اسی زمانے کا ذکر ہے کہ مجھے بڑی بی کی ایک اور کارروائی کا علم ہوا۔ سوتے میں وہ میرے قریب آکر غور سے میرے چہرے کو دیکھا کرتی تھیں۔ کئی مرتبہ مجھے آنکھ کھلنے پر شبہ سا ہوا۔ اس شبہ کی ایک روز میں نے مکر گانٹھ کر تصدیق کرلی۔ سوتا بن گیا اور میں نے چپکے سے دیکھا کہ بڑی بی اُٹھیں۔ دبے پاؤں آکر میرے چہرے کو دیکھنے لگیں۔ اسکے ساتھ ہی ایک اور بات معلوم ہوئی۔ نماز تو وہ پہلے بھی پڑھتی تھیں مگر کیسی؟ بس یہ سمجھئے کہ پڑھ تو رہی ہیں نماز مگر دل بازار میں پڑا ہے۔ ٹکریں مار مُوریہ جا وہ جا۔ مگر اب نماز نہ صرف دوسری تھی بلکہ مع وظیفہ۔ خیر یہاں تک بھی کچھ نہیں مگر میں نے یہ دیکھا کہ مغرب اور فجر اور عشا کی نماز کے مختصر یا طویل وظیفہ کے بعد ہی وہ گھوم گھام کر میرے قریب ضرور ہو جاتی تھیں؛ لیکن باوجود اِن واقعات کے اور باوجود اسکے کہ میں بدستور مرکزِ خدمات بنا ہوا تھا مرکزِ توجہات نہ بنا۔ بڑی بی کے رویّے میں ایک شانِ استغنا پائی جاتی تھی۔ یہ غالباً اُس کمزوری کی تلافی تھی جس کا اظہار وہ کر چکی تھیں۔

صورتِ حال مقررہ رفتار پر قائم تھی۔ دن اور مہینے گذرتے گئے اور کوئی قابلِ ذکر بات پیش نہ آئی۔ سردی کا موسم آیا تو بڑی بی نے میرا اور اپنا بستر کمرے میں پہونچایا۔ وہ کمرہ جس میں فرش تھا۔ نرم نرم گھاس پر دری اور اُس پر ایک جاجم اور اُس پر بستر۔ رات کو ایک کڑوے تیل کا چراغ اس کمرے میں اندھیرے اور اُجالے کا دنگل قائم کر دیتا اور یہ کُشتی جاکر صبح سورج کی کرنوں کی امداد سے فیصل ہوتی۔

چڑھتی سردی کا زمانہ تھا کہ میں بیمار پڑ گیا۔ معمولی بخار تھا مگر سر کے درد نے فنا کر دیا۔ باوجود میرے منع کرنے کے بڑی بی نے تیمارداری کو بیماری سے زیادہ تکلیف دہ بنا دیا۔ بستر سے بستر ملایا گیا اور سر کا درد کیا ہوا کہ سر کی ملکیت کا سوال درپیش ہو گیا۔ مگر ناحق شناسی ہوگی اگر اس تیمارداری کا شکریہ نہ ادا کروں۔ اور یہی بیماری میرے لئے مُہلک ثابت ہوئی۔ دراصل عورت پھر عورت ہے خواہ وہ بوڑھی ہو کہ جوان اور مرد ایک ناچیز ہستی ہے۔

معمولی بخار کی شکایت تھی جو جاتی رہی لیکن حکیم جی نے بدقسمتی سے بادام اور کاہو کا تیل سر میں دبانا تشخیص کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بعد بیماری یہ دردِ سر جاری ہوا کہ سوتے وقت بڑی بی گھنٹہ دو گھنٹے میرے سر میں تیل دبایا کرتی تھیں یا یوں کہیئے کہ لطیفے اور قصّے اِدھر اُدھر کے ہو رہے ہیں۔ میں لیٹا ہوا ہوں زانو پر اُن کے سر ہے اور وہ میرے سر اور بالوں اور پیشانی سے شوق فرما رہی ہیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ اسی طرح سر دباتے دباتے میں نے کہا کہ نیند سی آتی ہے۔ مگر بڑی بی نہ مانیں میں نے آنکھیں بند کرلیں اور غنودگی سی آگئی۔ نہیں کہہ سکتا کہ میں کب اور کتنی دیر میں سو گیا۔ اور سوتے میں میں نے ایک خواب دیکھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ وہی نابینا کا مکان ہے جہاں میں اپنی محبوبہ سے ملنے گیا تھا۔ وہی کمرہ ہے اور میں نے اُسکو دیکھا۔ میں نے اُس کو آگے بڑھ کر شوق بےتابانہ سے اپنے بیقرار سینے سے لگا لیا۔ اُس نے بھی محبت سے مجھے دبایا اور اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ میں نے اُس کے سر کو بوسہ دیا اور زور سے دبایا۔ اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور ہلکی ہلکی سسکیاں لیں اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ جذبات سے میں بے قابو ہو گیا۔ میں نے اور بھی محبت سے اُسکو اپنے سینے سے لگایا۔ اپنے سینے پر ٹھنڈک سی محسوس کی۔ آنکھ کھُل گئی۔ جہاں تک حقیقت کا سوال ہے خواب سچا تھا۔ یعنی یہ واقعہ تھا کہ میں نہایت گرمجوشی سے بڑی بی کو سینے سے لگائے اُنکے سر کو بوسوں سے سرفراز کر رہا تھا! انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور اُنہوں نے اپنے آنسوؤں سے میرا سینہ تر کر دیا تھا جس کی

خشکی میں محسوس کر رہا تھا۔

اب ایسی صورت میں میں کیا کرتا۔ تن بہ تقدیر اُسی طرح سوتا بن گیا۔ مگر کیا اب بڑی بی مجھے چھوڑنے والی تھیں۔ تو یہ کیجئے۔ اس محبت کی ماری بڑھیا نے اپنی گرفت کو اُسی طرح قائم رکھا۔ نتیجہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا تھا کہ اپنے ہاتھ ڈھیلے کر دوں مگر چھڑانا اور علیحدہ ہونا بغیر باضابطہ جاگنے کے ناممکن تھا۔ اور مجھے بہت جلد ہی تسلیم کرنا پڑا کہ میں جاگ اُٹھا ہوں۔ اور اس میں بڑی بی کی جیت تھی۔ نتیجہ یہ کہ مجھکو آنکھیں کھول کر چراغ کی دھیمی روشنی میں اپنی عبرتناک حالت کو دیکھنا پڑا۔ خود سوچئے کہ میں کیا کیا کرتا۔ یہ تو کہنے سے رہا کہ بڑا دھوکا ہوا۔ کچھ خفیف، کچھ شرم۔ نتیجہ یہ کہ مُردہ بدست زندہ۔ صورت حال کو نبھانا پڑا۔ اس محبت کی ماری بڑھیا کا آغوشِ اُلفت ایک مخمصہ ہو گیا۔ جس سے چھُوٹنے سے پیشتر اپنے خواب کی پوری تعبیر دیکھنا پڑی۔

دوسرے دن ہم دونوں خاموش رہے۔ مگر میں نے اس سانحہ کی اہمیت کا احساس کیا۔ یہ واقعہ ایک حادثے سے کم نہ تھا۔ کیا معنی خود تو پیشقدمی کروں اور دوسرے روز یہ عُذر کروں کہ دُھوکے میں اور عالمِ خواب میں میں نے ایسا کیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس اُلجھن سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے۔ میں اسی سوچ میں تھا۔ رات کو بڑی بی خاموشی سے سر دابنے کے لئے آئیں اور بغیر بات کئے اُنہوں نے سر کی مالش شروع کر دی۔ میں اس امکان ہی پر غور کرتا رہا کہ کس طرح اس مغالطہ سے نکلوں یا نکالوں۔ نتیجہ ظاہر ہے، میں سوچتا ہی رہ گیا۔ اپنی بے بسی کا احساس بھی تھا۔ عزت و آبرو کا پاس علیحدہ۔ مگر واقعات کے ہاتھ میں بچے کی طرح بے بس تھا۔ دوسرے دن بڑی بی سے نکاح کرنا پڑا۔ اور اس نکاح کے بعد میں خوب اور خوب ہی رویا۔ اپنی بے بسی پر یا بربادی پر! حقیقت کا احساس دل میں برچھی سی مارتا تھا۔ یا میرے اللہ! کیا یہ واقعہ تھا کہ ایک سیدزادہ ایک رذیل عورت کے ساتھ نکاح کا تماشہ کرے۔ کیا یہ نکاح تھا!۔

میں نے اس شادی کے "ہنی مون" کو اس عجیب و غریب طرح منایا کہ دفتر سے دس روز کی چھٹی لے کر کوٹھری میں بند رہا۔ رہ گئیں بڑی بی تو اُنہوں نے محلے میں حصے بانٹے۔ میں جب گوشۂ عافیت سے نکلا ہوں تو بات پُرانی ہو چکی تھی مگر پھر بھی یار لوگ کھنکارنے اور فقرہ چست کرنے سے باز نہ آئے لیکن جن کو یہ معلوم تھا کہ بڑی بی نے میرے ساتھ کیا سلوک کئے ہیں اور کیا احسان کئے ہیں اُنہوں نے میری ہمت کی تعریف کی۔

لیکن اس عجیب و غریب شادی کے ایک دوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ یہ شادی جیسی بھی حماقت آمیز، توہین آمیز، مضحکہ خیز، تمسخر انگیز اور انتہا سے لغو اور بے جوڑ شادی تھی اس کا اندازہ لگانا آسان ہے یعنی مطلب یہ کہ بغیر اس قسم کی خود حماقت کئے ہوئے آپ آسانی سے رائے قائم کر سکتے ہوں گے۔ میرا خیال تھا لیکن! ..... بخدا! میں تو عورت کی دلکشی کا قائل ہو گیا۔ عورت اور پھر بیوی! ایک دلکش راگنی ہے جو دل کو برماتی چلی جاتی ہے۔ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ عورت ہے کیا چیز!۔ عورت کی تمام ساحرانہ قوتوں سے بے خبر تھا۔ سوائے صورت و شکل اور ظاہری رعنائی اور انداز دلبری کے بقیہ تمام دوسری قوتوں کی طرف ذہن ہی منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کو اختیار ہے خواہ میرے ذوقِ انتخاب کی داد دیں۔ اور خواہ میری غرقابی پر کریں ماتم۔ میں تو ان محترمہ بڑی بی (جن کو میں نے اب بہ نظرِ احترام بڑی بیوی کہنا شروع کیا۔) میں ڈوب کر رہ گیا۔ ایک ڈھیر عورت میرے لئے چند ہی روز میں محبوبہ بن گئی۔ ایسی کہ میں اس کی محبت میں دیوانہ ہو گیا۔ یہ حال کہ دفتر کی عارضی جُدائی میرے لئے قیامت

تھی۔ وقت کاٹے نہ کٹتا تا منٹ گنتا اور دفتر سے دیوانہ وار گھر پہونچتا۔ اور جوں جوں وقت گذرتا گیا محبت میں بجائے وارفتگی کی استواری اور پختگی آتی گئی۔ اس بے جوڑ شادی میں مجھے عشق و محبت کا خزانہ ملا۔ رُوح کو انتہائی آرام و سکون ملا۔ ہر قسم کا جسمانی اور رُوحانی اطمینان کیساتھ وہ راحت اور وہ سکونِ قلب جو ایک مرد کو ایک دلچسپ ترین بیوی کے حاصل کرنے کے بعد میسر ہونا ممکن ہے۔ فاعتبرو.....

پھر خدا کی شان دیکھئے۔ یہ شادی تھی کہ فال نیک۔ اس شادی کے ساتھ ساتھ میری تقدیر نے بھی ایک خوشگوار پلٹا کھایا۔ ایسا کہ اسکے بعد ہر قدم پر ترقی اور کامیابی تھی حتیٰ کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوتا کہ الہٰی کیا یہ واقعہ نہیں کہ دُنیاوی ترقیوں کا راز بھی دراصل ایک کامیاب شادی ہی میں مضمر ہے۔ واللہ اعلم!

اب مَیں اُس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں جو میں نے انتہائی آرام اور سکون کیساتھ "بڑی بیوی" کے ساتھ گذارے۔

دس بارہ سال اسی طرح گذر گئے۔ بڑی بیوی کی عمر ۵۵ سال اور میری ۲۶ سال کی تھی کہ خود بڑی بیوی نے میری شادی کردی اور چھوٹی بیوی بیاہ لائیں۔

چھوٹی بیوی

ایک مختصر سا مگر کُشادہ کمرہ تھا جس میں عُمدہ غالیچوں کا فرش تھا۔ ایک طرف مسہری کا شامیانہ بر پا تھا۔ بیچ میں خوبصورت میز اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ایک طرف مسند لگی تھی۔ مسند پر گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی ایک ہلکی ہوئی زرنگار گٹھری رکھی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹی بیوی، یا چھوٹی بی تھی۔ پاس ہی بڑی بیوی ایک نورانی پھول کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ یہ تھا وہ سین جو میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں بڑی بیوی کے چہرے پر شادمانی کا نور پرتو فگن تھا۔ مارے خوشی کے وہ سچ مچ پھولی جا رہی تھیں۔

ہنسکر اُنہوں نے کہا "دیکھ تو دُلہن کو"۔

میں نے کہا "اب تمکو دیکھا ہے۔ بھلا کیا جچے گی یہ میری نظر میں۔ وہ بھی تمہارے سامنے"۔

بس کیا عرض کروں۔ مارے خوشی کے بڑی بیوی باغ باغ ہوگئیں۔ بولیں "چل، خبردار جو ایسی باتیں کیں"۔

بڑی بیوی نے چھوٹی بیوی کا گھونگھٹ اُٹھایا۔ وہ بیچاری اور بھی گڑی مُڑی ہوگئی۔ اور بھی جھک گئی۔ بڑی بیوی نے مسکرا کر رازدارانہ لہجہ میں اپنے انتخاب کی داد چاہی "لے دیکھ، دیکھ کیسی ہے"۔

میں نے کہا "مَیں اسے کیا دیکھوں۔ کیسے دیکھوں۔ یہ تو نہیں مانتی۔ بڑی مشکل سے قابو میں آئے گی۔ اس کا منہ تو اُوپر کو اُٹھاؤ"۔

اور ہم دونوں نے اس چھوٹی سی خوبصورت چیز کو پکڑ کر اچھی طرح دیکھا۔ گو بڑی بیوی اس جارحانہ منہ دکھائی کے خلاف تھیں مگر میں نے کہا "یہ ایسے نہیں ماننے کی۔ دیکھنے نہیں دیتی۔ تم یا تو اسکے ہاتھ پکڑو......"

لیکن چھوٹی بی بھر ہار گئی۔ میں نے اسکی ٹھوڑی کو سہارا دیکر اس کا چاند سا چہرہ بجلی کی روشنی میں آہستہ سے اُٹھایا۔ جب اس کا بس نہ چلا تو اُس نے لاچار ہو کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ بڑی بی نے سفارش کی۔ لیکن میں نے غور سے اِس خوبصورت اور معصوم چہرے کو

دیکھا اور جھک کر اس کا منہ چوم لیا۔ ایسے سخت گڑبڑ واقع ہوئی۔ بڑی بی خود اچھل پڑیں اور خود اس نے گھبرا کر اپنا منہ بالکل چھپا لیا۔ بڑی بیوی کی خاک سمجھ میں نہ آیا کہ اس موقع پر ہنسنا چاہیئے یا خفا ہونا چاہیئے۔ مجبور ہنسنے پر تھیں اور ضرورت خفگی کی تھی۔ موقع خوب تھا۔ وہ چوٹ کی ہر کہ بڑی بیوی کبھی نہ بھولیں۔ میں نے کہا "تم ہی نے تو کہا تھا کہ جب میں منہ دکھاؤں......"

اب میں کیا عرض کروں کہ بڑی بیوی کیسا سٹپٹائیں۔ بیحد خفا ہوئیں۔ خوب بڑبڑائیں۔ بے شرم، بے حیا، شوخ، شریر، سب ہی کہہ ڈالا۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ شرم نہ آئی کرتے۔ اور پھر ٹیپ کا بند "کیا سوچتی ہوگی دل میں۔"

میں نے کہا "پوچھ لو بیچاری بیٹھی تو ہے" اور یہ کہکر میں نے سفارش بھی کی۔ بڑی بی نے اسی بڑبڑانے کے سلسلہ کو جانے کی تمہید ٹھہرایا اور چلدیں۔ اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر چپکے سے مجھے اشارہ سے بلایا۔ میں اٹھکر گیا۔ کوئی پانچ منٹ انتہا سے زیادہ ضروری باتیں کرتی رہیں۔ جن میں سے آدھی میں نے سنیں۔ مجھے گلے سے لگایا اور چلی گئیں۔ اور آج سے میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

میں نے اپنی چھوٹی بی کو کیسا پایا۔ بخدا وہ مضمون کہ "بڑی تو بڑی چھوٹی سبحان اللہ!" ایک انتہا سے زیادہ دلچسپ اور خوش گلو لڑکی۔ گانے کی بیحد شوقین۔ انتہا سے زیادہ بناؤ سنگار کرنے کی اور محبت اور پیار کی باتوں کی حد سے زیادہ شوقین۔ طبیعت میں شوخی اور رنگینی۔ خوش پوش اور جامہ زیب۔ ایک رنگ برنگی خوبصورت چمکیلی تتلی جس کی چمک دمک اور بانکپن سے میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اور پھر میاں کے گلے کا ہار۔ نتیجہ یہ کہ میں تو سچ مچ گویا گھبرا گیا۔ خدا کی پناہ! میں کس دھوکے میں تھا اب تک! محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے! حسن وخوبصورتی بھی دنیا میں کوئی چیز ہے! ارے! عورت یہ ہے! بیوی! واللہ! جوانی بھی کوئی چیز ہوتی ہے! اگا بھی خوب چیز نکلا۔ جوانی اور بڑھاپے میں واقعی فرق ہوتا ہے۔ اتنے دن تک واقعی بڑے دھوکے میں رہے! پہلے بیشک ہم جی رہے تھے اور اب؟ اب تو زندہ معلوم ہوتے ہیں! آنکھیں کھل گئیں۔ اب چاروں طرف نظر جو ڈالتے ہیں تو لاحول ولا قوۃ۔ وہ مضمون کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون کل سیدھی۔ کپڑے دیکھو تو۔ لتے دیکھو تو۔ جوتا ٹوپی۔ میز کرسی۔ فرش فروش۔ ہر چیز صاف ہے۔ ستھری ہے۔ اپنے قرینے پر ہے۔ پر جس چیز کو دیکھو ایک ٹھوس اور مریل پنا ہے کہ برس رہا ہے۔ درحالیکہ چھوٹی بی کے دوپٹے کی چھینٹ ہے کہ دل میں چٹکیاں بھرے لیتی ہے۔ اور یہاں اپنی ہر چیز رنگ و بو سے خالی۔ رنگین ہے تو اس میں رنگ نہیں۔ سفید ہے تو اس میں چمک ندارد۔ صفائی ہے تو چکنا پن ندارد۔ ہر چیز پر ایک بڑھاپا سا ہے کہ پھٹا پڑتا ہے۔ ایک بوسیدگی ہے کہ چھائی ہوئی ہے۔ اور یہ غضب پہ غضب کہ اب جس ہم عمر کو دیکھو ہنستا معلوم ہوتا ہے۔ ایک بھڑکیلا پھول بنا رہتا ہے۔ ہمیشہ سے! پر ہم نے کبھی اس امر پر غور ہی نہیں کیا۔

قصہ مختصر کیا عرض کیا جائے۔ اس چھوٹی بیوی نے تو آنکھیں کھول دیں۔ ایک روشنی تھی کہ از خود ہر چیز نے جگمگانا شروع کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز میں ایک روپ اور نکھار سا پیدا ہونے لگا! اور زندگی ایک مرصع گلدستہ بن گئی۔

عظیم بیگ چغتائی

اُسکی موت کی وجہ

یہ ٹریجیڈی ساقی کے "ظریف نمبر" کے لئے میرے خیال میں کسی طرح مناسب نہ تھی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ شاہد صاحب نے اپریل نمبر کیلئے اسے ہی منتخب کیا۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھیری!۔　　حجاب

ایسے اِک نالۂ پُر درد کی تمہید ہوں میں　　انتہائے غم و ارمان ہے عُنواں میرا

گذشتہ اتوار کی صبح۔ "صبح کی ڈاک" (روزانہ اخبار) سے جب کپتان زہدی کی وفات حسرت آیات کی خبر معلوم ہوئی تو ہم سب کی حیرت کا کچھ ٹھکانہ نہ رہا کہ اتنی جلد اُنکی مظلوم رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی!۔

گذشتہ جمعرات ہی کا تو ذکر ہے کہ رات کو بیگم نجم کے ہاں ایک شاندار ڈنر پارٹی تھی۔ اس میں ہم بھی شریک تھے۔ اور سب نے کپتان مرحوم مغفور کو دیکھا تھا۔ الہٰی! اتنی جلدی وہ اپنے مادی جسم سے علیحدہ ہو گئے؟ افسوس افسوس!

جب بیگم نجم کے ہاں سے دعوتی رقعے ہمارے نام آئے تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ حلقۂ احباب میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ "آج چاند کدھر سے نکلا؟ یہ تو قیامت کے آثار معلوم ہوتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ زندگی بھر اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ کبھی بیگم اور جناب نجم بھی مہمانوں کے متحمل ہو سکیں گے۔

چنانچہ ہم سب بڑے اشتیاق سے وقتِ مُقررہ پر حاضرِ خدمت ہو گئے۔

کھانے کے بعد سب آگ کے قریب بیٹھے بے ڈنڈی کی چمکیلی پیالیوں میں قہوہ پی رہے تھے۔ اس وقت تک کپتان زہدی کی [illegible] تھی نہ تھا۔ کیونکہ مہمان کافی تعداد میں موجود تھے اور بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور زہدی مرحوم میں کوئی چمکیلی چیز تو لگی تھی نہیں کہ لوگ خصوصیت سے ان کی طرف متوجہ ہوتے۔

کھانے کے بعد آگ کے قریب بیٹھے بیٹھے یکایک مجھے خیال آیا اور میں نے خاتونِ خانہ سے کہا "آپ لوگوں کو شاید علم نہیں، کپتان زہدی علم نجوم کے ماہر ہیں اور ہاتھ خوب دیکھتے ہیں"

بس یہی اک جملہ غریب کی موت کا سبب بن گیا!!۔

تمام مہمان آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عینکوں کے نیچے سے، اُوپر سے، بیچ میں سے انہیں دیکھنے لگے۔ چشم زدن میں اُنکے ارد گرد مہمانوں کا اک حلقہ بن گیا۔ خواتین خصوصیت سے متوجہ تھیں۔

اب کھلی ہوئی ہتھیلیاں کپتان زہدی کے آگے پیش کی جا رہی تھیں اور بیتابانہ فرمائشیں ہو رہی تھیں کہ ہمارا ہاتھ پڑھئے ہماری تقدیر بتائیے۔ کس کس کی تمنا پوری کرے غریب؟۔ ع

اِک مُشتِ اُستخواں ہوں کسے دوں کسے نہ دوں

کا نقشہ تھا۔ پندرہ سولہ ہی ہاتھ دیکھے تھے کہ مہمانوں کے حلقے میں بہت محبوب ہو گئے۔

جب بیگم نجم کے ہاتھ کی باری آئی تو ان کا رنگ کچھ فق سا ہو گیا۔ شاید اس بات کا اندیشہ انہیں خوفزدہ کر رہا تھا کہ کہیں کوئی ایسی نامناسب بات ہاتھ سے ظاہر نہ ہو جائے جو انہیں مہمانوں میں منفعل کرے۔ مثلاً اُن کی شہرۂ آفاق موروثی بیماری۔ یعنی کنجوسی۔

مگر مرحوم نے بڑی خوش اخلاقی برتی۔ کچھ دیر بغور خاتون کا ہاتھ دیکھتے رہے۔ پھر مسکرا کر فرمایا۔ "خاتون! آپ بیحد فیاض اور دریا دل ہیں۔ ہاتھ سے یہی پتہ چلتا ہے"

یہ سنتے ہی مہمانوں میں اک کھلبلی سی پڑ گئی۔ جیسے یکلخت بہت سی مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ کہیں سرگوشیاں، کہیں چہ میگوئیاں، کسی کے مُنہ سے زیر لب کوئی فقرہ نکل گیا۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ کوئی مسکرا رہا تھا۔ کسی نے ہنسی چھپانے کو سر پھیر لیا۔ کوئی قہقہہ دبانے کو مُنہ پر رومال رکھکر باہر نکل گیا۔

کمرے کی اِس فضا کو دیکھکر بیگم نجم بہت پریشان ہوئیں۔ سمجھ گئیں کہ یہ بے کلی کس بات نے پیدا کی ہے۔ تردد سے کپتان زہدی کا مظلوم چہرہ دیکھا کہ کہیں وہ بھی تو نہیں تاڑ گئے۔ وہ غریب ندامت آمیز پریشانی کے عالم میں ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ گویا پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا غلطی کر بیٹھا ہے؟ بیگم نجم انہیں زیادہ غور کرنے کا موقع نہ بخشنا چاہتی تھیں۔ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور بولیں۔ "ذرہ نوازی! پیارے کپتان آپ کل ہمارے مہمان بن کر یہیں جوشب باشی کیجئے۔ کل تو چھٹی کا بھی دن ہے"

خاتونِ خانہ بیحد خوش ہو گئی تھیں۔ کیونکہ قصہ بالکل برعکس تھا آج کا شاندار ڈنر بھی خیراتی روپوں سے ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔

بیگم نجم کی اس دعوت نے پھر کمرے میں سرگوشیوں اور دبے ہوئے قہقہوں کی ایک لہر دوڑا دی بیگم نجم دل ہی دل میں پیچ و تاب میں۔ اور اُن کا سانس کسی قدر تیز ہو گیا تھا۔

حالات کا مطالعہ کر کے ہمارے میزبان نجم صاحب نے زور دینا مناسب سمجھا۔ اور فرمایا۔ "ہاں جناب! ٹھہر جائیے۔ کل چلے جائیے گا"

فیاضی میں وہ اپنی بیوی سے دو ہاتھ بڑھے ہی ہوئے تھے۔ اُس وقت اپنی رفیقِ حیات کی تعریف سُنکر وہ بھی بیحد مسرور تھے۔

کپتان زہدی کی مروت زبان زد خاص و عام تھی۔ وہ بات پر نہ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ بیحد ہمت کر کے ایک بار انکار کر بھی دیتے تو ذرا سا اصرار اُنہیں بے بس کر دینے کو کافی ہوتا تھا۔ (آہ اب کہاں لوگ اس طبیعت کے؟) چنانچہ سب مہمان رخصت ہو گئے، اور بدنصیب کپتان ٹھہرا لیا گیا۔

مہمانوں کو رُخصت کرتے وقت بیگم نجم کا تلخ تبسم صاف کہہ رہا تھا کہ میرے متعلق جس قسم کی نامناسب رائے تم سب نے قائم کر رکھی ہے اسکے متعلق کل کے بعد کپتان زہدی سے شہادت لیجئے گا۔

۲

دونوں میزبان اپنے مہمان سے بے انتہا خوش تھے اور اپنی فیاضی اور دریا دلی کا اس پر سکہ جمانا چاہتے تھے۔

صبح کی چاء پر بیگم نجم مسکرا کر کہنے لگیں "کپتان صاحب! آپ تو کچھ بھی نہیں لیتے۔ بھئی یہ تکلف ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ کم از کم سیب کا مربہ تو لیجئے"

نجم صاحب توس پر مزے سے مکھن لگاتے ہوئے بولے "سیب کا مربّہ تو اختلاجِ قلب کے مریضوں کی غذا ہے ہمارے مہمان کو آپ اسٹرابری جام کیوں نہیں دیتیں؟ اور بالائی بھی دیجیے"

مُروّت مرحوم میں بھی بولے "میں تینوں چیزیں بخوشی لے لونگا"

"اور تھوڑا سا ٹھنڈا گوشت؟" بیگم نجم نے اپنے ہونٹوں پر فیاضوں کی سی کیفیت اور مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا "آج کل صبح کے ناشتے پر ٹھنڈا گوشت بہت لُطف دیتا ہے"

کپتان مرحوم انکار نہ کرسکتے تھے کیونکہ اُن کی سرشت ہی نہ تھی اس لئے کہا "دیجیے"

"اس پر ٹماٹو کے قتلے بھی ضرور رکھو" نجم صاحب نے کہا "اور دو ایک آلو کے ٹکڑے بھی"

"اس کے بعد" بیگم نجم فرمانے لگیں "آپ کو دو کیلے ایک پیالی شیریں اور تازہ دودھ اور ایک پیالی گرم چاء کی پینی ہوگی"

"مگر خاتون" مرحوم نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا "یہ سب کچھ تو میرے لئے ناقابل برداشت ——"

"ایں آپ انکار کرتے ہیں؟" بیگم نجم نے کہا۔

"جی نہیں —" کپتان زہدی نے معذرت کی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا "انکار تو نہیں۔ خیر لے لونگا"

چاء ختم ہوئی۔ کپتان زہدی اور نجم صاحب سگار پیکر باغیچے کی سیر کیلئے چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں بیگم نجم بھاگی بھاگی باغیچے میں پہونچیں "کپتان زہدی، کپتان زہدی! آپنے غضب کر دیا۔ پوریج نہیں کھایا؟ کیا ہی افسوس کی بات ہے آج صبح میں نے اپنے ہاتھ سے اپنی خوابگاہ کے برقی چولھے پر آپکے لئے تیار کیا تھا"

نجم صاحب مُنہ میں سگار دبائے ہوئے گول گول آواز میں فرمانے لگے "تو ہوا کیا؟ اب کھالیں گے"

"جی —— نہیں ——" لرزتی ہوئی آواز میں مرحوم نے کہا "جی نہیں ——"

"نہیں نہیں" خاتون فرمانے لگیں "آپ کو کھانا ہوگا۔ میں اپنے مہمانوں کو کبھی بھوکا نہیں رکھ سکتی"

نجم صاحب فخریہ لہجے میں بولے "یہ میری بیوی کی عادت ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے مہمانوں کی بیحد تواضع کرتی ہیں۔ کوئی کھانے کا شوقین اُنہیں مل جائے —— بس —— پھر کیا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں!"

یہ کہکر مرحوم کی طرف اس طرح دیکھنے لگے گویا جانچ رہے ہیں کہ اس خاندان کی دریا دلی کا لوہا غریب مان گیا یا نہیں۔

"مگر جناب" وحشت زدہ لہجے میں مُروّت کے مارے ہوئے مہمان نے کہا "کھانے کا شو —— شوقین —— تو میں ——"

"آپ کو کھانا پڑے گا اچھے دوست!" یہ کہتے ہوئے خود بیگم نجم نے اپنے مہمان کا پہلو تھام لیا۔ اب بھلا خاتون کی بات سے کون معزز آدمی اِنکار کرسکتا ہے؟ کپتان زہدی قیدی کی طرح سر جھکائے طعام خانے کی طرف چلے۔ دونوں میزباں کانسٹبل کی طرح دائیں بائیں تھے۔

مرحوم نے کرسی پر بیٹھکر زانو پوش کھول لیا۔ پھر ناشتہ کھانے بیٹھ گیا۔

پوریج کے ڈھائی چمچے کھائے تھے کہ دفعتاً مرحوم کا چہرہ عجیب قسم کا ہوگیا۔ آنکھیں کُھل سی گئیں۔ مُنہ گول بن گیا۔ دونوں میزبان بھی حیران ہوکر اس تغیر کو دیکھنے لگے۔ بات یہ تھی کہ ڈکار آنے لگی تھی اور مرحوم بڑی کوشش سے اُسے روک رہے تھے۔

آخر جو تھے پیچھے پر غریب کو ڈکار آہی گئی۔ شرمندہ ہو کر اپنے میزبانوں کا چہرہ دیکھنے اور معافی چاہنے لگے۔
"کوئی مضائقہ نہیں" بیگم نجم کہنے لگیں "ایسا ہو جاتا ہے۔ تھوڑا سا ہاضمے کا نمک کھا لیجئے گا"
"جی ــ ضرور کھاؤں گا" یہ کہتے ہوئے زانو پوش سے منھ پونچھا۔ اور اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئے۔

(۳)

اب دو پہر کے کھانے کا مرحلہ بلکہ حادثہ پیش آنے والا تھا۔ کپتان زہدی مرحوم کی یقیناً یہی تمنا تھی کہ آج دن بھر وہ بغیر غذا کے کمرے میں تنہا چھوڑ دئے جائیں۔ مگر تمنائیں کب پوری ہوتی ہیں بھلا؟ اور جو تمنا پوری ہو جائے وہ تمنا ہی کیا؟ عین ایک بجے میزبان نے خود آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔
"کپتان! کپتان زہدی! کھانا تیار ہے"
کپتان مرحوم کی رُوح لرز گئی۔ وہ اپنی رات والی تجوم کی بات پر دانت پیس رہے تھے۔
"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے" بیگم نجم کی آواز آئی۔
بے حد ہمت کر کے بد نصیب کپتان نے کہا "میری خاتون مجھے معاف فرمائیں طبیعت خراب ہے"
"تو پھر کھچڑی کھا لیجے نا"
مروت نے اور کچھ کہنے نہ دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کپتان زہدی اپنے کمرے سے نکلے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ــ
کھانے کی میز پر تینوں بیٹھ گئے۔
"آج میرا دل کس قدر خوش ہے" بیگم نجم نے مچھلی کا ایک ٹکڑا کانٹے میں پردتے ہوئے فرمایا۔
"کیوں خوش ہے؟" نجم صاحب نے پوچھا۔ تاکہ تفصیل بیان کی جائے۔
"کیوں کیا؟" بیگم نجم نے مسکرا کر کہا "آپ میری عادت سے واقف ہی ہیں کہ جب کوئی مہمان آتا ہے تو مجھے کیسی دلی مسرت ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں میرے ہاں ہر ہفتے کوئی مہمان آئے اور اچھے اچھے کھانے پکیں"
"سنا آپ نے کپتان؟" نجم صاحب نے اپنی سیدھی ابرو چڑھا کر مغرور لہجے میں کہا "سنا آپ نے؟ میری بیوی کو دریا دلی کا جنون ہے۔ واقعی مجھے ان لوگوں پر حیرت ہے بلکہ افسوس ہوتا ہے جو مہمانوں سے محض اس لئے گھبراتے ہیں کہ وہ ان کا سب کچھ کھا جائیں گے۔ آخر یہ لوگ اپنا روپیہ اپنی قبروں میں لے جائیں گے؟"
"جی نہیں ــــ نہیں لے جائیں گے" جلدی سے کپتان زہدی نے جواب دیا۔ اصل میں اُن کی طبیعت مالش کر رہی تھی۔
"مچھلی لیجئے" بیگم نجم نے کہا۔
"دیجیے" کپتان نے اپنی رکابی آگے کو بڑھا کر اُداس لہجے میں کہا۔
صبح ہی بیگم نجم نے حسب معمول اپنے باورچی کو تاکید کر دی تھی کہ بازار میں جو سب سے سستی مچھلی ملے وہ لے آئے۔ چنانچہ وہ سڑی ہوئی لے آیا۔ یہ کھا کر غریب کی طبیعت اور بگڑی۔

"ایں آپ نے مرچوں کا سالن نہیں لیا"
کپتان زہدی وحشت زدہ ہوکر مرچوں کے سالن والی پلیٹ کو تکنے لگے۔
"خدا کے لئے لیجئے" نجم صاحب فرمانے لگے۔
ٹھنڈا سانس بھر کر کپتان نے کہا "دیدیجئے"
جب پھلوں کی باری آئی تو میزبانوں کے اصرار سے بہت پہلے خود مہمان نے جلدی جلدی دو کیلے چھیل کر کھالئے تین نارنگیاں کھائیں اور اپنی جگہ یہ سمجھ گئے کہ نجات مل گئی۔ چنانچہ اطمینان سے میزبانوں کے چہرے پر نظر ڈالی۔ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھنے ہی والے تھے کہ خاتون نے فرمایا "ایں! تربوز نہیں کھایا آپ نے؟"
مرحوم کا چہرہ فق ہوگیا۔ بس زبان سے اتنا نکلا "نہیں" پھر ہمت کرکے "مگر اب تو ——"
"لیجے لیجے" نجم صاحب کہنے لگے "تربوز تو ضرور کھانا چاہیئے"
کپتان زہدی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا "دیدیجے —— آہ ——"
بیگم نجم فوراً متوجہ ہوئیں "یہ کیا! آپ کچھ اداس سے نظر آرہے ہیں"
"جی نہیں —— میں بالکل اچھا ہوں —— بالکل"
"بات یہ ہے" نجم صاحب اپنے دونوں گالوں میں ایک ایک کیلا سنبھال کر کہنے لگے "کپتان صاحب تکلف کرتے ہیں"
مرحوم کو تکلف کے نام سے سخت ڈر لگا کہ کہیں کوئی اور مصیبت نہ آئے اسلئے جلدی سے کہا "جی نہیں —— خدا کی قسم۔ تکلف ... ." الفاظ حلق میں اٹک گئے۔
"ٹھہریئے، مجھے ایک اور چیز یاد آئی" خاتون نے کہا۔ کپتان کا دل انجن کے پرزے کی طرح تڑپنے لگا۔ خاتون نے اپنا جملہ ختم کیا "نعمت خانے میں اخروٹ کی مٹھائی رکھی ہے۔ یہ عرصے سے پڑی ہے۔ مری توبہ ہے کوئی کھاتا ہی نہیں۔ وہ آج آپ ضرور کھائیے"
"میں معافی چاہتا ہوں خاتون" یہ کہتے ہوئے وحشت کے عالم میں کپتان زہدی نے کرسی پیچھے کو سرکالی۔ اور باغیچے میں پاگلوں کی طرح بھاگے۔
بیگم نجم دو لمحے برآمدے میں کھڑی حیران ہوکر انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر اخروٹ کی مٹھائی کی طشتری لیکر ان کے پیچھے بھاگیں۔
"کپتان صاحب! کپتان صاحب! آپ کہاں ہیں؟"
کپتان زہدی دو لمحے شہتوت کے پیڑ کے پیچھے چھپے بیٹھے رہے۔ جب خاتون کی آواز قریب آئی تو موتیا کی بیلوں کی طرف بھاگے۔
"اخروٹ کی مٹھائی" بیگم نجم کی سریلی آواز گونجی۔ کپتان مرحوم موتیا کی بیلوں میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھے تھے اور پتوں کی اوٹ سے خاتون کی طرف وحشت زدہ نظروں سے جھانک رہے تھے۔
اتنے میں نجم صاحب دوسری طرف سے آنکلے۔ بڑے حیران ہوئے "ارے کپتان صاحب!" —— پھر ذرا قریب آکر بولے "ایں! آپ

یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کوئی سانپ ——— ؟"

کپتان کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے "جی ہاں سانپ!"

بیگم نجم بھی آواز سن کر آپہونچیں "میں کہاں کہاں آپ کو ڈھونڈتی رہی۔ یہ لیجئے"

یہ کہکر طشتری بڑھائی۔ ایک بہت لمبا سانس بھر کر اور دائیں پہلو پر جھک کر مرحوم مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھانے ہی لگے تھے کہ کچھ اکڑ سے گئے۔ یعنی دائیں پہلو پر ہی جھکے کے جھکے رہ گئے۔

"ایں! یہ کیا ہوا میرے اللہ؟" خاتون نے فرمایا مگر غریب کپتان اب سیدھا کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ مٹھائی مٹھی میں تھی اور آنکھیں بند۔"

بڑی مشکل سے نجم صاحب نے انہیں اٹھا کر کمرے میں بستر پر لٹا دیا۔ حالت بگڑ چکی تھی۔ ڈاکٹر آن پہونچا مٹھی کھولکر اخروٹ کی مٹھائی نکال پھینکی۔ اسی تشخیص تھی کہ کپتان زہری ہیضہ میں مبتلا ہیں چنانچہ فوراً ہسپتال پہونچا دئے گئے۔

اسی رات کے دو بجے غریب کا انتقال ہوگیا۔ اخروٹ کی مٹھائی گویا اسکی موت کی وجہ ہو گئی!۔ ع:۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!"

حجاب امتیاز علی

لال قلعہ کی ایک جھلک

سید ناصر نذیر فراق (مرحوم) کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے دکھایا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار ابوظفر کے زمانے میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی اور اس انتہائی انحطاط کے زمانے میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ سید ناصر نذیر فراق دہلی کے مشہور انشاپردازتھے اور اس اسکول کے لوگوں میں سے تھے جن کا ایک فرد بھی باقی نہیں۔ زبان کی حلاوت، انداز بیان کی شیرینی، اردوئے معلّٰی کے ٹکسالی محاورے، تہذیب قدیم کے عوائد و مراسم کا بیان۔ الغرض اس چھوٹی سی کتاب میں وہ کیا چیز نہیں ہے جس سے اس وقت انشاپردازی کی بڑی سے بڑی کتاب خالی نظر آتی ہے۔ میں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں جب تک وہ ختم نہیں ہو گئی۔ اور جب ختم کر چکا تو تاثر کا یہ عالم تھا کہ آنکھ اور دل دونوں رو رہے تھے۔ (نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار) قیمت صرف عہ

دلّی کا آخری دیدار

اب سے سو سال پہلے جب لال قلعہ میں خاندان مغلیہ کی آخری شمع جھلملا رہی تھی تو دلی کی سوسائٹی کیسی تھی اور دلی والوں کے رسم و رواج کیا تھے؟ بادشاہ سلامت شہزادیوں اور شہزادوں کا لائحہ عمل کیا تھا؟ امرا کے مشاغل کیا تھے؟ غربا کس طرح اپنا وقت گذارتے تھے؟ اس قسم کے ہزاروں سوال دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کا جواب آپکو اس کتاب میں ملجائیگا۔ لال قلعہ کی چہل پہل، چوک کی گھما گھمی۔ برسات کی نشیلی رت میں پھول والوں کی سیر جس میں رعی اور رعایا ہندو اور مسلمان سب برابر کا حصہ لیتے تھے۔ بیگموں کی چھیڑ چھاڑ، شرفائے دہلی کی تہذیب و معاشرت، میلوں تہواروں کی رنگ رلیاں یہانتک کہ سودا سلف بیچنے والوں کی صدائیں تک اس چھوٹی سی کتاب میں درج ہیں۔

ایک شہزادی کی زبانی یہ عبرت آموز کہانی سنیے۔ کہیں وفور مسرت سے آپکی باچھیں کھل جائینگی اور کہیں شدت غم سے آپکے آنسو نکل آئینگے۔ قیمت ۱۲ر

ایک ایکٹ کی کامیڈی

شادی کی اونچ نیچ!

اُردو میں "ڈرامہ" جس پستی میں ہے اُسے یہاں بیان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے، آغا حشر مرحوم نے اس صنفِ ادب کو فروغ دیا تھا، مگر اُن کے ساتھ اُردو ڈرامہ نگاری نے بھی دم توڑ دیا۔ یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ اب چند نوجوانوں نے "ڈرامہ" کو اپنا خاص موضوع بنالیا ہے اور ان ہی میں سے ایک سید انصار ناصری صاحب ہیں جنہیں اچھے ڈرامے لکھنے کی دُھن ہے، تجمہ نوری نے جو شہرت پائی محتاج بیان نہیں، ذیل میں جو ڈرامہ پیش کیا جارہا ہے کردار نگاری کے اعتبار سے اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ اور حضرات اسے نمونہ بناکر کچھ لکھیں تاکہ ہماری زبان میں "ڈرامہ" بھی "افسانہ" کی طرح اپنے عروج پر پہنچ جائے +

"شاھد"

افراد

حشمت آرا بیگم .... وحشی کی خوش دامن +
لیاقت بیگم .... حشمت آرا کی بھانجی +
انجمن آرا .... حشمت آرا کی بیٹی، وحشی کی بیوی +
وحشی .... نوجوان شاعر +

نئی دہلی کی ایک خوشنما کوٹھی کا ایک کمرہ، دائیں طرف ایک دروازہ، بائیں طرف دو دروازے، ایک ڈرائنگ رُوم میں کھلتا ہے، دوسرا برابر والے کمرے میں۔ دروازوں پر آسمانی رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ سامنے کے رُخ ایک کھڑکی جو بند ہے، اسکی سل پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ کمرے میں ضرورت سے زیادہ فرنیچر اور دیگر سامان بھرا ہوا ہے، وسط میں ایک میز ہے جس پر لکھنے کا سامان اور کچھ کتابیں پڑی ہیں۔

لیاقت بیگم حشمت آرا کی خوبصورت، ہنس مکھ نوجوان بھانجی ایک ہاتھ میں بیگ اور دوسرے میں ایک موٹی سی نوٹ بک لئے ہیں۔ حشمت آرا، سانولا رنگ، موٹی ناک، خضاب زدہ بال، دبدبہ اور شان کی مجسم

تصویر ہیں۔ گو فی الحال نزلے کی تحریک کے سبب ذرا ناک میں بولتی ہیں، اور موقع بے موقع خوفناک قسم کی چھینکیں بھی لیتی رہتی ہیں :۔

لیاقت بیگم :۔ گھبرانے کی کیا بات ہے خالہ جان! سب ٹھیک ہے......

حشمت آرا :۔ تو نہیں جانتی بچی —— جب —— آچھیں ں ں! —— جب معاملہ وکیلوں تک پہنچ جائے تو —— ہائے میں کیا کروں.........

لیاقت :۔ کیا واقعی وکیلوں تک نوبت پہنچ گئی —— اوہ —— تب تو واقعی افسوس ہے —— مجھے وحشی صاحب اور انجمن آرا کی طرف سے اتنی ذلالت کی توقع ہرگز نہ تھی۔

حشمت :۔ کیا بتاؤں بچی! —— ان دونوں کا دنیا جہان سے نرالا جوڑا ہے۔ آخر ہماری بھی شادی ہوئی تھی —— ہم میاں بیوی بھی لڑتے تھے۔ لیکن آجکل کی لڑائیاں توبس —— آچھیں ں ں!!

لیاقت :۔ جی ہاں خالہ جان!! آج کل تو ذرا ذرا سی بات پر طلاقاطلاقی ہوتی ہے —— میں کہتی ہوں کہ پھر شادی آخر کی ہی کیوں جائے۔ جب میاں بیوی پیار محبت سے نہیں رہ سکتے تو پھر شادی کی کیا ضرور.........

حشمت :۔ بچی تو کیا جانے ان باتوں کو۔

لیاقت :۔ مگر میں سیکھ رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ سب کچھ آجائیگا۔

حشمت :۔ کبھی نہیں آسکتا۔ شادی تو ایسا علم ہے جو سیکھا یا پڑھا نہیں جاسکتا، صرف برتنے اور تجربے سے آسکتا ہے —— مگر خیر یہ وقت ان باتوں کا نہیں —— ہائے میں کیا کروں —— ان دونوں نے تو لٹیا ڈبودی.......

لیاقت :۔ مگر خالہ جان۔ آج کوئی نئی بات تو ہے نہیں —— انجمن آرا تو ہمیشہ لڑتی ہی رہتی ہیں۔ گذشتہ مہینے جب قطب کی سیر کو گئے تھے تو وہاں بھی ان دونوں نے چین نہ لینے دیا صبح سے شام تک لڑتے ہی رہے —— مگر میرا بہت فائدہ ہوا۔ میری کتاب "شادی کی اونچ نیچ" کے لئے خوب مسالہ ہاتھ لگا.....

حشمت :۔ تو بڑی سنگدل ہے —— لیاقت —— میں کہتی ہوں کہ —— آچھیں ں ں!!

لیاقت :۔ آپ کچھ ہی کہیئے خالہ جان —— مجھے تو انجمن آرا سے اب ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔

حشمت :۔ ہاں ٹھیک ہے —— مگر میں تو اسکی ماں ہوں —— ماں کے دل سے پوچھ —— میرے دل سے، اُسکی آواز میں کیسا درد تھا۔ حالانکہ ٹیلیفون میں سے آرہی تھی، مگر ہچکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی —— ہائے رے میں کیا کروں.......

لیاقت :۔ مگر پچھلی دفعہ کا واقعہ کیا آپ بھول گئیں —— دونوں کے دونوں خوب لڑے، اور جب ہم ملاپ کرو لنے آئے تو خود ہی گھل مل گئے اور اُلٹا ہمیں ڈانٹا کہ تم لڑائی ڈلواتے ہو۔

حشمت :۔ ہاں ہاں۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاید میں ہی غلطی پر تھی۔

لیاقت :۔ آپ غلطی پر؟ —— وہ کیسے؟؟

حشمت :۔ آچھیں ں ں!!

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ لیاقت ٹیلیفون اُٹھاتی ہے)

لیاقت :۔ ہاں —— ہاں —— جی ہاں —— ہیں —— موجود ہیں۔ میں ابھی بلاتی ہوں۔ آپ ذرا توقف.......

انجمن آرا :۔ (حسین نازک اندام۔ سولہ سنگھار سے آراستہ) کون ہے؟

لیاقت :۔ ہم لوگ۔ تمہاری اماں جان —— کوئی ٹیلیفون پر بلاتا ہے۔

انجمن آرا :۔ اوہو —— اماں جان —— آپ آگئیں ——

حشمت :۔ بچی!!! (انجمن آرا کو گلے سے لگاتی ہے)

لیاقت :- ارے جلدی کرو ---- ٹیلیفون!!!
انجمن آرا :- (ٹیلیفون پر جاکر) ہیلو ---- ہاں - ہاں ---- بہن - کیسے بتاؤں ---- نہیں ---- اس مرتبہ قطعی فیصلہ ہو کر رہیگا ---- ہاں ---- نہیں ---- میرے عزیز معاملات طے کرنے یہاں آ چکے ہیں ---- میں ضرور علیحدگی اختیار کرکے رہوں گی ---- قطعی طے ہو اور کیا ---- تم پھر ٹیلیفون کرنا ---- کچھ دیر بعد ---- خدا حافظ -
حشمت :- انجمن کچھ تو بتا ---- میرا دل بیٹھا جاتا ہے ---- آخر ہوا کیا؟
انجمن آرا :- (تیزی سے) اماجان ---- کیا مجھے دق ہے؟
حشمت :- کیا؟؟
انجمن آرا :- کیا میں بیمار ہوں؟ کیا مجھے ہسٹیریا ہے؟ کیا میں سوتے میں خراٹے لیتی ہوں؟ کیا مجھے ڈکاریں بہت آتی ہیں؟ کیا میری ناک بہتی رہتی ہے ----
حشمت :- انجمن!!!
انجمن آرا :- کیا میں لالچی ہوں - فاقہ زدہ ہوں چٹوری ہوں جل ککڑی ہوں - جھاڑ کا کانٹا ہوں ---- پیر جلی بلی ہوں ----
حشمت :- نہیں نہیں - میری ....
انجمن آرا :- کیا میں فضول خرچ ہوں - کیا میں بسورتی صورت ہوں - کیا میری آنکھیں چُندی ہیں - کیا میرے بال گر رہے ہیں - کیا میں گنجی ہو رہی ہوں -
حشمت :- نہیں نہیں - خدانخوا.....
انجمن آرا :- کیا میں ہر وقت دردِ سر میں مبتلا رہتی ہوں - کیا مجھے ہر وقت حرارت رہتی ہے - کیا مجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا - کیا مجھے نزلے کی شکایت ....
حشمت :- آچھیں ں ں!!
انجمن آرا :- کیا مجھ میں اس قسم کا کوئی بھی عیب ہے؟
حشمت :- ہرگز نہیں -
انجمن :- کیوں لیاقت ---- ہے؟؟
لیاقت :- بالکل نہیں ----
انجمن :- تو پھر کیوں وہ مجھ پر یہ سارے الزام لگاتے ہیں ----
حشمت :- بالکل بہتان ہے -
لیاقت :- سراسر جھوٹ ہے -
انجمن :- پھر کیا میں اُن کی خدمت نہیں کرتی؟ کیا میں اُنکی ٹائی نہیں باندھتی - کیا اُن کے قلم میں سیاہی نہیں بھرتی - کیا اُن کے بدبودار رومالوں پر اپنی سینٹ کی شیشیاں کی شیشیاں نہیں اُنڈیل دیتی؟
حشمت :- کیوں نہیں!
انجمن :- کیوں لیاقت؟
لیاقت :- بیشک!!
انجمن :- تو پھر اس سوال کا جواب دیجئے کہ وہ کیوں میرے ساتھ بری طرح پیش آتے ہیں؟
حشمت :- اُس کا کمینہ پن ہے -
لیاقت :- وحشی صاحب آدمیت سے خارج معلوم ہوتے ہیں -
انجمن :- میں تسلیم کرتی ہوں کہ وہ شاعر ہیں - وہ آسمانوں پر رہتے ہیں - ہواؤں میں اُڑتے ہیں، پرندوں کے ساتھ گاتے ہیں - فرشتے اُن سے باتیں کرتے ہیں مگر خدارا یہ تو بتاؤ کہ کیا وہ سرے سے آدمی ہی نہیں رہے - کیا اُنہیں بیوی کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیئے -
حشمت :- آچھیں ں ں!!
لیاقت :- مگر میں سمجھتی ہوں کہ انجمن - اس میں تمہارا قصور بھی ہے تم شاید شادی کی زندگی کو نعمت خیال کرتی ہو ....
انجمن :- یہ کون گدھا کہتا ہے میں تو اسے مصیبت کی انتہا

سمجھتی ہوں۔ رومان کو اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اماں جان سے پوچھو، میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں شادی کی زندگی کو سخت ترین قید سمجھتی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اس سے زیادہ خشک، اور اُداس چیز اور کوئی نہیں۔ مگر یہ تو میں نے اب جانا کہ یہ کمبخت حد سے زیادہ ناقابل برداشت بھی ہے ——— (لیاقت جلدی جلدی اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھتی ہے)

حشمت :- یہ کیا لکھ رہی ہو لیاقت۔

لیاقت :- اپنی کتاب "شادی کی اُونچ نیچ" میں محترمہ انجمن آرا کا نظریہ درج کیا ہے۔

انجمن :- اوہ! تمہاری منحوس کتاب ——— بھاڑ میں جائے۔

حشمت :- لیکن انجمن۔ آخر بات کیا ہے ———

انجمن :- اماں جان! یقین جانئے میں ہر طرح برداشت کرتی رہی، مگر اب حد ہو چکی۔ میں نے آج تک کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ ہمیشہ اُن کے دوستوں کو عمدہ چائے پلائی، کبھی اُن کے سامنے گانے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کی ذلیل نظموں کو ہزاروں مرتبہ صبر کے ساتھ سُنا۔ لمبی چوڑی داد دی مگر پھر بھی ———

لیاقت :- ہمیں افسوس ہے کہ وحشی صاحب نے اتنے کمینہ پن کا اظہار کیا لیکن آخر یہ تو بتاؤ کہ وہ تازہ واردات کیا ہے؟

حشمت :- ہاں لڑائی کس بات پر ———

انجمن :- کیا کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ خوبصورت ہیں؟

لیاقت :- ہرگز نہیں ———

انجمن :- (جل کر) خیر۔ مجھے تمہاری رائے کی ضرورت نہیں ——— اماں جان آپ بتایئے کیا وہ کسی طرح بھی آدمی کہلائے جا سکتے ہیں۔

حشمت :- (بے چارگی کے عالم میں) ہاں ——— نہیں ——— مگر خیر۔

انجمن :- تو پھر بتایئے کہ وہ کیا ہیں؟

حشمت :- کیا ہیں؟ واقعی غور طلب سوال ہے ——— مگر میرا خیال ہے کہ انجمن، اگر تو صاف صاف بتادے کہ آخر لڑائی کس بات پر ہوئی تو شاید میں کچھ کر سکوں۔

انجمن :- کوئی کچھ نہیں کر سکتا سوائے وکیل کے۔

حشمت :- تو کیا سچ مُچ تو وکیل کے پاس گئی تھی۔

انجمن :- نہیں کل صبح جاؤنگی ——— لیکن فیصلہ تو ہو ہی چکا کہ میں اس جنجال سے اپنا پنڈ چھڑا کر رہونگی۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ انجمن آرا رسیور اُٹھاتی ہے)

ہلو ——— ہاں۔ ہاں۔ نہیں۔ میں آج شام کو نہیں مل سکتی ——— مفصل پھر بتاؤنگی۔ کل ——— خدا حافظ۔

حشمت :- لیکن لڑکی تو نے اسکے انجام پر بھی غور کیا؟

انجمن :- انجام کیا۔ میں آپکے ہاں آکر رہونگی۔

حشمت :- (پریشان ہو کر) ہاں۔ ار۔ ار۔ ضرور۔ بڑی خوشی سے، مگر تم جانتی ہو کہ تمہارے والے کمرے میں اب لڑکے پڑھتے ہیں۔ مجھے ان کا کہیں اور انتظام کرنا پڑیگا ——— اور پھر بُوا فہمن تو سخت ناراض ہونگی۔

انجمن :- اوہ! سب ٹھیک ہو جائیگا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔

حشمت :- مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آخر ہوا کیا۔

انجمن :- ہوا یہ کہ ——— (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے انجمن ٹیلیفون اُٹھاتی ہے) ہاں۔ ہاں۔ نہیں۔ یہ امپیریل بکڈپو نہیں ہے ——— معاف کیجئے (رسیور زور سے رکھدیتی ہے۔

(وحشی، طویل القامت بابونما انسان داخل ہوتا ہے)

وحشی :- او ہو۔ آداب عرض ہے اماں جان۔

لیاقت :- آداب عرض وحشی صاحب

وحشی :- تم بھی ہو لیاقت۔ وعلیکم السلام

انجمن :- (تیزی سے) میرے کمرے میں چلئے اماں جان۔

(حشمت آرا اور انجمن آرا بائیں طرف کے دروازے سے جاتی ہیں)

وحشی :- سناؤ لیاقت۔ کیا حال چال ہیں۔

لیاقت :- پھر وہی مصیبت!!

وحشی :- پھر!! - پھر سے کیا مطلب ہے۔ ہم دونوں علیحدہ ہونا چاہتے ہیں بس۔ پھر کیا؟؟

لیاقت :- آخر کس وجہ سے؟

وحشی :- (ٹیلیفون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس وجہ سے!

لیاقت :- کیا؟؟

وحشی :- ٹیلیفون!!

لیاقت :- کیا واقعی؟

وحشی :- دیکھو لیاقت میں بنتا نہیں ہوں مگر کیا تمہیں مجھ پر کچھ شبہ ہے کہ میں شاعر ہوں۔

لیاقت :- میں مانتی ہوں کہ آپ شاعر ہیں۔

وحشی :- ثبوت کیلئے یہ دیکھ لو کہ ملک کے مقتدر رسالوں میں میری نظمیں چھپتی رہتی ہیں۔ ابھی "دورِ جدید" میں میری ایک نظم "چشمے کا ترانہ" آب و تاب سے شائع ہوئی، تم نے بھی دیکھی ہوگی۔

لیاقت :- ہاں۔ ہاں مگر......

وحشی :- اسکے علاوہ یہ بھی جان لو کہ میں نے تھوڑے بہت قدردان بھی پیدا کر لئے ہیں —— یہ دیکھو بالکل اجنبی لوگ ایسے ایسے خط مجھے لکھتے ہیں (خط جیب سے نکال کر پڑھتا ہے)

"مکرمی۔ تسلیم۔ میں نے آپکا مجموعہ نظم
دیکھا، واللہ آپ نے ہندوستان کی لاج
رکھ لی، آپ کا تخیل۔ بندشِ الفاظ، زورِ
بیان، روانی، تسلسل۔ محاورات کا استعمال
چست قافیئے......"

لیاقت :- ہاں ہاں میں سمجھ گئی۔

وحشی :- غرض اب تم دیکھ لو کہ میں نے خاصی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اب ذرا تم ہی انصاف سے کہو کہ اگر میں لکھتے وقت اپنے کمرے میں سکون اور خاموشی چاہوں تو کیا گناہ ہے —— اب یہ منحوس ٹیلیفون (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) —— دیکھا تم نے —— (ٹیلیفون اٹھاتے ہوئے) ہاں، ہاں، یہی نمبر ۲۶۲۷ ہے، نہیں یہ بسکٹ کمپنی نہیں ہے (رسیور رکھ دیتا ہے) دن بھر یہی ہوتا رہتا ہے۔

لیاقت :- ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں رکھوا دیتے آپ اسے؟

وحشی :- انجم کہتی ہیں ڈرائنگ روم میں ٹیلیفون بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ میرا ہی کمرہ موزوں ترین جگہ ہے —— چنانچہ یہاں میں بیٹھتا ہوں اور یہیں وہ منحوس رکھا رہتا ہے، صبح سے شام تک ٹن ٹن ٹن ٹن!!

لیاقت :- کیا آپکو ٹیلیفون کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی؟

وحشی :- بالکل نہیں۔ میں قسم کھا سکتا ہوں جو میں نے کبھی کبھی اپنے لئے اسے ہاتھ لگایا ہو۔ انجم کے ہزاروں دوست ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی صاحب یا صاحبہ ٹیلیفون کرتی ہیں، کیسی طبیعت ہے کیا کر رہی ہو۔ آجاؤ۔ چار ہمارے ہاں پیو۔ سینما چلو، سرکس دیکھو وغیرہ وغیرہ —— مجھے اٹھنا پڑتا ہے اور انجم کو اطلاع دینی پڑتی ہے۔ وہ آتی ہیں۔ باتیں کرتی ہیں۔ کھلکھلا کر ہنستی ہیں اور میں اپنی قسمت پر آنسو بہاتا ہوں......

لیاقت :- تو آپ اسے بند کیوں نہیں کروا دیتے۔

وحشی :- ارے یہی تو رونا ہے روز اسی بات پر لڑائی ہوتی ہے۔ چھ مہینے سے یہی ہماری زندگی ہے — ہائے۔ ہائے تم نہیں جانتیں لیاقت —— مگر دیکھو میرا کہا مانو —— کبھی شادی نہ کرنا۔ شادی عذاب ہے۔ خدا کا قہر ہے۔ انسان کی انفرادیت کو تباہ کر دیتی ہے

لیاقت :۔ (جلدی جلدی لکھتے ہوئے) اور ——— اور ———

وحشی :۔ یہ کیا کر رہی ہو؟

لیاقت :۔ اپنی کتاب "شادی کی اُونچ نیچ" میں آپکی رائے لکھ رہی ہوں۔

وحشی :۔ کیا ابھی تک یہ کتاب شائع نہیں کی؟

لیاقت :۔ نہیں ابھی پوری نہیں ہوئی۔

وحشی :۔ لیکن مسالہ تو کافی فراہم ہو گیا ہوگا۔

لیاقت :۔ ہاں ہاں مگر ابھی "اونچ" کا حصہ ذرا کمزور ہے۔ "نیچ" کیلئے تو کافی مواد ہاتھ لگ چکا ہے۔

وحشی :۔ خیر ——— کیا بتاؤں لیاقت بعض دفعہ تو ایسا دم بولاتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنا گلا گھونٹ ڈالوں۔ چند سکنڈ کا بھی سکون مجھے میسر نہیں ——— کیسا کیسا میں تڑپتا ہوں ایک چھوٹے سے پُرسکون جھونپڑے کیلئے جو کسی سنسان جنگل میں ——— (ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجتی ہے) اوہ! دم غضب میں ہے۔ کون ہے۔ بولو۔ ہاں۔ بولتے کیوں نہیں ——— جواب کیوں نہیں دیتے ——— بول چکو ——— ہٹ تیری کی ——— (زور سے رسیور پٹختا ہے) دیکھا تم نے؟ کیا میں نے جھوٹ کہا تھا ——— لیاقت سچ سچ بتاؤ۔ کیا میں خبطی ہوں۔ کیا میں پاگل ہوں۔ کیا میں اپنے حواس کھو چکا ہوں؟

لیاقت :۔ نہیں نہیں!

وحشی :۔ نہیں۔ میں پاگل ہوں۔ لیاقت سچ مچ میرے حواس بجا نہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں نے انجم کو خوش رکھنے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔ اُنکے ہر حکم کو بتسلیم بجا لایا ——— ہر کام اُن کی مرضی کے موافق ہوتا تھا۔ میرا کمرہ تک ان ہی کے مذاق کے مطابق سجایا گیا ——— میں اس میز کو کھڑکی کے قریب رکھنا چاہتا تھا تاکہ ذرا ہوا آتی رہے۔ مگر انجم یہاں بیچ میں رکھنا چاہتی تھیں میں سبز رنگ کے پردے چاہتا تھا۔ وہ آسمانی رنگ کے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ صوفہ اُدھر ہو مگر نہیں حکم ہوا کہ یہیں ہونا چاہیئے چنانچہ ہے۔ مجھے گلدستہ والے کشن ایک آنکھ نہیں بھاتے مگر۔ یہ دیکھو۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں ایک ٹیبل فین رکھا رہے مگر اُن کا حکم نہیں ہوا اسلئے اب میں پسینے میں نہاتا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ مجھے اِس ستیاناسی کی چنگھاڑوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے ———

لیاقت :۔ یہ تو ٹھیک ہے وحشی صاحب۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود شادی کی کچھ نعمتیں بھی ہیں۔ چند ایسی برکتیں ———

وحشی :۔ برکتیں!! میں ہرگز نہیں مان سکتا۔

لیاقت :۔ سُنیئے۔ (اپنی کتاب میں سے پڑھتی ہے) چند "اونچیں" ملاحظہ ہوں۔

(۱) عیش و آرام دُکھ درد کا ایک مستقل ساتھی مل جاتا ہے۔

(۲) مصروفیتیں اس درجہ بڑھ جاتی ہیں کہ فضولیات میں پڑنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

(۳) انسان کو ....

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وحشی جھنجلا کر اُٹھتا ہے)

وحشی :۔ منبرتین۔ انسان کو ٹیلیفون جیسی نعمتِ غیر مترقبہ ملتی ہے ——— جی ——— ہاں۔ میرا ہی نام وحشی ہے ——— اچھا ——— اچھا ——— بیگم رفیق ہیں۔ جی ہاں انجمن یہیں ہیں۔ نہیں وہ ٹیلیفون پر نہیں آ سکتیں ——— جی ہاں۔ ہم جلدی ہی علیحدگی اختیار کر لیں گے ——— اچھا ہوگا نا؟

(زور سے رسیور رکھتا ہے انجمن داخل ہوتی ہے)

انجمن :۔ میرا خیال ہے میں نے ٹیلیفون کی آواز سُنی تھی۔

وحشی :۔ ہرگز نہیں۔

انجمن :۔ لیاقت، کیا ابھی گھنٹی نہیں بجی تھی ———

وحشی :۔ کہاں بجی تھی لیاقت؟

لیاقت :- نہیں، نہیں بجی!

انجمن :- خیر- اب اگر بجے تو مہربانی فرما کر مجھے بُلا لیجئے گا۔ بیگم رفیق ضرور ٹیلیفون پر بُلائیں گی (لیاقت کی طرف گھورتی ہوئی جاتی ہے)

وحشی :- جو حکم ـــــ معلوم ہوتا ہے انجم نے سب سے کہدیا۔ کتنی ذلیل بات ہے۔ میاں بیوی کے جھگڑے غیروں تک پہونچیں۔ میں نے سوائے ناز صاحب۔ مجنوں صاحب اور بیہوش صاحب کے کسی سے ذکر نہیں کیا .... (حشمت داخل ہوتی ہے)

حشمت :- میاں وحشی! کیا تم کسی طرح بھی مصالحت پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔

وحشی :- نہیں اماں جان۔ جب تک کہ یہ ٹیلیفون یہاں سے نہ ہٹایا جائے میں کسی قسم کی گفتگو نہیں کرونگا۔

حشمت :- اس کو تو انجمن کبھی منظور نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں وہ کہتی ہے کہ چونکہ بہت سے لوگوں کو وہ بتا چکی ہے۔ اس لئے اب کسی طرح بھی اس ارادے سے باز نہیں رہ سکتی۔ لوگ لے سے جھوٹا ـــــ آچھیں ں ں ں!!

وحشی :- لیاقت تم ہی کچھ سوچو۔ کوئی عمدہ تدبیر نکالو۔

لیاقت :- آہ! تدبیر ....

حشمت :- اللہ! کیسا زمانہ آگیا مجھے تو یہ خیال کھائے جاتا ہے کہ بُوا فہیمن کیا کیا نہ کہیں گی ـــــ جاؤں پھر اُس فندن سے مغز ماروں (جاتی ہے)

(چند سیکنڈ خاموشی)

لیاقت :- وحشی صاحب ایک ترکیب ہے۔

وحشی :- خدا تمہاری عمر میں برکت دے۔ بتاؤ جلدی کیا تدبیر ہے۔

لیاقت :- آپ جانتے ہیں کہ انجمن میں حسد کا مادہ بہت ہے۔

وحشی :- ہاں ہاں لیکن مگر ـــــ تمہارا مطلب؟

لیاقت :- دیکھئے تدبیر یہ ہے۔ شاید نمبر نشانے پر بیٹھے۔ آپ اس کمرے کے فرنیچر کو اپنی مرضی کے مطابق لگا لیجئے ـــــ

وحشی :- پھر اس سے فائدہ؟

لیاقت :- فائدہ یہ کہ انجمن یہ دیکھکر جل ہی تو جائیگی اور ممکن ہے وہ دوبارہ اسے اپنی مرضی کے مطابق آراستہ کرنے کیلئے ٹھیر جائے۔

وحشی :- ہوں! شاید۔

لیاقت :- تو پھر جلدی کیجئے ـــــ آئیے ـــــ

(دونوں فرنیچر کی الٹ پلٹ میں تن دہی سے مصروف ہو جاتے ہیں)

وحشی :- میز یہاں کھڑکی کے پاس رہیگی۔ ٹھیک ہے نا۔

لیاقت :- اور اس ٹیلیفون کو یہاں رکھیئے بند کر کے۔ وہ اگر پوچھے تو کہدیجئیگا کہ اب ہمیشہ کیلئے یہ یہیں رہیگا۔

وحشی :- انجم کیا کر رہی ہیں؟

لیاقت :- اُس نے کہا تھا کہ میں اُس وقت تک اس کمرے میں نہیں آؤنگی جب تک آپ چلے نہ جائیں گے۔

وحشی :- یہ صوفہ یہاں رہیگا۔

لیاقت :- آئینہ کا یہاں کیا تُک ہے؟

وحشی :- پھینکو اسے۔ اور یہ چپل ـــــ یہ موزے ـــــ چھتری سب انجم کے کمرے میں پھینک آؤ۔

لیاقت :- یہ تصویریں بھی مینٹل پیس پر نہیں رہنی چاہئیں۔

وحشی :- اگر انجم جانتیں کہ شاعر کیسے کہتے ہیں۔ لیاقت، کیا میں نے تمہیں اپنی نئی غزل نہیں سُنائی ـــــ

حشمت :- (داخل ہو کر) آچھیں ں ں ں!!

لیاقت :- بس اب ٹھیک ہو گیا۔ خالہ جان۔ اب چلئے انجمن آرا جیسے ہی اس کمرے میں آجائے ہم چلدیں گے ـــــ

حشمت :- مگر ـــــ

لیاقت :- آپ مانیئے تو میں نے تدبیر بڑی اچھی سوچی ہے

حشمت :- سچ !! ؟

لیاقت :- (انجمن کو آواز دیتی ہے) انجمن !! اب ہم جا رہی ہیں

انجمن :- (داخل ہوتے ہوئے) اوہو ـــ یہ کیا ـــ ؟؟

لیاقت :- وحشی صاحب نے اس کمرے کو اپنی مرضی کے مطابق ٹھیک کیا ہے۔

وحشی :- اب یہ کمرہ ایسا ہی رہیگا۔

انجمن :- ٹھیک ہے تو اس کا مطلب ہے آپ مجھے جلد سے جلد یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔

وحشی :- میں مطلب وطلب کچھ نہیں جانتا، میرا گھر ہے چاہے جس طرح رکھوں۔

انجمن :- خیر۔ مجھے کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاعر لوگ اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ مگر ـــــ

وحشی :- مذاق !! تم کیا جانو مذاق کسے کہتے ہیں ـــ تم تو یہ بھی نہیں جانتیں کہ شاعر کہتے کسے ہیں۔

انجمن :- میں اس داستان کو ہزاروں مرتبہ سن چکی ہوں۔

حشمت :- آچھیں ں ں !!

وحشی :- جب وہ منحوس ٹیلیفون یہاں نہ ہوگا تو میں کیسے سکون کیساتھ ......

انجمن :- ٹیلیفون !! اوہ خوب یاد آیا مجھے بیگم رفیق کو ٹیلیفون کرنا ہے ـــ ارے۔ کہاں گیا ؟

وحشی :- جہنم میں۔ اب وہ ہمیشہ کیلئے اس الماری میں بند رہیگا۔

انجمن :- خیر کوئی مضائقہ نہیں ـــ مجھے کیا ـــ میں جا رہی ہوں ـــ میں جاتی ہوں ـــ ابھی (کھٹ پٹ کرتی ہوئی اپنے کمرے میں جاتی ہے)

حشمت :- آہ ! ـــ !!

لیاقت :- چلئے خالہ جان !

انجمن کی آواز :- میرا خیال تھا کہ آپ پشیمانی کا اظہار کر کے مجھے مجبور کر دینگے کہ میں اپنے ارادہ سے باز رہوں۔ میں خود بھی چاہتی تھی کہ بات زیادہ نہ بڑھے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ آپ تو میرے جلنے سے خوش ہیں۔ اتنے خوش کہ کمرے کو کباڑیے کی دکان بنا رہے ہیں اور خود ایک کمینے پیشہ ور کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ـــ تو پھر مجھے کیا ضرورت۔ میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ خوشامد کروں ـــ میری چھتری کہاں ہے (بکسوں اور ٹرنکوں کی کھڑ بڑ کی آوازیں آتی ہیں) میں ایک منٹ کو بھی اس ناپاک گھر میں نہیں رہنا چاہتی ـــ شاعر بنے پھرتے ہیں صاحب ـــ تمیز نہیں ـــ میرا ہی دم تھا کہ اتنے دن ساتھ گذار دیئے اور کوئی سی ہوتی تو ....

وحشی :- خدا کے واسطے چپ رہو۔ میں اس بکواس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

حشمت :- ہائے رے میرا دل ـــ لیاقی ـــ

لیاقت :- اوہو خالہ جان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ وہ ایسی باتیں نہیں سن سکتیں۔ ہم جاتے ہیں وحشی صاحب۔ خدا حافظ۔

انجمن کی آواز :- خوب پھل پایا، میں نے شادی کر کے۔ اگر یہ خبر ہوتی کہ ایک وحشی شاعر کے پالے پڑوں گی تو ـــ

وحشی :- خدا حافظ لیاقت ـــ کیوں اماں جان کیسی طبیعت ہے ؟

حشمت :- بیٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے غش آنے والا ہے ـــ چل بچی ـــ خدا تمہیں نیکی کی ہدایت دے۔

لیاقت :- میں پھر آؤنگی وحشی صاحب ـــ آداب۔

(دونوں جاتی ہیں۔ وحشی چپ چاپ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک منٹ تک مستقل خاموشی رہتی ہے۔ انجمن نئی ساری باندھے۔ چھتری ہاتھ میں لئے آہستگی سے داخل ہوتی ہے)

انجمن :۔(نرم لہجے میں) اوہ! آپ بالکل اکیلی ہیں۔ وہ لوگ کہاں گئے۔

وحشی :۔ گئے۔

انجمن :۔ گئے!! انہیں کم ازکم میرا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔

وحشی :۔ انجم! کیا تم اپنا ارادہ نہیں بدلوگی۔

انجمن :۔ کس شرط پر؟ بتائیے؟؟

وحشی :۔ ٹیلیفون ڈرائنگ روم میں رکھا جائیگا۔

انجمن :۔ ہرگز نہیں!

وحشی :۔ خیر۔ کوئی مضائقہ نہیں (صوفے پر دراز ہوکر آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ انجمن دروازے تک جاتی ہے۔ دروازے کے باہر اپنی چپل دیکھ کر اُسے اُٹھاتی ہے۔ زور سے دروازہ بند کرتی ہے اور اپنی چپل کو چپ چاپ الماری کی دراز میں رکھتی ہے، چاروں طرف متوحش نظروں سے دیکھتی ہے۔ پھر وحشی کے قریب آتی ہے)

انجمن :۔ (نہایت میٹھے لہجے میں) خدا حافظ، وحشی صاحب!!

وحشی :۔ (چونک کر) اوہ! میں سمجھا تھا تم چلی گئیں۔ خدا حافظ۔

انجمن :۔ خدا حافظ (چند سیکنڈ کی خاموشی) یہ لوگ کدھر گئے ہیں؟

وحشی :۔ اماں جان بے ہوش ہونا چاہتی ہیں، لیاقت اُنہیں گھر لے گئی ہیں۔

انجمن :۔ لیاقت سے زیادہ دخل درمعقولات کرنے والا میں نے کسی کو نہ دیکھا۔

وحشی :۔ کیا اس لئے کہ وہ اماں جان کو گھر لے گئی ہیں؟

انجمن :۔ آپ غور کیجئے۔ اس لڑائی کا بیج کس نے بویا ـــــ اُسی فتنہ پرداز لیاقت آراء نے۔

وحشی :۔ کیا واقعی؟

انجمن :۔ اور کیا ـــ اُسے لڑائی ڈلوانے میں مزہ آتا ہے ـــــ جب یہ لوگ صبح کو آئے تھے تو میں سچ کہتی ہوں۔ میرا لڑنے کا ذرا بھی ارادہ نہیں تھا مگر اُسی سیہ کا کانٹا لیاقت نے آگ لگائی۔

وحشی :۔ آخر کیا کہا؟

انجمن :۔ ارے ایک سے ایک بات، کہنے لگی تمہارے میاں کیا جانے لکھنا، اِدھر اُدھر کے شعر چرا لیتے ہیں۔

وحشی :۔ (غضبناک ہوکر) بڑی نامعقول ہے وہ۔ میں مزہ چکھادونگا۔

انجمن :۔ اور کہنے لگی کہ تمہارے میاں ذرا بھی خوبصورت نہیں ـــ بہن یہ تمہارا ہی دم ہے جو اُن سے محبت کرتی ہو۔

وحشی :۔ انجم، تمہارا شکریہ ـــ تم واقعی بہت نیک ہو۔ میں کہتا ہوں کہ آخر یہ لوگ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے ـــــ اور اماں جان بھی ایسی ہی ہیں۔

انجمن :۔ اماں جان نے کیا کہا؟

وحشی :۔ کہنے لگیں کہ جب تم لوگ پیار محبت سے نہیں رہ سکتے، تو شادی ہی کیوں کرتے ہو۔

انجمن :۔ ضرور ـــ اُنہوں نے ضرور یہی کہا ہوگا۔

وحشی :۔ اور کہنے لگیں کہ انجمن تو شروع ہی سے ایسی لڑاکا ہے، چنچل کہیں کی۔

انجمن :۔ پھر آپ نے کیا کہا۔

وحشی :۔ میں نے کہا نہیں اماں جان! قصور تو میرا تھا ـــــ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ہمارے معاملوں میں دخل نہ دیں۔ تو ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

انجمن :۔ واقعی۔ مگر یہ لوگ ہمیں خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتے ـــ دیکھ لیجئے نا۔ لیاقت نے آتے ہی لڑائی ڈلوادی۔

وحشی :۔ ہاں۔ مجھے بھی یاد آیا۔ سامان کو اُلٹ پلٹ کرنیکی صلاح بھی مجھے لیاقت ہی نے دی تھی۔

انجمن :۔ میرا پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ اُسی کی شرارت ہے۔

وحشی :۔ میں نے اسکی خوشامد کی۔ اس سے التجا کی کہ ایسا نہ کرو مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ میں نے کہا کہ انجم اُس سے بہت ناراض ہونگی مگر وہ بھلا کیا مانتی تھی۔ خود ہی اُٹھ کر چیزوں کو تتر بتر کرنا شروع کردیا۔

انجمن :۔میں کہتی ہوں اُسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ اسباب کا کیا ہو؟ ذرا سی دیر میں پھر اُسیطرح رکھا جا سکتا ہے ۔

وحشی :۔ ہاں ۔ اور کیا ۔

انجمن :۔(اُٹھتے ہوئے) مثلاً یہ تصویریں پھر منٹل پیس پر رکھی جا سکتی ہیں ۔

وحشی :۔(اُسکی مدد کرتے ہوئے) ضرور!

انجمن :۔ اور یہ صوفہ ذرا سے اشارہ سے پھر یہاں آ سکتا ہے ۔

وحشی :۔کیوں نہیں (صوفے کو گھسیٹ کر پہلی جگہ رکھتا ہے)

انجمن :۔ اور یہ میز (دونوں میز پکڑوا کر پھر کمرے کے بیچ میں رکھدیتے ہیں) گو میں یہاں نہیں رہونگی ۔لیکن اس خیال سے ذرا سی خوشی حاصل ہوگی کہ آپ نے کمرے کی چیزیں اُسی طرح رہنے دی ہیں ۔

وحشی :۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کمرے کو اسیطرح رہنے دونگا

انجمن :۔ آپ کا شکریہ ۔فی الحقیقت ہم دونوں ایسے بُرے نہیں ہیں یہی لوگ آکر ہمیں لڑوا دیتے ہیں

وحشی :۔ ہاں ان لوگوں کو ذرا بھی تمیز نہیں ———

انجمن :۔ اور یہ چپل یہاں رکھدینی چاہیئے تاکہ ہمیشہ آپکی نظر کے سامنے رہے ۔ اور آپکے دل میں میری یاد تازہ رہے ۔

(وحشی ادب کے ساتھ چپل کو سامنے کی کھڑکی کی سل پر رکھتا ہے)

انجمن :۔خواہ مخواہ لیاقت نے بات بڑھوائی ۔ میں نے سب سے ذکر کر دیا

وحشی :۔ ہاں ، ناحق بات بڑھی ۔ اور پھر مزا یہ کہ یہ لوگ پھر بھی الگ کے الگ ہیں ۔ انہیں ہمارے دُکھ سکھ سے غرض ہی کیا ؟

انجمن :۔یہی تو رونا ہے "ہمیں جنگی ڈال جمالو الگ کھڑی" (کشن صوفے پر سلیقے کیساتھ رکھکر) میرا خیال ہے کہ اب سب ٹھیک ہوگیا ، وعدہ کیجیے کہ آپ اس کمرے کو جوں کا توں رہنے دینگے ۔

وحشی :۔میں وعدہ کرتا ہوں ۔ پیاری انجم ——

انجمن :۔آپ کا بہت سا شکریہ ——— آج کتنی زبردست ٹریجیڈی ہوئی سب کو رنج ہوگا سوائے لیاقت اور اماں جان کے ۔ یہ لوگ تو دل ہی دل میں خوش ہونگے ——— دوسروں کو تباہ حال دیکھکر بہت خوش ہوتے ہیں ——— اگر آپ اجازت دیں تو میں ٹیلیفون بھی نکال کر رکھدوں (الماری میں سے ٹیلیفون نکال کر رکھتے ہوئے) کم از کم تین روز تک تو اسے یہیں رہنے دیجئیگا ۔ میری یاد میں ۔

وحشی :۔ (ٹیلیفون کو چُومکر) ضرور پیاری انجم ——— انجم ایک بات کہوں ۔ ہم آخر ان لوگوں کو ہنسنے کا موقع دیں ہی کیوں؟

انجمن :۔ ہاں واقعی — آخر کیوں ہمارا دل جلا کر ہمیں تباہ کر کے خوش ہوں ۔ یہ لوگ ہرگز خوش ہونیکے لائق نہیں ہیں ۔

وحشی :۔تم بہت اچھی لڑکی ہو انجم ——— آؤ ملاپ کر لیں ۔

(انجمن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے)

انجمن :۔(خود بخود وحشی کی طرف کھنچتے ہوئے) کیا مضائقہ ہے ۔ ان دونوں کو اسی طرح سزا دیجا سکتی ہے ۔

وحشی :۔ ——— انجم پیاری ——— دُنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جُدا نہیں کر سکتی ۔

انجمن :۔یقیناً !!

(دونوں گرمجوشی سے بغلگیر ہوتے ہیں ۔
ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجتی ہے ۔)

وحشی :۔(تڑپ کر) اُف ——— یہ منحوس پھر !!!

انجمن :۔ (نرمی سے) میں اسے کل ہی ڈرائنگ رُوم میں رکھوا دونگی ضرور +

سید انصار ناصری بی، اے، دھلوی

شامت

نسیم کو بھی آئے دن نت نئی سوجھتی تھی۔ ایک سے ایک انوکھی شرارت دماغ سے اُتارتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ خالی بیٹھے بیٹھے نسیم کے دل میں گُدگُدی سی ہونے لگی۔ جی چاہا کہ کچھ شرارت کرنی چاہیئے۔ بہت دن ہو گئے کوئی ہنسنے ہنسانے کی بات نہیں ہوئی۔ منظور اُس کی شرارت میں شریک ہوا کرتا تھا۔ معاً اُس کا خیال نسیم کو آ گیا۔ چھٹی کا دن تھا جھٹ اُس کے گھر کا رُخ کیا۔ پہونچ کر اطلاع کرائی۔ گھر پہ اور کوئی نہیں تھا۔ منظور نے اندر ہی بُلا لیا۔

نسیم نے کہا "بھئی بہت دنوں سے کوئی دلچسپ بات نہیں ہوئی۔ دل افسردہ ہو رہا ہے۔ کچھ سوچو، کچھ کرو۔ ورنہ یوں بیکار پڑے پڑے تو زنگ لگ جائے گا"

منظور بولا "تم ہی کچھ سوچو نا۔ یہاں تو دماغ کچھ اس قدر ماؤف ہو گیا ہے کہ کوئی نئی بات سُوجھتی ہی نہیں۔ اس بدرنگ زندگی سے طبیعت اُکتا گئی۔ دل اُلٹا چلا آتا ہے"

پھر دونوں نے سر جوڑ کے خوب مشورے کئے۔ سینکڑوں ہی تجویزیں ہو گئیں مگر جچی ایک بھی نہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نکل آئی۔ آخر سوچتے سوچتے ایک بات نسیم کے ذہن میں آئی اور منظور نے بھی اُس پر فوراً صاد کر دیا۔ وہ یہ کہ آغا کو بیوقوف بنایا جائے اور اُن کی بدحواسی سے لُطف اُٹھایا جائے۔ آغا بہت دُون کی لیتے تھے۔ اُنہیں نیچا دکھانا چاہیئے۔ آغا تھے تو پرلے درجے کے سادہ لوح مگر سمجھتے تھے اپنے آپ کو بہت عقلمند اور نہایت تجربہ کار۔ بس اُن کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی ٹھہری۔ پلاٹ تیار کیا گیا اور بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ کسی عورت کی طرف سے آغا کو ایک محبت نامہ لکھا جائے اور کسی تنہائی کے مقام پر اُنہیں بُلا کر اُن کی ہنسی اُڑائی جائے۔ نسیم اور منظور دونوں بہت خوش تھے کہ آغا کا مُغالطہ دُور کرنے کی یہ تدبیر خوب سُوجھی۔

اب پہلا کام یہ تھا کہ خط لکھا جائے، چنانچہ دونوں کے صلاح مشورے سے یہ خط لکھا گیا:۔

میری گستاخی معاف۔ تمہاری محبّت نے مجھے بیباک کر دیا۔ کیسا سجیلا، کیسا بانکا جوان! میرا اس میں کیا قصور؟ تم اِس قدر حسین کیوں ہو؟ پرسوں شام کو مغرب کے بعد ہی کوٹلہ میں لاٹ کے پاس سیاہ بُرقعہ میں تمہاری منتظر ہونگی، حالِ دل رو رو کر زبانی کہونگی۔ لکھ نہیں سکتی، دل کی دھڑکن ہاتھ میں آ گئی۔ آہ ــــ! تم میری زندگی کو موت اور موت کو زندگی بنا سکتے ہو۔

ظاہر ہے کہ اس خط میں جو کچھ لکھا تھا اُس کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں تھا۔ جہاں تک آغا کے حُسن کا تعلق ہے وہ اس سعادت سے یکسر محروم تھے۔ مگر سب محبّت ناموں میں ایسی ہی بے سر و پا باتیں ہوا کرتی ہیں چنانچہ اس میں بھی اِنکا ہونا ضروری تھا۔

خط لکھکر نسیم نے اپنے کوٹ کی اندر کی جیب میں رکھا اور منظور سے رخصت ہو کر اپنے گھر پہونچا۔ چند مہمان آ گئے تھے، اُن سے شام تک فرصت نہ ملی۔ پھر مُنہ ہاتھ دھو کپڑے پہن آغا کے گھر چلنے کو تیار ہوا۔ خط جس جیب میں رکھا تھا وہ خالی تھی گھبرا کر دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا تو ملا۔ نکال کر پہلے تو اُسے عطر میں خوب بسایا۔ پھر ایک لفافے میں بند کر کے آغا کا نام پتہ لکھا، اور آغا کا

کے گھر پہونچ کر آواز دی۔ اندر جا کر آ کا کو پوچھا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ خط نسیم کے ہاتھ ہی میں تھا۔ بھابی کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا "بھابی ڈیوڑھی میں یہ خط کیسا پڑا ہے؟" بھابی نے خط لے کر اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور بولیں "اُن کے نام کا ہے"۔ نسیم اُن کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ غصّہ کی ایک ہلکی سی لپٹ سے اُن کا چہرہ سُرخ ہوا مگر ایک ہی لمحہ بعد جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ بولیں "بیٹھو"۔ نسیم نے کہا "پھر تھوڑی دیر میں آؤنگا۔ آ کا سے کچھ کام ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اُلٹے قدموں لوٹ آیا اور راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ بھابی نے تو کہیں کچھ تاڑ نہیں لیا؟ پھر خیال آیا کہ اگر تاڑ لیا ہوگا تو رات کو جب دوبارہ آنا ہوگا تو معلوم ہو ہی جائے گا۔

دو گھنٹے اِدھر اُدھر ٹہل کر گذارے اور پھر آ کا کے گھر کا رُخ کیا۔ وہ گھر پر موجود تھے مگر یہ دیکھ کر نسیم کے کان کھڑے ہوئے کہ اُس کی بیوی بھی وہاں موجود تھی۔ اور بھابی سے خوب گھُل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ نسیم کو دیکھتے ہی بھابی بولیں "میں نے بُلوایا ہے اِنہیں۔ بہت دن سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا"۔ نسیم دل میں کچھ کھٹک تو چُکا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ بیوی کا یہاں آنا خالی از علّت نہیں۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے، مگر مُنہ سے بھلا کیا کہہ سکتا تھا؛ معذرت کے رسمی الفاظ کہہ کر آ کا کے کمرے کی طرف چلا۔ نسیم کی آواز سُنکر وہ دروازے میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "ارے بھئی نسیم۔ آج کدھر راستہ بھُول گئے؟ میں تو تمہاری راہ ہی تک رہا تھا۔ آؤ اندر آؤ"۔ یہ کہہ کر نسیم کو کمرے میں لے گئے اور بولے "میاں نسیم تم خوب آئے بھئی۔ تمہیں تو ایک بڑی عجیب چیز دکھانی ہے"۔ یہ کہہ کر اُٹھے۔ پہلے دروازہ بھیڑا۔ پھر میز کی دراز کھول کر وہی خط نکالا جو نسیم نے لکھا تھا اور نہایت رازدارانہ لہجہ میں بولے "اِسے پڑھو"

نسیم نے اپنا لکھا ہوا خط پھر اُن کے سامنے پڑھا اور اپنے چہرے پر تعجّب و حیرت کے آثار پیدا کر کے کہا "آ کا یہ کیا بھید ہے؟" آ کا کچھ عجیب انداز سے مُسکراتے ہوئے بولے "کیوں دوست! قائل ہو گئے ہو گے اب تو۔ کیوں؟" نسیم بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ کہنے لگا "آ کا میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں"۔ آ کا نے تنک کر کہا "تو بھلا تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگا۔ ہو بھی تو ایسے ننھے سے۔ اماں صاف تو لکھا ہے۔ اور کیا چاہتے ہو؟" نسیم نے پھر خط کی طرف دیکھا اور کہا "کسی اور کے نام کا خط معلوم ہوتا ہے۔ یہ سجیلا اور بانکا جوان ——"

"تو کیا جھُوٹ لکھا ہے؟" آ کا نے نسیم کی بات کاٹ کر آئینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میاں تم نہیں سمجھ سکتے اِن باتوں کو"

نسیم نے کہا "مگر آ کا مجھے تو یہ کسی مرد کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو تو سہی یہ خط۔ عورت کا خط کہیں ایسا ہوتا ہے"۔

"جی بے شک"۔ آ کا نے کچھ بگڑ کر کہا "تو گویا ہماری ساری عمر کا تجربہ کوئی چیز ہی نہیں۔ میاں بچّے ہو ابھی۔ کچھ سیکھو"۔

نسیم نے دل میں سوچا بس اب چُپکا ہو جانا چاہیئے۔ مچھلی نے کانٹا نگل لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھنسا پھنسایا شکار ہاتھ سے نکل جائے — جھٹ دوسرا پہلو اختیار کیا۔

"تو اب آپ کیا کریں گے؟"

آ کا بولے "کرینگے کیا۔ جائیں گے۔ دیکھیں گے کہ آخر وہ کون محترمہ ہیں۔ اور سُنو تم بھی چل سکتے ہو، مگر اس شرط پر کہ دُور

سے کھڑے دیکھتے رہو۔"

نسیم نے ٹالنے کیلئے بات بنائی "پرسوں تو مجھے ایک کام سے باہر جانا ہے اور جو وقت اس خط میں ملنے کا لکھا ہے اُس وقت تک میں واپس نہ آسکونگا۔ اور آغا میں تو پھر کہتا ہوں کہ یہ تو کسی نے تم پر داؤں کیا ہے۔"

یہ سُنکر آغا آپے سے باہر ہی تو ہو گئے۔ عورت کی حُرمت اور نسیم کے اخلاق پر ایک طویل لکچر دے ڈالا۔ نسیم نے بمشکل تمام اُنہیں ٹھنڈا کیا اور اپنا پیچھا چھڑا کر رُخصت ہوا۔ بھابی کو جب سلام کیا تو اُنھوں نے کچھ عجیب طریقے سے کہا "ابھی ابھی تمہاری بیوی بھی ڈولی میں سوار ہوئی ہیں۔ پرسوں شام کو انہیں بھیجدینا۔ میرے ساتھ زنانہ کلب جائیں گی۔"

نسیم "بہت اچھا" کہہ کر جلدی جلدی اپنے گھر آیا۔ دل میں یہ کُریدنی لگی ہوئی تھی کہ بیوی اور بھابی کی کیا گھُٹ رہی تھی۔ بیوی سے جب پوچھا کہ بھابی نے کیوں بلایا تھا تو اُنہوں نے کہا "یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پرسوں زنانہ کلب جانے کو کہہ رہی تھیں۔"

دوسرے دن نسیم نے منظور سے کُل کیفیت بیان کی۔ اپنی عقلمندی اور آغا کی بیوقوفی کی حکایات سُنائیں۔ دونوں اپنے پلاٹ کی کامیابی پر بیحد مسرور ہوئے۔ پھر کل کے وعدہ پر نسیم رُخصت ہوا

اگلے دن پانچ بجے نسیم کی بیوی تو بھابی کے گھر سدھاریں اور نسیم منظور کے گھر۔ راستے بھر نئی نئی ترکیبیں سوچتا رہا۔ گھر پہونچ کر منظور سے کہا کہ اپنی بیوی کا بُرقعہ مانگ لاؤ، یہ کہکر کہ نسیم بھی اپنی بیوی کے لئے ایسا ہی بُرقعہ سِلوانا چاہتا ہے۔ منظور گھر میں جاکر بُرقعہ لے آیا۔ نسیم نے فوراً اُسے پہن کر دیکھا۔ کچھ اُونچا رہا خیال آیا کہ اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ رات کا وقت ہوگا۔ اور یوں بھی آغا اپنی رومان پسندی میں اسدرجہ کھوئے ہوئے ہونگے کہ اُن کا خیال اس طرف نہیں جائیگا۔ جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو یہ دونوں گھر سے نکلے اور جب کوٹلہ کے قریب پہونچے تو نسیم نے بُرقعہ پہن لیا اور منظور سے کہا کہ "تم اس طرح آس پاس رہنا کہ آغا تمہیں نہ دیکھ سکیں۔ جب تمہاری ضرورت ہوگی تو میں کھنکار دونگا اور تم میرے پاس آجانا۔" دونوں دوست علیحدہ ہوئے اور نسیم نے کوٹلہ میں داخل ہوکر دیکھا کہ دُور لاٹ کے پاس کوئی ٹہل رہا ہے۔ سمجھ گیا کہ ہوں نہ ہوں آغا ہوں۔ بس وہیں سے اُسنے اٹھلا کر چلنا شروع کردیا۔ جب اُنکے قریب پہونچ گیا تو مُنہ پر نقاب ڈال کر اور گردن میں ذرا سا خم دے کر ایک طرف کو کھڑا ہوگیا، اس انتظار میں کہ آغا پیشقدمی کریں۔ آغا کے چہرے پر عجیب بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو وہ کھڑے لرزتے رہے اور پھر جیسے کوئی روتا ہے کپکپائی آواز میں بولے "اے شریف خاتون، آپ ــــ"

وہ اپنا فقرہ پورا بھی نہ کرنے پائے تھے کہ بھوچکے ہوکر پیچھے کو ہٹے اور اُسی وقت نسیم کے سر پر کوئی سخت سی چیز اس زور سے آکر پیچھے سے لگی کہ اگر بُرقعہ کے اندر واقعی کوئی عورت ہوتی تو بیہوش ہوکر گر پڑتی۔ آغا کی طرف جو دیکھتا ہے تو گھبرا کر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اور پھر پلٹ کر جو دیکھتا ہے تو دو اور کالے بُرقعے! دونوں کے ہاتھوں میں اونچی ایڑی کے نازک مگر خوفناک جوتے۔ ایک نسیم کی کھوپری پر پڑ چکا تھا اور اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے دوسرا کچھ اس ترکیب سے اسکی ٹانٹ پر استعمال کیا گیا کہ تارے دکھائی دے گئے۔ اتنے اس صدمے سے سنبھلے سنبھلے کہ دونوں نے باری باری سے آنکھ جھپکانے میں کوئی ایک درجن جوتے نسیم کے سر پر گِن دئے۔ بہتیرا کھانستا ہے کھنکارتا ہے یہانتک کہ گلا آجاتا ہے مگر منظور ہے کہ کہیں

طرح نہیں آتا۔ آج کا شاید اس کا تجربہ کر رہے تھے کہ وہ کس قدر کانپ سکتے ہیں۔ جب نسیم نے دیکھا کہ یہ کالے بُرقعے اُس کی روح قبض کر لیں گے اور مدد کے لئے کوئی نہ آئیگا تو بے اختیار ہو کر بھاگنا چاہا۔ مگر بُرقعہ پہن کر دوڑنے کی اُسے مطلق مشق نہ تھی اِس لئے دو چار ہی قدم بعد اُلجھ کر گرا اور اس بُری طرح کہ فوراً اُٹھ بھی نہ سکا۔ اتنے ہی میں سر پر اونچی ایڑیاں پھر آزمائی جانے لگیں۔ دو ہی منٹ میں نسیم کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنے آپ کو مُردہ اور اِن دونوں کو منکر نکیر سمجھنے لگا۔ جب بیدم ہو گیا تو ان بُرقعوں میں سے ایک نے زبردستی اُس کے منہ سے نقاب کو نوچ لیا اور دوسرے نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ فضا میں ایک دم سے دو پُراسرار چیخیں گونجیں اور ہاتھوں سے جُوتے چھُوٹ کر گر پڑے۔ نسیم نے حیران ہو کر موت کے ان فرشتوں کو دیکھا۔ اُن کے مُنہ کھُلے ہوئے تھے۔ ایک بھابی تھیں اور دوسری نسیم کی بیوی۔

شاھد

مصوّرِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کا شہپارہ

خانم

بانگِ درا سائز کے چار سَو صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ درجے کی۔ کپڑے کی مضبوط جلد۔ سُنہری ٹھپّہ۔

اس کتاب کا دیباچہ مشہور انشاپرداز خاتون حجاب امتیاز علی صاحبہ نے لکھا ہے۔ اُنکی رائے ہے کہ "یہ کتاب محض تفریحی افسانوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ معاشرت کے بعض ایسے دقیق مسئلوں کے حل سے معمور ہے جنکا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اِس کتاب کو دورِ حاضرہ کا بہترین اصلاحی افسانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا جو ایسے دلنشین پیرائے میں لکھا گیا ہے جسے پڑھ کر پژمُردہ سے پژمُردہ آدمی بھی دو گھڑی کے لئے شگفتہ ہو جائے۔

خانم میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں اور ان میں سے ہر افسانہ بیحد مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

میری شادی۔ میری شہسواری۔ اندھیرا۔ کھُو گیا۔ کستل۔ چنبیلی کی کلی۔ یہ تصویر کس کی ہے؟ میں ایک بدمعاش میاں ہوں۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ کٹکھنا سانپ نمبر ا نمبر ۲ نمبر ۳۔ مٹھو بیٹے۔ ہنسمکھ موہن۔ اللہ جمیلٌ و یحبُّ الجمال۔ ہیرے کے بُندے۔ پولٹری فارم۔ مچھلی کا شکار۔ شاطر کی بیوی۔ جن حضرات نے چغتائی صاحب کی شگفتہ تحریریں دیکھی ہیں جانتے ہیں کہ اُن کے ہر مضمون میں تبسّم، ہنسی اور قہقہے سب ہی کچھ ہوتے ہیں اور غمگین سے غمگین طبیعت کا انسان بھی اگر ان کا مطالعہ کرے تو بے اختیار ہنس پڑے گا اور اپنے رنج و غم کو بھُول جائے گا۔ یہ افسانے تفریحی ہونیکے ساتھ ساتھ اصلاحی بھی ہیں۔ بے تکلف میاں بیوی۔ جٹھانی دیورانی کی نوک جھوک۔ شوخ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور گھریلو زندگی کی جو دلکش تصویریں آپکو خانم میں نظر آئینگی کسی اور کتاب میں نظر نہیں آسکتیں۔

قیمت چار روپے (للعؔہ) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

بارش کا حملہ

رِم جھم۔ رِم جھم ــــــ سَن سَن۔ سَن سَن!!

"الٰہی خیر! ــــــ اگر اس زور کی ہوا کے ساتھ یوں موسلا دھار پانی برسا تو رہا سہا یہ کرایہ کا پھوس کا بوسیدہ چھپر اس ہیبت ناک طوفان کا کیا مقابلہ کرسکیگا؟ ــــــ دیکھا نا! آخر وہ چھید ہو گیا ــــــ ایلو! وہ ٹپکنے لگا۔ ــــــ اے رشید کی اماں! ذرا اُٹھنا ــــــ ابے او گیوا کے بچے!۔ کیا سو گیا؟"

مرزا جی سے آخر نہ رہا گیا۔ خود اُٹھے اور کچھ نہ ملا تو فرش کو ایک مسلسل دھار کی زد سے بچانے کے لئے اُس کی سیدھ پر اُگالدان اٹھا کر رکھدیا۔ نیند کا خُمار ایسا نہ تھا کہ ایک ہی سانس میں اور طرف کی بھی خبر لے لیتے۔ مسہری پر بیٹھکر ایک لمحہ کے لئے حسرت آمیز نظر اُگالدان پر ڈالی اور دوسرے عالمِ بالا کی سیر کرنے لگے۔ ہلکی ململ کی چادر اوڑھے لپیٹے بے خبر سو رہے تھے کہ ایک گُستاخ دھار نے ٹھیک ناف کی سیدھ پر ٹپکنا شروع کردیا۔ نیند کی جھونک میں یہ تو نہ سمجھ سکے کہ پانی ٹپک رہا ہے' بے تحاشا ہاتھ پاؤں مار کر اُٹھے۔ مُنہ سے دو چار مرتبہ دھت۔ دھت تو ضرور نکلا۔ مگر بعد کو گھگّی بندھ گئی اور دیر تک بید کی طرح کانپتے رہے۔ جب ذرا دم میں دم آیا۔ ہوش ٹھکانے ہوئے چھتری لگا کر مسہری پر بادلِ ناخواستہ بیٹھ گئے ــــــ لیکن یہ خبر نہیں کہ کب اور کیونکر اسی زاویہ سے پھر سو گئے۔ سونے کو تو سو گئے مگر "ٹپ ٹپ" کی خلشِ پیہم نے کسی پہلو چین نہ لینے دیا پہلی کروٹ میں کمبل۔ دوسری میں توشک اور تیسری میں لحاف تک کی نوبت پہونچ گئی۔ اسپر بھی جب وہ مُستقل، ناگوار موسیقیت بارِ سماعت رہنا تھی اور رہی تو بقول مرزا جی، خود انہیں یاد نہیں کہ کس وقت ٹین چینی کا طشت۔ پیالہ وغیرہ استعمال میں لائے گئے۔

صبح، مُنہ اندھیرے حسبِ معمول گیوا حقہ بھر کر لایا تو دیکھا ــــــ کہ میاں اچھی خاصی روئی اور اُون کی گرما گرم قبر میں دفن ہیں۔ مزار پر پھولوں کی جگہ ٹین چینی کے پُرانے برتن چڑھے ہوئے ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ مرزا جی نے دم نکلنے سے پہلے گلے سے اوپر کا کفن سرکا لیا ہے ــــــ شاید اس احتیاط میں کہ مُنکر نکیران کی ضعیفی اور بے بسی پر صورت دیکھتے ہی رحم کر جائیں۔ جانکنی کی تکلیف نے دُنیا کا آخری نظارہ کرنے کے لئے آنکھیں کُھلی کی کُھلی چھوڑی ہیں۔ لبوں پر مُوچھوں کے گھناؤ کی وجہ سے وصیت کے الفاظ ہی باہر نہ نکل سکے ہونگے۔

گیوا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ڈیوڑھی پر بے لاگ جا پُکارا۔ "بیگم صاحبہ! غضب ہو گیا ــــــ مرزا جی قضا کر گئے۔"

کُہرام مچگیا حشر بپا ہو گیا۔ خاندان کی ساری فوج نے مرزا کے کمرے کا محاصرہ کر لیا۔ بیگم اور گیوا ڈرتے ڈرتے اندر آئے۔ چہرے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ حرارت ۱۰۵ ڈگری سے بھی دو چار قدم آگے ہی تھی۔

مرزا جی کی آنکھ کُھل گئی۔ جمائی لیکر بھنبھنی آواز میں بولے۔ "ابے گیوا۔ دیکھ تو شاید میں کیچڑ میں گر پڑا ہوں۔"

گیوا۔ اللہ کی امان۔ اے حضور کیچڑ کہاں۔ آپ تو بستر پر آرام فرما رہے ہیں۔

مرزا جی۔ ابے اُلو کی دُم۔ دیکھ تو رات بھر میرے اوپر پانی ٹپکا ہے۔

گیسوا - سبحان اللہ! صبح ہوئی اور لگے اول فول بکنے - اللہ رسول کا نام کسے یاد - میاں آنکھیں کھولیے - ہوش کی باتیں کیجئے - رات پانی برسا ہی کب ہے جو آپ کے اوپر ٹپکا کیا -

مرزاجی - کیا کہتا ہے؟ رات پانی نہیں برسا؟

گیسوا - جی اور کیا -

مرزاجی - ابے مردود - اُٹھکر چمڑی اُدھیڑ دونگا - یہ رات بھر ہمارے اوپر ٹپکا کیا ہی - تیر سر! - دیکھ تو سارا بستر تر بتر ہو رہا ہے -

گیسوا - میاں افیم نے دھوکا دیا ہوگا - پینک کی جھونک میں کمبل نوشک - لحاف اوڑھ بیٹھے - پھر بھلا مارے پسینے کے شرابور نہ ہوجاتے تو اور کیا؟

مرزاجی - تمہیں خدا کی قسم - سچ کہو - لاحول ولا قوۃ - رات بھر مفت خدا میں نیند حرام ہوئی -

دیوانہ بریلوی

"چمکی"

"اے عورت تیرا نام خودداری ہے!"

مُصنّفہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی - بی - اے - ایل ایل - بی (علیگ) ایڈوکیٹ - جودھپور مُصنّف "کمزوری" "شہزوری" وغیرہ وغیرہ

چغتائی صاحب کا تازہ ترین شاہکار "چمکی" پڑھکر آپکو کہنا پڑے گا کہ "اے عورت تیرا نام خودداری ہے!"

"کمزوری" اور "شہزوری" کے مُصنّف کے قلم سے عورت کی عجیب و غریب "خودداری" کی تصویر "چمکی" میں دیکھیے -

ناول دو حصّوں میں ہی - پہلا حصّہ "بڑی بی" اور دوسرا حصّہ "چمکی" ناول پریس میں دیدیا گیا اور چونکہ کتاب کافی ضخیم ہے لہذا کتابت اور چھپائی میں کم از کم دو مہینے لگیں گے مُصنّف کی ناول نویسی اور مزاحیہ نگاری کا عروج آپ اس انتہا سے زیادہ دلچسپ اور رنگین ناول میں دیکھیں گے - جسمیں "چمکی" کے حسن و عشق کی دلفریب اور عجیب و غریب کہانی آپکے سامنے عشق و محبت سوز و گداز کے ایسے رنگ برنگے فلم پیش کریگی کہ آپکو کہنا پڑے گا کہ "چمکی" ایک ایسی دلنشین اور ہوشربا داستان محبت ہے جس کے آگے چغتائی کے تمام شاہکار ماند ہیں ؂

قیمت - مجلد - تین ۳ روپے - غیر مجلد - ڈھائی روپے - علاوہ محصول ڈاک -

تاریخ اشاعت کا اعلان آیندہ کیا جائیگا -

آل اطفال ہاکی ٹورنامنٹ

یہ لعنت صرف ہندوستانیوں ہی کے حصّہ میں آئی ہے کہ وہ جس زمانے میں جس قوم کے غلام رہے اُسی قوم کی عادت تہذیب زبان رسوم اور لباس تک بڑی خوشی سے قبول کرلیا۔ یہی حال آج کل ہندوستانیوں کے کھیلوں کا ہے جس کھیل کو دیکھا کہ یورپ والے پسند فرماتے ہیں ہندوستانی بھی اُسی کو اختیار فرما کر فخر فرماتے ہیں جن میں سے ایک ہاکی کا کھیل بھی ہے، پس جب اس زمانے کے ہندوستانی بُزرگ یورپ کے نقّال بنے ہوئے ہیں تو بے ہوش بچّوں کو کیا کہ ٹانگ ٹوٹے یا رہے ہاکی کی مشقت شاقہ طبّی ضابطے سے مضرِ صحت ہو یا نہ ہو مگر وہ تو ہاکی کھیلیں گے اس لئے میرے گھر میں بھی خدا کے فضل سے بچّوں کا ایک "مال گودام" ہے جس میں ہر عمر اور ہر ذوق کا بچّہ ملتا ہے۔

سب سے بڑے بچّے کا نام نامی و اسم گرامی خلیقؔ عصمت ہے جو میرے ہمشیرہ زادے ہیں۔ ابھی یہ مدرسے کی چھٹی جماعت میں "انگریزی پا رہے ہیں" جسے عام طور پر کہتے ہیں کہ تعلیم پا رہے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ پس اس زمانہ کا جو لڑکا مدرسے کی چھٹی جماعت میں انگریزی پا رہا ہو ناممکن ہے کہ وہ ہاکی کے کھیل کو چھوڑ کر دیسی ورزش کا عادی ہو۔ البتہ فرق یہ ہے کہ آج کل جس خاندان کے جدِ امجد خود بی۔ اے پاس ہوں اُس میں علاوہ انگریزی ورزشوں کی تعریف کے نوجوان لڑکیوں کو بے ساختہ بے پردہ کردینے کا سوال تک از خود ہی پیدا ہوجاتا ہے مگر جن گھرانوں کے بُزرگوں میں مُلّا رموزی ایسے نیم وحشی قسم کے مولوی لوگ موجود ہیں اُن کے بچّے سگریٹ نوشی، سینما بینی اور برہنہ تصاویر پاس رکھنے میں جتنی احتیاط سے کام لیتے ہیں اُتنی ہی احتیاط سے وہ ہاکی کھیل آتے ہیں۔ یعنی ہاکی بھی کھیلتے رہیں اور بُزرگوں کو بھی خبر نہ ہو۔ شاید اسی قاعدے سے میرے بھانجے خلیقؔ عصمت صاحب ہاکی کھیلتے ہوں گے، اسی لئے میں نے اُن کے اسبابِ زندگی میں کبھی ہاکی کے اوزار اور اسلحہ کو نہ دیکھا، مگر ایک مارچ ۳۶ء کی شام کے چار بجے میری ہی شامت سی آئی اور میں اپنی روزمرّہ کی خشکی تفریح کی خاطر ایک صحرا کو جاتے ہوئے ناگاہ ایک ویرانے سے گزرا، دیکھا کہ پندرہ بیس برس سے اسی طرف کی عمر کے کوئی اڑھائی سو صاحبزادوں کا ہجوم ہے، جو قطاریں یا صفیں باندھے شور کر رہا ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی نصیب کا مارا پاگل آدمی اس طرف نکل آیا ہے اور یہ ڈھائی ڈھائی فٹ کے لونڈے اُس کا خیر مقدم کرکے اب شاید جلوس کی فکر میں ہیں۔ مگر نظر جو جمائی تو صفوں میں ترتیب سی محسوس ہوئی۔ آگے بڑھا یہاں تک کہ اُن کی صفوں میں ایک صف میں خود یوں جم گیا کہ پھر مسلسل تین دن تک جاتا ہی رہا۔ قصّہ تھا ایک ہاکی ٹورنامنٹ کا جو ایک ایسے میدان میں برپا کردیا گیا تھا جو کسی کے باوا کی جائیداد تھا نہ کہیں کے میونسپل بورڈ کی ملکیّت، بلکہ قدرتی طور پر چند کھنڈروں کے بیچ میں ایک میدان نُما زمین اُفتادہ تھی جو طول میں تقریبًا بیس گز اور عرض میں ہوگی شاید گیارہ گز، اس کے شمالی حصہ پر ایک فقیر کا مزار اور مکان اس کے مغربی حصے میں گدائی پیشہ حضرات کے جھونپڑے، اس کے جنوبی حصے میں ایک سخت متعفّن اور بدبو کے پانی کا گڑھا اور جنگلی درخت، اور اس کے مشرقی حصے میں بوسیدہ قبریں اور ان حدود اربعہ کے درمیان ہاکی ٹورنامنٹ، شمال سے جنوب کو یہ زمین از خود یوں واقع ہوئی تھی کہ گیند کا جنوب کی طرف جانا اِتنا آسان تھا کہ آپ شمالی حصّہ میں چاہیں جہاں اُسے جما دیں وہ از خود جنوب کے متعفّن

گڑھے میں جا گر گئی، اسی طرح مشرقی حصہ میں کھلاڑیوں کو اکثر چھوٹے پتھروں کو پھاند کر جانا پڑتا تھا۔

میرے مزاج میں جو شروع ہی سے فرعونیت، نمرودیت، ہامانیت، اور شدادیت ہے تو محلے کے لونڈے مجھ سے بے انتہا ناراض رہتے ہیں یا گھبراتے ہیں اور اسی لئے وہ میرے گذر جانے کے بعد مجھے "ملا رموزا"، یا "ملا رموزی کا بچہ" کہہ کر یاد فرماتے ہیں اس لئے مجھے اس ٹورنامنٹ کی صفوں میں دیکھکر یہ لوگ ذرا سہم سے گئے مگر مجھے تو آخر کار اس ٹورنامنٹ پر سرکاری طور پر مضمون لکھنا تھا، اس لئے میں نے بڑے پیار اور بھولے پن سے پاس والے لڑکوں کو اپنا دوست بنالیا اور کافی سے زیادہ بے خبری سے ان سے چند سوالات کئے۔

اس وقت کھیل شروع ہو چکا تھا مگر میری پیار بھری باتیں سُنکر ایک لونڈا جھک کر کھیل کے میدان میں گیا اور اپنے برابر کے ریفری سے سیٹی لاکر مجھے دی اور کہا کہ آپ ہمارے ریفری بن جایئے، واضح ہو کہ اس عرصہ میں کھیل بدستور جاری رہا، اب جو میں نے تیزی سے تین چار عُذر پیش کر دئے تو سیٹی لانے والا لڑکا پھر اُسی چال سے میدان میں گیا اور سابق ریفری کو سیٹی دے کر آگیا، اس وقت زیادہ تعداد میں لڑکے بجائے کھیل کے مجھکو گھور رہے تھے جس کا یہی مطلب ہوگا کہ دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ یہ مردود مُلا رموزی کا بچہ کہاں آمرا؟

بارے اِلٰہی پاس والے لڑکوں سے میں نے معلوم کر لیا کہ اس ٹورنامنٹ کا نام "سعید یہ ٹورنامنٹ" ہے۔ اس پر میں نے سوال کیا کہ کیا یہ "آل انڈیا ٹورنامنٹ ہے"؟ تو جواب ملا کہ "جی نہیں ایک ایک آنہ فیس ہے"۔

اس کے بعد میں نے اس کے قواعد معلوم کرنے کی کوشش کی تو ایک لڑکا پھر صف میں سے بھاگا اور دوسری جانب کے لڑکوں میں ایک کاپی کے کاغذ پر لکھا ہوا حسبِ ذیل چیلنج لے آیا جس کی لفظ لفظ عبارت یہ ہے کہ:-

جناب کیپٹن صاحب سلامیہ کلب!

بعد سلام مسنون آنکہ معلوم ہو کہ کل ہم چار لڑکے آپ کے ٹورنامنٹ میں اس شرط پر کھیلنے آئیں گے کہ پہلے کی طرح آپ کی طرف والے ہماری اسٹکیں نہ چھین لیں اور کوئی جھگڑا نہ کریں ورنہ ایک آنہ فیس فوراً واپس کرنا ہوگا۔

عبد السلام کیپٹن سلطانیہ کلب بقلم خود"

عبد الستار خاں فل بیک سلطانیہ کلب۔ حمید گول کیپر سلطانیہ کلب"

یہ گویا چیلنج تھا یا یوں کہیئے کہ داخلہ کی درخواست۔ میں نے اس پرچہ کو ان سے بہ ادب حاصل کرنا چاہا تو بڑی خوشی سے یہ کہہ کر مجھے بخش دیا کہ "ہاں لے لو اب کیا کریں گے"!

واضح ہو کہ جن حضرات نے اس ٹورنامنٹ کو منعقد فرمایا تھا وہ خود اس وقت کھیل میں مصروف تھے، میں نے کافی غور کے بعد اس ٹورنامنٹ کو یوں باضابطہ سمجھا کہ:-

۱۔ اس کے داخلہ کی فیس ایک آنہ تھی، آخر لکھنؤ میں بھی "ایک آنہ فنڈ"، موجود ہی ہے۔

۲۔ اس کھیل میں داخل ہو کر کھیلنے والوں کی تعداد بجائے گیارہ کے صرف چار اس لئے رکھی تھی کہ کھیل میں اگر نا اتفاقی ہو جائے تو اسٹکیں نہ چھینی جا سکیں اور کھلاڑی آسانی سے گھر بھاگ جائیں،

۳ - کھلاڑیوں کی کوئی خاص وردی نہ تھی بلکہ جس کے ماں باپ نے جس قیمت کے کرتے پاجامے دیدیئے تھے وہی وردی تھی۔
۴ - کوئی شامیانہ تھا نہ کوئی کرسی۔
۵ - پانچ سے تیرہ یا پندرہ برس کی عمر سے زیادہ کا ایک انسان نہ تھا۔
۶ - جی بھر کر شور کرنے کی عام اجازت تھی،
۷ - گول پر دو دو لکڑیوں میں کاغذ کی جھنڈیاں چسپاں تھیں، اور اب تو مشہور دولت مندوں کے جلوس میں بھی کاغذ کی جھنڈیوں سے کام لیا جاتا ہے اور شرم نہیں آتی!
۸ - راکھ سے حدود بنادی گئی تھیں، جن کے اندر باہر رہنے کا خود تماشائیوں کو اختیار حاصل تھا، پولیس کا انتظام تو تھا نہیں کہ بڑے آدمی کو دیکھکر سپاہی صاحب خود سلام کرنے لگے اور غریبوں سے ڈکٹ،
۹ - کوئی صدر جگہ تھی نہ بچوں کے سوا تماشائی کیونکہ کھیل کا میدان منظر عام پر نہ تھا اس لئے اکا دکا راہ گیر کچھ دیر کھڑا ہو جاتا تھا۔
۱۰ - کھلاڑیوں کی تواضع یا طبّی امداد کا کوئی بندوبست نہ تھا جس کا یہ مطلب تھا کہ اگر کھیل میں کسی کھلاڑی کی آنکھ پھوٹ جائے تو وہ خود ہی عینک لگا کر شفاخانے چلا جائے یا اُس میدان کے باہر کھڑا ہو کر روتا رہے" مالک کمپنی ذمہ وار نہیں"!
۱۱ - میدان کی حدبندی کے اندر داخل ہونے والے تماشائی لڑکوں کو ریفری صاحب منع فرماتے تھے جن کی عمر گیارہ برس کی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر تماشائی لڑکوں نے خود ریفری صاحب کو ڈانٹ دیا۔
۱۲ - ریفری کی واقفیت کا معاملہ کھلاڑیوں کے حکم پر موقوف تھا اور بعض جگہ یہ بھی ہوا کہ جب کھیل میں کوئی خرابی واقع ہوگئی اور خود کھلاڑیوں نے شور کیا کہ ریفری صاحب سیٹی تو بجاؤ تب موصوف نے سیٹی بجائی۔
۱۳ - اگرچہ تماشائی لڑکوں کی مقدار کافی تھی پھر بھی شروع سے آخر تک تقریباً بیس لڑکے دیکھتے رہے اور اس عرصہ میں باقی کے شائقین جب چاہتے تھے کھیل دیکھنے آجاتے تھے اور جب چاہتے تھے اپنے گھر جا کر اپنے کسی دودھ پیتے بھائی یا بہن کو گود میں لے کر آجاتے تھے،
۱۴ - آپس میں لڑنے جھگڑنے اور فحش گالیاں عطا فرمانے کی عام اجازت تھی، چنانچہ متعدد مرتبہ ہوا کہ میدان سے متصل ہی کئی بار ایسے جھگڑے ہوئے جن میں جھگڑنے والوں کے کرتے پاجامے شکستہ ہوگئے اور ان پر جھگڑنے والے چلا چلا کر روتے ہوئے واپس چلے گئے مگر نہ کھیل ملتوی ہوا نہ کسی دوسرے نے ان کی امداد کی،
۱۵ - میدان سے متصل دو درخت بیر کے تھے اور آج کل موسم ہے اس لئے ایک مرتبہ بعض تماشائی لڑکوں نے ان درختوں پر پتھر پھینکے جن میں سے ایک پتھر ایک کھلاڑی لڑکے کے آ لگا، اس پتھر کے لگتے ہی خود کھلاڑی صاحب نے کھیل کے میدان ہی سے سیدھی ماں کی گالی دے کر دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ اس پر تماشائیوں میں سے علی غول کے برابر ایک جتھا بیر کے درخت پر پتھر پھینکنے والوں کی طرف گیا اور اُن پر اس زور سے سنگ باری کی کہ جہاں تک نظر کام کرتی تھی وہ بھاگتے نظر آتے تھے۔

بارے ان حالات کے ساتھ آج سلامیہ کلب غفور یہ کلب سے تین گول سے جیت گیا اور آن کی آن میں کوئی ڈہائی سو لونڈے

ہیپ ہیپ ہُرّے، ہیپ ہیپ ہُرّے، کہتے ہوئے میدان سے روانہ ہوگئے اور میں اپنی تفریح کے لئے دشت و صحرا کی طرف کوچ کر گیا۔

میری بدقسمتی تھی جو اس "عظیم الشان کھیل" سے بعد از وقت واقف ہوا ورنہ ممکن تھا کہ میں اس مقابلہ کے تمام کھیل دیکھنے کی سعادت حاصل کرتا۔ بہرحال جو کچھ دیکھ لیا میں سمجھتا ہوں کہ اچھے اچھوں نے وہ نہ دیکھا ہوگا۔ چنانچہ آج مقابلہ کا آخری کھیل تھا جس میں میرے بھانجے کی کامیاب جماعت آج حصہ لینے والی تھی وہ تو میرے غیر مُعتقد وجود کے خوف سے گھر میں کچھ زیادہ ہنگامہ نہ ہوسکا ورنہ ممکن تھا کہ بھانجے صاحب آج اپنی کامیابی کے لئے اپنی والدہ صاحبہ سے ایک لاکھ مرتبہ "دعائے گنج العرش" کا وظیفہ پڑھواتے اور جہاں تک غیر انگریزی داں ماؤں کا تجربہ ہے اُن کو اولاد کی محبت میں نہایت سخت پایا ہے کیونکہ جو والدہ صاحبہ خود انٹرنس پاس ہوتی ہیں وہ اپنی اولاد سے محبت کا دعوے کرنے پر بھی اُسے لنڈن اور پیرس بغرض تعلیم بھیجدیتی ہیں چونکہ وہ خود تعلیم جدید کے مزے سے واقف ہوتی ہیں۔ لیکن ایک غیر انگریزی داں ماں کی تعلیم و تربیت یہ ہے کہ اس کی اولاد چوبیس گھنٹے اُس کے سامنے رہے، لہذا ہوسکتا تھا کہ آج بھانجے کی کامیابی کے لئے اُن کی والدہ صاحبہ نذر و نیاز تک سے کام لیتیں اور قبلہ خواجہ حسن نظامی یا کسی زنانہ رسالے کو کچھ رقم دے کر اُس کی ناظرات سے بھی دُعا کی فرمائش کرتیں، مگر کمبخت اور وہابی مُلّا رموزی کے خوف سے کچھ بھی نہ ہوسکا اور بھانجے صاحب نہایت خموشی سے کھیل میں تشریف لے گئے۔

آج میدان کے آس پاس خاصی چہل پہل تھی۔ گول کے ڈنڈوں پر نئے کاغذ کی تازہ جھنڈیاں پھر سے چسپاں کردی گئی تھیں، یہ نہیں کہہ سکتے کہ کن صاحب کی تھی مگر ہاں میدان کے ایک کنارے پر ایک میز ہی رکھی ہوئی تھی مگر اس کے برابر تو کیا پورے میدان میں ایک کُرسی نہ تھی۔ اس میز پر کچھ پھول بھی تھے اور بیچ میں ایک دیسی عطردان کی وضع کا شیشہ کا کپ رکھا ہوا تھا جس کی وضع کبھی کبھی انگریزی شفاخانوں کے اُس گلاس سے بھی ملتی تھی جس میں کونین کا پانی مُنہ اُونچا کرکے مریض کو پلاتے ہیں۔

آج تماشائی لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی یعنی اتنی کہ اگر یہ تمام لڑکے فوراً ہی پوری ڈاڑھی کے مرد بن جاتے تو پولیس خواہ مخواہ ہی ان کے کھیل کے انتظام کے لئے آتی اور آپ کو ہمکو قاعدے سے کھڑے رہنے کا حکم دیتی، اسی طرح اگر نوجوان لڑکیوں سے کم عمر کی لڑکیوں کو بے پردہ کرنے کی تحریک ہوتی اور "حقوق نسواں" کا ضابطہ ۱۲ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کے لئے بھی جاری ہوتا تو لکھنا پڑتا کہ "محترم خواتین بھی رونق افروز تھیں"۔

آج ریفری سے لیکر تمام کھلاڑی بہت صاف سے کپڑے پہنے ہوئے تھے جن سے وردی کا کام ہی لیا جانے والا تھا۔ کھلاڑی لڑکوں میں آج بہت کافی اکڑفوں غرور اور گھمنڈ کے آثار موجود تھے اور ان کے ساتھی کھیل سے قبل انہیں ہاکی کے داؤں پیچ بتانے میں مصروف تھے، آج سلطانیہ اور سلامیہ کا مقابلہ تھا، کھلاڑیوں کی کُل تعداد آٹھ تھی، جن میں سے صرف دو کے پاس نئی سی اسٹکیں تھیں اور بعض کے پاس ایسی تھیں گویا وہ اپنے بزرگوں کے ذخیرہ سے چُرا لائے ہیں

اب میدان پر تماشائیوں کا بندوبست شروع ہوا۔ یعنی آپس ہی میں ایمانداری سے ایک دوسرے کو میدان کی حد پر کھڑے ہونے اور میدان کو کھلاڑیوں کے لئے چھوڑ دینے کو کہا، اور آن کی آن میں لڑکے میدان کی چاروں سمتوں پر کھڑے ہو گئے، اسکے بعد ریفری نے خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی بیس مرتبہ پوری لیاقت سے سیٹی بجائی ہوگی مگر ایک کھلاڑی میدان میں جب نہ آیا تو یہ خود کھلاڑیوں کے ہجوم میں گھس گئے۔ جس وقت کھلاڑی میدان میں آئے تو چاروں سمت سے عین انگریزی قاعدہ سے تالیاں بجائی گئیں اور تالیوں کے ساتھ ہی کھلاڑیوں کے طرفداروں نے صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ

دیکھ بے سعید! گھبرانا نہیں ہم کھڑے ہوئے ہیں۔

دوسرے نے کہا۔ ابے وہ تو ہاکی گھوڑوں سے نہیں گھبرانا!

تیسرے نے کہا۔ واہ بیٹا جمال ذرا اسٹک تو دکھوانی؟

چوتھے نے کہا۔ واہ ریفری صاحب ذرا سلطان کی اسٹک تو دیکھنا۔ یہ بیٹا تو ڈنڈا لے آئے ہیں!

پانچویں بولے۔ واہ رے میرے شبر خوب کھیلنا، بس کپ اپنا ہی ہے۔

چھٹے بولے۔ اخ رحیما تم بیٹا کیا جانو کھیل، چلو اِدھر آ بھی جاؤ میں کھیل سکھا دوں پھر کھیلنا!!!

ساتویں بولے۔ ابے ٹر ٹر کیا کرتا ہے ذرا کھیل تو ہونے دے!

آٹھویں بولے۔ اور ہاکی کا ڈنڈا اونچا کر کے سب طرف گھوم کر بولے۔ اچھا بس خاموش، جو بولے گا نکال دیں گے اُسکو۔ ابن کسی کے باوا کی پرواہ نکریں گے۔ نہیں تو لے آؤ اپنے حمایتوں کو!

نویں بولے۔ جو ہارے گا گدھے پر بٹھائیں گے پہلے سے کہے دیتے ہیں!

دسویں بولے۔ اخ یہ اسٹک ہے یا کلا شاہ میاں کا سونٹا؟

غرض جتنے منہ تھے اُتنے آوازے تھے جو غریب کھلاڑیوں پر کسے جا رہے تھے۔ کہ ناگاہ ملّا رموزی صاحب کے بھانجے میدان کے قریب نظر آئے، ان کا کچھ رُعب یوں بھی ہے کہ یہ نہ فقط ملّا رموزی صاحب کے بھانجے ہیں بلکہ اس لئے بھی ہے کہ ملّا رموزی کے دوسرے بھائیوں کے بھی یہ بھانجے ہیں اور چونکہ ملّا رموزی کے بھائی خدا کے فضل سے کسی کے نوکر نہیں ہیں اور نہ ہوں گے اس لئے وہ کسی سے ڈرتے نہیں ہیں اور اس زمانے میں جو ڈرتا نہیں ہے وہی سب کا امام ہے، بس ان کے آتے ہی تماشائیوں میں کچھ سکون سا ہو گیا اور وہ پہلی سی غدر ۱۸۵۷ء سے ملتی ہوئی شورش نہ رہی، موصوف نے آتے ہی بڑے رنّاٹے سے اپنے کالے رنگ کا کوٹ اُتارا۔ ایک لڑکے نے بڑھ کر چاہا کہ وہ حضور کا کوٹ لے لے مگر آں حضور نے جھنجھلا کر کوٹ زمین پر رکھ دیا اور آستینیں چڑھاتے ہوئے میدان میں پہونچے اور پھر کچھ یاد آنے پر آپ کوٹ کے پاس گئے اور کوٹ سے کچھ نکال کر اپنے مقابل کھیلنے والی جماعت کے سردار کو کچھ دیا۔ میں نے خفیہ طور پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے کھلاڑیوں کی پیاس بجھانے کے لئے پودینہ کی ہاضم گولیاں دی تھیں جو سوڈا واٹر اور برف کے عوض استعمال ہوتی رہیں، پانی انتظام یہ تھا کہ جس کو پیاس محسوس ہو وہ کھیل کے بیچ سے ریفری کو اطلاع دیکر پاس والی مسجد میں خود جا کر پانی پی آتا تھا۔ اور کھیل میں شریک ہو جاتا تھا۔

اُس وقت مُلّا رموزی چند لڑکوں کی اوٹ میں خفیہ پولیس بنے بیٹھے ہوئے تھے کیوں کہ اگر ایسا نہ کرتے تو بھانجے صاحب مارے حجاب کے کھیل میں شریک نہ ہوتے کہ ناگاہ سیٹی بجی اور کھیل کیا شروع ہوا گویا لاہور میں ہندو مسلم فساد کا آغاز ہو گیا۔ اسٹکوں پر اسٹکیں تھیں جو ماری جا رہی تھیں اور گیند کو ضابطہ اور قاعدہ سے بجانا کیا معنی کھلاڑیوں میں جو تھا وہ قابو سے باہر تھا، حد ہو گئی کہ اس اٹلی اور حبشہ کی جنگ سے خود ریفری صاحب کھڑے کانپ رہے تھے کیوں کہ ریفری کی سیٹی کا حکم ہی کیا تھا وہاں تو جس کھلاڑی نے چلّا کر کہہ دیا کہ فاؤل تو ریفری نے سیٹی بجا دی کہ فاؤل اور جس نے کہہ دیا کہ گول تو ریفری نے سیٹی بجا دی کہ گول، کچھ اس سے بھی سوا معاملہ بے قابو تھا تماشائیوں کا یعنی جس طرف گیند جاتی تھی بے مبالغہ کوئی پچاس لونڈے ہوتے تھے جو اُس طرف دوڑ جاتے تھے اور اس گھوڑ دوڑ میں شور غوغا اور گالی گلوچ نفع میں!

ابھی کوئی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ بغیر کسی خاص جھگڑے کے کھیل خود بخود سا بند ہو گیا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ایک کھلاڑی کی اسٹک ٹوٹ گئی ہے اور وہ دوسری اسٹک لینے بھاگے ہوئے اپنے گھر گئے ہیں اس لئے کھیل بند ہے تھوڑی دیر میں بھاگے ہوئے کھلاڑی گھر سے آتے ہوئے نظر آئے تھے کہ کھیل شروع ہو گیا۔

میں تماشائیوں کی جس قطار میں کھڑا تھا اُس میں آزادی مختاری بے باکی اور بے پروا مزاجی کی گویا گولی چل رہی تھی، یعنی کوئی دس کم سو لڑکے تھے جو ایک کے اوپر ایک ہو کر کھڑے نہیں تھے بلکہ ہل رہے تھے یا جھوم رہے تھے اور ناممکن تھا کہ ان کی قطار میں کوئی نیا لڑکا آ جاتا کیوں کہ یہاں یہ انتظام تھا کہ جو لڑکا ایک انچ بھی آگے بڑھا نہیں کہ پاس والے نے جھک کر وہ چانٹا رسید کیا کہ نصف گھنٹے تک سر سہلانے سے فرصت ہی نصیب نہ ہو۔ اسی طرح یہ ضروری نہیں تھا کہ تمام لڑکے ایک جگہ کھڑے ہو کر شروع سے آخر تک کھیل دیکھتے رہیں بلکہ فی منٹ ایک نئی جگہ سے تماشہ دیکھا جاتا تھا جس کا طریق اور قانون یہ تھا کہ قطار کے جس حصہ میں اپنے سے کمزور اور کم عمر لڑکا نظر آیا اور اُس سے بڑے لڑکے نے پہلے تو اُس کے برابر کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ جگہ بنانے کی کوشش کی اور جو اس طرح بھی جگہ نہ ملی تو کمزور لڑکے کو دھکّا دیکر جگہ حاصل کر لی اور اگر پہلے والے لڑکے نے کسی سرکشی سے کام لیا تو اُس کے سر، مُنہ، بازو، کمر غرض جس حصۂ جسم پر چاہا زور کا گھونسا رسید کیا اور خود اُس کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ اپنے لئے جگہ حاصل کرنے میں جس لڑکے کو پیٹا گیا اُس کے بھائی یا ساتھی زیادہ تعداد میں بدلہ لینے کو جو آئے ہیں تو چانٹے مارنے والے لونڈے نے پہلے تو یہ عُذر کیا کہ۔ میں پہچانتا نہیں تھا کہ یہ تمہارا بھائی ہے اور جو اس عُذر سے بھی خطرہ دور نہ ہوا تو حمایت کرنے والوں کو اپنی طرف آتا دیکھکر ہی ٹورنامنٹ کا فیصلہ دیکھے بغیر جو فرار ہوئے تو سیدھے اپنے محلّے میں۔

امیروں دولتمندوں اور بڑے لوگوں میں کم تعداد میں اولاد پیدا ہونے کے طریقے آپ بھی جانتے ہیں اور مُلّا رموزی بھی۔ اسی طرح غریبوں میں بھیڑ بکریوں سے زیادہ اولاد پیدا ہونے کا سبب بھی معلوم ہے لہذا بے شمار بچّے ایسے بھی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے جن کی گود میں ایک ننگ دھڑنگ سا بچّہ ضرور ہوتا تھا اور جو ہر پانچ منٹ کے بعد چیخ کر روتا تھا۔ اور لادنے والا بچّہ مجبوراً اُس کو گھر چھوڑنے جاتا تھا جس سے مجھے اُتنی ہی ہمدردی ہوتی تھی جتنی ہمدردی مجھے اپنی اُس بیوی نمبر۲ سے ہے جو دو برس میں میرے معاملہ میں صرف دو مرتبہ بولی ہے اور پھر مجھ سے خوف اور وہم میں مبتلا ہو کر

جو چُپ ہوئی تھی تو آج کا دن!

الحاصل کھیل شروع تھا، ایک طرف ایک میز رکھی ہوئی تھی جس کے پاس کرسی نہ تھی بلکہ مالک کمپنی اُس پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے اب جو کھیل شباب پر آیا ہے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئٹہ کا زلزلہ اس ٹورنامنٹ میں آگیا ہے اور تماشائی ہیں کہ بھاگے بھاگے پھرتے ہیں، یعنی لونڈوں کی ٹولیاں تھیں جو کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھیں اور شور کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا، خود کھلاڑیوں کی بدحواسی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا کہ گیند کہیں تھی اور خود کہیں، ایک دوسرا اپنے ساتھی کو ڈانٹ رہا تھا اور بعض اوقات جوش میں ساتھی کو گالی بھی دیدی جاتی تھی، ریفری صاحب ہوائی جہاز بنے تمام میدان میں اُڑتے پھرتے تھے، اُس پر بھی کئی بار یہ ہوا کہ کھلاڑیوں ہی نے قسمیں کھاکر یقین دلایا کہ گول ہوگیا تو ریفری صاحب نے بھی کہدیا کہ اچھا گول ہی سہی۔ مُلّا رموزی صاحب کے بھانجے صاحب پر اُس وقت اونچے درجہ کی متانت اور بزرگی چھائی ہوئی تھی اس لئے یہ جس کو ڈانٹ دیتے تھے وہ ان کی سعید اولاد کی طرح خموش ہوجاتا تھا، کئی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کھلاڑیوں نے کھیل چھوڑ کر تماشائی لڑکوں کو جاکر چانٹے رسید کئے کہ وہ کیوں ہمارے کھیل پر آوازے کس رہے ہیں۔ یاد رہے کی جو ہاضم گولیاں کھیل کے بعد کے لئے دی گئی تھیں وہ کھیل ہی میں کھالی گئیں اور پیاس کا اہم معاملہ سرکاری نل کے پانی پر چھوڑ دیا گیا۔

الحاصل کھیل ختم ہوا اور سلطانیہ کلب تین گول سے جیت گیا۔ اب کپ کے تقسیم ہونے کا معاملہ تھا، چنانچہ پہلا ضابطہ تو یہ دیکھا کہ شکست کھائے ہوئے کھلاڑی صاحبان بغیر کسی اجازت کے میدان سے اپنے اپنے گھر یہ کہتے ہوئے روانہ ہوگئے کہ "بے ایمانی سے جیت لیا"۔ "بے ایمانوں کا کالا منہ"، اسی طرح کپ جیتنے والے جواب دے رہے تھے کہ "ہمت ہو تو پھر آجاؤ"۔ الغرض چور بازار بمبئی کے نیلام سے ملتی ہوئی میز کے آس پاس اڑھائی سو لونڈے جمع ہوگئے اور کوئی تیرہ برس کے ایک صاحبزادے نے وہ شیشہ کا گلاس اُٹھا کر کپتان صاحب کو عطا فرمایا اور انگریزی قاعدے سے تمام لڑکوں نے تالیاں بجائیں۔ میں منتظر تھا کہ دوسرے انعامات بھی تقسیم ہوں گے یا باضابطہ تالیاں پھر بجائی جائیں گی مگر کپ ملتے ہی زلزلے اور بھونچال کا پھر ایک جھٹکا محسوس ہوا یعنی کپ والے لونڈے اچانک شہر کی طرف بھاگے اور اُن کے پیچھے اللہ ہی جانے کتنے لونڈے تھے جو قدم قدم پر یہ کہہ کر چیخ رہے تھے کہ "ہیپ ہیپ ہُرّے"۔ "سلطانیہ والوں کی ہُرّے"، پھر ان الفاظ کی بھی ضرورت نہ رہی اور صرف ایک لڑکے کے ہُو کر دینے سے بھاگنے والے تمام لڑکے شور مچاتے تھے۔ اب میں تو اسی جگہ رہ گیا مگر اطلاعات ملیں کہ یہ کپ تمام شہر میں گھمایا گیا اور اب چندہ ہورہا ہے کہ قوالی بھی ہو۔ ممکن ہے کہ یہ باغیوں کی قسم کے لونڈے میری بیوی نمبر ۲ کی خدمت میں یہی کپ لیکر حاضر ہوں کیوں کہ موصوفہ ایسی چیزوں کو کافی قدر کی نظر سے ملاحظہ فرماتی ہیں صرف اُنہیں ہیں تو اُردو کے اشعار اور مضامین سے۔

مُلّا رموزی

زعفران زار

اک نگاہِ ناز سے قطرے کو دریا کیجئے
میری دُنیا کو مُسرت خیز دُنیا کیجئے

نرخ بالا کُن ہی نکلے گا لبِ عُشاق سے
جس قدر اور جتنا چاہیں آپ مہنگا کیجئے

خاک و باد و آب و آتش تھے یہی ہتیار چار
انکو بھی اب چھین لیجے اور نہتا کیجئے

روزے رکھیئے حج بھی کیجے رہیئے پابندِ صلواۃ
زندگی کی اُلجھنوں میں پڑکے کیا کیا کیجئے

فلسفہ منطق دلیل و بحث سب بیکار ہیں
دین کی باتوں میں آپ اتنا نہ اُلجھا کیجئے

روزے گر رکھتے نہیں سحری تو کھاتے ہیں ضرور
ہم مسلماں ہیں ہمیں اتنا نہ رُسوا کیجئے

کس کی طاقت ہے کہ روکے ہی بھلا کس کی مجال
سامنا مردوں کا کیجے بے محابا کیجئے

بوجھ بھاری زیوروں کا آپکی لادے بلا
آپ ننگی پنڈلیوں سے حشر برپا کیجئے

دردِ سر کے واسطے نسخہ بڑا اکسیر ہے
صبح دم اطریفل کشنیز چاٹا کیجئے

سُنیئے مجھ سے ہر مرض کا میں بتاتا ہوں علاج
پیڑ میں اُلٹے لٹک کر دھوپ کھایا کیجئے

تنگدستی گر نہ ہو تو عمر یوں کیجے بسر
دن کو سویا کیجئے اور شب کو گایا کیجئے

اب بڑوں کا کچھ ادب ہے اور نہ چھوٹوں کا لحاظ
آپ سب کو نام لے لے کر پُکارا کیجئے

اسطرح ہمدردی و ایثار کا دیجے ثبوت
گھر پڑوسی کا جلے ہاتھ آپ تاپا کیجئے

یہ ہی رستہ ہے ترقی کا یہی راہِ نجات
کام جو کیجے ہمیشہ ہی ادھورا کیجئے

ہند کو آزاد کرنے کی یہی تدبیر ہے
لے کے چرخا رات دن بس سوت کاتا کیجئے

گھر میں کھانے کو نہیں اور بیوی بچے ہیں تباہ
آپ سرکس دیکھئے تھیٹر میں جایا کیجئے

چور ڈاکو آن کر سب لے گئے مال و متاع
آپ بیٹھے بھیرویں کے سُر الاپا کیجئے

ہند والے کھیلتے ہیں سب لنگوٹی ہی میں پھاگ
گوشمالی انکی اب اے دھرتی ماتا کیجئے

ہٹے کٹے اور مُشٹنڈے فقیروں کیلئے
اپنے دل کو سخت کیجے سنگِ خارا کیجئے

کچھ نہ کیجے چھوڑ دیجے سب مخمصوں کو ظریف
لے کے فتنہ ہجر کی راتوں کو نیا کیجئے

ظریف دہلوی

"مصورِ غم" کا مزاحیہ لٹریچر

حُزن و مزاح اور الم و نشاط حیاتِ انسانی کے عناصرِ غیر اجتنابی ہیں اور جذبات نگار مُصنف ان ہی میں سے ایک کو اپنے اسپِ قلم کے لئے جولانگاہ بنا کر کامیاب ہوتے ہیں اور ہر زمانے اور ہر زبان میں حُزن نگار انشاء پرداز بھی نظر آئیں گے اور مزاح نگار مُصنف بھی۔ مجھے یہاں اُردو ادب کے عنصرِ ثانی یعنی میدانِ ظرافت کے ایک جلیل القدر شہسوار کے متعلق ناقدانہ خیالات کا اظہار کرنا ہے مگر اس سے پیشتر ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیداً ظرافت کی تشریح کر دوں تاکہ آپکو میرا معیارِ تنقید معلوم ہو جائے۔

ظرافت کا مفہوم میں تو یہ سمجھ سکا ہوں کہ ایسا دلاویز اظہارِ بیان ہو جو طبیعت میں شگفتگی پیدا کر دے۔ لیکن ساتھ ہی مذاقِ سلیم پر گراں بھی نہ گذرے جس وقت طبیعت متاثر اور سُکون سے بیزار ہو تو کوئی کوشش مائل بہ سُکون کر کے مسکراہٹ پیدا کر دے نہ یہ کہ قہقہے لگائے جائیں۔ خوش مذاقی جس کی مثال حسین تبسّم کی ہے۔ ہر شخص پسند کرتا ہے لیکن بھونڈا مذاق جو بدنُما قہقہوں کی صورت میں رُونما ہوتا ہے کوئی معقول آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ جب دل میں تفکر اور دماغ میں انتشار ہو تو خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ہنسی کی باتیں کرے۔ چونکہ مسرّت زندگی کے عناصرِ ضروری میں سے ہے اسلئے انسان فطرتاً مزاح و ظرافت کی طرف سے قطعی متنفر نہیں ہو سکتا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ لوگ بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ ہاں اس میں لطافت کا ہونا لازمی ہے۔ سنجیدہ اور متین طبائع کو عریاں مذاق، پھکڑپن اور تہذیب و وقار سے گری ہوئی باتیں ناگوار گذرتی ہیں۔ البتہ وہ اس مذاق اور ظرافت کی دلدادہ ہوتی ہیں جو اوباشوں کی گالیوں، ڈھول دھپّا اور خرافات وغیرہ پر محمول نہ ہو......... لیکن چند منچلے حضرات کی بدولت ظرافت کا مفہوم اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ ہر قسم کی ہرزہ سرائی کو بھی ظرافت کہہ کر اس کی توہین کی جاتی ہے۔ پھکڑپن وغیرہ کا رکیک عنصر آج کل بہت سے مزاح نگاروں میں پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ اُن کی ذہنی پستی، اخلاق سے معرّا ماحول اور بلندی سے بالکل عاری خیالات ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُن کا رجحان طبعی ایسی لایعنی طرف ہوتا ہے جسے ظرافت نہیں کہا جا سکتا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مزاح نگاری کا واحد مقصد قارئین کو ہنسا دینا ہے اور بس۔

ایسے حضرات کے نام جو حقیقی معنوں میں ظرافت نگار کہے جا سکیں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان ہی چند ہستیوں میں ہندوستان کے مایۂ ناز انشاپرداز مُصوّرِ غم حضرت علّامہ راشد الخیری کا نام ہے جو اس لئے اور بھی امتیازِ خصوصی رکھتے ہیں کہ اُردو زبان کے سب سے بڑے حُزن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ مزاح نگاری میں بھی اُن کا بہت بڑا رُتبہ ہے۔ یہاں اُن کی مزاح نگاری پر کسیقدر تفصیل سے لکھونگا۔

"نانی عشو" اور "ولایتی نعمی" تو خیر اُن کی مستقل اور مشہور تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی کتابوں میں شکسپیئر کے ڈراموں کی طرح حُزنیہ طربیہ (Tragedy & Comedy) ملتی ہیں یعنی ایک المناک داستان کے ساتھ ساتھ ایک خندہ ریز قصّہ بھی شریک ہے۔ اسی لئے بہت سے ادیب لکھتے ہیں کہ یہ کمال "مُصوّرِ غم" ہی میں دیکھا کہ ہنستوں کو رُلانے اور روتوں کو ہنسا

دیتے ہیں۔ ایک طرف نسیمہ اور صالحہ کے عیرفانی اور تمیزن آ اور بہادر شاہ ظفر کے عبرتناک کردار پڑھ جائیے۔ کیسی ہی خوشی کی حالت میں آپ نے کتاب شروع کی ہو ناممکن ہے جو آپ کے دل پر اثر نہ ہو۔ اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نہ نکل پڑیں۔ دوسری طرف نانی عشو اور ولایتی ننھی کے پرلطف قصے، عبدل اور ملّاجی کی دلچسپ کہانیاں پڑھیئے، کتنے ہی سنجیدہ کیوں نہ ہوں اور کتنا ہی دماغ متفکر کیوں نہ ہو بہت مشکل ہے کہ آپ کی طبیعت میں شگفتگی نہ پیدا ہو جائے۔ بعض لوگ موصوف میں یہ متضاد خوبیاں دیکھ کر تعجب کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حزن اور مزاح کا منبع ایک ہی ہے۔ جو شخص ایک کو نہ سمجھ سکے وہ دوسرے کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ نفسیاتی رو سے حزنیہ کا ماہر وہی ہو سکتا ہے جس نے طربیہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہو۔ غرض حزنیہ اور طربیہ کو بے تعلق اور متغائر خیال کرنا غلطی ہے۔

سچ پوچھیئے تو لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بہترین ظرافت اور دیرپا شوخی اُن ہی مصنفوں میں پائی جاتی ہے جو بالطبع متشائم اور قنوطی واقع ہوئے ہیں۔ "ولایتی ننھی" کے خاتمے کے قریب بی ننھی نے جن کی عمر پچپن سال ہوگی لیکن اپنے آپ کو نوعمر سمجھا کرتی تھیں (اور یہ عورت کی فطرت ہے کہ اپنی عمر ہمیشہ بے حد کم ظاہر کرتی ہے) اور جنہوں نے صمد نامی ایک اچھے خاصے جوان کو اپنے سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا، نکاح کے بعد اپنی تقریر میں کہتی ہیں :-

"مجھے آپ سب کے تشریف لانے سے بہت ہی سخت صدمہ ہوا کہ دو دو چھواروں کو آپ لوگ ترس رہے ہیں۔ بھائی مولویوں! آپ کی عزت ہر مسلمان پر فرض ہے مگر لعنت خدا کی تم سب پر کہ تم نے بہکا بہکا کر مسلمانوں کا یہ ہڈ ڑا کر دیا اور رسوا اس کے کہ تمکو تو سمے کھلادیں جیبیں بھر دیں اور کسی کام کے نہ رہے۔ جنت دوزخ کی تمام عمر وہ پٹی دی کہ خاصے بھلے چنگے کامی بندوں کو احدی اور کام چور بنا دیا۔ لعنت مردوں پر، لعنت عورتوں پر، اچکّوں پر اور قلندروں پر، ہم سب پر!

بدنصیبوں! تھوک دو اُن کے چہروں پر جو تمکو قسمت کا راگ دیں۔ یاد رکھو توکل سے بڑھ کر ذلیل، قسمت سے زیادہ فضول زندگی کی کوئی چیز نہیں۔ مردوں! مجھکو دیکھو اور سبق لو! چڑیلوں میری طرف آؤ اور کچھ سیکھو! تمہارے ہی جیسے ہاتھ پاؤں میرے ہیں۔ دادی قسمت ہی رٹتی رہیں اور میں نے اپنے ہاتھ پاؤں چلائے۔ وہ ہاریں اور میں جیتی۔ ان کے ساتھ اُن کی تقدیر تھی اور میرے ساتھ میری کوشش۔ اُن سے پوچھو قسمت کہاں ہے؟ اور مجھکو دیکھو کوشش کا پھل یہ ہے۔"

بظاہر یہ باتیں ہر شخص کو ہنساتی ہیں اور وہ ننھی خانم کے عیارانہ طرزعمل سے لطف اٹھاتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھیئے تو اس مسکراہٹ کے پیچھے اُداسی، مذاق میں طنز اور ظرافت میں سبق اخلاق پوشیدہ ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مولویوں کے حکمّ نے مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ اُن کی جہالت کے باعث لوگ قسمت ہی قسمت پر بھروسہ کر کے گمراہ ہو گئے۔ ایک طالب علم محض یہ سمجھ کر کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا، محنت ہی نہ کرے تو بھلا اس کی کامیابی کیسے ممکن ہے۔ "ولایتی ننھی" میں دادی تقدیر اور توکل کو ہی پیٹتی رہیں لیکن ننھی خانم نے قسمت کو بالائے طاق رکھ کر ایسے نت نئے طریقے اختیار کئے کہ مقصد کو حل ہوتے ہی بنا۔

حضرت علامہ راشد الخیری قارئین کو صرف ہنسانا ہی نہیں چاہتے بلکہ ہنسی ہنسی میں اخلاق کا درس دینا چاہتے ہیں۔ انکی کوشش تفنن مسلسل ہی نہیں بلکہ وہ آپ کو کہیں کہیں لمحۂ فکر یہ بھی دینا چاہتے ہیں کہ جہاں ظرافت سے آپ شگفتگی حاصل کریں وہاں ذہن بھی تفکر کا عادی بنے۔ اسی کتاب میں ایک ٹکڑا یہ ہے :-

"یہ مقررہ اصول ہے کہ طاقتور کمزور کو فنا کر دے .... حقیقی دلہن کی تباہی کی تمام ذمہ داری اسکے والدین یا ورثا پر ہو۔

اگر اُسکو تعلیم دی جاتی، دُنیا کے نشیب و فراز سمجھائے جاتے، جنوں اور بھُوتوں کی حقیقت سمجھائی جاتی تو وہ نہ صرف ان چیزوں کو لغو سمجھتی بلکہ ننھی کا ایسا کچومر نکالتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ اب جو کچھ ہوا یہ وہی ارتقا کا مسئلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ننھی کی کامیابی کا راز ہر متنفس جانتا ہے مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جہالت کس طرح لڑکیوں کا شکار کر رہی ہے۔ طاقت حق رکھتی ہے کہ کمزور کو مسمار کر دے۔"

مُصوّرِ غم کے پیشِ نظر ہمیشہ "عورت" رہی ہے۔ حُزن نگاری میں تو اس معاملے میں دُنیا کے بہت کم مُصنّف اس پایہ کو پہنچ سکتے ہیں لیکن ظرافت نگاری میں ہی عورت کو جس طرح اُنھوں نے ہمیشہ سامنے رکھا کم از کم اُردو میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ہوسکتا تھا کہ اُن کا مزاحیہ لٹریچر مردانہ کرداروں پر ہی منحصر ہوتا لیکن نہیں۔ یہاں ہی عورت کو فردِ خصوصی ٹھہرا کر ظرافت نگاری کو کمال تک پہنچا دیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مصورِ غم کی مزاح نگاری خالی خولی باتیں ہی نہیں سطح ذہن پر نقشِ دوام ہے کیونکہ اس کا پہلو اصلاحی ہوتا ہے۔ مذکور کتاب قطعی سنجیدہ بن کر پڑھنی ناممکن ہے، آپ خوش ہوتے ہیں اور ہنستے ہیں لیکن جب مندرجہ بالا الفاظ پر نظر پڑتی ہے تو ایک ساعت کے لئے ذہن ظرافت سے ہٹ کر عورت کی جہالت پر غور کرنے لگتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ جن بھُوتوں کا اثر عورتوں میں جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے؟ اس جہالت کی وجہ سے جن بھُوتوں پر اعتقاد کر کے اُنھوں نے اپنی زندگی تباہ کر لی۔ ابتدا میں یہ فقرا "یہ مقررہ اصول ہے کہ طاقتور کمزور کو فنا کر دے" کس قدر موثر اور جامع ہے۔ انہی جیسے فلسفیانہ فقروں سے مُصوّرِ غم کی ظرافت آپ اکثر مقامات پر مُرصّع پائیں گے۔

"نانی عشو" میں ایک جگہ نانی کی زبانی فرماتے ہیں:۔

"میں ہمیشہ قرآنی بات کہا کرتی ہوں، ورے پرے کا تو ذکر ہی نہیں کرتی جس طرح شادی غمی کے موقعوں پر ہم اپنی بڑی بوڑھیوں کو دیگوں پر بٹھا دیتے ہیں کہ وہ کھانے کا انتظام کریں اسی طرح اللہ پاک قیامت کے دن جنت دوزخ کا انتظام نیکوں کے سُپرد کر دیگا۔ ایک آدمی بیچارہ اللہ اتنی بڑی دُنیا کا حساب کتاب اکیلا کیونکر کر سکتا ہے۔ وہاں کا سارا کام کاج ہم ہی لوگ کریں گے۔ گیارہویں والا دادا ہونگے، اجمیری بڑے ابّا ہونگے، دلّی والے نانا ہونگے۔ خالہ رابعہ ہونگی، ہیں ہونگی۔ ہم ہی سب مل جُل کر تیاپانچا کر دینگے مگر تم جوتی خوریوں کی ایسی آنکھیں پھوٹی ہیں کہ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ تم سب کو معلوم ہے کہ اللہ پاک آم کے اتنے عاشق ہیں کہ آم کا سیپارہ تک بنا دیا ہے لیکن تم نامُرادیں روز آم کھاتی ہو، بچوں کو کھلاتی ہو مگر میرے لئے ایک دن لانے نصیب نہ ہوئے کہ اللہ کو پہنچ جاتے۔ مُردیو جب قبر میں پیٹ پھوٹے گا تو خون کی ایسی نہریں بہیں گی کہ ابابیلیں تیرینگی۔ تم نے کیا سُنا نہ ہوگا "طیراً ابابیل" پھر کیوں اللہ سے فرنٹ ہوتی ہو؟"

یہ اس تصنیف کا ٹکڑا ہے جو اُردو ظرافت میں معرکتہ الآرا تسلیم کی جاتی ہے۔ یوں آپ اس کے ہر ہر فقرے کو پڑھکر خوش اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس میں ایک جوہر مستور ہے جس سے آشنا ہونے پر دل پر تیر چلتے ہیں۔ مذہبِ مقدس اسی جہالت کی بدولت بدنام ہو رہا ہے اور مطلبی و عیار لوگ اس کی آڑ میں اپنا اُلّو سیدھا کیا کرتے ہیں۔ بظاہر عشّو کی باتوں سے آپ محظوظ ہوتے ہیں لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس قسم کی مولویانہ باتوں اور واعظوں سے اکثر جاہل عورتوں کا اعتقاد کمزور ہو جاتا ہے؟ کوئی تعجب نہیں اگر کوئی عورت جو بالکل جاہل ہے اس قسم کی باتوں سے مرعوب ہو کر یہ یقین کرے کہ عمر کے پارے کی نسبت آموں ہی سے ہے۔

اور یہ کہ قبروں میں پیٹ پھٹ جاتے ہیں اور ابابیلیں خون میں تیرتی ہیں کیونکہ "طیرن ابابیل" کی تاویل اس کے سامنے ایسی ہی پیش کی گئی ہے۔ اس میں سب سے قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضرت علامہ راشد الخیری نے گو تمام عمر عورتوں کے حقوق کا تحفظ کیا لیکن اُنھوں نے عورتوں کی ناجائز حمایت کبھی نہیں کی۔ کیا اس موقع پر ایسے الفاظ بجائے عشو کے کسی مرد کے مُنہ سے کہلوا دینا مُصنّف کے لئے مشکل تھا؟ نہیں۔ بلکہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی زبوں حالی کا سبب محض ہمارے پیر، مولوی، مُلّا اور واعظ ہی نہیں بلکہ مذہب مقدس سے قطعی ناواقف، احکامِ اسلام سے بالکل انجان اور ضعیف الاعتقاد جاہل عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ "نانی عشو" میں اس کہانی کے علاوہ تین اور بے حد پُرلطف افسانے "رفاعی"، "سجدۂ ندامت"، اور "عرب و گلشن" بھی شامل ہیں۔ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھکر ظریفانہ لیکن نتیجہ خیز، سبق آموز اور نہایت موثر ہیں۔ تینوں افسانے حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیریں ہیں۔ یہ افسانے تفننِ طبع اور دل لگی کے لئے نہیں لکھے گئے (اور نہ یہ کبھی مُصوّرِ غم کا مقصد تھا) جو پڑھنے کے بعد دل سے محو ہو جائیں بلکہ قہقہوں کی گونج ختم ہو چکنے کے بعد آپ کے دل میں کوئی نشتر کافی عرصہ کیلئے چُبھا رہتا ہے۔ ہر مضمون کے اختتام پر آپ اپنی خواتین سے سوال کر سکتے ہیں "اُس سے کیا سبق ملا؟" مطمئن رہیئے آپکو صرف یہ جواب نہیں ملے گا "خوش وقتی!" بلکہ مسرّت کی تہہ میں اخلاق اور نصیحت کا بحرِ بے پناہ پوشیدہ معلوم ہو گا عورتیں ہنسی ہنسی میں ان افسانوں سے بڑے کام کی باتیں سیکھ لیتی ہیں۔ "سجدۂ ندامت" میں ایک جگہ ظرافت کے پھول اِس طرح کھلے ہیں:-

"نانی اندر کے دالان میں تھیں۔ قالین کا فرش تھا۔ اندر جانے کا ارادہ کرتی ہے تو پاؤں میں ڈاسن کا بوٹ، اُترے کیوں کر اور اُتارے کون؟ بیویوں نے ٹھٹھے لگانے شروع کئے۔ نانی نے آواز دی "بیٹی یہاں آؤ"۔ تو جُوتی سمیت لگی چلنے۔ برابر میں کھڑی تھیں پچی۔ اُنھوں نے ٹوک دیا "بوا نمازی قالین ہیں، مُنڈے اُتار لو"۔ چلی۔ ٹھٹکی اور کہا "ٹائی صاحب! مجھکو افسوس ہے ٹایا صاحب کی موٹ کا"

اتنے ہی میں پچی بول اُٹھیں "بیٹی ٹایا کیا؟ زبان کیوں موٹی ہو گئی؟"

سمیعاً - "ڈیل پچی صاحب! آپ ٹہذیب سے بولیئے"

پچی - "ٹہذیب؟ اچھی بیٹی پھر کہیو! ٹہذیب اور ٹائی؟"

سمیعاً میں اب تاب کہاں تھی، بیویوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہنس رہے تھے جلکر لگی اُول جلول بکنے اور چلی دروازہ کی طرف یہ کہتی ہوئی "اٹنا بڑ ٹمیز لوگ ملنے کے لائق نہیں"

پچی - "ٹمیز!؟"

اب تو بیویوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ گئے جسے دیکھو وہ لوٹی جا رہی ہے۔ جل تو رہی تھی غضب یہ ہوا کہ لڑکوں نے تالی بجادی اور سمیعاً جلتی بھُنتی اپنی گاڑی میں آ کر کوٹھی روانہ ہوئی"

سیرت و کردار کا اظہار حرکات کے علاوہ الفاظ سے ہوتا ہے۔ مزاحیہ عنصر زیادہ نمایاں کرنے کے لئے دونوں کا برابر حصّہ ہے اور بعض جگہ حرکات کی بجائے مکالمہ کے الفاظ دل میں گُدگُدی پیدا کر دیتے ہیں۔ اِس جگہ الفاظ کے ردّوبدل اور انکی ہیئت کی تبدیلی

سے جو اُن میں جان پڑگئی ہے وہ ہنسنے پر مجبور کردیتی ہے۔"ٹھذیب ؟ اچھی بیٹی پھر کہیو! ٹھذیب اور ٹانی ؟" میں کتنی حقیقت پر مبنی ظرافت بھری ہے اور محض الفاظ کی خاطر! اس کے علاوہ ملاحظہ فرمایئے انگریزی زدہ عورت کا مضحکہ کتنی لطیف طنز کے ساتھ اُڑایا ہے کہ پُرانے زمانے کی بچی (جسے ضرورتاً تائی کہا ہے) "ٹھذیب اور ٹانی" سے خیال کرتی ہے کہ بیچاری بھتیجی کی زبان موٹی ہوگئی ہے۔ جہاں ایسے موقعوں سے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑجاتے ہیں وہاں یہ تازیانے کا کام بھی کرتے ہیں کیونکہ انگریزی زدہ لڑکیاں اس مضمون اوراس کے انجام کو پڑھنے کے بعد اُردو کے انگریزی لہجہ کا کبھی ارادہ نہ کرینگی۔ اس قسم کی صحیح ترجمانی آپکو مصوّرِ غم کے اکثر مزاحیہ افسانوں میں ملے گی کہ ظاہری وضع قطع ظرافت آمیز ہونے کے باوجود بعض الفاظ دل میں نیر ونشتر کی طرح چبھتے ہیں۔ "رفاعی" میں ایک ایک مسلمان کا کردار مزاحیہ پیرائے میں نہایت کامیاب عبرتناک مُرقع ہے۔ یہ صاحب خیر سے حافظ بھی تھے اب جو بیبرس گئے اور ایک حسینہ پر نظریں پڑیں تو ریجھ گئے اوراس کے پیچھے جو اُن کی دُرگت بنی وہ ظاہری طور پر اپنی ظرافت میں آپکو جذب کرکے دُنیا سے قطعی غافل کردیگی مگر درحقیقت حسن حُسن و خوبی سے مصوّرِ غم نے بقول اکبرالہ آبادی اِن "موم بتیوں" کی دلربائی سے احتراز کرنے کا سبق دیا ہے اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ اسی طرح "عرب اور گلشن" میں جہاں آپ گلشن نامی ڈرپوک اور جفاکار رماما کا قصہ پڑھ کر ہنسی کو ضبط نہ کرسکیں گے وہاں عرب گھوڑے کا کردار آپکو کتاب کی اس آخری سطر سے اتفاق کرنے پر مجبور کریگی "آج مجھے معلوم ہوا کہ جانور آدمی سے بہتر ہے۔"

مستقل مزاحیہ تصانیف کے علاوہ بہت سی ایسی حزنیہ داستانیں (ٹریجڈیز) بھی ہیں جن کے ساتھ ساتھ ظریفانہ فسانے بھی شامل ہیں یعنی یہ مزاحیہ افسانے حزنیہ داستانوں سے قطعی علیحدہ ہیں اور اگر آپ چاہیں تو خواہ حُزنیہ پڑھیئے یا طربیہ ایک کا دوسرے پر اثر نہیں پڑے گا۔ اس کا اصول تھیٹر کا سا سمجھیئے جس میں اصلی (Tragedy) ڈرامے کے ساتھ کومک (Comic) بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض تصانیف ایسی ہیں کہ حُزنیہ داستان کے ہی کسی کردار کو مضحک صورت میں پیش کردیا ہے کہ متاثر ہونیکے ساتھ ساتھ طبیعت ظرافت کو بھی قبول کرلیتی ہے۔ اوّل الذکر کی مثالیں آپکو "تفسیرِ عصمت"، "تمغۂ شیطانی"، "خدائی راج"، وغیرہ میں ملیں گی کہ جس میں حُزن و الم کے ساتھ ساتھ "عبدل"، "نا کرٹے والی بھری"، "خانصاحب"، "لڈیا"، کے ظریفانہ کردار آپکو متبسّم کئے بغیر نہ رہیں گے۔ آخر الذکر مثالیں "اندلس کی شہزادی"، "تین بہنیں"، "سات روحوں کے اعمالنامے"، "انگوٹھی کا راز" وغیرہ میں ملینگی جن میں "سیلوس"، "اسلامی کی ماں"، "مولانا"، "مرقان" وغیرہ کے کرداران سے ملحقہ درد انگیز داستانوں کو پڑھکر آنکھ سے آنسو نکلوانیسے پیشتر آپ کے دل میں مزاح و طرب کی لہریں دوڑادیں گے۔ مثلاً "سات روحوں کے اعمالنامے" میں "مرقان" کو لیجیئے۔ یہ رب الانہر کے دربار سے دھتکاری ہوئی ایک (مردانہ) روح ہے جس کی تقصیر گناہ اِس طرح مشروط کی گئی ہے کہ وہ انسانی دُنیا کا بہترین تحفہ پیش کرے چنانچہ "مرقان" پیکرِ انسانی میں دُنیا میں آتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک عورت کی روح حاصل کرے لیکن اُسکے لئے ملک الموت کے کہنے پر اُسے سنکھیا کی تلاش ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی آبادی سے قطعی ناواقف ہے اسلیے سنکھیا لینے بجائے سنکھیا فروش کے جوتے والے کی دوکان

پر پہنچ جانا ہے۔

جوتے والے کی دوکان پر شام کے وقت بیسیوں آدمی بوٹ شوز گرگابی پمپ، یہ دہ، بیس قسم کا سامان دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا۔

"آپ کے ہاں سنکھیا ہے؟"

جوتے والا۔ "کیا چیز جناب؟"

مرقان۔ سنکھیا"

جوتے والا۔ "منوں! کتنی لیجئے گا؟"

مرقان۔ ایک روح کے قابل۔

جوتے والا۔ تشریف رکھئے۔ پہرے والے ادہر آیو۔ دیکھ آپ کیا مانگ رہے ہیں۔

کانسٹبل۔ کیا چاہیئے تمکو؟

مرقان۔ سنکھیا۔

جوتے والا۔ فرماتے ہیں فقط ایک آدمی کے لائق۔

کانسٹبل۔ کیوں صاحب!

مرقان۔ ہاں بس ایک روح کی۔

کانسٹبل نے ہاتھ تھاما اور کوتوالی میں جاکر پیش کیا۔ تھانیدار موجود نہ تھے۔ محرر نے لکھا پڑھی کر کے حوالات میں داخل کیا۔

مرقان۔ بھائی یہ کیا کرتے ہو؟ اس میں کیا ہو۔

کانسٹبل۔ ابے اندر چل نہیں ایک لات دیتا ہوں۔

مرقان کی صورت دیکھ رہے تھے کہ کانسٹبل نے ایک لات رسید کی اور کہا۔ چل اندر۔ ابے دوسروں کی روح کی فکر میں ہو، پہلے تیری روح قبض ہوگی۔

مرقان۔ آپ دنیوی ملک الموت ہیں؟

کانسٹبل۔ (قفل لگاکر) اب دیکھ لیجیو۔

مرقان۔ ایک جگہ مصیبت آئی تو یہ نتیجہ ہوا۔ یہاں کیا ہوتا ہے مگر سنکھیا کسی دوکاندار سے پوچھنا یا مول لینا نافرمانی ہے۔ واہ چچا ملک الموت اچھا مروایا۔!

تھانیدار نے آتے ہی آسامی کو باہر نکلوایا اور پوچھا کیا نام ہو تیرا؟ مرقان خاموش تھے کہ کیا نام بتائیں۔ مرقان کو صرف چند روحوں کی پرواز سے معاملہ پڑا تھا اور صرف بیماریوں کے نام جانتے تھے، کہنے لگے میرا نام "بخار!"

تھانیدار۔ بخار! بغیر پٹے باز نہ آئے گا؟ ٹھیک نام بتا۔ دفعدار ذرا اس سے نام تو پوچھو۔

دفعدار نے میاں مرقان کے ایک تو تھپڑ دیا اور دو گھونسے پھر پوچھا بتا کیا اصلی نام ہے؟

مرفان۔ ....کھانسی لکھ بیجئے۔

اب تو تھانیدار کو بھی غصّہ آگیا اور مارے ہنٹروں کے مرفان کی کھال اُڑا دی۔

مرفان۔ اوہ! آہ! ہے۔ ہو۔ میرا نام سنکھیا! اینتھر! دوزخ! آدمی!

تھانیدار تھک گیا اور پھر حوالات میں بند کر دیا۔

ملک الموت اپنے دوست کو چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے تھے، یہاں آکر دیکھتے ہیں تو مرفان حوالات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ زور سے قہقہہ مار کر کہا۔ "پیارے مرفان! یہاں اڑے ہوئے ہو!"

اس کتاب میں "سات روحوں کے اعمالنامے" اسقدر عبرتناک اور درد انگیز پیرائے میں لکھے گئے ہیں کہ ضابط سے ضابط شخص بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض مواقع مرفان کو اس طرح پیش آتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی بیچارگی پر ہنسے ہی پڑتا ہے۔ اور یہ کمال آپکو "مصوّرِ غم" کی تصانیف ہی میں ملے گا۔ کہ وہ کہیں آپکو تڑپائیں گی اور کہیں گُدگدائیں گی۔ لاریب وہ اس فن کے موجد تھے۔ میں شاید کسی جگہ لکھ چکا ہوں کہ ظرافت میں الفاظ کو بھی خاص اہمیت ہے اور جب یہ مسلسل مکالمے کی صورت اختیار کر لیں اس وقت تو ان کا اثر کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا حصّے میں مکالمے کے ہی ذریعے ظرافت پیدا کی گئی ہے جو نہایت کامیاب ہے۔

"تمغۂ شیطانی" میں ناکڑے والی بہری اپنے مکّار پیر کا پروپیگنڈا ایک جگہ اِن الفاظ میں کرتی ہے:۔

"ڈلیوں کا نام تو بہت سُنا تھا اب آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کل شام کو بیٹھے بیٹھے آنکھیں سُرخ ہوگئیں، سر کے بال کھڑے ہوگئے، مُنہ سے اتنے کف جاری ہوئے کہ میں ڈر گئی۔ خلیفہ جی نے کہا سب ہٹ جاؤ وحی آرہی ہے۔ جب حالت ٹھیک ہوئی تو (پیرجی) فرمانے لگے "بھائی نصرو! موسیٰ بھی بہت ڈرپوک تھا بیہوش ہوگیا۔ ہم تو اللہ سے اِس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے برابر کا یار (نعوذ باللہ) پہلے تو ہماری بات پوچھی نہیں اب پریشان ہوئے تو زلفی شاہ سوجھے۔ ملکُن موت کے سوا ایک فرشتہ آسمان پر زندہ نہیں ہے سارے کام یوں ہی لگے یوں ہی پڑے ہیں۔ دیکھتے نہیں گرمی کے تین مہینے صاف نکل گئے ایک بوند نہیں پڑی، کُل کام اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں، میں اب کیا ہاتھ بٹاؤں جیسا کیا ویسا بھرو۔ اِس وقت یہ ہی کہہ رہے تھے کہ بھائی زلفی جس طرح ہو تھوڑے سے فرشتے بھیجو۔ آسمان صفاچٹ پڑا ہے"۔

مُصنّف نے (نعوذ باللہ) لکھنے کے بعد اِن الفاظ کو تحریر کیا ہے لیکن کیا اسے بعید از قیاس کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، آئے دن زر پرست صوفی اور مکّار پیر جن کی جہالت اِس سے ظاہر ہے کہ فرشتۂ موت کا نام بھی صحیح نہیں لے سکتے اپنا پروپیگنڈا اسی طرح کراتے ہیں اور نعوذ باللہ خدا سے ہمسری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جہاں یہ الفاظ پڑھکر ہنسی آتی ہے وہاں انہیں تنبیہ بھی ہے اور اِن ایمان فروش شیطانوں سے محفوظ رہنے کی تاکید بھی۔ ایسی کتابوں کے علاوہ بعض افسانے اور بھی ایسے ہیں جو ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ لیکن اُمید ہے کہ جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائیں گے۔

اکتوبر ۳۳ء کے عصمت میں ایک افسانہ "مچھیرن کا جھولا" شائع ہوا ہے جس کو پڑھکر کونسا دل ہوگا جو نہ رویا ہو، کونسی آنکھ ہوگی جو پُرنم نہ ہوئی ہو لیکن اسکے ساتھ ہی "مُلّا جی" کا بے مثل ظریفانہ کیریکٹر آپ کو داد دینے پر مجبور کرے گا۔ ایک جگہ

فرماتے ہیں:-

چچی - "اے بی حمیرہ رونا دھونا تو ہوچکا اب میاں کو رخصت کروگی یا نہیں - ملّا جی بھی اتنی دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں - روپیہ دو تو کپڑا منگاؤں"

حمیرہ - "کس قدر روپے کی ضرورت ہوگی جو فرمائیں حاضر کردوں -"

چچی - جوان کا مُردہ ہے - بڈھے ٹھڈے کا نہیں - ڈاکٹروں کو تو سینکڑوں روپے لئے دئے اب اللہ کا سودا ہی - یہاں کی تو خیر بُری بھلی جیسی تھی گذر گئی - میں تو کہتی ہوں کہ وہاں کی اچھی بنے - لاؤ سَو روپے دیدو، ملّا جی حساب دیدیں گے - کل بیبر ہے پھول بھی کل ہی کردونگی اُس کا روپیہ شام کو دیدینا"

حمیرہ - پھولوں کی تو ضرورت نہیں معلوم ہوتی اور میں اسے پسند بھی نہیں کرتی"

چچی - "بیٹی تم پسند کرنیوالی کون ہو - ہوئی کرو، اَن ہوئی نہ کرو - مرنے والا تو پیچھے وارث چھوڑ گیا ہے - کیا اسی لئے کماتا تھا کہ نام لیوا نہ پانی دیوا - مرگئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود، لو بھئی ملّا جی اور بھی سُنا؟"

ملّاجی - "یہ بیچاری اسلام کی باتوں کو کیا جانیں - ان کو نہ حکموں کی خبر، نہ حدیثِ پاک سے واقف - اسلام پر یہ وقت آگیا مسلمانوں کو یہ تک خبر نہیں کہ مسئلہ کیا ہے - سُنیئے مُردہ قبر میں اوندھا کردیا جاتا ہے - جب پھول ہو جاتے ہیں اُس کے بعد فرشتے سیدھا کرتے ہیں"

چچی - "سُبحان اللہ سُبحان اللہ - حق ہے ملّا جی حق ہے"

ملّاجی - "میں سامان لایا"

ملّا جی تھوڑی دیر کے بعد میت کو تختے پر لٹا کر اس طرح ڈر کر بھاگے جیسے بچّہ ہیّا سے بھاگتا ہے اور فرمانے لگے لاحول ولا قوۃ الا باللہ - یہ مسلمان کی میت ہی جس کے مُنہ پر ڈاڑھی نہ مونچھ! نہلانے والا ہی کافر اور کندھا دینے والا بھی گنہگار - پہلے تو ڈاڑھی کا انتظام کرو - پھر چار گواہ لاؤ جنہوں نے اسکو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہو"

چچی - "ملّاجی یہ تو غضب ہوگیا، ڈاڑھی کا کیا انتظام ہوسکتا ہے - اور میرے ہاں تو یہ بیماری میں آیا تھا ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھی"

ملّاجی - "بس تو اس کی بخشش بھی مشکل ہے اور کفن دفن بھی - یوں کہو یہ کافر مرا ہے - جب بیماری میں بھی اللہ سے نہ ڈرا تو یہ کافر اس کا باپ کافر - اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ"

چچی - "اے ہے ملّاجی ایسا غضب تو نہ کرو - یہ تو میرا سگا بھتیجا ہے اسکو تو اوّل منزل کرنا ہی پڑے گا"

ملّاجی - "آپ بہت پریشان کرتی ہیں - آپکو کیا معلوم نہیں، آپ نے تو پڑھا ہوگا کہ فرشتے جب حساب کتاب کو آتے ہیں اور بے ڈاڑھی کا مُردہ دیکھتے ہیں تو لعنت بھیجکر اور تھوک کر چلے جاتے ہیں - خیر اب ایک ترکیب ہو سکتی ہے - سوا گیارہ روپے لاؤ - میرے پاس ایک ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے وہ عرب شریف کی ہے ڈپٹی صاحب کے لئے رکھی تھی، آپ لے لیجئے"

حمیرہ نے ملّاجی سے کہا "اپنے شوہر کو میں خود نہلاؤنگی"

مُلّا جی۔ لاحول ولا قوۃ۔ استغفر اللہ۔ اس عورت کو یہ تک علوم نہیں کہ شوہر کے مرتے ہی نکاح ٹوٹ گیا۔ اب اُس پر پردہ واجب ہے۔ ہٹاؤ اس کو یہاں سے' ملک یوم الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین سب کو گنہگار کرتی ہے۔

مُلّا جی نے میّت کے کپڑے اُتارنے شروع کئے۔ قمیص میں سونے کے بٹن دیکھ کر مُنہ میں پانی بھر آیا۔ حکم دیا قمیص اللہ کے نام جائیگی۔ یہ کہہ کر سلک کی قمیص بٹنوں سمیت جیب میں رکھ۔ ہوا بند تھی اس لئے کیوڑے اور گلاب کی جو بوتلیں ساتھ تھیں ایک گلاس میں نکالکر نوش فرمائی اور ایک پھریری لیکر کچھ سوچ کر بیگم صاحبہ کو آواز دی اور کہا "میں نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔ سنسنیاں آرہی ہیں' کچھ کھانے کو دیدو تو دہڑ میں ڈال لوں۔ مروں جیوں تمہارا کام تو کر دوں۔ پھر زوال کا وقت قریب ہے میّت کو نہلانے کا بھی حکم نہیں ہے مگر گھر میں میرے سوا کوئی اور کچھ نہ کھائے کیونکہ تحقیقی مسئلہ ہے۔ اگر گھر میں کچھ تیار نہ ہو تو برسات کے دن ہیں بازار سے ہلکی سی غذا منگوا دو۔ دودھ پھینیاں۔ اندرسے کی گولیاں اور دس بارہ آم سردلی کے۔ میں نیاز دیدونگا"

حمیدہ کے عاشقِ زار شوہر کی بے بس موت سے دل پر جو اثر ہوتا ہے۔ اس کے زائل ہونے سے پیشتر مُلّا جی کے احمقانہ فتوے قارئین کو بظاہر ہنساتے ہیں، لیکن دُور بین نظریں ان پر ماتم کرتی ہیں۔ اسلام جیسا سچّا اور پاک مذہب ان ہی جیسے جاہلِ مطلق مُلّاؤں اور پیروں کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ شوہر کی پرستار بیوی کا دل خون ہوئے جا رہا ہے اور مُلّا جی خود غرضی کی خاطر اسلام کو اُلٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔ بتایئے کفر کا ان شانئک ھو الا بتر سے تعلق کیا اور نکاح ٹوٹنے کا ملک یوم الدین سے واسطہ کیا؟ انہی بے سر و پا مولویانہ باتوں سے اسلام کو مشکل اور سنگدل بنایا جا رہا ہے۔ مُلّا جی کا یہ فرمانا کہ مرنے کے بعد نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور پردہ واجب ہو جاتا ہے مصنّف کا مبالغہ نہیں بلکہ اُس کے آنسو ہیں اس ایک بڑے گروہ پر جو مذہب کا اجارہ دار بنا ہوا ہے اور مُلّا جی جس کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ پھولوں کے متعلق مُلّا جی کا مضحکہ خیز ارشاد ہنسانے کے لئے نہیں بلکہ ان لوگوں کی ذہنی پستی کی دلیل ہے۔ ڈاڑھی وغیرہ کا مسئلہ متنازع فیہ ضرور ہے لیکن جو کچھ مُلّا جی نے کہا وہ یقیناً جہالت اور حماقت کا ثبوت ہے۔ مصنوعی ڈاڑھی کے متعلق البتہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خلافِ مشاہدہ ہے۔ لیکن ایسا مبالغہ مزاح نگار کا جائز حق ہے کیونکہ احمق مولوی جب ڈاڑھی نہ ہونے کی یقینی وجہ لعنت اور پھٹکار بتاتے ہیں تو یہ ناممکن نہیں کہ وہ اس قسم کی مضحکہ خیز اور ناممکن العمل باتیں کہنے پر بھی آمادہ ہو جائیں۔ غرض بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف آپ کو ہنسانا چاہتا ہے لیکن درحقیقت ان نام نہاد مذہبی آدمیوں کی جہالت کا مضحکہ اُڑا کر مسلمانوں کے تنزّل پر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا خط یاد آیا جن کا نام ذہن میں محفوظ نہیں ہے کچھ سال ہوئے اُنھوں نے یہ خط حضرت علاّمہ راشد الخیری کو لکھا تھا۔ اتفاق سے مجھے بھی اس خط کو پڑھنے کا موقعہ ملا اور اس کے چند فقرے اب تک یاد ہیں "......

مولانا! آپ کی ٹریجیڈ نیز کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جس کسی کو اپنے اندر دق کے جراثیم داخل کرانے ہوں وہ آپ کے حزنیہ لٹریچر کا مطالعہ کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ نے مزاحیہ مضامین لکھ کر ڈاکٹروں کی طرح اس مرض کا تریاق خود ہی تجویز کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ صبح زندگی"، "شام زندگی"، وغیرہ کے پڑھنے والوں کے لئے "نانی عشو"، "ولایتی نُھی" وغیرہ پڑھنا از بس

ضروری ہے"!...... یہ تو ایک ڈاکٹر کی رائے تھی لیکن اس کے علاوہ وہ لوگ بھی جو ادب کے نباض ہیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس طرح حزنیہ تصانیف میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے اسی طرح ظرافت نگاری میں (خصوصاً نسوانی کردار اور سبق اخلاق و اصلاحِ معاشرت کے پہلو کو مدِنظر رکھ کر) کوئی دوسرا مزاح نگار اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اُن کی ظرافت کے مطالعہ سے بھی صرف ان کا اعلیٰ درجہ کا مزاح نگار ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کا معلّمِ اخلاق اور مصلحِ نسواں ہونا ہی مستند ہو جاتا ہے۔

یہ مضمون "مصوّرِ غم" کے مزاحیہ لٹریچر پر میں نے اجمالاً لکھا ہے۔ اُمید ہے "راشد الخیری نمبر" میں کوئی اور صاحب مفصل لکھ سکیں گے۔

یہاں یہ ذکر کرنا ناموزوں نہ ہوگا کہ چند دن ہوئے پنجاب کے ایک پُرانے پرچے کے ایڈیٹر صاحب کا ایک مضمون علامہ موصوف کے متعلق شائع ہوا جس میں نہیں آتا کہ کس طرح یہ الفاظ اُن کی قلم سے نکل گئے "—— اُنھوں نے مزاحیہ افسانے بھی لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی طبیعت حزن و ملال کی تصویر کشی کے لئے ہی موزوں تھی ——" اس "لیکن" کا مطلب واضح نہیں ہے۔ اگر اس کا مفہوم یہ ہے اُن کو اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی تو میں ان بیچارے ایڈیٹر کو معذور سمجھتا ہوں کیونکہ میرے نقطۂ خیال سے ظرافت کا دائرہ چچا یا ماموں کی حماقتوں اور ننھے کی ماں وغیرہ کی چیرہ دستیوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ اُنکے فرسودہ قصے سُنتے سُنتے کان پک گئے ہیں اور بقول محمد حسین ادیب اِن چبائے ہوئے لقموں میں کوئی مزا باقی نہیں رہا۔ ضرورت ہے کہ ظرافت میں جدّت اور تنوع پیدا کیا جائے۔ ایسے بے جان کردار عرصہ ہوا مر چکے ہیں۔ اُن کی شیطان کی سی آنتیں کب تک دراز ہونگی؟

حقیقت یہ ہی کہ ظرافت اور مزاح نگاری بہت بلند صنف ہے اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے بس کی نہیں۔

—— صادق الخیری دہلوی

گالیات

علم و ادب کے میدان میں شعر پر لاتعداد مقالے تصنیف کئے جا چکے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ گالی پر آج تک ایک پمفلٹ بھی شائع نہ ہوا۔ حالانکہ ہماری روزمرّہ کی زندگی کے لئے جس طرح شعر کا احساس ضروری ہے اُسی طرح گالی کا احساس بھی۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ گالی جب انتہائی درجۂ ارتقا پر پہونچ جاتی ہے تو شعر کہلانے لگتی ہے۔ اس لئے علم شعر کے متعلق ہماری تمام معلومات اس وقت تک تشنہ رہیں گی جب تک گالی کو کہ جو شعر کی ابتدائی صورت ہے ہم ادب فلسفہ اور نفسیات کی روشنی میں جانچ نہ لیں۔

گالی کی تعریف:- گالیوں کا منبع جذبات کی فراوانی ہے۔ اس لئے شعر کی طرح یہ بھی وجدانی شئے ہوئی جس طرح انجن میں بھری ہوئی بھاپ کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے کچھ بخارات خارج کر دیئے جاتے ہیں اُسی طرح دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور طبیعت کو راہ پر لانیکے لئے شعر کہے جاتے ہیں اور گالیاں دی جاتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گالی اور شعر میں فرق کیا ہے؟ اس کا مختصر ترین جواب "سماج کی ذہنیت" میں مُضمر ہے۔ وجدانیات کے ماتحت ہر وہ عبارت کہ جو علانیہ پڑھی جا سکے شعر ہے اور جس عبارت کا علانیہ پڑھنا بولنا اور سُننا ممنوع ہو وہ گالی ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے خلوت میں شعر اور گالی کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ یہ تعریف ہندوستان کی تمام اقوام۔ فرقوں اور طبقوں کو محیط کر لیتی ہے جن میں جاہل اور عالم کی کوئی تخصیص نہیں البتہ افراط و تفریط کا سوال ہے۔

گالیوں کی تقسیم (باعتبار معنی) (۱) اسمی، وہ گالیاں کہ جن میں محض نام لے دیا جاتا ہے۔ اس صنف میں چند نام ہیں کہ جو سوسائٹی میں شجرِ ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی ممانعت اس خیالی گناہ میں لذّت پیدا کرنے کے لئے کافی ہو۔ اگر زبان کے اس سنسر کو اُٹھا دیا جائے تو گاندھی کے نمک کی طرح ان میں بھی کوئی چاشنی نہ رہے گی اور مخصوص طریقہ سے بچّے گالی کی تکملہ پر مُصر نہ ہونگے۔

(۲) خبری، وہ گالیاں کہ جن میں محض اظہار واقعہ کر دیا جاتا ہے۔ جس کا تعلق مخاطب کی ذات سے ہو سکتا ہے یا اس کے خاندان سے۔ تاثرات کے لحاظ سے پہلی صورت میں وجدانی کیفیات کا مظاہرہ اسقدر بے ساختہ نہیں ہوتا جسقدر کہ آخری صورت میں۔ اندریں حالات داد دینے میں مخاطب کی زبان ہی حصہ نہیں لیتی بلکہ تمام جسم کا اشتراک عمل ہوتا ہے جس کے اثرات اکثر صورتوں میں دیرپا ثابت ہوتے ہیں بشرطیکہ طرفین میں "ذوقِ ثقیل" کی کمی نہ ہو۔ ایسی تمام گالیاں کم و بیش جنسیات کے تحت میں آتی ہیں جو ایک کتاب ہے غلط فہمیوں کے مسلسل ابواب کی۔ جنسی گالیوں کے ماتحت جو نقصِ امن کی وارداتیں رُونما ہوتی ہیں۔ اُن کا ایک حد تک یہی سبب ہے کہ مہذب دُنیا کا انسان حقیقت کو دیکھنے اور سُننے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔ شاید اسی وجہ سے عربی میں الحقّ مُرّ کہا گیا ہے۔

(۳) تخیلی۔ وہ گالیاں کہ جن میں دیرینہ آرزوں کا تخیل شامل ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ایک گالی ور (گالی دینے والا) اپنے مخاطب کے عزیزوں سے اپنے ذہنِ لاشعوری میں ایک رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے لیکن چونکہ اُسکی تکمیل کا امکان نہیں ہوتا اسلئے حسرتوں اور ارمانوں کی زبانی تکمیل ہی سے دلکو خوش کر لیتا ہے۔

(۴) وصفی۔ وہ گالیاں کہ جن میں کوئی نُمایاں صفت بیان کردی جاتی ہے۔ یہی وہ صنف ہے جہاں سے گالی اور شعر کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتی ہیں۔ اور شاعر اور گالی ور کی ہستی ایک دوسرے سے متصل۔ زبان کی وسعت۔ خیالات کی نزاکت۔ تشبیہوں اور استعاروں کی خوبیاں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ گالی وسیع ہوکر پھبتی۔ ضلع۔ جگت۔ ہزل اور ہجو کے مرتبہ تک پہونچ جاتی ہے۔ طنزیات ایک مستقل فن ہے جس کی پرواز شعر کی نازک خیالی سے بھی پرے ہے۔ اُس کی اصل گالی ہی ہے جس کو کراہیت کے بجائے نفاست۔ ثقالت کے بجائے نزاکت۔ اور بیساختگی کے بجائے تکلف اور تصنع سے آراستہ کرکے ارتقاء کی منزل آخر تک پہونچا دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کونین کی کڑوی گولی پر شکر کا قوام۔ لیکن طبعی خواص دونوں کے تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔

گالیوں کے محرکات:

(۱) جذبۂ غضب۔ تمام وہ اشیاء کہ جو انسان کی جسمانی اور روحانی اذیت کا موجب ہوتی ہیں اور اُس کی خواہشات کی تکمیل میں سدِّ راہ وہ اس جذبہ کو بھڑکاتی ہیں۔ خواہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح۔ ایسی حالت میں انسان اپنی امکانی طاقت صرف کردیتا ہے کہ اِن اشیاء کو فنا اور برباد کردے یہاں تک کہ جب وہ عاجز آجاتا ہے تو اُس کو خود اپنی ذات پر بھی غصّہ آتا ہے اور اس آخری کوشش میں وہ اپنے جسم اور روح دونوں کو قُربان کردیتا ہے۔ کائنات کو محفوظ رکھنے کے لئے قدرت کا یہ اُصول کہ ــــ انسان خدا نہیں بن سکتا اور خدا انسان نہیں بن سکتا۔ حکمت پر مبنی ہے ورنہ دونوں صورتوں میں ہمارے لئے ہر روز روزِ حشر اور ہر شب قیامت کی رات ہی ہوتی۔ بہرحال قدرت نے ایک دوسری پیش بندی بھی کی ہے اور وہ یہ کہ انسانی فطرت کے اِس تخریبی عنصر کو کم کرنے کے لئے اُس نے انسان کو گالیاں سکھادیں تاکہ زیردستوں اور زبردستوں میں تصفیہ کی صورت زبانی ہی رہے۔ لیکن ان پیش بندیوں کے باوجود کمزوروں کی زبان درازی کبھی کبھی شہ زوروں کی دست درازی میں تحریک پیدا کردیتی ہے لیکن اگر تہذیب یہ چاہتی ہے کہ ضعیفوں کے پاس گالیوں کا آخری حربہ بھی باقی نہ رہے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ ـــ غریبوں کا دُنیا میں اللہ والی۔

اس وقت کو رفع کرنے کے لئے قرآن شریف نے متمدن انسان کو گالی کا ایک بہترین عوض عنایت فرمایا تھا اور وہ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ تھا۔ لیکن ہم ہندی مسلمانوں پر خدا رحم کرے کہ ہم نے اس کو اپنے محاورہ میں "لاحول بھیجو" اور لاحول پڑھو بنا لیا ہے جس سے عام مفہوم گالی ہی کا لیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس میں شک ہو تو ایک غیرت دار مسلمان پر تجربہ کرکے دیکھ لے۔

(۲) جذبۂ محبت۔ گالیاں عداوت میں دلچسپی پیدا کردیتی ہیں اور محبت میں چاشنی۔ صورتِ اوّل میں اُن کو گالیاں ہی کہتے ہیں مگر صورتِ آخر میں "سہالیاں" کہتے ہیں۔ ماؤں کی گودیں بچّوں کے لئے گالیوں کا بہترین اسکول ہیں۔ اور شاعروں کی غزلیں گالیوں کا جامع نصاب۔ اگر اپنے دوستوں کو وفادار اور اپنی اولاد کو فرمانبردار بنانا چاہتے ہو تو اُن کی مدارات گالیوں سے کرو۔ لیکن دفتر میں نام پیدا کرنے اور صاحب کے دل میں جگہ پیدا کرنے کے لئے یہ دستورالعمل مفید نہیں۔ ایک تجربہ کار اور رمتا ہیڈ کلرک نے اپنے دفتر کے ایک نوآموز کلرک کو ایک دن حسبِ ذیل مشورہ دیا تھا۔

نوجوان کلرک نے کاغذات کا فائل ہیڈ کلرک کی میز پر رکھتے ہوئے کہا ـــ

"میں آج صاحب کے پاس دستخط کرانے نہیں جاؤنگا۔"

"کیوں؟"

"صاحب آج (mood) موڈ میں نہیں ہیں۔ ڈیم فول کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم جلد مستقل ہونا چاہتے ہو؟"

نوجوان نے سر ہلا دیا۔

"تو ایسے موقعوں پر جبکہ صاحب موڈ میں نہ ہوں بلا ضرورت بھی چلے جاؤ۔ احتیاطاً کانوں میں روئی ٹھونس لیا کرو۔"

نوجوان خاموش رہا۔

"کیا تم میری کرسی پر جلد بیٹھنا چاہتے ہو —— کیونکہ میری پنشن کے دن قریب ہیں۔"

نوجوان مسکرا دیا۔

"تو منتظر رہو کہ صاحب تمہارے ایک لات ماردیں۔"

نوجوان کے چہرے پر شکن آ گئی۔

"تو ایک استعفیٰ تیار رکھو تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔"

(۳) اظہارِ طاقت۔ ایک فرد کو اپنے دوسرے ہم جنسوں پر فوقیت جتانے کے لئے چند لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً علم۔ دولت۔ لباس۔ حسن وغیرہ لیکن جن لوگوں کے پاس اظہارِ طاقت کے تمام ذریعے مفقود ہوتے ہیں اُن کا منہ ہونٹوں کے بجائے گالیوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ صاحب اور پولیس اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

(۴) ہمدردی و نقل۔ فیشن ایبل چیزوں کی طرح گالیاں بھی وبائی ہیں۔ دونوں میں اختراع و ایجاد بھی ہوتی رہتی ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ایک موجد اپنا اشتہار دیتے ہیں اور دوسری کے موجد گمنام ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ اُن لوگوں کی اہمیت بھی مسلّم ہے کہ جو ان تمام اختراعات کو قدیم خرافیات کی طرح محفوظ رکھتے ہیں اور اپنی سوسائٹی میں سینہ بسینہ منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ایسی اقوام جو گالیوں کو محض تکیہ کلام اور فیشن کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں اُن میں زیادہ ہندی انگریز ہیں۔

گالیوں کی زبان:۔ ہندوستان میں تہذیب خواہ وہ قدیم ہو یا جدید ہمیشہ سے بدیشی اشیاء کی سرپرستی کرتی رہی ہے جن میں حکومت اور زبان مخصوص طریقہ سے بیرونی ہی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیسی گالیاں حقیر خیال کی جاتی ہیں اور بدیشی گالیاں معزز۔ یعنی گالیاں بالذات ممنوع نہیں ہیں بلکہ بالزبان ممنوع ہیں۔ وہ تمام الفاظ جو دیسی زبانوں میں گالیوں کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں اعلیٰ لغت اور مہذب جماعت سے خارج کر دیئے گئے ہیں لیکن اگر وہی مفہوم بدیسی زبانوں میں ادا کر دیا جائے تو دونوں میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے جُہلا کی تمام گالیاں بازاری ہیں اور اُن کے جُہلا کی گالیاں ٹکسالی۔ گو یا ہم کو اپنی زبان میں غصہ کرنے کی اجازت ہی نہیں!

گالیوں کی تقسیم (بلحاظ زبان) (۱) موٹی گالیاں۔ جن کو سُن کر شریفوں کے احساسات کو ٹھیس لگتی ہے اور تنفر اور کراہیت کے تمام آثار جسم پر اور چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں سوائے ہندوستان کی دیسی زبان ٹھیٹھ ہندی کے۔ ان کی سرپرستی ہمارے جُہلا کا طبقہ کیا کرتا ہے۔ ورنہ یہ کب کی مفقود ہو گئی ہوتیں۔

رسمی گالیاں۔ اسی قبیل کی گالیاں ہیں کہ جو روایتی طور سے ہمیں قدیم ہندوستان سے موصول ہوئی ہیں اور ہماری مہذب سوسائٹی میں جگہ پا گئی ہیں۔ یہ گالیاں ہم لوگوں کی زبان سے بیساختہ نکل جاتی ہیں لیکن ہم اکی لہروں میں

اس قدر جلد گھُل جاتی ہیں کہ سامعین کے کانوں تک بھی نہیں پہونچ سکتیں۔ یا اگر پہونچتی بھی ہیں تو ہمارا تلفظ اور لہجہ اُن کے روپ کو بدل دیتا ہے۔ ہندوستان میں موٹی گالیاں رامپور کی اور بمبئی میں بھنڈی بازار کی مشہور ہیں۔ "رسمی گالیاں" علی گڑھ۔ لکھنؤ۔ لاہور اور حیدرآباد کی ٹکسالی خیال کی جاتی ہیں۔

(۲) گوری گالیاں۔ دوستوں کو چھیڑنے۔ مذاق بنانے۔ بچوں کو ستانے اور تزئین کلام کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ اس صنف میں کسی خاص زبان کی تخصیص نہیں ہے۔ البتہ فی زمانا انگریزی ان کی جگہ نہایت سرعت کے ساتھ لے رہی ہے۔

(۳) شرعی اور علمی گالیاں۔ ان کے لئے بلا استثنا عربی، فارسی، اور سنسکرت زبانیں استعمال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ تمام ہندوستانی واعظوں خطیبوں اور پنڈتوں کو انہیں زبانوں میں جلال اور غصّہ آتا ہے۔

گالی ور اور پیشے:- عام طور پر لوفر اور شریف کے درمیان امتیازی نشان گالیوں کا خیال کیا جاتا ہے لیکن میں نے آج تک اُس شریف آدمی کی صورت نہیں دیکھی کہ جو اندھیرے میں کسی میز یا پلنگ سے ٹھوکر کھا کر گرا ہو اور اُس نے اُس چیز کی شان میں ایک تازہ بتازہ فصیح و بلیغ قصیدہ نہ پڑھا ہو۔ نہ صرف یہی بلکہ میں ایسے آدمیوں کو بھی جانتا ہوں کہ جنہوں نے اُس بیگناہ شے کی لات نوازی بھی کی ہے اور صبح کو اُٹھکر خود ہسپتال گئے ہیں اور اُس مجروح شے کو بڑھئی کے کارخانہ میں مرمت کے لئے بھجوایا ہے۔ اسی طرح اگر یہی تکلیف آپکو کسی انسان کے ہاتھوں پہونچی ہو۔ جسمانی یا روحانی ـــ تو میں یقین نہیں کرسکتا کہ آپ اُسوقت لکھنؤ اور دہلی کی زبان میں فرمائیں گے کہ ـــ دیکھئے خبردار رہیئے ورنہ آپکی مادر محترمہ کی شان میں میرے دہن سے چند گستاخانہ الفاظ صادر ہو جائیں گے۔ یا اگر خدانخواستہ آپ کو کوئی شخص معذور اور مجبور سمجھکر آپکے جسم اطہر سے بے ادبی کرے تو میں نہیں خیال کرسکتا کہ آپ اُس وقت اقبال کا شکوہ سوز و ساز کے ساتھ پڑھیں گے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ گالی عین اقتضاء فطرت انسانی ہے۔ البتہ بعض لوگ ضرورتاً استعمال کرتے ہیں اور بعض لوگ عادتاً۔ دراصل آخرالذکر طبقہ ہی پر ہماری اصطلاح گالی ور صادق آتی ہے اور جہاں کہیں ہم نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے وہاں کم و بیش اسی معنی کے ماتحت کیا ہے۔

لوگوں کا عام خیال کہ گالی ور دراصل طبقۂ جہلا میں پیدا ہوتے ہیں غلط ہے۔ اس کا تعلق فی الحقیقت انسان کی فطرت۔ قومیت، پیشے اور ماحول سے ہے۔ اس سے اِنکار نہیں کہ تعلیم بھی ایک قسم کا ماحول ہے لیکن مسلّم ماحول نہیں ہے بلکہ اُس کا ایک حصّہ ہے۔ اسی لئے وہ فطرت اِنسانی کو یکسر تبدیل نہیں کرسکتی ورنہ چند نسلوں کی تعلیم کے بعد بچے خود بخود تعلیم یافتہ۔ مہذّب اور متمدن پیدا ہونے لگتے اور اُن کو ابتداء عمر سے اسکولوں اور کالجوں میں بھیجنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اپنے بیان کی تائید میں ہم ہندوستان کی دو تعلیم یافتہ اور مہذب اقوام پارسی اور ہندی انگریزوں کو پیش کریں گے اور اُن کے نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد تحقیق کریں گے کہ ان کی قومیت پہ گالیوں کا اتنا گہرا رنگ کیوں چڑھا ہوا ہے۔

پارسی۔ ان کی گالیاں تجارتی ہوتی ہیں۔ جن کی مدد سے ان کی گفتگو دلچسپ اور ان کا بیان پُر زور ہو جاتا ہے۔ من حیثیت القوم پارسی جسمانی لحاظ سے نازک واقع ہوئے ہیں اسی لئے ذرا زبان دراز ہیں۔ ضعیف عورتوں کے سروتوں کی طرح ان کی زبان چلتی ہی رہتی ہے لیکن ان کی گفتگو کا عنوان علمی اور فلسفی نہیں ہوتا بلکہ نوجوان لڑکیوں کی گفتگو

کی طرح ذاتیات سے متعلق ہوتا ہو۔ وہ بے انتہا تجارتی اور عملی انسان واقع ہوئے ہیں اسی لئے اُن کا اخلاق بھی ایک قسم کا تجارتی سرمایہ ہے اور اُن کی گالیاں سُنہری کنجیاں جن سے اجنبیوں کے دل کا قفل جلد کھُل جاتا ہے۔ مغائرت کی اوٹ ہٹ جاتی ہے اور چشمِ زدن میں بے تکلفی ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا کبھی غیر تھے ہی نہیں۔ مقاصد کی تکمیل کے بعد ان کی دوستی متاع کی طرح وقتِ معینّہ پر ختم ہو جاتی ہے۔

ہندی انگریز۔ دراصل ایک معمہ ہیں۔ ہندوستانی ان کو انگریز خیال کرتے ہیں اور انگریز ان کو ہندوستانی۔ ان کی گالیاں سو فیصدی انگریزی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کو استعمال کرنے کے تمام موقعے ہندوستانی۔ چونکہ اُن کا وجود دونوں اقوام کی متحدہ لغزشوں کا نتیجہ ہے اسی لئے ترکہ اور ورثہ میں اس کے سوا اور کیا مل سکتا تھا۔

مارواڑی۔ اسی سلسلہ میں تمام سُود خوار اقوام بھی شامل ہیں۔ ان کا شمار ایک طریقہ سے گالی وروں میں نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ صرف سُنتے ہیں دیتے نہیں۔

مزدور۔ بعض انسانوں میں فطرتاً مارنا اور مار کھانا۔ دونوں قسم کی جبلّتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ مزدوروں میں یہ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اسی لئے وہ کمزوروں کو مارنے کی خاطر گالی دیتے ہیں اور زبردستوں کو مار کھانے کی خاطر۔ لیکن سرمایہ داری کے شکنجہ میں پھنس کر ان کا بیشتر حصّہ ان جبلتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اور اُن کے بجائے ان کو قدرت سے گالیاں دینا اور گالیاں سُننا بخش دیا گیا ہے جس طرح کثرتِ استعمال کے بعد افیمچیوں کیلئے افیون بھی غذا بن جاتی ہے اسی طرح ان کے لئے گالیاں جزوِ کلام بن گئی ہیں۔ اس حد تک پہونچنے کے بعد یہ لوگ واقعی بیگناہ اور بے ضرر ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اُن کی نیت دراصل کسی کے احساسات کو صدمہ پہونچانے کی نہیں رہی بلکہ یہ لوگ دوست دشمن عزیز اور غیر سب سے ایک ہی طرح ہمکلام ہوتے ہیں۔ مزدوروں کے کارفرما اور ہندوستان کی پولیس اُن کے احساسات کی موت کے راز سے خوب واقف ہو گئی ہے اور اسی لئے اُنکی بیاقت کے مطابق بات کرتے ہیں اور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چونکہ اُن کی متذکرۂ بالا جبلتوں کے ارتقاء کی وجہ صرف یہی ہے کہ ــــ ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ اس لئے دن بھر کی شدید محنت کے بعد بیچارے گالیوں کا مشاعرہ منعقد کرکے دل بہلا لیتے ہیں۔

جنا وربان۔ اس طبقہ میں تمام وہ لوگ شامل ہیں کہ جو اپنے دن کا بیشتر حصہ جانوروں کی صحبت میں گذارتے ہیں مثلاً کسان جو بیلوں سے ہل چلاتا ہے۔ کٹھارے والا اونچی نیچی پگڈنڈی پر مردہ بیلوں کی مدد سے رینگتا ہے۔ یکہ تانگہ اور گاڑی بان میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ پولیس اور سواریوں کے بوجھ سے لدا ہوا زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ جانور اور انسان کی اس مسلسل کشمکش میں دونوں اپنی اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ ایک اڑ جاتا ہے اور دوسرا بے صبر ہو کر گالیوں پر اُتر آتا ہے ــــ لیکن ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں۔ کبھی کبھی لات اور چابک کا طرفین میں تبادلہ بھی ہو جاتا ہے۔

سب سے زیادہ معصوم گالیاں اسی طبقہ کی ہیں اور مخصوص طریقہ سے کاشتکار کی کہ جس کے دُکھ درد کا کوئی شریک نہیں سوائے دو بیلوں کے۔ اس کی گالیوں میں درد ہوتا ہے التجا ہوتی ہے اور شکوہ ہوتا ہے۔ مگر ظلم نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود مظلوم ہے کیا اُس کی پیٹھ پر فوجدار۔ زمیندار اور تحصیلدار کے تازیانے نہیں پڑتے؟ یہی وجہ ہے کہ بیل اُس کو لات نہیں مارتے۔

گالیات کا فن

میں اس پر بالتفصیل رائے زنی نہیں کر سکتا لیکن اشارۃً حضرت غالب کا مشورہ درج کئے دیتا ہوں جس کو پڑھکر آپ خود اپنی رائے قایم کریں گے۔

غالب مرحوم کی حیات میں ایک کتاب کی تحریر پر ہندوستان کا "سوفیانہ فرقہ" آپ سے اس حد تک ناراض ہو گیا تھا کہ خطوط میں ہندوستان کے اطراف و جوانب سے گالیوں کے پارسل روزانہ بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک میں کسی نے آپکو ماں کی گالی بھی دی تھی۔ اُس وقت آپ نے حالیؔ مرحوم سے فرمایا تھا کہ افسوس ہے اس شخص کو گالی دینا بھی نہیں آتی۔ مجھ ضعیف اور عمر رسیدہ کو ماں کی گالی دینا حماقت ہے۔

دراصل

بچے کو ماں کی گالی
جوان کو بیوی کی گالی
اور بوڑھے کو بیٹی کی گالی دیجاتی ہے۔

ابوطاہر (لائک)

روحِ ظرافت!

چغتائی صاحب کے آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اِس کتاب کا دیباچہ اسقدر پُرلطف لکھا ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پہلا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" وہ مشہور و معروف افسانہ ہے جو چغتائی صاحب کی شہرت کا باعث ہوا۔ اس افسانے میں بالکل ہی نئے اسٹائل میں ایک چھوٹا پلاٹ پیش کیا گیا ہے اور پیرایۂ بیان اس قدر جاذب توجہ ہے کہ افسانہ شروع کرنے کے بعد ناممکن ہے کہ آپ کتاب کو ہاتھ سے رکھدیں۔ کولتار میں ایک لڑکی کے واقعات اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ انہیں پڑھ کر آپ تھوڑی دیر کے لئے تو آلام حیات کو بالکل ہی بھول جائیں گے۔ اسی طرح پکنک۔ الشذری، شاطر کی بیوی وغیرہ بھی ہر نوعیت سے تفریح دماغ کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اس ظرافت کی روح کو ہر پڑھے لکھے آدمی کے گھر میں ہونا چاہیئے تاکہ مکروہات دُنیا سے جب طبیعت پریشان ہو تو اس کا کوئی افسانہ پڑھ لیا جائے اور انبساطِ روحانی حاصل کر کے اپنا غم غلط کر لیا جائے۔ دوسرا ایڈیشن خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔

قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ (عہ۸) علاوہ محصولڈاک۔

کھرپا بہادر

چغتائی صاحب نے اِس ناول میں ایک عجیب و غریب قصہ پیش کیا ہے۔ ایک بدمعاش لفنگے کی سرگزشت سے اس ناول کی ابتدا ہوتی ہے۔ روزانہ اس کے سر پر پولیس والوں کے جوتے پڑتے ہیں اور کئی کئی دفعہ سزا بھی پاتا ہے۔ اس بدمعاش کی شادی ایک نواب صاحب نے ضد میں آکر اپنی چہیتی اور بیحد لاڈلی بیٹی سے زبردستی کردی اور اُسے کھرپا بہادر کا خطاب دیا۔ اس بدمعاش پر شاہی محلات میں جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ الف لیلیٰ کے سوتے جاگتے (ابوالحسن) کے قصّے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی ناول میں ریاست لنکران کے ساتھ ساتھ ریاست کفترہ کے غمناک واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک بیگم پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُسے کوآتشی بنا دیا جاتا ہے۔ محلات کی جگمگاتی فضا میں آپ عجیب عجیب رنگینیاں دیکھیں گے کہیں ہنسی اور کہیں قہقہے۔ کہیں آنسو اور کہیں خون کی بوندیں۔ کھرپا بہادر کو پڑھکر آپ شرر کے دربار حرام پور کو بھول جائینگے۔ تقریباً تین سو ۳۰۰ صفحات کی کتاب ہے۔

قیمت ایکروپیہ (عہ۱) علاوہ محصولڈاک

رُودادِ حیات

(ایک کُتّے کی خودنوشتہ سوانح عمری)

اپنی حیاتِ مختصر کے لمحاتِ اوّلیں پر نظر ڈالتا ہوں تو کس قدر تعجب ہوتا ہے کہ ایک کتّے کی حیثیت سے میری اصل زندگی کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب مجھے ایک چالاک نوجوان نے صرف ڈیڑھ روپے میں خریدا تھا۔ اس واقعہ کے ساتھ ہی میرا عہدِ طفلی ختم ہو گیا۔ مجھے حاصل کرنے کے لئے کسی شخص نے ایک مخصوص رقم صرف کی تھی۔ اس لئے مجھے بھی قدرتی طور پر اپنی نئی ذمہ داریوں کا بہت احساس ہونے لگا۔ اب میں دُنیا کی وسعتوں میں تھا اور دُنیا کی وسعتیں میرے لئے تھیں۔

اس سے قبل میرا مالک ایک قہوے خانے کا منتظم تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی محدود جگہ میں رہ کر حیات و ممات کے رموز سمجھنا اور سب سے زیادہ یہ کہ خود اپنی حقیقت پر نظر ڈالنا قطعی محال ہے۔ میں اکثر اپنی کس مپرسی کی حالت پر دل ہی دل میں بھنایا کرتا تھا کہ ایسی پابند زندگی سے مرجانا ہی بہتر ہے۔ کھانے پینے کی اشیا میں کسی قسم کی کمی نہیں تھی۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑے جن میں سے اکثر پر مکھن یا پنیر لگا ہوتا تھا بڑی افراط سے ملتے تھے۔ کبھی کبھی پھٹا ہوا دودھ بھی میسر آجاتا جو انسانی کام و دہن کے لئے بدذائقہ اور غیر مفید سہی مگر ہماری جنس کے لئے تو ایک نعمت ہے۔ ذمہ داریاں بھی کچھ زیادہ نہیں تھیں۔ صرف اتنا کام تھا کہ باورچی خانے کے قُرب و جوار میں جو جو ہے دکھائی دیں اُنہیں فوراً لقمہ بنا لیا جائے۔ کسی چیز کی چوکسی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اوّل تو قہوہ خانہ رات کو چند گھنٹے کے لئے بند ہوتا تھا۔ اور دوسرے وہاں ان قیمتی اشیاء کا خود ہی کال تھا جن پر چوروں یا بدمعاش کی للچائی ہوئی نظر پڑتی ہے۔ اور ہاں ایک کام اور تھا۔ وہ یہ کہ جب کبھی کوئی فقیر خواہ اپاہج ہو یا ہٹا کٹا دروازے پر آکر صدا لگاتا تو اچھی طرح اُس کی تواضع کی جاتی۔ یعنی کبھی ٹانگ میں کاٹ لیا۔ اور کبھی کاٹ لینے کی صرف دھمکی دی۔ سو یہ کام ذاتی دلچسپی کے لئے خود اپنے ذمہ لیا تھا۔ ورنہ مالک کا حکم نہ تھا۔ اِن تمام آزادیوں کے باوجود میں اپنی زندگی کو پابند سمجھتا تھا کیونکہ صرف اس عمارت کی چاردیواری میری کُل دُنیا تھی۔ درانحالیکہ میری آرزو تھی کہ ساری دُنیا میں چل پھر کر دُنیا کی حقیقت معلوم کروں۔ اور فیصلہ کروں کہ قہوہ پینے والوں کی یہ باتیں کہ زمین گول ہے اور سُورج کے گرد گھومتی ہے کس حد تک صحیح اور قرینِ قیاس ہے۔ میں ان کی بحث بڑے غور سے سُنا کرتا تھا اور جب کبھی وہ دوسرے ممالک کے اقتصادی معاشرتی اور سیاسی یا ادبی اور فنی واقعات اور کارگذاریوں پر رائے زنی کرتے تو میں غرّا کر گویا انہیں ڈانٹتا تھا کم بختو! تمہاری بحث فضول ہے۔ تمہاری عقلِ نارسا ایک کتّے کی اعلیٰ فراست کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ لیکن وہ کم علم انسان میری گفتگو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے کسی نے اتنی جُرأت نہ کی کہ مونٹ ایورسٹ کی چڑھائی۔ طبقاتِ شمالی و جنوبی کی تحقیق، صحرائے اعظم کی بادیہ گردی یا بحرالکاہل کی عمق پیمائی میں مجھے اپنے ساتھ لے لیتا۔ کہا جاتا ہے کہ عورت ذات شدید ترین مصائب و آلام برداشت کرسکتی ہے اور اسی لئے جاپان کے لوگ صنفِ نازک کو بید کے پھول سے تشبیہ دیتے ہیں جو موسم سرما کی شدید خنکی

کے باوجود شگفتہ رہتا ہے۔ مگر انسان نے غالباً کتے کی زندگی کا غائر مطالعہ نہیں کیا۔

خیران باتوں سے کیا سروکار۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی محدود زندگی سے اُکتا گیا تھا اور وہ شاید اس لئے بھی کہ میرے خون میں جتنے خون شامل ہیں اُن کا فطری تقاضا یہی تھا کہ میں جانبازی، دلیری اور بلند ہمتی سے کام لوں۔ مثلاً میرے ایک والد آسا کوس سرکس کی جان سمجھے جاتے تھے۔ اور دوسرے والد ——— خدا ان کو دوسری مرتبہ بھی کتے ہی کی زندگی عطا کرے ——— آسمان فلم کے سب سے زیادہ درخشاں ستارے تسلیم کئے گئے تھے۔

میں اپنی روداد حیات ماہ اپریل کی اس سہ پہر سے شروع کرونگا جبکہ وہ چالاک نوجوان پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آیا تھا۔ اس وقت سورج کی آخری شعاعیں بڑی حد تک خوشگوار تھیں۔ میری ماں کو دھوپ بہت مرغوب تھی۔ اس لئے وہ کھلے صحن میں ایک پھٹی ہوئی دھوتی پر جو خانساماں نے دو روز قبل ہی بیکار سمجھکر پھینک دی تھی آرام سے بیٹھی تھی۔ اور میں اُس کے سینہ سے لگا بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ میں نے اپنی والدہ کو غراتے ہوئے سُنا مگر مطلق پروا نہیں کی۔ بلکہ آنکھیں بند کئے بدستور پڑا رہا۔ ماں کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑی ہوشیار نگہبان ہے اور سوائے مالک کے وہ ہر آنے جانے پر ضرور بھونکتی ہے۔ جب میں دو تین ہفتے کا تھا تو میری بھی یہی عادت رہی۔ مگر بعد ازاں میں نے اپنا رویہ تبدیل کرلیا۔ زندگی اتنی مختصر ہے کہ ہر اس شخص پر بھونکنے کی مہلت نہیں مل سکتی جو اپنا نام بتائے بغیر ہمارے صحن میں داخل ہو ——— صحن سے میرا مطلب عمارت کا وہ حصّہ ہے جہاں خالی بوتلیں، ایندھن اور باقی وہ سامان رکھا جاتا تھا جس کو منظرِ عوام پر رکھنا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ انسان کی یہ وضعداری آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کا ظاہر و باطن ایک دوسرے سے متضاد کیوں رہتا ہے ——— بہرحال میں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ کیونکہ صبح سے ایک ٹوٹی ہوئی بوتل کو ادھر اُدھر لڑھکاتے لڑھکاتے میں تھک گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کچھ دیر اعضاء کو آرام دے لوں۔ تاکہ رات کے وقت خواہ مخواہ راہ چلتوں پر بھونکنے کے لئے نیا جوش پیدا ہوجائے ——— میں غنودگی کے عالم میں خدا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ میرے کان میں کچھ آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا تھا کہ "یہ کتا تو بہت ہی بدصورت ہے"۔

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ گفتگو میری ذات سے متعلق ہے۔ میں خوش ہوں کہ مجھے اپنے حسن و جمال کے بارے میں کبھی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اور غنیمت ہے کہ کبھی اوروں نے بھی بے جا طور پر تعریف کرکے میرے اندر خود نمائی اور خود بینی کے جراثیم پیدا نہیں کئے۔ حتیٰ کہ میری ماں نے بھی کبھی مجھکو حسین و جمیل نہیں سمجھا۔ وہ ہمیشہ میرے بُرے اور بھدے خد و خال کو نام دھرتی تھی۔ اپنی شکل و صورت کے متعلق مجھے خود کچھ علم نہیں۔ کیونکہ اس چمکدار شے کے سامنے کبھی رسائی نہیں ہوئی جس کے اندر آقا اپنے چہرے کا عکس دیکھکر بال وغیرہ درست کیا کرتا تھا۔ تاہم اتنا جانتا ہوں کہ مُنہ بُلڈاگ سے کسی حد تک مشابہ ہے۔ مگر ٹانگیں اور باقی دھڑ شکاری کتے کی طرح نازک ہے۔ میری لمبی دُم ہوا میں اُڑنے والی مکھیوں کے لئے تازیانہ بنی رہتی ہے۔ بال مہین تار کے مانند سخت اور گہرے سیاہ ہیں۔ صرف سینے کا رُواں سفید ہے۔ پتلیاں بدہیئت اور کرنجی ہیں ——— لیکن آقا کو دوسرے لوگوں سے تعارف کراتے ہوئے مجھے ہمیشہ ایک قیمتی ہاؤنڈ بتایا ہے ——— مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کس حد تک صداقت ہے۔ مگر جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے۔ اس کا کوئی بیان کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میری ذات موضوع بحث ہے۔ تو آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میرا آقا مجھ پر نظریں جمائے

قریب ہی کھڑا تھا - اور اس کے پاس وہ اجنبی انسان تھا جس نے مجھے بدصورت کہا تھا - وہ باعتبار عمر ایک مے فروش سے کم سن مگر بلحاظ قد ایک پولیس سارجنٹ سے زیادہ طویل القامت تھا - لباس صوفیوں کی طرح سادہ مگر مجذوبوں کی طرح بوسیدہ تھا - چہرے سے عیاری و بدمعاشی ٹپک رہی تھی - جی میں تو آئی کہ چلا کر کہوں کہ "او کم بخت انسان! آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ - دوسروں پر اعتراض کرتا ہے" مگر آقا کی موجودگی کے باعث خاموش رہا -

"لیکن اس کی خصلت قابل تعریف ہے" میرے آقا نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا - اور حقیقتاً یہ بات تھی بالکل سچ - ماں کی تربیت اولاد کو نیک بناتی ہے اور بد بھی - میری ماں میرے حق میں بہترین معلّمہ تھی - اُس نے اعلیٰ پند و نصائح سے کام لیکر ہمیشہ مجھے ہدایت کی کہ اگر میرے خد و خال اچھے نہیں ہیں تو کم از کم نیک عادات و خصائل کا ضرور خیال رکھا جائے - اس کا قول تھا کہ انسان کی صحبت میں رہ کر بھی اپنے "جذبۂ کلبیت" کو سرد نہ ہونے دیا جائے - کتّا کیا نہیں کر سکتا؟ - اگر وہ چاہے تو اپنے دل کو بھی معرفت الٰہی سے معمور کر سکتا ہے - میری ماں فخر کرتی تھی کہ وہ صرف ایک شخص کی ملکیت ہے - اور اس لئے سوائے آقا کے کسی دوسرے کا ہاتھ تک چومنا گناہ عظیم تصور کرتی تھی - وہ ہر آنے جانے والے پر بھونکی اور کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا - لیکن میں دوغلا تھا - اس لئے میری فطرت میں بعض نقائص پیدا ہو گئے تھے - میں انسان کی آواز سنتے ہی دُم ہلانے لگتا - سربسجود ہو کر قدموں میں لوٹتا - اور بلا تخصیص ہر ایک کا ہاتھ چومنا چاہتا - چنانچہ اس وقت بھی اجنبی کی آواز سنتے ہی میری دُم ہلنے لگی - ماں نے اظہار ناپسندیدگی کے طور پر غرّا کر مجھے ڈانٹا - اور میں دبک کر اس کے سینے سے لگ گیا -

آقا نے میرے متعلق بہت کچھ کہا - مجھے تعجب تھا کہ آج وہ میری کس قدر تعریف کر رہا ہے - مگر نو وارد نے بہت کم گفتگو کی وہ حد درجہ خاموش تھا - مجھے فوراً بنیئے کا کتّا یاد آگیا جو تمام دن دوکان کے سامنے دہلیز پر منہ رکھے اونگھتا رہتا ہے اور خواہ کوئی دوکان کا مال لوٹ کر لے جائے اسے دُنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی - حالانکہ بنیئے کا کتّا بھی اپنے مالک کی طرح ہونا چاہیئے - میرے آقا نے میری تعریف کے ایسے پُل باندھے کہ خود مجھے شرم آنے لگی - حتّٰی کہ اس اجنبی نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "میں ڈیڑھ روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دونگا - خواہ تم اسے آسمانی فرشتہ ہی کیوں نہ بتاؤ"

خوف کی ایک لہر دماغ کے اندرونی پردوں میں پیدا ہوئی اور ریڑھ کی ہڈی میں سے ہوتی ہوئی دُم کی راہ نکل گئی - اب حقیقت مجھ پر روشن ہوئی - اس احساس کے ساتھ ہی کہ مجھے ایک جنس بازاری کی مانند فروخت کیا جا رہا ہے - میرا دل لرز کر زور زور سے دھڑکنے لگا - میں نے آقا کو دیکھا اور پھر اپنی ماں کو - حسرت و یاس سے اس کا چہرہ مغموم تھا - آنکھوں میں آنسو تھے - مجھ سے نظر ملانے کی تاب نہیں تھی اس لئے نگاہیں فوراً نیچی کر لیں - باقتضائے عمر و تجربہ ماں مجھ سے زیادہ سمجھدار تھی - اور وہ جان گئی تھی کہ اس گفتگو کے انجام کے ساتھ ہی میرا مستقبل کس نوع کا ہوگا ——— جُدائی ——— غالباً دائمی جُدائی ———

وہ اپنی زبان سے میرے سر کے بال چاٹنے لگی - اور میں آہستہ آہستہ اپنی نازک ٹانگیں اس کی چھاتی پر مارنے لگا - گویا اس خوش مذاقی سے اس کے رنج و غم کو دور کرنا چاہتا تھا ———

"اچھا مجھے منظور ہے" میرے مالک نے انقطاعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا "اگرچہ یہ بجائے کتّے کے میری نگاہ میں بمنزلہ اولاد ہے - لیکن خیر - ڈیڑھ روپیہ ہی دلواؤ - میں اپنے پاس سے اسکو کبھی جُدا نہ کرتا - مگر مجبوری ہے"

میرا مالک میرے سامنے پہلی مرتبہ جھوٹ بولا۔ کیونکہ حقیقتاً ایسی کوئی مجبوری لاحق نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ مجھے فروخت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ یہ محض بناوٹی بات تھی۔ اسے میری ماں پر بھروسہ تھا کہ وہ ہر سال اس کے لئے بچے جنتی رہے گی۔ اور وہ ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کے حساب سے انہیں فروخت کرتا رہے گا۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ میری پیدائش سے قبل ماں نے کتنے بچے جنے تھے۔ کیونکہ اُن میں سے ایک بھی موجود نہیں تھا۔ تاہم ان کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہوگی ـــــ میری ماں مالک کی بیوی کی طرح جس کے ہاں نو بچے پیدا ہوئے تھے کافی لاغر و نحیف تھی۔ میں نے قہوہ پینے والوں کی زبانی اکثر سُنا ہے کہ صنفِ نازک کثرتِ اولاد سے بہت کمزور اور مضمحل ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس اصول کا اطلاق صرف انسان کی عورت ہی پر نہیں بلکہ جانوروں کی عورتوں پر بھی صحیح ہے۔ اگرچہ میں اس رمز کو سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسی صورت میں کمزوری کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا تجربہ بہت وسیع نہیں ہے۔ میں جسم کے نظامِ عمل سے قطعی نابلد ہوں۔ اور وہ اس لئے کہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ شادی تک نہیں ہوئی۔

اجنبی نے رسّی کا ایک ٹکڑا میری گردن میں باندھ دیا۔ میری ماں مجھے آخری نصیحتیں کر رہی تھی۔ غالباً اس نے کہا ہوگا کہ بیٹا! آیندہ جس خاندان کی دہلیز پر زندگی بسر کرو اس کے لئے مایۂ فخر و ناز بن جانا۔ جان پہچان والوں کے سامنے سر جھکانا اور غیروں پر بھونکنا اپنا فرض سمجھنا۔ اُس چیز کی طرف جو تمہیں کھانے کے لئے نہ دی گئی ہو کبھی نظر اُٹھا کر نہ دیکھنا۔ رات کو دیر سے سونا اور صبح سویرے اُٹھنا۔ تاکہ مکان کی چوکسی اچھی طرح ہو سکے۔ اور نہ جانے کیا کیا کہا ہوگا۔ جو میں نہیں سُن سکا کیونکہ تلاطمِ جذبات کے باعث میرے حواس گم تھے۔ کانوں کے پردوں تک آواز پہونچ رہی تھی لیکن میں سُن نہیں سکتا تھا۔ شاید اُس کی آخری آرزو یہ تھی کہ اگر فرصت ملے تو کبھی کبھی آکر اپنی ماں سے مل جایا کرنا۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہیں دودھ پلایا ہے۔ میرا خون تمہارے جسم میں ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے چلنے سے پہلے سب کو الوداع کہا ـــ اپنی ماں کو۔ آقا کو۔ بُندو خاکروب کو۔ اور زمین کے اُس مختصر حصے کو بھی جو میری ماں کے سونے کے لئے مخصوص تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے مجھ کو وہیں جنا ہوگا۔

میں اس کے ساتھ ساتھ دوڑتا اور مسلسل بھونکتا رہا۔ کوشش کی کہ رسّی توڑ کر بھاگ جاؤں۔ مگر بے سُود۔ وہ بہت مضبوط تھی۔ اُسنے دو چار مرتبہ ٹھوکریں ماریں اور چُپ رہنے کے لئے ڈانٹا۔ جب میں نے دیکھا کہ اب سرِ تسلیم جھکا لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے تو خاموش ہو گیا اور فیصلہ کیا کہ آیندہ اسی نئے مالک کی رضا جوئی اپنا فرض سمجھونگا۔ راستے میں بہت سی جاذبِ نظر چیزیں تھیں۔ اور میں اُن کو بچشمِ غور دیکھنے کے لئے ایک لمحے ٹھہر جانا چاہتا تھا مگر ہر بار ایک زور کا جھٹکا لگتا اور میری گردن کی رگیں دُکھنے لگتیں۔ بہت سے کتّے بھی ملے اور میں نے چاہا کہ ان سے معانقہ کروں۔ لیکن موقعہ نہ ملا۔ مجبوراً اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ نئے نئے بازاروں میں سے گذر ہوا، جن سے میں قطعی ناواقف تھا۔ اگر اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دیا جاتا تو اپنی قدیمی قیام گاہ تک پہونچنے کے لئے سڑکوں کے کناروں پر لگے ہوئے سرکاری بورڈ بھی ناکافی رہتے۔ کیونکہ میں سڑکوں کے نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اور یقیناً دوکانداروں یا راہ گیروں سے دریافت کرنا پڑتا کہ اب کس سمت چلوں۔

اُس وقت سے میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ دُنیا واقعی کتنی وسیع ہے۔ میں اپنی اس پہلی مسافت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ چلنے پھرنے کی عادت نہیں تھی۔ تاہم میں بہت ہی تھک گیا تھا اور اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ شاید ایک گھنٹے میں ہم سوڈیڑھ سو میل چلے ہونگے۔ میرا قیاس یہی ہے۔ خواہ انسان کے نقطۂ نظر سے وہ فاصلہ ایک میل بھی نہ ہو۔ سڑکوں کے اختتام پر سپاہی نظر آئے۔ جو ہاتھ مٹکا مٹکا کر عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے۔ تاہم میں نے ایک نئی بات دیکھی یعنی جب کوئی سپاہی چاہتا تو تیزی سے تیز چلنے والی موٹروں سائیکلوں اور تانگوں وغیرہ کو محض ہاتھ کے اشارے سے روک لیتا۔ اس کی دو ہی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ یا تو اس کے جسم میں کوئی ایسی قوت تھی کہ اُس کے اثر سے متحرک چیزیں ساکن ہوجاتی تھیں۔ یا ایسا کوئی سرکاری قانون ہوگا۔ اور گاڑی والے ان اشاروں کو سمجھتے ہونگے۔ خیر کچھ بھی ہو میں نے اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے زیادہ دماغ سوزی نہیں کی۔ کیونکہ جانتا تھا کہ خود میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی جائے تو اُسے چلا نہیں سکوں گا۔ میں اُن کے پُرزوں وغیرہ سے قطعی ناواقف تھا۔

چلتے چلتے ہم ایک مکان کے قریب پہونچے۔ اور میں سمجھ گیا کہ یہی منزلِ مقصود ہے۔ اسی جگہ مجھے رہنا ہوگا۔ تقریباً ایک لاکھ ——— ہاں میں ایک لاکھ ہی کہونگا ——— ایک لاکھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم مکان کی دوسری منزل میں پہونچ گئے۔ کمرے وغیرہ اچھی طرح سجے ہوئے نہیں تھے۔ لیکن میں خوش تھا کیونکہ اکثر کونوں میں سے چوہوں اور گلہریوں کی خوشبو آرہی تھی۔ میرا مالک سگار جلاتے ہوئے ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہ بہت تھک گیا تھا۔ میرے پنجے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ ورنہ میں ضرور اُس کی ٹانگیں دبا کر ہمدردی کا ثبوت دیتا۔ میں نے سوچا کہ لاؤ کچھ گفتگو ہی کریں۔ اس لئے بے شمار سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ مثلاً میں نے پوچھا۔ کیا تمہارا مکان یہی ہے؟ کیا مجھے اِسی کمرے میں رہنا ہوگا؟ تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟ اُن سے میرا تعارف کراؤ۔ اگر شادی نہیں ہوئی تو میں ایک خوبصورت لڑکی بتاؤں؟ اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک نوجوان حسینہ یاد آگئی۔ جس کے قدموں میں اکثر لوٹ جانے کی میں نے تمنّا کی تھی۔ وہ قہوہ پینے کے لئے روزانہ ہمارے ہاں آتی تھی، لیکن ماں میری نظر تاڑ گئی۔ اور اُس نے ہمیشہ مجھکو میرے ارادے سے باز رکھا۔ اُس نے نصیحت کی کہ آج کل کی نوجوان لڑکیوں سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ حتیٰ کہ اُن کی ٹانگ میں کاٹنا بھی نہیں چاہیئے۔ میں نے وجہ پوچھی تو ماں نے کہا "بیٹا تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر اُن کے جسم کا خون دانتوں پر لگ گیا تو تم بھی اُن کی طرح مست و بے خود ہوکر قبل از وقت کسی کتیا پر عاشق ہوجاؤ گے"۔ میں خود بھی دیکھتا کہ وہ لڑکی دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف ایک عجیب انداز سے چلتی تھی۔ اس طرح جھوم جھوم کر کہ میرا جی چاہتا تھا کہ ہر قدم پر اس کی ٹھوکروں میں اپنا دل پامال ہونے کے لئے رکھ دوں ——— لیکن ماں کی عدول حکمی گوارا نہیں تھی۔

میں نے مالک سے اور بھی سوال کئے۔ میں نے دریافت کیا۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ مجھے کھانے کے لئے یہاں کیا کیا ملے گا؟ اگر اجازت ہو تو دو چار چوہے پکڑ لوں؟ کیا تمہارے ماں باپ کا انتقال ہوگیا ہے؟ ——— تم تاجر ہو یا دستکار یا کسی کے ملازم ہو؟" مگر اس بندۂ خدا نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ نہایت بُری طرح ڈانٹا۔ اور شاید گالیاں بھی دیں جو انسان کی عادت ہوتی ہے۔ اگر اُس نے میری خاطر ڈیڑھ روپیہ خرچ نہ کیا ہوتا تو میں ضرور اُس کی ٹانگ میں کاٹ لیتا۔ اُسکی جیب سے نکلے ہوئے وہ

چند سکے میری خودداری کا خون کر رہے تھے۔

خاموش بیٹھے بیٹھے میری طبیعت اُکتا گئی۔ کوئی پچیس تیس گھنٹے گذر گئے ہونگے۔ میں نے سوچا۔ خواہ مار کھانی پڑے۔ لیکن بولونگا ضرور۔ چنانچہ میں نے کہا "آقا! ایک کہانی سناؤں۔ بہت دلچسپ کہانی۔ افسوس ہے کہ میں ناخواندہ ہوں۔ محکمۂ تعلیم کے متعصب حکام نے ہمارے لئے کوئی درسگاہ قائم کی نہ کسی قسم کا نصاب مقرر کیا۔ اس لئے مجبور ہوں کسی کتاب یا رسالے میں سے مضامین پڑھ کر نہیں سنا سکتا۔ تاہم سُنی سُنائی باتوں کا اعادہ کرسکتا ہوں۔ کیونکہ میرا حافظہ بہت اچھا ہے۔ اور قبل اسکے کہ وہ اجازت دے یا منع کرے میں نے کہانی اس طرح شروع کر دی۔

"ایک کُتا جو مملکت ایران کے شاہی کتوں کے خاندان سے تھا تمام دُنیا کی سیاحت کے لئے روانہ ہوا۔ دورانِ سفر میں اس کا گذر...." ابھی اتنی ہی بات بیان کی تھی کہ میرے سر پر ایسی ٹھوکر پڑی کہ بھنّا گیا۔ اور میں اپنے دل میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ "کہتے نا آخر انسان۔ ہزار کتوں کی صحبت میں رہے لیکن رہے گا پھر بھی انسان ہی"

کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھکر باہر چلدیا۔ اور میں کمرے میں تنہا رہ گیا۔ مجھے غصّہ بہت آرہا تھا اس لئے سوچا کہ چاہے جان جائے مگر اس نئے مالک سے بدلہ ضرور لونگا۔ گنجینہ پر بہت دیر سے نگاہ تھی۔ چنانچہ اس کے جاتے ہی میں نے پنجے مار کر دروازہ کھول لیا۔ ایک خانے میں اشیائے خام تھیں۔ مثلاً دال چاول اور مصالحہ جات۔ مگر دوسرے خانے میں کچھ بھنا ہوا گوشت رکھا تھا اور ایک پیالے میں دودھ تھا۔ مستقبل کی تمام دور اندیشیوں کو بالائے طاق رکھکر میں نے گوشت بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ مرچیں کسی قدر زیادہ تھیں۔ یا شاید اس لئے محسوس ہوئیں کہ قہوہ خانے میں زیادہ تر ڈبل روٹی کے ٹکڑے ملتے تھے کبھی مالک نے چھوٹی ہڈیاں ڈالدیں تو وہ چوسی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس لئے مرچوں کا عادی نہیں تھا۔ گوشت ختم کرنے کے بعد دودھ نوش کیا اور اس طرح مُنہ ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ ماں کی کسی ہدایت پر عمل نہیں کرونگا۔ اس کا احترام میرا فرض ہے لیکن اس امر کا کیا علاج کہ وہ بہت ہی قدامت پسند تھی۔ معاشرت کے وہ اصول اس کے پیشِ نظر تھے جن کو تبدیل ہوئے عرصہ گذر چکا تھا۔ اب جبکہ زمانہ سے ہمدردی خلوص اور صداقت کا مفہوم اُٹھ گیا ہے۔ کیوں نہ ہمیں تصنع اور بناوٹ سے کام لینا چاہیئے۔ ہمت اور دلبری اسی کا نام ہے کہ ایک طرف مالک کے جوتے کھائیں۔ اور دوسری طرف اُس کے کھانے کا بُھنا ہوا گوشت وغیرہ ہضم کریں۔

پیٹ بھر جانے کے بعد میں صحن میں آکر اطمینان کی نیند سو گیا۔ عجیب و غریب خواب نظر آتے رہے کبھی ماں کو دیکھا کہ وہ ہجر فراق میں آنسو بہا رہی ہے۔ اور کبھی بندو خاکروب کو، گویا وہ میری ماں سے پوچھ رہا ہے کہ آج ننھے میاں کہاں گئے۔ اسی حالت میں وہ نوجوان حسینہ بھی نظر آئی جس کی شوخیوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ ماں کی تمام ہدایتوں کی خلاف ورزی کرنا میرا مسلک بن چکا تھا۔ اس لئے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لپک کر اُس کی ٹانگ میں کاٹ لینا چاہا۔

میری آنکھ کُھل گئی۔ میرا مُنہ کٹہرے کے چوبی ستون سے ٹکرایا اور دانت ٹوٹتے ٹوٹتے بچ گئے۔ مالک قریب کھڑا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے اجازت لئے بغیر اس نے رسّی کا سرا ہاتھ میں پکڑا اور زینے سے اُترنا شروع کر دیا۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔ کیونکہ رسّی کے جھٹکے میری گردن پر ضربِ کاری ثابت ہوتے تھے۔ اب کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ سڑکیں روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔

گاڑیوں کے لیمپ وغیرہ بھی جل رہے تھے۔ خاصی چہل پہل تھی۔ میں ہر چیز پر سرسری نگاہ ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کوشش میں تھا کہ ان راستوں کو پہچانتا رہوں۔ تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔ ممکن ہے کبھی فرار ہونا پڑے۔ تو لاعلمی کی صورت میں یہ ہو گا کہ گویا کنوئیں میں سے نکل کر کھائی میں جا پڑے۔

بہت دیر تک چلنے کے بعد شہر کی رونقوں سے دُور ہم ایک ویران جگہ پہونچے جہاں میرے مالک نے ایک مکان پر دستک دی جس کے قُرب و جوار میں بس چند گھر اور تھے۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی نکلا۔ جس کے چہرے سے مکاری اور بدمعاشی ظاہر ہو رہی تھی۔ دونوں میں کچھ چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔ جن کو میں نہ سُن سکا۔ آخر میرا مالک مجھے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں سمجھ ہی نہ سکا کہ آخر مطلب کیا ہے۔ اس شخص کی ڈاڑھی خاصی لمبی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ اسے "مولانا" کہا کروں۔ کیونکہ یہ لفظ میں نے قہوہ خانے میں اکثر سُنا تھا۔ خود میرا پہلا مالک اور دوکان کے دوسرے ملازم تمام ڈاڑھی والوں کو مولانا کہکر مخاطب کرتے تھے۔ جب میں اس اجنبی کے پاس اکیلا رہ گیا تو میں نے خیال کیا کہ یہ ضرور شریف آدمی ہوگا۔ اس سے گفتگو کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "مولانا! آخر ماجرہ کیا ہے؟ مجھے بھی تو معلوم ہو۔ کیا اب تم نے مجھے خرید لیا ہے"؟ میری خاطر کتنی قیمت ادا کی ہے؟ ـــ میرا مالک کہاں گیا؟ تم اُس کے باپ ہو یا وہ تمہارا باپ ہے؟ ـــ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ مولانا قطعی بہرے ہیں۔ یا بالکل جاہل ہیں۔ میری گفتگو مطلق نہیں سمجھتے۔ جب چیختے چیختے میرا گلا تھک گیا تو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد مجھے سوکھی ہوئی روٹی کھانے کے لئے ملی۔ جو میں نے نہیں کھائی۔ کیونکہ ایک تو وہ مرغن بُھنا ہوا گوشت ہضم ہی نہیں ہوا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ میں باسی کھانا مُضرِ صحت سمجھتا ہوں۔ اس لئے وہ جوں کا توں وہیں پڑا رہا۔ پھر مجھے صحن میں ایک درخت کے نیچے باندھ دیا گیا۔

بُری طرح تھک جانے کے باعث تمام اعضا میں درد ہو رہا تھا اس لئے بستر وغیرہ نہ ہونے کے باوجود مجھے بہت جلد نیند آ گئی۔ خواب میں نظر آیا گویا تمام دُنیا جل کر کباب ہو گئی ہے۔ ہر طرف سے بُھنے ہوئے گوشت کی خوشبو آ رہی ہے۔ درختوں کی جگہ جانوروں کے سوختہ پائے لگے ہوئے ہیں۔ دریاؤں میں پانی کی بجائے یخنی اور نہاری بہ رہی ہے۔ مکانات کی دیواریں دل، جگر اور گُردوں سے تعمیر ہوئی ہیں۔ جن میں پسا ہوا بھیجہ بطور چونا اور گارا استعمال ہوا ہے۔ غرض کس قدر شاعرانہ فضا تھی۔ میں خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ کہ اسی اثنا میں کچھ آواز سُنائی دی اور میری آنکھ کُھل گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ باورچی خانے کے قریب کی کھڑکی کوئی باہر سے کھولنی چاہتا ہے۔ میں خاموش لیٹا دیکھتا رہا۔ حتی کہ صاف نظر آیا کہ کوئی شخص اندر داخل ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں چُپ رہنا خلافِ مصلحت تھا۔ اس لئے پوری قوت سے بھونکنا شروع کر دیا۔ میں نے چلا چلا کر کہا۔ "مولانا! دوڑو ـــ چور ـــ مولانا! بدمعاش ـــ عف عف۔ بھاگو مولانا ـــ عف عف۔ چور ہے مولانا۔ عف عف" ـــ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ شخص اگر چوری کر کے یہاں سے جانے لگا تو تمام قوت صرف کر کے رسّی توڑ لونگا۔ اور اس کے پاؤں سلامت نہیں چھوڑونگا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ شخص میری ہی طرف آیا اور میں نے پہچانا کہ وہ خود مولانا ہیں۔ نزدیک آتے ہی ایک پتلی بید سے اُنھوں نے مارنا شروع کر دیا۔ ہر چند میں نے کہا کہ آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ کہ مکان کا اصل دروازہ چھوڑ کر چوروں کی طرح آدھی رات کو

کھڑکی کی راہ آئے اور اگر ہم بھونکے تو سزا دے رہے ہو۔ مگر وہ باز نہ آئے۔ خوب ہی مارا۔ کوئی شخص یقین نہیں کرسکتا کہ بالکل یہی واقعہ کئی رات برابر ہوا۔ اور میں متواتر پٹتا رہا۔ آخر اپنا سابقہ فیصلہ یاد آگیا کہ ماں کی تعلیم بالکل ناقص ہے۔ اس کی تربیت کا ماحصل تھا کہ بھونکو اور خوب بھونکو۔ ممکن ہے اس کا بھونکنا قابلِ تعریف ہو۔ لیکن میرے لئے تو عذابِ جان بن گیا۔ لہذا میں نے تمام عمر کے لئے ایسے موقعوں پر خاموش رہنے کا تہیّہ کرلیا۔ کہ بجائے ایک کے اگر دس آدمی بھی کھڑکی کی راہ آئیں۔ اور تمام قیمتی سامان کے علاوہ خود مالکِ مکان اور اُس کے اہل و عیال کو چُرا کر بھاگنا چاہیں تو میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہونگا—— بلکہ اُس کے پاؤں چاٹونگا جو مجھے بھی چُرا کر وہاں سے لے جائے۔

پہلی مرتبہ جب مولانا کے کھڑکی کی راہ آنے پر میں نہیں بھونکا تو وہ خوب خوش ہوئے — میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور غیر متوقع طور پر آدھی رات کو نہایت عمدہ خوراک کھانے کے لئے ملی۔ اسی طرح وہ کئی رات برابر آتے اور میرے نہ بھونکنے پر اظہارِ مسرّت کرتے رہے۔ میرا نقصان کیا تھا۔ بلکہ عمدہ غذائیں ملتی تھیں۔ ایک آدھ رات ایسا بھی ہوا کہ وہ آتے اور میں سورہا تھا۔ جس کا انعام مجھے صبح ملا۔ اپنے اس طریقۂ عمل سے بالکل الگ میں اکثر سوچتا کہ مولانا کا مقصد کیا ہے۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کا گھر چوروں سے غیر محفوظ رہے اگر یہ بات ہے تو مجھے کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان امور کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ انسان کی جعلسازیوں سے قطعی ناواقف تھا۔

تقریبًا ایک ماہ کے بعد وہی شخص آیا جس نے مجھکو ڈیڑھ روپے میں خریدا تھا۔ مولانا سے اس کی کچھ باتیں ہوئیں۔ جو شاید میری تربیت سے متعلق تھیں۔ کیونکہ اُس نے بھی خوش ہو کر مجھے دیکھا اور بہت پیار کیا۔ ایک دوسری بات جو میری سمجھ میں آئی یہ تھی کہ میرے مالک نے کسی شخص کے کتّے کو زہر دیکر مار ڈالا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کیوں۔ اچھی طرح بات چیت کرلینے کے بعد اس نے رسّی پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ اب بھی میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کہاں لے جایا جارہا ہے۔

کچھ دُور چلنے کے بعد ہم دونوں ایک بڑی حویلی کے قریب پہونچے۔ میرے مالک نے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی سی دیر میں ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے پہلے مالک پر پھر مجھ پر نظر ڈالی۔ اور ایسی نگاہ سے دیکھا گویا وہ ہماری آمد کا مقصد معلوم کرنا چاہتا ہے۔ میرے مالک نے پوچھا "کیا آپ ہی کا نام نسیم جعفری ہے"

اُس کے جواب میں صاحبِ خانہ نے صرف گردن ہلادی۔ پھر میرے مالک نے کہا "میں نے اخبار میں آج ہی اشتہار دیکھا۔ غالبًا آپ میرا کتّا خرید نا پسند کرینگے۔ یہ بہت اچھی نسل سے ہے۔ اور گھر کی چوکیداری کرنا خوب جانتا ہے"

نسیم صاحب نے ایک حقارت آمیز نظر ڈالی اور کہا "کتّا نہایت بدصورت مگر خوفناک ہے۔ اور اسی لئے میں اسکو خریدلونگا۔ اِس کی قیمت کیا ہے؟"

کافی جھک جھک کے بعد دس روپے پر فیصلہ ہوا۔ اور اسکے ساتھ ہی مجھے ایک نئی چاردیواری میں رہنے کے لئے مجبور کردیا گیا۔ مکان نہایت کشادہ وسیع اور شاندار تھا۔ نسیم صاحب متموّل معلوم ہوتے تھے۔ مجھے اُن کے ایک ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا ایک نہایت خونخوار کتّا تھا۔ جو ایک ہفتہ قبل بغیر کسی خاص وجہ کے اچانک مرگیا۔ سب کا شبہ ہے کہ کسی نے ارادۃً زہر دیدیا۔ زہر کا نام سن کر میں چونکا اور فورًا سمجھ گیا کہ یہ کارستانی سوائے میرے مالک کے اور کسی کی نہیں ہے۔ وہ مجھے

باقی برصفہ ۱۲۴

سالگرہ

لطیف! کیا تمہیں وہ واقعہ یاد ہے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں ایک شاعر باریاب ہوا اور قصیدہ سُنانے کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ نے اجازت دی تو شاعر لہک لہک کر قصیدہ سُنانے لگا۔ بادشاہ جھوم جھوم کر عش عش کرنے لگا۔ درباری شاعر نے جو یہ رنگ دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور سمجھا کہ اس کی وقعت بادشاہ کی نظروں میں گر گئی۔ بس ایک بارگی عرض کرنے لگا کہ جہاں پناہ اگر اجازت دیں تو خادم یہ حقیقت آشکارا کرنے کی جراءت کرتا ہے۔ کہ یہ قصیدہ دراصل اسی نمکخوار کا ہے۔ بادشاہ کو حیرت ہوئی اور وہ اپنے درباری شاعر کی طرف متوجہ ہوا اور حکم دیا کہ ثبوت پیش کیا جائے۔ اس پر اُس نے پورا قصیدہ لفظ بہ لفظ دُہرا دیا۔ اس کے بعد عرض کرنے لگا کہ حضور یہی نہیں بلکہ غلام زادہ کو بھی قصیدہ یاد ہے اور حکم ہو تو وہ بھی سُنائے۔ چنانچہ درباری شاعر کے لڑکے نے بھی لفظ بہ لفظ قصیدہ دہرا دیا۔ اس کے بعد پھر اُس نے عرض کیا کہ میرا غلام بھی قصیدہ سُنائے گا۔ سارا دربار اور بادشاہ محوِ حیرت ہو گئے۔ جب غلام نے بھی من وعن سُنا دیا تو نووارد کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ چُپکے سے بے نیل و مرام دُم دبا کر چلتا ہوا۔

حافظ کی ایک یہ مثال تھی کہ صرف ایک دفعہ سُنکر درباری شاعر نے پورا قصیدہ دھرا دیا۔ اُس کے لڑکے نے دو دفعہ سُنکر دھرا دیا اور اُس کے غلام نے تین دفعہ سُنکر اپنے خداداد حافظہ کا ثبوت دیا۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ ایمرسن کے حافظہ کا واقعہ مشہور ہے کہ لانگ فیلو کے انتقال پر ایمرسن سے خواہش کی گئی کہ وہ وقتِ دفن ایک مختصر سی تقریر کرے جس سے مرنے والے کی خوبیاں اور کمالات پر روشنی پڑ سکے۔ ایمرسن کا انتخاب محض اس لئے کیا گیا کہ وہ مرحوم کا قدیم ترین دوست تھا۔ وقت معینہ پر وہ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "......

آج میں آپ حضرات کے سامنے اُس شخص کی خوبیوں کا خاکہ پیش کرنے کے لئے کھڑا ہوں۔ جسے دُنیا ——— جسے دُنیا ——— جسے دُنیا ——— افسوس کہ میں اس کا نام بھولتا ہوں" ——— آج میں تمہیں کمزور حافظہ کی دلچسپ داستان سُناتا ہوں۔ تم رشید کو جانتے ہو۔ وہی جو گذشتہ رمضان کی عید میں ہمارے ساتھ سینما چلا تھا اور پکچر ختم ہونے پر میرے اِس بیان کی تردید کر رہا تھا کہ ہم نے یہ پکچر اس سے پہلے دیکھی ہے۔ لمبا تڑنگا۔ دُبلا پتلا۔ سانولی سلونی رنگت۔ تنگ پیشانی۔ کھڑ انقشہ۔ بڑی بڑی مخمور آنکھیں۔ ناک جیسے سدِ سکندری۔ چوڑا دہانہ۔ لمبی ہاتھ بھر کی گردن۔ سمجھے نا وہی جسنے سگریٹ کو کارک ٹپ کی طرف سے جلایا تھا اور تم بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔ اتنی صریح نشانیوں کے بعد تو تم سمجھ گئے ہوگے۔

اس مختصر سی ملاقات میں مَیں نے تمہیں یہ نہیں بتلایا تھا کہ ان حضرت کا حافظہ کمزور ہے۔ خطرناک حد تک کمزور بلکہ تھوڑے سے مبالغہ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی قوت حافظہ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہے۔ یا تمہاری اصطلاح میں یوں کہوں کہ معشوق کی کمر کی طرح لاپتہ۔

دراصل داستان اُسوقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ ایکدن عرصہ دراز کے بعد رشید مجھے پارک میں ملا۔ شام کا ٹھنڈا سُہانا وقت تھا۔ وہ ایک لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے خراماں خراماں چہل قدمی میں مصروف تھا۔ جوں ہی مجھ سے

آنکھیں چار ہوئیں وہ میری طرف لپکا اور میں اس کی طرف لیکن یہ دیکھکر کہ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ بلا وجہ بُری طرح گھسیٹ رہا ہے میں ٹھٹکا۔ باوجود میرے اِس کھچاؤ کے وہ قریب پہنچ کر مجھ سے بھڑ گیا۔ میں متوقع تھا کہ وہ اِس لڑکی کا تعارف کرائیگا۔ مگر توبہ کرو وہ تو اپنی بے وقت کی راگنی الاپے جا رہا تھا میری بھی بلا کو کیا پڑی تھی کہ کان دھرتا، میں تو یہ اندازہ کر رہا تھا کہ آخر یہ بھولی بھالی لڑکی کون ہوسکتی ہے؟ جب قیاس کام نہ کرسکا اور دُنیا بھر کی بدگمانیاں رشید کی طرف سے دلمیں پیدا ہونے لگیں تو میں نے صاف گوئی برتی اور پوچھ ہی لیا کہ "آپ کی تعریف؟"

"اوہو! کیا میں نے اب تک تعارف نہیں کرایا۔ معاف کرنا۔ یہ میری بیوی" ـــــ

"بیوی؟" میرے مُنہ سے ایسی چیخ نکلی کہ بیچاری عورت کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"معاف کرنا خاتون!" میں نے اس نسوانی پیکر سے ملتجیانہ انداز میں کہا "مجھے دراصل رشید کے حافظہ پر بھروسہ نہیں ہے یا یہ کہئیے کیا میں آپ کو مسز رشید کے نام سے یاد کرسکتا ہوں؟"

"میں تصدیق کرسکتی ہوں کہ اس تعارف میں تو کم از کم انکے کمزور حافظہ کو دخل نہیں" اس نے جواب دیا۔

"تو رشید صاحب! دعوت کہاں رہی شادی کی۔ دیکھئے اوہ! میں سمجھا آپ مجھے بھول گئے ہونگے" میں نے رشید سے گلہ کیا۔

"نہیں ریاض" وہ کہنے لگا۔ "بات یہ ہے کہ میں نے کسی کو بھی شادی کی دعوت نہیں دی۔ اس تقریب کو ہی سرے سے بھول گیا۔ واقعی مجھے دعوت دینی چاہئیے تھی۔ غالبًا اور لوگ تو دیتے ہونگے۔ مگر افسوس تو اس کا ہے کہ تم نے بھی مجھے یاد نہ دلایا۔ یہ جانتے ہوئے ہی کہ میں بھولتا بہت ہوں"

"خوب! اب کہیں یہ نہ بھول جانا کہ آپ شادی شدہ ہیں اور یہ آپکی بیوی ہے ـــــ
اگر حکم ہو تو وقتًا فوقتًا یاد دلادیا کروں"

ایک سال بعد رشید ایک صبح مجھ سے بہت پریشانی کے عالم میں ملا۔ میں نے اس انتشار کی وجہ پوچھی تو کہا۔

"ٹھہرو! تمہیں ایک خط دکھلاتا ہوں" وہ اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ آخر مایوس ہوکر کہنے لگا۔ "لاحول ولا میں اُسے گھر ہی پر بھول گیا"

"کیا مضائقہ۔ کہو تو سہی بات کیا ہے" میں نے دریافت کیا۔

"مسز رشید غائب ہے"

"پھر پولیس میں اطلاع دو"

"نہیں یار۔ یہ کوئی مذاق کا وقت نہیں ہے۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئیے"

"خط کا ذکر تم کس سلسلہ میں کر رہے تھے۔ کیا مسز رشید نے کوئی خط چھوڑا ہے؟"

"ہاں۔ ہاں"

"کیا لکھا ہے اُس نے"

"کچھ ٹھیک یاد نہیں۔ میں بھولتا ہوں۔ ٹھہرو ابھی جاکر لے آتا ہوں بغیر اس کے واقعات تمہاری سمجھ میں نہ آئیں گے" یہ کہہ کر وہ رفوچکر ہوگیا۔

مسز رشید کا چلا جانا میرے لئے کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ دراصل میں شروع ہی سے اس کی اُمید کر رہا تھا۔ وہ تو اس غریب نے ایک سال تک ہی جو نبھایا کمال کیا۔ دوسری ہوتی تو اس کمزور حافظہ والے شخص کے ساتھ ایک منٹ نہیں گذرتی۔

میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ رشید دوڑتا ہوا واپس آیا اور خط میرے آگے پھینک دیا۔ مضمون یہ تھا:-

پیارے رشید-

میں تم سے جُدا ہو رہی ہوں۔ لیکن یقین مانو کہ یہ جُدائی عارضی ہے اور صرف اُس وقت تک کے لئے میں علیحدہ رہونگی جب تک کہ تم میری سالگرہ کی تاریخ صحیح طور پر یاد کر کے مجھے لکھ نہ بھیجو۔

میری فکر نہ کرو میں آرام سے رہونگی۔ آپ کی زحمت نہ کرنا کیونکہ میں نہیں مل سکوں گی۔ البتہ خط بھیج سکتے ہو لیکن صرف ایک اور وہ بھی وہی جس میں میری سالگرہ کی صحیح تاریخ درج ہو۔ مجھے حسب ذیل پتہ پر خط مل سکتا ہے۔

پوسٹ باکس نمبر ۶۵ بتوسط "خاتون"

تمہاری
ذکیہ

"اتنی سی بات کے لئے کیوں پریشان ہوئے جاتے ہو" میں نے کہا۔ "وہ تو صرف اپنی سالگرہ کی تاریخ دریافت کرتی ہے۔ لکھ بھیجو ابھی وہ آ جائیگی"۔

"مگر ریاض یہی تو مجھے یاد نہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو؟"

"میں کیا جانوں تمہاری بیوی کی سالگرہ کی تاریخ؟"

"مگر نہیں تمہیں میری مدد ضرور کرنی چاہیئے ——— اور یہ تو خیال کرو کہ بات ہی کیا تھی جو مسز رشید اس طرح خفا ہو گئیں۔ بھئی خدا سمجھے آجکل کی لڑکیوں سے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ وہ کر گذرتی ہیں جو اُنہیں ہرگز ہرگز نہ کرنا چاہیئے"۔

"بات تو حقیقت میں ذرا سی معلوم ہوتی ہے لیکن رشید سالگرہ کا جشن آجکل فیشن ہو گیا ہے تم چاہے دُنیا بُھول جاتے لیکن یہ نہ بھولتے۔ کیونکہ اس جشن کے سلسلہ میں متعدد نجی سوالات اُلجھے ہوئے ہیں۔ مثلاً لباس۔ زیور وغیرہ کا سالانہ خرچ اسی ایک دن پر منحصر ہوتا ہے ——— رشید تم نے نئی فیشن کی لڑکی سے شادی تو کر لی لیکن بغیر یہ جانے ہوئے کہ اُن کی ضروریات۔ اُن کی جمالیاتی تزئین اُن کے تفریحی مشاغل اور اُن کی سہیلیوں اور دوستوں کی پارٹیوں کا سوال کتنا اہم ہو چلا ہے۔ تم ایسے ہی کمزور حافظہ والے تھے تو اپنی ضروریات اور اپنی تفریحوں کو بھول جاتے"۔

"لیکن ریاض یہاں اپنے پرائے کا سوال ہی کہاں۔ اور پھر ان تمام چیزوں کو سالگرہ سے مطلب؟"

"واہ ابھی جو میں نے کہا۔ ایک تو ہر سالگرہ پر تجدید محبت کی مہر ثبت ہونی چاہیئے۔ دوسرے تحفے تحائف خرید و فروخت اور دعوت وغیرہ اسی ایک جشن پر تو منحصر ہوتے ہیں۔ اور جو تم اسی کو بھول گئے تو نئی فیشن کی لڑکیاں اس کا مطلب یہ لیتی ہیں کہ گویا تم نے ان ساری متعلقہ چیزوں کو فراموش کر دیا یا کم از کم ان سے دلچسپی نہیں رکھتے"۔

بہرحال جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن خدا را اب نجات کی صورت دکھاؤ"۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ گذشتہ سالگرہ کس تاریخ کو واقع ہوئی تھی"۔

"خوب یہ یاد ہوتا تو بات ہی کیا باقی رہتی"۔

"ٹھیک یاد نہیں تو اندازہ کرو مثلاً یہ کہ کونسا موسم تھا"۔

"موسم گرمی ——— نہیں اُف گرمی کا نہیں ہو سکتا۔ سردی ——— شاید؟"

"برسات؟"

"ہوگا۔ ہوگا"

"اس طرح سے کام نہ چلے گا۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ——— گرمی سے پگھلنے کا سردی سے ٹھٹھرنے کا اور برسات میں بھیگنے کا خیال کرو تو ممکن ہے کچھ یاد آ جائے"۔

"تم نے اشارے تو خوب بتائے۔ در اصل مجھے یاد پڑتا ہے کہ برسات کا موسم تھا کیوں کہ اُن دنوں میں موسم کی خرابی کی وجہ سے کہیں باہر سفر پر نہیں جا سکا تھا۔"

"اچھا تو یہ طے ہو گیا کہ موسم برسات کا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شروع زمانہ تھا یا آخیر؟"

"یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے ـــــ البتہ یہ یاد پڑتا ہے کہ میں نے گذشتہ سالگرہ کے موقع پر اسے ایک تحفہ دیا تھا۔"

"مگر وہ تحفہ کیا تھا؟"

"یہی تو یاد نہیں۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ وہ تحفہ کہاں سے لیا تھا تم نے؟"

"ٹھیرو سوچنے دو۔" زانو پر ہاتھ مار کر "شیخ علی اینڈ سن"

"کیا یہ نام تم نے اس لئے تو نہیں بتا دیا کہ ہمیشہ تم یہیں سے سامان خریدتے ہو؟"

"نہیں بلکہ محض اس لئے کہ دوسرا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا تھا ـــــ چلو اُس سے ملکر دریافت کریں کہ میں نے تحفہ کب خریدا تھا۔"

زبردستی رشید مجھے کھینچتا ہوا موٹر تک لے گیا اور پھر شیخ علی اینڈ سن کی دوکان تک تمام رستے میں اس بدحواسی پر غور کر رہا تھا کہ کیا چیز خریدی گئی یاد نہیں اور دوکان کا نام بھی یقینی نہیں اور رشید صاحب چلے ہیں دوکاندار سے پوچھنے کہ تحفہ کب خریدا گیا۔

دوکان پر پہونچے۔ شیخ علی اینڈ سن جنرل مرچنٹ ہیں۔ دُنیا بھر کی اشیاء موجود ہیں اور رشید صاحب ہیں کہ منیجر سے دریافت کرتے ہیں۔ "کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے جب اپنی بیوی کی سالگرہ کے موقع پر تحفہ خریدا تھا وہ کونسی تاریخ تھی؟" وہ بیچارہ اس بیوقوفی کا مطلب نہ پا سکا، اور انگشت بدنداں تھا......!

"کیا آپ کے ہاں رسید نہیں ہے؟" منیجر نے دریافت کیا۔

"مجھے یاد نہیں" رشید نے جواب دیا۔

"اچھا یہ تو بتایئے کہ کیا چیز آپ نے خریدی تھی؟"

"یہ بھی یاد نہیں۔"

"کم از کم یہ بتایئے کہ کب خریدی تھی۔"

"یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں اور آپ ہم ہی سے پوچھ رہے ہیں۔"

"نہ شئے کا نام یاد ہے، نہ تاریخ خریداری یاد ہے اور نہ رسید موجود ہے۔" منیجر بڑبڑا رہا تھا "اور پھر بھی آپ مجھ سے تاریخ خریداری معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ آہا ہا ہا ـــــ"

رشید جھینپ گیا اور میں نے اُسے یہ کہکر مزید شرمندگی سے بچایا کہ چلو ایک تدبیر سوجھی ہے۔

"کہو تو سہی کہ وہ ہے کیا؟"

میں اُسے دوکان سے باہر لایا۔ کیونکہ منیجر دوکان کے دوسرے نوکروں سے رشید کی بیوقوفی کا حال کہہ رہا تھا اور وہ ہماری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ خیر تو میں باہر آ کر کہنے لگا۔ مسٹر وہ ترکیب یہ ہے کہ کیا تم نے کبھی اُن کتابوں کا ذکر بھی سُنا ہے جس کا عنوان اس قسم کا ہوتا ہے کہ "تم کب پیدا ہوتے ہو؟"

"نجوم کی کتابیں نا! چھوٹی چھوٹی۔ وہی جو ایک ایک آنے کو ملتی ہیں اور جس میں ہر مہینے کی خصوصیات درج ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بالکل ٹھیک! اب تم راستے پر آ رہے ہو۔ ماشاء اللہ تمہارا حافظہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ اچھا تو اس قسم کی کتابوں کا پورا ایک سٹ خرید ڈالو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"تمہیں کیا مطلب؟ سامنے کی دوکان پر شاید مل جائے۔"

دوڑو۔ جلدی کرو۔ گھر پہنچ کر اطمینان سے میں بتاؤں گا کہ اس سے ہمارا معمّہ کیوں کر حل کیا جا سکتا ہے۔"

رشید لپکا اور آن کی آن میں پوری بارہ کتابیں سال بھر کی خرید لایا۔ گھر پہنچ کر میں نے چھ کتابیں لیں اور اُسے چھ دیں اور طریقہ دیکھنے کا یہ بتایا کہ ان میں ذکیہ کی طبیعت۔ مزاج اور فطرت کی مطابقت سے مہینہ تلاش کیا جائے۔ تلاش کرتے کرتے ایک گھنٹہ کے قریب وقت گذر گیا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ذکیہ کی پیدائش کا کون سا مہینہ ہو سکتا ہے کیونکہ ہر مہینے کی چند خصوصیات ذکیہ کے کردار سے ملتی جُلتی تھیں۔ مثلاً جنوری کے مہینے میں جو لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اُن کی خصوصیت یہ درج تھی کہ اُن کی طبیعت میں تلوّن بے قراری۔ بے چینی اور بے ثباتی ہوتی ہے۔ اور رشید کہتا تھا کہ یہ چیزیں ذکیہ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ اور فروری کے مہینے کی خصوصیات کے منجملہ خصوصیت بھی درج تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہیں اور کبھی چشم پوشی نہیں کرتیں۔ ذکیہ کے کردار کا نمایاں جزو یہی تھا کہ ذراسی بات پر اس نے رشید جیسے چاہنے والے شوہر کو ٹھکرا دیا۔ اچھا مارچ کے مہینے کا حال سُنیئے۔ لکھا تھا کہ اس مہینے میں جو لڑکیاں پیدا ہوں وہ شوہر سے ہمیشہ ناراض رہیں گی۔ خواہ مخواہ نکتہ چینی کرتی رہیں گی۔ اب تم ہی بتاؤ اس سے بہتر کوئی خصوصیت یہاں ہو سکتی تھی مگر ٹھہریئے اپریل کے مہینے کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شوہر کو اُلّو بنائیگی اور مجھے یقین تھا کہ ذکیہ رشید کو اُلّو بنا رہی تھی۔

غرض یہ کہ ہم بحث کرتے کرتے تھک گئے لیکن یہ معلوم نہ کر سکے کہ وہ کس مہینے میں پیدا ہو سکتی ہے رات زیادہ ہو گئی تھی۔ کچھ کھا پی کر سو رہے۔ آدھی رات گذری ہو گی لیکن مجھے تو ایک ہی گھنٹہ معلوم ہوا اس وجہ سے کہ تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا۔ ہاں تو نصف شب کے قریب رشید نے مجھے جھنجھوڑ کر جھنجھوڑ کر ہوشیار کیا۔

"کیا ہے رشید۔ کہیں کاٹ کھانے کا مقصد تو نہیں؟"

میں نے بیزار ہو کر نیند کو رُخصت کرتے ہوئے کہا۔

"سُنو سُنو ایک نہایت اہم بات یاد آئی۔ یقیناً اس سے پتہ چل جائے گا۔"

"کہو گئے بھی یا یوں ہی فضول بکواس کرو گے۔"

"تم ہوش میں تو آؤ ——— مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالباً میں اور ذکیہ گذشتہ سالگرہ کے موقع پر سینما گئے تھے۔"

"لاحول ولا۔ اس سے کیا حاصل۔ سینما تو ہر رات ہوا کرتا ہے۔ اس سے کیا خاک پتہ چلے گا۔"

"مگر ٹھہرو۔ میں۔ میں کھیل کا نام بتاؤں گا۔" "روشن آرا" غالباً یہی کھیل تھا۔"

"ہشت یہ تو پچھلے مہینے ہوا تھا۔"

"تو پھر "جہاں آرا" ہو گا۔"

"بیوقوف یہ تو آنیوالا ہے۔ صبح ہی تو دوکان پر اشتہار دیکھا تھا۔"

"عالم آرا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "عالم آرا" ہی تھا۔"

"مگر یہ کھیل صرف ایک دن تھوڑی ہی دکھایا گیا ہو گا اُردو کھیل ہفتوں بلکہ مہینوں چلتے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ چلے گا کہ تم کس دن گئے تھے۔"

"مگر مہینہ تو معلوم ہو جائیگا بلکہ کیا عجب جو ہفتہ کا بھی تعیّن ہو جائے۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ کس تھیٹر میں ہو رہا تھا یہ کھیل؟"

"ار ——— یہی تو مشکل ہے ——— مگر تمہارے ہاں تو ہر تھیٹر کے پروگرام جمع رہتے ہیں نا۔ ذرا فائیل اٹھا تو لاؤ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ کس تھیٹر میں تھا یہ کھیل۔"

"مگر میں تو اب کچھ بھی نہ کرونگا چاہو تو تم دیکھ ڈالو۔ وہاں

تیسرے نمبر کی الماری میں اُس کا سارا مواد جمع ہے۔ جاؤ اب بھاگو یہاں سے۔ نیند بے چین کر رہی ہے۔"

صبح ہوتے ہی میں نے سجائے ٹبلر کے رشید کی صورت دیکھی ناشتہ کے لئے طبیعت بے چین تھی اور وہ سینما کے پروگرام کا بلندہ لئے تواضع کے لئے کھڑا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا "رشید یہ معاملہ ناشتہ تک کے لئے تو کم از کم اُٹھا رکھو۔ ایسی بھی کیا بدحواسی کے سر ہو گئے مجھ غریب کے!"

طوعاً و کرہاً سینہ پر پتھر رکھکر رشید نے اُس وقت تک ضبط کیا جب تک کہ ہم ناشتہ کے لئے میز پر جمع نہ ہو گئے۔ وہ ہر لحظہ کچھ بولنا ہی چاہتا تھا لیکن میں ہمیشہ ہاتھ کے اشارے سے روک رہا تھا کہ ابھی نہیں۔ ذرا صبر کرو۔۔۔۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بھوکا مر رہا ہے۔ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے لیکن میں نے اُس کو ناشتہ کی طرف راغب کرنے سے بہتر اپنے پیٹ کا خیال زیادہ مناسب سمجھا۔۔۔۔ اول خویش بعد درویش!"

"ہاں تو معاف کرنا رشید" میں نے ناشتہ ختم کر کے کہا "تمہیں تھوڑی دیر تک انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑی لیکن یقین مانو میں نے صرف تمہاری خاطر ناشتہ جلد ختم کر دیا گو کہ طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال کہو کسی نتیجہ پر پہنچے؟"

"زمرد محل میں یہ کھیل ہوا تھا۔۔۔۔ تو دیکھو اُسنے سب پروگرام میرے آگے بڑھا دیا۔")

"یہ تو کوئی دس گیارہ مہینے پہلے کا ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ سالگرہ انہی دنوں ہوئی تھی؟"

"ہاں بالکل یقین۔ ہماری شادی کے کچھ ہی دنوں بعد۔ جولائی کا پہلا ہفتہ۔۔۔۔ لیکن اُردو پکچر کبھی ایک ہی ہفتہ پر ختم نہیں ہوتی۔ اس کے لئے تم کیا کرو گے؟"

"نہیں مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ کھیل صرف ایک ہی ہفتے دکھایا گیا تھا۔ تاہم ٹھہرو میں ٹیلیفون سے دریافت کرتا ہوں (یہ کہہ کر وہ دوڑا ہوا کمرے سے نکلا اور تھوڑی دیر بعد آکر سلسلۂ کلام جاری رکھا) ہاں تو میں نے معلوم کر لیا کہ میرا قیاس صحیح تھا۔"

"مگر ایک ہفتہ میں دن اور تاریخ کا تعین کس طرح ہو سکے گا؟"

"ٹھہرو۔۔۔۔ (وہ گہری سوچ میں کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد) ریاض!۔۔۔۔ وہ مارا! (بچوں کی طرح وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور دیوانوں کی طرح ناچنے لگا)۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ ہم نے میٹینی شو (Matinee Show) دیکھا تھا۔"

"مگر دوپہر کا کھیل تو جمعہ اور اتوار دو دن ہوتا ہے۔"

"ارے توبہ! تو کیا یہ تمام محنت ضائع جائیگی۔ نہیں میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی چیز معلوم کرونگا جس کی وجہ سے پتہ مل جائیگا۔۔۔۔ (اپنے آپ سے) میں نے اُس دن پکچر دیکھنے کے سوا اور کون کون کام کئے تھے (سوچتا ہے لیکن جب کوئی چیز یاد نہیں آتی تو جھنجھلا کر ہاتھ پاؤں ٹپکنے لگتا ہے اور جانے کیا کیا بڑبڑاتا ہے۔)

"اچھا خیر یہ تو ہوتا رہے گا۔ ذرا تم ناشتہ کر کے اپنے حافظ کو جلا تو دے لو۔۔۔۔ بھوک میں کیا خاک سُجھائی دیگا۔" میں نے اخلاقاً اُسکو ناشتہ یاد دلایا۔

"خوب یاد آیا۔ ناشتہ کے ذکر سے مجھے اہم ترین گمشدہ کڑی مل گئی۔۔۔۔ یعنی یہ کہ اس دن ہم پکچر دیکھکر رسٹوران میں شام کا کھانا کھانے ڈٹے تھے۔"

"اس سے سراغ کیسے ملے گا؟"

"رسٹوران کے منیجر سے دریافت کرونگا کہ میں نے کھانا کب کھایا تھا؟"

"کیا تم نے رسٹوران میں صرف ایک ہی دفعہ کھانا کھایا ہے؟"

"نہیں۔ مگر جولائی کے پہلے ہفتے میں اور وہ بھی جمعہ یا اتوار کو زکیہ کے ساتھ تو یقیناً ایک ہی دفعہ کھایا ہے۔"

"کون سا رسٹوران تھا وہ!"

"وہ ـــ وہ ـــ وہ! توبہ۔ لاحول ولا! ابھی کہتا ہوں۔ اس کا نام بھلا سا ہے۔ ارے توبہ خوش نما عمارت ہے۔ سامنے کھلا ہوا عمدہ چمن ہے۔ کرسیاں میز نفیس ہیں۔ بوائے سلیقہ مند ہیں۔ کھانا خصوصاً مچھلی بہترین ملتی ہے۔"

"مگر یہ تو اکثر اعلیٰ درجہ کے رسٹوران کی عام خصوصیات ہیں۔ اس سے کسی خاص مقام کا پتہ کیسے چلے گا؟"

"سامنے گیٹ پر ایک نہایت عمدہ بورڈ لٹکا ہوا ہے، پورٹیکو میں گاڑی پہنچتے ہی بوائے دوڑ کر دروازہ کھولنے آتا ہے ـــ"

"یہ بھی ہر جگہ ہوتا ہے۔"

"یوں نہیں۔ ٹھہرو۔ زمرد محل کے ارد گرد کتنے رسٹوران ہیں ـــ وہ جو سامنے ہی ہے ارے یہ تو وہی معلوم ہوتا ہے بالکل سامنے نہایت خوشنما اور ہر دل عزیز۔ ہمیشہ گھمگھٹا رہتا ہے۔ اچھا ریاض بتاتا تو نام اس کا۔"

"اپ ٹو ڈیٹ (Up to date) رسٹوران۔"

"ٹھیک۔ ٹھیک۔ بالکل یہی سہی۔ یہ کہنا ہوا وہ تھا۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے دفتر خانہ سے ٹیلیفون ملایا۔

"کون ہے مسٹر ریاض؟" ایک پہچانی ہوئی نسوانی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"جی ہاں مسز رشید۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا رشید کے متعلق؟ کہیں وہ آپ کے ساتھ تو نہیں ہیں؟"

"سنیئے رشید نے سالگرہ کی تاریخ صحیح طور پر معلوم کر لی۔"

"اوہ!" ایک ایسی دل خوش کن چیخ سنائی دی کہ میں خیال کرنے لگا کہ یہ ٹیلیفون اکسچینج والے بھی کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ روزانہ نہ معلوم ایسی کتنی آوازیں سنا کرتے ہیں ـــ" اچھا یہ تو بتاؤ کہ کیا واقعی رشید نے میری عدم موجودگی محسوس کی؟"

"کیا کہوں مسز رشید ـــ میرے خیال میں سارے شہر میں ان سے زیادہ کوئی پریشان اور کوئی بدحواس نہ تھا ـــ کسی شوہر نے بھی اپنی بیوی کی عارضی جدائی کو اس طرح تشویش کن محسوس نہ کیا ـــ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری قوم نے انہیں منتشر اور دل گرفتہ رہنے کے لئے اپنا نمائندہ بنایا ہے ـــ یا یہ کہ گورنمنٹ نے انہیں رونے بسورنے کے لئے کوئی معقول معاوضہ اور دل خوش کن خطاب دے رکھا ہے ـــ حالت یہ تھی کہ نہ کھانا نہ پینا۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ آٹھوں پہر آپ ہی کا خیال ـــ"

"ارے توبہ ریاض صاحب! پھر آپ نے ان کی یہ بری حالت کن آنکھوں سے دیکھی ـــ آپ بھی عجیب سنگدل واقع ہوئے ہیں کہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ سچ ہے کہ مردوں کے سینہ میں پتھر کا دل ہوتا ہے۔"

"لیکن مسز رشید ـــ"

"اور کمال یہ ہے کہ آپکو صحیح تاریخ معلوم تھی۔ پھر بھی آپ سے یہ نہ ہوسکا کہ بتا دیتے ذرا۔ توبہ کیجئے ایسی بھی کاہیکی دوستی!"

"مگر مسز رشید! آپ ہی نے تو تاکید کی کہ چاہے کچھ ہو جائے مگر تم نہ بتانا ہرگز ہرگز نہ بتانا۔ پھر بتاتا میں کیسے جرأت کر سکتا تھا۔"

"جناب من! میں نے کہا تھا تو اچھا کیا لیکن آپ اتنا بھی سمجھ نہ سکے کہ وہ میرا شوہر تھا اور میں اس کی بیوی۔ یہ تو آپس کی بات تھی بھلا آپکو اس سے تعلق؟ میں چاہے کتنی بھی سختی کروں بجا ہے لیکن یہ کس طرح گوارا کر سکتی ہوں کہ آپ بھی اس بیچارے پر ناروا ظلم توڑیں۔"

"ارے توبہ آپ سمجھتی ہی نہیں۔ آپکی تاکید کے بعد میری

کس طرح مجال ہوسکتی تھی اور پھر مجھے یہ بھی تو خیال تھا کہ بات ہی کونسی ہے۔ رشید معلوم ہی کرلیں گے۔ آج نہ سہی کل!"

"اور سُنیئے! آپ کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہوئی۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھیری ــــــ"

"مگر وہ جو آپکی تاکید تھی اور میرا اقرار ــــــ"

"مگر آپ کا اخلاقی فرض تھا کہ ایسے نازک وقت پر آپ انہیں نظرانداز کرجاتے اور اگر دوستی کا ذرا بھی پاس تھا تو ہمدردی فرماتے نہ کہ تماشا دیکھتے۔"

اس کے بعد مسز رشید نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

لطیف مجھے جو کوفت ہوئی اس کا اندازہ تم مشکل سے کرسکتے ہو۔ اسی فکر میں میں نے بدلہ لینے کی ٹھان لی اور جوں توں کرکے رشید کو راضی کرلیا کہ اب تمہاری باری ہے۔ وہ حیران تھا کہ کس طرح لیکن میں نے سمجھایا کہ ذکیہ کی سالگرہ کی تقریب کے بعد ہی تم اس سے علیحدہ ہوجاؤ اور لکھ بھیجو کہ میں اس وقت تک علیحدہ رہونگا جب تک کہ تم میری سالگرہ کی تاریخ صحیح لکھ نہ بھیجو۔

رشید یہ تجویز سُنکر اُچھل پڑا۔

کچھ عرصے کے بعد مسز رشید مجھ سے گھر پر ملی۔ وہ سُبکیاں لے رہی تھی۔ میں نے انجان بنتے ہوئے دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے لیکن گریہ گلوگیر تھا اور اُس نے بمشکل واقعات کہہ سُنائے اور بڑی منّت سماجت سے میری مدد مانگی۔ میں کوئی ایسا بھولا تو نہ تھا کہ اُس کے فریب میں آجاتا۔ بہر حال جو کچھ گذری وہ ایک دوسری داستان ہے۔ آیندہ کسی موقع کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ اتنا اور سُن لو کہ کس قدر خودغرض ہیں آج کل کی فیشن پرست بیویاں کہ اگر مرد اُنکی سالگرہ کی تاریخ یاد نہ رکھے تو رائی کا پربت بناتی ہیں اور انہیں لائقِ گردن زدنی خیال کرتی ہے اور اگر وہ شوہر کی سالگرہ بھول جائے (جوکہ وہ عمداً بھولتی ہے) تو اسکو خطا ہی نہیں گنتی بلکہ اُلٹا شوہر ہی کو غیرمہذب اور جانے کیا کیا ٹھہراتی ہے۔

ـــ یہ سب کچھ میں نے محض اپنے تم سے کہا کہ تم کنوارے ہو شادی کرتے وقت منجملہ اور شرائط کے ایک شرط سالگرہ کے متعلق بھی کرلینا۔

والسلام۔ تمہارا

ریاض

سیّد بادشاہ حسین۔

میرا ہم سفر

پلیٹ فارم پر شہاب، سعید اور عباس نے ایک شور مچا رکھا تھا۔ یہ سب دوست مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے، گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ شہاب نے بڑھ کر پائے دان پر چڑھتے ہوئے مجھ سے کہا:-

"عباس کہتا ہے کہ گھر جا کر اپنی "اُن" کی خدمت میں سلام ضرور کہنا۔"

"وہ تو پاگل ہے ــــ اچھا خدا حافظ" میں نے ان علیگی دوستوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے یہ الفاظ جلدی میں ادا کئے اور شہاب سے ہاتھ ملا کر دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

علیگڈھ اور اُس کی حسین علمی فضا جس میں میں اس سے کچھ عرصہ پہلے سانس لے رہا تھا، اب مجھ سے ایک طویل عرصہ کے لئے دُور ہو رہی تھی۔ میرا دل سخت مغموم تھا۔ شہاب اگرچہ کالج میں بہت تنگ کرتا تھا مگر اُس سے جُدا ہونے کا مجھے اب احساس ہوا، جب میں نے دفعتہً خیال کیا کہ امرتسر میں مجھے اُس ایسا دلچسپ دوست میسر نہ آسکے گا۔ اسی خیال کے غم افزا اثر کے تحت میں نے سر کو جُنبش دیتے ہوئے اور اس عمل سے گویا اپنے ذہن سے اس تاریکی کو جھٹکتے ہوئے، جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اسکو سُلگایا اور اطمینان سے نشست پر ٹھکاتے سے بیٹھ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا اور پھر اپنے ساتھی کی طرف جو سیٹ کے آخری حصہ پر بیٹھا تھا، پیٹھ کر کے سگریٹ سے دُھوئیں کے چھلّے بنانے کی بے سُود کوشش میں مصروف ہو گیا۔

میں بالکل خالی الذہن تھا معلوم نہیں کیوں؟ سگریٹ کا دُھواں جسکو میں اپنے مُنہ سے چھلّوں کی صورت میں نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہوا کے تُند جھونکوں کی تاب نہ لا کر کھڑکی کے راستے کسی تھرکتی ہوئی رقاصہ کی طرح تڑپ کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بہت عرصہ تک سگریٹ کے اس لرزاں دھوئیں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا ــــ یہ رقص کی ایک تکمیل تھی۔

"رقص کی تکمیل"۔ یہ الفاظ دفعتہً میرے دماغ میں پیدا ہوئے اور میں اپنے اس اچھوتے خیال پر بہت مسرور ہوا۔

"کیا میں پاگل ہوں؟"

گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ آہنی پٹڑیوں کا بچھا ہوا جال بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پتھریلی روش کے آس پاس اُگے ہوئے درخت ایک دوسرے کا تعاقب کرتے معلوم ہوتے تھے۔ میں "رقص کی تکمیل" اور ان درختوں کی بھاگ دوڑ کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ ان حیران کُن الفاظ نے مجھے چونکا دیا جو غالباً میرے اُس ہم سفر نے ادا کئے تھے جو سیٹ کے آخری حصّے پر کونے میں بیٹھا تھا۔ اُس نے یقیناً یہ عجیب سا سوال مجھ سے ہی پوچھا تھا۔

"کیا آپ مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں؟"

"جی ہاں، کیا میں پاگل ہوں؟" اُس نے ایک بار پھر مجھ سے دریافت کیا۔

ٹرین کی روانگی پر جب میں نے شہاب سے یہ کہا تھا "وہ تو پاگل ہے ــــ اچھا خدا حافظ" تو شاید اس شریف آدمی نے یہ خیال کر لیا تھا کہ میں نے اُسی کو پاگل کہا ہے ــــ میں کھل کھلا کر ہنس پڑا اور نہایت مؤدبانہ لہجہ میں کہا:-

"آپکو غلط فہمی ہوئی ہے حضرت، گاڑی چلتے وقت شاید میں نے اپنے کسی دوست کو پاگل کے نام سے پکارا تھا ــــ وہ تو

ہے ہی پاگل۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ آپکو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی"۔

یہ معقول دلیل سُنکر میرا ہم سفر جو غالباً کچھ اور کہنے کے لئے ذرا آگے سرک رہا تھا خاموش ہوگیا۔ یہ دیکھ مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ معاملہ نہیں بڑھا۔ اتفاق سے میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ عموماً مجھے نکمی سے نکمی باتوں پر طیش آجایا کرتا ہے چونکہ اس سے قبل کئی مرتبہ دورانِ سفر میں میرا مسافروں سے جھگڑا ہوچکا تھا۔ اور میں اُس کے تلخ نتائج سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے لازمی طور پر میں اس معاملہ کو اتنی جلدی بخیر وخوبی انجام پاتے دیکھکر بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے اس مسافر سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لئے اُس سے ایسے ہی گفتگو شروع کی —— رسمی گفتگو جو عام طور پر گاڑیوں میں مسافروں کے ساتھ کی جاتی ہو۔

"آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں ؟" میں نے اُس سے دریافت کیا۔

"میں ——" یہ کہتے ہوئے وہ کونے سے سرکتا ہوا اُٹھکر میرے مقابل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "میں دہلی جارہا ہوں" —— آپ کہاں اُتریں گے ؟

"مجھے کافی طویل سفر کرنا ہے — امرتسر جارہا ہوں"۔

"امرتسر ——"

"جی ہاں"

"مجھے یہ شہر دیکھنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ اچھی بارونق جگہ ہے۔ کپڑے کی تجارت کا مرکز ہے کیا آپ وہاں کسی کالج میں پڑھتے ہیں ؟"

"جی ہاں"، میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اُس کا سوال میرے نزدیک بہت غیر دلچسپ تھا، اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اپنے ہم سفر سے یہ کہا ہوتا کہ میں علی گڈھ کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں تو وہ کالج کی دلچسپیوں، اسکی عمارت اور اُس کے خدا معلوم کِن کِن حصّوں اور شعبوں کے متعلق مجھ سے سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ اِس سے قبل میرے ساتھ اس قسم کا واقع پیش آچکا تھا جب میرے ایک رفیقِ سفر نے سوال پوچھتے پوچھتے رات کی نیند مجھ پر حرام کر دی تھی۔

"کون سے کالج میں —— میرے خیال میں وہاں کئی کالج ہیں"۔ اُس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا۔ "خالصہ کالج میں"۔

"اچھا، وہی جو اینڈرسن نے تعمیر کرایا ہے"۔

"اینڈرسن نے، مگر وہ سکھوں کا کالج ہے حضرت"۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مسٹر، یہ اینڈرسن سکھ ہوگیا تھا نا —— آپ نے غالباً سکھ ہسٹری کا مطالعہ نہیں کیا"۔

"شاید"۔

یہ کہہ کر میں نے گفتگو کو دلچسپ نہ پاتے ہوئے مُنہ موڑ لیا اور کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی اب یو۔پی کے وسیع میدانوں میں دندناتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ لوہے کے پہیوں کی وزنی جھنکار اور چوبی شہتیروں کی کھٹ کھٹ فضا میں ایک عجیب یک آہنگ شور برپا کر رہی تھی۔ اس شور کی صدائے بازگشت نے آس پاس کے دوڑتے ہوئے کھمبوں اور درختوں سے ٹکرا کر شام کی خُنک ہوا میں ایک انتعاش پیدا کر دیا تھا۔ میں نے ایسے ہی کھڑکی میں سے اپنا بازو باہر نکالا۔ مُنہ زور گاڑی کی تیز رفتار کی وجہ سے ہوا کے زبردست دھکے نے میرے بازو کو ریلا دیکر پیچھے دبا دیا —— میں نے ٹھنڈی ہوا کے اِس دباؤ کو بہت پیارا محسوس کیا۔ چنانچہ میں کھیل میں مصروف ہوگیا اور اپنے ہم سفر اور اُس کی گفتگو کو بالکل بھول گیا —— ہوا کے دباؤ کی دلنوازی بہت مسرور کُن تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے اِس کھیل سے اُکتا گیا۔ دراصل بار بار ہوا کو چیرنے سے میرا بازو تھک گیا تھا۔ اب میں نے مُڑ کر میدانوں کی وسعت کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخ ــــ آتشیں سُرخ کرنیں میدان کے گڑھوں میں بارش کے جمع شدہ پانیوں پر زرنگاری کا کام کر رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری زمین کے سینے پر کسی نے بڑے بڑے آئینے آویزاں کر دیتے ہیں۔ بجلی کے تاروں اور کھمبوں پر نیل کنٹھ اور ابابیلیں پھُدک رہی تھیں ــــ یہ منظر بہت سُہانا تھا۔

"کیا میں پاگل ہوں؟"

ان الفاظ نے ایکبار پھر اُن رنگوں کو منتشر کر دیا جو میرے دل ودماغ پر ایک نہایت ہی پیاری تصویر کھینچ رہے تھے۔ میں چونک پڑا۔ میرے اُسی ہم سفر نے مجھ سے یہ سوال دریافت کیا تھا۔ میں مُڑا۔ وہ میری طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے میں نے اس سے کہا:۔

"کیا ارشاد فرمایا آپ نے؟"

وہ ایک لمحہ خاموش رہا اور پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا ــــ "کچھ بھی نہیں، شاید آپ نہ بتا سکیں گے!"

اب میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ اُسکی عمر غالباً بیس بائیس برس کے قریب ہوگی۔ ڈاڑھی کمال صفائی سے مونڈی ہوئی تھی۔ اُس کے گال گوشت سے بھرے ہوئے تھے اُنکی موٹائی میں بہت خفیف سا فرق تھا، جو صرف مجھ ایسا باریک بیں ہی دیکھ سکتا ہے۔ بال جن میں سے کسی اچھے اور بڑھیا تیل کی خوشبو آرہی تھی، پیچھے کی طرف کنگھی کئے گئے تھے جس سے اُسکی پیشانی بہت کشادہ ہوگئی تھی۔ وہ معمولی قسم کے کشمیرے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کلف شدہ کالر قمیص کے ساتھ لگا ہوا تھا مگر ٹائی موجود نہ تھی ــــ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بولا:۔

"میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اُس کے رازدارانہ لہجہ سے بہت متحیّر ہوا۔ آخر وہ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتا ہے؟ یہ خیال کرتے ہوئے میں نے جُھک کر گویا اُس کے سوال کا جواب دینے کے لئے تیار ہو کر کہا۔ "بصد شوق ــــ فرمایئے۔"

"کیا میں پاگل ہوں؟"

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ جواب کیا دوں۔ آپ ہی فرمایئے میں اُس شخص کو کیا جواب دے سکتا تھا جو بظاہر نہایت ہی ہوشمند انسان معلوم ہوتا تھا ــــ بالکل میری اور آپ کی طرح۔

"آپ؟...... آپ؟" ــــ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں میں۔ آپ فرمایئے نا؟" اُس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے دریافت کیا۔

"مگر کیوں؟ آپ بڑے ہوشمند انسان ہیں ــــ!"

"آپ اپنی رائے مرتب کرنے میں جلدی سے کام نہ لیجئے، پھر غور فرما کر جواب دیجئے، کیا میں واقعی پاگل ہوں۔"

اس میں غور کرنے کی بات ہی کوئی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے ہم سفر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دراصل میں دو چیزیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اوّلاً یہ کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا۔ ثانیاً یہ کہ شاید اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کر دے کہ وہ سچ مچ پاگل ہی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے سُنا تھا کہ عام طور پر پاگلوں کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے اُبھرے ہوتے ہیں۔ مگر وہ آنکھیں جو میری طرف دیکھ رہی تھیں، غیر معمولی طور پر سفید تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سفید چینی کی بنی ہوئی ہیں۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

"آپ کو کسی نے بہت غلط طور پر شک میں ڈال دیا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی ڈاکٹر نے اُس کو وہم میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آجکل کے سستے اور جاہل ڈاکٹر بغیر سوچے سمجھے نبض پر ہاتھ رکھ کر کسی کو دیوانہ کسی کو مدقوق اور کسی کو ضعفِ اعصاب کا مریض ٹھیرا دیتے ہیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے ــــ مگر آپ کو قطعی طور پر یقین ہے کہ میں واقعی پاگل نہیں ہوں"۔ اُس نے کہا۔

"قطعی طور پر ــــ جس شخص نے آپ کو اس وہم میں مبتلا کیا ہے، میرے خیال میں وہ خود پاگل ہے"۔

"خیر وہ تو پاگل نہیں، اچھا بھلا ہے"۔

"وہ کون بزرگ ہیں؟"

"میرا اپنا باپ"

"آپ کا باپ؟"

"جی ہاں ــــ وہ کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں، حالانکہ میں خود میں اس قسم کی کوئی علامت نہیں پاتا۔ آج سے ایک سال قبل اُس کی نظروں میں میں پاگل نہ تھا لیکن جونہی میری شادی ہوئی میرے باپ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ موہن دیوانہ ہے۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سسرال والوں نے ڈر کے مارے اپنی لڑکی کو گھر بلوا لیا۔ اب وہ اُس کو میرے حوالے نہیں کرتے۔ یہ کس قدر رنج افزا بات ہے کہ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ دس پندرہ دن بھی بسر کرنے میسّر نہیں ہوئے"۔

یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ واقعتاً وہ بہت مغموم ہے۔ میں بھی بہت متاثر ہوا لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کے باپ نے اُسے خواہ مخواہ پاگل بنا کر اُس کی زندگی کیوں تلخ کر دی ہے۔

"مگر آپ کے والد صاحب نے یہ حرکت کیا کی؟" میں نے اُس کی داستان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر، وہ یہودی ہے ــــ پکا یہودی۔ اُسکو صرف اپنے طلائی سکّوں سے غرض ہے۔ اور بس۔ میں اُس کے خون کا ایک حصّہ ہوں مگر یہ چیز اُس کے دل پر اثر نہیں کر سکتی ہے اگر اُس نے مجھکو پاگل بنایا ہے تو اس میں بھی کوئی بڑا راز مضمر ہے۔ وہ اس قدر نفس پرست ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی جایداد اُس کے اپنے لڑکے کے ہاتھوں میں چلی جائے دیکھئے، میں نے تین سال ہوئے بی۔ اے پاس کیا ہے، یہ علیٰحدہ بات ہے کہ میں کوئی نوکری حاصل نہیں کر سکا ہوں مگر میرے باپ کو یہ تو چاہیئے کہ وہ مجھے اچھا خرچ دے"۔

"یقیناً"، میں نے پرزور تائید کی۔

"لیکن وہ مجھے صرف پانچ روپے ماہوار دیتا ہے ــــ حقیقت تو یہ ہے کہ اُس نے میرے شباب کی تمام رنگینیوں پر اپنی ہوس پرستیوں کی سیاہی اُلٹ دی ہے۔ میں آگرہ میں پڑا ہوں میری بیوی دہلی میں ہے۔ میرے اِس یہودی باپ نے میرے اور اُس کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے میں اُس سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ وہ خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے، مگر وہ مجبور ہے ــــ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔ اب میں اُس کا فیصلہ کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی تین پتلونیں اور تین کوٹ بیچ دئے ہیں۔ اب میں دہلی جا رہا ہوں۔ دیکھا جائیگا جو ہوگا"۔

"آپ اپنی بیوی کے پاس جا رہے ہیں"، میں نے اُس سے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ میں گھر میں بغیر اجازت لئے داخل ہو جاؤنگا اور وہاں سے اپنی بیوی کو لئے بغیر ہرگز ہرگز نہ ٹلونگا۔

اگر میں پاگل ہوں، تو ہوں ــــ مگر مجھے یقین ہے کہ سوشیلا (یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا جھینپ گیا) میرے ساتھ چلنے کو تیار

ہوگی۔ میں نے اُس کے لئے نمائش میں سے ایک اُونی سوئٹر خریدا ہے وہ اِس کو یقیناً پسند کریگی۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟"

"اگر آپکو ٹرنک وغیرہ کھولنے کی زحمت نہ اُٹھانا پڑے"۔ میں نے جواب دیا۔

"نہیں صاحب، یہ تو میں نے قمیص کے اندر خود پہن رکھا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور کوٹ اُتار دیا۔ پھر قمیص کو پتلون کی گرفت سے آزاد کرکے اُس نے اُسے بھی اُتار دیا ــــ وہ واقعی ایک رنگ برنگی فیتوں والا زنانہ سوئٹر پہنے ہوئے تھا۔

"کیا آپکو پسند ہے؟ ــــ یہ میں نے اسلیئے پہن رکھا ہے کہ اگر سوشیلا نے اِسکے لینے سے انکار کردیا تو میں اسے پہنے ہی رہونگا"۔

اِس زنانہ سوئٹر میں وہ کسقدر عجیب معلوم ہوتا تھا ــــ

سعادت حسن منٹو

شریر بیوی

چغتائی صاحب نے اِس ناول میں عام ناول نگاری کی طرز سے ہٹ کر بالکل ہی نئی طرز اختیار کی ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے بھی اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی اُردو ناول نگاری میں "شریر بیوی" اپنی طرز کی پہلی چیز ہے۔ شریر بیوی کی شرارتیں اس قدر عجیب وغریب ہیں کہ آپ انہیں دیکھکر بے اختیارانہ ہنس پڑیں گے۔ اِس ناول کا سنٹرل پارٹ "کونین" اتنا مقبول ہوا ہے کہ اُردو کے بے شمار رسالوں میں نقل ہوچکا ہے۔ اس کتاب میں ایک روشن خیال اور تعلیم یافتہ شریف گھرانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ آزاد خیال شریر بیوی کا کیریکٹر دیکھنے کی چیز ہے۔ اِس کی معصوم شرارتیں اسقدر دلچسپ ہیں کہ آپ اس کتاب کو بار بار پڑھیں گے اور ہر دفعہ آپ کو ایک نیا لُطف حاصل ہوگا۔ پردہ اور بے پردگی کی حدود پر اس کتاب میں بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور افسانے کے پیرایہ میں ایک ایسی خاتون کی سرگذشت بھی پیش کی گئی ہے جس نے گھٹی ہوئی فضا میں تربیت پائی تھی اور کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے گھر کی چار دیواری ہی کو اپنی دُنیا سمجھتی تھی۔ اِس غریب پر جو جو مصیبتیں پڑتی ہیں وہ اسقدر دردناک ہیں کہ انہیں پڑھکر دل بھر آتا ہے۔ قیمت (۱۲؍)

دیکھا جائیگا

چغتائی صاحب کا معرکتہ الآرا مختصر ناول ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ عام طور پر آج کل محبت کا مفہوم کیا ہے؟ دو بھائی ایک مالدار لڑکی سے بے طرح عشق کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک صاف صاف کہدیتا ہے اگر لڑکی نے انکار کیا تو خودکشی نتیجہ نکلے گا۔ لڑکی کی سراسیمگی، اور بالآخر ایک عجیب وغریب ذریعے سے اس معمہ کا حل۔ لڑکی کس کو ملی؟ کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔ محبت بوالہوسی اور زرپرستی کو افسانہ کے پیرایہ میں نہایت خوبی سے واضح کیا گیا ہے لڑکیوں اور والدین کے لئے ایک بے مثل کتاب ہے۔ سرورق چار رنگ کا۔ خوشنما جلد۔ قیمت ایکروپیہ (عہ)

تفویض

ایک گریجویٹ خاتون کی شادی محلّہ کی مسجد کے مولوی سے ہو جاتی ہے اور مولوی صاحب کی خوفناک محبت زدوکوب تک پہونچتی ہے۔ طلاق وہ دیتے نہیں۔ اِس غریب عورت نے کس طرح اس عفریت سے پیچھا چھڑایا اور پھر اس پر کیا بیتی، ایک حیرت انگیز خواب کے پیرایہ میں چغتائی صاحب نے اس قصہ کو پیش کیا ہے۔ قیمت صرف پانچ آنہ (۵؍) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ: ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

سونے کی تلاش

(۱)

سونا! میرا مطلب ایک وزنی چمکدار پیلی سی دھات سے ہے۔ سُناروں کی دُوکانوں میں سجی دیکھکر میری تو آنکھ ٹکٹکی لگ جاتی ہے۔ میر صاحب کو بھی اس قسم کی روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دفعہ اس کی سخت تلاش کی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میر صاحب (صبح کے وقت) ایک اُردو اخبار ہاتھ میں ذرا گھبرائے مگر خوش خوش داخل ہوئے۔ بولے "میاں کتابیں پڑھ لینے کے معنی یہ تھوڑی ہیں کہ عقل ہی آ جائے۔ ہم نہ کہتے تھے ...."

اور یہ کہہ کر اُنہوں نے اخبار میرے سامنے میز پر رکھا۔ پاؤ رچونے اور کتھے میں رنگین اُنگلی ایک عنوان پر رکھکر پڑھ کر سُنانے لگے۔

گھونسلے میں سونے کا کنٹھا

احمد آباد میں آندھی سے ایک درخت گر گیا۔ اس میں ایک گھونسلا تھا۔ اس میں سے ایک غریب آدمی کو لکڑیاں بینتے میں ایک سونے کا کنٹھا ملا۔ گھونسلا بعد تحقیقات معلوم ہوا کہ چیل کا تھا۔

یہ پڑھنے کے بعد میر صاحب نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے قائل کر چکے تھے۔ کہنے لگے "بولو۔ کیا ارادہ ہے؟ بس یہ دیکھ لو کہ چیل کے بچے آج کل ہر پیڑ پر ہیں۔"

میں نے کہا "آں ہاں۔"

وہ بولے "اِس میں تو شک نہیں کہ چیل کے بچے بغیر سونا دیکھے آنکھ نہیں کھولتے .... مگر یار ایک بات ہے۔ جو تم نے مُنشی کو لیا تو بس۔ بس کام بگڑ جائیگا۔"

میں نے کہا "نا صاحب ہم مُنشی وُنشی کو کیوں لینے لگے۔"

(۲)

اِس کے چوتھے دن کا ذکر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ ہم دونوں صبح اندھیرے مُنہ جنگل چل دیئے۔ میر صاحب کی پوٹلی میں ناشتہ تھا۔ سونے کی تلاش تھی اور میر صاحب کچھ کیمیا میں بھی دخل رکھتے تھے۔ ایک دم سے چیخے "ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔ دیکھو۔ واللہ۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔

"کانا موسی! اماں واللہ کانا موسی۔ ٹھہرو۔"

ہم دونوں وہیں کے وہیں بیٹھ گئے اور ایک بُوٹی کا معائنہ کر رہے تھے۔ "کانا موسی" وہ بُوٹی ہے جس کے پیچھے ہزاروں لاکھوں کیمیا گر فنا ہو گئے پر نہ ملی۔ مگر قسمت تو دیکھئے ہماری! یوں مل گئی۔ میر صاحب بولے۔ "واللہ مرزا وہی ہے۔ ہٹ جاؤ...

.....بولو مت۔"

بعد تحقیقات اس کی پتیاں انگلیوں میں مل کر سونگھی گئیں میر صاحب نے ایک خاص قسم کی خوشبو محسوس کرنے کی فرمائش کی اور اس بوٹی کو انگلی سے مسل مسل کر سونگھا اور سونگھایا گیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ خاص خوشبو معلوم ہو سکے ناک جھلانے لگی۔ انگلیاں بھی سہلانے لگیں۔ بہت جلد ناک میں کھجلی سی معلوم دی۔ کھجایا تو اور بھی زیادہ ہوئی۔ میں نے کہا "ارے میر صاحب یہ کیا واہیات ہے"۔ میر صاحب نے اپنی ناک مسلتے ہوئے کہا "ارے ......" اجی کہاں کی کا ناموسی۔ "ناکا موسی" سے فی الحال سابقہ پڑا۔ اِدھر میں چھینکتا ہوں اور اُدھر میر صاحب بانسری بجاتے ہیں۔ ناکیں پکڑے معلوم ہو بھوت شیشہ میں اُتارے جا رہے ہیں۔ بس نہ تھا کہ ناکوں کا وجود مٹا ڈالیں۔ ناکیں لال ہو گئیں ملتے ملتے۔ اور گالوں اور ہونٹوں کو بچانا دوبھر ہو گیا۔ میر صاحب چیخے "ارے راکھ" اور ہم نے بھی زمین میں رگڑ رگڑ کر ناک پر پھیرتے ہیں۔ ناکیں ہیں کہ دُکھ رہی ہیں۔ رومال میں مٹی بھر بھر کر ناکیں ڈبوئی گئیں۔ سفر ملتوی ہو گیا۔ خدا خدا کر کے وہاں سے جان چھوٹی۔ پر ناکیں ہیں کہ جھلا رہی ہیں۔ میر صاحب کے ناشتہ دان میں گھی تھا۔ اُس میں نمک مرچ نہیں ملا تھا۔ بعد رگڑا رگڑی کے ناکوں پر گھی ملا۔ مگر معلوم دے کہ پھننگ پر انگارے رکھے ہیں۔ بہت دیر بعد حواس ٹھیک ہوئے۔ آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ لڑائی ہوتے ہوتے بچی۔ جوش تو آدھا رہ گیا تھا مگر سونا بری چیز ہے۔ لہذا آگے چلے۔ بار بار ہم ان کی ناک کو اور وہ ہماری ناک کو دیکھتے۔ ایک دوسرے کی ناک کو دیکھ کر اپنی ناک کی سُرخی اور سوزش کا پتہ لگاتے ہوئے۔

(۳)

بہت جلد چیل کے گھونسلے کی تلاش شروع ہو گئی۔ چلتے چلتے ایک پیڑ پر گھونسلا نظر پڑا۔ میں نے کہا کہ میں چڑھوں اور انہوں نے کہا کہ میں چڑھوں۔ طے ہوا کہ دونوں چڑھیں۔ اب پیڑ پر چڑھنے میں ہم دونوں مہارت نہ رکھتے تھے۔ دونوں نے کوشش کی معلوم ہوا درخت سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ میر صاحب نے مجھ سے پہلے ہار مانی اور درخت کو موٹی موٹی گالیاں دیں حسرت سے گھونسلے کی طرف دیکھا اور پھر جوش آیا۔ معلوم ہوا کوشش شرط ہے۔ "دونوں چڑھ سکتے ہیں۔ ایک جنا گھوڑا بن جائے۔" میر صاحب نے مجھے گھوڑا بنانے کی نیت سے کہا۔ "پھر اوپر سے مدد دیکر چڑھا لینا آسان ہے۔"

میں نے اوّل تو کچھ سوچا۔ پھر بن گیا گھوڑا۔ میر صاحب نے اپنے وزن کی کمی پر فخر کیا اور مجھے "بدکنے" سے منع کر کے چڑھ گئے۔ جلدی سے میں کھڑا ہو گیا۔ اور اُن کے کولھوں کو ہاتھ سے سہارا دیا۔ اب دیکھتا جو ہوں تو میر صاحب گدّے پر بیٹھے مُسکرا رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ "لے اب تم بھی چڑھ آؤ" یہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا۔ بائیں ہاتھ سے برابر کا گدّا گلے سے چمٹا لیا اور ایک طرف پیر اڑا لیا ایسے کہ پیچھے کو تنے رہیں۔ میں نے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے تو دل بول رہا تھا کہ الٰہی خیر۔ ہاتھ میں ہاتھ۔ دونوں پنجہ ایک ایک کر کے درخت کے تنے سے لگائے۔ لٹکا جو ہوں تو صبر میر صاحب کی جان پر۔ ذرا اوپر نہیں کھینچتے۔ "ارے کھینچو۔ کھینچئے میر صاحب......"

"اُوں۔ ہوں......"

وہ جگہ پر بیٹھے رہتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ ذرا کھڑے ہوئے ہیں کہ توازن بگڑ گیا۔ پیر رَپٹ گیا۔ میرے پیر جگہ سے سرک گئے۔

ایک نیچے ہوگیا۔ اِدھر میں کھردری چھال سے رگڑ کھاتا پھسلکر گرا اور اُدھر میر صاحب کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ پیچھے گرے۔ بہتیرا سنبھلے پر نہ سنبھلا گیا۔ گرنے سے بچنے کے لئے ساری بغل اور ران چھل گئی۔ ایسا گرنا اس سے ہزار درجہ بہتر ہوتا تھا۔ بعد بحث خطا میری ثابت ہوئی۔ اب پھر پیڑ کی طرف دیکھا۔ گھونسلے تک پہونچتے پہونچتے اسی قسم کی رگڑوں اور پھسلنوں کے اتنی جگہ امکان تھے کہ ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ دراصل ایسا "بیہودہ" درخت ہی کس کام کا۔ میر صاحب نے اور موٹی موٹی گالیاں درخت کو دیں اور یہاں سے چل کھڑے ہوئے۔

(۴)

واللہ۔ جویندہ یابندہ۔ ایک درخت پر پہونچے ہیں کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ کیسے موقعہ کا پیڑ تھا اور اُس پر چیل کا گھونسلا! "اُرے۔ رے۔ رے" میر صاحب نے کہا "قسم خدا کی..... لاؤ ہاتھ....." اور پھر غور سے ہم دونوں نے مٹھی کی دوربین بنا کر تاک لگائی۔ چیل کے بچے۔ سونا وغیرہ وغیرہ نہ معلوم کیا کیا دیکھ ڈالا۔ قیاس کہاں کہاں دوڑایا ہے کہ مشاہدہ میں دخیل ہوگیا۔ "درخت تو یہ ہے" میر صاحب نے خوش ہوکر کہا۔ "یار مرزا دیکھتا کیا ہے"

جلدی سے سامان نیچے چھوڑ چھاڑ ہم دونوں چڑھنے لگے۔ بڑی تیزی سے اُوپر پہونچے ہیں۔ میر صاحب اپنے کو خطرے میں ڈالکر "شارٹ کٹ" کرکے ایک گدھا پھاندکر مجھ سے سبقت لے گئے اور لپک کر گھونسلا سنبھالا۔ لاحول ولا قوۃ۔ قیاس اور نظر دونوں نے غلطی کی۔ گھونسلا تو موجود مگر غالباً بن رہا تھا۔ ہی بچے وغیرہ جو نیچے سے دکھائی دئے تھے وہ محض خیالی تھے۔ اور میر صاحب نے چیلوں کو مغلظات گالیاں دیتے ہوئے سارا گھونسلا پالک کے ساگ کی طرح بکھیر دیا۔ کہ اتنے میں نیچے سے آواز آئی "غُر..... فش..... عف عف....." نیچے ناشتہ دان پر کتے لڑ رہے تھے!

"لینڈی....." میر صاحب نے دہاڑ کر کتوں کو مخاطب کیا اور پھر کتوں کے مخاطب کرنے والی سب لغت معہ گالیوں کے ختم کردی۔ اور میں الگ چیختا ہوں۔ "ابے کتے..... کتے..... کتے۔ کُ تے۔ ع..... ہاہا..... ارے..... لینا....."

اب میر صاحب اور میں دونوں چیختے چلاتے کتوں کو للکارتے گرنے سے بچتے تیزی سے اُتر رہے ہیں پیڑ پر سے۔ میرا تھیلا بھی وہیں رکھا تھا۔ جب تک ہم اُتریں اُتریں ایک کتا میر صاحب کی پوٹلی لیکر یہ جا وہ جا۔ …سرا میرا تھیلا لے کر کھسکا ہے کہ میں جان پر کھیل کر درخت سے کودا پڑا اور تھوڑی ہی دور جا کر تھیلا اپنا چھڑا لیا۔ لیکن میر صاحب اوّل تو گر پڑے اور پھر اُن کا کتا ہاتھ نہ آیا۔ وہ دراصل دوسری سمت گیا تھا اور دُور نکل گیا۔ میر صاحب نے دُنیا کے کل کُتوں اور کُتوں کے آبا و اجداد کو پُن ڈالا۔ اور کتے تو نکل گئے۔ رہ گیا میں۔ تو اب مجھ سے اُلجھ پڑے۔ اور بنائے مخاصمت یہ کہ "جب ایک آدمی چڑھ رہا ہے تو دوسرے کو چڑھنے کی کیا ضرورت۔ ایک کو نیچے رہنا چاہیئے تھا"

اس کا میں کیا جواب دیتا۔ خود ہی تو خوشی سے بیدم ہو گئے چڑھتے وقت۔ قطعی منع نہ کیا، پھر خود سوچیے کہ میں اگر نہ چڑھتا اور وہاں میر صاحب کے ہاتھ سونا لگ جاتا تب بھلا مجھے کیا ملتا۔ یہ تو میں نے نہیں کہا۔ عذر میرا یہ تھا کہ اوّل تو آپ کم چیخے اُوپر سے۔ میں زیادہ چیخا۔ پھر میں پوٹلی والے یعنی آپکے۔ کتے کے پیچھے اگر پہلے دوڑتا تو میرا تھیلا بھی گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ خطا میری کچھ بھی نہیں۔ جب دونوں اُوپر تو کتا پوٹلی لیکر چلدے تو اور تھیلا لے کر چلدے تو سب برابر۔ کوئی ذمہ دار نہیں۔

اس محنت اور بحث اور صدمہ سے فراغت پائی تب دیکھا کہ جگہ جگہ سے کپڑے ہی پھٹ گئے ہیں۔ خیر۔ درخت پر تو یہ ہونا ہی ہے۔ اب چارہ ہی کیا تھا۔ چلو بھائی آگے۔ اور ہم دونوں کتوں کو بُرا بھلا کہتے۔ میر صاحب کے عمدہ ناشتہ اور رُوغن زرد کے نقصان پر افسوس کرتے چلے۔ کھیتوں کھیت اور مُنڈیروں نالیوں کو لانگتے پھلانگتے۔ سامنے فاصلہ پر بلند درختوں کی پھننگوں سے آس لگائے۔ "یا مالک کر دے حکم"۔ میر صاحب نے ایک گڈھے کو پھاندتے ہوئے کہا اور سامنے درختوں سے اُمید دلائی۔ راستہ میں کئی گنواروں پر کتا پالنے کے جرم کا الزام ہی لگایا۔ مگر بیکار۔ پوٹلی والا کتا اور اُس کا مالک کوئی بھی نہ ملا۔

(۵)

چلتے چلتے ہم دونوں جو ایک درخت کے تلے پہونچے ہیں تو میر صاحب کی "کھیسیں" کھل گئیں۔ اور ہم دونوں نے جلدی جلدی کپڑے سمیٹے اور پاجامے اوڑس کر لگے چڑھنے کی تیاری کرنے۔ نیچے ہی سے دیکھ لیا ہم نے۔ گھونسلے میں بچے بیٹھے تھے۔ "وہ مارا"۔ میر صاحب نے خوش ہوکر کہا۔ "آدھوں آدھ"۔ میں نے بھی کہا "آدھوں آدھ"۔ میر صاحب نے کہا "خواہ سُنار سے مال انکوا کر دام آدھے لے لینا اور خواہ ناپ تول کر چیز کا آدھا کر لینا"۔ میں نے کہا "ٹھیک۔ جیسی آپ کی مرضی"۔ اور چڑھتے ہی تھے کہ دیکھا جلدی میں تھیلا وغیرہ تو پھر ویسے ہی چھوڑے جاتے ہیں۔ جلدی سے اُٹھا کہ ایک نیچے سے گڈھے پر تھیلا وغیرہ رکھا۔ اب چڑھنے لگے۔ درخت پر چڑھنا ویسے تو آسان تھا مگر چیل کی شرارت تو دیکھئے کہ ایک سے ایک عمدہ اونچی ڈالی اور پھننگ موجود پر چڑیل نے گھونسلا رکھا تو کہاں۔ ایک بے شاخ و برگ کا خوب موٹا سا گُدّا اوپر جا کر ایک طرف سید ھا شہتیر کی طرح چلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ ذرا اُٹھتا ہوا جیسے سامنے ایک چڑھائی ہو۔ آخیر میں جاکر چند شاخیں اور اُن میں گھونسلا تھا۔ گدّا نہایت ہی موٹا اور مضبوط تھا۔ جگہ بہ جگہ شکستہ شاخوں اور قدیم ڈالیوں کے وجود کے نشان۔ گڈھے۔ سوراخ چھوٹے چھوٹے۔ جگہ بہ جگہ ٹھونٹھ اور کھونٹیاں کپڑے پھاڑنے کو۔ سہارا لینے پکڑنے کو کچھ نہیں۔ لیکن گدّا موٹا تھا اور گھوڑے کی طرح اُس پر بیٹھ کر گدّے کو پکڑ کر دونوں پیر اِدھر اُدھر لٹکائے بڑے مزہ سے اوپر تک سرکتے چلے جائیں گے۔ اور ہم دونوں خوش خوش اس گدّے پر سوار ہو کر ٹھونٹھ اور کھونٹیوں سے کپڑوں کو بچاتے آگے کھسکنے لگے۔ میر صاحب بے انتہا خوش۔ بولے۔ ہُوا تو مزیدار ہے یار۔ مگر"

میں نے اپنی ران کو ایک کھونٹی سے بچاتے ہوئے ذرا اُوپر کو سرکتے ہوئے کہا "مگر مل جائے کچھ تو ہے"۔

اور اسی طرح ہم دونوں خوش خوش میر صاحب آگے اور میں اُن کے پیچھے سرکتے کھسکتے مزہ اور احتیاط سے اپنی رانیں اور کپڑے کھونٹیوں سے بچاتے آخر کار اُس گدّے کی آخری حصہ پر پہونچے۔ اس موقعہ پر دو تین آدمی نیچے آگئے تھے۔ میر صاحب بولے۔ "بھائی ذرا چیزیں دیکھتے ہوئے"۔

ایک بگڑ کر بولا "کوئی ہم چور ہیں۔ ہیں کوئی لئے جاتا ہے"۔

میر صاحب نے کتوں کو بہت سخت اور موٹی سی گالی دیکر کہا کہ خطرہ دراصل اُن سے ہے کہیں وہ نہ تاخت کر جائیں (حالانکہ کوئی چیز سوائے جوتے کے کتوں کے خطرہ میں نہ تھی)۔

اب جلدی جلدی ایک گز بھر بڑھکر ہم دونوں منزلِ مقصود پر پہونچ گئے۔ "ارے۔ رے۔ رے۔ رے۔ رے۔۔۔۔ یار مرزا" میر صاحب نے مارے خوشی کے لرز کر کہا۔ "ابے یار دیکھ تو"۔ اور میں نے کہا "سامنے تو آپ ہیں"۔ میں کندھے پر سے دیکھنے کی کوشش

گرتا تھا۔ میر صاحب نے کہا "ے دیکھ۔ اب دیکھ۔ دیکھ" اور یہ کہہ کر وہ جھک گئے بالکل اور میں نے دیکھا چیل کے چار بچے گھونسلے میں بیٹھے تھے۔ گھونسلے کی پتلی پتلی شاخوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے پنجوں میں بڑی مضبوطی سے پکڑے ہوئے۔ میر صاحب نے ایک ٹیڑھی سی لکڑی اُسی گھونسلے میں سے کھینچ لی اور بچّوں کو ہٹانا شروع کیا۔ مگر بچے چونچ پھاڑ کر آنکھیں نکال کر چیخنے لگے اور پنجوں سے اِس طرح گھونسلے میں جمے ہوئے کہ دیکھنے ہی نہ دیں کہ گھونسلا خالی ہے کہ اس میں سونا وغیرہ بھی ہے اور ہوگا کیوں نہیں۔ ضرور بالضرور ان کے پنجوں کے اور پوٹوں کے نیچے۔ کمبخت جمے ہوئے ہیں۔ دیکھنے ہی نہیں دیتے۔ اب دھر دھر کے میر صاحب بچوں کو ہٹاتے ہیں مگر نہیں ہٹتے۔ پھیل گئے کہ نظر ہی نہ آسکے سونا۔ "ارے دیکھنے کیا ہو" میں نے کہا۔ "ہاتھ ڈال کر بڑھکر دیکھ لو" اور میر صاحب نے عاجز آکر لکڑی سے بچّوں کو ٹھونکا کہ جگہ چھوڑیں۔ مگر ان کمبختوں نے تو پَر پھیلا دئے تھے۔ پوٹے ٹیک دئے تھے اور گھونسلے کا گھونسلا چھپا لیا تھا۔ "مار ڈالونگا" میر صاحب نے لکڑی سے بچوں کو مارتے ہوئے گالیاں دیں۔ اور بچے چیخ ہی رہے تھے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

میرے سر پر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور میر صاحب کے سر پر مارا چیل نے زور کا جھپٹّا۔ اور پھر میرے سر پر۔ پھر میر صاحب کے سر پر۔ "ارے یار مرزا۔۔۔" اور میں چیخا۔ "میر صاحب۔۔۔ ارے۔ رے" اب میں تو خالی ہاتھ اور میر صاحب کے ہاتھ میں لکڑی۔ میں چیختا ہوں کہ مارو۔ مگر توبہ کیجئے ایک دو جھپٹّوں میں میر صاحب کی اور میری ٹوپی غائب۔ اور مارا جو ہے میر صاحب کے سر پر چیل نے جھپٹّا تو چاند بھنّا گئی۔ اور میں میر صاحب کو دیکھتا ہوں کہ میری چاند پر یہ معلوم دیا کسی نے دیا کس کر ایک خاردار جوتا۔ ایک۔ دو تین۔ دو چیلیں ایک نظام کے ساتھ جو ہم دونوں کی کھوپڑیوں پر جھپٹی ہیں تو بس یہی معلوم ہوا کہ جوتہ کاری ہو رہی ہے۔ سونا گیا اپنی ایسی تیسی میں۔ ذرا غور کیجئے گا۔ ایسے گدھے پر اُلٹا کیسے کھسکا جائے گا۔ مگر کرتے ہی تو کیا۔ اب میر صاحب کو دیکھئے کہ سر پر تو پڑ رہے ہیں خاردار جوتے اور چلے جو پلٹتے ہوئے اُلٹے تو تیزی تو ملاحظہ ہو کہ میری گود میں گھسے آتے ہیں چیختے ہوئے ایسے کہ میرے اپنے حصّہ کا جھپٹّا تو میرے سر پر رہا اور انکے سر پر جو پڑے تو اس میں بھی آدھے کا شریک۔ اب ہم چیختے ہیں۔ چلّاتے ہیں۔ چیلیں سر پر اور نیچے بیہودے کھڑے ہنس رہے ہیں اور میر صاحب ہیں کہ پُشت میری طرف چیختے چلّاتے میرے پیٹ میں گھُسے جاتے ہیں۔ اب چلنے میں تیزی کرو تو ہاتھ برابر گھرے رہیں اور چیلیں ٹمانٹ گنجی کر دیں۔ اور "حوحق" مچا مچا کر چیلوں سے بچ بچ کر چلو تو رفتار ہلکی۔ اور میر صاحب ہیں کہ چیخ رہے ہیں۔ بہت جلد معلوم دیا کہ عجب نہیں جو گدھے سے ہم دونوں نیچے گریں۔ کہتا کچھ ہوں میر صاحب سے وہ سمجھتے کچھ ہیں اور آدھی بات مُنہ میں آدھی دل میں کہ چیل جھپٹّا مارتی ہے اور میر صاحب دیکھ لیتے ہیں۔ میں آپ سے کیا عرض کروں۔ اِدھر گرنے کا ڈر اُدھر کھونٹیوں اور ٹھونگوں سے بچاؤ۔ مگر بہت جلد بے چینی بڑھ گئی اور چیلوں نے جو "چاند ماری" کی ہے تو نہ کسی سے کچھ کہتے بن پڑا نہ سُنتے۔ بس کھسکو اُلٹے۔ اور پھر جو ہم نے دونوں نے۔ اُلٹا ڈبل مارچ کیا ہے تو میر صاحب کا پچھلا حصّہ ہے کہ سنگھار کی طرح چڑھا آتا ہے میرے مُنہ پر۔ مگر ہم دونوں جو آنکھ میچ کر اس ڈبل مارچ میں لگے ہیں تو گدھے کے آخری حصّے پر پہونچتے پہونچتے میر صاحب تیزی میں اپنے بدن کا پچھلا حصّہ بالکل بلند کر کے عجیب و غریب طرح سے میرے سر پر سے پھلانگ کر نکل گئے اور ہم دونوں بدحواس جو وہاں سے اُترے ہیں تو اُترتے اُترتے گر پڑے اور اُٹھتے اُٹھتے چیلوں نے دو چار گدّے

ایسے دئے کہ سب چیز چھوڑ چھاڑ ہم وہاں سے بھاگے اور چیلیں ہیں کہ منڈلاتی۔ جھاڑے "لگاتی چلی آ رہی ہیں۔ اور واقعہ ہے کہ اگر وہ آدمی لکڑیاں لیکر نہ بچائیں تو ٹانٹ گنجی ہو گئی تھی۔

کچھ عرض نہیں کر سکتے کہ ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے ہیں تو کیا حال۔ سر کا وہ حال کہ آگ سی لگی ہوئی۔ خون تو دو چار جگہ نکلا مگر چند یا بھنّا رہی تھی۔ وہ غضب کے کہر وپنچے لگے تھے کہ کنپٹی اور گردن میں تو آگ لگی ہوئی، اور جناب سر تو سر۔ چونتڑوں اور رانوں کا وہ حال کہ معلوم ہو جلتے توے پر بیٹھے ہیں۔ گدھے کی چھال ہی چونتڑوں کے بل اُلٹی ڈبل مارچ کے لئے کیا کم تھی کہ ٹھونٹھہ اور کھونٹیاں غضب کر گئیں۔ بچنے کی یا دیکھنے کی فرصت کسے۔ نہ صرف سارے چونتڑ کہر وبچ کر اور چھل کر رہ گئے بلکہ اب دیکھتے جو ہیں تو پاجاموں کے تمام ضروری اطراف کا کپڑا ہی غائب۔ دھجّیاں دھجّیاں ہو کر اندھا دھند ڈبل مارچ میں گدھے کی ٹھونٹھیوں اور میخوں ہی میں اُلجھا رہ گیا۔ اور اب پتہ چلا کہ ڈبل مارچ کھُردرے گدھے پر کس طرح ہوئی تھی۔ میر صاحب کہنے لگے "یا رب ہی تو میں کہوں کہ مارے رگڑ کے آگ سی لگی تھی۔" قصہ مختصر پاجاموں کا اہم ترین حصّہ گدھے پر جگہ بہ جگہ اُلجھا رہ گیا۔ اور تہمند اور رومالوں سے بیٹھکر جکڑ بندی کر کے کام نکالا۔

(۶)

ایک کنوئیں کے پاس لنگڑاتے پہونچے۔ وہاں جو کچھ ہی بچا کھچا تھیلے میں تھا وہ کھایا۔ سروں پر ٹھنڈا پانی ڈالا اور وہاں سے چیلوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتے لنگڑاتے ٹانگیں چیرے چیرے چلے جس طرح بن پڑا گھر پہونچے اور گھر پر آکر معلوم ہوا کہ گدھے کی رگڑ نے ستم ڈھایا ہے ایسا کہ کوئی پندرہ دن تک یہ حال رہا کہ اُدھر میر صاحب تہمند باندھے ٹانگیں چیرے چلے آ رہے ہیں۔ اور اِدھر ہم۔ یا تو زخموں کو دُرست کرنے کی ادویات کی تاثیر پر بحث ہے اور یا پھر چیلوں کو موٹی موٹی گالیاں دی جا رہی ہیں۔ اب رہ گیا سونا۔ تو اُس کی تلاش کی بات چیت بند!

عظیم بیگ چغتائی،

روح لطافت

چغتائی صاحب کے آٹھ چیدہ چیدہ افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ بیحد مقبول ہو چکا ہے۔ پہلا افسانہ "مہارانی کا خواب" ایک بہت ہی عجیب و غریب رومانی افسانہ ہے جس میں راجپوت مہارانیوں، ان کی خواب جیسی زندگی، محلات کی جگمگاتی تصویر، عشق و محبت کے دلدوز مناظر وغیرہ دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ اس خونچکاں داستان نے پڑھنے والوں کو تڑپا کر رُلا دیا ہے۔ باقی سات فسانے اس قدر ہنسانے والے ہیں کہ ہنستے ہنستے آپ بے حال ہو جائیں گے۔ اگر آپ دن بھر کی تھکان اور کوفت دُور کرنا چاہتے ہیں تو "رُوحِ لطافت" کا صرف ایک فسانہ پڑھ لیجئے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ قیمتی سے قیمتی ٹانک کا بھی اتنا فرحت بخش اثر نہ ہو گا جتنا کہ اس لطافت کی روح کا صرف ایک فسانہ اپنے اندر رکھتا ہے۔

قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ (عہ) علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ: ساقی بکڈپو۔ دہلی!

فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اور اُس کی صرف یہی ترکیب تھی کہ زیادہ قیمت حاصل کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کا کتّا مار ڈالا جائے جس کا گذارہ کتّے کے بغیر مشکل ہو۔ نسیم صاحب کو ملازمین سے زیادہ کتّے کی چوکیداری پر اعتماد تھا۔

ظاہر تھا کہ وہاں میرے لئے ہر قسم کا آرام میسّر آ سکیگا۔ حتیٰ کہ میرے گلے میں سے رسّی تک کھول دی گئی تھی۔ پھر بھی میں اس اُوپری جگہ سے گھبرا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر مولانا یاد آ رہے تھے۔ ہر چند سب سے زیادہ انہی نے مجھ کو مارا تھا۔ لیکن اُن کی مار صرف یہ سکھانے کے لئے تھی کہ میں کھڑکی کی راہ آنے والوں پر بھونکا نہ کروں۔ مجھے یہ بات بھی ناگوار معلوم ہو رہی تھی کہ نجانے خرید و فروخت کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ میرے وجود سے لوگ ناجائز فائدہ اُٹھا رہے تھے اور میری جان مفت میں ہلکان ہو رہی تھی۔ مختلف آقاؤں کی ماتحتی بلکہ غلامی میں رہ کر ایک کتّا کسی اعلیٰ پیمانہ پر اپنا کردار نہیں بنا سکتا۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ایک بار آزادی حاصل کر کے اپنی ہستی کو عام سطح سے بلند کر لوں۔ بجائے خریدنے کے مجھے ایک شخص اپنے ہاں ملازم رکھ لیا کرے۔ میرے اور اس کے درمیان یہ مفاہمت ہو کہ جب تک میں چاہوں نوکری کروں اور جب چاہوں چھوڑ دوں۔ دوران ملازمت میں مجھے دونوں وقت معقول کھانا مل جایا کرے اور بس۔ مجھے روپے پیسے کی کیا ضرورت تھی۔

یہی سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ تقریباً نصف شب گذری ہوگی۔ کہ صحن کی دیوار میں بنے ہوئے روشندان کے اندر کسی کا سر نظر آیا۔ معاً مجھے خیال ہوا کہ مولانا ہونگے مگر یہ میری کج فہمی تھی۔ کہاں مولانا اور کہاں نسیم صاحب کا گھر۔ اُس شخص نے ایک لکڑی کے ذریعہ جس کے نچلے سرے میں آنکڑا لگا ہوا تھا کھڑکی کی کنڈی کھول لی۔ اور پھر روشندان میں سے غائب ہو کر کھڑکی کی راہ صحن میں آ گیا۔ میں خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نزدیک آنے پر میں نے غور سے دیکھا تو حد درجہ خوشی ہوئی کہ حقیقتاً وہ مولانا ہی تھے۔ شاید مجھے لینے آئے تھے۔ میں اُن کے قدموں میں لوٹنے لگا اور چاہا کہ چلّا چلّا کر ان کا شکریہ ادا کروں۔ مگر انھوں نے اپنے مخصوص اشارے سے مجھے خاموش ہو جانے کے لئے کہا۔ اور خود ایک کمرے کی طرف بڑھے۔ دروازہ بند تھا۔ مگر مُقفل نہیں۔ اِس لئے وہ اسے کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے گیا۔ وہ مجھے روکنا چاہتے تھے مگر پھر خود ہی چُپ ہو گئے۔ کمرے میں بہت سا سامان موجود تھا۔ مگر انھوں نے اس کی طرف نظر تک نہیں کی۔ وہ غالباً کسی خاص چیز کی تلاش میں تھے۔ جسے پہلے سے جانتے ہونگے۔ انہوں نے کئی الماریوں کو کھولنا چاہا جو مُقفل تھیں یہ دیکھ کر انہوں نے کنجیوں کا گچھا نکالا اور ایک ایک کر کے بہت سی کنجیاں لگائیں یہاں تک کہ قفل کُھل گیا۔ انہوں نے ایک چادر میں بہت ہی اچھے اچھے ریشمی کپڑے جن پر چمکدار فیتے وغیرہ ٹکے ہوئے تھے باندھنے شروع کئے۔ وہیں ایک چھوٹا سا صندوقچہ بھی تھا۔ جسے بغیر کھولے کپڑوں کے ساتھ رکھ لیا۔ میں نے کہا۔ "مولانا! یہ سامان کہاں لے جا رہے ہو آدھی رات آ چکی ہے۔ یہیں کسی پلنگ پر آرام کرو۔ صبح ہوتے ہی چلے جانا۔ مولانا! یہ صاحب خانہ تمہارے داماد ہیں یا خُسر۔ یا کوئی اور رشتہ ہے۔ تم ملنا چاہو تو اُنہیں اوپر سے بلا لوں۔"

مولانا بالکل غیر متوجہ رہے۔ اور کسی ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صاحب خانہ سے یا کسی دوسرے شخص سے ملنا نہیں چاہتے۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو کام باپ کو پسند ہے بیٹا اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یا بیٹا جس نوع کی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے۔ باپ اُس پر اعتراض کرتا ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ بعض لوگ ایک ہی کام کو اپنے لئے جائز مگر دوسرے لوگوں کے لئے اسی کو ناجائز سمجھتے ہیں

مولانا میں یہ خصوصیت غیر معمولی طور پر پائی جاتی تھی۔ میں نے سوچا کہ لاؤ کچھ دل لگی کریں۔ مولانا کو خبر بھی نہ ہو اور میں اوپر جاکر مالکِ مکان کو جگا لاؤں۔ غیر متوقع ملاقات جتنی تعجب انگیز ہوتی ہے۔ اتنی ہی دل خوش کُن۔ مالک مکان اوپر کی منزل میں سونے کیلئے گئے۔ اور باقی رشتہ داروں کی خوابگاہ نیچے تھی۔ لہذا میں جلدی جلدی سیڑھیاں طے کرکے اوپر گیا۔ کمرے اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ میں نے جھری میں سے جھانک کر دیکھا وہ بے خبر سو رہے تھے۔ خراٹوں کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ میں نے زور زور سے کواڑوں پر پنجے مارے۔ تاکہ وہ جلدی سے بیدار ہو جائیں۔ پہلے تو وہ اُٹھے ہی نہیں اور پھر اُٹھے تو کروٹ بدل کر دوبارہ لیٹ گئے۔ لیکن مجھے بھی ضد ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اُن کی ملاقات ضرور کراؤنگا۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے اجنبی ہیں۔ تو میں تعارف کرا دونگا۔ نئے نئے لوگوں سے متعارف ہونا بھی تو ایک قسم کی خوش نصیبی ہے۔ بشرطیکہ کوئی کسی کو آزار نہ پہونچائے۔

میں کواڑوں پر مسلسل پنجے مارتا رہا۔ یہانتک کہ نسیم صاحب نے کواڑ کھولے اور میری طرف تعجب سے دیکھا۔ میں نے کہا "آؤ نیچے آؤ۔ مولانا تمہارے منتظر ہیں۔ شاید تم سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تم اُن سے مِل کر خوش ہوگے۔ بڑے نیک آدمی ہیں۔ کیا تم واقف نہیں ہو؟"

صاحبِ خانہ نے مطلق پروا نہیں کی اور وہ مجھے دھتکار کر کواڑ بند کر دینا چاہتے تھے کہ میں نے زور زور سے چلا کر کہا۔ "آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ ہم اپنی نیند خراب کرکے آئے اور تم نیچے جانے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے۔ خواہ کچھ بھی ہو تمہیں اُن سے ملنا ہوگا۔ وہ بہت دُور سے آئے ہیں۔ اور صرف اس لئے تم کو اُٹھانا نہیں چاہتے کہ یہ آرام کا وقت ہے۔ لیکن جب تم بیدار ہو چکے ہو تو مِل لینے میں کیا ہرج ہے؟"

اس دفعہ نسیم صاحب کچھ کچھ سمجھ گئے۔ اور کیوں نہ راضی ہوتے۔ میں نے کئی بار اُن کا دامن پکڑ پکڑ کر کھینچا تھا۔ اور زینے کی طرف بھاگ بھاگ کر انہیں اشارہ کیا تھا کہ نیچے چلو۔ مولانا کمرے میں ہیں۔ چنانچہ وہ جلدی سے ساتھ ہولئے۔ مگر تعجب ہے کہ اپنے ساتھ اُنہوں نے پستول بھی لے لیا۔ حالانکہ میں نے بندو خاکروب کی زبانی سُنا تھا کہ یہ خوفناک ہتھیار صرف اندیشے کے موقعے پر استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال میں اُنہیں کھینچ کر نیچے لایا۔ اور سیدھا کمرے کی طرف بھاگا۔ مگر مولانا وہاں نہیں تھے۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا کر نکل جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک بڑی سی گٹھڑی اُن کے ساتھ تھی۔ میں وہیں سے چلاتا ہوا دوڑا۔ "مولانا ڈرو نہیں۔ مسٹر نسیم ہیں نسیم۔ میرے موجودہ مالک۔ تم ان سے مِل کر خوش ہوگے۔ اماں اتنی جلدی نہ کرو۔ پان تو کھا لو۔ اچھا سگرٹ ہی پی لو۔" مگر مولانا نہ رُکنے تھے نہ رُکے۔ یہ سب کچھ ایک منٹ میں ہوگیا۔ نسیم بھی کھڑکی کے قریب پہونچ چکے تھے۔ اس کے دوسری جانب باغیچہ تھا۔ اس لئے اُنہوں نے فوراً گولی چلا دی۔ میں ڈرا کہ کہیں ہنسی ہنسی میں کسی کی جان نہ چلی جائے۔ اس اثنا میں گھر کے مُلازم وغیرہ بیدار ہوگئے اور اس دل لگی میں حصہ لینے کے لئے باغیچہ کی طرف آئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب مولانا سے مُلاقات کے متمنی ہیں۔ ان سب نے ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ ایک دو کے ہاتھ میں برقی روشنی کے لیمپ بھی تھے۔ مگر بے سود وہ چیز آسانی سے نظر نہیں آسکتی جس کو صرف سونگھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کج فہم انسان نہیں جانتا کہ کتے کی ناک کسقدر قیمتی ہوتی ہے۔ میں نے زمین سونگھنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ایک درخت کے نیچے پہونچ گیا۔ گو نظر کچھ نہیں آیا مگر مولانا لازمی طور پر درخت کی ڈالیوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ میں نے نیچے ہی سے چلا کر کہا۔ "مولانا عجیب آدمی ہو۔ آخر حیران کرنے سے کیا فائدہ؟ نیچے اُترو۔

نسیم صاحب سے ملاقات ضروری ہے۔ وہ نیک آدمی ہیں۔ پستول غلطی سے چل گیا۔ تم کو نقصان نہیں پہونچے گا"

سب لوگ میرے قریب آگئے۔ روشنی کی شعاعیں اوپر کی طرف اُٹھیں۔ اور مولانا معہ اپنی ڈاڑھی کے نظر آنے لگے۔ نسیم صاحب نے ڈانٹ کر پستول دکھایا اور وہ نیچے اُتر آئے۔ مگر اُن کے چہرے سے بجائے مسرت کے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی مجھے ہنسی آئی کہ رنگ میں بھنگ پڑ رہی ہے۔ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میں نے چیخ چیخ کر بے شمار سوال کر ڈالے کہ آخر مجھے بھی تو اصل حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ مگر کسی نے توجہ نہ کی۔ بلکہ ایک ملازم کو کہیں چلتا کر دیا۔ مولانا کو سب لوگ مار رہے تھے۔ اور مجھے رہ رہ کر غصّہ آ رہا تھا۔ کیونکہ سابقہ مالک تھے۔ آخر ان کا نمک کھایا تھا۔ ہمدردی کیوں نہ ہوتی۔

کچھ لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھ بھال کی اور وہ گٹھڑی جس میں مولانا نے کچھ سامان باندھا تھا ایک جھاڑی میں سے برآمد ہو گئی۔ تھوڑی دیر ہم سب وہیں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک موٹر تیزی سے آیا۔ اور کچھ لوگ اُترتے نظر آئے۔ میں ایک دم سمجھ گیا کہ پولیس کے آدمی ہیں۔ قہوہ خانے میں اکثر انہیں آتے دیکھتا تھا۔ مولانا ان کے سپرد کر دئے گئے۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ البتہ میں نے نسیم صاحب کو بہت ڈانٹا کہ آخر یہ کیا حماقت ہے؟ بلا قصور مولانا کو سزا بھگتنے کے لئے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ کارگذاری بہت ہی لائق تحسین تھی۔ کیونکہ اُس روز سے ہماری بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے بہت ساری ہڈیاں اور چھیچھڑے وغیرہ کھانے کے لئے ملتے ہیں۔ رہنے کے واسطے جگہ بھی ایسی ملی کہ بڑے اطمینان سے نیند آتی ہے مگر اکثر نسیم صاحب یاد آتے ہیں۔

فضل حق قریشی دہلوی

جدید اصطلاحات

جنابعالی۔ اُردو کی جدید اصطلاحیں یہ خادم مُرتب کر رہا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی متعلق "کرکٹ" ارسال خدمت ہے۔ یہاں کرکٹ کے کھیل سے متعلق جتنی انگریزی اصلاحیں ہیں اُن کی خادم نے اُردو کی ہے۔ جو بجنسہٖ پیش ہیں:۔

اُردو	انگریزی
(۱) گیند بلّا	1. Cricket
(۲) منصف صاحب	2. Umpire
(۳) گلاّ سُکھا	3. Toss
(۴) گلاّ	4. Head
(۵) سُکھا	5. Tail
(۶) داؤن	6. Turn
(۷) تھپنی۔ (لفظ بلاٹینس وبیڈمنٹس وغیرہ وغیرہ پر حاوی ہوگا۔)	7. Bat
(۸) نیزہ۔ نیزے۔ ڈنڈا۔ ڈنڈے۔	8. Wicket
(۹) گلّی۔ گلیاں۔	9. Bells
(۱۰) سپرلتا۔ سپرلتے۔ (صیغہ جمع)	10. Leg-guard
(۱۱) سپرہتھا۔ سپرہتے۔ (دستانہ ذومعنی اور یہاں نادُرست ہے۔)	11. Gloves
(۱۲) چٹائی۔	12. Mat
(۱۳) دوڑ	13. Run
(۱۴) گیندو۔ گیندچی۔	14. Bowler
(۱۵) سپاٹا گیند۔ (سپاٹا گیندو)	15. Fast Ball, (Fast Bowler)
(۱۶) گھُسّو گیند (گھُسّو گیندو)	16. Slow Ball
(۱۷) مار۔ (ماریں۔ مواریہ۔ اُمرّہ۔ جمع صیغہ۔) ٹُلا۔ (ٹُلے۔ ٹُوائیل جمع صیغہ)	17. Hit
(۱۸) غُپ۔ غپچ۔ (جمع غپا غپچ)	18. Catch
(۱۹) سلطان کو حامد نے غپ کیا۔	19. Sultan was caught by Hamid
(۲۰) مرجانا۔	20. Out
(۲۱) لال	21. Century

(۲۲) آڑی — 22. Partner

(۲۳) حدود اربعہ — 23. Boundry

(۲۴) گیند اُونچیا دی — 24. Skied the ball

(۲۵) نُکّا — 25. Slip

(۲۶) گدّا — 26. Off

(۲۷) ٹنگا — 27. Leg

(۲۸) گیارس — 28. Eleven

(۲۹) جمعدار — 29. Captain

(۳۰) نیزے والا۔ ڈنڈے والا — 30. Wicket-keeper

(۳۱) بڑا نیزے والا۔ بڑا ڈنڈے والا — 31. Long wicket-keeper

(۳۲) چوپال۔ چھتری — 32. Pavillion

(۳۳) سُنار — 33. Blocker

(۳۴) لوہار — 34. Blind Hitter

(۳۵) گچّی — 35. Crease

(۳۶) اوپر — 36. Over

(۳۷) اُوپر ہتّھا — 37. Overhand

(۳۸) سُرّا — 38. Underhand

(۳۹) بدن السطور — 39. Body-line

(۴۰) منشی جی۔ گنتی جی — 40. Scorer.

(۴۱) گنتی — 41. Score

(۴۲) ٹلاّنویس۔ ٹلّے باز — 42. Hitter

(۴۳) برقنداز — 43. Player

(۴۴) ٹولی — 44. Team

(۴۵) دھمّا — 45. Bowled

(۴۶) چوڑی گیند — 46. Wide Ball

(۴۷) نہیں گیند — 47. No Ball

(۴۸) گھاتا۔ (گھاتے کی دوڑ) — 48. Bye-run

(بقیہ برصفحہ ۱۵۰)

اجوٹنٹ لم ڈھیگ اور موضع مگر گھاٹ کے مگر

کپلنگ کی ایک دلآویز کہانی ٭

جسے

جناب عنایت اللہ دہلوی بی۔ اے

سابق ناظم دارالترجمہ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

نے ساقی کے لئے فصیح و شگفتہ اُردو میں ترجمہ کیا

٭

اجونٹ لم ڈھیگ اور موضع مگر گھاٹ کے مگر

"بڑوں کا ادب کرو"

یہ آواز تو آئی مگر بڑی بھیانک آواز تھی۔ جیسے بلغم بھرے حلق سے نکلی ہو۔ جسے سُن کر بدن میں سنسنی آجائے۔ آواز میں گرج اور لہر تھی۔ مینڈک کے ٹرانے اور کسی کے رونے اور ٹھنکنے کی آوازیں بھی اس میں شامل تھیں۔ پھر آواز آئی :۔

"دریا کے یارو! بڈھوں کا ادب کرو، انکا لحاظ کرو"

دریا کے اُوپر یا اُس کے دائیں بائیں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ البتہ تین لمبی لمبی کشتیاں ابھی ابھی ریل کے پُل کے نیچے سے نکل کر دریا کے بہاؤ پر جاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں عمارت کا پتھر بھرا ہے۔ یہ ریل کا پُل حال میں تیار ہوا تھا۔ پیل پایوں کے سامنے ابھی تک مٹی کے ڈھیر لگے تھے۔ ناؤ والوں نے پتوار اس طرح پھیرے کہ کشتیاں ان ڈھیروں سے بچ کر نکل جائیں۔ اب وہ پُل کے نیچے سے نکل کر برابر برابر ادھر آرہی ہیں۔ پھر وہی آواز سُنائی دی :۔

"دریا کے ہمنوں، بوڑھوں اور پرکھوں کا ادھار کرو"

ایک ناؤ والے نے ہاتھ اُٹھا کر جدھر سے آواز آئی تھی اُدھر اشارہ کیا۔ اور جو کچھ اس وقت اُس کی زبان سے نکلا وہ ادب یا تعظیم کے جملے نہ تھے۔ بلکہ اُن کی شان کچھ اور ہی تھی۔ کشتیاں بوجھ سے لدی چُوں چُوں چر چر کرتی پانی پر چلی جاتی تھیں۔ دریا کا پاٹ چوڑا تھا۔ سچ پوچھو تو اس مُلک کے دریا، دریا کا ہے کو چھوٹی چھوٹی جھیلوں اور باقی کے چھقروں کا ایک زنجیرا ہوتے ہیں۔ کچھ دُور پانی رہا پھر ریت آگئی۔ دریا کا یہ ٹکڑا جس کا ذکر ہم کرتے ہیں خوب پانی سے بھرا، بالکل شفاف آئینے کی مثل ہو رہا تھا۔ برسات کے موسم میں دریا کے دائیں بائیں سے بہت سے نالے ندیاں اس میں گرتے تھے لیکن اب گرمی کا زمانہ تھا۔ یہ ندیاں اور نالے اپنے سوکھے مُنہ پھاڑے دریا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دریا کے بائیں کنارے پُل سے قریب کچے پکے مکانوں پھوس اور تنکوں کی جھونپریوں کا ایک گاؤں بلندی پر آباد تھا۔ گاؤں کے بیچ میں سے ایک کچی سڑک اُوپر سے بالکل سیدھی دریا تک آئی تھی، اس میں گائے بھینسیں ہر وقت بھری رہتی تھیں۔ جہاں یہ کچا راستہ دریا پر ختم ہوا تھا وہاں پکی اینٹوں کا ایک چبوترہ اور چبوترے سے کچھ سیڑھیاں پانی کے اندر گئی تھیں۔ گاؤں والے انہی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر نہایا دھویا کرتے تھے۔ اس چبوترے اور اُسکی سیڑھیوں کو موضع مگر گھاٹ کا گھاٹ کہنے لگے تھے۔

اِدھر دھان اور کپاس کے کھیتوں میں شام کی تاریکی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ کھیت اتنی نیچی زمین پر تھے کہ ہر برس وہاں طغیانی آیا کرتی تھی۔ دریا کے ایک موڑ پر دُور تک نرسلوں کی قطاریں کھڑی تھیں اور اُن کے پیچھے گاؤں کے ڈھور ڈنگر چرانے کا ایک جنگل تھا۔ شام کی آب نوشی کے جلسے میں طوطے اور کوّے غُل شور مچا کر ایک سمت کو بسیرا لینے اُڑے چلے جاتے ہیں۔ آسمان پر تو یہ پرندے اُڑتے ہیں اور زمین پر لومڑیوں کی پلٹنیں "ڈبل مارچ" بولتی جارہی ہیں۔ ادھر ہوا میں طوطوں اور کوّوں کی صفیں بندھی جارہی تھیں اور نیچے مرغابیوں کے جھنڈ قائیں قائیں اور غائیں غائیں کرتے نرسلوں کے بن میں اُترتے تھے۔ ان پانی کے پرندوں میں بطیں، قاز، بگلے، کڑوا نتیلیاں، رنگ برنگ کی مرغابیاں، کالے پروں کے چھچھے جن میں اِکا دُکا کلنگ یا لم ڈھیگ بھی ہے شامل ہیں۔ کسی کا سر لال

ہے، کسی کے پر کیرے یا بالکل کالے ہیں اور کوئی سپید بگلہ بھگت بنا ہے۔ کسی کے بھورے پر ہیں اور کسی کے پروں پر سبز چمکتی سنجاف ہے۔

سب کے آخر میں ایک پرانا بھاری لم ڈھینگ اس طرح اُڑتا آیا کہ پروں کی ہر حرکت پر معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی یہ آخری جنبش ہے۔ اور وہی آواز اُسکے کان میں بھی آئی:۔

"دریا کے برہمنوں بڑوں کا ادب اور پرکھوں کا ادھار کرو۔"

لم ڈھینگ جن کو اُن کے سپاہیانہ انداز اور قد و قامت کی وجہ سے "اجوٹنٹ لم ڈھینگ" یا فقط اجوٹنٹ کہتے تھے۔ جب انہوں نے حالتِ پرواز میں یہ آواز سُنی تو گردن موڑی اور جدھر سے آواز آئی تھی اُدھر سے کچھ کترا کر پُل کے نیچے ایک ریت کے ٹیلے پر جا اُترے۔ اب آپ اُن کا حُلیہ مُلاحظہ فرما سکتے ہیں کہ صورت کس درجہ ازازیل سے مُشابہ رکھتے تھے۔ پیچھے کے رُخ سے دیکھئے تو بڑے فرشتہ خصلت واجب التعظیم بُزرگ معلوم ہوتے تھے۔

قد آپ کا تقریباً چھ فٹ تھا۔ چندیا پر بال نہ ہونے اور پُشت پر پروں کی لپیٹ کچھ ایسی صاف اور ستھری تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا پاک نفس پادری کھڑا وعظ کہتا ہے...... لیکن اگر سامنے سے دیکھئے تو دوسری چیز تھے۔ سر اور گردن پر پر تو کجا ایک رُواں تک نہ تھا اور پھر طرّہ یہ کہ جیسے چمڑے کی ایک زنبیل ٹھوڑی سے شُروع ہو کر گردن پر لٹکی چلی گئی تھی۔ آپ کی چونچ کی وضع ایسی تھی جیسے باڑھ کاٹنے کی قینچی کے دونوں پلڑے بند ہوں۔ اس منقار سے جس چیز کا سرقہ کرتے تھے اُسے اِسی لال لال جیتے چمڑے کی زنبیل میں محفوظ کر لیتے تھے۔ یہ بٹوا بھی تھا اور مال مسروقہ کا گودام بھی۔ ٹانگیں آپ کی لمبی پتلی اور جُھریاں پڑی تھیں۔ چلنے میں قدم بڑی نزاکت سے پڑتا تھا۔ جب چونچ سے دُم کے پروں کو صاف کرتے تو ٹانگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے اور شانوں کے پروں کی چمک جب دیکھتے تو باغ باغ ہو جاتے۔ اور پھر چونچ سیدھی کر کے "سٹنڈل ایٹ ایج" ہو جاتے۔

اب ایک نُچا کُھچا کھجلی میں سر سے پاؤں تک لپا چھوٹا سا گیدڑ جو کھانے کے لئے کوڑیوں پر جھانکتا پھرتا تھا، دُم سیدھی کان کھڑے کئے پانی کیچڑ میں سے کودتا پھاندتا اجوٹنٹ صاحب کے قریب آیا۔

یوں تو بڑھیا سے بڑھیا گیدڑ بھی نیچ جات ہونے کی وجہ سے گھٹیا ہی سمجھا جاتا تھا مگر ہمارے یہ گیدڑ تو اپنی برادری میں سب سے گئے گذرے تھے۔ اگر آدھے ٹکڑ گدا تھے تو باقی آدھے چور اور اُٹھائی گیرے تھے۔ گاؤں کی کوڑیوں کو صاف کرنا آپکا شیوہ تھا۔ شدّت سے ڈرپوک تھے مگر اس کے ساتھ ڈھٹائی اور منچلے پن میں بھی کچھ کم نہ تھے۔ بھوک ہر وقت ستائے رکھتی طبیعت میں شرارت بہت تھی مگر کبھی اس شرارت سے کوئی نفع نہ پہنچتا تھا۔

اخ خو کہکر بڑے درد اور تکلیف سے ایک جُھرجُھری لیکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "خدا ان گاؤں کے کتوں کو غارت کرے۔ لال کھجلی ان میں ایسی پھیلے کہ ایک بھی نہ بچے، ہر چھڑی کے پیچھے تین تین گھاؤ اِن کتوں کے کاٹے کے بدن پر ہیں۔ اور قصور پوچھئے تو صرف اتنا تھا کہ گائے جہاں بندھی تھی وہاں ایک پُرانا کھونسٹرا پڑا تھا۔ اس کھونسٹرے کی طرف اس ناچیز نے ذرا منظر جما کر دیکھا تھا۔"

اس پر اجوٹنٹ بولے (آپکی آواز ایسی تھی جیسے کسی موٹے تختے میں آرہ کش آرہ چلاتے ہیں۔) "سُنتا ہوں کہ اس کھونسٹرے میں ایک بالکل تر و تازہ کتیا کا پلہ پڑا تھا۔"

گیدڑ بولا: "سُننا اور بات ہے اور واقعی کسی بات کا علم ہونا دوسری بات ہے۔" گیدڑ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ جب شام کو گاؤں میں الاؤ لگتا اور گاؤں والے اس کے گرد بیٹھ کر باتیں کرتے تو گیدڑ بھی کہیں چھپے چھپائے بیٹھے اُنکی باتیں سُنا کرتے تھے۔

ہ Stand at Ease

اجوٹنٹ کہنے لگے "درست فرمایا۔ جب کتے کہیں اور مصروف تھے تو اس ننھے سے پلے کی دیکھ بھال کون کرتا۔ یہ خدمت ایں جانب نے اپنے ذمے لی۔"

گیدڑ کہنے لگا "واقعی کتے تو کچھ ایسے مصروف ہوئے کہ مجھ سے تو اب قسم لے لیجئے جو گاؤں میں کچھ دنوں تک کھانے کی کوئی چیز ڈھونڈنے قدم رکھوں۔ اب آپ کے فرمانے سے مجھے بھی خیال آتا ہے کہ اس پرانے کھونسڑے میں کتیا کا ایک پلا جس کی آنکھیں ابھی تک نہ کھلی تھیں پڑا تھا۔"

اجوٹنٹ نے گیدڑ کو کن انکھیوں سے دیکھکر چونچ سے پوٹے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "جی وہ پلا تو اب اس میں ہے۔ چھوٹی سی چیز تھی اور کچھ بہت بھی نہ تھی مگر مزے میں بری نہ تھی۔ خاص کر اس زمانے میں جبکہ خیر خیرات دنیا سے اٹھ چکی ہو اتنی چیز بھی غنیمت ہے۔"

گیدڑ نے بہت غمزدہ آواز میں کہا "درست ہے، دنیا کا دل تو پتھر ہو گیا ہے" زبان سے تو یہ کہتا تھا مگر آنکھیں پانی پر لگی تھیں کہ اگر اس میں ذرا بھی جنبش دیکھے تو فوراً سمجھ جائے کہ کون آتا ہے۔ چنانچہ پانی میں کچھ آہٹ پاتے ہی جلدی جلدی کہنے لگا "زندگی کاٹنی تو سب ہی کے لئے مشکل ہو گئی ہے اور مجھے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے آقائے نامدار رشکِ معابر غیرتِ گنگ و جمن ......"

اتنا سنکر اجوٹنٹ بولے "سچ کسی نے کہا ہے کہ ایک جھوٹا، دوسرا خوشامدی اور تیسرا گیدڑ یہ سب ایک ہی انڈے سے نکلے ہیں۔" اجوٹنٹ کی اس تقریر کا انداز کچھ ایسا تھا کہ گویا کسی سے خاص طور پر خطاب نہیں ہے۔ اجوٹنٹ خود بھی نہایت لطیف و نازک طریقے پر جھوٹ بولنے والوں میں تھے۔

گیدڑ اب آواز تیز کر کے کہنے لگا "میرے خیال میں تو جب سے یہ ریل کا پل بنا ہے اس وقت سے تو ہمارے دریاؤں کے ان تاجدار کو بھی کھانے کی چیز مشکل ہی سے ملتی ہوگی۔ گو انکے سامنے میں اتنی بات منہ سے نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ بڑے دانا و عاقل حلیم و نیک نفس ہیں۔ گو اس کا افسوس ضرور ہے کہ میں ویسا نہیں۔"

اتنا سن کر اجوٹنٹ کچھ منہ ہی منہ میں بولے "سچ ہے اگر گیدڑ کسی چیز کو بھورا کہے تو سمجھ لو کہ الٹے توے سے بھی زیادہ کالی ہوگی" پانی میں جو چیز حرکت کرتی آ رہی تھی اسکو اجوٹنٹ نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

گیدڑ نے سلسلہ تقریر جاری رکھا اور کہنے لگا "اور چونکہ غذا یا چارے کی ان کو حال میں کمی نہیں اس وجہ سے ......"

اتنے میں ایک ہلکی سی چخ چخ چخ ایسی سننے میں آئی جیسے کم پانی میں کوئی کشتی اکڑ رکی ہو۔

گیدڑ فوراً دم پر چک پھیری کھا جدھر وہ چیز آئی تھی ادھر منہ کر کے بیٹھ گیا کیونکہ جس جانور کا ذکر اس وقت ہو رہا تھا اس کی طرف سے منہ کر کے بیٹھنا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ جانور دراصل سولہا ہاتھ لمبا ایک مگرمچھ تھا۔ مگرمچھ کا ہیکو، خدا کی پناہ ایک لوہے کا خول سمجھیئے۔ جس میں تین تین قطاریں گول گول میخوں اور آہنی خاروں کی جڑی ہوں۔ اوپر کے دانتوں کی زرد زرد نوکیں نیچے والے جبڑے کے لٹکے ہوئے خوبصورت ہونٹ پر سیدھے خطوط کھچے معلوم ہوتے تھے۔ اور آپ ہی موضع مگر گھاٹ کی گول تھتنی والے مگر تھے۔ گاؤں میں کوئی انسے زیادہ عمر کا نہ تھا۔ اور انہی کے نام نامی پر گاؤں کو مگر گھاٹ کہنے لگے تھے۔ ریل کا پل بننے سے پہلے گھاٹ کا دیو کہو شیطان کہو جو کچھ کہو یہی حضرت تھے۔ خونی، قاتل، مردم خور، ہتیارے اور پھر گاؤں کے دیوتا۔ یہ تمام صفات آپ کی ذات میں مجتمع تھیں۔ لمبی تھتنی پانی میں ڈالے دم کی خفیف حرکت سے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ گیدڑ جانتا تھا کہ اسی دم کو پانی میں ذرا بھی زور سے

جُنبش دی تو ایک آن میں کنارے کے اُوپر اس طرح پہونچ جائیں گے جیسے ریل کا انجن زن سے پاس سے نکل جائے۔

گیدڑ بڑی لجاجت سے عرض کرنے لگا "غریب پرور سلامت، حضور کے قدم ہمارے لئے بڑا سہارا ہیں۔ (گیدڑ کہتا تو یہ تھا مگر ہر لفظ پر ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔) پانی میں آہٹ دیکھ کر میں خوش ہوا۔ اور یہ ناچیز اور اجوٹننٹ صاحب اِس اُمید میں اِدھر آئے کہ تھوڑی دیر اور کچھ نہیں تو لُطف کی باتیں ہی ہونگی۔ حالت انتظار میں یہ حقیر حضور کا تذکرہ زبان پر لایا۔ مجھ کو تو یہی اُمید ہے کہ حضور نے کچھ نہ سُنا ہوگا"۔

گیدڑ نے مگر کی نسبت اِس سے پہلے جو کچھ کہا تھا اسکی غرض یہی تھی کہ مگر سُنے۔ کیونکہ گیدڑ کو معلوم تھا کہ روزی ملنے کے لئے خوشامد سے بڑھکر کوئی چیز نہیں۔ مگر جانتا تھا کہ گیدڑ نے جو کچھ کہا تھا اس کی غرض یہی تھی کہ مگر سُنے۔ اور گیدڑ جانتا تھا کہ مگر کو اس کا علم ہے اور مگر کو علم تھا کہ گیدڑ اس بات کو جانتا ہے۔ غرض اس حالت میں سب راضی خوشی ہو کر باتیں کرنے لگے۔

بُڈھا مگر کبھی آگے کھسکتا کبھی پیچھے ہٹتا۔ زور زور سے ہانپتا اور بُڑبُڑاتا۔ آخر کار ٹیلے پر چڑھا اور زبان پر یہی تھا کہ دریا والو بُڈھوں اور ضعیفوں کا ادب کرو۔ اس کی آنکھیں دو جلتے کوئلوں کی طرح اس کی تکھونٹی تھتنی پر روشن تھیں۔ اور ہونٹوں کے کنارے پلکیں لوہے کے ٹکلوں کی طرح نکلی تھیں۔

غرض اپنے لمبے موٹے دھڑ کا پیپا مع چار چھوٹے چھوٹے پایوں کے لئے اُوپر آئے اور دراز ہو کر پانی اور کیچڑ میں قائم ہو گئے۔ گیدڑ مگر کی تمام حرکات اور سکنات سے خوب واقف تھا۔ اور بارہا دیکھ چکا تھا کہ جب یہ سوکھا ہاتھ کے لمبے حضرت تیرتے ہوئے کنارے آتے ہیں تو وہاں آپ کے آرام کرنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی بڑا بہتا درخت قدرتی طور پر کنارے آن لگا ہو۔ بلکہ یہاں تک خیال رکھتے ہیں کہ کنارے سے جس زاویہ پر آسودہ ہوں وہ کیا بلحاظ پانی کے زور کے اور کیا بلحاظ وقت اور موج کے ایسا ہی ہو جیسے کہ بہتے درخت کے کنارے پر رُک جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر کی یہ حرکتیں مقتضائے عادت تھیں۔ کیونکہ اس وقت وہ محض تفریح کے خیال سے کنارے آیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سچ پوچھئے تو مگر مچھ کا پیٹ کبھی پورا نہ بھرتا تھا۔ اور گیدڑ اگر اس وقت دھوکا کھا جاتا تو پھر اُنکی ساری دخل در معقولات وہیں ختم ہو جاتی۔

مگر ایک آنکھ بند کر کے گیدڑ سے فرمانے لگے "برخوردار میں نے کچھ نہیں سُنا۔ میرے کانوں میں تو پانی بھر چکا تھا۔ اور بھوک سے بھی نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ جب سے یہ ریل کا پُل بنا ہے اُس وقت سے میرے گاؤں کی اسامیوں کو وہ چاؤ اور محبت مجھ سے نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اس نے میرا دل توڑ دیا"۔

گیدڑ بولا "ہائے توڑا بھی کیسا شریف دل۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آدمی سب ایک سے ہوتے ہیں"۔

اتنا سُنتے ہی مگر بولے "نہیں ان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بعض تو ان میں ایسے دُبلے سوکھے ہوتے ہیں جیسے ناؤ کے بانس ہوں۔ اور بعض ایسے موٹے ہوتے ہیں جیسے گی..... نہیں بھولا، جیسے کتے۔ میں آدمیوں کو کبھی بُرا نہیں کہونگا۔ وہ ہر قماش کے ہوتے ہیں۔ اور سالہا سال کے تجربے سے کہتا ہوں کہ وہ سب اچھے ہوتے ہیں۔ چاہے مرد ہوں چاہے عورت اور چاہے بچے۔ مجھے تو آج تک کسی طرح کا نقص ان میں معلوم نہیں ہوا۔ برخوردار یاد رکھو اگر تم دُنیا میں عیب نکالوگے تو دُنیا تم میں عیب نکالے گی"۔

اجوٹننٹ جو اب تک ایک ٹانگ پر کھڑے تھے، دوسری ٹانگ زمین پر رکھ کر بولے "خوشامد کا حال تو یہ ہے جیسے خالی

پیٹ میں کسی نے تمام لوٹ رکھدیا ہو۔ اسوقت بڈھے مگر کی زبانی جو کچھ سُنا وہ حقیقت میں عقل کی باتیں تھیں۔"

گیدڑ کہنے لگے "یہ تو سب کچھ درست ہے مگر ذرا انسان کی احسان فراموشی پر تو غور کیجیے کہ ایسے بزرگ کے ساتھ انکی کیا حالت ہے۔"

مگر کہنے لگے "احسان فراموشی نہ کہو۔ عیب ہے تو اتنا ہی کہ دوستوں کے حال کی خبر نہیں رکھتے۔ اور بس۔ چنانچہ میں اپنی آرامگاہ یعنی گھاٹ کی سیڑھیوں کے نیچے پڑا دیکھا کرتا ہوں کہ نئے پل کی سیڑھیاں کچھ ایسی بنائی ہیں کہ اُن پر چڑھنا بالخصوص بڈھوں اور بچوں کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ خیر بڈھے تو زیادہ خیال کرنے کی چیز نہیں ہیں۔ مجھکو تو جو کچھ افسوس ہوتا ہے اور نہایت افسوس ہوتا ہے وہ بچوں کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن پھر غور کرتا ہوں تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب کچھ تھوڑے دن کی بات ہے۔ جب یہ پل پُرانا ہو جائے گا تو پھر میرے گاؤں کی اسامیاں ہوں گی اور وہی پُرانا گھاٹ ہو گا جس میں ننگی ٹانگوں تر کر وہ دریا پار ہو جاتے ہونگے۔ پھر اس بڈھے مگر کی وہی آو بھگت اور عزت جو ہمیشہ سے ہوتی آئی تھی ہونے لگے گی۔"

اجو ٹنٹ اتنا سُن کر بولے "دریں چہ شک۔ شاید آج ہی کا تو ذکر ہے کہ میں نے گھاٹ کے کنارے پانی میں گیندے کے پھول تیرتے ہوئے دیکھے تھے۔ سارے ہندوستان میں گیندے کے پھول جب کسی کی عزت کرنی ہوتی ہے تو اُس پر نچھاور کرتے ہیں۔"

مگر کہنے لگے "جی نہیں، آپ سمجھے نہیں۔ وہ حقیقت میں ایک غلطی تھی۔ اصل میں وہ حلوائی کی جورو تھی۔ ہر سال اس غریب کی بینائی کمزور ہوتی جاتی ہے اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ درخت کے ایک تنے میں اور مجھ میں تمیز نہیں کر سکتی۔ جس وقت اُس نے پھولوں کا کنٹھا پانی پر پھینکا ہے اس کی غلطی اسی وقت میں نے دیکھ لی تھی۔ کیونکہ میں گھاٹ کی سیڑھیوں کے نیچے ہی پڑا تھا۔ اگر ایک قدم اور آگے بڑھتی تو پھر مجھ سے رعایت کی کیا اُمید ہو سکتی تھی۔ لیکن اچھا ہی ہوا۔ اس غریب عورت کی نیت اچھی تھی اور نیا زندر میں جس چیز کو دیکھنا ہوتا ہے وہ نیت ہی ہوا کرتی ہے۔"

گیدڑ دو چار مکھیوں کی طرف مُنہ مار کر کہنے لگے "جب کوئی کوڑی پر کھڑا ہو تو گیندے کے پھول اُسکے کس مصرف کے۔" زبان پر تو یہ حیرت آمیز جملے تھے مگر ایک آنکھ جناب غریب پرور کی طرف جمی تھی۔

مگر بولے "لیکن ابھی انہوں نے وہ کوڑی نہیں تیار کی ہے جہاں مجھے جا کر کھڑا ہونا پڑے۔ دریا کے اس کنارے پانچ مرتبہ میں گاؤں کو از سر نو بنتے دیکھ چکا ہوں۔ اور پانچ ہی مرتبہ اور اپنی زندگی میں اسکو بگڑتے بنتے دیکھوں گا۔ میں اپنے بھیا گھڑیال کی کی طرح جس کی غذا مچھلیاں ہیں اور جو اپنی جگہ سے ہلتا ہی نہیں بے ایمان نہیں ہوں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ آج کاشی میں تو کل پریاگ میں۔ اس پر بھی ممکن نہیں کہ اپنے گھاٹ سے نظر چوک جائے۔ برخوردار، یہ بات یونہی نہ تھی کہ گاؤں کا نام میرے نام پر رکھا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب برسوں کسی چیز کا خیال اور اس سے محبت رکھی گئی تو اُس کا اجر ایک نہ ایکدن ضرور ملیگا۔"

گیدڑ بولے "میں نے بھی تو مدتوں آنکھیں لگائے رکھیں مگر مجھے تو اس محبت کا انعام سوائے اس کے کچھ نہ ملا کہ کبھی ڈنڈے کھائے اور کبھی کتوں کے کاٹے کے زخم اُٹھائے۔"

اس پر اجو ٹنٹ ہُو ہُو کر کے خوب ناچے اور کہنے لگے "واہ کیا بات ہے۔ میاں گیدڑ تم نے "مدتوں" کی بھی خوب کہی۔ وہی مثل ہوئی کہ اساڑھ میں گیدڑ نے جنم لیا۔ ساون میں مینہ برسا۔ گیدڑ پانی کو دیکھکر کہنے لگے میں نے تو اس شدت کا سیلاب کبھی پہلے نہ دیکھا تھا۔"

اجوٹنٹ میں ایک بڑی تکلیف دہ خصوصیت یہ ہے کہ کبھی کبھی اُن کے پیروں اور ٹانگوں میں شدت سے تشنج کا دورہ پڑتا ہے۔ گو ہمارے اجوٹنٹ کو اس حال میں دیکھنا اتنا ناگوار نہیں ہوتا جیسے کہ انہی کے اور کلنگوں اور لقلقوں کو دیکھنا موجب تکلیف ہوتا ہے گو اجوٹنٹ کی طرح یہ لق لق اور کلنگ اپنی اپنی قوم میں سربرآوردہ اور معزز مانے جاتے ہیں۔ قصہ مختصر جب اجوٹنٹ اس عارضہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو ایک پر پھیلا کر اور ایک ٹانگ اُٹھا کر اس غضب کا لنگڑا ناچ ناچتے ہیں کہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ناچنے میں مُنڈیا کبھی ایک طرف کرتے ہیں کبھی دوسری طرف۔ اور کوئی خاص سبب ایسا ہے جس کا علم ہم کو نہیں کہ مرض کے شدید حملوں کے ساتھ ساتھ وہ حد درجے کریہہ الفاظ میں دوسروں پر نکتہ چینیاں کرتے جاتے ہیں اور جب سب کچھ کہہ چکتے ہیں تو پھر یکلخت "اٹنشن"[5] کھڑے ہو کر پہلے سے بھی دس گنے زیادہ اجوٹنٹ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

گیدڑ جن کو جنم لئے ابھی تین ہی فصلیں گذری تھیں بیٹھے کن انکھیوں سے اجوٹنٹ کو دیکھتے رہے بھلا اُن کی مجال تھی کہ وہ ایک ایسے جانور کے اعتراض کا جواب دیتے جس کی چونچ کچھ کم گز بھر کی تھی اور اس چونچ کو برچھی کی طرح بھونک دینے کی قوت بھی تھی۔ چپکے بیٹھے سب کچھ سنا کئے۔ اجوٹنٹ بھی گو بزدلی میں شہرۂ آفاق تھے لیکن گیدڑ ان سے کہیں زیادہ اس وصف میں شہرت رکھتے تھے۔"

مگرمچھ بولے "مشکل یہ ہے کہ کچھ سیکھنے سے پہلے جینا بھی تو پڑتا ہے اور پھر بھی یہ کہنا ضرور ہے کہ چھوٹے موٹے گیدڑ تو اَن گنت ملیں گے مگر ایسا مگرمچھ جیسا کہ میں ہوں مشکل سے دیکھنے میں آئے گا۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ مجھے کسی بات کا غرور ہے۔ کیونکہ غرور اور تکبر موجب تباہی ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی نہ بھولنا کہ جو کچھ ہے قسمت ہے۔ قسمت کے خلاف نہ تیرنے والا نہ چلنے والا نہ اُڑنے والا کچھ کر سکتا ہے۔ میں تو اپنی قسمت پر نازاں ہوں۔ اگر تقدیر کھوٹی نہ ہو اور نظر صحیح ہو اور دریا کے کنارے کسی پانی میں پہونچکر اس کی پہچان بھی ہو کہ اس میں سے نکلنے کا راستہ کدھر ہے تو پھر کس بات کی کمی رہتی ہے۔"

گیدڑ نے شرارت سے کہا "سُنتا ہوں کہ ایک مرتبہ حضور سے بھی چوک ہو گئی تھی۔"

مگرمچھ بولے "بالکل درست کہا۔ مگر دیکھو قسمت اچھی تھی صاف نکل آیا۔ یہ ذکر اُس وقت کا ہے جبکہ میں اپنے پورے قدو قامت کو نہ پہونچا تھا۔ اور واقعہ پچھلے تین کالوں کو چھوڑ کر جو کال آیا تھا جب کا ہے۔ گنگا جی کے دائیں بائیں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس زمانے میں دریاؤں میں پانی اتنا آتا تھا کہ بس دیکھا کیجئے۔ ہاں تو میں اس زمانے میں نوعمر تھا۔ سمجھ پوری نہیں آئی تھی۔ جب سیلاب آیا تو مجھ سے زیادہ کون خوش ہوتا۔ دریا کے دھارے سے لیکر گاؤں کے اُتر تک سب جل تھل ہو گیا۔ تیرتا ہوا گھاٹ کے اُوپر پہونچ دور تک نکل گیا۔ خوب یاد ہے کہ اس سفر میں شیشے کی چوڑیوں نے پیٹ میں سخت بےچینی پیدا کی۔ اور اگر ٹھیک یاد ہے تو ایک جوتے کے جوڑے نے بھی معدے میں سخت گرانی کی۔ اتنی عقل کہاں تھی کہ نگلنے سے پہلے دو چار جھٹکے ایسے دیتا کہ دونوں جوتے نکل کر پانی میں جا گرتے۔ مگر بھوک تیز تھی اسکا خیال نہ آیا۔ اور سب ہڑپ کر گیا۔ بعد میں طبیعت میں احتیاط پیدا ہو گئی۔ غرض کچھ دنوں اسی طرح کھاتا پیتا آرام کرتا رہا۔ جب آدمیوں کو کھاتے کھاتے نیت سیر ہو گئی تو دریا میں واپس جانیکا ارادہ کیا۔ سیلاب اب کم ہونے لگا تھا۔ گاؤں کی کچی سڑک سے مجھے گذرنا پڑا۔ وقت کی بات ہے کہ کیچڑ میں چلنا بھی پڑا تو کسکو موضع مگر گھاٹ کے مگر کو۔ گاؤں میں جتنی رعیت تھی عورتیں اور بچے سب میرے درشن کو گھروں سے نکل پڑے۔ میں نے ان سبکو

۵ attention

بڑی محبت اور شفقت کی نظر سے دیکھا۔ لیکن ایک ناؤ والا مانجھی کہنے لگا کہ "کیچڑ میں مقابلہ کرنا درست نہ ہوگا۔ بہتر ہو کہ کلہاڑے لاکر اسکے یہیں ٹکڑے کردیں۔" اتنا سُنکر ایک برہمن بولا "ایسا نہیں ہوسکتا۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو، پیچھے پیچھے مگر ہے اور آگے آگے سیلاب کا پانی ہے جو گاؤں سے رخصت ہو رہا ہے۔ پھر ہمارے گاؤں کا وہ دیوتا بھی تو ہے۔" غرض گاؤں والوں نے مجھے جان سے مارنے کا قصد چھوڑ کر مجھ پر سے بہت پھول نچھاور کئے۔ اور جب ان کو زیادہ خیال ہوا تو ایک بکرا بھی بھینٹ چڑھایا۔"

گیدڑ بولا "اچھا بکرا بھی بھینٹ چڑھایا۔ بکرا تو سبحان اللہ بڑی ہی لذیذ چیز ہے۔"

گھاٹ کے مگر بولے "بکرا اچھی چیز نہیں۔ بال بہت ہوتے ہیں اور اگر پانی میں پڑا ہو ملے تو سمجھ لو کہ اس میں لوہے کا کوئی موٹا اور تیز کانٹا ضرور چھپا ہوگا جو نگلنے والے کا کام ہی تمام کردے گا۔ بہرکیف یہ جو کچھ ہو بکرا میں نے قبول کرلیا۔ اور بہت خوش خوش میں گھاٹ پر آیا۔ اب سُنئے کہ تقدیر اس کو کہتے ہیں کہ وہی ناؤ والا جس نے کلہاڑوں سے میرے ٹکڑے کرنے چاہے تھے میرے ہتے چڑھا۔ اور یہ اس طرح کہ اُس کی ناؤ ایک ٹیلے پر ریت میں پھنس گئی۔ یہ ریت کا ٹیلا بھلا تم کو کیا یاد ہوگا۔ برسوں کی بات ہے۔"

اس پر اجوٹنٹ کسی قدر ترش ہو کر بولے "کیا آپ نے ہم سب کو گیدڑ ہی سمجھ لیا ہے، آپ اُس ٹیلے کو کہتے ہیں نا جہاں ہما کال کے زمانے میں ایک ناؤ پتھروں سے بھری ڈوبی تھی۔"

مگر کہنے لگا "ہاں۔ لیکن دو ٹیلے تھے ایک اُوپر کو تھا اور دوسرا نیچے کو۔"

اجوٹنٹ کہنے لگے "ہاں میں بھولا۔ بیچ میں پانی آیا ہوا تھا۔ پھر وہ پانی سوکھ گیا۔" اتنا کہکر اجوٹنٹ اپنے حافظے پر ناز کرنے لگے۔

"اچھا۔ بالکو، سُنو۔ اس نیچے ٹیلے کے قریب آکر ہمارے اس نیک خوار اور وفادار مانجھی کی ناؤ آکر پھنس گئی۔ مانجھی ناؤ کے پیندے میں کچھ سوتا کچھ جاگتا پڑا تھا۔ فوراً اُٹھ ناؤ سے پانی میں کود ا تاکہ کشتی کو دھکا دے کر آگے بڑھائے۔ ناؤ خالی تھی۔ کچھ دور بڑھی مگر پھر آگے کے ٹیلے میں جا اٹکی۔ ناؤ کے نیچے نیچے میں برابر لگا رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ آدمی پانی میں اُتر کر آئینگے کہ ناؤ کو کھسکا کر کنارے تک پہونچائیں۔"

گیدڑ کو اس شکار کے حالات سُننے میں کچھ ایسا لُطف آیا کہ وہ بیتاب ہو کر پوچھنے لگا "پھر حضور وہ لوگ آئے۔"

مگر مچھ بولے "ہاں ہاں۔ جہاں ناؤ اٹکی تھی وہاں اور اس سے آگے جدھر کو دریا بہہ رہا تھا پانی میں اُتر کر آئے۔ میں جہاں تھا وہیں رہا۔ اور دن بھر میں تین کھائے! اور کھائے بھی ایسے جو بڑے تگڑے، مضبوط، موٹے تازے مانجھی تھے! اور سوائے آخری آدمی کے سب کو پکڑ کر اس طرح کھایا کہ کسی کی آواز تک اتنی نہ نکلی کہ کنارے تک جاتی۔ حالانکہ میرا زمانہ اُس وقت ناسمجھی کا تھا۔"

گیدڑ نے تعریف کی اور کہا کہ "یہ بڑا اشریفانہ شکار تھا۔ اور نہایت ہوشیاری اور صفائی اور نشانے پر پوری قدرت رکھنے کا تھا۔"

مگر فرمانے لگے "نہیں برخوردار ہوشیاری یا صفائی کوئی چیز نہیں۔ صرف خیال رکھنے کی بات ہوتی ہے۔ زندگی میں صحیح خیال کرنا ایسی چیز ہے جیسے بھات پر تھوڑا سا نمک چھڑک دیا ہو۔ اور میری کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جو خیال دل میں آئے وہ ہمیشہ صحیح ہو۔ میرے چچیرے بھائی گھڑیال نے جنکا شیوہ ماہی خوری ہے ایک مرتبہ کہا تھا کہ کسی خاص مچھلی کا پیچھا کرنا بڑا مشکل کام ہے اور ایک مچھلی دوسری مچھلی سے بڑی مختلف ہوتی ہے۔ پھر ہر گھڑیال کا فرض ہے کہ مچھلیوں میں وہ تمیز کرسکے کہ یہ

کونسی ہے اور وہ کونسی۔ تمام مچھلیوں کو فرداً فرداً اور بحیثیت مجموعی جانتا پہچانتا ہو۔ اسکو میں بھی عقل ہی کی بات کہتا ہوں۔ لیکن برعکس اس کے ہمارے بھیا گھڑیاں جو رات دن اپنی اسامیوں میں رہتے ہیں اس پر قدرت نہیں رکھتے۔ میری رعایا ایسی نہیں ہے جو بڑے بڑے جتھے بنا کر پانی میں تیرتی ہو۔ اور پانی سے مُنہ باہر نکالے رکھے جیسے کہ روہو مچھلی کا حال ہے یا جیسے کہ ارونا کی کیفیت ہے۔ میری رعایا میں کوئی بھی ایسا نہیں کہ جو موہو یا چیٹا کی طرح کروٹ کے بل تیرے اور نہ بچوا اور چلوا کی طرح طغیانی کے بعد غول بنا کر ایک جگہ اکھٹی ہو جائے۔"

اتنا سُن کر اجو ٹنٹ کہنے لگے" یہ جتنی اقسام مچھلیوں کی آپنے بیان کیں یہ سب نہایت ہی لذیذ ہوتی ہیں۔" اور یہ کہکر اجو ٹنٹ نے اپنی سخت اور کرخت چونچ کے دونوں پلڑے زور سے کھٹکھٹائے۔

مگر بولے کہ" ہمارے بھیا جی تو مچھلیوں ہی کے شکار پر خوش ہوتے اور بغلیں بجاتے ہیں۔ لیکن جن چیزوں کا وہ شکار کرتے ہیں ہمارے شکار کی طرح نہیں ہیں کہ اس جانب کے زبردست جبڑوں سے جان بچانے کے لئے دریا کے کنارے پر چڑھکر فرار ہو جائیں۔ ہماری رعایا اور قسم کی ہے۔ وہ پانی کی رہنے والی نہیں ہے اُس کی زندگی زمین پر بسر ہوتی ہے۔ وہ گھروں میں رہتے ہیں اور چاروں طرف اُن کے گائے، بیل اور بھینسیں بندھی ہوتی ہیں۔ مجھ کو اس بات سے بخوبی واقف رہنا پڑتا ہے کہ اِس وقت وہ کس کام میں مصروف ہیں اور اس سے فارغ ہو کر کیا کام کریں گے۔ اور جیسے کہاوت چلی آتی ہے میں دھڑ میں دُم لگا کر پورا ہاتھی بنا لیتا ہوں۔ اگر دیکھا کہ کسی کے گھر کے دروازے پر تلسی کے ہرے ہرے پتے یا لوہے کا کوئی چھلا لٹکا ہے تو سمجھ جاتا ہوں کہ اس گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اور وہ ایک نہ ایک دن گھاٹ پر کھیلنے ضرور آئے گا۔ اسی طرح جب دیکھتا ہوں کہ کسی گھر میں لوگ چیزیں لاتے لے جاتے ہیں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی لڑکی کی شادی جلد ہونے والی ہے۔ پھر شادی سے پہلے یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ لڑکی گھاٹ پر اشنان کرنے آئے گی۔ پس یہ بُڈھا مگر گھاٹ پر حاضر رہتا ہے۔ یا اگر دریا نے اپنا رہگزر بدل دیا تو مگر کو اسکے حال سے باخبر رہنا لازمی ہے۔"

گیدڑ بولا" اِس کی خبر رکھنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ میری اس تھوڑی سی عمر میں دریا نے اپنے بہنے کا راستہ کئی مرتبہ بدلا ہے۔" (اس مُلک میں دریاؤں کو ایک ہی رہگزر پر قرار نہیں ہے۔ ایک ہی برس کے اندر وہ دو دو تین تین مِیل ہٹکر بہنے لگتے ہیں۔ ایک طرف کے کھیت ڈوبکر دریا بُرد ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف نئی زمین پیدا کر دیتے ہیں۔)

مگر مچھ کہنے لگا" دریا کے رہگزر کے متعلق ہر قسم کا علم رکھنا مگر کے لئے نہایت ضروری اور بکار آمد شئے ہوتا ہے۔ کیونکہ نئی زمین کے پیدا ہونے سے نئے نئے ٹنٹے پیدا ہوتے ہیں، مگر اس بات کو جانتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ دریا نے اپنا رُخ بدل کر کس طرف نئی زمین پیدا کی ہے۔ جب پانی نکل جاتا ہے تو اس جانب دریا کے کنارے کونے کھُدروں میں دُبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ مقامات اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ آدمی سمجھتے ہیں کہ مگر تو بڑی چیز وہاں تو کتا تک چُھپ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ مگر میں وہیں پڑا شکار کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں ایک کاشتکار آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں یہاں ککڑیاں بوؤں گا، وہاں خربوزے لگاؤں گا۔ نئی زمین جو دریا نے پیدا کی ہے اسکی مٹی پاؤں کے انگوٹھے سے کُرید کر کہتا ہے کہ مٹی بہت اچھی ہے۔ اتنے میں دوسرا کاشتکار آتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں تو یہاں پیاز گاجریں اور گنے لگاؤں گا۔ اب ان دونوں میں اس طرح ٹکر ہوتی ہے جیسے بے ڈانڈ پتوار کشتیاں ٹکرا جائیں۔ نیلے نیلے پگڑوں کے نیچے سے ایک نے دوسرے پر آنکھیں نکالیں۔ بُڈھا مگر

تاک میں بیٹھا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ ایک کسان دوسرے کسان کو بھائی کے سوا اور کچھ نہ کہتا۔ اور اب وہ دونوں زمین کی حد بندی کرنے بڑھتے ہیں۔ مگر بھی کمینگاہ سے نکل کر اُن کے پیچھے پیچھے کیچڑ پانی میں دبکا دبکا جاتا ہے۔ اب دونوں کاشتکاروں میں گالم گلوچ کے بعد لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر دونوں اپنے سروں سے پگڑ اُتار پھینکتے ہیں۔ لاٹھیاں سنبھال کر اونچی کرتے ہیں۔ اور آخر کار اُن میں سے ایک لاٹھی کھا کر کیچڑ میں جا گرتا ہے۔ دوسرا اس کا یہ حال دیکھتے ہی بھاگ جاتا ہے۔ جب وہ واپس آتا ہے تو لکڑیوں گنوں کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو مارا گیا ہے اُسکی لاٹھی قتل پر گواہی دے رہی ہے۔ اس پر بھی تو مگر گھاٹ کے مگر کا یہ لوگ احسان نہیں مانتے اور سب چیخنے لگتے ہیں کہ خون ہو گیا۔ پھر فریقین کی برادری والے بیس بیس اور تیس تیس کی ٹولیاں باندھکر لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہی کہونگا کہ میری رعیت بہت اچھی ہے وہ اُتر کے جاٹ بیٹ کے تگڑے مالوی ہیں۔ لاٹھی محض تماشہ دکھانیکو نہیں چلاتے جب لڑائی ختم ہو جاتی ہے تو مگر مچھ دریا کے کنارے جہاں کیکروں کا جھنڈ ہے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔ گاؤں سے کوئی آدمی اسکو دیکھ نہیں سکتا۔ اب تاریوں بھری رات میں آٹھ یا نو خوب موٹے تازے تگڑے جاٹ لاش کو چرپائی پر ڈال اُٹھا لاتے ہیں مگر یہ جاٹ سب بڈھے ہیں۔ اور ان کی آوازیں بھی ایسی ہی بھاری ہیں جیسے میری آواز ہے۔ چرپائی رکھ کر وہ آگ جلاتے ہیں۔ دریا کے کنارے اس آگ کو پہچاننے والا مجھ سے بڑھ کر کہاں ملے۔ اب یہ بڈھے جاٹ حلقہ باندھ کر زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی حلقہ کے اندر سر آگے بڑھا کر اور کبھی چرپائی پر مُردے کی طرف دیکھکر سر ہلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انگریزوں کا قانون ایسے معاملوں میں رسی لیکر آن موجود ہوتا ہے۔ پھر جیلخانے کے چوک میں مجرم کو پھانسی دی جاتی ہے جس سے اُسکے خاندان والوں کی بڑی بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے۔ اس پر مقتول کے دوست کہتے اچھا ہے پھانسی لگ جانے دو۔ ایسا کام ہی کیوں کیا تھا۔ غرض یہی گفتگو بار بار بلکہ بیسیوں دفعہ اس لمبی رات میں ہوتی رہی۔ آخر کار ایک آدمی اُن میں سے کہنے لگا" بھائیو۔ لڑائی برابر کی تھی۔ بس قاتل سے ڈنڈ لیکر معاملہ رفع دفع کر دو۔ جتنا وہ کہتا ہے اس سے کچھ زیادہ دے۔ اور اس جھگڑے کو آیا گیا کر دو اور پھر اس کا کوئی ذکر تک نہ کرے۔ اب ڈنڈ کی رقم پر حجتیں ہونے لگیں۔ کیونکہ جو شخص مارا گیا تھا وہ مضبوط آدمی تھا اور اس کے بہت سے بیٹے جوان تھے۔ غرض سورج نکلنے سے پہلے انہوں نے مُردے کو آگ دکھا دی۔ یا یہ کہو کہ اُس کا مُنہ جُھلس دیا اور پانی میں لاش ڈال دی۔ پھر کیا تھا۔ وہ مُردہ اس جانب کا لقمہ بنا۔ اب وہ اپنا حال کیا کہتا۔ جب لاش ہی لاپتہ ہو جائے تو پھر قصہ آگے کیا چلتا۔ مگر کے سوا کسی کو یہ ماجرا معلوم تھا۔ واقعی مالوے کے جاٹ بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

اجوٹنٹ بولے" اچھے ہوں یا بُرے، ہمارے پوٹے میں اُن کی سمائی ممکن نہیں۔ اور نہ وہ ایسی چیز ہیں جو چونچ سے پکڑ کر زنبیل میں رکھ لی جائیں۔"

مگر کہنے لگا" یہ کام ہمارا ہے اور ہمیں کو زیب دیتا ہے۔"

اجوٹنٹ نے اپنی تقریر جاری رکھی اور کہا کہ "ایک زمانہ ہوا کہ دکھن کے شہر کلکتے میں گھروں کا کوڑا کرکٹ سڑک پر پھینکدیتے تھے۔ یہ بہت ہی پُرانے وقتوں کی بات کہتا ہوں۔ آج کل کی کیا پوچھتے ہو۔ اب تو وہ اپنے گھروں اور گلیوں کو ایسا صاف اور ستھرا رکھتے ہیں جیسے باہر سے انڈا ہو۔ یہ حال دیکھکر ہمارے سب بھائی برادر وہاں سے چلے گئے۔ صاف ستھرا رہنا اور بات ہے اور دن بھر میں سات سات دفعہ جھاڑنا پوچھنا۔ جھاڑ دینا دوسری بات ہے۔ اس میں تو اچھے بھی تھک کر چور ہو جائیں۔"

گیدڑ بولے" دکھن کا ایک گیدڑ تھا اُس نے اپنے بھائی سے سُنا اور اُس بھائی نے مجھ سے ذکر کیا کہ کلکتے میں جتنے گیدڑ ہوتے

ہیں برسات کے اُوت بلاؤں کی طرح چکنے چپڑے، موٹے تازے ہوتے ہیں"۔ یہ فقرہ کہتے تو کہدیا مگر مُنہ میں پانی بھر آیا۔

"لیکن مشکل یہ ہے کہ وہاں پیلے چمڑے والے یعنی انگریز بہت رہتے ہیں۔ کشتیوں میں انکے ساتھ کتے بیٹھے ہوتے ہیں جو خدا جانے وہ دریا در یا کہاں سے لاتے ہیں"۔

اجوٹنٹ اتنا سُنکر بولے "اُن کے کُتے بڑے موٹے تازے چکنے چپڑے ہوتے ہیں تاکہ وہاں کے گیدڑوں کو وہ بھوکا اور دُبلا رکھیں"۔

گیدڑ کہنے لگا "کیا یہ انگریز بھی یہاں کے آدمیوں کی طرح ظالم ہیں۔ ہائے سچ ہے آسمان زمین آگ پانی کوئی بھی تو گیدڑ کے ساتھ سُلوک اور مروّت سے پیش نہیں آتا۔ پچھلے برس کا ذکر ہے کہ میں نے ایک اُجلے چمڑے والے کا خیمہ دیکھا۔ برسات جب ختم ہوتی ہے تو اُن کے ڈیرے خیمے لگے ہوا کرتے ہیں۔ اندر گھس کر میں نے چمڑے کی ایک لگام اُٹھا کر چبائی۔ افسوس، بات یہ ہے کہ یہ گوری صورتوں والے چمڑے کو تیار کرنا بالکل نہیں جانتے۔ کھانا تو کُجا چبانے ہی سے میں کئی دن بیمار پڑا رہا"۔

اجوٹنٹ بولا "واہ جو مجھ پر گذری وہ اس سے کہیں بدتر تھی۔ قصہ یہ ہے کہ ابھی دُنیا میں آئے تین فصلیں گذری تھیں۔ یا یہ سمجھو کہ میں بالکل نوعمر اور نڈر پرندہ تھا۔ ایک دن اُڑتے اُڑتے وہاں پہونچا جہاں دریا پر انگریزوں کی بڑی کشتیاں ٹھیرتی ہیں۔ کچھ جانتے بھی ہو انگریزوں کی کشتیاں تمہارے اس گاؤں سے کتنی بڑی ہوتی ہیں"؟

گیدڑ کو اجوٹنٹ کی بات کا کچھ یقین نہ آیا اور جل کر کہنے لگا "آپ تو دِلّی تک ہو آئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہاں کے آدمی پاؤں پاؤں نہیں بلکہ سر کے بل چلتے ہیں"۔ اتنا سُنکر مگر نے بھی بائیں آنکھ جو اب تک بند تھی کھول کر اجوٹنٹ کو بڑے غور سے دیکھا۔

اجوٹنٹ کہنے لگا "میں نے جو کچھ عرض کیا اس میں ایک حرف دروغ نہیں۔ سب سچ ہے۔ جھوٹا تو اُس وقت جھوٹ بولتا ہے جب سمجھتا ہے کہ سُننے والے جھوٹ کو سچ سمجھیں گے۔ کوئی شخص جس نے انگریزوں کی ان کشتیوں کو نہیں دیکھا ہے وہ کبھی سچی بات کا یقین نہیں کر سکتا"۔

مگر مچھ بڑبڑے پڑے بولے "یہ بات تم نے عقل کی کہی۔ اچھا پھر کیا ہوا"؟

"اِس بڑی کشتی میں کہیں اندر سے لوگ کوئی سپید سپید اُجلی چیز نکال کر باہر لاتے تھے۔ اور یہ چیز کچھ ایسی ہوتی تھی کہ تھوڑی دیر میں پانی ہوکر بہنے لگتی تھی۔ نکالنے میں بہت سی جہاز کے نیچے کنارے پر گری اور باقی کو ایک بڑی موٹی موٹی دیواروں کے گھر میں بند کر دیا۔ اتنے میں ایک ملّاح ہنستا ہوا آیا اور اُس نے اسی اُجلی چیز کا ایک بڑا سا ٹکڑا جو ایک چھوٹے سے کُتے کے برابر ہوگا، میری طرف پھینکا۔ ہماری قوم کا دستور ہے کہ جو کچھ سامنے آئے بے دیکھے بھالے، بے سمجھے بوجھے چونچ سے اُٹھا کر نگل جاؤ۔ نگلنا تھا کہ شدّت سے سردی محسوس ہوئی۔ پوٹے سے لیکر ٹانگیں اور ٹانگوں سے لیکر پنجوں کی نوکیں تک ٹھنڈی پڑ گئیں۔ تمام عمر مجھکو ایسا جاڑا معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس حیرت اور تکلیف میں میں ناچنے لگا۔ اور جہاز والوں نے مجھے دیکھ کر قہقہے لگانے شروع کئے۔ جب تک طبیعت کچھ سنبھلے میں برابر ناچتا اُچھلتا کودتا رہا۔ پھر میں نے دُنیا کی مکّاریوں اور دغابازیوں پر سخت لعنت ملامت کی۔ جہاز والوں نے مجھ کو چھیڑنا شروع کیا اور ہنستے ہنستے وہ گر گر پڑے۔ اب جس بات پر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی وہ یہ تھی کہ گو سردی سے بہت تکلیف پہونچی تھی۔ مگر تھوڑی سی دیر میں کہ ناچنا کودنا گریہ وزاری ابھی پوری بند بھی نہ ہوئی تھی کہ معلوم ہوا پوٹا بالکل خالی ہے"۔

قصہ یہ تھا کہ اس وقت اجوٹنٹ بہادر نے ایک واقعہ کو

اپنے طور پر صحیح بیان کرنے کی ازحد کوشش کی تھی اور واقعہ یہ تھا کہ ایک دفعہ اُس نے ساڑھے تین سیر کا برف کا ایک ڈلا نگل لیا تھا۔ جس زمانے میں کلکتے کے انگریزوں نے برف کی کلیں نہیں کھڑی کی تھیں تو اُس زمانے میں وہ امریکہ سے جھیل وینہام کی جمی ہوئی برف جہازوں میں بھروا کر ہندوستان منگوایا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ اجوٹنٹ کو معلوم نہ تھا کہ برف کیا چیز ہے۔ اور گیدڑ اور مگر گھاٹ کے مگر بھی اس سے واقف نہ تھے اس لئے اس قصّے کو سُنکر کسی کو لُطف نہ آیا۔

مگر مچھ اپنی بائیں آنکھ بند کر کے بولے "ہمارا موضع مگر گھاٹ کچھ چھوٹا گاؤں نہیں ہے جب کوئی کشتی اُس سے نکلتی بڑی ہو پھر جو کچھ بھی اس سے ظہور میں آئے وہ تھوڑا ہے۔"

پُل پر سے سیٹی کی آواز سُنائی دی اور دلّی کی ڈاک گاڑی چیختی چلاتی دن دن کرتی گذری جتنی گاڑیاں تھیں سب میں روشنیاں تھیں۔ اور گاڑیوں کی پرچھائیاں پانی پر جلدی جلدی پڑتی نکل گئیں۔ اور پوری ٹرین کڑکتی گرجتی ایکدم پھر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ لیکن مگر اور گیدڑ کے لئے پُل سے ریل کا گذرنا رات دن دیکھتے دیکھتے ایک معمولی بات ہو گیا تھا چنانچہ ان میں سے کسی نے بھی اُدھر گردن پھیر کر نہ دیکھا۔

اجوٹنٹ کہنے لگا "کسی ناؤ کا موضع مگر گھاٹ سے نکلنا بڑا ہونا کیسی عجیب بات ہے اس سے بڑھکر کیا عجیب بات ہو گی" اتنا کہہ اجوٹنٹ بہادر نے پُل کی طرف اُوپر کو دیکھا۔

مگر مچھ بولے "بیٹا۔ یہ پُل سارا میرے سامنے بنا ہے۔ اس کا ایک ایک پتھر چنائی میں اُونچا ہوتے میں نے دیکھا ہے۔ گو مزدور جو اُوپر کام کرتے تھے پاڑ پر پاؤں بہت سنبھال کر رکھتے تھے پھر بھی جو گر کر نیچے آیا بندہ موقع پر حاضر تھے۔ جب تک پہلا پیل پایہ بنتا رہا کسی کو پرواہ تک نہ ہوئی کہ جو گرا ہے اسکو نکالکر کریا کرم کریں۔ غرض اس خدمت میں میں نے اُن کو تکلیف اور زحمت سے بچایا۔ پُل کے بنانے میں کوئی بات عجیب نہ تھی۔" اس پر اجوٹنٹ بولے "سب میں عجیب چیز تو وہ ہے جو پُل پر دھکی ہوئی گاڑیوں کو کھینچے لئے جاتی ہے۔"

مگر گھاٹ کے مگر بولے "اس میں شُبہ نہیں کہ وہ کسی عجیب وغریب نسل کا بیل ہے۔ لیکن ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے کہ اُس کے پاؤں بھی نہ جمیں گے اور وہ بھی آدمیوں کی طرح نیچے آن رہیگا۔ اور اینجانب اسکے ہڑپ کرنے والے موقع پر حاضر ہونگے۔"

بُڈھے مگر کی اتنی بات کہنے پر گیدڑ نے اجوٹنٹ کی صورت دیکھی اور اجوٹنٹ نے گیدڑ کی۔ انجن جو کچھ بھی ہو مگر اس کے بیل ہونے کا یقین کسی کو نہ آسکتا تھا۔ گیدڑ نے اُسکو پٹڑی کے کنارے بناسپتی کی باڑ میں سے بارہا جھانک کر دیکھا تھا۔ اور اجوٹنٹ تو انجن کو جب سے وہ ہندوستان میں جاری ہوا تھا دیکھتا چلا آیا تھا۔ لیکن بُڈھے مگر نے جب کبھی انجن کو دیکھا تھا تو وہ نیچے سے دیکھا تھا اور انجن کی پیٹھ پر جو پیتل کا گولا ہوتا ہے اس کے سوا اور کچھ اُسکو نظر نہ آتا تھا۔ اسی گولے کو وہ بیل کا کوہان سمجھتا تھا۔

مگر مچھ نے اپنے دل کو یقین دلانے کے لئے یہی جملہ پھر دُہرایا "بیل ہے مگر نئی قسم کا ہے۔"

گیدڑ بولے "حضور بجا ہے۔ سوائے بیل کے دوسری کیا چیز ہو سکتی ہے؟"

مگر مچھ بولے "ممکن ہے کہ وہ کوئی اور جانور....."

گیدڑ کہنے لگا "نہیں غریب پرور، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ وہ بیل ہے۔"

اس پر مگر مچھ کسی قدر تُرش ہو کر بولے کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ مجھ سے زیادہ اس بات کا علم دوسروں کو ہے کہ انجن دراصل کیا چیز ہے۔" وہ جو کچھ بھی ہو لیکن تم نے مجھے پوری

بات کہنے نہ دی۔"

گیدڑ پنجے جوڑ کر عرض کرنے لگے "جو کچھ غریب پرور اسکو کہیں وہی وہ ہے۔ میں تو حضور کا غلام ہوں نہ کہ اس کا جو پل سے گذرتا ہو اور دریا پار جاتا ہے۔"

اجوٹنٹ کہنے لگے "جو کچھ بھی ہو مگر ہے انہی اُجلی چمڑی والوں کی کاریگری۔ اور سچ پوچھو تو میں تو اتنی دُور بھی کھڑا ہونا پسند نہ کروں جیسے یہاں سے یہ ریت کا ٹیلا ہے۔"

مگر مچھ بولے "جیسا کہ ان اُجلی گردن والے انگریزوں کو میں جانتا ہوں دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ جس زمانے میں یہ پل بن رہا تھا تو ایک انگریز اسکی دیکھ بھال کے لئے یہاں رہا کرتا تھا۔ روز شام کو کشتی میں بیٹھتا اور اس کے پیندے پر پاؤں زور زور سے مارتا۔ اور دبی آواز سے پوچھتا "کیا وہ یہاں ہے" کبھی کہتا "نہیں شاید وہاں ہو" کبھی چیخ کر کہتا "ہمارا بندوق اُٹھا لاؤ"۔ صورت دیکھنے سے پہلے ہی اس کی آواز سُنتا تھا۔ اور جو کچھ اُس کی زبان سے نکلتا اس کی شکل دیکھنے سے پہلے ہی سُن لیتا۔ غرض اس کا زور زور سے بکنا غل مچانا، بندوق کی کھڑبڑ یا کوئی آواز بھی جو اس کی وجہ سے پیدا ہوتی وہ پہلے میرے کانوں میں پہونچ جاتی۔ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اسی دن اُس کا ایک مزدور پل سے پانی میں گرا اور اسکو میں وہیں کھا چکا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ میں نے لاش پھونکنے کی ضرورت باقی نہ رکھی۔ لکڑی کے دام بچا دئے۔ اس وجہ سے اس انگریز کا روزانہ گھاٹ پر آنا ایک معمولی سی بات ہو گئی۔ جب آتا تو چیخ چیخ کر کہتا کہ میں مگر گھاٹ کے مگر کا شکار کرکے گھاٹ کو اس بلا سے نجات دونگا۔ واہ واہ شکار بھی کس کا کریں گے۔ میرا۔ میں جو موضع مگر گھاٹ کا مشہور و معروف مگر ہوں۔ بچو۔ سُنو میں اس انگریز کی ناؤ کے نیچے نیچے گھنٹوں تک پھرتا رہا۔ اور دیکھتا تھا کہ درختوں کے ٹھنے جو بہتے بہتے دریا کے کنارے آن لگے تھے اُن پر وہ برابر فیر کئے جاتا تھا۔ جب میں سمجھتا کہ اب وہ واقعی تھک گیا ہے تو اک دم پانی سے اُبھر جبڑے پھاڑ اس کے سامنے آجاتا۔ اور دونوں جبڑے اُس کے مُنہ کے پاس لاکر کھٹ سے بند کرتا۔ جب پل بن چکا تو یہ انگریز کہیں چلا گیا۔ شکار کرنے کا طریقہ تمام انگریزوں کا یہی ہے۔ مگر یہ طریقہ اسی وقت تک کام دیتا ہے جبکہ خود اُن کا شکار نہ کیا جاتا ہو۔"

گیدڑ بڑی حیرت سے پوچھنے لگا "کیا ان سپید چمڑے والونکا بھی کوئی شکار کرتا ہوگا۔"

مگر مچھ بولے "اب تو نہیں مگر اگلے وقتوں میں خود میں نے ہی ان کا شکار کیا ہے۔"

اجوٹنٹ جو دیر سے خاموش تھے جھٹ اپنی چونچ کھٹ کھٹا کر بولے "مجھے بھی ان کا شکار کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ گو اُسوقت میں بہت کمسن تھا۔"

مگر مچھ فرمانے لگے "یہ زمانہ وہ تھا کہ موضع مگر گھاٹ کے گھاٹ پر میں بخوبی آباد ہو چکا تھا۔ ایک دن ہمارے چچیرے بھیا خبر لائے کہ بنارس سے اُتر کی طرف کھانے کے لئے بڑا مال ہے۔ پہلے تو میرا اُدھر جانے کا ارادہ نہ ہوا۔ کیونکہ ان بھیا جی کو میں جانتا ہی تھا کہ مچھلیوں کے کھانے والے ٹھیرے، ان کو کھانے کے بارے میں اچھے بُرے کی کیا تمیز۔ لیکن اُسی دن شام کو میں گاؤں والوں کو آپس میں بات چیت کرتے سُنا۔ اور جو کچھ انہوں نے کہا اُس کا مجھے یقین ہو گیا۔"

گیدڑ بیقرار ہو کر پوچھنے لگے "وہ کیا باتیں تھیں جو آپ نے اُن سے سُنی تھیں۔"

مگر مچھ بولے "ان کی باتیں جو سُنیں وہ ایسی تھیں کہ پانی کو چھوڑ کر اس جانب نے خشکی میں پیادہ پائی اختیار کی۔ خیال کرنے کا مقام ہے کہ میں موضع مگر گھاٹ کا مگر پانی چھوڑ کر

پاؤں پاؤں چلوں۔ بغرض روانگی رات کے وقت پیش آئی۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں یا دریا کے ٹکڑے جو بیچ میں آئے تیرتا ہوا گذرا۔ شروع شروع میں کچھ خشکی میں بھی چلنا پڑا۔ لیکن گرمی کا موسم شروع ہو رہا تھا۔ ندی نالوں میں پانی تھوڑا تھا۔ اس سفر میں گرد اور خاک سے اَٹے راستوں کو میں نے طے کیا۔ کبھی اونچی اونچی گھاس میں چلنا پڑا۔ چاندنی راتوں میں پہاڑیوں اور ٹیلوں پر چڑھا۔ کھُردرے اور ناہموار چٹانوں پر بھی۔ بچّہ میں بے تکلف چڑھتا چلا گیا۔ ذرا خیال کرنے کی بات ہے کہ میں موضع مگر گھاٹ کا مگر اور پیدل چلوں۔ آخر کار دہلی سے اوپر پہونچکر میں نے سرہند کی دُم پکڑی۔ یہاں پانی کا نام نہ تھا۔ آگے بڑھا تو کئی چھوٹے چھوٹے دریا ملے جو گنگا جی کی طرف بہتے جا رہے تھے۔ اب سمجھو کہ میں اپنے گاؤں اور گاؤں کی رعایا اور دریا کے اُن کناروں سے جنکے چپّے چپّے سے واقف تھا پورے ایک ماہ کی راہ پرآ گیا تھا اور یہ کام بڑی حیرت کا مجھ سے عمل میں آیا تھا۔"

گیدڑ جس کی جان معدے میں پڑی رہتی ہے پوچھنے لگا۔ "یہ تو فرمائیے کہ حضور نے رستے میں کھایا کیا؟" گیدڑ کو مگرمچھ کے خشکی میں اتنی دور سفر کرنے پر مطلق تعجب نہ ہوا۔

مگرمچھ نے اس سوال کا جواب ٹھیر ٹھیر کر ایک ایک لفظ کو نہایت واضح طور پر ادا کر کے یہ دیا۔ "جو۔ کچھ۔ بھی۔ ملا۔ وہ۔ کھایا۔ سُنا۔ تم۔ نے۔ بہن۔ کے۔ بٹوا۔"

ہندوستان میں کسی ایسے شخص کو بہن یا بھائی کا بیٹا کہنا جس سے واقعی کوئی خونی رشتہ نہ ہو گالی سمجھا جاتا ہے۔ مگر کے خاندان میں سے کسی کی شادی گیدڑ سے ہوئی ہو تو قصے کہانیوں میں شاید ایسا پیش آیا ہو تو آیا ہو۔ مگر حقیقت میں ایسا ہونا اب تک نہ سُنا تھا۔ گیدڑ سمجھ گیا کہ مگر نے اسکو اپنے خاندان میں شامل کرنے کی کیوں عزت بخشی ہے۔ اگر گیدڑ اور مگر تنہا ہوتے تو گیدڑ مگر کے اس جملے کا کچھ خیال نہ کرتا لیکن اجوٹنٹ نے کچھ اس طرح آنکھیں جھپکائیں کہ گویا وہ اس گندے لطیفے سے لُطف اُٹھا رہا تھا۔

گیدڑ بھی کچھ کم نہ تھے، بولے: "باوا جان۔ حضور نے جو کچھ فرمایا دُرست ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کوئی گھٹیا سے گھٹیا مگر بھی اپنے کو گیدڑ کا باپ کہلایا جانا پسند نہ کرے گا۔ چہ جائیکہ موضع مگر گھاٹ کے معزز مگر۔ لیکن حضور کے قول کی تردید کس سے ممکن ہے، اور پھر اس سے اتنی باتیں اور نکلتی ہیں کہ انکو بیان میں لانا لاحاصل ہو گا۔"

گیدڑ نے تنا اور کہا "حضور نے اِس ناچیز سے قرابت بندی ظاہر فرمائی ہے۔ لیکن درجہ قرابت بھی ارشاد ہو۔ میں کَے دن کی جان ہوں کہ اتنی بڑی بات مجھے یاد رہتی۔ علاوہ اس کے جیسا کہ حضور نے فرمایا ہماری آپ کی غذا بھی ایک ہی ہے۔"

گیدڑ کے اس جواب نے معاملے کی صورت بدل دی کیونکہ گیدڑ نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ مگر نے اس سفر میں جو کچھ کھایا ہو گا وہ تازی غذا ہو گی۔ باسی کر کے کھانے کا وقت سفر میں کہاں ملا ہو گا۔ دریا کے جتنے مگر، بھونٹ، گھڑیال یا نہنگ، یا خشکی میں جنگل کے جتنے شریف درندے ہوتے ہیں انکا قاعدہ ہے کہ جب تک گوشت کو کسی قدر باسی کر کے سڑا نہ لیں کھاتے نہیں۔ دریا کے کسی جانور کو یہ کہنا کہ وہ تازے گوشت کا کھانیوالا ہے ایسا ہی ہے جیسے کسی انسان کو مردم خور کہنا۔

اب اجوٹنٹ دبی آواز میں کہنے لگے "جو کچھ اسوقت کھایا تھا اسکو تین برس گذر لئے ہیں اور اگر اتنے ہی برس اور اس کا ذکر کیا جائے تو جو اس وقت کھایا تھا پھر میسّر آنا ممکن نہیں۔ اب مگر یہ فرمائیں کہ جب اس سفر سے فارغ ہو کر وہ اچھے پانیوں میں پہونچ گئے تو پھر کیا گذری۔ گیدڑ کو تو بکنے دیجئے۔ وہی مثل ہے کہ کہیں گیدڑ کے چیخنے سے شہر کے کاروبار بند ہوتے ہیں ——"

مگرمچھ اجوٹنٹ کے اس طرح بیچ میں بات کاٹنے کے کسی قدر شکر گذار ہوئے۔ اور جلدی جلدی کہنے لگے کہ "گنگا جی کے دائیں بائیں کی سوں۔ جب میں وہاں پہونچا تو پانی زیادہ نہ تھا"

گیدڑ بولا "تو کیا آخری طغیانی سے بھی پانی وہاں کم تھا ــــ؟"

مگر بولے "آخری طغیانی کی بھی خوب کہی۔ یہ طغیانی تو وہی تھی جو ہر پانچویں برس آیا کرتی ہے۔ جس میں چند پردیسی آدمی کچھ مرغیاں کچھ چونرے ڈوبے ہوئے بہتے آیا کرتے ہیں۔ ایک آدھ مرا بیل یا بچھیا بھی ہوتی ہے۔ لیکن جس موسم کا میں حال کہتا ہوں اس میں دریا اترا ہوا تھا۔ سطح بالکل ہموار اور صاف تھی۔ بھیا گھڑیال کی خبر کہ وہاں انگریزوں کے مُردے بہت آتے ہیں، صحیح نکلی۔ خوب کھاتے۔ بلکہ یہ سمجھیے کہ پیٹ اور سینے کا دور اور شکم میں گہرائی اور گنجائش کی زیادتی اُسی وقت میں حاصل ہوئی۔

آگرے سے اٹاوے کے رستے الہ آباد کے بڑے پاٹ والے دریاؤں ...... اور پھر الہ آباد کے قلعہ کی دیواروں کے نیچے جو پانی گھوم کر آیا ہے اور بھنور ڈالتا ہے وہاں تو واہ واہ، وہ اس طرح آ رہے تھے جیسے نرسلوں کے جھنڈ میں مرغابیاں چکر کاٹتی اتر کر آئیں۔"

اجوٹنٹ اتنا سنکر اپنے اُس "اک ٹنگے" ناچ میں مصروف ہوکر گیدڑ کو حسرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔

چونکہ یہ حالات جن کا ذکر مگر اجوٹنٹ سے کرتا تھا، بہت پرانے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ گیدڑ کو کیونکر یاد ہوتے۔ یہ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات اور حالات تھے۔ گیدڑ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

مگر کی تقریر جاری تھی "ہاں اگر پانی کے گھوم پھیر سے نکل کر الہ آباد کے قریب دریا کے ہلکے بہتے پانی میں آجائیں تو پھر اگر بیس ہی نظر آئیں تو ان میں سے کم سے کم ایک تو ضرور ہڑپ کر ہی جاتا۔ اور پھر یہ کیسی خوبی ہے کہ انگریزوں کے پاس گہنا پاتا کچھ نہیں ہوتا۔ چوڑیاں بالیاں جیسے کہ آج کل ہماری عورتوں کے پاس ہوتے ہیں انکے پاس کچھ نہیں ہوتے۔ سچ کہا ہے جس کو زیور کی ہوس ہو اس کے گلے میں موتیوں کے ہار کی جگہ رسّی کا پھندا ہی نظر آتا ہے۔ غرض چارے کی کثرت کا کیا پوچھنا ہے ملک میں جتنے دریا تھے اور دریاؤں میں جتنے مگرمچھ تھے وہ سب مُردے کھا کھا کر اتنے موٹے ہوئے تھے کہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ مگر یہ مقسوم میں تھا کہ میں ان سب سے زیادہ فربہ اور موٹا ہو جاؤں۔ خبر آئی کہ انگریزوں کو دریا کی طرف بھگا کر باغی ان کا شکار کھیلتے ہیں۔ گنگا جی کی سوں میں نے جو کچھ سنا اس کا پورا یقین کر لیا۔ اور جہاں تک جنوب کی سمت میں گیا اس خبر کا ایک ایک حرف صحیح نکلا۔ جب میں دریا کے بہاؤ کی طرف منگیر سے کچھ آگے بڑھا اور ان مقبروں کے قریب پہونچا، جو دریا سے دکھائی دیتے ہیں۔ تو اور بھی یہ بات صحیح اور سچ نکلی۔"

اجوٹنٹ بولے "میں منگیر میں بہت رہا ہوں۔ اُس وقت کے مقابلے میں اب تو اسکو ایک برباد شہر سمجھنا چاہیئے۔ اور اب وہاں آبادی بہت کم ہے۔"

"اس کے بعد میں پلٹا۔ کیونکہ اب چڑھاؤ پر جانا تھا اسلئے رفتار سست ہو گئی۔ منگیر سے کچھ اوپر ایک ناؤ میں بہت سے سپید چہرے جیتے جاگتے نظر آئے۔ جہانتک یاد پڑتا ہے اس ناؤ میں عورتیں ہی عورتیں چار لکڑیوں پر کپڑا تانے اس کے سائے میں پڑی تھیں۔ اس زمانے میں ہم غریب دریا کے رکھوالوں پر بندوقیں کے فیر ہوتے بند تھے۔ کیونکہ بندوقیں اس وقت دوسرے کام میں تھیں۔ رات دن ہر ہوا کے جھونکے کے ساتھ بندوقوں کے دھڑ دھڑ چھٹنے کی آوازیں سنا کرتے۔ جب ان عورتوں کی ناؤ میرے قریب آئی تو میں پانی سے ابھرا۔ پانی میں اونچے ہونیکی

وجہ صرف اتنی تھی کہ ویسے تو میں گوری چمڑی کی عورتوں سے خوب واقف تھا مگر اُن کو میں نے زندہ آج تک نہ دیکھا تھا۔ اسی ناؤ میں ایک ننگا دھڑنگا گورا بچّہ تھا۔ وہ ناؤ کے کنارے جھکا کھڑا تھا، پانی میں ہاتھ ڈال کر کھیلتا بھی ضرور تھا۔ بچّے کو پانی سے کھیلتے ہوئے دیکھنا بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں اس دن خوب کھا چکا تھا لیکن پیٹ میں تھوڑی سی جگہ خالی بھی تھی۔ غرض شکار کی نیت سے نہیں بلکہ تفریح کے طور پر کھیل میں مَیں نے اس بچّے کے ہاتھ پر مُنہ مارا۔ پانی میں اُس کے گورے گورے ہاتھ اچھا نشانہ تھے۔ میں نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں اور جبڑے بند کر دیئے۔ میرا جبڑا ٹھیک پڑا تھا مگر اُس کے ہاتھ اتنے چھوٹے چھوٹے تھے کہ مُنہ بند کرنے نہ پایا تھا کہ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر کھینچ لئے۔ اور اس کے مطلق چوٹ نہ آئی۔ ممکن ہے کہ یہ ننھے ننھے ہاتھ دانت اور دانت کے بیچ کی ریخ سے نکل گئے ہوں۔ بڑے چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے ہاتھ تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ [illegible] لیکن جیسا کہ مَیں پہلے کہہ چکا ہوں یہ شکار ضرورت کا نہ تھا بلکہ محض تفریح اور کھیل کی بات تھی۔ یا یہ سمجھو کہ نئی چیزوں کے دیکھنے کا شوق تھا۔ غرض اسی دُھن میں پانی سے اُبھرا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ناؤ میں جتنی عورتیں تھیں چیخنے پیٹنے لگیں۔ میں فوراً ڈبکی لگا گیا۔ لیکن ایک بار پھر اُبھرا۔ ارادہ کیا کہ ناؤ کو اُلٹ دوں مگر وہ بڑی بوجھل تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اُس میں عورتیں ہی عورتیں بھری تھیں۔ لیکن عورت پر بھروسہ کرنا اور بھرے تالاب میں کائی پر چلنا ایک بات ہے۔ اور جیسی یہ بات صحیح ہے، گنگا جی کے داہنے بائیں کی سوں دوسری بات نہیں۔"

گیدڑ بولے "ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک عورت نے مچھلی کی سوکھی کھال میری طرف پھینکی۔ اور بات یہ تھی کہ میں نے اُسکے دودھ پیتے بچّے کو بُری نیت سے گھورا تھا مگر پھر وہی کہاوت ہوئی کہ گھوڑے کا دانہ گھوڑے کی لات سے بہتر ہوتا ہے۔"

گیدڑ مگر سے پوچھنے لگے "پھر اس عورت نے کیا کیا؟"

"اُس نے جھٹ ایک بندوق نکال کر مجھ پر فیر کرنے شروع کر دیئے۔ یہ بندوق کچھ ایسی تھی کہ اُس وضع کی نہ میں نے پہلے دیکھی تھی اور نہ جب سے ابتک پھر دیکھی۔ (معلوم ہوتا ہے کہ مگر کو اس وقت کسی پُرانی قسم کے پستول سے واسطہ پڑا تھا) وہ عورت فیر پر فیر کرتی رہی اور میں آنکھیں پھاڑے دھوئیں میں کھڑا رہا۔ پانچ مرتبہ جلدی جلدی اتنی دیر میں اس نے فیر کئے جتنی دیر میں مَیں اپنی دُم اس طرح ہلاؤں۔" یہ کہکر مگر نے اپنی دُم ہلائی۔

گیدڑ قصہ سُننے میں اتنا مصروف تھا کہ جب مگر نے اپنی دُم کی تلوار کو حرکت دی تو اُسکو صرف اتنا وقت مل سکا کہ اُسکی زد سے بچکر کھڑا ہو جائے۔

مگر نے اپنی تقریر جاری رکھی اور کہا "جب پانچ فیر ہو لئے تو میں نے ڈبکی لگائی۔ اور پھر جو اُبھرا تو ایک ملّاح کو ناؤ کی عورتوں سے یہ کہتے سُنا کہ زخم کاری پہونچا ہے یقین ہے کہ مر گیا ہوگا۔ ایک گولی میری گُدّی کے نیچے کھال میں لگی تھی۔ خبر نہیں کہ وہ ابتک وہیں ہے یا نکل گئی۔ ایک طرف کو گردن نہیں مُڑتی۔ اسلیے سمجھتا ہوں کہ ابھی تک وہیں ہے۔ ذرا میاں گیدڑ پاس آکر دیکھو تو تاکہ میرے بیان کی تصدیق ہو جائے۔"

گیدڑ کہنے لگا "حضور کیا فرماتے ہیں۔ یہ غلام تو پُرانی جوتیوں اور سوکھی ہڈیوں کا چچوڑنے والا ٹھیرا۔ حضور نے جو کچھ فرمایا وہ میرے سر آنکھوں پر۔ اگر ذرا بھی شک کروں تو ننھے پلّے میری دُم چبا جائیں۔ بھلا میری مجال ہے کہ حضور کے قریب آؤں۔ جو کچھ ارشاد ہوا اس میں ہرگز کسی طرح کا شک وشبہ غیر ممکن ہے۔ غریب نواز کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور والا نے اس غلام کو اس امر واقعی سے مطلع فرمایا ہے کہ تمام عمر میں صرف

Hamidur Rahman

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

افسانہ نویسی و داستان سرائی کے متعلق آئے دن اچھے اچھے مضامیز ہمارے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے فن کے متعلق بھی اردو میں چند کتابیں موجود ہیں۔ ہمارے نئے لکھنے والے بالعموم یہ غلطی کرتے ہیں کہ بغیر کچھ معلومات حاصل کئے افسانے لکھنے شروع کر دیتے ہیں۔ فن کا تو ذکر ہی کیا، مشاہدہ ان کا سطحی اور تجربہ انہیں بالکل ہوتا نہیں۔ ذاتی واقفیت تو یوں ختم ہوئی۔ اب رہا کتابی علم، تو انہیں زحمتِ مطالعہ گوارا نہیں۔ یوں مشاہدہ اور مطالعہ دونوں معدوم۔ جب ہر اہتمام سے افسانے لکھے جائیں تو نتیجہ معلوم۔ اس پر اڈیٹر کی سردمہری کا شکوہ اور اس کے غرور و پندار پر غم و غصہ کا اظہار ـــــ ع ۔

ہم نے وہ لطف اٹھائے ہیں کہ دل جانتا ہے

بھ ... ڈیٹر ہی سے پوچھا جاتا ہے کہ آخر آپ افسانے میں چاہتے کیا ... جواب اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ یہ سوال آسان ہے۔ تاہم کسی ... ہم اسے واضح کرنے کی کوشش کرینگے۔

افسانہ نگار کے لئے سب سے ضروری امر یہ ہے وہ جو کچھ لکھے دلچسپ ہو۔ اس کا پلاٹ نیا ہو یا پرانا، سادہ ہو یا پیچیدہ، افسانے کی فضا غم انگیز ہو یا مضحکہ خیز، اس کے دورانِ مطالعہ میں ایک لمحہ ... ایسا نہیں آنا چاہیئے کہ ایک معقول پڑھنے والے کو جمائیاں لینے لگیں اور اس کی طبیعت اتنی اکتا جائے کہ کہانی ادھوری ہی چھوڑ دے۔ اگر پڑھنے والے نے کہانی ختم کرنے سے پہلے پڑھنا ختم کر دیا تو سمجھئے کہ افسانہ نگار اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا۔

افسانہ نگاری کے فن کے متعلق تفصیل سے یہاں کہنے کی گنجائش نہیں۔ مغربی افسانہ نگاروں میں اس موضوع پر اختلاف آرا رہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی رائے کچھ ہے اور اسٹیونسن اس سے پہلے کچھ اور کہہ گیا ہے ... تین قسموں میں تقسیم کرتا ہے اور اس سے بھی پہلے ... کے اجزائے ترکیبی پر اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہے۔ ... یہ سب اس پر متفق ہیں کہ فنی حیثیت سے ... ہونا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ ... منتہا کو پہونچتے ہوں۔

افسانے کا اپنا ایک ماحول ہونا چاہیئے، واقعات و خیالات میں جامعیت ہونی چاہیئے اور یہ ایسے گندھے ہوئے ہونے چاہئیں کہ پڑھنے والے کا خیال ان میں جذب ہو جائے۔ اگر افسانے میں ذہن کو اکسانے کا عنصرِ لطیف بھی ہو تو سونے پر سہاگہ سمجھئے۔

پبلک کا مذاق بہت کچھ بدل گیا اور بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ بیس سال پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؟ عوام میں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے مذاق ترقی کے کئی مدارج طے کر چکا۔ جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی رنگین کہانیاں اب عام طور سے بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ آجکل کا پڑھنے والا خیالات کی گہرائی میں اترنے اور تجزیہ کرنے کا خوگر ہو گیا ہے۔ افسانہ نگار کی شخصیت کا اثر قبول کرنے کے لئے بھی آمادہ نظر نہیں آتا۔ جس وہ کہانیاں ... پڑھنے والے آبدیدہ ہو جاتے تھے اب انہی کہانیوں کو پڑھکر آج کل کے بعض پڑھنے والے رلانے کی کوشش پر قہقہے لگاتے ہیں۔ یہ وقت و تاریخ کا سوال نہیں ہے بلکہ عوام کے ادبی مذاق کی ترقی کا ثبوت ہے۔ اس ترقی یافتہ ذوقِ ادب کا لحاظ بطورِ خاص ہر افسانہ نگار کو رکھنا پڑیگا۔ امید ہے کہ نئے لکھنے والے حضرات اگر ان امور کو پیش نظر رکھیں گے تو انہیں اڈیٹروں کے ظلم اور اپنی مظلومیت کا کچھ زیادہ شکوہ نہیں رہے گا۔

پیشِ نظر "افسانہ نمبر" میں مضمون نگار حضرات کی عنایت سے نہایت پاکیزہ افسانے جمع ہو گئے ہیں۔ دلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر صاحب کے ہم شکر گذار ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مضامین کے شائع کرنے کی اجازت دی ۔ دربار اکبری کی ایک جھلک۔ ایک پرانا زمانہ۔ فسانۂ آزاد۔ خزانچی کی بیٹی۔ خرافات اور فولادی عشق۔ ان مضامین کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی سے کیسے کیسے بیش قیمت مضامین نشر کئے جاتے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ جو مضامین نشر کئے جاتے ہیں ان کی طباعت و اشاعت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس وقت ایک مغربی شاعر کا قطعہ یاد آتا ہے ۔

(بقیہ بر صفحہ ۸)

دربارِ اکبری کی ایک جھلک

مہاراجوں کے راجہ مہابلی اکبر بادشاہ آگرہ براج رہے ہیں۔ وہی آگرہ جو اب اکبرآباد ہو چکا ہے اور اس کا قلعہ بن چکا ہے۔ بہارِ جانفزا کا آغاز ہے۔ ہولی بھی جس کے آنے پر بقول بابر سارا ہندوستان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ قریب آ چکی ہے۔ سرسوں پھول رہی ہے۔ دشت و بیاباں سب زعفران زار بنے کھڑے ہیں۔ ہوا میں رنگ، دلوں میں اُمنگ، اور سروں میں ترنگ ہے۔ باغ در باغ گل و گلزار سب ہرے بھرے پھلوں سے لدے ہیں۔ سارے شہر کی آئین بندی ہوئی ہوئی ہے۔ گلی گلی کوچہ کوچہ آراستہ ہے۔ ہندو مسلمان، مرد، عورت، بوڑھے بچے، لڑکے بالے، جسے دیکھئے اپنے اپنے مقدور بھر اچھے اچھے کپڑے پہنے ٹھٹ کے ٹھٹ بولتے اُن راستوں کی طرف چلے جا رہے ہیں جو قلعہ کو جاتے ہیں۔ یہ راستے، اِدھر کے مکانات، ان کی چھتیں تماشائیوں سے بھر گئی ہیں یا بھرتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ خود قلعہ کی عمارت سہاگ کا سُرخ جوڑا پہنے کھڑی ہے۔ خندق سے لیکر بُرج نبارہ بلکہ دیوار و کنگرے تک ایک ایک چیز سجی اور اپنے زیور سے لدی ہے۔ راؤ، راجہ، مہاراجہ، امیر، وزیر، رؤسا، سفرا، سپہ سالاران نامدار و شاہزادگان کامگار کی سواریاں تورۂ اکبری کے مطابق قلعہ کو جا رہی ہیں۔ کوئی صاحبِ فیل و نشان ہے، کوئی صاحب طبل و علَم۔ کسی کے آگے آگے توغ و تمن توغ ہے یا ماہی مراتب۔ کسی کے سامنے نقارہ و دمامہ بجتا جاتا ہے۔ کسی کے ساتھ نقارہ ہے مگر کیا مجال کہ چوب نقارہ کو چھو جائے۔ کسی کے سامنے نفیری بجتی جاتی ہے۔ اور کسی کے ساتھ صرف جھانج۔ کسی کے ساتھ یہ سب لوازم امارت ہیں اور گاجہ باجہ بھی ہر طرح کا بجتا آتا ہے۔ مگر خاص خاص جگہ پر پہونچا اور بند۔ سوار و پیادے، کوتل گھوڑے، اونٹ، ہاتھی با ساز و یراق، ہودج و عماری سے سجے ہوئے ان جلوسوں کے ساتھ ہیں۔ لیکن کم و بیش اور علیٰ قدر مراتب۔ قلعہ معلیٰ تک عوام کی رسائی کہاں۔ وہ انہیں سواریوں اور جلوسوں کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں۔ ایسی سواریاں وابستگانِ دولت کی ابھی بہت سی آئینگی اور قلعہ کو جائیں گی، اور اُمراء اپنے اپنے جلوس کو جلوخانہ میں چھوڑ کر خود تام جھام۔ ہاتھی یا گھوڑے پر تا بہ نقارخانہ سوار جائینگے۔ کسی کا خاصہ یعنی لوازمہ جلوخانہ میں بھی جگہ نہ پائیگا۔ قلعہ سے باہر ہی رہ جائیگا۔ کسی کو قلعہ کے دروازے یا اُس کے سامنے سے ہی پیادہ پا ہو جانا پڑیگا۔ یہ تماشے آپ یہاں ہونے دیجئے ہمیں جلدی ہے۔ قلعہ کے اندر پہونچنا چاہیے۔ کہ وقت تنگ اور دربار کی ساعت قریب آ رہی ہے۔

اوہو ہو ہو، یہ کیا سماں ہے! یہ زمین ہے یا آسمان، یہ چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں یا خیابانِ رضواں۔ یہ محلات دیوان ہیں یا قصورِ رضواں۔ اس حوض کو تو دیکھئے، کوثر کا ہمسر ہے۔ یہ نہر اسی سے نکلتی ہے۔ پانی اس کا اسی لئے شہد و شیر کا ہم رنگ ہے۔ نہر کے کنارے کنارے دُور تک موٹے موٹے خوش رنگ نمدوں پر روپہلی گھڑے سُنہری کٹوروں کی مُہریں لگے سُرخ سُرخ قند میں لپٹے رکھے ہیں۔ ہوں نہ ہوں اسی آبِ حیات سے بھرے ہیں۔ آگے چل کر یہ نہر دو نہروں میں پھٹ گئی ہے ایک اندر اندر کہیں اور جا نکلی ہے۔ یہ شاخ آبشار بن کر گرتی ہے جس سے یہ مرمری نہر ملتی ہے اس کی تہ میں دیکھنا کیا خوب

لہریا بنا ہے پانی بھی اسی لئے بل کھاتا لہریا اور آب رواں بناتا ہوا بہتا ہے، نہر میں جابجا فوارے لگے ہیں اور سب اُڑ رہے ہیں۔ کوئی چکر کھاتا ہے، کوئی چادر پھیلاتا ہے۔ کسی نے ساون بھادوں کا سماں باندھا ہے اور پھواریں پڑ رہی ہیں۔ کسی سے چشمہ اُبل رہا ہے۔ غرض جو فوارہ ہے عجائب ہے۔ اس حوض مثمن کو تو دیکھئے اس کی شان ہی نرالی ہے۔ گوشہ گوشہ پر گلدان رنگا رنگ پھولوں سے اور چنگیر تازہ تازہ میووں سے بھرے رکھے ہیں۔ حوض میں چھوٹا سا ہزارہ چل رہا ہے۔ اس کی پھواریں پھلوں اور پھولوں پر اوس بن کر گرتی اور ان کی تازگی کو طراوت و شادابی کا رنگ دے رہی ہیں۔ جابجا چاندی کے کھم سنہرے بادلے سے سجے کھڑے ہیں۔ بلبل ہزار داستاں کے پنجرے لبتنی سے کسے زری گوٹے سے زربفت بنے پڑے لٹک رہے ہیں۔ غرض باغ نہیں فردوس بریں ہے۔ حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔ اس لئے تصور کے پر لگا کر اب دیوان خانہ پہونچتا ہوں۔

دیوان خانہ میں سر تا سر لاہور کی بادشاہی کارگاہ کا بنا ہوا ایک ریشمی قالین بچھا ہے جس میں بیل بوٹوں سے پورا باغ بنا ہے۔ کتنا خوش رنگ اور نظر فریب ہے۔ بخارائی و ایرانی قالین پا انداز میں پڑے ہیں، عام وخاص کے تمام در و دیوار گجراتی کمخواب، کاشانی مخمل، بنارسی زربفت، رومی بانات اور تاش تمامی سے آراستہ ہیں۔ دروازوں پر کشمیری شالوں کے پردے محرابی صورت پر بندھے ہیں۔ کوئی زردوزی ہے، کوئی گوٹے ٹھپے دھنک پیمک۔ تیلون، کلابتون، مقیش۔ بادلے سے لپا ہے اور بندھا ہوا ہے جگر جگر کر رہا ہے۔ ستونوں نے ولایتی جامہ وار اور مشجر کا جامہ پہنا ہے اور گل و گلدان لئے کھڑے ہیں۔ چھت میں جس کی لاجوردی زمین رنگ برنگ کے نقش و نگار سے خجالت دہ چرخ بریں ہے سونے کا جڑاؤ ہزارہ بلوری جھاڑ لٹک رہا ہے۔ دروازوں میں محرابیاں ہیں۔ دیواروں پر شفق چادریں۔ کونوں میں چاندی سونے کے گنگا جمنی سرو چراغاں رکھے ہیں۔ فانوس، حباب گلابیاں، لالہ، مردنگ کنول بھی جابجا لگے ہیں مگر اس خوبی سے کہ جگہ خود ان کو مانگ رہی ہے۔ ایک چیز بھی جگہ سے ہٹ جائے تو حسن بد نمائی سے بدل جائے۔ دیوان خانہ کے آگے سقرلاط کا کہکشانی سائبان کھنچا ہے، اس سے آگے ایک اور اونچا شامیانہ ہے اور اس سے آگے اور اونچا۔ آخیر میں دل بادل یا آسمانی شامیانہ ہے جس کی چھت آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ چوبیں ان کی سب سونے چاندی سے منڈھی، گلدستوں سے سجی ہیں۔ کس کس چیز کو دیکھئے، ایک سے ایک اچھی ہی ہے۔ سب سے زیادہ نادر اور تحفہ سنگ مرمر کا اورنگ یا تخت ہی جو خاص و عام کے وسط میں رکھا ہے۔ چھت اسکی بنگلہ نما ہے۔ نازک نازک مرمری ستونوں کے اوپر کھڑی ہے اور جابجا ستونوں سمیت جواہر زواہر سے جڑی ہے۔ اُس کے اوپر سرخ مخمل و سقرلاط کا شامیانہ ہے مکلل بہ لآلی و جواہر۔ جس کی سنجاف میں موتیوں کی جھالر لٹکتی ہے اور نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ تخت کے اوپر مخملی مسند لگی ہے۔ حاشیہ اس کا کوئی چھ سات گرہ جواہرات اور کندن سے مرصع ہے۔ گاؤ تکیہ و پشتی کا کہنا کیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے گرد نیم آسمان کے سارے تارے ٹانک دئے ہیں۔

ابھی ہمیں خاص و عام میں بہت کچھ دیکھنا تھا اور آرام گاہ خاص کے سامنے جاکر خاصہ دقور خانہ کی سیر کرنی تھی کہ

دفعتہً دیوان خانہ میں نسقچی، نقیب، یساول، چاؤش و چوبدار داخل ہوئے اور اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور درباری جن کے جلوسوں کو آتا ہوا ہم راستہ میں چھوڑ کر دیوان خانہ آ پہونچے تھے دیوان خانہ کی طرف آتے دکھائی دئے۔ یہ ابتک اپنے اپنے چوکی خانوں میں بیٹھے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ دربار کا وقت قریب آیا تو خاص و عام کا رُخ کیا۔ ہر ایک اپنی اپنی مُقررہ جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ لو وہ کرنا کی آواز آئی۔ آکر بیٹھنے والے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دم قدم کو دیکھا۔ نسقچی نے جس کو ذرا بھی خلافِ قاعدہ پایا چھڑیوں کے ٹہوکوں سے سیدھا کر دیا۔ کیا مجال کہ کوئی چُوں بھی کر سکے۔ کچھ سمجھے یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اِس لئے کہ بادشاہ آرام گاہِ خاص سے چل پڑے۔ وہ سنکھ بجا۔ مہابلی جہاں پناہ۔ بادشاہ سلامت! بادشاہ سواری خاصہ پر سوار ہو گئے۔ اب جب تک بادشاہ دیوان خانہ تک پہونچیں۔ یساولوں کی بن آئی ہے۔ جہاں کسی امیر سے آدابِ دربار کے خلاف کوئی ذرا سی بھی حرکت ہوئی اسی کو اُنھوں نے آدبوچا۔ پکڑا اور نکال دیا۔ لیجئے عُود و عنبر کی انگیٹھیاں بھی روشن ہو گئیں۔ سارا دیوان خانہ عطر و خوشبو سے مہک اُٹھا۔ وسطِ دیوان میں گلاب کا ہزارہ اُڑنے لگا۔ کتنا باریک ہزارہ ہے۔ بُوند تک دکھائی نہیں دیتی۔ اِس کا خزانہ ہو نہ ہو اِس طلائی گھڑے میں ہے جسکو یہ گُرجی عورت کا اسٹیچو بغل میں لئے کھڑا ہے۔ لو وہ شہنائی بجی۔ چاؤش پکارے "باادب باش۔ جہاں پناہ مہابلی بادشاہ سلامت"۔ جلوس آن پہونچا۔ اب کیا مجال کہ دیوان خانہ میں کوئی جنبش بھی کر سکے۔ پہلو کے دروازے سے ایک خواجہ سرا دیوان خانہ میں داخل ہوا۔ پھر چاؤش پکارے "باادب باش نگاہ بر قدم، جہاں پناہ، مہابلی بادشاہ سلامت"۔ سلامت کی آواز ختم نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ سلامت نے بادشاہزادوں کو ساتھ لئے، اس طرح کہ بادشاہ و بادشاہزادے کو خواجہ سرا گھیرے ہوتے ہیں جیسے چاند کو ہالہ، دیوان خانہ میں قدم رکھا، سر پر چنور ڈھل رہا ہے۔ مورچھل ہوتا چلا آتا ہے۔ تورخانہ کے خاصہ بردار پیچھے پیچھے ہیں۔ سارا دربار فرطِ تعظیم سے جُھک کر دُہرا ہو گیا، آداب بجالایا۔ بادشاہزادے تخت کے قریب اپنی اپنی جگہ پر ٹہرے۔ بادشاہ زینہ پر چڑھ کر تخت پر پہونچے۔ اور اللہ اکبر کہہ کر تخت کی مسند پر بیٹھ گئے کہ اکبر کا سلام اور انعام الٰہی کا شکر یہی اللہ اکبر ہے۔ یہ آواز سُنتے ہی سارے دربار نے جل جلالہ کہا اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ نقارخانہ میں نقارے پر چوٹ پڑی۔ دمامہ بول جیسے کوئی بادل گرجا۔ شہنائی سے مبارک و سلامت کے بول نکلے۔ شادیانہ بجنے لگا اور آس پاس کے ایوانوں سے ساز و سرود کی جانواز آوازیں آنے لگی۔

مہابلی کا رنگ گندمی، قد میانہ۔ بدن دُہرا، سادہ لباس میں بھی نہایت جامہ زیب ہے۔ آج سالگرہ کا دن ہے بڑے گھیر کا گلابی جامہ زیبِ بر ہے۔ سر پر تاج ہے مگر نہ مُغلئی نہ ایرانی وضع کا بلکہ خود مہابلی کی ایجاد ہے۔ ہندوانی مُکٹ سے ملتا جُلتا ہے۔ سارا جواہرات سے مرصع ہے موتی اور جواہرات کی لڑیاں اس میں لٹک رہی ہیں۔ جامہ پر قبائے نیمہ آستین ہے۔ اس کی آستینیں اور گھیر کوئی تین تین انگل طلائی دبکی اور جواہرات سے پلی ہے سنجاف پر موتی ٹکے ہیں۔ دامنوں کے کونوں اور شانوں کے شمسے جگر جگر کر رہے ہیں کہ پڑی نگاہ

ان پر نہیں ٹھہرتی۔ کمر میں مرصّع کمر بند ہے اور اُس میں خنجر لگا ہے۔ داہنے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول ہے، بائیں میں ایک خوش غلاف شمشیر کو تھی قبضہ سب مغرق بہ جواہر۔ بندِ شمشیر میں ایک بڑا سا موتی اور دو لعل آبدار آویزاں ہیں، دونوں کلائیوں میں مرصّع پہنچ پہنچ، بازوؤں پر ہیرے کے بازوبند بندھے ہیں اور گلے میں مرصّع ہار لٹک رہا ہے۔ کلغی وطرّہ پر اقبالِ اکبری کا اوطرہ ہے، کسی آنکھ کو نگاہ اور نگاہ کو اس کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں ہو۔ قورخانہ کے چیلے خواص تخت کے پہلو میں دونوں طرف ہاتھوں میں اسلحہ خاصہ لئے ہے خود سر تا پا اُوپچی بنے کھڑے ہیں۔ بھول کر بھی نظر ان پر جا پڑتی ہے تو زہر آب ہونے لگتا ہے۔

جہاں پناہ بادشاہ تخت پر بیٹھے ہی تھے کہ تصدقِ فرقِ مبارک شروع ہوا۔ اکابر دولت اپنی اپنی باری سے آگے بڑھکر بادشاہ پر زر و جواہر نثار کرنے لگے۔ جو اس رتبہ کے نہیں وہ پیش گاہ بادشاہی میں صدقات فرقِ مبارک پیش کرتے ہیں۔ اور اُلٹے پاؤں چلکر اپنی جگہ پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیجئے نذر شروع ہوئی، ولی عہد سلطنت کی نذر سب سے مقدم ہے۔ جواہرات و عجائبات کی کشتیاں آرہی ہیں اور بادشاہ کے سامنے پیش ہو رہی ہیں۔ ہاتھی گھوڑے مرصّع وزربفت کے سازو یراق سے سجے، زیوروں سے لدے دُلہن بنے جھم جھم کرتے پیش گاہِ عالی سے گذر رہے ہیں۔ جہاں پناہ بیٹھے سے باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ نذر کی فہرست لاکھوں کی ہو۔ ولی عہد کو جو انعام ملے گا وہ کروڑوں سے کم نہ ہوگا۔

بادشاہزادوں کے بعد اُمرائے سلطنت علیٰ قدرِ مراتب اپنی اپنی نذریں پیش گاہِ بادشاہی میں پیش کریں گے اور شاہانہ انعام و اکرام اور اضافہ منصب و اکرام پائیں گے۔ آخر میں دربار جس ترتیب سے جما تھا اُس کے برعکس ترتیب سے برخاست ہوگا۔

یہاں تک دربار سالگرہ ہے کل سے جشن بے تکلف شروع ہوگا۔ دعوتیں، ضیافتیں ہونگی۔ ناچ رنگ کی محفلیں جمیں گی۔ اور نہ صرف اکبرآباد میں، بلکہ ساری مملکت میں آج دربار لگا ہوگا۔ کل سے جشن منے گا۔ خوشیاں ہوں گی۔ ہم اور ہمارا تصور آخر کہاں کہاں جائیں اور کیا کیا دیکھتے پھریں، اِس لئے رُخصت۔

عبدالرحمٰن؛

ایک پرانا زمانہ

اور

ٹوٹے کنوؤں کی سیر

اب سے کئی جگ پہلے اسی بھارت ورش بلکہ اسی دلّی میں ہندو مسلمان نہایت پیار و اخلاص سے رہا کرتے تھے۔ گو مسلمانوں کی حکومت گئے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ مگر ایک ہوا میں سانس لینے والے۔ ایک ان جل سے زندگی بسر کرنے والوں میں بھائی بھائیوں کی طرح سے میل جول تھا۔ شادی، بیاہ۔ موت، زندگی غرض دنیا کے ہر کام میں وہ ایک دوسرے کے شریک تھے۔ بلکہ ہاٹ بازار۔ رستہ۔ گلی میں جب کوئی ہم محلہ یا پاس پڑوسی ایک دوسرے سے مل جاتا تو صاحب سلامت کے بعد وہیں کھڑے کھڑے کئی منٹ تک ایک، دوسرے کی خیر صلاّ اور خانگی معاملات پوچھتے پوچھتے ہونٹ خشک ہو ہو جاتے تھے۔ مثلاً تمہارے گھر میں خیریت تو ہے؟ بال بچے اچھے ہیں؟ گذارے کی کیا شکل ہے؟ اگر خدانخواستہ کسی کے ہاں دکھ بیماری ہو جاتی تو یہ میرا چشم دید واقعہ ہے بغیر کسی مزدوری یا صلے کے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ اپنی اپنی معلومات سے فائدہ پہونچاتے اور اڑے کھڑے وقت میں تو عورت مرد۔ بوڑھے نوجوان سب کے سب سگے بھائی بہنوں کی طرح ایک دوسرے پر ہاتھوں چھاؤں کرنے لگتے۔ چھوٹے کی چھٹائی، اور بڑوں کی بڑائی کا اس زمانے میں خاص امتیاز تھا۔ آپس میں حصّہ بخرا۔ لین دین۔ بنج بیپار۔ اس عام محبت اور بے فکری کے ساتھ ہوتا کہ اُس وقت میں اور آج کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

بلا مبالغہ ایک روپیہ کے ۳۰ سیر گیہوں۔ من بھر کے چنے۔ خالص بالکل خالص ڈھائی تین سیر کا گھی، جواب قیامت تک نہیں مل سکتا، کھلے بندوں پڑا بکتا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک روپے کا آٹا دو میاں بیوی ایک مہینے تک خوب للے تللے سے کھا کر بھی تمام نہیں کر سکتے تھے۔ دودھ۔ دہی۔ مکھن ایسا نرویا اور خالص کہ جنہوں نے کھایا ہے بس وہی خوب جانتے ہیں۔ تیل، لکڑی، ڈنگری، افراط کے ساتھ ملتے تھے۔ ساگ پات اور ترکاری تو کوڑیوں کے مول بکتی تھی۔ جس کا جی چاہے الغاروں لیلے، کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ غریب غربا نہیں، امیر لوگ کھاتے پیتے آدمی ایک پیسے میں چار سودے لینے کے عادی تھے۔ اس پر بھی ملک میں کسی قسم کی بے چینی، پریشانی یا عام گھبراہٹ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ جسے دیکھو ہندو مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی، سکھ اِس سرے سے اُس سرے تک ہنسی خوشی اور امن چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔

دلّی! ہائے وہ پچاس برس پہلے کی دلّی بس کیا کہوں؟ شہر کیا تھا ایک گلزار تھا گلزار۔ فتح پوری سے لیکر چاندنی چوک گھنٹہ گھر، فوارہ اور پھر خونی دروازے سے دھر لال قلعہ تک شام کے وقت اگر تھالی پھینکو تو سروں

ہی سروں پر چلی جائے۔ دوسری طرف نیا بانس۔ لال کنواں۔ حوض قاضی اور پھر چاوڑی بازار سے جامع مسجد تک ایک عام تفریح گاہ تھی کہ شہر کے امیر و غریب روزانہ بنے سنورے۔ کچھ پیدل کچھ اپنی اپنی سواریوں میں گل گشت کرتے نظر آتے تھے۔ تیس ہزاری کی طرف ٹھیک دوپہر کو جہاں اب لارڈ ڈفرن کا پُل ہے بلکہ اس سے ذرا آگے جہاں نہر سعادت خاں لہریں لیتی تھی گرمی کے موسم میں یہ غریبوں کے لئے ایک جنت کا ٹکڑا تھا جس کے دونوں کناروں پر صدہا سایہ دار درختوں کا جھرمٹ تھا۔ شوقین تیراک پل پر سے کودتے تھے۔ قسم قسم کی تیرایاں دکھاتے تھے۔ شیخو والے۔ نہروں والے، اور خدا جانے کون کون والوں میں مقابلہ ہوتا تھا اور خلق خدا، سب سے زیادہ کارخانہ دار لوگ بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

دو طرفہ سودا سلف بیچنے والوں کے خوانچے۔ پھول والوں کے سبد گل۔ لال لنگیاں باندھے سقوں کے کٹوروں کی جھنکار ہر آیند و روند کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ جا بجا مسلمانوں اور ہندوؤں کی سبیلیں، پیاؤ جن سے عام مخلوق سیراب ہوتی اور کوئی کسی سے دوسراہٹ کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، چاوڑی بازار تو ہر شام کو سچ مچ کا شاہی بازار بن جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مغلیہ بازار میں خرید و فروخت کرنے والے سب کے سب فرقہ اناث سے تھے اور یہاں سب مرد۔ شوقین جیوڑے اکثر وجیہہ و شریف، کچھ اہل حرفہ بقدر مقدرت اچھے اچھے لباس پہنے بنے سنورے نکلا کرتے تھے۔ کوئی بادپایہ سوار ہے۔ کوئی فٹن خود ہانک رہا ہے۔ عطروں میں بسے پھولوں کے آڑے کنٹھے پہنے ادھر ادھر گذر جاتے تھے۔ کہیں نفیری بج رہی ہے۔ کہیں خوش گلو باجے پر گا رہے ہیں، کہیں چوک میں حقے والے ساقی۔ حقے لئے کھڑے ہیں۔ غریب غربا چلتے چلتے ٹھہر جاتے، دو کش لگاتے اور پیسہ دو پیسہ ہاتھ پر دھر یہ جا وہ جا۔ مگر آج وہی دلّی ہے، وہی شہر۔ مگر وہ حالت نہیں۔ نکبت ادبار اور عام افلاس نے خلق خدا کی صورتیں تک بگاڑ دی ہیں۔ نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ نوجوانوں کی لال سی جانیں خودکشی کی نذر ہوتی ہیں۔ روزگار نایاب۔ علم و ہنر گو پہلے سے چہار چند ہے اس پر بھی فراغت اور اطمینان قلب نایاب۔ حالانکہ ملک میں ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ زراعت اور غلہ کی پیداوار دگنی چوگنی ہو گئی ہے۔ خام چیزوں کی مانگ بہت زیادہ۔ آبپاشی کی کثرت۔ لیکن اس پر بھی جہاں دیکھو خاک اُڑ رہی ہے اور بیٹھے نان شبینہ کو محتاج۔

اسی زمانے میں ٹوٹے کنویں کی سیر

اب میں پچاس برس پہلے کی ایک رنگیلی صحبت کا ذکر کرتا ہوں۔ جس سے صاف معلوم ہو جائیگا وہ کیسا امی جمی اور بےفکری کا زمانہ تھا۔ آہ یاد بخیر وہ برسات کا موسم۔ ساون بھادوں کی گھٹائیں دن رات جھوم جھوم کر برستی تھیں۔ کبھی ابر محیط آسمان رہتا۔ کبھی رنگا رنگ لیلے گیلے پھرنے لگتے۔ کئی کئی شوخ و شنگ ہمجولی مختلف رنگ کے لباس پہنے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محو گلگشت ہیں۔

شُدہ شُدہ کبھی پھر یکایک ایسی اندھیری چھا جاتی کہ بلا مُبالغہ دن پر اچھی خاصی رات کا دھوکا ہو ہو جاتا۔ غرض اسی تاریکی میں پھر جو بجلی چمکتی تو سفید بُراق بگلوں کی لمبی قطار آسمان پر ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے گوری کی آنکھوں میں کاجل۔

بس اِسی عالم میں اکثر شوقین جیوڑے سیلانی پنچھی گویا اس شعر کا اعادہ کرتے گھروں سے نکل پڑتے ؎

کبھی ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں برسے ؛ ایسا برسے مرے اللہ کہ چھاجوں برسے

ابھی برسا ابھی پھر کھُل گیا۔ ابھی پھر دُھواں دھار برسنے لگا۔ وہ بجلی کا رہ رہ کر کوندنا۔ وہ بادل کی گرج اور گرج کے ساتھ ہی بار بار وہ موروں کا جھنکارنا، کوئل کی کوک، پپیہے کی الاپ، ان چیزوں کو کچھ انہیں دلوں سے پُوچھیئے جو قدرت کے کرشموں کے والہ و شیدا ہیں۔ یا ازلی لٹے ہوئے لوگ۔

الغرض اب سے پچاس برس پہلے بالکل ایسا ہی اک فرحت افزا دن تھا جبکہ برسات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ع سرد و بستاں یا د و ہا ئیدن۔ کے موافق چند حسین حسین صورتوں کو لال سبز پڑیوں پر ساون کا جھولا جھولنے اور ملار گانے کے لئے دریائے جمنا کے کنارے ٹوٹے کنویں تک کھینچ لائی تھیں جسکو آج تک دلی والے کمبو د دروازہ یا لنگاہِ موت کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ پارٹی کی پارٹی عورتیں اور مرد شکرم گاڑیوں میں لدے پھندے آموں کے ٹوکرے۔ جامنوں کے چھبیے، فرش فروش اور سامانِ خورد و نوش لئے لبِ سڑک آ اُترے۔ گاڑیوں کو تو وہیں چھوڑا، پھر سب کے سب ہنستے کھیلتے پاس ہی ایک آم کے تختہ میں آ براجے۔ یہاں آتے ہی دم کے دم میں ڈیرے ڈنڈے ڈالدیئے، فرش بچھ گئے کڑاہیاں چڑھ گئیں۔ آم اور جامنوں کے ڈھیر لگا دئے۔ اوّل اوّل دسترخوان بچھے۔ سبنے مل کر کھانا کھایا اور پھر سب نے ہاتھ مُنہ دھو، پانوں کی گلوریاں رچا۔ ایک ایک جوڑی باری باری سے جھولنے لگی۔ اُس وقت ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی۔ جو یکایک سامنے سے ایک حسین ترین جوان ملاگیری رنگ کا نیچا کرتہ پہنے، شہزادوں کی سی اُونچی سلمہ کی سر پر، دلی کی سپاٹ سلیم شاہی پاؤں میں، جوانی کے نشے میں جھومتا جھامتا ادھر ہی آتا دکھائی دیا۔ بس اسے دیکھنا تھا کہ وہ سب کی سب حسین صورتیں مارے خوشی کے پھول کی طرح کھِل گئیں بلکہ کھِلکھلاتی ہنستی دوڑی ہوئی اُس کے خیر مقدم کو گئیں۔ وہ آئے وہ آئے صاالعالم، بس ہماری سیر پوری سُہاگن ہوگئی۔ یہ لفظ گویا ہر اک کے ترجمانِ دل تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ حسین جوان بھی خوش خوش وہیں آ بیٹھا۔ پہلے تو اپنے میزبانوں کی خاطر سے کچھ مُنہ جھٹلالا، اور پھر باری باری سے ہر ایک کے ساتھ جھولا جھولنے لگا۔ چنانچہ اسی طرح باری باری سے ہر جوڑی پاؤں جوڑ کر جھولتی اور باقی سب کے سب کھڑے ہو کر جھونٹے دیتے تھے اور زبان سے کہتے جاتے "آتے بدروا کارے کارے" بیشک ان میں سے کئی خوش گلو تھے۔ اُنھوں نے اس ملار کو اس خوبی سے گایا کہ ایک سماں بندھ گیا۔ طرہ یہ کہ اس پر ہر اچھی صورت نے اداکاریاں بھی کیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ جب اُس جوانِ رعنا کی باری آئی تو وہ ظالم کچھ اس بلا کا خوش گلو تھا کہ اُسنے اِن بولوں کو

"آسے بدروا کارے کارے۔ کارے کارے۔ آئے بدروا کارے" بغیر کسی اداکاری کے کچھ اس طرح گایا کہ سب پر اک عالمِ وجد طاری ہو گیا۔ بلکہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ گانا بھی ایک سحر ہے، جادو ہے، واقعی نعمت ہے خاص، جس کو وہ خالق عطا کرے۔

آغا شاعر قزلباش

گنگا کا کنارا

آنکھوں کو میسّر ہے یہ دلچسپ نظارہ ॥ تابندہ یہ ذرات یہ گنگا کا کنارا
اِس طرح سے دریا میں ہے موجوں کو تلاطم ॥ جیسے کوئی کرتا ہو اشارے پہ اشارا
یہ بھیگے ہوئے گیسوئے شب تا بہ کمر آہ ॥ ہر قطرۂ آبی ہے غرض چرخ کا تارا
گرمی کی ہواؤں کا شب انداز ترنم ॥ جیسے کہ کہیں دُور پہ بجتا ہو چکارا
مصروف ہے اشنان میں اک حُسن سراپا ॥ فردوس تماشا ہے یہ گنگا کا کنارا
یہ جسم حسیں چاند سے تابندہ ہے زائد ॥ اور چاند کو عالم نہیں ہوتا یہ گوارا
وہ ابر کے پردے میں چھُپا شرم کے مارے ॥ کیا مُنہ کسے دکھائے وہ بھلا شرم کا مارا
اشنان سے فارغ ہوئی وہ حُسنِ مجسم ॥ دیکھا تو کنارے پہ ہے اک درد کا مارا
آنکھوں میں بھرے اشک ہیں چہرے پہ اُداسی ॥ چلتا ہے وہ ہر گام پہ لے لے کے سہارا
پہچان گئی دیکھ کے وہ مردِ حزیں کو ॥ کہنے لگی یہ ہو گیا کیا حال تمہارا
اِک درد اُٹھا قلب میں آنسو نکل آئے ॥ اب چیخ کے رونے ہی لگا درد کا مارا
کہنے لگا اے جان تمنّائے دل و جاں ॥ وہ کیا کرے جسکو کہ نہ ہو تیرا نظارہ
تب حُسن یہ بولا ترے جذبے کے تصدق ॥ اے کاش کہ ہو جائے تجھے ضبط کا یارا
فانی ہے مرا حُسن مرا روپ ہے فانی ॥ فانی مرا پیکر ہے یہ فانی ہے نظارا
جس نے مجھے پیدا کیا وہ خالقِ عالم ॥ تُو اُسکو ذرا دیکھ کہ کس درجہ ہے پیارا

تُو دیکھ ذرا جلوۂ لیلائے حقیقی
پی جھوم کے پی ساغرِ صہبائے حقیقی

خزانچی کی بیٹی

خزانچی کی بیٹی کے دلچسپ انتقام کی داستان بغداد سے عراق عجم تک مشہور رہی۔ اسکو خود موصل کے بادشاہ نے اپنی زبان سے بیان کیا کہ جب میں شاہزادہ تھا اور میری عمر بیس سال کے قریب پہونچی تو میرے باپ نے چاہا کہ میری شادی کردیں۔ انکے اشارے سے میری والدہ نے محل میں ان لڑکیوں کو بلایا جن کے باپوں کی طرف سے پیغامات آئے تھے۔ پھر مجھے طلب فرمایا کہ دیکھکر ان میں سے اپنے لئے منتخب کرلوں۔ ایک سے ایک بڑھکر حسین تھی مگر کوئی بھی میرے دل کو نہیں کھینچ سکی۔

میرے باپ کو سخت تعجب ہوا۔ مگر وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے کہ اس میں تقدیر کا کوئی بھید ہے۔ اُنھوں نے میرے دل میں بغداد دیکھنے کا بہت شوق پایا اِس لئے اجازت دیدی اور سفر کا سازوسامان درست کرکے ایک محافظ دستہ بھی ساتھ کردیا تاکہ میں جسوقت بغداد میں پہونچوں تو معلوم ہوجائے کہ موصل کا ولی عہد آیا ہے۔

راستہ میں ایک مقام پر لٹیرے بدوؤں کی جماعت ہمارے اوپر آپڑی۔ ہرچند کہ ہم نے بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ غالب آگئے اور اُنھوں نے ایک ایک کو قتل کرڈالا صرف میں باقی رہ گیا۔ جب میری طرف بڑھے تو میں نے ڈانٹ کر کہا کہ میں موصل کا ولی عہد ہوں کیا تم بادشاہوں کے اُوپر بھی ہاتھ اُٹھانے کی جرآت کرنے لگے۔ اُن کے سردار نے ہنسکر کہا کہ تم سے بہتر شکار ہمکو دوسرا کہاں ملے گا۔ تمہارے باپ نے ہمارے بہت سے آدمی مارے ہیں اُن کا بدلہ ہم تم سے لیں گے اُنھوں نے مجھکو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ اس جگہ لائے جہاں اُن کے ڈیرے تھے۔ مجھکو ایک درخت سے باندھدیا اور خود کھانے پینے میں مشغول ہوگئے۔

میں اپنی اِس مصیبت پر آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر روتا تھا۔ خدا کی شان کہ وہ جوں ہی فارغ ہوئے اُن کے جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ تاجروں کا ایک قافلہ فلاں راستہ سے گزرنے والا ہے۔ سب کے سب اُسی وقت مسلح ہوکر روانہ ہوگئے اتفاق سے ایک بوڑھی عورت اس درخت کی طرف آئی جس سے میں بندھا ہوا تھا۔ وہ میری حالت دیکھنے لگی پھر بولی کہ کیا تیری ماں زندہ ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ اُسکو میری جوانی پر ترس آگیا۔ رسّیاں کاٹ دیں اور ایک سمت اشارہ کیا کہ بھاگ جا۔

میں دن بھر اور رات بھر برابر چلتا رہا۔ جب اُجالا ہوا تو دیکھا کہ کچھ لوگ گدھوں پر سامان لادے لئے جارہے ہیں۔ قدم بڑھاکر اُن سے پوچھا کہ بغداد کا راستہ کدھر ہے۔ بولے کہ ہم وہیں چل رہے ہیں تم ساتھ ہوجاؤ۔ اُنہوں نے جب سنا کہ میں لٹا ہوا پردیسی ہوں تو بہت مہربان ہوگئے۔ تیسرے دن ہم بغداد میں داخل ہوئے۔

وہاں نہ میں کسی کو جانتا تھا نہ کوئی مجھے۔ ناچار ایک مسجد میں چلا گیا۔ دوسرے دن جب بھوک نے ستایا تو روزی کی تلاش میں نکلا۔ ایک جگہ ایک حویلی دیکھی جس میں سے غربا روٹیاں لے کر نکل رہے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ خزانچی کا مکان ہے جس کے یہاں ہر جمعرات کو غریبوں کو کھانا کھلایا اور تقسیم کیا جاتا ہے۔ میں اندر چلا گیا۔ ایک حبشی خادم نے کھانا سامنے لاکر رکھا۔ ابھی فارغ نہیں ہوا تھا کہ زنانخانے کے پردے سے ایک نوجوان لڑکی نے سر نکالکر خادم کو

بلایا اور کچھ کہا۔ میں نے ایسی حسین شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی صورت میری آنکھوں سے دل تک اُتر گئی۔ اور محبت کا شعلہ ایسا بھڑکا کہ دماغ تک پہونچگیا۔ قریب تھا کہ میں دیوانہ ہو جاؤں۔ کھانے کے بہانے سے دیر تک بیٹھا رہا۔ خادم بیدھا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ یہ کون تھی جس نے تم کو بلایا تھا۔ بولا کہ ہمارے آقا کی بیٹی زمرد خاتون جو کہہ رہی تھیں کہ اگر کھانا کم ہو تو اندر سے اور منگا لو۔

اب میں وہاں سے اُٹھا اور ایک طرف کو حیران و سرگرداں چل نکلا۔ آج تک میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا بلا ہے۔ مگر اس غربت میں یہ مصیبت بھی سر پر پڑگئی۔ دل کو کسی طرح قرار ہی نہیں آتا تھا۔ چلتے چلتے شہر سے باہر نکل گیا اور ایک قبرستان میں پہونچا۔ شام ہوگئی تھی جاتا تو کہاں جاتا۔ تکیہ ہی میں ایک دیوار کے قریب بیٹھکر اپنی حالت پر رونے لگا۔ جب اندھیرا ہوگیا تو کچھ آہٹ سنائی دی اور دیکھا کہ دفعتہً چار آدمی میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ پوچھنے لگے کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا آفت کا مارا پردیسی۔ وہ غور سے دیکھتے رہے پھر بولے کہ ہمارے ساتھ چلو۔ مجبوراً اُنکے ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دور چلکر وہ ایک تہ خانے میں اُترے۔ کھانا لائے خود بھی کھایا اور مجھکو بھی کھلایا۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوا کہ پیشہ ور چور ہیں کیونکہ وہ آپس میں ایک بڑی چوری کا ذکر کر رہے تھے۔ جو اُنھوں نے حال ہی میں کی تھی۔ مجھکو جوان اور پردیسی پاکر اپنے ساتھ شریک کرنا چاہا۔ کہنے لگے کہ ابھی ہم ایک مہم پر روانہ ہونے والے ہیں، تم کو چلنا ہوگا۔ میں نے دل میں کہا کہ اب یہ تیسری اُفتاد مجھ پر پڑی جس کا خدا ہی جانے کیا انجام ہو۔ ڈرتا تھا کہ اگر انکار کروں تو مار ڈالیں گے۔ بیٹھا دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ ناگاہ باہر سے شور سنائی دیا جس کے ساتھ ہی بہت سے سپاہی اندر آگئے اور ہم سب کو گرفتار کرکے شہر میں لائے۔ رات بھر بند رکھا۔ صبح کو کوتوال کے سامنے پیش کیا۔

چور جانے پہچانے ہوئے تھے اُنکو اپنے جرم کا اقرار کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ میں ایک پردیسی آدمی ہوں گرفتاری سے صرف گھڑی بھر پہلے ان لوگوں نے قبرستان سے اپنے ساتھ پکڑ لیا تھا۔ چوروں نے بھی اس کی تصدیق کی اس وجہ سے کوتوال نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر اپنے پاس رکھ لیا۔ معلوم نہیں کہ اس کی غرض کیا تھی۔ چند روز کے بعد وہ بہت مہربان نظر آنے لگا۔ میں نے اپنی شاہزادگی کا ذکر تو اس سے نہیں کیا لیکن خزانچی کے گھر جو واقعہ پیش آیا تھا بیان کر دیا۔ اس اُمید پر کہ شاید کوئی صورت وہ نکال سکے۔ پہلے وہ خاموش رہا پھر بولا کہ مشکل یہ ہے کہ میرے اور خزانچی کے درمیان پرانی عداوت چلی آتی ہے وہ میری بات کیونکر مانیگا مگر تاہم تم صبر کرو میں کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالونگا۔

چند روز کے بعد اُس نے تنہائی میں مجھے بلایا اور کہا کہ میں نے ایک اچھی تدبیر سوچ لی ہے۔ مگر تم اپنے آپ کو بصرہ کے قاضی کا بیٹا بتانا۔ پھر مجھے اچھے کپڑے پہنا کر ایک حجرہ میں بٹھا دیا اور اپنے خاص ملازم کو خزانچی کے پاس بھیجا کہ ایک ضروری معاملہ میں گفتگو کرنی ہے اگر قدم رنجہ فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ خزانچی اس سے خوف زدہ تھا۔ فوراً آیا۔ کوتوال نے نہایت اعزاز کے ساتھ اسکو مسند پر بٹھایا اور کہنے لگا کہ میرے اور آپ کے درمیان رنجش ہے۔ جس سے میں نادم ہوں۔ عرصہ سے میری خواہش ہے کہ آپس میں صفائی ہو جائے۔ اب خدا نے اس کے لئے ایک اچھی صورت نکالدی ہے۔ اسلئے میں نے آپکو تکلیف دی۔ وہ یہ ہے کہ بصرہ کا قاضی میرا ماموں ہے اُسکا بیٹا آپکی لڑکی کی خوبیوں کو

سُن کر میرے پاس آگیا ہو اور میرے ذریعہ سے نکاح کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ہوجائے تو ہم آپ ایک ہو جائیں گے۔ لڑکا حُسن وجمال میں یکتا اور علم وادب میں فائق ہے۔ یہ کہہ کر مجھے بلایا۔ خزانچی نے دیکھا۔ گفتگو کی اور بہت پسند کیا۔ گھر جاکر منظوری کا پیغام بھیجدیا اور دن مقرر کردیا۔ تاریخ پر کوتوال نے لوگوں کو جمع کرکے شادی کی محفل آراستہ کی۔ اور نکاح ہوگیا۔ خزانچی مجھکو اپنے گھر لایا۔ وہاں عورتیں جمع تھیں۔ گا رہی تھیں۔ سب نے مجھکو دیکھا اور تعریف کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ زمرد میری صورت۔ بات چیت خاصکر محبت کو دیکھکر بیحد خوش ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو جب اُٹھکر ہم مُنہ دہو رہے تھے کوتوال کا آدمی میرے وہ میلے کپڑے لئے ہوئے آیا جو اس وقت میرے جسم پر تھے جب میں گرفتار ہوا تھا۔ اور کہا کہ یہ اپنے کپڑے لو اور کوتوال صاحب کے کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں واپس کرو۔ یہ سُنکر گھر کے لوگ گھبرائے۔ میں بھی حیران ہوا اور زمرد مبہوت ہوکر مجھے دیکھنے لگی۔ اب میں نے ساری داستان سچّی سچّی کہہ سُنائی۔ زمرد کو میری باتوں پر یقین آگیا۔ وہ خوش ہوگئی۔ نیا لباس منگاکر مجھے دیا اور کوتوال کے کپڑے واپس کردئے۔ پھر بولی کہ کوتوال نے ہمارے گھر بھر کو ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے میں اس سے بدلہ لونگی اور اپنا سکو نہیں اسکا قرض اداکرونگی جن سکو نہیں اس نے دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اُس نے دہوکا دینے کے لئے مجھے قاضی زادہ بتایا مگر حقیقت میں میں شاہزادہ ہوں لہذا اسکی شرارت سے نقصان کیا پہونچا۔ جس کا بدلہ لینا ضروری ہو۔ مگر عورت جب انتقام پر اُتر آئے تو دُنیا کی کوئی طاقت اُس کو روک نہیں سکتی۔ بولی کہ تمہاری شہزادگی کا معاملہ نہیں ہے تم اگر شہزادے نہ بھی ہوتے تو میرے لئے تمہاری محبت کافی تھی۔ مگر اُس نے دوست بنکر دشمنی کی ہے اس لئے بدلہ لینا لازم ہے۔ تم اجازت دیدو۔ میں نے کہا کہ اگر تمہاری رائے یہی ہے تو بہتر ہے۔

اُس نے سادہ لباس پہنا، اُوپر سے ایک معمولی چادر لپیٹ لی اور اکیلی کوتوالی پہونچی۔ وہاں ایک طرف الگ کھڑی ہوگئی۔ کوتوال نے آدمی بھیجکر دریافت کیا کہ کس لئے آئی ہے۔ جواب دیا کہ ایک نہایت اہم ضرورت سے، جسکو تنہائی میں کوتوال صاحب سے عرض کرونگی۔ اُس نے ایک حجرہ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود وہاں گیا۔ زمرد نے اُس کے سامنے اپنے چہرے کو کھولدیا اور کہا دیکھئے کیا میں اندھی ہوں؟ کیا میرا چہرہ کالا ہے؟ کوتوال دیکھکر مدہوش ہوگیا، کہنے لگا نہیں نہیں، یہ آنکھیں حور کی ہیں، یہ چہرہ پری کا ہے جوان آنکھوں کو اندھا اور اس چہرے کو کالا بتائے وہ خود اندھا ہے، مگر اس سے مطلب!!

بولی کہ میں آپ سے باتیں کررہی ہوں اور آپکی باتیں سُن بھی رہی ہوں، کیا گونگی ہوں کیا بہری ہوں؟ بولا کہ ہرگز نہیں جو ایسا کہتا ہے اُس پر خدا کی لعنت۔ مگر مدعا تو کہو۔

اب اُس نے چادر اُتاردی اور حجرہ میں خرامِ ناز سے چلنا شروع کیا اور کہا کیا میں لنگڑی ہوں کیا میرے پاؤں مفلوج ہیں؟ بولا کہ خدا کی قسم ایسی خوشنما رفتار اور ایسے خوبصورت پاؤں آج تک میں نے نہیں دیکھے کس کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں جو تم کو لنگڑی کہتا ہے۔ مگر غرض تو بتاؤ یا محض ستانے کے لئے آئی ہو۔ وہ تن کر کھڑی ہوگئی اور بولی

کہ کیا میں کُبڑی ہوں۔ پھر بال کھولدئے اور کہا کہ کیا میں گنجی ہوں؟ بولا کہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو تمہارا قد سرو ہے اور تمہاری زلفیں سنبل۔ مگر مقصد تو بیان کرو یا مار ڈالنا ہی منظور ہے۔

اُس نے کُرتہ کی آستینیں چڑھالیں اور دونوں کلائیاں اُس کے سامنے کرکے بولی کہ جناب کیا میں لولی ہوں کیا میں لُنجی ہوں؟ بولا کہ کون مردود ہے جو ایسا کہتا ہے یہ کلائیاں بلور اور یہ حنائی ہاتھ چنار کے پنجوں سے بڑھکر ہیں۔ مگر کچھ کہو بھی تو۔ میں تو دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔

اب وہ چادر اوڑھکر بیٹھ گئی اور غمگین آواز میں کہنے لگی کہ جناب میں ایک رنگریز کی بیٹی ہوں جسکے دل میں نہیں معلوم کیا سمائی ہے کہ وہ اپنے گھر سے مجھکو نکالنا نہیں چاہتا۔ جہاں جہاں سے شادی کے پیغام آئے کسی سے کہدیا کہ میری بیٹی گونگی اور بہری ہے۔ کسی کو جواب دیا کہ لولی اور لنگڑی ہے۔ کسی کو یہ کہکر ٹالدیا کہ اندھی ہے اور اپاہج۔ یہاں تک کہ اب پیغام آنے بھی بند ہوگئے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں بھی دوسری عورتوں کی طرح سینے میں دل رکھتی ہوں کب تک یہ ظلم وستم سہتی اور اس کے گھر میں پڑی سڑتی رہوں۔ کوتوال نے پوچھا کہ آخر کوئی وجہ بھی ہے بولی کہ وجہ تو اسی سے پوچھنی چاہیئے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اُس نے تو اس قدر سختی کی ہے کہ نہ مجھے کہیں نکلنے دیتا ہے نہ کسی عورت کو گھر میں آنے دیتا ہے۔ بڑی تدبیروں سے آج گھڑی بھر کے لئے نکلکر آپ کے یہاں آسکی ہوں۔ آپ حاکم ہیں اور اللہ نے آپکو غریبوں اور بیکسوں کا فریادرس بنایا ہے میری مدد کیجئے۔ ورنہ گھٹ گھٹ کر مرجاؤنگی۔ یہ کہتے ہوئے رونے لگی۔

کوتوال نے کہا کہ میں پوری مدد کرونگا اور خدا نے چاہا تو بہت جلد اس مصیبت سے رہائی دلاؤنگا۔ یہ سُنکر وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی اُٹھی۔ کوتوال نے گردن جُھکاکر کہا کہ محترمہ اگر میں اپنا پیغام آپکے لئے بھیجوں تو ناپسند تو نہ کروگی؟ بولی۔ جناب اس سے بڑھکر کونسی عزت مجھکو حاصل ہوسکتی ہے۔ بولا بس بس پھر اطمینان رکھئے سب کچھ ہوجائیگا۔ پتہ کیا ہے؟ بولی۔ پُل کے متصل۔ لال دریبہ۔ عبدل رنگریز کا مکان جس کے آگے کھجور کا درخت ہے۔ کوتوال نے کہا جایئے میں کارروائی شروع کئے دیتا ہوں۔

زمرد کوتوالی سے سیدھی میرے پاس آئی۔ سارا ماجرا سُنایا۔ ہم دونوں خوب ہنسے۔ اُدھر کوتوال نے ایک آدمی عبدل رنگریز کے پاس بھیجا۔ وہ ڈرتا ہوا آیا مگر دیکھا کہ توقع کے خلاف کوتوال صاحب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مزاج پُرسی کے بعد اندر حجرہ میں لیجاکر بٹھایا اور کہا کہ سُننے میں آیا ہے کہ آپکی لڑکی جوان ہے اس لئے آپکو تکلیف دی ہے کہ ایک پیغام پیش کروں۔ عبدل نے کہا مگر وہ تو اندھی اور اپاہج ہے۔ کوتوال مُسکرایا اور بولا کہ ہاں وہ ایسی ہی ہوگی لیکن اگر اس پر بھی کوئی بیاہنے پر راضی ہو تو۔ اُس نے کہا جناب وہ لنگڑی اور لُولی ہے۔ کوتوال دل میں خوش ہوکر بولا کہ بالکل صحیح مگر دُنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ عبدل نے کہا بھلا ایسا کون ہے جو ان عیبوں کے ہوتے ہوئے بھی اُس سے نکاح کرلے۔ بولا کہ وہ یہی شخص ہے جو آپکے سامنے بیٹھا ہے۔ عبدل نے چلّا کر کہا خدا گواہ ہے وہ آپکے قابل ہرگز نہیں۔ بولا کہ اس سے آپکو کیا۔ میں ان تمام عیوب کے ساتھ بھی شادی پر رضامند ہوں۔ عبدل نے دل میں سمجھ لیا کہ معلوم ہوتا ہے اسکو کسی نے دھوکا دیا ہے۔ مجبوراً کہا کہ اگر آپکو اصرار ہے تو پھر مجھے بھی انکار نہیں۔

کوتوال منظوری سُنکر خوش ہوا اور بولا کہ مہر کیا ہوگا۔ عبدل نے سوچا کہ جب یہ ایسا متوالا ہورہا ہے تو کمی کیوں کی جائے، کہنے لگا کہ ایک ہزار اشرفی۔ اُس نے قبول کرلیا۔ اور اُسی وقت قاضی اور اپنے احباب کو بُلوایا۔ عبدل نے مجمع کے سامنے کھڑے ہوکر کہا کہ یہ شادی کوتوال صاحب اپنی مرضی سے کررہے ہیں۔ میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ کوئی جسمانی عیب ایسا نہیں ہے جو میری لڑکی میں نہ ہو۔ لہذا بعد میں میرے اوپر الزام نہ رکھا جائے۔ کوتوال نے کہا کہ تمہارے اُوپر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس کے بعد قاضی نے نکاح پڑھایا اور مہر عبدل کے حوالے کردیا۔ وہ لیکر روانہ ہوا اور کہہ گیا کہ گھر پہونچکر میں لڑکی کو رُخصت کئے دیتا ہوں۔

اُدھر کوتوال کی بیوی کو گھر میں جب اس شادی کی اطلاع ہوئی تو اُس نے اُسی وقت اُسکو بلُایا اور گریبان پکڑکر کہا کہ میں ہرگز کسی سوکن کے ساتھ نہیں رہ سکتی مجھکو ابھی طلاق دو۔ نئی شادی کے نشہ میں بیوی کو طلاق دیدی، وہ سوار ہوکر اپنے میکے کو چلی گئی۔

اب کوتوال نوعروس کا انتظار کرنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چار آدمی ایک صندوق اُٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اب تک اسی خیال میں تھے کہ رنگریز کی بیٹی نے جو کچھ کہا ہے سچ ہو۔ سب کو ہٹادیا اور خود آکر صندوق کا پردہ کھولا۔ دیکھا تو اُسمیں ایک اندھی اپاہج۔ کالی زندہ لاش رکھی ہوئی ہے۔ مُنہ سے چیخ نکل گئی اور سر پکڑکر بیٹھ گئے۔ اب سمجھ میں آیا کہ کتنا بڑا دھوکا کھایا۔

بغداد کی گلی گلی میں یہ داستان پھیل گئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کس نے یہ چکمہ دیا۔

چند روز کے بعد خزانچی کے مشورہ سے میں خلیفہ کی قدمبوسی کے لئے گیا۔ انکو جب معلوم ہوا کہ میں موصل کا ولی عہد ہوں تو خوش ہوکر سینے سے لگالیا اور کہا کہ ہم تو تمہارے انتظار میں تھے، دیر کیوں ہوئی؟ میں نے سفر کا واقعہ بیان کیا، فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے تم کو سلامت رکھا مگر تم نے ناحق شرم کی جس حالت میں بغداد میں پہونچے تھے ہمارے پاس آنا چاہیئے تھا۔ تمہارا باپ ہمارا دوست ہے۔ اُنہوں نے قصر خلافت میں ایک حصہ مخصوص کرکے مجھکو حکم دیا کہ معہ اپنی بیوی کے وہاں رہوں۔ اسی درمیان میں خبر آئی کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ مجھے بہت رنج ہوا۔ خلیفہ نے تسلی دلائی اور پھر تین ہزار فوج کیساتھ ہم کو موصل کی طرف روانہ کیا۔ یہاں ہم جس روز پہونچے سارے شہر نے استقبال کیا۔ پھر میری تخت نشینی کا جشن منایا گیا۔ اب میں بادشاہ ہوں اور زمرد ملکہ۔ جب کبھی رنگریز کے داماد کا ذکر آجاتا ہے تو ہم خوب ہنستے ہیں ؂

اسلم جیراجپوری؛

چغتائی نمبر

دلّی جون بدلتی ہے

پہلے اندر پرست میں دلی کی نیو پڑی تھی، جہاں آج کل پرانا قلعہ ہے۔ وہاں کیر و پانڈو نے اپنا شہنشاہی دربار "راج سوئیگ" کے نام سے کیا تھا اور اسی جگہ راجہ ششوپال نے سری کرشن جی کی توہین کی تھی اور کرشن جی کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔ اور اسی جگہ جوئے کی وہ مشہور بازی ہوئی تھی جس پر مہا بھارت جیسی عظیم الشان لڑائی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پھر اس جگہ نے جون بدلی اور شیر شاہ نے یہاں قلعہ بنایا۔ "دین پناہ" نام رکھا۔ ایک خوبصورت مسجد بھی بنائی اور ایک مکان بنایا جس کو شیر منڈل یا شیر منزل کہتے تھے۔ افغان حکومت کے خاتمہ کے بعد ہمایوں دلی میں دوبارہ آیا تو اسی شیر منڈل کے زینے پر چاند دیکھنے چڑھا اُترنے لگا تو پاؤں پھسلا، گر پڑا اور مر گیا۔ تاریخ ہوئی: "ہمایوں بادشاہ از بام افتاد"۔ اس قلعے کے غرب میں اکبر کی انا "ماہم انکہ" نے مسجد بنائی اور ایک مدرسہ بنایا جہاں اکبر بھی کچھ دن پڑھا۔ اور حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ بھی اسی مدرسے میں پڑھتے تھے اور اسی مدرسے کے بڑے دروازے کی بالائی کھڑکی میں ایک حبشی غلام چھپ کر بیٹھا تھا اور اس نے اکبر پر تیر چلایا تھا جبکہ وہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی زیارت کر کے واپس آ رہا تھا، اور تیر نے اکبر کے بازو کو زخمی کیا تھا۔ اور اسی مسجد اور مدرسے کے شمال میں دلی کا لال چوک تھا اور ایک عظیم الشان دروازہ تھا جس کے کھنڈر اب بھی باقی ہیں۔ اس لال چوک میں بڑے بڑے جوہریوں کی دوکانیں تھیں اور ایران اور سمرقند اور بخارا کے بڑے بڑے سوداگر ان دکانوں میں اپنا مال لئے بیٹھے رہتے تھے۔ وہ دکانیں اب بھی موجود ہیں۔ لال چوک سے شمال کی طرف بڑھیں تو سڑک کے غرب میں پہلے مرزا بیدل کا مزار ہے اور پھر حضرت ملک نور الدین یار پراںؒ کا مزار ہے اور سڑک کے شرق میں ٹیلے پر حضرت بابا ابوبکر حیدری طوسیؒ کا مزار ہے جہاں بانسوں پر بے شمار مٹکے ٹھلیاں اوندھی رکھی ہوئی ہیں۔

لال کوٹ اندر پرست دلی نے جون بدلی تو راجہ پرتھی راج نے لال کوٹ قلعہ بنایا۔ جہاں آج کل قطب مینار ہے۔ قطب الدین ایبک نے یہ قلعہ پرتھی راج کی فوج سے لے لیا۔ اور اسلامی دلی اسی جگہ آباد کر دی۔ ایبک کے بعد بلبن تک دلی یہاں رہی پھر اس نے جون بدلی۔ بلبن کے پوتے کیقباد نے جمنا کے کنارے بنوائے اور دلی آس پاس بسائی جہاں آج کل اوکھلے کا بند ہے۔ جلال الدین خلجی نے کیقباد کو قتل کر کے جمنا میں ڈال دیا۔ اور غلام خاندان کی حکومت جمنا میں اُس جگہ ڈوبی جہاں آج کل جامعہ ملیہ کی عمارتیں بنی ہیں، اور ڈاکٹر انصاری دفن ہوئے ہیں۔ جلال الدین کے بعد علاء الدین خلجی نے پھر دلی کی جون بدلی اور سیری کے نام سے دلی بسائی جس کے کھنڈر مقبرۂ صفدر جنگ اور قطب مینار کے بیچ میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ قطب الدین خلجی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا اور غیاث الدین تغلق نے حکومت حاصل کی تو دلی قطب مینار سے پانچ میل شرق میں چلی گئی اور تغلق آباد کا عظیم الشان قلعہ تیار ہوا۔ تغلق خاندان کا خاتمہ ہوا تو حکومت لودھیوں میں آئی اور انہوں نے چراغ دہلی کے قریب دلی بسائی۔ ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھ سے مارا گیا تو بابر نے قدیمی دلی پر قناعت کی۔ اس کے بیٹے ہمایوں کو شیر شاہ نے ایران بھگا دیا۔ جب وہ واپس آیا تو پرانے قلعہ کے پاس شیر شاہ کی بسائی ہوئی دلی میں رہنے لگا۔ اکبر کا عروج ہوا تو اس نے آگرہ بسایا۔ جہانگیر کے زمانے تک دلی پرانے قلعہ کے آس پاس رہی۔ شاہجہاں نے یہ شہر بسایا جس میں لال قلعہ ہے اور جامع مسجد کے جنوب میں اردو بازار ہے اور رسالہ ساقی کے اڈیٹر صاحب اس بازار میں بیٹھے ساقی

کا سالنامہ لکھا کرتے ہیں۔

اب انگریزوں نے شاہجہاں کی دلّی کے گوشۂ غرب وجنوب میں ایک نئی دلّی بسائی ہے جس کی عمارتوں کے مختلف نقشوں کو دیکھ کر کہا جاتا ہے "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا" اور حضرت اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

مری نظروں میں اب کچھ رنگِ دہلی جم نہیں سکتا　　وہی مٹّی کے تودے ہیں وہی جمنا کا پانی ہے

آواگون اور تناسخ جیو اور جان اور رُوح کے لئے ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دلّی بھی ایک "جیو" ہے اور ایک "جان" ہے اور ایک "رُوح" ہے۔ نئی دلّی کی عمارتوں میں کہیں رومنوں کا طرز تعمیر ہے کہیں یونانیوں کا کہیں جرمنوں کا کہیں ہندوؤں کا کہیں مسلمانوں کا اور کہیں جنّات کا۔ یہ خصوصیت دُنیا کے کسی شہر میں نہیں ہے کہ وہاں جنّات کا طرز تعمیر بھی ہو، میرانشاء نے لکھنؤ میں کوئی مہمل قطعہ تاریخ کسی مکان پر لکھا دیکھا تھا تو اُس کی ہنسی اڑائی تھی۔ نئی دلّی میں جاؤ تو ہنسی نہیں آتی بلکہ رونا آتا ہے۔ کروروں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا مگر اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے دلّی نے اس نئی دلّی کے جنم سے پہلے کوئی ایسا کھوٹا کرم کیا تھا کہ اس کو اس عجیب وغریب جون میں آنا پڑا۔

اُردو بازار

شاہجہاں کی بنائی ہوئی دلّی میں ایک اُردو بازار بھی تھا جس کے پاس اور بہت سے اچھے اچھے محلّے اور بازار تھے ۱۸۵۷ء کی ہلچل میں بقول مرزا غالب کے "انقلاب کا بندر آیا اور اس نے ان بازاروں کی گنبدیوں کو ہلا ہلا کر گرا دیا"۔ اب چاندنی چوک کی سڑک سے وکٹوریہ اسپتال تک ایک بڑا میدان سنسان پڑا رہتا ہے جس کو پریڈ کا میدان کہتے ہیں اور جس میں چاندنی چوک کی طرف دو مندر ہیں اور وسط میں حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کی درگاہ ہے اور جنوب میں ایڈورڈ پارک ہے اور غرب میں سرمد شہیدؒ کا مزار ہے۔ اس میدان کے جنوب میں نشاط ٹاکیز سنیما کی عمارت سے لیکر نقمان الملک حکیم نابینا صاحب کے مطب تک ایک لمبی سڑک چلی گئی ہے جس کے جنوبی کنارے کنارے بہت سے کتاب فروش اپنی دُکانیں سجائے بیٹھے رہتے ہیں اب اس بازار کا نام اُردو بازار رکھا گیا ہے کیونکہ اس بازار کے شمال میں جو چٹیل میدان پڑا ہے، ایڈورڈ پارک اور جامع مسجد کے بیچ میں، پُرانا اُردو بازار اسی جگہ تھا مگر اب وہاں پائخانے بنائے گئے ہیں تاکہ ایڈورڈ پارک اور جامع مسجد میں جانے والے اپنی انسانی ضروریات یہاں پوری کر سکیں۔ دلّی میونسپل کمیٹی میں جتنے ہندو مسلمان ممبر ہیں وہ اس عجیب انتخاب کے ذمہ دار ہیں مگر وہ بیچارے کیا کرتے، اس میدان کو لوگوں نے جنگل سمجھ رکھا تھا جہاں آزادی سے رات بھر کی کثافتیں دُور کی جاتی تھیں کمیٹی نے وہاں پردہ دار محفوظ جگہ بنا دی۔

تو اب سوچنا یہ ہے کہ دلّی نے جو اتنی جونیں بدلی ہیں تو اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ نئی دلّی کو تو دلّی کی جون نہیں کہہ سکتے۔ یہ جون تو نہ شرقی ہے نہ غربی، شمالی ہے نہ جنوبی۔ آسمانی ہے نہ کوہستانی۔ نہ جنّت سے اس کو کچھ تعلق ہے نہ دوزخ سے نہ اعراف سے۔ یہ ہے مگر نہیں ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو یہ ضرور ہے۔ اس واسطے میں تو ساقی کے سالنامے میں ایک نشہ پئے ہوئے آدمی کی طرح جھوم جھوم کر اور بہک بہک کر اور "شاہد" کے کندھے پر ہاتھ لٹکا کر یہ کہتا ہوں کہ دلّی اب جون نہیں بدلے گی، اس کا جنم تر اختم ہو گیا آواگون کا چکّر پورا ہو گیا۔ اب دلّی کو پورن موکش مل گیا اسلئے دلّی کہتی ہے ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را　　خاک بر سر کُن غمِ ایام را

افسانہ نمبر ۲

جب میں اپنی دونوں آنکھیں بند کئے جون کی ۵ تاریخ شام کے ۵ بجے خوب تیز لو اور گرمی میں بیٹھا ہوا یہ مضمون لکھوا رہا تھا تو میرے لڑکے علی نے کہا یہ مضمون سالنامے کے لئے نہیں ساقی کے "افسانہ نمبر" کیلئے

درکار ہے۔ میں نے کہا تو بیٹا میں بھی تو ایک افسانہ ہی لکھ رہا ہوں۔ ہر جون جو بدلتی ہے گذرا ہوا افسانہ سناتی ہے اور آنے والا افسانہ سنتی ہے۔ مجھے ساقی سے آنکھ لڑانے دو اور اس کی چشم مخمور میں دنیا بھر کے افسانے دیکھنے دو۔ میں ان سب افسانوں میں اپنی پیاری راج دلاری دل لینے والی من موہن دلی کی کہانی ڈھونڈنی چاہتا ہوں۔ جہاں بہت سی قوموں نے اپنی اپنی بیتی سنائی اور کہتے کہتے چپ ہو گئی تو کسی نے کہا ہے

یہ چمن یونہی رہیگا اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

ساقی کے پاس کھڑا ہو جاؤں اور پوچھوں کیوں سرکار! یہ تو بتاؤ یہ سامنے اونچے اونچے میناروں والی کیا چیز ہے تو وہ جواب دے شاہ جہاں کی نماز کا افسانہ، پھر پوچھوں اور وہ دور لال لال دیواریں کیسی ہیں، تو وہ کہے، شاہ جہاں اور اس کی اولاد کا عشرت خانہ اور پھر بے تار کی خبر رسانی کے کالے کلو ٹے کھمبوں کا افسانہ، اور ایسی آوازیں جیسے موٹر کی ہوتی ہے، ایسی نہیں جو سارنگی کے تاروں سے نکلتی ہے اور ایسی نہیں جو ساجن سیاں کے میٹھے بولوں میں سنائی دیتی ہے۔ تو بس یہ افسانے سن کر میں سن ہو جاؤں۔ اور پھر چپ ہو جاؤں ـــــ اور پھر کہوں کہ بس بات ختم ہوئی۔ ع۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

حسن نظامی

ہندوستان کے سب سے بڑے مترجم مولانا عنایت اللہ دہلوی کی دلکش تراجم

فسانۂ آزاد

رتن ناتھ سرشار

اُردو زبان کے نثرنگار مُصنف ۔ فسانۂ آزاد پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کے برابر اور چند شاید اُن سے بہتر خیال کئے جا سکتے ہیں لیکن غالباً اُردو کی کوئی ایک کتاب ایسی نہیں جو ہر پہلو سے فسانۂ آزاد کی ٹکر کی سمجھی جائے۔ اس کا مقابلہ اگر ہو سکتا ہے تو بوستانِ خیال اور طلسم ہوشربا ہی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اُن میں بھی وہی خیالات کی آمد مضامین کی کثرت اور بیان کی دلکشی ہے جو فسانۂ آزاد میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ کتابیں فارسی سے اُردو میں آئی ہیں۔ اور ترجمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فسانۂ آزاد اُردو ادب کی اپنی بنائی ہوئی چیز ہے اور ایجادی ذیل میں آتا ہے۔

خود سرشار نے اور کتابیں لکھی ہیں لیکن اُن میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس کا نام فسانہ کے ساتھ لیا جا سکے۔ اس شہرت و خوبی کے باوجود یہ کہنا کسی قدر دُشوار ہے کہ فسانۂ آزاد کیا چیز ہے؟ اس کے مُصنف کو عموماً ناول نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس کو اُردو زبان کا سب سے پہلا ناول نویس خیال کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم فسانۂ آزاد کو ناول کہہ سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے ناول کی ایک صحیح تعریف اپنے ذہن میں قائم کر لیں۔ یہ ایک طویل مضمون ہے اور پندرہ منٹ کی مختصر تقریر میں اس پر بحث کرنے کی مہلت نہیں۔ اطالین فرنچ وغیرہ میں جن سے لفظ ناول نکلا ہے اس کے کچھ اور ہی معنی تھے۔ انگریزی میں بھی اس لفظ کی موقع کے لحاظ سے مختلف تعریف ہو سکتی ہے۔ لیکن عموماً اس کو ہر قسم کے بناوٹی اور خیالی قصہ کہانیوں کے لئے بول سکتے ہیں اگر لفظ ناول کو ان وسیع معنوں میں لیا جائے تو فسانۂ آزاد کو ناول کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر ناول سے ہماری مُراد اس قسم کے قصے ہوں جو اٹھارھویں صدی سے آج تک انگلستان میں رائج رہے ہیں تو فسانۂ آزاد کو ناول کہتے ہوئے ضرور تامل ہوگا۔

اس کتاب کی حقیقت کو پہچاننے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کن حالات میں لکھی گئی تھی اور اس کے لکھنے سے اس کے مصنف کو کیا مقصد حاصل کرنا منظور تھا۔ فسانۂ آزاد کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب لکھنؤ کی بادشاہت کو ختم ہوئے ابھی بیس پچیس سال ہی گذرے تھے وہاں کے امیر اور آسودہ حال لوگ ابھی تک اُس عیش پرستی میں مبتلا تھے جس کی بدولت شاہانِ اودھ کی حکومت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کچھ بچی کھچی دولت اِن نوابوں اور رئیسوں کے قبضہ میں موجود تھی اور وہ اس کو مرغبازی، بٹیربازی، پتنگ بازی اور ان سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض بازیوں میں بیدریغ لٹاتے تھے۔ اپنی حالت کو بدلنے کا ان کو مطلق کوئی خیال نہ تھا اور نہ ان کو اُن ذہنی اور معاشرتی تغیرات کا کوئی احساس تھا جو مغربی تعلیم اور مغربی خیالات کی درآمد کی بدولت درپیش تھے۔ فسانۂ آزاد کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس طبقہ کو اس کی صورت تخیل کے آئینے میں دکھائی جائے۔ شاید وہ اپنی بگڑی ہوئی شکل سے بیزار ہو اور اُسکو سنوارنے کی کوشش کرے۔ اس قسم کے اصلاحی یا ہجو یہ خاکے اور لوگوں نے بھی کھینچے تھے۔ اخبار اودھ پنچ میں بہت سے قابل ادیبوں کی مزاحیہ نثر و نظم شائع ہوتی رہتی تھیں جس کا منشا یہی تھا کہ اُن نوابوں رئیسوں کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا جائے۔ نواب سید محمد آزاد کا نوابی دربار جو اسی قسم کا ایک مزاحیہ ادبی خاکہ ہے اور پہلے اودھ پنچ میں شائع ہوا تھا اب بھی کبھی کبھی لکھنؤ کے کتاب فروشوں کی فہرستوں میں نظر آجاتا ہے اور مولانا اکبر حسین الہ آبادی جن کے کلام کو اس وقت بہت فروغ حاصل ہے ان کی ہجویہ اور مزاحیہ شاعری کی ابتدا بھی اودھ پنچ ہی سے ہوئی تھی۔ اودھ پنچ کا بڑا حریف اودھ اخبار تھا جسے اُردو ادب کے مُحسنِ اعظم منشی نولکشور نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اگرچہ ظریفانہ مضامین

کے لئے وقف نہ تھا لیکن چونکہ اُس زمانے میں سیاست سے لوگوں کو چنداں دلبستگی نہ تھی اور اخبار بینی کا مدعا خبریں معلوم کرنے کے علاوہ ادبی شوق کی تسکین تھا۔ اودھ اخبار کو بھی اپنے خریداروں کی تفریح کا کچھ سامان مہیا کرنا ضروری تھا۔ یہ خدمت پنڈت رتن ناتھ سرشار نے جو غالباً اُس وقت اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے، اپنے ذمے لے لی اور فسانۂ آزاد کا ایک حصہ ہر پرچہ کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ کتاب کے ابتدائی ابواب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثر جدا گانہ ادبی خاکے ہیں، جن میں سے ہر ایک لکھنؤ کی معاشرت کا ایک رُخ دکھاتا ہے۔ اور ان میں باہم سوائے اس کے کوئی ربط یا تعلق نہیں کہ وہ سب ایک ہی شخص یعنی آزاد کے مشاہدات و تجربات پر مبنی ہیں۔ کیا یہ سمجھنا درست ہوگا کہ شروع میں سرشار کا خیال کوئی باقاعدہ اور منظم قصہ لکھنے کا نہ تھا بلکہ لکھنؤ کے قدامت پسند باشندوں کی روزمرہ کی زندگی کی ایک جھلک دکھانی مقصود تھی اور اُن کے پیش نظر بعض انگریز مصنفین مثلاً ایڈیسن اور اسٹیل اور ڈکنز وغیرہ کے وہ ادبی خاکے تھے جو انہوں نے اپنے زمانے اور اپنے ملک کی معاشرت کی آگاہی اور اصلاح کے لئے لکھے تھے۔ بہرحال سرشار کا ابتدا میں کچھ بھی مقصد ہو لیکن قدرت نے اُن کو مصوّر کی نظر عطا کی تھی وہ نہ صرف اس زندگی کے تاریک پہلو دیکھ سکتے تھے جس کی اصلاح منظور تھی بلکہ اُس کے ہر ایک پہلو پر اُن کی نگاہ تھی اور اُن کا نور افشاں قلم اس کے تمام سیاہ و سفید کو روشن کرنے کے لئے کافی تھا اور اگرچہ شروع میں آزاد کی حیثیت اس زندگی کے ایک تماشائی کی تھی لیکن جب وہ لکھنؤ کے چوک اور بازاروں، میلوں اور تہواروں کی سیر کرتے ہوئے اور نوابوں کی مصاحبت کا لطف اُٹھاتے ہوئے حسن آرا کے محل تک پہونچ جاتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں تو ہمیں فسانۂ آزاد کے ایک قصہ یا داستان ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو کس قسم کا قصہ اور کس قسم کی داستان خیال کی جائے؟

میرا قیاس ہے کہ سرشار کا دوسرا مقصد ایک ایسے قصہ کی تصنیف تھا جو داستان امیر حمزہ وغیرہ پرانی قسم کی داستانوں اور مغربی نمونے کے نئے طرز کے ناولوں کے بین بین ہو اور جس میں دونوں کی ادبی لطافتوں کو ایک جگہ جمع کیا جاسکے۔

پرانی داستانوں کی طرح فسانۂ آزاد میں خلاف عقل واقعات اور جادو اور طلسمات کا تو کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اور بہت سی باتوں میں وہ ان کا ہمرنگ ہے۔ اوّل تو قصہ کی اُٹھان بالکل وہی ہے جو اکثر پرانی داستانوں کی ہوتی ہے۔ قصہ کا ہیرو کسی عورت کے حسن جمال کی شہرت سُن کر یا اس کی صورت کی ایک جھلک دیکھ کر اُس کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ آزاد کی شناسائی حسن آرا کے ساتھ سُنی سُنائی تعریف یا ایک آدھ جھلک سے کچھ زیادہ تھی لیکن اُن کے دل کے آنے کا وہی ناگہانی ڈھنگ ہے جو پرانی داستانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد ان داستانوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت اپنی شادی کی شرطیں سُناتی ہے، ان میں کسی بہت دشوار کام کی انجام دہی یا کسی خطرناک مہم کی فتح ایک ضروری شرط ہوتی ہے۔ شاید کسی کو یہ خیال گزرے کہ لکھنؤ کے چین اور آرام کی زندگی اور اُس وقت کے پُرامن دور میں ایسی شرطوں کی کہاں گنجایش تھی۔ لیکن حسن اتفاق سے اسی زمانے میں ٹرکی اور روس کی جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمان ہندوستانیوں کو اس جنگ سے بہت دلچسپی تھی اور عام طور پر اُن کی ہمدردی ٹرکی کے ساتھ تھی۔ حسن آرا کو یہ موقع مل گیا کہ میاں آزاد کو ٹرکی کی مدد کے لئے بھیج دے۔ اور اس طرح یہ ضروری شرط پوری ہو جائے۔

پرانی داستانوں میں ہر ایک پہلوان کے ساتھ ایک عیار لگا رہتا ہے جو پہلوان کے زور و قوت کی تائید اپنے مکر و فریب سے کرنے کے علاوہ مصیبت اور تکلیف میں طرح طرح کے حیلوں سے اُس کا دل بہلاتا اور اُس کی طبیعت کو اُکساتا رہتا ہے۔ آزاد کے ساتھ خوجی ہیں جن میں عیاری کا تو کوئی وصف نہیں لیکن اُن کی موجودگی سے آزاد کو وہی تقویت اور پڑھنے والے کو وہی تفریح حاصل ہوتی

ہے جو عیاروں سے ہوتی ہے۔ پرانی داستانوں کی طرح فسانۂ آزاد کو بھی زیادہ تر اونچے طبقے کے لوگوں سے واسطہ ہے اگرچہ خود آزاد کے متعلق تو یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ سوسائٹی کے کس طبقہ کا آدمی ہے اور اس میں یہ بھی وصف ہے کہ امیروں اور رئیسوں سے لیکر بھٹیاروں اور گھسیاروں تک سے برابری کا برتاؤ کر سکتا ہے۔ جن تمام طبقہ کے لوگوں کا ذکر آتا ہے وہ عموماً رئیسوں کے مصاحب، حاشیہ نشین یا ملازم ہیں اور قصہ میں اُن کو کوئی مرکزی حیثیت نہیں۔

سرشار کی تحریر کے اسلوب میں بھی نئی اور پرانی طرز دونوں کا میل ہے۔ کہیں اُن کی عبارت آج کل کی روش کی طرح سہل اور صاف ہوتی ہے اور کہیں قدیم دستور کے مطابق رنگین اور مقفّٰی۔ پرانی داستان گوئی کا معمول تھا کہ جب کوئی نیا قصہ شروع کرتے تھے تو چند تمہیدی الفاظ استعمال کرتے تھے جو داستان کا چہرہ کہلاتے تھے یا چند اشعار ساقی نامہ، غزل وغیرہ کی قسم کے قصے بیان کرنے سے پہلے پڑھ دیتے تھے۔ سرشار بھی اِس رسم کو نباہنے کی کوششیں کرتا ہے اور شعروں کی جو بھرمار فسانۂ آزاد میں ہے وہ بھی بجائے خود پرانے رنگ کے موافق اور نئے رنگ کے خلاف ہے۔ صبح و شام کی کیفیت۔ موسموں کا بیان۔ قدرتی نظاروں کا ذکر۔ جس حد تک بھی فسانۂ آزاد میں موجود ہے وہ سب پُرانے ڈھنگ کا ہے۔ یعنی اُس میں مصنف کا ذاتی مشاہدہ کم ہے اور لفاظی زیادہ۔ اور لفظ بھی اکثر وہی ہیں جو پرانی شاعری اور پرانی داستانوں میں کثرت سے برتے جا چکے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے ساتھ فسانۂ آزاد میں بہت سی خوبیاں ہیں جنکی بنا پر اس کو یورپ کے اچھے سے اچھے ناول کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس میں سرشار نے اپنی بے مثل قوت ایجاد سے بے شمار مرد اور عورتوں کی ایک نقلی دنیا پیدا کر دی ہے۔ جن کے معاملات اصلی دنیا کے باشندوں کے معاملات سے بھی زیادہ رنگین اور پُرلطف معلوم ہوتے ہیں۔ آزاد۔ خوجی اور حسن آرا سے واقعات کی دنیا میں ملاقات ہونی ناممکن ہے لیکن سرشار نے اپنی قلم کے جادو سے اُن میں ایسی جان ڈالدی ہے کہ وہ دوستوں کی طرح ہمارے دل میں گھر کر لیتے ہیں اور دوستوں سے زیادہ ہم اُن کے اچھے بُرے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے اگرچہ جذبات اور مناظر قدرت کے بیان میں سرشار رسمی لفاظی سے آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن جہانتک روزمرہ کی زندگی کا تعلق ہے اُس کی قوت مشاہدہ بہت بڑھی ہوئی ہے اور فسانۂ آزاد کے ورقوں میں آج سے پچاس سال پہلے کے لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی لفظی تصویریں کثرت سے موجود ہیں۔ فسانۂ آزاد کی تیسری خوبی اُس کی ظرافت ہے جس کی نظیر اُس سے پہلے یا اُس کے بعد کی اُردو ادبیات میں بہت کم ملتی ہے۔ اُردو میں ظرافت کے اکثر معنی صرف ایسی زبان کے استعمال تک محدود رکھے جاتے ہیں جس کو سُنکر یا پڑھکر آدمی کو ہنسی آجائے اور اس زبان کو گندے اور فحش لفظوں سے پاک رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ وہ ظرافت جو ہنسنے ہنسانے کا موقع اور محل پیدا کر دے۔ اور کانوں کی زیادہ آدمی کے تصور کو خوش کرنے کی کوشش کرے اُردو میں بہت کمیاب ہے۔ اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سرشار اُردو زبان میں سچی اور اچھی ظرافت کا موجد تھا۔ خوجی کا کردار فسانۂ آزاد کی جان ہے۔ افیمیوں کے متعلق ہندوستان میں ہمیشہ سے لطیفے اور حکایتیں سُننے میں آتی رہی ہیں۔ خوجی کو اُن تمام اگلے پچھلے افیمیوں کا مجموعہ خیال کرنا چاہیئے۔ لیکن سرشار نے اپنے افیمی کو ایسی نزاکت اور لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اُسکی ذلت اور حقارت کا کوئی خیال ہمارے دل میں نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ اسکے برعکس اس سے ایک قسم کا اُنس اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے جو کتاب کو ختم کرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

بعض لوگ فسانۂ آزاد کی غیر معمولی ضخامت کو ایک عیب خیال کرتے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ انگریزی ناولوں کو

اپنے سامنے نمونیکے طور پر رکھتے ہیں اور ان سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابتدا میں انگریزی ناول بھی خاصے طویل ہوتے تھے۔ اُنیسویں صدی میں عام میلان اختصار کی جانب رہا لیکن اب پھر ہزار بارہ سو صفحے کے ناول دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فسانۂ آزاد غالباً لمبے سے لمبے انگریزی ناول سے بھی کچھ زیادہ طویل ہے۔ لیکن میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ سرشار کے پیش نظر ایک طرف اگر انگریزی ناول تھے تو دوسری طرف ہندوستانی داستانیں جن میں طوالت کوئی عیب نہیں۔ بلکہ ایک قسم کا وصف خیال کی جاتی تھی۔ جو طبیعتیں طلسم ہوشربا کی آٹھ اور بوستان خیال کی نو جلدوں کی خوگر تھیں اُن کے لئے فسانۂ آزاد کی چار جلدیں شاید کافی بھی نہ سمجھی جائیں۔ لیکن غالباً فسانۂ آزاد کے اِس قدر طولانی ہو جانے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ وہ اودھ اخبار میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شائع ہوا اور اس کے مصنف کو کبھی اُس کے ڈیل ڈول کو پہلے سے جانچنے اور ناپنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پڑھنے والوں کی دلچسپی بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ کتاب کا حجم بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان حالات میں ادبی تناسب کی توقع فضول ہے۔ تو بھی فسانۂ آزاد کے بہت کم حصے ایسے ہیں جنکو بھرتی کا سمجھکر نظر انداز کیا جا سکتا۔ باخبر لوگوں سے سُننے میں آیا ہے کہ سرشار کی طبیعت میں غضب کی آمد تھی۔ جو کچھ لکھتے تھے قلم برداشتہ اور بے ساختہ لکھتے تھے اور اپنے لکھے کو دوبارہ دیکھنا یا ترمیم کرنا اُن کی عادت کے خلاف تھا۔

ایک مشہور ہندی مصنف نے فسانۂ آزاد کا خُلاصہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنا اپنا مذاق ہے میں اور شاید اور بہت سے لوگ تو اس میں کوئی کاٹ چھانٹ پسند نہ کریں گے، سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا خوش قطع حوض جس کے عین بیچ میں ایک کنول نما فوارہ لگا ہو اور جس کا پانی شیشے سے زیادہ چمکدار اور شفاف ہو واقعی بھلا لگتا ہے۔ لیکن بعض آنکھوں کو کسی دریا یا ندی کی بے قاعدہ لیکن شاندار روانی کا نظارہ اُس سے بھی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔

مرزا محمد سعید۔ ایم۔ اے

نرگس جمال

مولانا نیاز فتحپوری لکھتے ہیں: "ترجمہ ہے مٹرلنک کے ڈرامے "جائزل" کا۔ مارس مٹرلنک (بلجیم کا مشہور ڈرامہ نگار) ہمارے شاہد صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُن کا یہ ذوق نہایت مشکل پسند ذوق ہے۔

مٹرلنک کے ڈرامے عموماً چونکہ اسٹیج کے لئے نہیں ہوتے اسلئے اُن میں علمی و فلسفیانہ شان زیادہ پائی جاتی ہے اور طبقۂ خواص ہی کی تسکین ذوق اُن کا اصل مقصود ہوتا ہے۔

مٹرلنک زیادہ تر "عشق جمال" اور اُسکے متعلقات سے گفتگو کرتا ہے۔ اسی لئے اُسکے یہاں جذبات کی نزاکت و وسعت اور فطرت انسانی کی وہ لچک جسے ہم چاہیں تو روحانیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ دہشت انگیز مناظر پیش کر کے دلوں کو ہلانا پسند نہیں کرتا، وہ انسان کی خون آشامیوں کے افسانے سُنا کر رُوح کے سکون کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف ان لطیف و پاکیزہ انعطافات کی داستان سُناتا ہے جو حُسن سے پیدا ہوتے ہیں، محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور رُوح میں جذب ہو کر شاہراہِ انسانیت کو منور بنا جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوقِ سخن یہ ہوگا، اس کے یہاں خیال کی نزاکت، بیان کی ندرت، طرزِ ادا کی جدت اور معنی کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب بھی کچھ ہوگا، اور ایک غیر زبان سے اِن تمام خصوصیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن مسٹر شاہد احمد بی۔ اے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ خود اسی ذوق کے ادیب ہیں۔" قیمت صرف عمر

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی

خرافات

پنواڑی لتنے پان لگائے۔ میں نے ان حضرت کا جائزہ لیا۔ جو دوکان پر ایک طرف کو ایک بھورے کمّل میں لپٹے اکڑوں بیٹھے تھے۔ اور جن کے سلسلۂ کلام میں میری فرمائش اچانک مخلِ انداز ہوگئی تھی۔

اگر کملی میں ذرا سا روزن ناریل مُنہ سے لگانے کو نہ ہوتا۔ یا سامعین بیحد دلچسپی سے ان کی طرف متوجہ نہ ہوتے، تو یار لوگ یہی سمجھتے کہ بوری میں تمباکو کے سوکھے پتّے رکھے ہیں۔

میں نے پنواڑی سے پان کے لئے کہا تو ان حضرت نے رُک کر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اور پھر سر موڑ چُپ چاپ ناریل کی طرف توجّہ کرلی۔ انہماک کے عالم میں دو ایک کش لگائے۔ پھر ایک نظر سامعین پر ڈالی۔ جو سامنے مونڈھوں اور لوہے کی کُرسیوں پر بیٹھے بیتابی سے منتظر تھے، کہ پنواڑی مجھے بھگتانے میں اور کتنا وقت لیتا ہے۔ ادھر اکی اکتائی ہوئی پھرتی صاف کہہ رہی تھی کہ اسوقت کاروبار سے زیادہ اخلاق کے خیال نے اُسے میری فرمائش کی تعمیل پر آمادہ کر دیا ہے۔

مَیں پان کھا کر مُنہ اور چُٹکی پونچھنے کو جیب سے رومال نکال رہا تھا کہ سامعین کے اندازِ نشست اور چہروں سے ذہین طالبعلوں کی سی توجّہ ظاہر ہونے لگی۔ اور آنجناب نے عنانِ نصاحت ڈھیلی چھوڑ دی۔

کہنے لگے "تو بس صاحب اللہ تمہارا بھلا کرے۔ اب ہم اس فکر میں کہ آخر کو سُسرُ یہ بات ہے تو کیا ہے۔ امیروں سے بھی فقیروں سے بھی۔ پڑھے لکھوں سے۔ زاہلوں سے اور تمہارا بھلا کرے، بہروں سے، خنساؤں سے، صاحب لوگوں سے، لیجئے صاحب دُنیا بھر سے پوچھ ڈالا۔ (ناریل کا کش لے کر سر کی جنبش نفی سے)۔۔۔ کچھ نہیں۔ پر ہم نے بھی دل میں ٹھان لی کہ اگر زندگی رہی تو ایک دَفعے مالُم تو ضرور کریں گے کہ آخر کو یہ بھید سالا ہے تو کیا ہے۔

(ناریل کے کش لیکر اور سر ذرا مزے میں ہلاکر) کرنا خُدا کا کیا ہوتا ہے کہ ایک رِسلدار صاحب ہماری پڑوس میں آکر بس گئے۔۔ ۔۔۔ اے دیکھو، یہ کچھ اچھا سا نام تھا ان کا۔ سُسرُ زبان تک آآکر لوٹ جاتا ہے۔ بشی رتی۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔ خیر صاحب کچھ ایسا ہی نام تھا ان کا غرض کہ۔۔۔۔ تو رسلدار صاحب تھے تو ہماری طرح زاہل اَن پڑھ۔ مگر ہندوستان سے تا بہ لندن تک، اور صاحب تمہارا بھلا کرے۔ اور افریقہ اور کیا کہتے ہیں اسی کو برما اور لنکا، اور الّم غلم بیسیوں جگھوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ بڑے بڑے فرنگیوں سے میل جول تھا۔ واپس آکر بھی صاحب لوگوں میں آتے جاتے رہتے۔ بیلی صاحب کے ہاں ڈالی والی چڑھاتے تھے، بیلی صاحب کی میم صاحب بھی ہنستی بولتی تھیں ان سے۔ مگر صاحب واہ وا۔ واہ وا۔ کیا عورت تھی! ایک اچھی، ایک بہت ہی اچھی۔ اس قدر کی لائق اور پڑھی لکھی عورت کہ شاذ ہی کی بات ہے جو ہماری نظر سے گذری ہو۔ قسم ہے، امیر علیہ السلام کی۔ ہم نے بھی زمانہ دیکھ ڈالا ہے۔ جوانی کا جب زمانہ تھا ہماری۔ (کمّل سر سے سرک گیا۔ آنکھیں چمک اُٹھیں، نتھنے پھول گئے) جھوٹ بولنے والا کافر۔ والدجدھر سے گزر جاتے تھے، قیامت مچ جاتی تھی، قیامت

(پنواڑی سے) تونے تو دیکھی ہے، وہ غفورن پان والی۔۔۔ کیا چیز ہے؟ (فخر سے مسکرا کر) "بڑھاپا ہے، مگر اب بھی جب

دُکان کے سامنے سے گزر جاتے ہیں ہم، تو سینہ تھام کے رہ جاتی ہے، ہم سے کہا کرتی تھی کہ میر صاحب مجھے اپنے گھر میں ڈال لو۔ اپنی دُکان دُے دیتی تھی۔ اور صاحب تمہارا بھلا کرے، کہتی تھی کہ میرا سارا گہنا پاتا۔ روپیہ پیسہ اور کیا نام اس کا کہ کپڑا لتّا لے لو، مگر یہاں جو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا ہو تو چوچور کی سزا، بات کیا تھی؟ بس ایک روز آنا کہہ بیٹھے تھے، کہ "بھنّو ذرا دو بیڑے پان تو لگا دے" بس صاحب قسم لے لو۔ جیسی جی چاہے تمہارا، وہ دن اور آج کا دن جو بہن کے سوا اسے اور کچھ جانا ہو۔ تو وجہ کیا؟ کہ قولِ مرداں جان دارد۔ مگر جناب کیا کہنے ہیں اُسکے بھی جگرے کے، کہ آج تک ہمارے نام پر کنواری بیٹھی ہے۔

بس حضرت تو میم صاحب سے جو ملاپ تھا اُن کا، تو ہم دل میں سوچے، کہ جس بات کی ہمیں دُھن لگی ہے، وہ بس یہیں سے ملیگی۔ (اندازِ نشست میں کچھ ترمیم کر کے) لیجئے صاحب ہم نے رسلدار صاحب کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی جاکر بازار سے سودا سلف لا دیا ان کا۔ اور صاحب تمہارا بھلا کرے، کبھی اُن کی جُروا کا قارورہ حکیم صاحب کو دکھانے لے گئے۔ غرض کہ اسی طرح میل مِلاپ بڑھا لیا، تم جانو دلکو دل سے راہ ہوتی ہے۔ رسلدار صاحب بھی ہم پر مہربان ہو گئے۔ (ناریل کے دو چار چھوٹے چھوٹے اور ایک بڑا سا کش لیکر) مہربانی تو اس پاک پروردگار کی چاہیئے ؎

اسے نفضل کرتے نہیں لگتی بار نہ ہو اس سے مایوس اُمیدوار

(سامعین کی زبانوں، آنکھوں اور گردنوں کی جنبش نے کُھلے دل سے تائید کی) لیجئے صاحب، اب ہم اس تاک میں، کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو اپنی منشا زبان پر لائیں، کہتے ہوئے گھبرائیں بھی، کہ اگر ناں کر دے تو مفت میں بات بھی جائے۔ آدمی آبرو ہی سے تو ہے۔ آبرو پر پانی پھر جائے، تو ٹکے میں بھی سستا، نہ کچھ مہنگا۔

اللہ کی قدرت، ان ہی دنوں ہمارے چچا نے ـــــ مرادآباد میں پولیس میں ملازم تھے۔ وہ کڑیل نوجوان کہ دیکھکر اُسکی قدرت یاد آتی تھی۔ ہاتھی کی طرح اینڈ اینڈ کر چلتے تھے۔ ایک ایک بازو، خدا جھوٹ نہ بُلوائے، تو (ہاتھ سے بتا کر) یہ یہ تھا۔ بس صاحب تمہارا بھلا کرے، تو انہوں نے مرادآباد کا کچھ خمیرہ ہمیں بھیجدیا۔ تم جانو ہم تو اپنی بات کے فراق میں تھے ہی، تبا کو لے سیدھے رسلدار صاحب کے ہاں پہونچ گئے۔ آٹھوں گُن کے پورے تو ہیں ہی، تو ار کھ کے خمیرے کی ایک چلم جو بھر کے دیتا ہوں، تو پھڑک اُٹھے۔ آنکھیں کُھل گئیں، تمہاری قسم بولے "قربان جائیں ان ہاتھوں کے، مانگ آج کیا مانگتا ہے؟"

بس ہمارا یہ سُننا تھا، کہ دل میں گدبدی مچ گئی۔ اُٹھکر مجرا عرض کیا، کہا "پیر و مرشد، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ راج پاٹ نہ سہی پیٹ کی گزر چلی چلتی ہے۔ ہاں ایک سوال ہے، جو اس کا جواب سمجھا دیں، تو سمجھونگا بھر پایا۔"

کہنے لگے "پوچھ کیا پوچھتا ہے؟"

ہم بھی کچی گولیاں ناں کھیلے تھے، کہا "پہلے قول دیجئے"

قول کا نام سُنکر رسلدار صاحب بھڑکے، مگر صاحب جھوٹے کے منہ میں خاک، میں بھی اپنا تلی علموں پر چلمیں پلائے گیا۔ آخر کہاں جاتے تھے۔ (ہاتھ پہ ہاتھ مار کر) قول ہار بیٹھے۔ پھر تو ہم بھی سمجھ لئے کہ آج میدان مار لیا۔ لے مرے بھائی، جھٹ سامنے آ دست بستہ عرض کی "پیر و مرشد، فرنگی چمچے سے کھانا کھاتے ہیں۔ ہاتھ سے نہیں کھاتے۔ اس میں کیا بھید ہے؟"

لیجئے صاحب ہمارا یہ کہنا تھا، تو آئے ہے تو جاتے کہاں ہیں۔ گالی گلوچ اور لیجئے گرٹیو اور ایک اُودھم مچا دیا۔ مگر اب ہم کہاں

چھوڑتے تھے، سب کچھ چپکے سُنا کئے۔ کہا، تو صرف یہ، کہ صاحب اب قول ہار چکے ہو۔ (سکوت جس میں نظریں فخر کے انداز میں سامعین پر پڑ رہی اور اپنی سیاست کی داد طلب کر رہی تھیں۔)

آخر بولے:- "یہ ایک بڑے راز کی بات ہے، تو کسی سے کہیو مت"۔

یہاں تک داستان پہونچا کر آپ نہایت استغنا سے ناریل کی طرف متوجّہ ہوگئے، ہر طرف سے اصرار ہو رہا تھا کہ ہمیں ہماری ہی قسم بتا دو۔ ایک مغلانی جو روز کی آنے جانے والی معلوم ہوتی تھی، ترچھی نظر سے بولی "ہمارا ہی لہو پیئے جو نہ بتائے"۔ مجھے دفعتاً احساس ہوا کہ میرا دُکان پر یوں کھڑا ہونا کچھ بے موقع سا ہے، مگر میں مقر ہوں کہ داستان کا بقیہ حصّہ معلوم کرنے کا اشتیاق میری خودداری پر غالب آرہا تھا۔ میں اپنے قیام کو معقول نما بنا کر توسیع دینے کیلئے جو کچھ بھی کرسکتا تھا کرتا رہا۔ سگرٹ کی ڈبیا خریدی۔ سگرٹ اس میں سے نکال کر سگرٹ کیس میں بھرے، ایک سگرٹ سُلگایا۔ بوٹ کے تسمے کھولتا اور باندھتا رہا۔ اُدھر سامعین کا اصرار دم بدم بڑھ رہا تھا۔ آخر بولے۔ "لے اب کچھ منہ وہنہ بھی میٹھا کراتے ہو، کہ ہم چلیں"۔ ہر طرف سے فراخدلی سے وعدے ہوئے۔ مگر اب دفعتاً بتا دینا بے موقع سا معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے نظروں کو خوابناک بنا کر ناریل کی طرف توجّہ کرلی۔ انکار سے جو بے لطفی پیدا ہو گئی تھی، اُسے دھوئیں میں اُڑا دیا۔ خفیف سا مسکرائے، بولے "کیا کہا جائے ....."

ذرا دیر کو پھر ناریل کی طرف توجّہ کی۔ دفعتاً نظروں کو برق وش سامعین پر ڈال کر بولے "دیکھو۔ کسی سے کہنا تو ہو مت"۔

اتنے آپ دو چار اور کش لگائیں، سامعین ہر ممکن طرح اسکے متعلق اطمینان دلانے کی کوشش کرتے رہے۔

"اور جو کسی سے کچھ کہا، تو پچھتاؤ گے"۔

سامعین نے ایک دوسرے کی طرف تعجّب کی نگاہوں سے دیکھا۔ دُکان کے آئینے کے سامنے میرے ہاتھ بھی کالر ٹائی پر رک گئے۔ کسی نے دبی زبان سے پوچھا کہ کیا ہوگا؟۔

آپ نے ایک پُراسرار تبسّم کے ساتھ کہا "کہ جو دیا"۔

یکلخت اِدھر اُدھر احتیاط کی ایک نگاہ ڈالی۔ سر سامعین کی طرف بڑھایا۔ اور آہستہ سے بولے "ناخن! فرنگیوں کے جو ہوتے ہیں ناخن، اِن میں ہوتا ہے ایک طرحوں کا زہر! کیا سمجھے؟ جو کہیں ان کا ناخُن کھانے کو چھو بھی جائے، تو سارا کھانا زہر زہر ہو جاتا ہے۔ پھر تو اِدھر کھایا اُدھر پٹ، اور صاحب تمہارا بھلا کرے، یہ بھی بتا دیں، کیا یاد کرو گے، کہ فرنگی کا ناخن نایاب شے ہے، بڑے بڑے اسکے فراق میں ہیں بگڑ اوں ہوں۔ جو کہیں ناخنوں کو ہوا بھی لگنے دیتے ہوں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ کب تراشتے اور کہاں پھینکتے ہیں۔ وجہ کیا کہ اس زہر کے مارے کا کوئی علاج ہی نہیں۔ لاش کو ڈاکٹو ملٹو چیر و پھاڑ دے۔ کیا مجال جو شُبہ بھی گزر جائے، کہ کس شے کی کرامات ہے، ایک اور بات بھی ہمیں معلوم ہوئی، کہ اِن فرنگیوں کے ناخن بڑھتے نہیں اور تراشنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ پر اس کا ابھی ہمیں یقین نہیں۔ کبھی فُرصت ہوئی تو نشا خاطر سے مالُم کریں گے"۔

سامعین اس اِنہماک سے سُن رہے تھے، گویا دُنیا کے کسی بہت بڑے راز سے اُنہیں آگاہ کیا جا رہا ہے۔ اور وہ بڑے فخر اور پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ اس بارِ امانت کو اُٹھانے کیلئے آمادہ ہیں۔ میں انہیں مصروف چھوڑ کر تحقیق کا بقیہ حصّہ اپنے اوقاتِ فُرصت میں مکمل کرنیکا ارادہ کرکے گھر روانہ ہوگیا۔

سید امتیاز علی تاج

کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

بڑا ہے گو اہتمامِ دُنیا۔ اُلٹ پلٹ ہی نظامِ دُنیا۔ غلط خیالِ دوامِ دُنیا بگڑ رہا ہی قوامِ دُنیا

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا۔ کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

نہ آتشِ اعتقاد باقی۔ نہ شعلۂ اعتماد باقی۔ نہ صورتِ اتحاد باقی قلوب میں ہی فساد باقی

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

معاشرت اِک ملمع سازی، ستم ظریفی ستم نوازی۔ نہ پاک بینی نہ پاکبازی۔ نہ دلستانی نہ دلگدازی

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

قدم قدم پر قمار خانہ۔ گلی گلی میں سنگار خانہ۔ جو گھر بنے ہیں نگار خانہ تو مدرسے اشتہار خانے

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

فریب کا نام عقلمندی۔ خودی کے پردے میں خود پسندی۔ جہاں ہو پستی میں بلندی وہ ذہنیت ہے سری گندی

چھلک پڑا ہو نہ جامِ دُنیا! کہیں نہ مٹ جائے نامِ دُنیا

رئیس حسین سیالکوٹی

دیوانی

حضرت اورنگزیب کا مقولہ ہے کہ شکار کارِ بیکاران است!

اور میں ایک مدّت سے اسی مقولے پر کاربند ہوں۔ موسم شروع ہوتے ہی کہیں نہ کہیں نکل جاتا ہوں۔ گذشتہ موسم میں بھی میں ایک پہاڑی علاقے میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ دامنِ کہسار میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ کوئی پندرہ بیس گھر ہونگے۔ میں ایک گوالے کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد جب مجھے اِن علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو یہاں کے رہنے والوں کی زندگی پر رشک سا آنے لگتا ہے۔ ہر بات میں سادگی دیکھ لیجئے۔ بناوٹ اور تصنّع کا کہیں نام تک نہیں۔ مناظرِ قدرت کی طرف دیکھئے تو بیحد دلفریب اور جو گاؤں والوں کی طرف نظر کیجئے تو ایک عجیب رومان انگیز زندگی نظر آئے گی۔ کارزارِ حیات میں ہم شہر کے رہنے والوں کی نسبت یہ لوگ کچھ زیادہ ہی سرگرم نظر آتے ہیں اور میرے خیال میں زندگی کا لطف بھی انہیں ہم لوگوں سے کچھ سوا ہی حاصل ہوتا ہوگا۔

تو خیر! میں گوالے کا مہمان تھا۔ اِس علاقے میں کبک، سی سی، تیتر، پاڑے اور گلنذار کا شکار ملتا ہے۔ گوالے کا لڑکا میرا راہبر تھا۔ دُنیا بھر کے قصے کہانیاں اُس سے سُن لیجئے۔ اور پھر گاتا بھی خوب تھا۔ اور فدا نظر باز بھی تھا۔ اُس کی باتوں میں مجھے بہت لطف آتا۔ پنگھٹ پر تو وہ ہر کام چھوڑ کر بھی صبح و شام ضرور چلا جاتا۔ اور گھر والوں سے گاہے گاہے اس پر لتاڑ بھی خاصی پڑتی۔ آج وہ دوپہر سے غائب تھا۔ والوں سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ پاڑوں کی ایک ٹولی کہسار کے دامن میں جو جوار کے کھیت ہیں ان میں چُگ رہی تھی۔ مجھے اپنے راہبر کا بہت انتظار تھا لیکن جب وہ عصر تک بھی واپس نہ آیا تو میں بندوق لیکر اکیلا ہی پہاڑوں کی طرف چلدیا۔ جن کھیتوں کا لونڈوں نے پتہ دیا تھا وہاں پاڑوں کے سُم کے نشان بالکل تازہ تھے۔ پاڑے جس کھیت میں صبح چرنے کے لئے آتے ہیں دن ڈھلے بھی وہاں ایک آدھ پھیرا ضرور کرتے ہیں۔ میں ایک پتھر سے لگ کر اُن کے انتظار میں بیٹھ رہا۔ کبھی کبھی کسی چٹان پر سے کبک کی آواز تو سنائی دیتی لیکن اس خیال سے کہ پاڑے بندوق کی آواز سُنکر بھاگ نہ جائیں میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرے دیکھتے دیکھتے دس پندرہ کبک پہاڑ سے اتر کر کھیت کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔ کبک رفتاری کے قصے تو اکثر سُنے ہیں لیکن خدا کی قسم آج آنکھوں سے دیکھکر جو لطف آیا بیان نہیں ہو سکتا۔ جھوم جھوم کر قدم اُٹھانا، سینہ ابھار اُبھار کر چلنا اور مست آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنا قیامت کے فتنے سے کم نہ تھا۔ میں ابھی اُن کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ داہنے ہاتھ کی ڈھلوان پر مجھے پتھروں پر کسی کے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ میں نے جو جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو چار پانچ پاڑے پہاڑ پر سے نیچے اُتر رہے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان کمبختوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ کیونکہ ایک جھاڑی کے پاس جاکر یہ رک گئے۔ فائر تو میں کر دیتا لیکن فاصلہ زیادہ تھا۔ اِس خیال سے کہ شاید زد میں آجائیں دبک کر بیٹھ رہا لیکن میرے دیکھتے دیکھتے ایک گھاٹی میں اُتر گئے اور میں بندوق کندھے پر رکھ کر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اُن کے پیچھے ہو لیا۔ اسی طرح چلتے چلتے میں گاؤں سے اتنی دُور نکل گیا کہ راستے کا پتہ نشان نہ رہا۔ شفق کی لالی دشت و جبل پر اس طرح عریاں تھی جیسے کسی عروسِ نو کے کفِ دست پر حنا۔ میں واپس لوٹ جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہی پاڑے مجھے ایک چٹان پر کھڑے نظر آئے۔ فاصلہ تو کچھ زیادہ نہ تھا لیکن اس چٹان تک پہونچنے کے لئے مجھے ایک چکر کاٹنا پڑا۔ ہوا یہ کہ میرے پہونچتے پہونچتے پاڑے تو کسی اور طرف چلدئے اور میں سستانے کے لئے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

وسعت نگاہ کے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور پشت کی جانب ن سربفلک پہاڑ تھے جن کی برف پوش چوٹیاں ثریا سے ہم کلام معلوم ہوتی تھیں۔ اور انہی گھاٹیوں میں کہیں کسی آبشار کی ترنم ریزیوں سے ایک کیف سوز و ساز پیدا ہو رہا تھا۔ شام کی اس ہلکی ہلکی روشنی میں دشت و جبل کا منظر بیحد دلکش معلوم ہوتا تھا۔ اور بن کی ہوا سے مستی کی بو آرہی تھی۔ آپ جانئے شکاریوں کے شوق اور ولولے بھی دنیا بھر سے نرالے ہی ہوتے ہیں۔ دل تو اس وقت یہ چاہتا تھا کہ کیا اچھا ہو جو اس ویرانے میں ہی رات بسر کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن حالات واپس جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس لئے بندوق اٹھا کر توکل کے بھروسے پر جدھر سے آیا تھا ادھر ہی کو ہو لیا۔ خیال تو یہ تھا بستی زیادہ دور نہیں۔ تاہم دل میں ایک الجھن سی پیدا ہو رہی تھی۔ اس لئے چلتے چلتے بندوق کا ایک آدھ فائر کر دیتا۔ خوف سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ شاید کوئی گڈریا یا گوالا آواز سنکر ادھر کو آجائے۔ لیکن نہ تو کوئی گڈریا ہی مدد کو آیا اور نہ کسی گوالے کی بنسری کی آواز سنائی دی اور تھوڑی ہی دیر بعد لیلائے شب کائنات سے ہمکنار ہونے لگی اور بام فلک پر ستارے کسی کے آویزۂ گوش کی طرح چمکنے لگے۔ جب تک ممکن تھا راستے کی جستجو میں لگا رہا۔ لیکن جب تاریکی اچھی طرح مسلط ہو گئی تو تھک ہار کر ایک درخت کے نیچے آبیٹھا۔

یہ ظاہر تھا کہ اسی ویرانے میں رات بسر کرنے کی جو مجھے آرزو تھی اب پوری ہو کر رہے گی۔ لیکن سوال تو جاڑے کا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ میرے پاس دیاسلائی بھی نہ تھی جو الاؤ تاپ سکتا۔ اب سر پر جاڑے کی رات تھی اور رات کاٹنے کا سہارا یہی بن کے جنگل تھے۔ اتنا ہی غنیمت ہوا کہ کوئی پہر رات گئے پہاڑیوں کے عقب میں سے چاند نکل آیا۔ پہلے تو کہسار کی یخ بستہ چوٹیاں یوں چمکنے لگیں جیسے کسی نے چاندی کی ڈلی رکھدی ہو۔ پھر بتدریج تمام کائنات حسن کی تنویر سے چمک اٹھی۔ لیکن ماہ تاباں جب کبھی بادلوں کے جھرمٹ میں آجاتا تو یہی دیو قامت اشجار الف لیلے کے جنون کی طرح بھیانک سے نظر آنے لگتے۔ لیکن روئے تاباں سے نقاب اٹھتے ہی ایسا معلوم ہوتا گویا جنت کی کوئی حور شجر و حجر پر نور کی بارش کر رہی ہے۔ اس خاموشی اور سناٹے میں کسی دور کے آبشار کی وہی صدائے سوز و ساز اداسی کا عالم پیدا کر رہی تھی کہ اچانک میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ آواز نہیں بلکہ درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی فریاد۔ ایک پہاڑی گیت تھا جس کا مفہوم اردو میں یوں ادا ہو سکے گا ؎

دنیا کا ذرہ ذرہ مدہوش ہو گیا ہے
تاروں میں حسن عالم روپوش ہو گیا ہے

یہ آواز کیا تھی کوئل کی کوک یا بلبل کا نالۂ فراق تھا۔ لیکن اس ویرانے میں جس کی خامشی میرے لئے سوہان روح ہو رہی تھی یہ غم انگیز صدائیں پیغام حیات سے کم نہ تھیں۔ آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا ؎

خاموش میکدے میں مے نوش سو گیا ہے
حتیٰ کہ ساز فطرت خاموش ہو گیا ہے
میں خون رو رہی ہوں خاموش سب جہاں ہے
یہ خامشی ہے پریتم! اس وقت تو کہاں ہے

معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فراق آشنا روح کسی کی جستجو میں نالۂ و شیون برپا کر رہی ہے۔ میرے کان آواز پر لگے ہوئے تھے لیکن آواز آنی اب بند ہو چکی تھی۔ مجھے کچھ اطمینان سا ہو چلا تھا کہ خیر میں اس بن میں اکیلا نہیں بلکہ کہیں آس پاس ایک اور متنفس بھی موجود ہے۔ جدھر سے یہ آواز آئی تھی میں اسی جانب ہو لیا۔ چاندنی جوبن پر تھی۔ اور کہیں کہیں کیک چاند دیوتا کو دیکھ دیکھ کر رقص کر رہے تھے۔ یہی پرندے جو دن کے وقت پاس نہ پھٹکنے دیتے اس وقت میں ان کے قریب پہونچ جاتا اور انہیں خبر تک نہ ہوتی۔ میں اس وقت چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے دامن میں چل رہا تھا۔ ہوا چونکہ بند تھی اس لئے یہاں سردی بھی کچھ زیادہ محسوس نہ ہوتی۔ کچھ دور جاکر پہاڑیوں کا سلسلہ ختم

ہوگیا۔ اور دو چٹانوں کے درمیان ایک گھاٹی سی نظر آئی۔ کہیں کہیں پانی بھی چمکتا تھا۔ حقیقت میں یہ کسی پہاڑی ندّی کا راہگذر تھا۔ میں اسی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ واقعی دُنیا کا ذرّہ ذرّہ خاموش ہوچکا تھا۔ شجر و حجر بھی نیند کی آغوش میں معلوم ہوتے تھے۔ بھلا میں تو ایک راہ گم کردہ تھا۔ لیکن اس ویرانے میں اس وقت یہ فریاد و فغاں کرنے والی کون تھی؟ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ دیوانی ہی نہ ہو جس کا ذکر میں گوالے کے لڑکے سے کئی بار سُن چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے اس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ آواز آنی تو دیر سے بند تھی لیکن اس کے سوز بھرے ترانے میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے۔ ندّی یا ندی کا راستہ میدانوں کی طرف جارہا تھا۔ اور مجھے کچھ ڈھارس سی بندھنے لگی تھی کہ شاید میں گاؤں کے قریب ہی کہیں جانکلوں۔
پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوچکا تھا۔ اور نظر کے سامنے بڑے بڑے پتھر اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔ اور کہیں دُور فاصلے پر یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آرہا تھا۔ اچانک پھر وہی آواز سُنائی دی۔ لیکن اب کہیں قریب سے وہی پہاڑی گیت جو اُردو میں یوں ادا ہوسکیگا ؎

مندر سے آرہی ہیں ناقوس کی صدائیں
تقدیس کے ترانے گانے لگیں ہوائیں
دُنیائے رنگ و بُو کی رنگین ہیں فضائیں کو
خوابیدہ حُسن کی پھر زندہ ہوئیں ادائیں کو
یہ دلنواز منظر فطرت کا ترجماں ہے
اے ترجمانِ اُلفت اِس وقت تو کہاں ہے

میں ایک پتھر پر خاموش بیٹھا تھا۔ گو آواز آنی بند ہوچکی تھی۔ لیکن اس وقت میرے دل میں بھی ایک درد تھا اور یہ درد مجھے بھی بیتاب کر رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر میدان نظر آرہے تھے لیکن میں ندّی کا کوہستانی راستہ چھوڑ کر اس آواز کے رُخ ہولیا۔ یہاں بھی قدم قدم پر نشیب و فراز تھے۔ اور پہاڑیوں کا سلسلہ پھر قریب ہوچلا تھا۔

ماہِ تاباں قلّۂ کوہ پر اس طرح ضیا پاش تھا جیسے کسی حسینہ کے ماتھے پہ بندیا۔ میں دس پانچ قدم چلکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ آخر ایک چٹان پر مجھے ایک عورت کھڑی نظر آئی۔ آپ جانیئے! میں توہم پرست تو ہوں نہیں۔ لیکن اس وقت میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اس ویرانے میں جس کا سکوت اور دہشت شاید ستاروں کے لئے اٹھکیلیاں کررہی تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر جلدی جلدی قدم اُٹھاتا اُس کی طرف چلا۔ لیکن پتھروں پر تیزی سے چلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ غالباً اس نے بھی کچھ آہٹ سی پالی تھی۔ کیونکہ اب وہ بھی اسی طرف جدھر سے میں اُسکی طرف جارہا تھا دونوں ہاتھ کمر پر رکھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اُسنے ایک ہاتھ اُٹھاکر اور چیخکر کہا "ساجن"! پھر میری طرف بھاگی۔ جگہ جگہ نشیب و فراز تھے۔ کبھی وہ سامنے آجاتی اور کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی۔ میرا دل اب ذرا کچھ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شاید میں بھی گاؤں والوں کی طرح اسے ایک غیر مادّی چیز ہی سمجھ رہا تھا۔ وہ میرے نزدیک پہونچ گئی۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی:۔
"تم آگئے ساجن؟"
اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ پیشانی پر عرق کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ کوئی بیس بائیس کے قریب سن و سال تھا۔ لانبے سُنہری بال تھے جو شانوں پر بکھرتے ہوئے کمر سے نیچے پہونچ رہے تھے۔ غزال کی طرح موٹی دنبالہ دار آنکھیں تھیں۔ اُبھرا ہوا سینہ پھٹے ہوئے کرتے کے اندر سے جوانی کے جذبات کا ترجمان تھا۔ ہلکی سانولی رنگت تھی اور خد و خال کی دلکشی اس فرسودہ سامانی میں بھی ایک شانِ دلرُبائی پیدا کر رہی تھی۔ یہ پیکر خاکی جس انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا قلم اس کیفیت کو بیان نہیں کرسکتا۔ چہرے پر مایوسی برس رہی تھی اور خوبصورت سیاہ آنکھیں جن کی مستی شاید کسی وقت چشمِ آہو کو بھی شرمندہ کرتی ہو۔ اُس افعی کی آنکھوں کی طرح میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے سپیرے کی بین نے مسحور بنا رکھا ہو۔

وہ کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی پھر ایک آہ بھر کر بولی ۔

"نہیں! نہیں! مجھے دھوکا ہوا"

پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی ۔

"تم میرے ساجن کا سندیسہ لائے ہو گے ؟"

میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔

"نہیں! " اس نے تعجب سے کہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگی "کون ہو تم ؟ "

پھر ایک قہقہہ لگا کر "شاید تمہاری گائے کھو گئی ہوگی. اُسے ہی تلاش کر رہے ہو نا ؟ "

"نہیں! "

"تو تم ہو کون ؟ "

"میں راستہ بھول گیا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"راستہ بھول گئے، کیسے ؟ "

گاؤں والے تو اسے دیوانی سمجھتے تھے۔ لیکن باتوں سے تو وہ ہرگز دیوانی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے پھر پوچھا۔

"کیسے راستہ بھول گئے تم ؟ "

"میں شکار کے لئے نکلا تھا" میں نے جواب دیا "لیکن اندھیرا ہو جانے کے باعث راہ بھول گیا"

"تم گاؤں سے آئے ہو ؟ "

"ہاں! " میں نے کہا "کتنی دور ہو گا یہاں سے ؟ "

"گاؤں تو کچھ دور نہیں" وہ بولی "لیکن میرے ساجن مجھ سے بہت دُور ہیں"

اس کے بال ہوا کے ساتھ رقص کر رہے تھے۔ چاند نے بادل کی سیاہ نقاب چہرے پر ڈال لی تھی اور اس اداس اداس فضا میں یہ جوان عورت واقعی کسی اور ہی دُنیا کی چیز معلوم ہوتی تھی کہ پھر پاس کی چٹانوں سے ایک لکڑ بگڑ کی کرخت سی آواز سنائی دی۔ میں بندوق سنبھال کر تیار ہو گیا کہ نکلے تو ماروں۔

وہ ہاتھ اٹھا کر بولی "مت مارو اسے، جانے میرے ساجن کا سندیسہ ہی لایا ہو"

میں نے بندوق پھر بغل میں دبالی۔

"تم نے تو نہیں کہیں دیکھا ۔ ؟ "

"کسے ؟ " میں نے پوچھا۔

"میرے ساجن کو ! "

"نہیں! " میں نے کہا "کہاں ہے تمہارا ساجن ؟ "

"دل کے پاس آنکھوں سے دُور ! " اُس نے جواب دیا۔

"تم اس وقت ویرانے میں کیوں گھوم رہی تھیں ؟ " میں نے پوچھا۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "ساجن کو ڈھونڈتی تھی۔ وہ آنے کو جو کہہ گئے تھے۔ کل بھی مجھ سے کہہ رہے تھے جمنا میں تو آگیا تم کہاں ہو"

سردی سے ہاتھ شل ہو رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھ جیب میں ڈال لئے۔ وہ بولی "تمہیں جاڑا لگ رہا ہے ؟ "

"ہاں "

"تو آؤ" وہ بولی "میرے گھر چل کر بیٹھو"

"چلو ! "

وہ آگے آگے ہولی۔ میں پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن وہ اس تیزی سے چلتی کہ میں لانبے لانبے ڈگ بھرنے کے باوجود پیچھے ہی رہ جاتا۔ کچھ دیر یوں ہی چلنے کے بعد وہ ایک اونچی سی چٹان کے پاس رکی۔ اُس چٹان کے پاس ہی ایک معمولی سی کوٹھڑی تھی۔ گھاس پھوس کی چھت تھی۔ وہ ہنس کر کہنے لگی "یہ ہے میرا گھر۔ اندر چل بیٹھو۔ میں آگ جلا دونگی تم آگ تاپو میں ساجن کو تلاش کرنے جاؤنگی۔ ٹھیک ہے نا ؟ "

یہ کہتے ہوئے وہ اندر گئی۔ میں بھی اندر جا کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں پاس ہی ایک گڑھے میں کچھ چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ اس نے ان چنگاریوں پر سوکھی گھاس ڈالی اور پھونکیں مارنے لگی۔ پہلے دھواں نکلنے لگا پھر شعلے۔ آگ جلنے سے کمرے میں خاصی

روشنی ہوگئی۔ ایک کونے میں سوکھے پتّوں کا انبار لگا تھا۔ اِدھر اُدھر کچھ لکڑیاں بھی رکھی تھیں۔ ایک دو مٹی کے گھڑے بھی تھے۔ اور ایک پھٹا پُرانا کمبل تھا۔ یہ تھی اس کوٹھڑی کی کُل کائنات۔

"بیٹھ جاؤ" وہ بولی۔ "وہ کمبل رکھا ہے۔ جاڑا لگتا ہو تو اوڑھ لو"

مَیں آگ کے پاس بیٹھ گیا۔

"بیٹھ جاؤ نا تم بھی!" میں نے کہا۔

"نہیں!" وہ بولی۔ "مَیں تو جاؤں گی"

"کہاں جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"ساجن کو ڈھونڈنے" اس نے جواب دیا۔ "وہ جو آنے کو کہہ گئے تھے"

"تو پھر مَیں اکیلا کیا کروں گا" میں نے کہا۔ "مجھے گاؤں کا رستہ بتا دو"

"تم ابھی جاؤ گے؟"

"تو اور کیا!" میں نے کہا۔ "ہاں! یہ تو کہو تمہارے ساجن گئے کہاں؟"

"تمہیں معلوم نہیں"

"نہیں!"

تعجّب سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"تم گاؤں میں نہیں رہتے؟"

"نہیں!"

"تو تم میری بات سُنو گے؟" اُس نے میرے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! کیوں نہیں"

"تم مجھے دیوانی تو نہیں کہو گے؟"

یہ کہکر وہ اُٹھکر کھڑی ہوگئی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھکر اور میری طرف جُھک کر بولی "کیوں جی؟ جو ساجن کو ڈھونڈے وہ دیوانہ ہوتا ہے؟"

"کون کہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ نا!"

وہ پھر بیٹھ گئی۔

"پانچ دیوالیاں کتنا عرصہ ہوتا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"پانچ سال!"

"ٹھیک!" وہ سر ہلاکر بولی۔ "پورے پانچ سال۔ میں تو ساجن کے جانے کی ایک ایک گھڑی گنتی رہتی ہوں"

"کیا ہرج ہے" میں نے کہا۔

"میں بھی گوالے کی بیٹی ہوں" وہ کہنے لگی۔ "وہ بھی گوالا ہی تھا۔ ہم دونوں یہاں اپنی گائیں بھینسیں چرانے کو لایا کرتے تھے۔ اُنہیں بہت گیت یاد تھے۔ ہم دونوں مل کر گایا کرتے۔ بڑے مزے سے۔ ڈھور چگتے چرتے۔ ہم گیت گاتے درختوں پر چڑھ کر پھل اُتارتے۔ دونوں مل کر کھاتے۔ پھل کھاتے اور گیت گاتے"

میں آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ وہ زور سے میرے زانوں پر ہاتھ رکھکر بولی "سُن رہے ہو؟"

"اے سُن تو رہا ہوں"

"اس کوٹھڑی میں پہلے کوئی بیراگی رہا کرتا تھا۔ لیکن وہ ہمارا بیاہ ہونے سے پہلے ہی کہیں چلا گیا۔ جب پانی پڑتا تو ہم یہاں آ بیٹھتے۔ ڈھور چرتے چگتے۔ ہم گیت گاتے۔ بڑے مزے سے۔ پھر ہمارا بیاہ ہوگیا۔ ہم گاؤں میں رہنے لگے۔ ہمارے پاس بہت سے ڈھور ہوگئے۔ ابھی میرے ہاتھوں کی مہندی میلی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک روز میں چولھے کے پاس بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ ساجن پاس بیٹھے کھا رہے تھے، ساجن جو تھے۔ اتنے میں گاؤں کا پٹیل تھانے کے دو سپاہی ساتھ لئے آگیا۔ میں نے گھونگٹ نکال لیا۔ ساجن بولے "آئیے مہاراج بھوجن کیجئے۔"

لیکن پٹیل ڈانٹ کر بولا "چل بے! سرکار نے بلایا ہے"

"مجھے!" ساجن نے تعجب سے کہا۔ "کیا جرم کیا ہے میں نے؟"

"جرم ورم کی ہم نہیں جانتے!" پٹیل نے اکڑ کر کہا۔ "تیرا نام

فوج میں لکھا گیا ہے۔"

یہ سُنکر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گاؤں میں کئی روز سے پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ گبھرو جوان زبردستی بھرتی کئے جاتے تھے۔ ساجن بولے "ناہاراج! میں تو نوکری نہ کرونگا۔"

"نوکری تو تیرا باپ بھی کرے گا" پٹیل نے غصّے سے کہا۔

"کوئی زبردستی تھوڑی ہی ہے" پاس سے میں نے ہولے سے کہا۔

"چُپ رہ چھوکری" پٹیل نے جھڑک کر کہا۔

پھر ایک سپاہی بولا "سُن بے! تنخواہ بھی ملے گی اور انعام بھی۔"

"مجھے تنخواہ ونخواہ نہیں چاہیئے" ساجن نے بھی ذرا غصّے سے کہا۔

یہ سُنتے ہی ساتھ والے نے پاؤں سے ساجن کے ٹھوکر مار کر کہا "پہر بھر سے کھڑے تری بکواس سُن رہے ہیں۔ چل ورنہ دوسرا انتظام کرتا ہوں۔"

ہم غریبوں کی کچھ پیش نہ گئی اور وہ ساجن کو پکڑ لے گئے۔ میں بھی روتی ہوئی ساتھ ہولی۔ کچھ دُور جا کر ساجن نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا "جمنا! چنتا مت کیجیو۔ میں جلدی آجاؤنگا۔"

"آہی جائیں گے۔ کہہ جو گئے تھے۔ ساجن آئینگے تو میں اپنا لال جوڑا پہنوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں! ہاں!" میں نے کہا "کیوں نہیں آئیں گے۔"

"نہیں!" وہ میری طرف رازداری کے انداز سے دیکھکر کہنے لگی "وہ تو آچکے۔ مجھ سے چھپے رہتے ہیں کہیں۔ کل میں یہاں لیٹی ہوئی تھی۔ ساجن دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔ لیکن وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر مجھے پکار کر کہا۔ جمنا! ڈھونڈھ لو مجھے! لو میں اب جاتی ہوں، انہیں ابھی ڈھونڈھ کر لاتی ہوں۔ لیکن اب میں ان سے بولنے کی نہیں۔ ملینگے تو روٹھ جاؤں گی میں بھی۔ چھپے جو ہیں مجھ سے! ٹھیک ہے نا!"

اتنا کہہ کر وہ اُٹھی اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

***

جمنا کے جاتے ہی کٹیا بھیانک بھیانک سی نظر آنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ عارضی ماہتاب پھیکا پڑ چکا تھا۔ محفلِ انجم سرد پڑ چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں نے خیمے ڈیرے لگا رکھے تھے اور کُہسار کی فضا پر کُہر کی ہلکی سی شبنمی تنی ہوئی تھی۔ گھڑی تو میرے پاس نہیں تھی جو وقت معلوم ہو سکتا لیکن قیاساً پو پھٹنے والی معلوم ہوتی تھی۔ میں ایک پتھر پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر اس بدنصیب عورت کو دیکھنے لگا۔ ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ پھر ایک بار وہی سوز بھری آواز سُنائی دی ؂

اب رات ہو چکی ہے گلریز کُہسارو
دن رات سر پٹکتے رہتے ہو آبشارو
پیتم مرا کہاں ہے اے نور پاش تارو
تم سے اگر ملے تو یہ کہنا ماہ پارو
پیارے تمہاری جوگن اسوقت نیم جاں ہے
اور پوچھتی تھی ہم سے پیتم مرا کہاں ہے

***

میرا جی بھر آیا۔ جنگ تو ختم ہو چکی تھی اور جن کے نصیب میں گھر دیکھنے تھے وہ واپس آ چکے تھے۔ اس وقت جمنا ایک بلند چٹان پر کھڑی تھی۔ اس کے بال سانپوں کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے اور وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے بادل کے ایک ٹکڑے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا اس کی طرف چلا لیکن میں ابھی چٹان کے دامن میں پہونچا ہی تھا کہ اُس نے زور سے ایک قہقہ مارا اور خوشی سے بولی ؂

"وہ آ گئے ساجن!"

یہ کہتے ہوئے وہ بھاگی اور چشم زدن میں ایک کھڈ میں جا گری

"ساجن" یہ اُس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔

دن چڑھے جب میں گاؤں میں پہونچا تو میرے نشان بتلانے پر گاؤں والے اس بدنصیب کی لاش اُٹھا لائے اور ندی کے پاس مذہبی رسوم کے ساتھ اسے جلا دیا۔ وہی جمنا جسے یہ لوگ دیوانی کہتے تھے اب یہ سادہ لوح اسے دیوی کہنے لگے۔

ایم۔ اسلم۔

شبِ گُل

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی پھُول تھے نکہت فروش
ذرہ ذرہ تھا فضائے ناز کا جنّت بدوش
میں تھا غرقِ حُسن اور تُو تھا شبابِ برق پوش
ہائے کیوں کر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

تو میری آنکھوں میں تھا شہزادۂ نرگس نگاہ
وہ سُنہری بال، وہ قد، وہ خرامِ حشر گاہ
پھُول سے رُخسار، آنکھیں نیلگوں ٹیڑھی کلاہ
ہائے کیوں کر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ طرب کا جشن وہ گلگوں لبوں کا اہتزاز
وہ مُعطّر پنکھڑیوں کا جلوۂ بادہ نوازہ
وہ نویدِ رنگ و بوہ لذّتِ مینا گداز
ہائے کیونکر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ مرا کچھ پوچھنا وہ تیرا حُسنِ التفات
وہ بکھرنا زُلف کا وہ عشرتِ جامِ حیات
کیا کہوں کیا چیز تھی وہ رات اے شاخِ نبات
ہائے کیونکر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

یاد ہے وہ قہقہوں کے موتیوں کی آب و تاب
چاندنی نغمہ لطافت، موجۂ جوئے شراب
زندگی، معصومیت، رنگینیاں جوشِ شباب
ہائے کیوں کر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ ترا تصویر بننا وہ غُرورِ اشتعال
وہ محبّت کی نگاہیں وہ سرورِ قیل و قال
وہ تبسّم وہ ضیائے چشمکِ رُوحِ جمال
ہائے کیوں کر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

ایک لحن رنگ و ریشم تھا سکوتِ اختلاط
حُسن میں ڈوبی ہوئی تھی کارگاہِ انبساط
عشق تھا سرچشمۂ حُسنِ طرب زار نشاط
ہائے کیوں کر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

بھُول سکتا ہوں کبھی وہ ساعتِ رنگیں عذار
وہ ترا دینا ادائے خاص سے جامِ بہار
وہ متاعِ جلوہ کی رعنائیاں وہ لالہ زار
ہائے کیونکر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

وہ ترا کاوش پہ کرنا بارشِ لُطفِ عظیم
وہ ترا ہنسنا ہنسانا وہ ترا ذوقِ سلیم
وہ نشاطِ رقص، وہ بربط وہ سیلابِ شمیم
ہائے کیوں کر میں شبِ گُل کی حکایت چھوڑ دوں

کاوش حیدر آبادی

"مسٹر کرٹھلے" کے دو باب۔

اُلّو

غالباً یور رائل ہائنس نے اُلّو دیکھا ہوگا۔ نہ دیکھا ہو تو سُنا تو ضرور ہوگا۔ اِس جانور کو مشرق و مغرب میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ اور اس کے بارے میں روایات مشہور ہیں۔ مغرب کی جملہ روایات سے خود ہز رائل ہائنس مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہونگے۔ جہانتک مجھے معلوم ہے اُلّو کو مغرب میں عقلمند اور مبارک سمجھتے ہیں اور سچ ہوا جاتا ہے کپلنگ کا کہنا۔ کیونکہ بدقسمتی سے اُلّو کو مشرق میں نہ صرف بیوقوف بلکہ منحوس بھی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ اُلّو کی بیوقوفی اس قدر عام ہے کہ ہماری معاشرت اور زبان میں اس جانور کے نام نے عجیب و غریب طرح دخل پایا ہے۔

ذرا خیال فرمائیے گا کہ ہماری زبان میں لفظ "اُلّو" ایک شائستہ گالی ہے۔ نوکر کو آقا جھڑکتا ہے تو "اُلّو" کہتا ہے۔ اِس سلسلے میں مرکب الفاظ بنائے گئے ہیں۔ زیادہ غصّہ کی حالت میں لوگ دوسرے کو "اُلّو کا پٹھا" یا "اُلّو کا بچّہ" کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ "اُلّو کا لڑکا" ہرگز نہیں کہیں گے ورنہ زبان کے لحاظ سے یہ حد درجہ غیر فصیح جُملہ ہوگا۔ ان جُملہ اُمورِ زبان و روایات کو مدّنظر رکھتے ہوئے اب میرا قصّہ سُنیئے۔

یہ تو سب کچھ ہے لیکن یور ہائنس یقین فرمائیں کہ مجھکو قطعی نہیں معلوم تھا کہ یہ مُبارک یا نامُبارک جانور یا اُس کا نام کسی طرح میری زندگی کے واقعات پر اس طرح اثر انداز ہوگا۔

اب مَیں درخواست کرونگا کہ میری گُذشتہ کہانی کو قطعی نظر انداز فرما کر یہ سمجھیں کہ وہ زمانہ طالبعلمی تھا اور وہ باتیں کہیں سے کہیں پہونچیں۔ وہ زمانہ ختم ہوا اور مَیں دُنیا کے جھگڑوں اور روزی کی فکروں میں پھنس گیا۔

برسرِ روزگار ہوتے ہی مجھکو یہ علم ہوا کہ خیر سے تعلیم ختم ہونے سے کچھ قبل ہی سے والدین میری شادی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے تین جگہ میری شادی کی تجویز کی لیکن بدقسمتی سے اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔

والد صاحب قبلہ نے مجھے حکم دیا کہ اُن کے ایک دوست کے یہاں جاکر دہلی ٹھہر جاؤں۔ دراصل دہلی میں ایک جگہ میری شادی طے ہو رہی تھی اور اب یہ قرار پایا کہ میرے والد کے دوست میرے پہونچنے پر اُن حضرت کی دعوت کریں گے جو مجھے اپنی فرزندی میں لینے کے لئے پھُسلائے جا رہے تھے اور قبل رام ہونے کے مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ اُن کی سمجھ تھی ورنہ میری تصویریں تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔

دن بھر کا راستہ طے کر کے مجھے شام کو دہلی پہونچنا تھا۔ میں نے انٹر کلاس کا ٹکٹ لیا۔ مَیں چونکہ بر دکھاوے کو جا رہا تھا لہٰذا میں نے اپنے ایک دوست کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ انکے علاوہ ایک اور ہم عمر ہمسفر تھے۔ بہت جلد ہم تینوں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔

دوسرے مُسافروں میں ایک صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ اُن کی پچاس پچپن برس کی عمر ہوگی۔ ایسے رئیس اور آرام طلب کہ ایک پوری بنچ پر قبضہ کئے بیٹھے تھے اور ساتھ میں وہ رئیسانہ لوازمہ کہ دیکھا کیجئے۔ ریل کا تو سفر اور ساتھ میں حقّہ۔ پاندان۔ کوئلہ۔ برف۔ قرآن شریف۔ ناشتہ دان۔ لوٹا گلاس۔ کٹوردان۔ بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ معلوم ہو کہ گھر پر بیٹھے ہیں۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن بدقسمتی سے یہ حضرت بلا مبالغہ ہر اسٹیشن پر اپنے ایک نوکر کو پکارتے تھے جو تھرڈ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ پکارتے وہ اِس طرح تھے کہ یہی سمجھ میں نہ آسکا کہ اس بدتمیز نوکر کا نام "اُلّو" ہے یا "حسینا"۔ وہ پکارتے تھے "ابے اُرسینا..... ابے اُلّو" اور وہ بھی اس دلکش لہجے میں کہ سُننے والوں پر رقت طاری

ہو جائے۔ اس کو بھی برداشت کر لیا پر مصیبت اور تھی۔ وہ یہ کہ یہ حضرت حسینا اس لئے طلب ہوتے تھے کہ سارا درجہ زیر و زبر کر دیں۔ مثلاً حقہ کی چلم "اُس طرف" لے جاکر پھونکیں یا درست کریں تاکہ اُس کی خاک بجائے اُن کے بچھونے کے ہماری آنکھوں میں آئے۔ خیر سے اگالدان بھی ساتھ ہی تھا لہذا اُس کا پانی حضرت حسینا ہماری سائڈ کی کھڑکی میں پھینکیں۔ حُسینا صاحب کھڑے ہوں تو ہمارے سروں پر۔ اور آمد و رفت میں ہماری ہی ناک کی پھنگیوں میں اپنے کپڑے رگڑیں۔ ایک منٹ میں دس مرتبہ ہم اُن کی آمد و رفت کے لئے ٹانگیں ہٹائیں یا اخبار سمیٹیں۔ جوتے ہیں کہ حسینا کچلے دے رہے ہیں۔ کہیں بستر پھاندے جا رہے ہیں کہیں ہماری بیچ پر ان کو پیر رکھکر اوپر کے مچان سے کوئی چیز اتارنے کی ضرورت ہے۔ بزرگ آدمی ویسے ٹھہرے کیا کہیئے۔ مگر بدعتیں بھی محدود ہوں۔ نتیجہ یہ کہ اور تو بس نہ تھا۔ اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ پہلے تو میں نے یہ عرض کیا کہ آئندہ جو ضرورت ہو تو حسینا کے بجائے یہ خادم حاضر ہے۔ اس پر التفات نہ ہوئی بلکہ بولے کہ:۔

"جناب آپ منع نہیں کر سکتے"

میں نے کہا "قبلہ جہنمی ہو جو منع کرے" مگر وہ منہ پھلا کر خفا ہو کر بیٹھ رہے۔ خیر۔

دوسرا اسٹیشن جو آیا تو اُن کو تو ضرورت نہ تھی لیکن مجھے کچھ اور سوجھی لہذا میں نے کھڑکی سے گردن نکال کر چیخنا شروع کیا "ابے اُلّو۔۔ ۔۔۔ابے اُلّو" خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر۔ یور رائل ہائنس کیا آپ یقین فرمائیں گے کہ سچ مچ حُسینا دوڑا چلا آتا ہے!! ادھر میرا اور میرے دوست کا اور دوسرے مُسافروں کا یہ حال کہ مارے ہنسی کے لوٹے جا رہے ہیں اور اُدھر اُن کا حال؟ نہ پوچھئے۔ مارے غصے کے لرز گئے اور ڈانٹ کر کہتے ہیں حسینا سے "ابے اُلّو، تجھے کس نے بلایا ہے؟" مرے پہ سو دُرّے وہ مضمون ہمارا۔ حال یہ کہ معلوم ہو کہ ہنستے ہنستے شاید مر جائیں گے۔

بمشکل ہنسی ختم ہوئی۔ لاکھ جتن کئے۔ اخبار پڑھا۔ دل بہلایا تب جاکر ہنسی کم ہوئی۔ اب میرے دوست نے مجھکو اور میں نے اُن کو "اُلّو" کے لفظ سے مخاطب کرنا شروع کیا۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا "تم بھی عجیب اُلّو ہو" میرے مُنہ سے برجستہ نکلا "ہم بھی کیا لاجواب اُلّو ہیں"

اس مصرعہ کو سُن کر وہ حضرت چونک پڑے اور میرے اوپر برس پڑے۔ میں نے بہت کچھ معذرت کی۔ سمجھایا کہ قبلہ و کعبہ یہ میرے دوست ہیں میرا ان کا مذاق ہے۔ میرے علاوہ اس درجہ میں کوئی اور اُلّو نہیں ہے مگر وہ نہ مانے۔ بمشکل لوگوں کی سفارش پر انہوں نے جان بخشی کی۔ مگر اب ادھر میری طبیعت حاضر اُدھر میرے دوست کی۔ شاعری ہونے لگی۔ مصرعہ پہ مصرعہ نازل ہونے لگا۔ چند یاد ہیں:۔

ہم بھی کیا لاجواب اُلّو ہیں   آپ عالی جناب اُلّو ہیں
جسکو لینا ہو لے علیگڈھ میں   اِن دنوں دستیاب اُلّو ہیں

شباب اُلّو ہیں۔ کباب اُلّو ہیں۔ شراب اُلّو ہیں۔ غرض کوئی لفظ نہ چھوڑا جسکو گھسیٹ نہ مارا ہو۔ ان سب کچھ باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی اسٹیشن تک وہ اُلّو حسینا نہ آیا۔ پکارنے ہی کی ہمت نہ پڑی۔ پھر خود ہی آیا جو سہی تو حضرت پوچھتے ہیں کہ "ابے اُلّو کیا مر گیا تھا"

اب خود سوچئے کہ میں نہ ہنسوں لیکن دوسرے لوگ ہنسیں تو میں کیا مُنہ پکڑلوں۔ خیر، حسینا صاحب آئے اور ہدایت ہوئی کہ بکس میں سے تولیہ نکالو۔ وہ نکالی جو سہی تو ساتھ ہی اُس کے ایک شیشی پھٹ سے نیچے گری اور ٹوٹ گئی۔ اس میں سے کچھ دوا بہہ نکلی۔ "ابے اُلّو یہ کیا؟" معلوم ہوا کہ خضاب کی شیشی تھی جو ٹوٹ گئی۔ فوراً فرمایا کہ "ابے دوسری شیشی کیا ہوئی؟" اُس نے جواب دیا کہ "چھاؤنی گیا تھا نہیں ملی"

چیخ کر بولے "نہیں ملی ؟"
اُس نے کہا "جی نہیں ملی"
ڈانٹ کر بولے "تجھے معلوم تھا کہ پرسوں دعوت ہوگی۔۔۔اب ؟۔۔۔" یہ کہکر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ سوچنے لگے۔
خود سوچئے کہ خضاب کی شیشی ایک تو ٹوٹ گئی دوسری لاپتہ۔ یہاں شاعری کا یہ عالم کہ لغت ختم ہوگئی۔ سب قافیہ کباب۔ شراب۔ ختم ہولئے پر خضاب کا خیال تک نہ آیا۔ سامنے ایک عدد ڈاڑھی بے خضاب! شیشی پھوٹی ہوئی! طبیعت یوں بھی حاضر کہ کس مقصد کیلئے جارہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ شعر موزوں ہوگیا۔ اور ایسا کہ ناممکن کہ اپنے دوست کو نہ سُنائیں۔
میں نے کہا "یار غضب کا شعر ہوگیا ؎　　چھاؤنی میں نہیں ملی شیشی لو
میں نے مصرعہ دوبارہ اُٹھایا ؎
عرض کیا ہے:-　　　　چھاؤنی میں نہیں ملی شیشی
جب سب متوجہ ہوگئے تو میں نے دوسرا مصرعہ کہدیا:-
"اِن دِنوں بے خضاب ۔۔۔۔۔"
یور رائل ہائنس میں عرض نہیں کرسکتا کہ کیا ہوا۔ بس قتل نہیں ہوا۔ ہاتھا پائی بھی نہیں ہوئی اور نہ کوئی مسافر ہنسی کے سبب مرا۔ سب بال بال بچے۔
اس کے بعد خیریت ہی ہوئی جو دہلی کا اسٹیشن آگیا۔ میں نے ہاتھ جوڑے۔ پیر پکڑے اور معافی مانگی مگر وہ حضرت نہ مانے اور یہی کہا کہ "میاں مجھے تم خود معاف کرو"۔
میں مع اپنے دوست کے اپنے والد صاحب قبلہ کے دوست کے مکان پر پہونچا۔ یہ شخص سرکاری ملازم نہایت ہی سُلجھی ہوئی طبیعت کے اور متین اور باوقار شخص ہے۔ میرے بارے میں نہایت ہی اچھی رائے رکھتے تھے۔
تیسرے دن دعوت ہوئی۔ میں نے اپنے کو کپڑوں وغیرہ سے اس طرح دُرست کیا جیسا کہ چاہئیے۔ ڈاڑھی بنانے میں حد درجہ مُبالغہ کیا۔ بال سنوارے میں۔ اسی طرح بہترین کپڑے اور بہترین وضع سے پہنے۔ اپنے ہونے والے خُسر سے مُلاقات کرنا تھی!۔
دعوت سے کچھ قبل مہمان آئے۔ معلوم ہوا کہ صرف چار حضرات اور آئیں گے۔ تین حضرات آگئے اور اب مجھے چوتھے کا بیحد ہی انتظار تھا جن کی صاحبزادی کا شوق مجھکو یہاں تک لایا تھا۔ اور یور رائل ہائنس آپ یقین کیجئے گا کہ یہ حضرت آئے۔ کاش وہ تنہا آتے۔ آہ! مگر ایسی میری تقدیر کہاں۔ ساتھ میں "اُلّو" بھی تھا۔ اُن کو دیکھتے ہی میرا عجیب حال ہوگیا۔ عمر میں شاید ایسی عبرتناک حالت کسی کی نہ ہوگی۔ مجھے ان کا گمان تک نہ تھا! اور انکے آنے سے میری حالت ابتر ہوگئی۔ میں اس وقت موت مانگتا تھا پر ہنسی ملتی تھی۔ ہنسی روکنے کے لئے میں نے دانتوں سے زبان کاٹ لی۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ شاید کام چل جاتا۔ اگر ساتھ میں حسینا نہ ہوتا یا میرے دوست نہ ہوتے۔ نتیجہ حد درجہ غمناک نکلا۔ جی ہاں غمناک۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب قبلہ کے دوست اُن کی پیشوائی کے لئے بڑھکر مصافحہ کرکے جو اُن کا تعارف مجھ سے کرانے بڑھے ہیں تو میں حتی الوسع ہنسی کو روکتا ہوا یہ کہکر بھاگا کہ "ابھی حاضر ہوا"۔ لاکھ چاہا کہ کمرے میں گھس جانے کے بعد ہنسی کی آواز نہ نکلے۔ کمرہ کمبخت دُور بھی نہ تھا۔ مگر تقدیر۔

کمرے کے بالکل اندر گھس گیا اور بیچ بیچ اپنے کلّے پر گھونسے مارے، اتنے زور سے کہ جبڑہ ہل گیا تب کہیں جاکر اس قابل ہوا کہ خاموشی نصیب ہوئی۔ دوڑ کر غسل خانہ میں پہونچا۔ منہ دھویا۔ کھنکارا۔ اللہ سے دعا مانگی کہ الٰہی میری مشکل حل کردے۔ اور یٰسین شریف دل میں پڑھتا ہوا باہر نکلا۔ کیونکہ قرآن پاک پڑھنے میں مجھے دعویٰ ہے کہ ہنسی روک سکتا ہوں۔ مگر یور رائل ہائنس یقین فرمائیں کہ میرا یہ دعویٰ ہرگز ناکام نہ ہوتا اگر کم سے کم وہاں حسینا نہ ہوتا۔ میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی ہے کہ یٰسین شریف بھول گیا اور پھر لوٹنا پڑا۔

لوٹتے ہی میں نے دیکھا وہ حضرت اٹھکر چلنے لگے۔ ان کو لاکھ روکا۔ لاکھ پکڑا۔ مگر وہ نہ مانے اور چلے گئے۔

مَیں عرض نہیں کرسکتا میرا کیا حال ہوا۔ تن بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ موت کی سی ٹھنڈک بیٹھ گئی۔ سناٹے میں آگیا۔ اور اب ہنسی بھی جاتی رہی۔ مَیں کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اتنے میں میرے میزبان صاحب نے آواز دی۔

مَیں کیا کرتا۔ پہونچا۔ سب چُپ چپ تھے۔ میں بھی جاکر خاموش بیٹھ گیا اور طبیعت کی ناسازی کا عذر کیا، اختلاجِ قلب کا عذر کیا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔

مجھے اپنے دوست سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت یہ کہکر گئے ہیں کہ آدھ گھنٹہ بعد آتا ہوں اور محض اسی اجازت کے لئے اترا تھا۔ اور یہ سنتے ہی میرا دل بیچ بیچ پھر دھڑکنے لگا اور دل ہی دل میں مَیں نے دعا مانگی کہ الٰہی اگر وہ آئیں تو کم از کم ایسا گنہگار تو مَیں نہیں ہوں کہ میری اتنی دعا قبول نہ ہوگی کہ حسینا ان کے ساتھ نہ آوے۔

لیکن نہیں، وہ نہیں آئے۔ ان کا انتظار کیا گیا۔ پھر آدمی گھر پر بھیجا گیا تو انہوں نے کہلا دیا کہ دفعتًا انکی طبیعت ناساز ہوگئی ہے اور وہ معذرت چاہتے ہیں۔ بیچ مجبور ہیں۔ سب کے سب خاموش ہوگئے۔ سمجھ گئے۔ دعوت انتہائی خاموشی سے ہوئی —— اور مجھ سے کچھ نہ کھایا گیا۔

دوسرے روز صبح کی گاڑی سے مَیں مع اپنے دوست کے بھاگ آیا۔ میرے میزبان خاموش رہے اور انہوں نے نہ تو ایک لفظ کہا اور نہ مجھے روکا۔

گھر پر والد صاحب نے جو پوچھا تو میں نے کہدیا کہ میں نے تو ایسا سنا ہے کہ انہوں نے لڑکی کی دوسری جگہ کہیں رئیسوں میں منگنی بھی کردی۔ والد صاحب نے فورًا کہا۔ "اوہو۔ میں سمجھ گیا" پھر مجھے الزام دیا کہ میں ٹالتا رہا اور دیر کردی۔ اور پھر میری شومیِ تقدیر پر اظہار تاسف کیا۔

لیکن تیسرے دن میرے والد صاحب کے دوست کا خط پہونچا۔ اس میں کیا لکھا تھا۔ یہ مت پوچھئے۔ اس لئے کہ صحیح میں بتاؤنگا نہیں اور جھوٹ بولنے سے فائدہ کیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ والد صاحب نے یہ کہدیا کہ "تم انتہا سے زیادہ نالائق ہو اور اب ہم تمہارے معاملے میں کبھی نہ پڑیں گے" والدہ صاحبہ خوب روئیں۔ میں گھر سے فورًا ہی نوکری پر بھاگا۔

یور رائل ہائنس، خود غور فرمائیں کہ بھلا اس میں میری کیا خطا تھی۔ یہ تو تقدیر کا بدا تھا۔

کلّو

یور رائل ہائنس نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح میری شادی کی تجویز نذرِ الّو ہو گئی لیکن میری دوسری شادی نذرِ کلّو ہوگئی۔ یہ کلّو کون تھی؟ میرے دوست جو دہلی کی الّو والی مہم میں میرے شریک تھے۔ ان کا اصلی نام کلّو نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا لیکن عرفیت ان کی کلّو تھی۔ یہ کالے تھے اور اسی مناسبت سے ان کے والدین نے ان کا نام کلّو رکھدیا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں کالے اور گورے کے تعصب سے بالا ہوں اور میرے سب سے گہرے دوست بھی کلّو تھے لیکن بخدا مجھکو یہ خبر نہ تھی کہ ع۔ کالے کی دوستی کا نتیجہ خراب ہے

اور ان کے چہرے کی کالونچ کسی طرح میرے نجی معاملات میں بھی مخل ہوسکے گی۔

دہلی والے واقعہ کے بعد والد صاحب قبلہ بہت دن تک مجھ سے خفا رہے۔ لیکن تا کے۔ ایک دن خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ایک خان بہادر کی لڑکی سے شادی طے ہو رہی ہے اور نصیحت فرمائی تھی کہ آئندہ کسی قسم کی حرکت نہ کروں۔ اس شادی کی خط وکتابت طے ہوکر کوئی اُن کا آدمی آیا، وہ مسخرہ مجھے چپکے اور بے چپکے سے دونوں طرح دیکھ گیا۔ پھر بھی خان بہادر صاحب کو صبر نہ آیا اور انہوں نے اب خود مجھے طلب فرمایا۔ طے یہ ہوا کہ انہی کے یہاں جاکر ٹھہروں۔ میں اس سے بیحد گھبرایا اور یہ سوچا کہ یہ امتحان تو اس سے بھی مشکل ہے۔ بھلا کیسے بھگتونگا۔ یہ تو طے کرلیا کہ ہنسونگا قطعی نہیں۔

اسٹیشن پر ہمیں لینے کے لئے موٹر آیا۔ ایک نہایت ہی ٹھاٹھ کے بنگلے میں جاکر ٹھہرے۔ خان بہادر صاحب بڑے خلیق تھے آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین بھی تھے۔ زمیندار بھی تھے تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ دوسری بیوی کی سب سے بڑی لڑکی سے شادی ٹھہر رہی تھی۔ ہم دونوں بڑے آرام دہ کمروں میں ٹھہرائے گئے۔ رات کو بڑا تکلف کا کھانا مارا۔ اور کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں دوستوں نے چند امور پر غور کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم خود بھی لڑکی کو دیکھیں! کیوں نہ کوشش کریں۔ دویم یہ کہ وہ مجھے ضرور دیکھے گی۔ بلکہ شاید بلایا ہی اسی لئے گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تب کیا کریں۔ خان بہادر صاحب کے کئی بچے مختلف سائز کے تھے۔ ایک ان میں سے کوئی چار برس کا بڑا باتون اور پیارا بچہ۔ دوسرے دن بعد ناشتے کے خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے باتیں پوچھیں۔ لہٰذا میرے دوست نے اس سے پوچھا کہ "بھئی تمہاری آپا گوری ہیں کہ کالی؟"

وہ ہنسکر بولا "گوری"

میرے دوست نے اپنے چہرے کی طرف انگلی رکھکر کہا "ایسی" (وہ خوب کالے تھے)

لڑکا ہنسکر اور ٹیڑھا ہوکر بولا "نہیں" زور سے سر ہلانے لگا "ہماری آپا گوری ہیں"

میرے دوست ہنسکر بولے "دیکھو۔ اُن سے کہنا کہ ہم تمہیں دیکھنے آئے ہیں"

"ابے او کالے!" میں نے گرج کر کہا "خبردار جو تونے اس دفعہ کٹر بڑکی" اور یہ کہکر میں نے روکدیا۔

مگر انہوں نے بچے سے یاری گانٹھی۔ علیحدہ لے گئے اور خوب باتیں ملائیں۔ مجھکو معلوم بھی نہیں اور ان حضرت نے پھر عجیب حرکت کی۔ ایک انگریزی اخبار پڑا تھا۔ اُس کا ایک صفحہ لیکر عبارت میں الفاظ تلاش کئے۔ اور ان الفاظ کے نیچے سُرخ نشان لگادیا۔ یہ لفاظ اخبار کے ایک ہی صفحے پر تھے لیکن مختلف سطروں اور مختلف کالموں میں تھے جن الفاظ کے نیچے نشان لگایا تھا اُن سب کو ملایا جائے تو حسب ذیل جملہ بنتا تھا۔ "میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اور یہ اخبار لے کر بچے سے کہا کہ اپنی آپا کو دے آؤ۔ پہلے بہ احتیاط یہ پوچھ لیا کہ کہاں بیٹھی ہیں اور اماں کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اپنے کمرے میں علیحدہ بیٹھی ہیں۔ لڑکا پہلے جاکر دیکھ آیا۔ پھر اُسکو اخبار دیدیا۔ وہ اخبار لئے چلا گیا۔ وہاں اندر جاکر اُس نے اپنی بہن کو اخبار دکھایا۔ لڑکی تھی تیز اُس نے لفظوں کو جو پڑھا تو جھٹ سے ایک جگہ اسی اخبار میں لکھا ہوا تھا "نہیں" اُس نے اس لفظ کو خط کشیدہ کر کے

بھیجدیا۔ اور جب یہ اخبار بچّہ لئے واپس آیا اور میرے دوست نے دیکھا تو حضرت نے مُنہ پھاڑ کر مجھے بتایا۔ اور تجویز کی کہ اس کا پھر جواب دینا چاہیئے۔“

مَیں سخت گھبرایا اور میں نے کہا ”میاں کالیا۔ یاد رکھو کہ تمہاری عاقبت بگاڑ دونگا اگر ذرا بھی تم اِس معاملے میں مُخل ہوئے۔ پھر خان بہادر اگلا ویسے ٹھہرا۔ یاد رکھنا ہزار مارے گا ایک نہ گنے گا اور پھر جو شکایت کی کہ سُسرال میں پٹوایا تو ایک نہ سُنونگا۔“

آپ خود غور فرمائیں کہ یہ شخص کس قدر بدتمیزی پر آمادہ تھا۔ یہ کہتا تھا کہ لڑکی کو دیکھ لینا سخت لازمی ہے۔ اور خط و کتابت ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن مَیں نہ مانا۔ اس لئے کہ لڑکی کے باپ اور بھائیوں کو دیکھکر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر ان سے کم و بیش بھی لڑکی ملی تو منظور ہے۔ لہٰذا مزید تفتیش بیکار تھی۔ بہر حال اِن حضرت کو بمشکل روکا۔ خان بہادر صاحب نے تین شبانہ روز بڑی خاطر و مدارات کی۔ خوب سیر کروائی۔ اپنے دوست احباب سے خوب ملوایا۔ کئی جگہ چائے کیک کھلوائے۔ اور ہم وہاں سے خوش و خرّم واپس آئے اور ہمارے پیچھے پیچھے ہی خان بہادر صاحب کا ایک خط ہمارے بارے میں ایسا آیا کہ والد صاحب قبلہ کی باچھیں کھل گئیں کہ او ہو مَیں بھی کسی بیٹے کا باپ ہوں۔ بیحد خوش ہوئے۔ لیکن تقدیر کا بدا کچھ اور تھا۔ میں تو دو دن گھر ٹھہر کر چلا گیا اور اب میرے نام ایک گمنام خط عجیب و غریب پہونچا۔ یہ خط والد صاحب نے جوں کا توں بند مجھے بھیجدیا۔ اب اُس کو جو کھولکر پڑھتا ہوں تو عجیب معمّہ۔ کم و بیش حسب ذیل تھا۔

”جو کتاب آپ کے پاس تھی اُس کو دیکھئے۔

$10\frac{3}{4} + 30\frac{2}{7} + 8\frac{9}{2} + 4\frac{5}{3} + 100\frac{3}{11}$ وغیرہ وغیرہ۔“

غرض اسی قسم کا ایک سوال سا لکھا تھا اور خط ختم۔ اور اس خط پر مُہر اس شہر کی جہاں خان بہادر صاحب رہتے تھے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ میرے دوست کے پاس ایک چھوڑ تین کتابیں ساتھ تھیں جو باہر ہی رکھی تھیں۔ اب مَیں سخت حیران کہ کیا کروں کیا نہ کروں! اور یہ معاملہ کیا ہے۔ اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا میں نے اپنے دوست کو تار دیکر بُلایا۔ وہ آئے تب اُن کو خط دکھایا۔ پوچھا کہ اُن ہی کی کتاب تھی۔ کہنے لگے کہ میری ایک کتاب وہاں رہ ضرور گئی ہے۔ انگریزی کا ناول۔ اُس کا نام بتایا۔ اب بتائیے کیا کریں۔ سوچے کہ خان بہادر ہی کو لکھیں پھر طے ہوا کہ تار دیکر بمبئی سے منگالیں۔ چنانچہ یہی کیا۔

کتاب آئی تو بہت جلد معمّہ حل ہو گیا۔ خیال اسی طرف جا چکا تھا۔ $10\frac{3}{4}$ کا یہ مطلب تھا کہ دسویں صفحے کی تیسری سطر کا چوتھا لفظ! اور ان تمام لفظوں کو جوڑ کر جو جملہ بنایا تو دیوتا کوچ کر گئے کیونکہ آپ یقین مانئے حسب ذیل عبارت سامنے تھی۔

”جس لڑکی سے تمہاری شادی طے ہو رہی ہے وہ لڑکی کسی طرح بھی تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم ایک شریف اور غیور نوجوان ہو اور اُسے اور مجھے دونوں کو عمر بھر کے لئے احسانمند کرو گے۔“

مَیں کیا عرض کروں کہ اس عبارت کو پڑھکر مَیں کیسا گُھل کر رہ گیا۔ حالانکہ میں نے لڑکی کو نہیں دیکھا تھا مگر مجھے یہ لڑکی بیحد پسند تھی۔ لہٰذا میں نے اور میرے دوست نے یہی طے کیا کہ ہو نہ ہو یہ خود اُس نے لکھا ہے لہٰذا قطعی شادی نہ کرنا چاہیئے۔ یہ تو طے ہو گیا لیکن سوال یہ تھا کہ والد صاحب کو کون روکے گا۔ اور اُدھر خان بہادر کو کون روکے گا۔ اس لئے کہ وہاں تو معاملات رفتار پر تھے۔ مجھے والد صاحب قبلہ کے مزاج کی کمزوری کا علم تھا چنانچہ ایک خط نے اُن کو بھڑکا دیا۔ میں نے لکھدیا کہ میں نے سُنا ہے کہ لڑکی ذرا ”ویسی“ ہے۔ اور میں ہرگز

نہ کروں گا۔ اب "ویسی" کی جو تشریح پوچھی تو نہ تو میں نے یہ بتایا کہ کیسی اور نہ یہ بتایا کہ مجھکو کیسے معلوم ہوا۔ جب بیحد دبایا گیا تو میں نے ایک صاحب سے بشرط رازداری زبانی کہدیا کہ وہ خط کتابت کرتی ہے اور میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔ اس سے زائد میں نہیں بتا سکتا۔ آگے والد صاحب کی مرضی ہو تو میں حاضر ہوں۔

والد صاحب یہ سنتے ہی چمک گئے۔ کہاں تو عورتیں لڑکی کا معائنہ کرنے جارہی تھیں اور کہاں جملہ معاملات التوا میں پڑ گئے۔ مجھے نہیں معلوم والد صاحب اور خان بہادر صاحب میں کیا اور کیسی چھنی۔ یہ شادی ایسی ٹلی کہ سال بھر تک پھر کوئی گفت و شنید والد صاحب کی طرف سے نہیں ہوئی۔ لیکن مجھ کو یہ معلوم تھا کہ وہ فکر میں ضرور ہیں۔ مگر اسی دوران میں ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

میں ایک کام سے بریلی جارہا تھا۔ سکینڈ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ میں جو آکر بیٹھا تو ڈبے میں دو مسافروں کو موجود پایا۔ ایک جوان العمر شخص مع اپنی بیوی کے تھے۔ میں آکر خاموش بیٹھ گیا۔ بہت جلد میں نے دیکھا کہ اُن کی نوعمر بیگم صاحبہ نے شاید مجھ کو ضرورت سے زیادہ غور سے دیکھا۔ کئی بار دیکھا۔ میری دیکھنے کی ان کو ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اوّل تو میری عادت بھی نہیں اور دوئم یہ کہ بدقسمتی سے وہ واقعی دیکھنے کی چیز نہیں۔ میں اخبار پڑھنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اُن نوجوان خاتون نے اپنے شوہر محترم سے کچھ باتیں کرنی شروع کیں۔ میں حد درجہ بے چین سا ہوا کیونکہ مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ خاتون اس درجہ میں میری موجودگی کے خلاف ہیں اور گفتگو میرے بارے میں ہو رہی ہے! اور بدقسمتی سے یہ واقعہ بھی تھا۔ میں نے مجبوراً رُخ اپنا دوسری طرف کر لیا۔

لیکن بہت جلد ان حضرت نے میری طرف توجہ کی۔ مجھے سگرٹ پیش کیا۔ پھر ایک آدھ سوال اِدھر اُدھر کا دریافت کر کے کہنے لگے۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

مجھے اس جملے سے ویسے ہی اُلجھن ہے۔ میں نے کہدیا کہ "بہت ممکن ہے دیکھا ہو گا" اس سلسلہ میں میری عادت ہے کہ قصداً میں مقامات کا نام لینے سے گریز کر کے اپنے مخاطب کو قدرے کوفت پیدا کرتا ہوں۔ خود ہی وہ خان بہادر صاحب کا نام لیکر بولے کہ "شاید مجھے وہاں دیکھا ہو گا۔ اب ان نوجوان خاتون کا یہ حال کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مسکراہٹ، شرارت، حجاب اور گھبراہٹ بیک وقت ایسے کہ بیان نہیں کر سکتا اور وہ لاکھ اپنے شوہر مکرم کو روکتی ہیں مگر توبہ کیجیے۔ ایک قہقہہ لگا کر اُنہوں نے کہا۔

"میں آپ کا اپنی بیگم صاحبہ سے تعارف کراتا ہوں۔ آپ ان کو جانتے ہیں اور یہ آپکو"

میں نے بڑھکر مصافحہ کیا اور عرض نہیں کر سکتا کہ میرا کیا حال اور اُنکا کیا حال۔ چوٹ پہ چوٹ وہ حضرت بولے۔

"..... اور مجھے آپ کے اُن کالے دوست سے ہمدردی ہے"

میں نے ہنسکر کہا "قبلہ، ہمدردی تو مجھ سے کیجئے نہ کہ میرے کالے دوست سے"

وہ بولے "کیوں؟"

میں نے کہا "اس لئے کہ قابلِ ہمدردی تو میں ہوں نہ کہ وہ"

وہ بولے "جناب آپ کیوں ہونے لگے"

میں نے کہا "اور پھر کون ہو گا"

اب ذرا اُنہوں نے تجسس کے ساتھ اپنی بیگم صاحبہ کو دیکھا جن کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ اور بولے۔

"آپ... تو..."

میں نے کہا "حضت اُمیدوار تو یہ خادم تھا......"

خود خاتون صاحبہ بھی چونک پڑیں اور وہ بھی بولے "ہیں!"

میں نے کہا "ہیں کیا......"

وہ بولے "آپ کا پیغام گیا تھا کہ ان کا؟ جناب کا اسم گرامی"

میں نے اپنا نام بتایا اور دیکھا کہ دونوں چونک پڑے۔ اور دونوں چُپ۔ اور پھر جو اُنہیں ہنسی آئی ہے تو نہ پوچھئے۔ حقیقت اب کھُلی۔ عجیب لطیفہ رہا۔ اُن کی بیگم صاحبہ نے چاہا کہ ان کا مُنہ بند کر دیں مگر وہ نہ مانے اور اُنہوں نے بتا دیا۔ بات یہ ہوئی کہ ان محترمہ نے مجھے دیکھنا چاہا اور خود اپنے چھوٹے بھائی اور ایک اور سہیلی کی غلطی سے میرے سیاہ دوست کو مجھے سمجھا اور فوراً ہی ناپسند فرما کر اُن کے مشورے سے وہ عجیب وغریب خط لکھدیا۔ جس کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔ محترمہ اپنے شوہر کی زیادتی سے بیحد خفیف اور شرمندہ تھیں۔ انہوں نے بھی غالباً زیادتی کی جو مجھ سے حقیقت کہدی۔ میں نے اُسی وقت اُن دونوں کے روبرو مُصمّم ارادہ کیا کہ آئندہ اس کالے منحوس کو کبھی ایسے مشن پر لیکر ساتھ نہیں جاؤں گا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اس موقعہ پر میں خود چوٹ نہ کرتا۔ لہذا میں نے ان حضرت سے کہا کہ "حضرت۔ معاف کیجئے گا۔ غلط فہمی کو دُعا دیجئے کہ کم ازکم کالے گورے کی تفتیش پھر نہ ہوئی"

اور میں نے دیکھا کہ محترمہ شرم کے مارے عرق عرق ہوگئیں۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ میرا رنگ اُن کے شوہر محترم سے بہت زیادہ صاف تھا۔

قصّہ مختصر بقیہ سفر بہت لُطف کے ساتھ کٹا۔ اور بریلی پر ہم رخصت ہوئے۔ وہ نینی تال جا رہے تھے۔ مجھے یہ اقبال کرنے میں بالکل شرم نہیں آرہی ہے کہ مجھ کو کوفت اور تکلیف ہوئی۔ اور ایسی اچھی صورت شکل کی لڑکی محض غلط فہمی میں ہاتھ سے جاتی رہنے کا بیحد قلق ہوا۔ اور اپنے کالے دوست کے اوپر تو بیحد غصّہ آیا۔ معلوم ہوا کہ کالوں کی دوستی ہی خوب نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے دوست کا رنگ میرے زندگی کے معاملات میں اس قدر دخیل ہوگا۔

ایک موقعہ اُلّو نے کھویا اور دوسرا کالے رنگ نے اور مجھے جب ہی سے اُن تمام قوانین سے اتّفاق ہے جو کالوں کے خلاف دُنیا میں پاس ہوتے رہتے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی۔

میرا ایشیائی محبوب

(مشرق و مغرب کی ایک دلکش داستان)

۱

طلباء یونیورسٹی کی آزاد، بے فکر اور عجیب و غریب زندگی کے حالات سن سن کر میری یہ خواہش روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی تھی کہ جلد از جلد میں بھی کسی یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے چند سال گزاروں۔ چنانچہ اسکول سے فارغ التحصیل ہو کر میں نے اپنی یہ خواہش والدین پر ظاہر کی مگر انہوں نے اسے پسند نہ کیا کیونکہ وہ مخلوط تعلیم کے مخالف تھے۔ تاہم میں اپنی ضد پر قائم رہی اور چونکہ میں انکی اکلوتی اور چہیتی لڑکی تھی اس لئے میرا اصرار ان کے انکار پر غالب آیا اور میں یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔

یہاں میری سہیلی لوسی نے میرا تعارف ایک نوجوان طالب علم جون سے کرایا جو نہایت نیک اور با اخلاق شخص تھا۔ شاید ہم دونوں کے تعلقات آہستہ آہستہ اس قدر بڑھ جاتے کہ میں کسی روز اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتی مگر اُسے اُس نے ایک ایسے شخص سے میری ملاقات کرا کے ناممکن کر دیا جس کی یاد سے آج دل کے ناسور رس رس کر میری زندگی محال کئے دیتے ہیں۔ جون اکثر اس شخص کی تعریف کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس سے زیادہ قابل طالب علم آج تک یونیورسٹی میں نہیں آیا۔ اور یہی نہیں بلکہ بڑے بڑے پروفیسر بھی اُس کی لیاقت اور علمیت کے معترف ہیں۔ اس کا نام ہیری لی تھا اور میری اس سے ملاقات نہایت دلچسپ طریقے پر ہوئی۔ ایک شب تبت کے ایک صوفی عالم کی تقریر سننے کے لئے جب میں اپنی سہیلی کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو تمام جگہیں بھر چکی تھیں جس سے ہمیں بڑی مایوسی ہوئی لیکن اتنے میں میں نے جون کو اپنی طرف بلانے کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ ہم دونوں جون اور اُسکے ساتھی کی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔ جہاں سے وہ ہمارے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں اور ہیری ایک طرف کھڑے ہو جائیں گے، آپ آرام سے بیٹھ جائیے" جون نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

سامعین تقریر سن رہے تھے۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جون اور اس کے دوست کو مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے تھے اور ہیری کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر میں یہ دیکھ کر مایوس کن تحیر میں رہ گئی کہ ہیری لی "چینی" تھا، جس کا جون نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔ بہرحال وہ خوش رو تھا اور اس کے چہرے سے وقار ٹپکتا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے بازوؤں پر رکھے ہوئے تھے اور آنکھیں ——— وہ سیاہ ملکوتی آنکھیں ——— اپنا خاموش اور پُر سکون جادو مجھ پر کر رہی تھیں۔ جب میں نے بمشکل اپنی نگاہیں اُس حسین مرد پر سے ہٹائیں تو آنکھیں ایک دفعہ اور اُس کی طرف دیکھنے کے لئے مچلنے لگیں، دوبارہ، سہ بارہ، نہ جانے کتنی بار! تبت کا بوڑھا صوفی روحانی بارش کر رہا تھا اور میں نے بھی چند لمحات تک اس سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن نہ ... کوشش میرے دل کے خلاف بغاوت کر رہی تھی اور میں مجبور ہو گئی کہ ہیری کو دیکھے جاؤں اور جب بھی میں اسکی طرف دیکھتی اسکی سیاہ ملکوتی آنکھیں میری نظروں کو کئی لمحات تک گرفت میں لئے رہتیں۔ اور مجھ پر ایک نامعلوم کیف طاری ہو جاتا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد جب مجمع منتشر ہوا تو میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی کہ کہیں محبت کی غیر مرئی زنجیریں مجھے جکڑ نہ لیں مگر میں تو پہلے ہی بے بس ہو چکی تھی، میرے پاؤں اٹھ ہی نہ سکے۔ لوسی، ہیری سے مل چکی تھی۔ اس لئے تعارف کے بعد ہیری مجھے میری جائے قیام تک پہونچانے آیا۔ وہ راستے میں عالمانہ گفتگو کرتا رہا۔ اس کا لہجہ شیریں، الفاظ خوبصورت اور خیالات شاعرانہ تھے اور میں اس کے سامنے کچھ بولتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے خاموش اور تاریک راستے میں وہ تخیل کے انمول موتی بکھیرتا رہا اور میں غیر ارادی طور پر اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ اس کی سنجیدہ فطرت اور پُرجوش باتوں نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ کیوں لوگ اسکی قابلیت کے مدّاح ہیں۔
رخصت ہوتے ہوئے میں نے اس کی درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کر لیا۔
"بہت اچھا! کل سہ پہر کو میں آپ کے ہمراہ سیر کو چلوں گی"۔
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میری روح اپنی تکمیل کے لئے محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک دوسری روح کی محتاج ہے۔ میرے ہر سانس کے ساتھ ہر بار ابھرنے والے سینے میں لذتِ خلش کی ایک بے پناہ موج اٹھ اٹھ کر مجھے ہوش و خرد کے ساحل سے بہت دور لے جا رہی تھی اور میں بے قابو ہو کر سوچنے لگتی تھی "اے معبود! میری آزادی کیوں چھینی جا رہی ہے!!"

اسی شش و پنج میں میں نے لوسی سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگی "ہیری نہایت اچھا آدمی ہے، میں تو اس کو قطعی چینی نہیں سمجھتی۔ بعض اعتبار سے تو دنیا میں شاید اس کا ثانی نہ مل سکے"۔
غرض میری رائے کی لوسی نے بھی تصدیق کر دی۔
دوسرے روز جب ہیری سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے پھولوں کا ایک نازک گلدستہ دیتے ہوئے شاعرانہ انداز میں کہا "آپ خود ہی ایک حسین و جمیل گلِ نوشگفتہ ہیں ...."
اس دن کی سیر کے بعد میں ایسا محسوس کرنے لگی گویا میں اس کی شخصیت کے اثر سے مغلوب اور شاعری کے جادو میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اور بہت جلد میں بھول گئی کہ "—— یہ تو ایشیائی ہے —— غیر ملکی!!" مگر کس قدر خوبصورت تھا وہ! اسکی مسکراہٹ غضب کی شیریں تھی اور میں نے اس سے زیادہ خوش اسلوب اور شریف النفس شخص کبھی دیکھا ہی نہیں۔ کچھ دنوں بعد ہماری ملاقاتیں ہر روز ہونے لگیں۔ میرا خیال ہے اس کو جو دلچسپی مجھ سے ہو گئی تھی وہ اس کے خلاف لگاتار جہاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ کیا یہ سنجوگ —— ایک مشرقی مرد اور ایک مغربی عورت کا —— واقعی کمزور دانش کی دلیل نہیں ہے؟ اس نے پڑھائی کی طرف سے کبھی غفلت نہیں کی کیونکہ اس کا قصد ایک آدھ سال بعد پیکنگ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے جانے کا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں شہر سے باہر خوشنما پہاڑیوں اور کم آباد شاہراہوں کی اکثر سیریں کرتے تھے۔ ان موقعوں پر ہیری مجھے ولولہ انگیز رومان اور عہد قدیم کی متحیر کر دینے والی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ اور آس پاس کا لہلہاتا ہوا حسن —— یعنی ہرے بھرے کھیتوں خوش رنگ و معطر پھولوں اور پہاڑیوں کے دامن میں بل کھانے والے مناظر میں ہم دونوں جذب ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتے تھے۔
ایک دفعہ شبِ ماہتاب میں وہ مجھے سیب کا ایک کھلا ہوا درخت دکھانے لے گیا جو علف زار میں سپید پھولوں کا ہولے ہولے گرنے والا آبشار معلوم ہو رہا تھا بلکہ دور سے تو ایسا منظر آتا تھا کہ برف سے ڈھکی ہوئی شمعی انگلیاں معبود نیّر کی پرستش کر رہی ہیں۔ ہیری

میرے تحیّر و تعجب پر اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ "تم بھی سیب کے کھلے ہوئے پھولوں کی طرح ہو!" یکبارگی میں اُس کی سحر آلود اور محبت بھری آواز سُنکر بالکل اُس کے قریب ہوگئی ـــــ بیحد قریب!!

اُس رات کے بعد ہیری کے لئے میرے دل میں جو جذبات بیدار ہو چکے تھے اُنہوں نے مجھکو بے قابو کر دیا۔ میں ہر وقت اُسکے ساتھ رہنا چاہتی تھی اور اس ارمان کو پورا کرنے کیلئے میں دُنیا کی ہر شے قربان کرنے کو تیار تھی۔

جون کی ایک خوشگوار شام کو ہیری اور میں ایک ایسی راہ چل رہے تھے جہاں کوئی تیسرا ہمیں دیکھنے اور سُننے والا نہ تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے کیونکہ چند ہفتے بعد میں گھر جانے والی تھی اور جُدائی کا رُوح فرسا خیال ہمارے دماغوں پر مسلّط تھا۔ دفعتاً ہیری ٹھہر گیا اور اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھدیئے۔ میں نے بھی فوراً ہی اس کی طرف دیکھا۔

"اے گُلِ رعنا! ہم اور تم ایک پُرسکون دریا میں سفر کر رہے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی تیز اور طوفانی رَو بہت جلد ہماری کشتی کو کہیں بہالے جائے گی۔" وہ مُسکرایا مگر اس کی آنکھوں میں سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ "ہم کو واپس لوٹ جانا چاہیئے، اے خوبصورت پھُول! ایسا نہ ہو کہ پھر ہم بے بس ہو جائیں۔"

میں جانتی تھی اس کا کیا مطلب ہے لیکن سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ "کچھ بھی ہو ہیری! مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ میں طوفانی رَو سے بھی نہیں ڈرتی جب تک ـــــ جبتک ـــــ تم میرے ساتھ ہو!!"

اس کے معصوم لب میرے بالوں کے قریب آگئے۔ اُس نے مترنّم آواز میں کہا "میرے آبا و اجداد کی عقل گرما کے بادل کی طرح ہے جو آسمان میں پگھل جاتا ہے۔ اے گُلِ نوبہار! میں تم سے محبت کرتا ہوں، بہت گہری، بہت سچّی اور تا زیست کرتا رہونگا، لیکن ہمیں محبت کرنی نہیں چاہیئے۔ تم بالکل بھولی اور کمسن ہو اے میری محبوبہ! اسلئے میں تمہارے پاس سے چلا جاؤنگا۔"

"نہیں، نہیں،" میں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی "اگر تم میرے پاس سے چلے گئے ـــــ تو میں مرجاؤں گی۔" میں نے اُسکے سینے پر سر رکھکر والہانہ انداز میں کہا "ہیری! میں مرجاؤنگی۔" اور اسوقت مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اُس نے میری پریشانی سے ملول ہوتے ہوئے میرے رخساروں پر سے آنسو پونچھے۔ "میں تو تمہاری ہی بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں اے آسمانی پھُول! کہ ہم کو شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ میری محبت تو دائمی رہے گی، تمہاری البتہ ـــــــــ" "لیکن میں نے فوراً ہی اُسکی پیشین گوئی کی تغلیط کر دی۔ "تم کیوں شبہ کرتے ہو، میں ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہونگی!"

کاش میں سمجھ سکتی کہ وہ کس قدر سچّا ہے! ایک ماہ بعد ہم دونوں کی شادی ہوگئی۔ مگر میں نے اسے راز میں رکھا۔ ہیری کو ابھی گرمیوں گرمیوں یہاں رہنا تھا چنانچہ ہم نے کالج سے کافی فاصلے پر ایک چھوٹا سا خوشنما مکان لے لیا اور وہیں رہنے سہنے لگے۔ ہیری اتنی دُور ہر روز کالج جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ ہم دونوں خوش تھے، بہت خوش، تنہا، اکیلے ـــــ دُنیا کے جھمیلوں سے دُور، زمانے کے فریبوں سے الگ! میرے والدین کو میری شادی سے بیحد صدمہ ہوا، خصوصاً میری ماں تو یہ جان کر کہ ہیری چینی ہے قریب المرگ ہوگئی۔ چنانچہ اُنہوں نے میرے خطوط کے جواب تک نہ دیئے۔ تاہم میں مسرور تھی اور شادی کا اوائل زمانہ بے فکر اور خوش و خرّم بلبل کی طرح بسر کرنے لگی۔ ہیری کی عدم موجودگی میں گرما کے خاموش اور پُرسکون دن مجھے افکار و آلام سے غافل کر دیتے اور شام ہوتے ہم دونوں سیب کے درختوں کے نیچے جو پھولوں سے لدے ہوتے بیٹھ جاتے اور ہیری مجھے محبت سے لبریز، پُرسوز نغمے، اور رومان انگیز، المناک

داستانیں سنایا کرتا۔ میں مستقبل کو بالکل بھولی ہوئی تھی، ہیری کے طلسم کو توڑنے کے لئے مجھ میں تاب ہی کہاں سے آتی!

یہ معلوم کر کے کہ میں عنقریب ماں بننے والی ہوں مجھے ذرا ناگوار سا گذرا کہ یہ تیسری ہستی ہماری مسرتِ بے پایاں میں خلل انداز ہوگی مگر ہیری اس سے بے حد خوش تھا۔ اس نے ایک ہوشیار اور تجربہ کار نرس کو گھر پر بلوایا اور چند ماہ بعد میرے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ میں کئی روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہی، اور کافی عرصے بعد میں اس قابل ہوئی کہ ہیری کی پریشانی کو جو اس کے مضطرب چہرے اور بے خواب آنکھوں سے ہویدا تھی اپنی کمزور مسکراہٹ سے دور کر سکوں۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی بھی عود کر آئی ہے۔

"تم بچے کو دیکھنے کی مشتاق ہوگی"۔ اس نے محبت سے کہا۔ "وہ تندرست و توانا ہے"۔ یہ کہہ کر ہیری خوش خوش بچے کو لے آیا اور اسے میری آغوش میں لٹا دیا۔ دو ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں کھیل رہے تھے۔ ہیری نے بچے کے چہرے پر سے کپڑا ہٹا دیا کہ میں بچے کو دیکھ سکوں لیکن..... میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے پھر غور سے دیکھا۔ یہ میرا بچہ تو نہیں ہو سکتا..... یہ..... یہ مضحکہ خیز صورت چندھی آنکھیں، چپٹی ناک! یہ میرا بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"جاؤ ——— لے جاؤ اسے یہاں سے!" میں بری طرح چیخی۔ "یہ کریہہ المنظر شکل!..... یہ میرا بچہ نہیں ہو سکتا! نکل جاؤ، یہاں سے!"

ہیری دھم ہو گیا اور آہستہ سے اس نے بچے کو اٹھا لیا۔ یہ اس کا بچہ تھا، اسی جیسا! لیکن مجھے تو اس امکان کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میرا بچہ مجھ جیسا ہوگا ———!!

میری چیخیں سن کر نرس کمرے میں آ گئی۔ ہیری سہما ہوا کھڑا تھا، اس کے چہرے پر حسرت اور اداسی چھا رہی تھی اور بچہ اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں مجھے غیر معلوم ہو رہے تھے۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو ——— مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے!" میں نے بے اختیار ہو کر کہا "میں اب تمہاری صورت بھی دیکھنی نہیں چاہتی، میں تم سے بیزار ہو چکی ہوں"

نرس بولی "مسٹر لی! ان پر سرسامی کیفیت طاری ہے، اگر آپ تھوڑی دیر کیلئے باہر چلے جائیں تو اچھا ہو"

ہیری خاموشی سے اپنے بچے کو، جسے میں نے قابل نفریں سمجھا، سینے سے چمٹائے باہر چلا گیا۔

اس غیر متوقع صدمے سے میری علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ہیری میرے سرہانے رات رات بھر بیٹھا چپکے چپکے روتا تھا اور مجھے تسکین دینے کی مقدور بھر کوشش کیا کرتا تھا۔ میں بمشکل بول سکی "میری ماں کو بلا دو"۔ اور اسے کہتے ہوئے سنا "ہاں ہاں پیاری! میں تمہاری ماں کو جلد بلا دونگا"

میرے والدین آئے اور جب میں سفر کے قابل ہو گئی تو مجھے واپس لے گئے۔ بچے کو دیکھ کر وہ حقیقت حال سے واقف ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے آئندہ مجھ سے یہ ذکر ہی نہیں کیا۔ ہیری کی طرف سے میرے دل میں اتنا زیادہ تنفر پیدا ہو گیا تھا کہ میں متعجب تھی کہ مجھے اس شخص سے اس قدر گہری محبت ہوئی ہی کیوں؟ میں نے اس سے شادی ہی کیوں کی جو اس کا بچہ جننے کی نوبت آئی؟

آخرش اس سال کی یاد میرے دل سے بالکل محو ہو گئی، جب ایک نادر الوجود اور پاک محبت کرنے والی روح نے مجھے اپنی پناہ

میں لیا تھا۔
کوئی دو سال بھی نہ گزرے ہونگے کہ میرے پاس یونیورسٹی کا رسالہ آیا جس میں کالج نے پروفیسر ہیری لی کی پیکنگ (چین) میں بیوقت موت پر اظہار رنج والم کیا تھا۔ میں بیحد افسردہ ہوئی لیکن پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ اور وہ بچہ؟ میں نے یقین کر لیا کہ وہ بھی مر چکا ہوگا ——— اور اس طرح میری کتاب زندگی کا یہ اہم ورق ہمیشہ کیلئے الٹ دیا گیا۔

(۲)

دوسرے سال میری منگنی جیرلڈ سے ہوگئی جو ایک کاروباری فرم میں ملازم تھا۔
میرے باپ نے اس سے میرے لڑکپن کی شادی کا تذکرہ کرتے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرا پہلا شوہر مر چکا ہے لیکن اُس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہیری چینی تھا اور نہ میں نے کبھی یہ قصہ چھیڑا۔
شادی کے بعد ہم لندن کے نواح میں ایک خوبصورت مقام پر رہنے لگے۔ ایک برس بعد ہمارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور ہم نے اس کا نام روز رکھا۔ اس کی آنکھیں اپنے باپ کی سی اور بال میرے جیسے تھے۔ اور بہت جلد وہ ہم دونوں کی مرکز محبت بن گئی۔ بے شمار دن آسودگی سے گذرے۔ ہاں اس گیارہ سال کے عرصے میں میرے والدین کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد پھر آرام سے گزرنے لگی۔ میں اب ادھیڑ عمر کی ہو چلی تھی اور ایام گذشتہ کی تلخ کام یاد کو ماضی نے گم کر دیا تھا۔
ایک دن میرا شوہر دفتر سے آکر کہنے لگا "میں شنگھائی جانے والا ہوں اور فرم کا مالک چاہتا ہے کہ اُس کی لڑکی بھی وہاں کی سیر کر آئے اس لئے اگر تم اس کی نگرانی کیلئے چلی چلو تو وہ تمہارے اور روز کے اخراجات خوشی سے برداشت کریگا"۔ جیرلڈ اور روز شنگھائی جانے کے لئے بہت بے قرار تھے مگر میں نہ جانے وہاں کیوں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے پاس چونکہ کوئی معقول وجہ نہ تھی اسلئے بہت جلد ہم شنگھائی روانہ ہو گئے۔ میری اور روز بہت جلد ایک دوسرے کی سہیلی بن گئیں اور اس سفر سے بیحد خوش تھیں۔
شنگھائی کے ہوٹل میں ہماری ملاقات جیرلڈ کے دوست مسٹر جم، اُس کی بیوی اور برادرِ نسبتی جورج سے ہوئی اور اُن کے اصرار پر ہم نے اُن کی یہ دعوت قبول کرلی کہ ان کے چھوٹے سے خوشنما مکان میں چل کر رہیں جو شہر کے شور وغل سے قریباً پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ جیرلڈ اور جم کام کاج سے فارغ ہوکر ہفتے کو یہاں آتے تھے البتہ جورج اور چند ملازم ہمارے ساتھ ہر وقت رہے کہ ہمیں مختلف مقامات کی سیر کرائیں، لیکن مجھے اب شور وغل ہی پسند تھا اور یہ خاموش جگہ مجھے ویران معلوم ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ مجھے اُن بدنام چینیوں سے نامعلوم خوف سا لگتا تھا جو سامنے دریا کے کنارے اپنی راہ چلا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے لڑکیوں کو کہدیا کہ وہ گھر سے دور نہ جائیں۔ ایک ملازم نے بتایا کہ یہ غریب چینی انقلابی ہیں اور کبھی کبھی یہ لوگ رہزنی بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر عموماً جانی نقصان نہیں پہونچاتے صرف روپیہ مانگتے ہیں ———
دریا کے کنارے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک مسمار شدہ کنشتِ چین (بدھی بتکدہ) کے کھنڈرات تھے۔ ہم نے ایک روز یہاں کی بھی سیر کی لیکن ہمارے ایک ملازم ڈنگ نے ہمیں بتایا کہ یہاں بہت سے غار اور پوشیدہ مقامات ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکے کیونکہ اُن میں بہت سے بھک منگے پناہ گزیں ہیں۔
ایک دن ہمیں ایک چینی فقیر ملا اور اُس نے اپنا نام ڈاہ تو بتایا۔

"آپ انگلستان سے آئی ہیں؟" اُس نے پوچھا۔
"ہاں! کیا تم انگریزوں کو پسند کرتے ہو؟" روز جواباً بولی۔
واہ بو کہنے لگا "میرا ایک دوست ہے اُسکو انگریزوں سے خاص دلچسپی ہے"
"کیا تمہارا دوست انگریزوں کو پسند کرتا ہے؟" لڑکیوں نے وہی سوال دُہرایا۔
واہ بو مسکرا کر آہستہ سے کہنے لگا "ہم دونوں مشنری اسکول میں پڑھتے تھے لیکن میرا دوست انگریز اُستانی کو تگنی کا ناچ نچایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ تو بازار میں اُس نے اس پر کیچڑ پھینک دی۔ اس کے بعد ہم نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہاں سے بھاگ آئیں"
لڑکیاں یہ سنکر بڑے زور سے ہنسیں۔
دوسرے دن میں باغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ واہ بو اور اسکے ساتھ میں ایک اور شخص دیوار پر سے مجھے جھانک رہے ہیں۔
"لی ہونگ! اس میم کو دیکھو" واہ بو نے اپنے ساتھی سے کہا۔
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ لی ہونگ کی وہ ——— سیاہ آنکھیں ——— جن سے تحقیر و ملامت برس رہی تھی ——— میرے دل کو چھلنی کر دیں گی۔ چین کے وہ تمام خوف جن کو میں اب تک بھولنے کی کوشش کرتی رہی، اس وقت میرے دل و دماغ پر چھا گئے اور میں وہاں سے بھاگ کر چھپ جانا چاہتی تھی۔ لی ہونگ اور واہ بو دریا کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دُور چلکر وہ مسز جم اور دونوں لڑکیوں کے پاس آ گزرے جو پانی سے کھیل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ لی ہونگ کچھ دیر تک وہاں ٹھٹک کر ان کو گھورتا رہا۔
اس وقت کے بعد سے، گھر سے باہر نکلنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دن میں ایک آدھ مرتبہ میں لی ہونگ کی جھلک ضرور کہیں آس پاس پھرتے ہی دیکھ لیتی تھی۔ اور ہر دفعہ وہ سیاہ ڈراؤنی اور تنفر آمیز نظریں مجھے کھائی جاتی تھیں۔ جورج اُسے دیکھکر ایک دفعہ کہنے لگا "واہ بو کہتا ہے وہ شخص نصف انگریز ہے"
"نصف انگریز!" میرے مُنہ سے حیرت و استعجاب میں نکلا۔
"ہاں! وہ کہتا ہے کہ اس کا باپ ایک زبردست عالم تھا ——— پیکنگ یونیورسٹی میں پروفیسر ——— اور لی ہونگ کے بچپن ہی میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت سے یہ دربدر بھیک مانگتا پھرتا ہے"
مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی میری رُوح سلب کر رہا ہے۔ میں نے اپنے کمرے کے دروازے بند کر لئے اور رات بھر کسی خیال سے لرزتی رہی۔ میں سمجھ گئی تھی! میں سمجھ گئی تھی! خدا نے، جو انصاف والا ہے، مجھے اس جگہ اس لئے بھیجا تھا کہ ندامت اور ملامت میرے ایمان کو اپنے تیروں سے مُردہ کر دیں اور میں سمجھ لوں کہ دُنیا اتنی وسیع نہیں کہ اس کا کوئی حصہ مجھے اپنے شرمناک اعمال کے نہ ٹلنے والے نتائج سے محفوظ رکھ سکے۔
آخر کار میں نے اپنے آپ کو قسمت کے سُپرد کر دیا کہ جو ہونا ہے ہو جائیگا، چنانچہ لی ہونگ کی آنکھوں سے بچنے کی میں نے پھر کوئی کوشش نہیں کی۔ میں دریا تک شکستہ دل اس طرح چلی گئی کہ رُوح بیمار تھی اور جسم تکلیف میں مبتلا۔ وہ کبھی میرے پاس ہی آ گیا۔ مگر میں اُسے دیکھتے ہی ناگہانی اضطراب میں چلائی "جاؤ ——— یہاں سے چلے جاؤ"
"میں کُتا نہیں ہوں جسے تم دھتکار سکتی ہو" اُس نے غمگین آواز میں جواب دیا۔

کانپتے ہوئے میں نے پوچھا" تم ـــ چاہتے ـــ کیا ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں مغربی عورتوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اُن سے نفرت ہے۔ میں ..... میں ..... اُنہیں مار ڈالنا چاہتا ہوں"

اُس کی سیاہ آنکھیں چمک اُٹھیں اور مَیں ڈر کر پیچھے ہٹی، مگر وہ بھی قریب آگیا اور کہنے لگا" میری ماں ـــ ایک انگریز عورت تھی ..... مشنری اسکول میں اُنہوں نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ میری ماں نے مجھے حقارت سے کیوں ٹھکرا دیا۔ میرا باپ ایک جیّد عالم تھا ....." وہ فخر سے سر بلند کر کے کہنے لگا" ... میں بھی عالم ہوتا ـــ اگر ـــ میرا معزز باپ مجھے تعلیم دینے کے لئے زندہ رہتا!"

میں نے آہستہ سے پوچھا" آخر تم یہ ـــ مجھے ـــ کیوں بتا رہے ہو؟"

لی ہونگ نے اپنے شانے ہلائے" میں اس نفرت کا اظہار کیا کرتا ہوں جو میرے دل میں روز بروز متلوّن مزاج میموں کیلئے بڑھتی جاتی ہے"

وہ وہاں سے دریا کے کنارے کنارے جانے لگا۔ مَیں اُس کی طرف کھڑی تکتی رہی۔ کاش مجھے کوئی اس سوہانِ روح مجسّم غم وخوف سے آزاد کرا سکتا!

روز اور میری، ونگ کے ساتھ مچھلی کا شکار کر رہی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر میں نے دیکھا کہ واہ بو اور پانچ چھ اور چینیوں نے لی ہونگ سے کچھ باتیں کر کے لڑکیوں کو گھیر لیا اور ونگ کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ بے قابو ہو کر میں اُس طرف چیختی ہوئی دوڑی" انکو چھوڑ دو ـــ چھوڑ دو"

مسز جم بھی میری آواز سنکر آگئیں اور ہم دونوں لڑکیوں کو چھڑانے کیلئے جدوجہد کرنے لگیں۔

اتنے میں، میں نے لی ہونگ کی آواز سنی" جلدی کرو ـــ صرف لڑکیوں کو بھگا لے جاؤ"

ہم دونوں واہ بو سے لڑ رہی تھیں اور باقی چینی لڑکیوں کو لے جا رہے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا" لی ہونگ! ایسا نہ کرو۔ ـــ ان کو چھوڑ دو"

اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا، اُس کی آنکھیں زہر میں بُجھی ہوئی تلواریں معلوم ہوتی تھیں" کل تمہارے مرد شنگھائی سے آجائینگے اُن سے کہدینا کہ روپیہ تیار رکھیں، لڑکیاں تمہیں واپس مل جائیں گی۔ میں واہ بو کو اُن سے ملنے بھیجونگا ـــ روپیہ تیار رکھنا، اس سے بھوکے فاقوں سے بچ جائیں گے"

میں نے لی ہونگ کو پکڑ لیا اور میری اُنگلیاں اس کے کپڑوں میں اُلجھ گئیں" واپس چلی جا ـــ اے انگریز عورت!"

لی ہونگ مجھے حقارت سے پرے ہٹاتے ہوئے بولا" روپیہ تیار رہے، لڑکیاں واپس بھیجدی جائیں گی"

"سنو تو سہی لی ہونگ!" میں نے التجا کرتے ہوئے کہا" تم یہ کیا کر رہے ہو، تم سمجھتے بھی نہیں! وہ میری لڑکی ہے ـــ تم ـــ ہیری لی کے ـــ اور وہ تمہاری ـــ بہن ہے!!"

میں نیم بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اُس نے مجھ کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔ دُور سے میں نے روز کی نحیف صدا سُنی:

"ماں! ـــ ماں!"

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور مسز جم میرے پاس۔

(۳)

مسز جم کی تسلی اور ہمدردی سے متاثر ہو کر میں نے اپنی کہانی کا کچھ حصہ اُسے سنا دیا۔ وہ کہنے لگی کہ یہ لوگ لڑکیوں کے ساتھ کوئی تشدد نہیں کریں گے، صرف روپیہ چاہتے ہیں۔

"کیا خبر لی ہونگ انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے" میں نے روتے ہوئے کہا۔

جیرلڈ اور جم دوسرے دن دوپہر کو آ گئے، ونگ نے راستے ہی میں اُن کو اس واقعہ سے مطلع کر دیا۔ اپنے شوہر کی صورت دیکھکر میں ایک اور خوف سے لرز گئی ——— اُسے جب میری گذشتہ زندگی کا حال معلوم ہو گا تو اس کا اعتماد اور محبت چکنا چور ہو جائے گی!۔

جیرلڈ، واہ بو کا انتظار کئے بغیر فوراً بتکدے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ان بھگ منگوں کی جائے قیام تھی۔ جورج گھر پر رہا، باقی سب جیرلڈ کے ہمراہ ہو گئے۔ جب ہم بتکدے کے قریب پہونچے تو ایک بندوق چلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی نصف درجن چینی کھنڈر میں سے نکل کر ہماری طرف دوڑ پڑے۔ اُنہوں نے ہمیں گھیر لیا اور روپے کا مطالبہ کیا۔ میں دوڑ کر لی ہونگ کے پاس پہونچی۔ اس کی پیشانی سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

"میری بچی کہاں ہے؟!"

عین اسی وقت واہ بو، روز اور میری کو کلائیوں سے پکڑ کر ہماری طرف لانے لگا مگر باقی چینی ان کو پھر گھسیٹ کر واپس لے گئے۔ یہ دیکھکر جیرلڈ سے نہ رہا گیا اور اُس نے چینیوں پر گولی چلا دی۔ چینی بگڑ گئے اور بھرے ہوئے شیروں کی طرح میرے شوہر اور جم پر پل پڑے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لی ہونگ اور اُس کے ساتھ اس کا دوست واہ بو چاہتے تھے کہ لڑکیوں کو بغیر روپے کا مطالبہ کئے واپس کر دیں لیکن دوسرے لوگ اس پر راضی نہیں ہوئے، چنانچہ اُنہوں نے بیچارے لی ہونگ پر حملہ کر کے زخمی کر دیا تھا۔۔۔۔ مگر اسکے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ لی ہونگ مجھ سے انتقام لیکر رہیگا۔

"اسے کوئی تکلیف نہ پہونچاؤ لی ہونگ! ——— یہ میری بچی ہے ——" میں نے عاجزی سے کہا۔

ہماری نظریں ملیں۔ اب اُن سیاہ آنکھوں سے وہ تنفر اور وہ حقارت معدوم ہو گئی تھی ——— "ہاں! اُس بچی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچے گی"

میرا شوہر غصے سے چلایا "اس گدھے سے کیوں عاجزی کرتی ہو!" یہ کہکر وہ لی ہونگ کی طرف جھپٹ کر آیا اور اس کے چہرے پر ایک زور سے مکا مارا۔ لی ہونگ نے کوئی حرکت نہیں کی ——— زبان سے ایک لفظ تک نہ نکالا ——— لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے دوست نے جیرلڈ کی طرف بندوق تانی ہے، وہ بجلی کی طرح بندوق اور میرے شوہر کے درمیان آ گیا۔ گولی لی ہونگ کے پار ہو گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

آتشِ جنوں سرد ہو گئی۔ لوگ لی ہونگ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے شکستہ آواز مگر تحکمانہ لہجہ میں کچھ کہا اور دو چینی جلدی سے

لڑکیوں کو لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ لی ہونگ کی دکھ اور رنج سے لبریز آنکھیں مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ جیرلڈ بھی اُسے — جس نے اپنی زندگی قربان کر اس کی جان بچائی — اپنے قدموں میں لوٹتا دیکھکر بہت متاثر ہوا۔

میرا راز ابھی تک پوشیدہ تھا اور کسی طرح مجھے یقین ہوگیا تھا کہ لی ہونگ اپنے مُنہ سے کچھ نہ کہے گا لیکن جب میں نے اُسے عالمِ جانکنی میں دیکھا تو میرے سازِ حیات میں ایک ارتعاش پیدا ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں — کچھ کہہ رہی تھیں کچھ التجا کر رہی تھیں۔ میرے دل میں ترحّم کا ایک طوفان بپا ہوگیا — وہ میرا ہی تو بچہ تھا، میرا ہی خون! وہ غریب و ناتواں جسم، وہ بھوکی روح، ہیری — میرے محبوب — ہی کا تو بیٹا تھا!!

مَیں اب بھی وہاں سے اپنا راز محفوظ لیکر آسکتی تھی مگر نہیں، میری روح پکار پکار کر کہہ رہی تھی "جا اِن عنقریب بند ہوجانیوالی آنکھوں کی خاموش التجا کو سُن لے! جا اُسکے پاس جا اور اُسکو اپنے سینے سے لگالے"! اُسکی آنکھیں یہی التجا کر رہی تھیں مگر کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہے گا۔

میں وہیں بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

"میں اس نازیبا حرکت پر بیحد متاسّف ہوں" اس کا سانس اُکھڑ چکا تھا، وہ رُک رُک کر کہہ رہا تھا "ان بچی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچائی گئی — مگر پھر بھی، اس کی ماں کو تو تکلیف ہوئی ہوگی — بچّہ نہ جانے اپنے ماں باپ کی کیوں خواہش کرتا ہے! ...میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ جیسی خاتون مجھے یہ عزت بخشیں"

میرا دل بھر آیا تھا۔ اس سے زیادہ رحم میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ میری روح گناہ کی بیڑیاں توڑ رہی تھی۔ "اسکی ہوجا! اس لڑکے کی جو تنہا اور کوئی دم کا مہمان ہے!"

مسز رحم لڑکیوں کو گھر لے گئی اور میں نے اپنے شوہر کو اپنے پاس بٹھا کر کہا "اس نے تمہاری جان بچائی ہے جیرلڈ! اس سے کچھ تسکین آمیز باتیں کرو" اور گویا خدا کہلوا رہا ہو، میں نے آہستہ سے کہا "یہ — ہیری ہی کا بیٹا ہے — میرا بیٹا!"

جیرلڈ کا چہرہ اُتر گیا لیکن میں نے قطعی پرواہ نہیں کی۔ میں تو اعتراف کر رہی تھی کہ "یہ میرا بیٹا ہے"

"اے خاتون! آپ کسقدر رحم دل ہیں!" لی ہونگ کے مرتعش ہونٹ سخت ہوتے جارہے تھے۔

"ہیری لی — کیا چینی تھا؟" جیرلڈ نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" میں آہستہ سے بولی، مجھے کوئی یاد آرہا تھا "وہ ایک زبردست عالم تھا"

لی ہونگ کے بُشرے پر خوشی اور اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ "میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنے معزز باپ کے پاس سوؤں" اُس نے بمشکل کہا "وہ پیکنگ میں پیوندِ خاک ہے"

"ہاں — ہاں — ایسا ہی ہوگا" میں نے اس سے وعدہ کیا۔

اگرچہ جیرلڈ صدمے سے دم بخود تھا، پھر بھی اسے احساس تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بچہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے جس نے اُس کی جان بچائی۔ وہ لی ہونگ پر جھک گیا اور پیار سے اسکی پیشانی پر سے موت کا پسینہ پونچھنے لگا۔

لی ہونگ کی نظریں میرے چہرے پر سے نہیں ہٹیں۔ اس نے اپنا رخسار میرے سینے سے ملا دیا۔ کیا کوئی غیبی طاقت مجھے دُنیا

کہ اُس کونے سے یہاں اس لئے کھینچکر لائی تھی کہ یہ بچّہ اپنی ماں کی آغوش میں دم توڑے ؟ ـــــ وہ آغوش جس نے پیدائش کے وقت نفرت وحقارت سے ٹھکرا دیا تھا؟ میں نے اُس کے رخسار پر اپنے لب رکھدیئے، اس کے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوگئی۔" ما ـــ ں ـــ" اُسکے مُنہ سے آخری بار بصد حسرت دیا س نکلا اور اُس کی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہوگئیں۔

جب جیرلڈ نے اُسے میری آغوش میں سے لیکر اپنی آغوش میں لیا تو میرے دل میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔

"اِسے پیکنگ میں اس کے باپ کے پاس سُلا دو!" اور جیرلڈ نے تسلّی دیتے ہوئے کہا" ہاں پیاری! یہ وہیں سوئیگا"

چند دن بعد ہم وطن روانہ ہوگئے۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ جب حواس دُرست ہوئے اور میں کچھ سمجھ سکنے کے قابل ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے شوہر کے مغموم و ہراساں رہنے کی وجہ، جو اُس کی رُوحانی اذیت کا باعث ہوئی، یہ تھی کہ میرا ایک بچّہ تھا ـــــ جو میری سنگدلی کی وجہ سے جب تک جیا، دو دو دانوں کا محتاج رہا۔ جیرلڈ اس دُکھ میں خود ہی مبتلا تھا، کاش وہ مجھے بھی اس میں شریک کر لیتا! اس کی اُداس آنکھیں اُسکے دل کا پتہ دے رہی تھیں، کاش وہ مجھ پر بھی اپنی زبان سے اس کا اظہار کر دیتا!۔

ایک سہ پہر کو معًا میں نے اپنے شوہر سے کہا" جیرلڈ میں تمہاری محبت کی مستحق نہیں ہوں پھر بھی میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے محبّت کرو ـــــ مجھے اب تمہاری محبّت کی بیحد ضرورت ہے ـــــ میں چین جانا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی مجھے زبردستی دھکیل رہا تھا ـــــ مجھے اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے ـــــ اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ بیس سال کے بعد بھی میں اس سے نہ بچ سکی تو کانپ اُٹھتی ہوں۔ کیا میرے ننّھے کو میری آغوش میں اس لئے موت آئی تھی کہ میری سزا پوری ہو جائے اور یا وہ خود ہی تمام عمر اس کی دُعا مانگتا رہا؟ ـــــ جیرلڈ اب میں پہلی سی نہیں رہی، مجھ پر ترس کھاؤ!"

جیرلڈ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا" میں اپنی غیر ذمّہ دارانہ روش پر بیحد نادم ہوں جیرلڈ! میں سزا سے بچتی بھی کہاں تک؟۔ اور خدا جانے یاد، مجھے تڑپنے کیلئے کب تک زندہ رہنے دے؟.... تمہارے بغیر تو میں اور بھی بے یار و مددگار رہ جاؤں گی۔ جیرلڈ! مجھے اپنی محبّت دے دو!"

میرے شوہر نے میرا ہاتھ اپنے میں لے لیا جس سے میں اطمینان اور سکون سا محسوس کرنے لگی۔

گھر پہونچے ہمیں دو ڈھائی مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن روز نے غمگین آواز میں کہا" امّی ـــــ نہ جانے لی ہونگ مجھے کیوں یاد آئے جاتا ہے!"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ کہنے لگی" ابا کہتے ہیں کہ میں اُن واقعات کا ذکر تک نہ کروں مگر اچھی امّی! صرف اس دفعہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ کیونکہ میرا دل مجھے مجبور کر رہا ہے۔ وہ بُرا آدمی تو نہیں تھا، کیوں امّی؟ اس نے ابا کی جان بچائی اور اس کے علاوہ جب وہ چینی ہمیں غار میں لے گئے تو اس کا سُلوک ہمارے ساتھ نہایت شریفانہ تھا۔ اس نے ہمیں کھانا کھلایا اور پھر وہ فرش پر میرے روبرو بیٹھ گیا۔ چند لمحات تک وہ میری طرف حسرت اور محبّت سے دیکھتا رہا، پھر اُس نے انگریزی میں کہا" چھوٹی بہن! ـــــ چھوٹے سے سیب کے پھول!" مجھے اس سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ اور دیکھنا امّی! اس نے مجھے ایک رام وہ

بستر پر لٹادیا! اور جب میں سوکر اُٹھی تو میں نے دیکھا کہ وہ خود زمین پر لیٹا ہوا ہے، اور امّی! ــــ رو رہا ہے!! اُسے مجھے اور میری کو لے جانے کا بڑا رنج تھا، تھا نا؟ اُسے یاد کر کے مجھے رونا سا آجاتا ہے ــــ میں چین کے تمام واقعات ایک نہ ایک دن بھول جاؤنگی مگر امّی ــــ لی ہونگ کو کیسے بھُلا دوں؟"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے" لی ہونگ نے تمہارے باپ کی جان بچائی تھی روز! وہ ــ بہادر ــــ تھا!" میں نے اس سے گلوگیر ہوکر کہا اور اس طرح اُس ٹھکرائے ہوئے بچّے کی اندوہناک یاد میں ایک اور دردناک یاد کا اضافہ ہوگیا۔ لی ہونگ نے میری بچّی کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا! ــــ وہ جانتا تھا کہ وہ بچّی کون ہے!! ــ اور وہ اسکے لیے رو رہا تھا!؟۔

یہ بہار کا موسم ہے اور گذشتہ گرمیوں کے واقعات بہت دیرینہ معلوم ہوتے ہیں۔ جیرلڈ دفتر سے آنے والا ہے اور روز دروازے پر اس کا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی محبت آپس میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ شاید یہ میرا خیال ہی خیال ہے کہ جیرلڈ روز کو صرف اپنی بچّی سمجھتا ہے اور میری برائے نام ــــ کیونکہ میرا بچّہ تو وہ تھا۔

ہوا کے ایک لطیف جھونکے نے سیب کے سپید پھول روز کے بالوں پر بکھیر دئے ہیں اور وہ اپنے باپ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آرہی ہے لیکن میرا دل دُور، بہت دُور ایک ایسی سُنسان جگہ مصروفِ ماتم ہے جہاں ایک بہادر بچّہ اپنے عالم اور معزز باپ کے پہلو بہ پہلو محوِ خواب ہے۔

(پلاٹ انگریزی سے ماخوذ) ــــــــ صادق الخیری

تعلیم زدہ

جسے دیکھئے، نوکری کا ہے سائل — یہ "بی اے" "یہ "ام اے" ہیں بدتر ز جاہل
تجارت سے واقف نہ کھیتی کے ماہر — نہ صنعت کے لائق نہ حرفت کے قابل
غلامی کے فن میں مگر چاق چوبند — ہوا ان کو تعلیم سے بس یہ حاصل
وطن کی محبت، نہ قومی حمیّت — یہ ہوتے ہیں خود فوجِ دشمن میں شامل
سمجھتے ہیں معراج ہے چاکری میں — اِسی پر ہیں قانع اِسی پر ہیں مائل
نہ ہمت رہی ان میں باقی نہ جرأت — ہوئے ہیں یہ کمبخت پڑھ لکھ کے بزدل
دماغ اِن کے مفلوج، دل انکے مُردہ — ارادے فسُردہ، خیالات باطل
یہ آزادِ اخلاق! یہ پیرو نفس! — رذائل ہیں اُن کی نظر میں فضائل

کسی اور کو ان سے اُمید ہو کیا
خُدا کے یہ بندے خُدا سے ہیں غافل

ک۔ ش۔

Excellent

اندھی محبّت

(جب محبّت کے اندھے دیوتا "کیوپڈ" کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے ؟ -)

۱

حادثہ

"پاچ تون" سے شہر شوراک جاتے ہوئے ہمیں کار کا ایک ایسا خوفناک حادثہ پیش آیا جس نے میری کتابِ زندگی میں ایک عجیب و غریب باب کا اضافہ کر دیا۔

موٹر کار کی پچھلی سیٹیں سامان سے لدی ہوئی تھیں۔ چچا جعفر نے سامان کا ایک جزو بنکر پچھلی سیٹ پر ٹھونسے جانے کی بجائے بہتر سمجھا کہ ڈرائیور کو ساتھ نہ لیں اور اُسکی سیٹ پر خود رونق افروز ہو جائیں۔

چنانچہ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے کار چلا رہے تھے اور میں اُنکے پہلو میں دوربین لئے اِدھر اُدھر کے مناظر دیکھ رہی اور راستے کا جائزہ لے رہی تھی۔

جہاں کہیں پُرخطر راستہ یا کوئی اچانک موڑ نظر آتا دکھائی دیتا میں انہیں پہلے سے آگاہ کر دیتی۔ ایشیائی صبح کی خوشگوار خنک ہوا، پہاڑی راستوں کی ناہموار گھاٹیاں، کہیں اُبلتے ہوئے چشمے، کہیں بل کھاتی ہوئی ندیاں کہیں کہسار کی کاسنی چوٹیاں، کہیں سربلند صنوبر کے مخروطی سرے۔

ان تمام چیزوں نے ہمیں بیحد محظوظ کر رکھا تھا۔

دفعتاً میں نے دوربین سے دیکھتے ہوئے کہا "چچا، چچا! ایک اور پُرخطر موڑ آگیا۔ رفتار ذرا دھیمی کر لیجئے۔ اُف، یہ سیاہ غار! راستہ بھی بہت ناہموار ہے۔"

چچا جان کے مُنہ میں موٹا سا سگار تھا۔ گول گول آواز میں بولے "تردد نہ کرو۔ بہت آہستہ چلا تو تاخیر کا اندیشہ ہے۔ ہمیں شام سے پہلے شوراک پہونچنا ہے۔ وہاں وکیل میرا منتظر ہوگا۔"

ان کا جملہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ آنکھوں نے وہ دیکھا اور حواس نے وہ محسوس کیا کہ الامان الحفیظ! کار اچانک ایک بڑے پتھر سے ٹکرائی اور پیچھے ڈھلوان سڑک پر پھسلنے لگی۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا اس کا مجھے پتہ نہیں۔ میرے حواس جیسے کسی اتھاہ تاریکی میں ڈوب رہے تھے۔

کار شاید کسی کھڈ میں جا گری ہو، شاید کسی پہاڑ سے ٹکرائی ہو، میں بیہوش ہو چکی تھی۔

۲

تاریکی

پانچ دن کیسے گذرے! مجھے اس کا مطلق احساس نہیں پیشانی پر اور سر کی پُشت پر ایسی چوٹیں آئی تھیں جنہوں نے مجھے بُدھ کر رکھا تھا۔ اس پر شدید بخار نے حواس مختل کر دیئے تھے۔

پانچویں دن جب مجھے کچھ ہوش آیا اور میں نے اپنی پلکیں اُٹھانے کی ایک ناتواں کوشش کی تو دیکھا کمرے میں ایک گہری تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی بے رُوح تاریکی ــــ جسے میری آنکھوں نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اگرچہ میرا سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا مگر میں نے اسے آہستہ سے گھما کر دریچوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر بہت جلد مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں نہ کوئی دریچہ ہے نہ روشنی کا کوئی دوسرا اہتمام۔ اچانک سرد اور تاریک قبر کی یاد نے میری رُوح میں ایک نشتر گھونپ دیا۔ میرے دل نے کہا یہ

تیرہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اور میں چیخ پڑی "چچا! چچا جعفر! چچا جعفر!"

پانچ دن کے بعد یکلخت میری آواز سنکر نرس دوڑ پڑی۔

"خاتون! کیا بات ہے، کیا بات ہے! تم کیسی ہو؟ میں نرس ہوں"

"نرس" میں نے گھبرا کر روتے ہوئے کہا "خدا کے لئے کمرے میں روشنی کرو"

"روشنی؟"

"ہاں" میں نے کہا "یہاں کوئی روشنی کیوں نہیں ہے؟"

نرس نے قریب آکر میری نبض پر اپنی انگلیاں رکھیں پھر بولی "دن کا وقت ہے خاتون"

میں گھبرا کر اٹھنا چاہتی تھی، مگر میری گردن اکڑی ہوئی تھی، میں بے بسی سے تکیے پر گر پڑی اور رونے لگی "نرس مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے تم بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ چچا کہاں ہیں؟ ہائے چچا ــ!"

"میں ابھی سر جعفر کو بلاتی ہوں" نرس نے کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

میں سسکیاں لیتی ہوئی بستر پر پڑی رہی۔

"بیٹی! بیٹی زیبا! کیسی ہو؟" چچا کی آواز آئی۔

"چچا! چچا آپ کہاں ہیں؟ آپ مجھے دکھائی نہیں دیتے"

"نقاہت کا سبب ہوگا بیٹی۔ چپ چاپ پڑی رہو۔ تم پانچ دن بے ہوش رہی ہو" یہ کہتے ہوئے آکر مجھ پر جھک گئے اور میری پیشانی چوم لی۔

میں بے اختیار رو پڑی "چچا میرا دل بیٹھا جاتا ہے، مجھے کچھ نہیں سوجھائی دیتا۔ کیا آپ لوگ مجھ سے ہنسی کر رہے ہیں! کیا باہر آفتاب چمک رہا ہے؟ ہائے میری آنکھیں! میری آنکھیں کیا ہوئیں؟ وہ کھلی ہیں یا بند؟ ــ یہ کیا ہو گیا؟"

معلوم ہوتا تھا چچا جعفر کو میری باتوں پر ہذیان کا شبہ ہو رہا ہے۔ بار بار کہتے "نرس! ٹمپریچر لینا۔ کہیں بخار زیادہ تیز نہ ہو گیا ہو"

"جی جناب میں نے آدھے گھنٹے پہلے حرارت دیکھی تھی۔ نارمل تھی"

"تو نرس۔ فوراً ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرو"

دس منٹ بعد ڈاکٹر پہونچ گیا۔ اس نے مجھ سے چند سوال کئے۔ پھر دھیمی آواز میں چچا سے کچھ کہا اور انہیں کمرے سے باہر لے گیا۔

میں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا "نرس! ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟ کیا میری بصارت جاتی رہی؟"

نرس نے کچھ بتانا شاید مناسب نہ جانا صرف اتنا کہا۔ "ابھی تو کچھ نہیں کہا کوشش کیجئے کہ نیند آجائے" یہ کہکر وہ میرے تکیے ٹھیک کرنے لگی۔ میں سسکیاں لیتی ہوئی ایک جنون افزا اندھیرے میں چپ چاپ پڑی رہی۔

(۳)

علاج کی تجویز

مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کتنا وقت گذر گیا۔ آدھ آدھ گھنٹے بعد میں نرس سے پوچھ لیا کرتی تھی۔ نرس اب کیا بج گیا؟

شام کو چچا جعفر چپ چاپ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے ان کے قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ آہستہ سے میرے قریب کھڑے ہوئے۔ میں منتظر تھی کہ کوئی بات کریں گے مگر انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ شاید میری آنکھوں کو غور سے دیکھ رہے تھے ــ

آخر گھبرا کر میں نے کہا "چچا؟"

"ہاں بیٹی زیبا"

"آپ چپ کیوں ہیں؟ میرا جی گھبرا رہا ہے۔ میری آنکھوں

کو کیا ہو گیا چچا جان؟ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں؟" میرے منہ سے ایک آہ نکلی۔

چچا ضبط کر کے بولے "نہیں بیٹی۔ یہ عارضی اثر ہے۔ معبود نے چاہا تو ڈیڑھ دو ہفتوں میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز میں ایک دلدوز درد پنہاں ہے۔

میں چیخ پڑی "ڈیڑھ دو ہفتے! اتنی مدّت اس اندھیرے میں رہونگی؟ ہائے اب کیا ہوگا؟"

چچا بولے "بیٹی اس طرح رویا نہیں کرتے۔ میں نے آج مشہور ڈاکٹروں سے ملکر مشورہ کیا ہے۔ ان سب کی یہی رائے ہے کہ ڈاکٹر شیدی کو بلانا چاہیئے۔"

"وہ کون ہیں؟" میں نے مایوس لہجے میں پوچھا۔

"ڈاکٹر شیدی مشہور ماہر چشم ہیں۔ انہوں نے بعض پیدائشی نابیناؤں تک کو بصارت بخش دی ہے۔ وہ شورا کے سے تین سو میل کے فاصلے پر رہتے ہیں اور اتنے مصروف آدمی ہیں کہ شاذ ہی کہیں باہر جاتے ہیں۔"

"تو پھر وہ یہاں کیونکر آئیں گے چچا؟"

"نہ آئے تو ہمیں انکے ہاں جانا پڑیگا۔"

میرا دل دہک سے رہ گیا۔ ہائے! تو یوں کہئے۔ مجھے اندھوں کے ہاسپٹل میں رہنا ہوگا۔ میں اندھی ہو گئی۔ گویا زندگی کی تاریکی میں اِدھر اُدھر بھٹکا کرونگی! کوئی میرا رفیق نہ ہوگا!"

میں نے اندھوں کے کئی افسانے پڑھے تھے۔ ان کی نامراد زندگی کی بے رنگ یکسانی سے بخوبی واقف تھی۔ اب یہی کیفیت میری ہوتی نظر آرہی تھی۔ نہ میں کتابیں پڑھ سکونگی، نہ صبح اور شام کا حسن دیکھ سکونگی۔

میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ اور میں نے اپنا سر دوسری طرف پھیر لیا۔

"بیٹی رو رہی ہو؟"

"نہیں چچا جان" میں نے ضبط کر کے کہا۔

"پھر ایسی کیوں ہو؟" انہوں نے مغموم لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں — تھک گئی ہوں"

"بیٹی افسردہ نہ ہو۔ انشاء اللہ ڈاکٹر شیدی کا جواب آتے ہی علاج شروع ہو جائے گا۔ یا تو وہ یہاں آئیں گے یا میں تمہیں وہاں لیجاؤں گا۔"

"اچھا چچا جان" میں نے اپنے زخمی جذبات کو چچا سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔

چچا جعفر کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور میں گھبرا کر رونے لگی۔ میرے لئے اب دنیا میں — اس وسیع اور روشن دنیا میں کچھ بھی نہ رہا تھا۔ تاریکی! صرف بھائیں بھائیں کرتی ہوئی تاریکی!

شاید سامنے کا دریچہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے ٹھنڈی اور نکہت بیز ہوا کے جھونکے کمرے میں آرہے تھے۔ رات کی چڑیاں باغیچے میں سُبک دلی سے سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ مگر نہیں — نہ رنگین پھولوں کو دیکھ سکتی تھی جن سے مجھے محبت تھی۔ نہ خوش گلو پرندوں کو جن سے مجھے عشق تھا۔ آہ! تاریک زندگی۔

معائنہ

ڈاکٹر شیدی کا جواب آگیا کہ وہ یہاں نہیں آسکتے۔ البتہ ہم کو وہاں آجانے کے لئے لکھا تھا۔

اسی شام چچا اور میں اور بڑی بوڑھی نرس "کوہِ فیروز" روانہ ہو گئے۔ جونہی ہم وہاں پہونچے ڈاکٹر شیدی کے پرائیویٹ سکرٹری نے ہمیں ایک بڑے ہال میں بٹھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک نہایت شیریں مردانہ آواز آئی "تسلیم سر جعفر!"

چچا کی آواز آئی "تسلیم، یہ میری بھانجی اور آپکی مریضہ ہیں"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہلکی ہلکی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

چچا حادثے کی تفصیل بیان کر رہے تھے میں چپ چاپ ایک کوچ پر بیٹھی پاگلوں کی طرح ایک بے بسی کے عالم میں سر ادھر ادھر پھیر رہی تھی۔ میرے لئے اس نئے مقام میں سوائے نئی آوازوں اور نئی خوشبوؤں کے اور کچھ نہ تھا۔ اپنی محرومی اور نامرادی کا درد دل میں لئے اکتائی ہوئی بیٹھی تھی۔

دفعتاً چچا کی آواز آئی "بیٹی زیبا! ڈاکٹر شیدی تمہاری آنکھوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔ انکے ساتھ چلی جاؤ"

میں چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سہارا دیکر لیچلوں" ڈاکٹر شیدی نے کہا۔ اسکی آواز غیر معمولی دلفریب اور سریلی تھی۔

میں چپ چاپ ڈاکٹر کے سہارے جدھر وہ لے گیا چلی گئی۔

مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک دروازہ اس نے کھولا اور ہم دونوں اس میں داخل ہوگئے۔

ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا "خاتون۔ میں آپ کی آنکھوں پر شعاعیں ڈال کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک ہلکی سرخ سی روشنی محسوس کرتی ہیں یا نہیں" یہ کہتے ہوئے وہ میری کرسی کی پشت سے لگ کر کھڑا ہوگیا اور جھک کر میرا سر کرسی کی پشت پر رکھ کر پیشانی کے بال ہٹا دئے۔

"میں اپنی آنکھیں بند کر لوں؟"

"جی ہاں۔ اگر آپ کوئی روشنی محسوس کریں تو مجھے بتا دیجئے"

لیکن ڈاکٹر —!" بیساختہ میری زبان سے نکلا "اگر میں نے کوئی روشنی محسوس نہ کی — تو کیا ہوگا؟ کیا میں ہمیشہ کیلئے اندھی؟"

میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

رحمدل ڈاکٹر متاثر ہوگیا۔ اس نے میری تسکین کے لئے میری گرم پیشانی پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھدیا۔ بولا "بانو! اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ آپ کی بصارت آپ کو واپس نہ ملے تو مجبوری لیکن آنکھ رکھتے ہوئے بھی زندگی کو تاریک بنا لینا اور بغیر آنکھوں کے بھی زندگی کو روشن رکھنا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے"

ان فلسفیانہ باتوں پر غور کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی میں بے بسی کے عالم میں رو پڑی "مگر ڈاکٹر، بغیر آنکھوں کے ساری زندگی کیسے کٹے گی؟ میں کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی۔ کوئی خوشنما منظر نہیں دیکھ سکتی۔ اب کیا ہوگا ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے میرے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خاتون خوف نہ کیجئے۔ میں پوری کوشش سے آپ کا علاج کرونگا۔ لیکن اگر قدرت کو یہی منظور ہوا کہ آپ اپنی زندگی تاریکی میں کاٹیں تو اس کا انتظام یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی قوت سامعہ کیلئے دلچسپیاں مہیا کی جائیں۔ آپ حسین چیزوں کو دیکھ نہ سکیں گی مگر خوبصورت الفاظ سن سکیں گی۔ حسین راگ آپ کا دل بہلائیں گے"

ڈاکٹر نے آہستہ سے میرا سر کرسی کی پشت والی کشن سے لگا دیا۔ اور مجھ سے کہا کہ اس کی طرف دیکھوں۔ اپنے اسسٹنٹ کی امداد سے جو بہت خاموش نوجوان معلوم ہوتا تھا وہ دیر تک میری آنکھوں کا معائنہ کرتا اور مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھتا رہا۔

آخر کچھ دیر بعد اطمینان بخش لہجے میں بولا "خاتون زیبا! میرا خیال ہے کہ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ پہلے کچھ دن آپ کا علاج کیا جائے گا اور اس کا اگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا تو آپریشن کیا جائیگا"

"میں دونوں کے لئے تیار ہوں ڈاکٹر" میں نے کہا۔

پھر ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔

۵

مریض اور معالج

ڈاکٹر شیدی کے زیر علاج مجھے دو ہفتے گذر گئے۔ چچا جعفر جیسے مصروف آدمی کا اپنے شہر سے باہر رہنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ وہ بوڑھی نرس کو میرے پاس چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔

میری آنکھوں کی اب تک وہی کیفیت تھی۔ زندگی ایک دکھ بھری تاریکی میں گذر رہی تھی۔ وہی چند لمحے میرے لئے خوشگوار ہوتے تھے جب ڈاکٹر شیدی میرے پاس آ بیٹھتے۔ اور کسی پر لطف موضوع پر گفتگو چھیڑ کر مجھے اس میں ایسا منہمک کر لیتے کہ سوائے ایک ذہنی مصروفیت کے مجھے اور کسی بات کا احساس نہ رہتا۔

وہ عموماً ایسے موضوعوں پر گفتگو کرتے یا ان میں میری دلچسپی بیدار کرتے جن کے متعلق آنکھیں نہ رکھنے والے بھی تخیل ہی کی آنکھوں سے کام لے سکتے ہیں۔ آغاز آفرینش۔ قدیم تہذیبیں۔ یونانی فلسفہ۔ نفسیات اور اسی قسم کے دوسرے موضوعوں پر کوئی بات چھیڑ کر میرے تخیل کو ایک راستہ سجھا دیتے۔ اور میں اُنکے متعلق اپنی بساط کے مطابق بات میں سے بات پیدا کرتی رہتی۔ اور نہ معلوم فی الواقع ایسا تھا یا محض میری حوصلہ افزائی کی غرض سے ڈاکٹر عموماً میری ذہانت اور اندازِ فکر کی بہت داد دیتے۔

یہ خیال افروز صحبتیں لذیذ بھی ہوتی ہیں اور طویل بھی۔ شاید میرے علاوہ خود ڈاکٹر بھی اُن سے کم لطف اندوز نہ ہوتے تھے تھوڑے ہی دن بعد وہ اپنی فرصت کا سارا وقت، بلکہ بعض اوقات اپنا کام اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کر کے میرے پاس آ بیٹھتے۔ اور کوئی گفتگو وہیں سے شروع کر دیتے جہاں پچھلی صحبت میں ہم نے اُسے ختم کیا تھا۔ خیالی باتیں نہ کرتے تو میرے احساسات کا خیال رکھتے ہوئے ان کی آنکھیں میری آنکھوں کا کام سر انجام دیتیں اور وہ آس پاس کی ایک ایک چیز جسے دیکھنے کی میں خواہش کرتی بڑی تفصیل سے مجھ سے بیان کرنے لگتے۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ علاوہ مجھ سے ہمدردی ہونے کے ڈاکٹر کے دل میں میری قدر بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر کے رخصت ہو جانے کے بعد بعض اوقات مجھے بہت دیر تک اپنی نابینائی کا احساس تک نہ ہوتا۔ میرے تخیل کے لئے سوچنے اور غور کرنے کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ موجود رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی عملی زندگی کا کوئی واقعہ مجھ میں اپنی نابینائی کا احساس تازہ کر دیتا تو اس تمام خود فراموشی کی کسر نکل جاتی کہ پھر کان کے سوا اور کوئی شے میرے لئے باعثِ تسکین نہ بن سکتی۔

ایک شام میں دریچے کے پاس کوچ پر بیٹھی تھی۔ سر دریچے کے باہر نکال رکھا تھا۔ درختوں پر بلبلوں کے نغمے سنائی دے رہے تھے کہ یکایک مجھے ایک سُریلی تان سُنائی دی۔ اور پھر ایک خاص بھینی بھینی خوشبو آئی۔ معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر شیدی میرے قریب ہی کہیں ہونگے۔ کیونکہ جب کبھی وہ آتے یہی خوشبو کمرے میں پھیل جاتی تھی۔

اسی وقت ڈاکٹر کی آواز آئی "میں آپ کو دریچے میں دیکھکر اِدھر آنکلا"

"میں یہاں چڑیوں کے نغمے سُن رہی تھی ڈاکٹر۔ کیا ابھی ابھی آپ ہی کوئی مصرعہ گنگناتے زینے پر چلے آرہے تھے؟"

"جی ہاں۔ وہ میں ہی تھا"

"کتنا پیارا راگ تھا ——" میری زبان سے نکلا۔ جب سے بصارت گئی میری قوتِ سامعہ تیز ہوتی جارہی ہے ڈاکٹر۔ کیا آفتاب غروب ہو گیا؟"

ڈاکٹر میرے قریب آکر کھڑے ہو گئے پھر کہا "ابھی ابھی غروب ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کسی طرف کو چاند طلوع ہو رہا ہوگا۔ آئیے میں آپ کو باغ میں لے چلوں"

میں فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کا سہارا دیا۔ ڈاکٹر شیدی دراز قد اور مضبوط آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انکی آواز بھی بہت دلفریب تھی۔ جس وقت ہم دونوں باغ کے زینے پر اُتر آئے اچانک میرا دل دھڑکنے لگا۔ یقیناً وہ بہت خوبصورت بھی ہوگا!

میرا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ اسکی شکل دیکھوں۔

ہم دومنٹ باغ کے زینے پر چپ چاپ کھڑے رہے۔

پھر ڈاکٹر رشیدی نے کہا۔ "اب چاند طلوع ہو رہا ہے۔ باغیچے پر اُس کی ہلکی ہلکی روشنی کانپنے لگی۔ چاند نہ بہت سفید ہے نہ بہت زرد۔ پتے بھی ہل رہے ہیں۔ اُن کی آواز تو آپ بھی سنتی ہونگی؟"

"ہاں آواز آرہی ہے۔ کیا ننھے ننھے پودے بھی جھوم رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں اتنی تیز ہوا نہیں۔ بس۔ سربلند درختوں کی ٹہنیاں ہل رہی ہیں۔ لیجیے، چاند اب کچھ اوپر کو بڑھ آیا۔ شہتوت کا سایہ خوفناک معلوم ہونے لگا"

"کیا شہتوت بھی لگے ہیں؟"

"ہاں گرمیوں کا آغاز ہے، کچے شہتوت لگے ہیں۔ چلیئے، آپکو فوارے کی طرف لے چلوں"

ہم دونوں فوارے کے پاس ایک کوچ پر جا بیٹھے۔ وہ کہنے لگے "فوارے پر ایک عورت کی گردن ترشی ہوئی ہے۔ عورت کی دونوں آنکھوں میں سے پانی نکل رہا ہے۔ گویا آنسو بہہ رہے ہیں"

میں بول اٹھی "آہ کتنا المناک تخیل ہے۔ نہ جانے ایسا بُت کیوں تراشا گیا"

"چاند کی کرنیں ننھی ننھی بوندوں پر چمکنے لگیں۔ لیجیے ابھی ہمارے سامنے سے ایک جنگلی خرگوش جھاڑی میں بھاگ گیا۔ سرسراہٹ آپنے بھی سنی ہوگی"

"ہاں سنی تھی، ڈاکٹر آج تو آپ بالکل وہی خدمت انجام دے رہے ہیں جو کبھی میری آنکھیں دیا کرتی تھیں۔ میں سوچ رہی ہوں اگر میں یہاں سے مایوس گئی تو گھر پر میری آنکھوں کا کام کون دیگا؟"

ڈاکٹر دو لمحے چپ رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ میں کچھ شرما سی گئی اور بولی "ڈاکٹر! آپ کیا کر رہے ہیں؟ چپ ہیں؟"

ن بولے "آپنے ابھی ابھی مجھ سے سوال کیا تھا کہ آپ یہاں سے مایوس گئیں تو گھر پر آپ کی آنکھوں کا کام کون انجام دے گا۔ تو خاتون آپ کا جو بہترین دوست ہوگا اس کا سب سے بڑا فرض یہی ہوگا کہ آپ کی آنکھوں کا کام دے"

"میں مایوس لہجے میں بولی "مگر میں تو کوئی بھی ایسا دوست نہیں رکھتی ڈاکٹر۔ بالفرض اگر ایسا کوئی نکل بھی آئے تو اسے اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ اپنی زندگی کے تمام کام چھوڑ کر مجھے دنیا کی باتیں سنایا کرے۔ ایسی ہمدردی تو فرشتوں میں ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں آپ کو فرشتہ سمجھتی ہوں"

"کوئی بھی ایسا دوست نہیں؟" ڈاکٹر نے مکرر پوچھا۔ اسکی آواز میں سنجیدگی اور درد بھرا ہوا تھا۔

"کوئی نہیں ڈاکٹر" میں نے کہا۔

"کیا، کیا ــــــ یہ خدمت میں انجام دے سکتا ہوں؟"

میں حیران ہوئی "کیا ــــ؟ کون سی خدمت؟"

"یہی ــــ کہ زندگی بھر آپ کی آنکھوں کا کام میرے الفاظ دے سکیں"

"زندگی بھر؟ ــــ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں"

"یہ کیونکر ممکن ہے؟ زندگی بھر ــــ؟" میں پاگلوں کی طرح سوال کئے جارہی تھی۔

میری حیرت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر رشیدی نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا اور بھاری آواز میں بولے "زبیدا! میں زندگی بھر اس خدمت کو انجام دونگا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ شدید! بڑی شدید"

میں لرز گئی ــــ! صرف محبت کے فقرے سننا اور اپنے چاہنے والے کا چہرہ نہ دیکھنا کس قدر عجیب ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہیں دور سے ایک ملکوتی راگ میرے کانوں میں پہونچ

رہا ہے۔ میں از خود رفتہ ہو کر ڈاکٹر پر گر پڑی۔ میری زبان سے صرف اتنا نکل سکا "شیدی!"

شیدی نے مجھے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ لرزتی ہوئی آواز سے میرے کان میں پوچھنے لگے "زیبا! تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟"

میں بے خودی کے عالم میں بولی "یقیناً۔ مجھے تمہاری آواز سے عشق ہے۔ میں تمہارے فلسفیانہ اور شاعرانہ فقروں کی شیدا ہوں ——"

(۶)

رنگین اندھیرا

اس عہد و پیمان کے بعد محبت کا ایک نہایت پُر لطف اور رنگین دور شروع ہو گیا۔ میری رگ رگ میں ڈاکٹر شیدی کی محبت سمائی لیتی معلوم ہوتی تھی۔ اُن کی آواز کے سُنتے ہی میری خوابیدہ رُوح جیسے جاگ اُٹھتی۔ ان کے مضبوط ہاتھوں کو چھو کر میں اک نئی زندگی حاصل کرتی تھی۔

میری زندگی کی یہ پہلی محبت تھی۔ اور یقیناً آخری!

اب یہ ہر روز کا معمول ہو گیا تھا کہ اپنے کام سے فارغ ہو کر شام کے وقت شیدی میری طرف آجاتے اور مجھے باغیچے میں چہل قدمی کرواتے۔ وہ گھنٹوں پتّوں کا ہلنا آسمان کا رنگ شفق کی سُرخی پھولوں کی رنگین زندگی کی کہانی مجھے سُناتے رہتے۔ میری آنکھیں نہیں تھیں مگر شیدی کے فقروں نے آنکھوں کی کمی کو بہت حد تک بُھلا رکھا تھا۔

اس دوران میں چچا جعفر تین دفعہ ایک ایک دن کے لئے آئے اور مجھے دیکھ کر کچھ مایوس سے چلے گئے۔

آخر جب ایک مہینہ گذر گیا تو ایک دن شیدی نے کہا "زیبا! معلوم ہوتا ہے کہ آپریشن کرنا ہی پڑیگا"۔

یہ سُنکر میں ڈر گئی۔ "شیدی۔ مجھے آپریشن کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ پہلے میں اپنی نابینائی سے بیزار تھی۔ مگر اب محبت نے میری رُوحانی آنکھیں جگمگا دی ہیں۔ مجھے اب اپنی آنکھوں کی پرواہ نہیں رہی"۔

"مگر پیاری" اُنہوں نے پیار کے لہجے میں کہا "تم مجھے بھی تو نہیں دیکھ سکتیں"۔

میں مچل گئی "ہاں شیدی! البتہ مجھے تمہارے دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔ تم خود ہی مجھے بتا دو تم کیسے ہو؟ میں تمہاری آواز سُنکر اندازہ لگا سکتی ہوں کہ تم کتنے حسین ہو گے۔ اچھا مجھے دیکھنے تو دو ——"

یہ کہکر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کا چہرہ ٹٹولا۔

"تم بیحد حسین ہو۔ تمہاری آنکھیں لمبی لمبی ہیں۔ تمہاری پیشانی کُشادہ ہے"۔

"یہ سب کچھ صحیح۔ مگر زیبا! خیال کرو۔ جب ہماری شادی ہوگی ..... جب ہمارے ننھے ننھے بچے ہوں گے —— اس وقت آنکھوں کی ضرورت کس قدر محسوس ہوگی؟" شیدی کی آواز میں ایک ارتعاش تھا۔

میں شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ پھر شرمیلے انداز میں بولی "شیدی کیا باتیں کرتے ہو"۔

شیدی مجھے اپنے بازوؤں میں لیکر بولے "میں غلط نہیں کہتا —— کچھ عرصے بعد تمہیں اپنی آنکھوں کی ضرورت محسوس ہوگی"۔

لمحہ بھر لب کچھ سوچکر میں بگڑ سی گئی بولی "ہاں بیشک، تم سچ کہتے ہو اندھی بیوی مصیبت ہوتی ہے۔ ہے نا؟"

"خُدا کی قسم یہ بات نہیں ہے میری زیبا! اندھی بیوی تو مُفید ہوتی ہے مُصیبت کیوں ہونے لگی؟ مگر میں نہیں چاہتا کہ تم آنکھوں جیسی نعمت سے زندگی بھر محروم رہو۔ اگر تمہیں اس بات کا خیال ہے کہ میں اندھی بیوی کو مصیبت سمجھتا ہوں اور محض اپنے

فائدے کے لئے تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرنا چاہتا ہوں تو میں تم سے تمہاری موجودہ نابینائی کی حالت میں شادی کرنے پر تیار ہوں۔ کچھ عرصے بعد تمہیں خود آنکھوں کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت تمہارے کہنے پر میں آپریشن کرونگا۔ زیبا۔ اب تمہارا اطمینان ہوگیا؟"

میں مسکرائی" شیدی۔ اگر تم زندگی بھر مجھ سے ایسی ہی محبت کروگے جیسی آج کرتے ہو تو میں اپنی آنکھوں کی کمی کو کبھی محسوس نہ کرونگی۔ میرے پیارے شیدی۔ تمہیں نہیں معلوم دن رات محبت بھرے فقرے سنتے رہنا بھی ایک فردوسی زندگی ہے۔ میری آنکھیں آجائیں گی تو تمہارے محبت بھرے الفاظ بھی کم ہو جائیں گے۔ کیونکہ پھر ان کی ضرورت نہ رہے گی۔ نہیں شیدی۔ میں اندھی ہی اچھی۔ مجھے تمہاری محبت میسر ہو تو پھر نابینائی کا کوئی غم نہیں"

یہ سنکر شیدی بیتاب ہوگئے" زیبا، پھر تو ہمیں شادی میں دیر نہیں لگانی چاہیئے۔ اس ماہ کے اختتام پر ہماری مشترکہ زندگی کا آغاز ہو تو کیسا ہو؟ ـــــ اصل مرحلہ تو سر جعفر کی منظوری کا ہے۔ انہیں اب تک اس کا بھی علم نہیں کہ یہاں ہم میں کس شدت کی محبت ہوگئی ہے"

میں دھیمے لہجے میں بولی "مگر میرا خیال ہے چچا کو کسی قسم کا اعتراض نہ ہوگا۔ کیونکہ ـــــ آخر انہیں بھی تو میری نابینائی کا خیال ہوگا کہ ـــــ نابینا سے شادی کون کریگا"

شیدی بول اٹھے" نہیں نہیں۔ ایسا خیال نہ کرو۔ یہ سرخ گلاب کی پتی جیسے ہونٹ، اور یہ سنہرے بال اور یہ معصوم بھولا بھولا چہرہ ہر نوجوان کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھکر کسی کو نابینائی کا خیال تک نہیں آسکتا۔

تکمیل آرزو

آخر میرا خیال درست نکلا۔ یعنی جب ڈاکٹر شیدی نے چچا سے میرے لئے درخواست کی تو انہوں نے فوراً منظور کر لیا۔ مگر اتنا ضرور کہا "ڈاکٹر شیدی۔ جو کچھ آپ کرنا چاہتے کچھ دنوں غور کرکے کیجیے۔ ایک نابینا لڑکی سے شادی کرنا غور طلب معاملہ ہے۔ کیا آپ نے اس پر کافی سوچ لیا ہے؟ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ آپ کی یا زیبا کی ازدواجی زندگی میں اس کی نابینائی کی وجہ سے دقتیں پیدا ہوں"

"سر جعفر!" ڈاکٹر شیدی کی دل فریب آواز آئی "میں نے اس پر کافی غور کر لیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ مجھے خاتون زیبا سے بہتر بیوی اس دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آپ اطمینان رکھیئے۔ انشاءاللہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہوگی جس سے زیبا کو ان کی نابینائی کے باعث کسی قسم کی تکلیف ہو"

"پھر تو میں مطمئن ہوں" چچا نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد اسی شام ڈاکٹر شیدی بھاگے بھاگے میرے پاس آئے اور مجھے لپٹا لیا" زیبا، زیبا، مجھے مبارکباد دو۔ تمہارے چچا نے اجازت دیدی"

پندرہ دن بعد اپریل کے آخری ہفتے کی ایک خوشگوار شام ہمارا عقد نہایت خاموشی سے ہوگیا۔ شیدی کہہ رہے تھے کہ میں اس شام اپنے لمبے دامنوں والے عروسی لباس میں نارنگی اور موتیا کے پھولوں میں لپٹی لپٹائی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے یونانیوں کے حسن و عشق کی دیوی۔

ہم نے اپنے "ایام عروسی" ایک چمکیلے ساحل پر بسر کئے۔ وہ میری زندگی کا انتہائی پر لطف اور رنگین زمانہ تھا۔ مجھے اپنی نابینائی کا زیادہ صدمہ نہ رہا تھا۔ مگر میں محسوس کرتی تھی کہ شیدی کی دلی تمنا یہ تھی کہ میری بصارت بحال ہو جائے۔ اور ایک چاہنے والے کی یہی تمنا ہونی چاہیئے۔

چنانچہ ایک دن جب میں دریچے میں کھڑی سمندری ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی وہ آگئے اور کہنے لگے" زیبا! زندگی کے ہر لمحے پر ایسا شبہ ہوتا ہے جیسے ہم فردوس میں بیٹھے ہوں۔ آج

تمہاری آنکھیں ہوتیں تو یہ خلش بھی نہ رہتی جو میرے دل میں خار بنکر کھٹک رہی ہے۔"

میں مُسکرا کر بولی "اگر میری نابینائی کا صدمہ ہماری مسرّت میں خلل انداز ہو رہا ہے تو میں آپریشن کیلئے تیار ہوں شیدی۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں شیدی۔ بالکل۔"

"تم بڑی عقلمند لڑکی ہو۔ زیبا۔ سوچو تمہاری آنکھیں آجائینگی تو ہماری زندگی کس قدر روشن ہوگی ——؟ اس کا خیال دفورِ مسرّت سے مجھے پاگل بنا دیتا ہے۔ تم مجھے دیکھ سکوگی —— اپنے شوہر کو۔"

میں بیتاب ہوکر بولی "اللہ وہ وقت کتنا مبارک ہوگا! تمہیں دیکھنا! اپنے پیارے شیدی کو دیکھنا۔ میری تمام رُوح کھنچکر میری آنکھوں میں آجائے گی۔" پھر ایک لمحے کے بعد کچھ افسردگی کے لہجے میں بولی "مگر شیدی اب میں تمہارے دل کی آواز سُن رہی ہوں۔ آنکھیں آجائیں گی تو ہماری محبت چُپ چاپ ہوجائیگی۔"

شیدی ہنس پڑے "پاگل لڑکی۔ کوئی اتنی سی بات پر آنکھیں کھو دیتا ہے؟"

"کیوں نہیں شیدی؟" میں کہنے لگی "کیوں نہیں؟ مجھے تمہارے محبت بھرے فقرے آنکھوں سے کہیں زیادہ محبوب ہیں۔ میں ان فقروں کو کھو دونگی۔ ان سے محروم ہوجاؤنگی۔"

شیدی بولے "تمہیں تو محض میرے فقروں سے محروم ہوجانے کا اندیشہ ہے مگر —— کیا مجھے اس بات کا خدشہ نہیں پیدا ہوسکتا کہ تمہاری آنکھیں آنے پر کہیں —— کہیں میں تمہاری محبت ہی سے محروم نہ ہوجاؤں۔"

میں سمجھ نہ سکی "ایں —— محبت سے محروم! اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

شیدی دو لمحے خاموش رہے۔ نجانے کیا کر رہے تھے۔

میں نے پھر پوچھا "شیدی، بولتے کیوں نہیں! تم محبت سے محروم کیوں ہونے لگے؟"

شیدی کہنے لگے "زیبا! میں صاف صاف بتا دوں؟" —— دیکھو مجھے معاف کرو۔ میں نے بڑا دھوکا دیا۔ اور شاید اس دھوکے کا انکشاف اب بعد از وقت ہو۔ مگر اب بتائے دیتا ہوں کہ میں کوئی حسین آدمی نہیں ہوں۔"

میں کچھ حیران ہوئی "مگر جب میں اپنی انگلیوں سے تمہارے چہرے کو ٹٹولتی ہوں تو تم بڑے حسین معلوم ہوتے ہو۔"

"ہاں —— انگلیوں کا محسوس کرنا اور بات ہے اور آنکھوں سے دیکھنا علیحدہ بات۔ اب تم مجھ سے محبت کرتی ہو اسلئے بھی میں تمہیں حسین معلوم دیتا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد محبت ہوگی نہ میں حسین معلوم ہونگا۔"

میں کچھ پریشان سی ہوگئی تھی بولی "پیارے شیدی! پھر تو میں اندھی ہی اچھی۔"

شیدی ہلکی ہنسی ہنس پڑے جس شخص کی ہنسی اتنی ہوشربا اور موسیقی آمیز ہو وہ بدصورت ہو سکتا ہے؟ —— کہنے لگے "دیکھا آخر ڈر گئیں نا۔ لیکن زیبا۔ میری بدصورتی تمہیں اندھا نہیں رکھ سکتی۔ ایک وفادار شوہر اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی بیوی کے لئے ہر قربانی پر تیار ہوجاتا ہے۔ خواہ مجھے دیکھنے کے بعد تم مجھ سے نفرت ہی کرو۔ مگر میں ضرور تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرونگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھے صحنِ باغ میں لے آئے۔

میں کچھ سوچنے لگی۔ باغیچے میں سناٹا تھا۔ دریچے کے پاس ایک ننھا سا پرندہ گا رہا تھا۔ سمندر کی موجوں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

بڑی دیر بعد میں نے سر اُٹھایا "شیدی، تم کہاں ہو ——؟" اندھے پن کے بعد اس سوال کی مجھے عادت ہوگئی تھی پھر بولی "تم یکلخت چُپ ہوگئے۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

"پیاری، میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب محبت کے اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے"۔

میں نے ایک گہری سانس لی "شیدی۔ تم بڑے بدگمان آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مجھے تمہارے حُسن یا بدصورتی سے یقیناً محبت نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ یقین کرو تم سے۔ کاش میں اپنا دل کھول کر تمہیں بتا سکتی۔ تم میری آنکھوں کا آپریشن کرو اور دیکھ لو۔ میری محبت کا دیوتا تمہاری صورت کے معاملے میں ہمیشہ اندھا ہی رہے گا"۔

"کیا تم دل کی گہرائیوں سے کہہ رہی ہو زیبا؟"—

اُنہوں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ میرے پیارے شیدی۔ دل کی گہرائیوں سے"۔

"تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرو گی زیبا؟"

"ہمیشہ شیدی"۔

یہ سُنکر شیدی نے مجھے مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

۸

کشمکش

اِس گفتگو کے دوسرے ہفتے میرے آپریشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔

چچا جعفر اور ڈاکٹر شیدی مجھے تسلّی دلاسے دیتے رہتے تھے۔

آخر وہ ہیبتناک دن آگیا اور میرا آپریشن ہوا۔ وہ وقت بھی گذر گیا۔ اب میری آنکھوں پر پٹّیاں بندھی ہوئی ہیں۔ کمرہ اندھیرا رکھا جاتا تھا۔ نویں دن میری پٹّیاں کھُلنے والی تھیں۔ گویا اگر میری قسمت میں ہوا تو نو دن کے بعد میں اپنے محبوب شوہر کا چہرہ دیکھ سکونگی۔ نہ پوچھئے وہ ایام کس بیقراری اور تذبذب میں کٹے۔

جس صبح میری پٹّیاں کھُلنے والی تھیں اُس کی رات شیدی میرے کمرے میں کچھ گھبرائے گھبرائے سے آئے "زیبا آج کی شام ضائع نہیں کرنی چاہیئے۔ کیا پتہ یہ شام ہماری صحبت کی آخری شام ہو۔ اس شام کے بعد کیا پتہ ہماری تقدیر بدل جائے"۔

مجھے صدمہ ہوا "شیدی، تم ایسی باتیں کرو گے تو میں اپنی پٹّیاں ابھی کھول کر پھینک دونگی"۔

شیدی بولے "تو پھر شاید آج ہی شام سے زندگی کا رُخ بدل جائے"۔

مَیں چڑکر بولی "اگر میری آنکھوں کی روشنی سے تمہاری زندگی تاریک ہو جانے کا اندیشہ ہے تو مَیں کبھی نہ چاہونگی کہ میری آنکھیں آجائیں"۔

"اچھا زیبا۔ کل تمہاری محبت، اور میری کم روئی کا مقابلہ ہے"۔

مَیں بولی "بیشک ہوگا۔ شیدی، عورت اپنے شوہر کو بہت ہی چاہتی ہے خصوصاً ایسی لڑکی، جس نے اپنی زندگی میں شوہر کے سوا کبھی کسی مرد سے محبت نہ کی ہو۔ کیا تم کو علم نہیں میں نے سوائے تمہارے کبھی کسی سے محبت نہیں کی"۔

شیدی بغور میرے چہرے کا مطالعہ کر رہے تھے کیونکہ وہ خاموش تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد جھک کر میرے رُخسار دل کو چھوا اور بولے "اچھا زیبا خدا حافظ۔ صبح دیکھا جائے گا کہ جب محبت کے اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو کیا ہوتا ہے"۔

مَیں مُسکرا کر بولی "دیکھ لینا"۔

۹

حُسن یا محبت؟

دوسرے دن کی صبح کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ شیدی نے خواہ مخواہ میرے دل میں وسواس سا پیدا کر دیا تھا۔ اوّل تو یہ دھڑکا

کہ بصارت بحال ہوتی ہے یا نہیں۔ ہو کبھی جاتی تو پھر طرح طرح کے اندیشے تھے۔ میں خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ معبود! مجھے اس امتحان میں کامیاب کر۔ کبھی اپنے دل سے باتیں کرنے لگتی کہ کیا واقعی جس شخص کی میں شیدائی ہوں جسے میں دنیا کا بہترین مرد سمجھتی ہوں وہ کم رو اور کریہہ منظر آدمی ہے؟ ___ کیا اسے دیکھکر میری محبت لرز جائے گی؟ ___ میں یہ دعا نہیں کرتی کہ وہ بدصورت نہ ہو بلکہ یہ دعا کرتی ہوں کہ اسے دیکھکر میری محبت سہم نہ جائے۔ مجھے شیدی سے محبت ہے۔ محبت ہے۔ میرے قدم اس راہ میں کبھی نہ ڈگمگائیں گے۔ مگر پھر آپ سے آپ دل سرگوشی میں کہنے لگتا پاگل لڑکی۔ محبت کا تعلق تو دل سے پہلے آنکھ سے ہے۔ محبت دیکھکر ہوتی ہے۔

غرض میری رات شدید ترین اضطراب میں کٹی۔ صبح ہوئی تو دل مارے اندیشوں کے بیٹھا جا رہا تھا۔ جب شیدی میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں ہانپ رہی تھی۔ بے بس ہو کر ان سے لپٹ گئی ___

"زیبا! میری زیبا! کیسی ہو رہی ہو؟"

"میں اچھی ہوں" مگر ایک سسکاری نکل گئی۔

"کیوں؟ میری قسمت پر رو رہی ہو؟" انہوں نے بھاری آواز سے پوچھا۔

میں ضبط کر کے بولی "میں سوچ رہی ہوں اتنی مدت بعد میں دنیا کو کیسے دیکھونگی! اس خیال سے خوف معلوم ہوتا ہے"

میں نے شیدی کا گرم سانس اپنے رخسار پر محسوس کیا پھر بولی "شیدی جب میں تم پر پہلی نگاہ ڈالوں گی تو میرے دل کی کیا حالت ہوگی؟ ___ اُف میرے اللہ!"

شیدی سنجیدہ لہجے میں بولے "زیبا، یہ تمہاری آنکھوں کی پٹیاں میں نہیں کھولونگا مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرا اسسٹنٹ یہ خدمت انجام دے گا"

"جیسی تمہاری مرضی شیدی۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ تم کھولو گے۔ اور دنیا میں سب سے پہلے مجھے تمہاری حسین صورت نظر آئے گی"

"اگر وہ حسین ہوتی تو ایسا ہی ہوتا زیبا!"

آخر وہ وقت آ گیا کہ میری پٹیاں کھولی جانے لگیں۔

میں چپ چاپ لیٹی تھی۔ میرے اطراف دو تین ڈاکٹروں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیدی بھی یا اس کمرے میں موجود ہیں۔

آخر پٹی کھل گئی ___ ڈاکٹر نے مجھے دیکھنے کو کہا۔

اُف وہ لمحہ! پلکوں کو پلکوں سے جدا کرنا۔ روشنی کیلئے! یا ابدی تاریکی کے لئے ___! سہمے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے پلک اُٹھائی۔

میں لرز گئی۔ اور ایک چیخ سی میرے منہ سے نکلی ___ روشنی کی پہلی کرن میں نے محسوس کی۔ اس دھندلی روشنی میں سے کمرے کے رنگ ابھرتے اور واضح ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں ایک سبز دریچوں والے حسین کمرے میں کوچ پر پڑی تھی۔ کھڑکی میں سے آسمان نظارہ افروز تھا۔ وہی نیلا۔ روشن حلیم سے مسکراتا ہوا آسمان"

"شیدی! شیدی!" میرے منہ سے نکلا۔ شیدی نے مجھے میری آنکھیں واپس دیدیں۔ یہ انہیں کے پیارے ہاتھوں کا کرشمہ ہے۔ میرے دل میں محبت کا ایک چشمہ اُبلنے لگا۔ اس شخص کو دیکھنے کے اشتیاق نے مجھے پاگل بنا رکھا تھا جس سے مجھے محبت تھی اور جس نے مجھے آنکھیں بخشی تھیں۔

دفعتاً پردے کے پاس مجھے کچھ آواز آئی۔ میں نے مڑکر دیکھا اور چیخکر کہا "شیدی!" مردانہ حسن و وجاہت کا ایک دلفریب نمونہ پردے کے پاس کھڑا تھا۔ لمبی لمبی نشیلی آنکھیں۔ سنہرے بال حسین مانگ۔ نہایت شگفتہ چہرہ۔ میں بیخود ہو کر اُسکی طرف

گئی۔ وفورِ شوق سے میری زبان سے بشکل اتنا نکلا "میرے شیدی"۔

نوجوان نے سر جھکا کر مجھے سلام کیا۔ بھاری آواز میں بولا۔

"ڈاکٹر شیدی باہر ہیں معزز خاتون۔ میں انکا اسسٹنٹ ہوں"۔

"او ــــ" میں نے مایوس لہجے میں کہا "مجھے غلطی ہوئی۔ کیا آپ براہِ کرم انہیں بلادیں گے"۔

اسسٹنٹ بولا "پانچ منٹ میں وہ خود ہی آجائیں گے۔ وہ اپنے اس وقت کے اضطراب کو مریضوں میں مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

میں اپنا اشتیاق چھپا نہ سکی "اسسٹنٹ تم کو معلوم ہے کہ میں مدت سے اندھی تھی۔ میں نے اپنے شوہر کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ آپ مجھے بتادیں گے کہ وہ کیسے ہیں؟"

وہ مسکرایا "وہ ــــ مینٹل پیس پر ڈاکٹر شیدی کی تصویر رکھی ہے ادھر دیکھیے"۔

میں مینٹل پیس کے پاس گئی اور تصویر اٹھالی "یہ شیدی کی ــــ میرے رفیقِ زندگی کی تصویر ہے؟ میرے اللہ" میرے منہ سے ایک آہ نکل گئی۔ یہ ایک چالیس سالہ مرد کی تصویر تھی۔ پیشانی فراخ مگر نقش نہایت بھدے۔ چہرے پر کرختگی برس رہی تھی۔ اس تمام تصویر پر کچھ ایسی بے رونقی اور بدصورتی چھائی ہوئی تھی کہ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ سامنے قدِ آدم آئینے میں اپنا کا ہیدہ مجسمہ دیکھکر میں لرز گئی۔ مجھ سی نازنین عورت یہ کس مرد کی محبت میں گرفتار ہوگئی!۔

اسسٹنٹ مجھے بغور دیکھ رہا تھا بولا "بھولی خاتون! کس سوچ میں کھڑی ہو؟ آپ کی کچھ دنوں کی نابینائی نے آپ کی زندگی سے بڑی بدسلوکی کی۔ جب ڈاکٹر شیدی سے آپ کی شادی ہونے لگی تو کئی بار میرا جی چاہا کہ کسی خفیہ طریق پر آپ کو ان کی بدصورتی کے راز سے آگاہ کردوں۔ مگر آپ جانیئے ڈاکٹر شیدی بھلا ایسا موقع مجھے کب دینے لگے تھے ــــ؟ آخر انہوں نے وہی کیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ ان کی عمر چالیس سال کی ہوگئی ان کی تجرد کی زندگی کی تمام ذمہ داری انکی شکل پر عائد ہوتی ہے۔ اس علاقے کی تقریباً تمام لڑکیوں نے انہیں بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ آخر آپکی بدنصیبی آپ کو یہاں کھینچ لائی"۔

میں ششدر کھڑی تھی۔ اور ٹکٹکی باندھ کر اس حسن کے دیوتا کو دیکھ رہی تھی جو میرے سامنے کھڑا تھا۔ یہ بالکل افسانوں کے ہیرو کا سا حسن و جمال رکھتا تھا کچھ دیر بعد میری نظر اپنے شوہر کی تصویر پر گئی۔

"مگر مجھے ڈاکٹر شیدی سے محبت تھی ــــ محبت ہے"۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ کی محبت نابینائی کی مرہونِ منت ہے، اب آپ اپنی آنکھوں سے مشورہ لیجیے۔ سچ تو یہ ہے خاتونِ زیبا۔ آپ سی نازنین لڑکی کو ڈاکٹر صاحب جیسے مکروہ انسان کے ساتھ دیکھکر میرے دل پر چھریاں چلنے لگتی ہیں"۔

"آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں اسسٹنٹ ــــ محبت کا دارومدار حسن پر نہیں ہوتا"۔

نوجوان اسسٹنٹ دلفریب آواز میں ہنس پڑا "ایمان سے کہیئے آپ کو اپنے شوہر کی تصویر کو دیکھکر مایوسی نہیں ہوئی؟"

میں بولی "اسکے لئے میں پہلے سے تیار تھی۔ شیدی نے مجھے خود بتادیا تھا کہ وہ حسین نہیں ہیں مگر ــــ میں سمجھتی تھی ــــ وہ انکی شکل ایسی تو نہ ہوگی"۔

"اگر آپ کو شبہ ہو تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیجے۔ وہ برآمدے میں ایک مریض کو کچھ ہدایتیں دے رہے ہیں"۔

میں دھڑکتے ہوئے دل سے کھڑکی کی طرف گئی، اور جھانک کر دیکھا۔ آہ، میرا دل بیٹھ گیا۔ وہ تصویر سے زیادہ بدصورت تھے۔ کیا میں اسی شخص کی پرستش کرتی ہوں؟ کوئی عورت اس سے محبت کرسکتی ہے؟۔

میں سر پکڑ کر ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔

نوجوان اسسٹنٹ سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے ایک گہرے نیلے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ گہرے سبز رنگ کی نکٹائی زیبِ گلو تھی۔ وہ ایک افسانوی انداز میں مجھ پر جھک کر بولا "خاتون زیبا۔ آپ بڑی جلد باز لڑکی ہیں۔ مگر آپ سے زیادہ تعجب مجھے آپ کے چچا پر ہوتا ہے اُنہوں نے آپکو اس تاریک غار میں کیوں پھینک دیا۔ کیا ڈاکٹر کی دولت اور ثروت نے اُنہیں اندھا کر دیا تھا؟"

میں جلدی سے بولی "نہیں نہیں۔ سر جعفر کو دولت و حشمت کی مطلق پرواہ نہیں۔ اُنہوں نے یہی سوچا ہو گا نا ——— کہ اندھی لڑکی ———"

"یہ ظلم ہے صریحاً ظلم"۔ اسسٹنٹ نے کہا "آپ سی حسین لڑکی اگر اندھی بھی تھی تو کسی کو کیا پرواہ ہو سکتی تھی؟ مثال کے طور پر میں خود اپنے آپ کو پیش کر سکتا تھا۔ اگر آپ سی اندھی بیوی مجھے مل جاتی ——— تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب ———"

میں نے روکا "ایں ایں۔ اسسٹنٹ! کیا کہتے ہو؟ میں تمہارے چیف کی بیوی ہوں۔ تم بہت نامعقول شخص نکلے"

"معاف کرنا خاتون زیبا۔ مجھ سے لغزش ہوئی"۔

میں نے رُوکھائی سے کہا "اچھا تو اب آپ براہِ کرم ڈاکٹر شیدی کو بُلائیں، میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں"

"بہت اچھا ——" یہ کہکر اسسٹنٹ باہر چلا گیا۔

جب محبت کے اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر شیدی اپنے کرخت وضع کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے میں آئے اور خوبصورت اسسٹنٹ باہر چلا گیا۔

"زیبا" اُنہوں نے کہا۔ اُنکی آواز میں لرزش تھی۔

"شیدی" میری زبان سے نکلا۔ اور ساتھ ہی ہجومِ جذبات سے دو موٹے موٹے آنسو میرے رُخسار پر ڈھل آئے۔

"زیبا! آنکھیں مُبارک! سچ سچ تم دیکھ سکتی ہو؟ اب روتی ہو؟ کیوں کیا میری تقدیر پر؟" اُنہوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ کہا۔ اُنکی آواز ایک انوکھے طور پر دردناک معلوم ہو رہی تھی۔

میرے حواس جیسے سُن ہو گئے تھے "نہیں شیدی نہیں" یہ کہکر نجانے کیوں میں سسکیاں لینے لگی۔

وہ کسی قدر قریب آ گئے "زیبا۔ جب محبت کے اندھے دیوتا کی آنکھیں پیدا ہوتی ہیں تو یہی کچھ ہوتا ہے... سسکیاں ——— اپنے کئے پر پچھتاوا ——— آنسو ———"

میں ضبط کر کے بولی "نہیں شیدی۔ میں اپنے قول پر قائم ہوں۔ میں اب بھی ——— تم کو چاہ ——— تی ہوں"۔

"ہاں۔ چاہتی تو ہو۔ مگر کیا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتی ہو کہ نابینائی کے ایام میں جس وارفتگی سے مجھے چاہا کرتی تھیں وہی وارفتگی اب تک موجود ہے؟"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں "شیدی۔ مجھے آنکھیں نہیں چاہئیں۔ مجھے تمہاری محبت چاہیئے۔ میری آنکھوں میں کوئی تیزاب ڈال دو۔ تاکہ پھر میں اپنے خوابوں کے جزیرے میں تمہاری ہی محبت کا گیت گا سکوں۔ میرے شیدی آنکھیں بڑی فسادی ہوتی ہیں۔ یہ مجھے نہیں چاہئیں۔ مجھے محبت کی اندھی آنکھیں چاہئیں"۔ یہ کہتے ہوئے میں رونے لگی۔

"زیبا میں تمہاری زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ ایک مدت تک میری ویران زندگی تنہائی اور تجرد کے عالم میں بسر ہوتی رہی۔ پھر تم آئیں اور میں نے تمہیں دھوکا دیکر تمہیں اپنے محبت کے جال میں پھنسا لیا۔ اب جبکہ تمہاری بصارت بحال ہو گئی ہے میرے دھوکے

کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔"

"مگر شیدی" میں پریشان لہجے میں بولی "تم نے میری آنکھوں کا آپریشن کیا ہی کیوں؟ میں خوش تھی۔ میں اندھی تھی اور محبت کی پرستار تھی۔"

"وہ میرا انسانی فرض تھا زیبا!"

"آہ، تم بہت نیک ہو شیدی!"

"تم نے اپنی آنکھیں بند کیوں کر رکھی ہیں؟" شیدی نے پوچھا انکی آواز میں ایک درد تھا۔

"مجھے اسکی عادت ہو گئی ہے شیدی۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں تو میں خواب اور افسانے کی سرزمین پر ہوتی ہوں۔"

"اور جب وہ کھل جاتی ہیں تو ایک دیوانا آدمی تمہارے دلآویز تخیلات کی عمارت کو مسمار کر دیتا ہے۔ یہی بات ہے نا؟" انہوں نے نہایت افسردگی سے پوچھا۔

"نہیں شیدی، ہرگز نہیں۔ مجھے آنکھیں بند رکھنے میں محض اس لئے مزہ آتا ہے کہ مجھے اپنے عشق کے ابتدائی دن یاد آجاتے ہیں۔ جب میں اندھی تھی اور تم نے پہلے پہل اظہارِ آرزو کیا تھا۔"

شیدی نے میرا بازو چھوا اور کمرے کی دوسری طرف لے گئے۔ پھر ایک جگہ مجھے کھڑا کر کے کہا "زیبا۔ اب آنکھیں کھولو۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے قدآدم آئینے میں ہم دونوں کا عکس نظر آرہا تھا۔ میں مبہوت ہو کر اپنے حسین اور کاہیدہ اور اپنے شوہر کے بھدّے اور کریہہ منظر کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ میرا دل خون ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اپنا منہ نوچ لوں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور باوجود انتہائی کوششِ ضبط کے میرے آنسو نکل آئے۔

شیدی نہایت دل شکستہ نظر آرہے تھے "زیبا! اب تم نے دیکھ لیا؟ —— میں تمہارے قابل نہیں۔ اگر دنیا میں انصاف کوئی چیز ہے تو مجھے چاہیئے کہ تم سے معافی چاہوں اور ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاؤں۔ یہی میری سزا ہے۔"

"شیدی، ایسی باتیں نہ کرو۔"

"کیوں ایسی باتیں نہ کروں زیبا؟ آخر مجھے اپنی کم روئی کا احساس ہے۔ اپنے جرم کا احساس ہے۔ تمہارے حسن کا احساس ہے۔ ہر روز تم میری محبت کا مقابلہ دوسروں سے کرو گی۔ میرے حسین اسسٹنٹ ہی سے کرو گی۔ میں سوچتا ہوں کہ جب تم مجھے اور اسے یکجا دیکھو گی تو تمہارے دل پر کیا گزرے گی؟"

میں بیقرار ہو گئی "شیدی۔ تم بے حد بدگمان ہو" اسی وقت میری نگاہ اتفاق سے الماری پر جا پڑی۔ اس میں ایک شیشی نظر آئی جس پر کسی تیزاب کا نام جلی لفظوں میں لکھا تھا۔ میں نے الماری کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا "وہ الماری میں کیا چیز رکھی ہے؟ کوئی تیزاب ہے؟ میں اسے اپنی آنکھوں میں ڈال لونگی۔ اور ہمیشہ کے لئے اندھی ہو جاؤنگی۔ پھر تو ہماری زندگی مزے سے کٹے گی نا —— ؟"

یہ کہکر میں الماری کی طرف بڑھی۔

شیدی جلدی سے بولے "ٹھہرو۔ تمہیں پھر اندھا بننے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی مکروہ شکل ہمیشہ کے لئے چھپا لوں گا۔ اپنی آنکھیں ضائع نہ کرو۔ جب حسن دیکھنے کو مل جائے تو آدمی کو اندھا نہیں ہونا چاہیئے۔" پھر وہ دریچے کی طرف گئے اور ہلکی آواز میں کہا "اسسٹنٹ!"

اسی وقت اسسٹنٹ اندر داخل ہوا۔ وہی حسین چہرہ، وہی میٹھی مسکراہٹ۔ وہی دل میں گھر کرنے والی نشیلی آنکھیں میں نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔

شیدی نے نہایت درد انگیز لہجے میں کہا "زیبا میں انصاف پسند ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں میں تم سی حسین لڑکی کے ناقابل ہوں۔ شاید آنکھیں مل جانے کے بعد یہ نوجوان تمہارا زیادہ موزوں رفیق ثابت ہو سکے۔"

میں حیران ہو کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ مایوسی اور صدمے سے وہ پاگل ہو رہے تھے۔

میں نے رحم اور بے بسی کے لہجے میں کہا "شیدی۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اُسے نہیں سمجھتے۔ تمہارا دماغ بیکار ہو گیا ہے"

شیدی نے سنجیدگی سے کہا "زیبا۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ خدا حافظ زیبا۔ مجھے معاف کر دو" یہ کہہ کر انہوں نے ایک آخری نظر مجھ پر ڈالی اور باہر چلے گئے۔

میں چیخ پڑی "اسسٹنٹ، اسسٹنٹ۔ انہیں بلاؤ۔ —— دیکھو۔ یہ تیزاب کی شیشی —— میں یہ تیزاب اپنی آنکھوں میں ڈال رہی ہوں —— میں اندھی ہو رہی ہوں۔ اپنے شوہر کی خاطر ——"

یہ کہہ کر میں نے شیشی کا کارک کھول لیا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ شیشی میرے ہاتھ سے دور جا گری اور اسسٹنٹ نے قریب آکر کہا "دیوانی ہو گئی ہو؟ وہ مکروہ شکل اب تمہاری زندگی سے باہر ہے۔ مفت میں اپنی آنکھیں کیوں کھوتی ہو؟" شدتِ مسرت سے اس کی آواز عجیب ہو رہی تھی ——

"کیونکہ —— کیونکہ اسسٹنٹ مجھے محبت چاہیئے صرف محبت۔ ڈاکٹر شیدی حسین نہ سہی۔ مگر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دلی محبت۔ ایسی محبت —— جس نے میری اندھی دنیا کو روشن کر دیا تھا۔ میں اس محبت کو کھو نہیں سکتی" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"زیبا!"

میری روح کانپ گئی۔ ایں۔ یہ کس کی آواز ہے!——

ڈاکٹر شیدی!؟!"

میں نے آنکھیں کھول لیں "اسسٹنٹ؟ کیا ابھی ابھی ڈاکٹر شیدی نے مجھے بلایا تھا؟ میں سچ کہتی ہوں مجھے ان ہی سے محبت ہے۔ انہیں بلاؤ —— انہیں بلاؤ۔ اپنی نشیلی آنکھوں سے مجھے نہ دیکھو۔ میری محبت حسن کی محتاج نہیں۔ میری محبت اُن کی محبت کی اتھاہ محبت کو پکار رہی ہے"

"میری طرف دیکھو زیبا! کیا میری آنکھیں تمہیں محبت کا سبق نہیں پڑھا سکتیں؟ مجھے اپنی ان آنکھوں سے نہ دیکھو۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو۔ شاید اس طرح تم اس میں میری اتھاہ محبت کو پاسکو۔ اپنی آنکھیں بند کر لو اور میرے چہرے کو ٹٹولو"

میں اس نوجوان کو تک رہی تھی کہ اچانک ایک نئے کانپتے ہوئے احساس سے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور نہ معلوم فطرت کے کس اصرار پر جوشِ اضطراب کے کس تقاضے پر میں نے آپ سے آپ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور تاریکی کی قدیم رفاقت میں ایک بار پھر میری ذی حس انگلیوں کے سرے ایک بیقراری سے اُس کے چہرے کے نقش و نگار ٹٹولنے لگے ——

میرے منہ سے اچانک ایک چیخ نکل گئی! اور میں نے ایک اضطرار کے عالم میں اپنی بیتاب آنکھیں کھول دیں۔ اور حیران ہو کر اس حسن کے مجسمے کو دیکھنے لگی "ایں! شیدی! میرے شیدی!؟"

وہ خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا!——

حجاب امتیاز علی

اُلٹ پُلٹ

شادی کے دوران میں سہیلی سہیلیوں نے حمیدہ بانو کے دل پر بٹھادی تھی، کہ سسرال میں عزت چاہے تو خبردار کسی سے بولیو نہیں، زبان فساد کی جڑ ہے، دُنیا جہان کے فتنے اِس نگوڑی زبان کے ہی سبب اُٹھتے ہیں۔

اِس اُنچھر نے حمیدہ پر جادو کر دیا۔ سسرال جاکر وہ چُپ سادھی، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا ہمیوں خاص گھر والے سے بھوٹے مُنہ بات کرنے کی روادار نہ ہوئی۔

کچھ دن تو یہ ادا سب کو پسند آئی، محلّے ٹولے کی بہو بیٹیوں میں چرچا رہا، کہ واہ واہ خالہ بختاور کو جیسی بہو ملی ایسی سب کسی کو نصیب ہو، بڑی شرمیلی ہے، کوئی کچھ کہا کرے، کیا مجال جو اُنٹ کر جواب دے۔

لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے، آخر کب تک، زبان ہی سے تو دوسرے جانوروں پر انسان کو فضیلت حاصل ہے، جب کوئی ہر وقت مُنہ میں گونگی کی گھنگھنیاں بھرے رہے، تو کیوں نہ آس پاس والوں کا دَم گُھٹے۔

حاصل کلام یہ کہ جس خصلت نے لوگوں کو حمیدہ بانو کا گرویدہ کر رکھا تھا، وبالِ جان ہوگئی، اور دُلہن کا قفلِ خاموشی توڑنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ جھڑکی، دھمکی، ٹھٹولی، برہمی، خوشامد، بیزاری، چھیڑ چھاڑ، کونسا دقیقہ تھا کہ اُٹھا نہ رکھا گیا، مگر اُنکی جوڑی کھلنی تھی نہ کھلی۔

ویسے کہنے کو حمیدہ بانو گھر کا کام کاج بھی کرتی تھیں، لیکن کس طرح، کونڈا کنستر سامنے رکھدیا، گھونگھٹ کاڑھے کاڑھے آٹا گوندھنے لگیں، نمک مرچ ہلدی دھنیا کی رکابی دی سل پہ۔ مسالا رگڑ لائیں، کسی چیز کی کمی بیشی سے انہیں بحث نہیں، دَر دَرا رہا یا پتلا ہوگیا، جانے اُنکی بلا۔ وہ تو گُم سُم ہیں، مُنہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔

میاں عاجز، ساس کا ناک میں دَم، خُسر پریشان، آنے جانے والیاں حیران۔ کون کون سے ڈھنگ نہ برتے، کیا کچھ نہ کیا، حمیدہ بانو تھیں کہ آج بولیں نہ کل بولیں۔

آہ! جو بہو ارمانوں سے لائی گئی تھی، کہ گھر کی رونق بڑھائے گی، اُس نے گھنّی سادھ کر سب کا ناطقہ بند کر دیا۔

جو آتا بختاور بیگم بہو کا دُکھڑا لے بیٹھتیں، کوئی کہتا تھا، مارے شرم کے زبان نہیں کھلتی، کسی نے آسیب کا خلل بتایا، مٹیا کھوسٹ عقیدے کی بڑی بوڑھیاں جادو ٹونے کا اثر سمجھیں۔ اکثر رشتہ داروں کا خیال تھا، کسی نے کچھ کھلا پلا کر گلا مار دیا ہے ــــ!

غرض عجیب عجیب قیاس آرائیاں ہوئیں، طرح طرح کے مشورے کیے گئے، مگر ہوا ہوایا خاک نہیں۔

۲

ایک روز بختاور بیگم کے بھتیجے خورشید علی صاحب جو اپنی پھوپی سے ملنے آئے، اور بھابی جان کا حال پوچھا، تو معلوم ہوا، ویسے تو ٹھیک ہیں، مگر بولتی نہیں۔

"اچھا! بولتی نہیں، تو گونگی ہونگی میں جانوں"، خورشید علی صاحب نے کہا۔

بختاور بیگم:- بیٹا! گونگی ہوتی تو صبر آجاتا، سُنتی ہوں اکیلے میں تیرے بھائی سے کچھ کچھ بات چیت کر لیتی ہے۔

خورشید علی:- بس، اور کسی سے نہیں بولتیں؟

بختاور بیگم :- اے بیٹا! آدھی بات نہیں کرتی، تیرا بھائی ہو یا نہ ہو، سارا سارا دن اوپر کوٹھے پر کمرہ بند کئے پڑی رہتی ہے، کبھی اس طرف آئی بھی تو کیا سوا ہاتھ کا گھونگھٹ کاڑھے، بالکل چُپ چاپ.. ... کتنے ہی تعویذ گنڈے بھی کئے .....

خورشید علی :- بھلا تعویذ گنڈے ایسے کاموں میں چلتے ہونگے، پھوپی اماں! -

بختاور بیگم :- مَیں تو تیرے بھائی کی شادی کر کے پچھتائی، دن اور تیرے پھوپا کچہری چلے جاتے ہیں، دُلہن زینے کی کنڈی لگائے کوٹھے پر کمرے میں پڑی رہتی ہے بیٹیا اب کیا کروں، دو سال ہونے کو آئے تجھے ہی کچھ معلوم ہو تو بتا، بڑی پریشانی ہے مجھکو۔

خورشید علی :- پریشانی کی کیا بات، پھوپی اماں! وہ تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

بختاور بیگم :- (خوش ہو کر) تیرے مُنہ میں گھی شکر، بیٹیا! بڑے ثواب کا کام ہے، ہاں تو علاج میں خرچ کیا ہو گا۔

خورشید علی :- خرچ درج کا ہے کا، بغیر پیسے ٹکے دُرست نہ ہو گئیں تو بات ہی کیا رہی۔

بختاور بیگم :- سچ کہیو! اے میں تو مُلّانوں سیانوں میں بڑا پیسہ گلا چکی ہوں، پھر دیکھو تو فائدہ رتی بھر نہ ہوا۔

خورشید علی :- جی رتی بھر، خدا نے چاہا سولہ آنے ٹھیک ہو جائیں، پٹ پٹ باتیں کریں، ایک ہی دن میں دو سال کی کسر نکل جائے۔

بختاور بیگم :- (بلائیں لیکر) صدقے گئی بیٹیا! تو پھر جلدی سے علاج کر، میرا لال!!

خورشید علی :- خیر علاج کرنا تو آپ ہی کو پڑیگا، میں صرف ترکیب بتا سکتا ہوں، نہایت اعلیٰ درجے کی۔

بختاور بیگم :- تو بیٹیا ترکیب ہی بتا دے!

خورشید علی :- مگر آپ کریگی، جیسا کہوں؟ -

بختاور بیگم :- ضرور کرونگی، پر بیٹیا ایسی نہ بتائیو کہ مجھ سے ہو نہ سکے۔

خورشید علی :- ہو کیوں نہ سکے، پھوپی اماں ہو سکے اور بڑی آسانی سے ---!

بختاور بیگم (خوش ہو کر) کیا دُلہن بولنے لگے گی؟ -

خورشید علی :- اجی صاحب بولنا بھی کیسا خوب چیخیں حلق پھاڑ پھاڑ کر ایک دفعہ کو محلہ سر پر اٹھالیں۔

بختاور بیگم :- اچھا.. تو وہ ایسی کیا ترکیب ہے؟ -

خورشید علی :- ترکیب کیا معمولی سی بات ہے، پھوپی اماں! موقعہ دیکھکر کوئی جھوٹا الزام لگا دیں، جب وہ اُسے کاٹیں تو آپ ہرگز نہ مانیں، برابر الزام پر الزام لگائے جائیں۔ بھابی جان کتنی ہی تنتنائیں آپ ایک نہ سُنیں، اپنی ہی کہے جائیں!

یہ نسخہ فی الحال صرف تین روز کے لئے ہے، چوتھے دن حاضر ہونگا، ضرورت ہوئی تو دوسرا طریقہ بدل دیا جائیگا....

۳

خورشید علی صاحب نے بختاور بیگم کو الزامات کی دو تین صورتیں بتائیں، چند فقرے اور خاص خاص الفاظ ذہن نشین کرائے، کچھ طریقہ استعمال بھا کر رخصت ہو گئے۔

ابھی کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی، کوٹھے کے کواڑ بھیڑے جانے کی دھڑ دھڑاہٹ ہوئی، بختاور بیگم سمجھ گئیں کہ ہاں اب دُلہن بی ادھر آنے والی ہیں۔

فوراً جھاڑو سنبھال زینے پر چڑھیں اور چپکے سے کواڑوں کی اوٹ (آڑ) میں جا کھڑی ہوئیں، جوں ہی حمیدہ بانو نے کنڈی کھولی اور زینے میں قدم رکھا، ساس صاحبہ جھاڑو تان کر چیخیں :-

"کیوں ری چڑیل یہ کیا ہو رہا تھا، ہائے وہی تو میں کہوں ہر وقت کوٹھے پر کیوں رہتی ہے، تو قاسمہ آج معلوم ہوا، آئے نے دے ذرا اپنے خصم کو، بوٹیاں ہی نہ نچوائی ہوں تو نام نہیں۔"

لو بھلا حمیدہ بیچاری نے کا ہے کو کسی کی کڑی بات سُنی

تھی، دھک سے رہ گئی، کچھ عجیب حال ہوا، غصہ آیا، دل بیٹھا، تن بدن میں آگ لگی، تیز آنسوؤں کا طوفان اُٹھا اور آنکھوں تک آتے آتے سوخت ہو گیا۔ اِدھر بختاور بیگم صاحبہ نے بھتیجے کا بتایا ہوا علاج پورے شدّ و مد سے جاری رکھا۔

چند سے ساکت رہکر حمیدہ کی زبان سے بے اختیار نکلا:۔

ہیں! ہیں!! ہیں!!!۔

بختاور بیگم:۔ ہیں! ہیں!! کی بچی، پیدا ہوتے ہی نہ مرگئی کٹنی!!!۔

حمیدہ (رو کر) آپ کیا کہہ رہی ہیں یہ؟!۔

بختاور بیگم:۔ کہہ کیا رہی ہوں، جیسے ننھی بھولی کچھ جانتی ہی نہیں، اری دیدہ پھٹی قطامہ تو نے اچھا اپنے خاندان کا نام روشن کیا، ہائے مجھے کیا خبر تھی کہ بنّو میں یہ یہ گُن بھرے ہوئے ہیں . . . .

حمیدہ:۔ میں نے کیا کیا؟۔

بختاور بیگم:۔ (بھبھک کر) کیوں زبان کھلواتی ہے مُردار . . . . تیرا دین دُنیا میں کالا مُنہ ہو . . . کمبخت . . .

حمیدہ:۔ آخر معلوم تو ہو میرا کیا قصور ہے؟۔

بختاور بیگم:۔ (آگ بگولہ ہو کر) اُف ری دیدہ دلیری، بے حیائی کی حد ہو گئی، اری بتاؤں، یہ کوٹھے پر ہنس ہنس کر سقّے سے کیا اشارے کئے جا رہے تھے، قطامہ، تو نے اُلٹی جُوتی سے ہماری ناک کٹوا دی . . ہائے غارت گئی تجھے بن مانگی آئے . . . . .

حمیدہ:۔ اے غضب خُدا کا، کیسا سقّہ، کس نے اشارہ کیا ہے؟۔

بختاور بیگم:۔ کُتیا کہیں کی . . . . . لو ہمیں جلاتی ہے . . . . دھوپ میں چونڈا سفید نہیں کیا ہے، تو نہیں تو کیا تیری نانی ہنس ہنس کر سقّے سے ٹھٹولیں کر رہی تھی مُردار، ہائے کیا زمانہ آیا . . . شریف گھرانوں کے یہ طور طریق رہ گئے ہیں . . . توبہ! توبہ!!

حمیدہ:۔ دیدے گھٹنے پھوٹیں، جو اشارہ کیا ہو، مجھے تو خبر بھی نہیں کیسی گلی ہے۔

بختاور بیگم:۔ (دانت کٹکٹا کر) ہاں! ہاں!! قسمیں کھائیگی، اے اب تو حلف اُٹھائے گی، قطامہ، لگاؤں دو جھاڑو ئیں منہ پر . . .

حمیدہ:۔ آپ بڑی زیادتی کر رہی ہیں۔

بختاور بیگم:۔ زیادتی! ہاں زیادتی کر رہی ہوں، آنے دے ذرا اپنے خصم کو آج تیری چُٹیا کٹوا کر کالا مُنہ ہی نہ کرایا ہو . . . . .

ہائے اور کبھی کوئی نہ ملا محلے کا سقّہ ہی نگوڑا رہ گیا تھا تیرے لئے۔

اتنے میں کسی ہمسائی کی بچی دروازے میں جھانک کر بھاگ گئی، جاتے ہی اپنی ماں کو خبر کی:۔

"امّاں! امّاں!! لو وہ خالہ بختاور کی دُلہن خُوب زور زور سے لڑ رہی ہیں" بس جناب وہ تھیں کہ کام کاج چھوڑ سٹر سٹر جوتیاں گھسیٹتی دوڑیں، اُنہیں دیکھ کر گلی میں گڑ بڑ مچ گئی آناً فاناً تو جل میں جل ہر میل کی پڑوسنیں آ موجود ہوئیں، کہ چلو دُلہن کی لڑائی دیکھیں، افوہ بڑی مُدّت میں بولیں۔

یہاں بی بختاور بیگم صاحبہ کی تو غرض ہی کچھ اور تھی، احسان کرنے کے انداز میں بہو پر سر سے پیر تک نظر ڈال کر کہا:۔

"خیر کمبخت اسوقت تو کالا مُنہ کر، پھر سمجھونگی تجھے!"

گویا آئی ٹلی، حمیدہ بانو نے قضا کے چنگل سے رہائی پائی، کھٹ سے کُنڈی لگا دوڑیں کمرے میں، دَھم سے چارپائی پر جا پڑیں، اور رو رو کر دل کی بھڑاس نکالنے لگیں۔

ادھر بختاور بیگم تھیں کہ پڑوسنوں کو لیکر اپنے دالان میں پہونچیں۔ اور آئیں بائیں شائیں میں معاملہ غتر بود کر دیا۔

اس واقعہ سے حمیدہ بانو کچھ ایسی دہلیں، ہر وقت ایک ہول آنے لگا، مبادا اگر تو کہیں خُدا کے غضب سے ڈر، خوشدامن صاحبہ بیٹھے بٹھائے کہیں کوئی طوفان نہ اُٹھا دیں، مجبوراً قفلِ خموشی توڑنا پڑا، بختاور بیگم کچھ پوچھتیں تو جی کڑا کر کے جواب دے دیتی تھیں ــــــ

چوتھے دن ملک الموت کے گماشتے جناب خورشید علی صاحب

ادا ر دھوئے، رسمی سلام دعا سے نبٹ کر پہلی بات جو انہوں نے کی یہ تھی :-

"پھوپی اماں! بھائی جان کا کیا حال ہے ؟"

بختاور بیگم نے خوش ہو کر جواب دیا :-

صدقے جاؤں بیٹا! اچھی ترکیب بتائی، تیرے جاتے ہی کوٹھے کے کواڑ دھڑ دھڑائے، میں تھی کہ جھاڑو اٹھا چپکے سے زینے میں جا کھڑی ہوئی، جوں ہی دلہن نے کھولنے کو اڑ تڑ تڑ کر کہا :-

"کیوں ری یہ تو کیا کر رہی تھی ابھی ابھی، اف وہ! اسی لئے سارا سارا دن کوٹھے سے نہیں اترتی کہ سنتے سے آنکھیں لڑائے"

یہ سنکر بڑی چکرائی۔ لگی برابر سے جواب دینے، میں نے اس کا خوب فضیحتہ کیا، وہ تو یوں کہو پڑوسنیں آگئیں، اس وجہ سے میں نے اسے تو کوٹھے پر لوٹا دیا، اور ادھر ادھر کی باتیں بنا کر آنے والیوں کو ٹالا۔

پڑوسنوں سے گھر خالی ہونے پر کڑک کر دلہن کو آواز دی، روتی دھوتی آئی، تھر تھر کانپتی ہوئی، میرا جی تو بہت کڑھا مگر ویسی ہی ناراض صورت بنائے رہی، بلکہ اور زور سے گھُرکی :-

"قطامہ! رو کر ڈراتی ہے، ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا، اب دیکھ کیسا علاج کرتے ہیں، کہ دنیا تیرے جنم میں تھوکے!!"

بے اوسان ہو گئی، پھوٹ پھوٹ کر روئی، گھگھیا گھگھیا کر لگی قصور معاف کرانے، میرے قدموں پر لوٹ گئی، بمشکل میں نے کہا :-

"خیر ابکے تو چھوڑے دیتی ہوں، آئندہ کچھ دیکھنے سننے پر تو یاد رکھ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا"

خورشید علی :- اچھا اب وہ بولنے بھی لگیں یا نہیں ؟

بختاور بیگم :- سخت مجبوری میں، یوں ہی کچھ ہاں ہوں کر دیتی ہے ورنہ پہلے تو اتنا بھی نہیں تھا۔

خورشید علی :- رفتہ رفتہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

بختاور بیگم :- میرا جی چاہتا تھا ابھی اسکو یہاں بلاتی، لیکن کیا کروں، اس وقت تک پہلی عادت کا اثر باقی ہے، شاید نہ بولے۔

خورشید علی :- تو خیر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔

بختاور بیگم :- مگر نہیں یہ بھی کوئی بات ہوئی ..... تیرے لئے پان تو لائے ..... دلہن! اے دلہن!! یہ خورشید آیا ہے، ذرا پان تو لاؤ اس کے لئے!!!

جواب دواب تو کوئی آیا نہیں، البتہ پاندان کھڑکا، دو تین منٹ میں حمیدہ بانو گھونگھٹ کاڑھے آئیں، خاصدان سمیت تین چار سلام کئے، اور سہمی ہوئی سی رہ گئی "اوں ہوں میں نہیں کھاتی" بختاور بیگم نے کہا "ہاں بیٹا خورشید!"

خورشید علی صاحب ایک پان اٹھا کر آداب بجالائے۔

دلہن صاحبہ تھیں کہ جیسے جان بچی لاکھوں پائے۔ دبے پاؤں انگنائی پار، باورچی خانہ میں۔

بختاور بیگم (خورشید علی سے) دیکھا بیٹا! یہ حال ہے!۔

خورشید علی :- کچھ مضائقہ نہیں۔

بختاور بیگم :- اب کیا کروں بیٹا! میرا تو دم گھٹا کرتا ہے ان باتوں سے۔

خورشید علی :- یہی کہ ایک شگوفہ اور سہی کسی وقت، ایکے پورا پورا علاج ہو جائے گا۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے خورشید علی صاحب نے اجازت چاہی۔ بختاور بیگم بولیں، اچھا خیر ایک پان تو اور کھاتا جا، اے دلہن! باورچی خانے میں کیا کر رہی ہو، خورشید جاتا ہے، پان لاؤ!!۔

حمیدہ بانو نے دوبارہ خاصدان پیش کیا، ایک گلوری اٹھا کر خورشید علی بولے :-

بھابی جان کیسا مزاج ہے ؟-

انکے تو گویا پیروں تلے کی زمین نکل گئی، جیسے کسی نے

شکنجے میں کس دیا، اِدھر ہوا جائے نہ اُدھر، کھڑی کھڑی کسمسا رہی تھیں، بختاور بیگم نے کہا۔

"آہ! بیٹا خورشید!! کیسا کیسا سمجھاتی ہوں، یہ ہے کہ خاطر ہی میں نہیں لاتی ...... اپنے ٹھسّے میں مری جاتی ہے ...... اری لڑکا کیا کہہ رہا ہے ...... کچھ سنا ...... بولتی نہیں ...... ہائیں!......"

گھونگھٹ سے مری سی آواز آئی "شکریہ"۔

اور دُلہن صاحبہ نے رسّان سے باورچی خانہ کا رُخ کیا، خورشید علی صاحب اپنی پھوپی اماں سے رخصت ہوئے، دروازے تک پہونچے تھے، بختاور بیگم نے کہا۔

بیٹا خورشید! یہ دُلہن سلام کر رہی ہیں!!

دیکھتے ہیں جو پلٹ کر تو باورچی خانہ کی دہلیز پر بھابی جان بغلی سائن بورڈ بنی کھڑی تھیں۔

۵

گو اب حمیدہ بانو کے مزاج میں بہت کچھ تبدیلی آچکی تھی، جو حمیدہ بانو شفیق ساس کی انتہائی للّو پتّو کے باوجود دو سال ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ شیطان طوفان کے خوف سے ہر وقت خیر مانگا کرتی تھیں، بلکہ ساس کو رضامند کرنے کا بھی کچھ خیال پیدا ہو گیا تھا، لیکن یکایک کیونکر پہلی روش بدل دی جاتی۔ یہ اپنے شش و پنج میں مبتلا رہیں، اُدھر بختاور بیگم صاحبہ موقع تاک رہی تھیں، اس ادھیڑ بن میں کوئی ہفتہ عشرہ نکل گیا۔

ایک روز جبکہ گھر میں کوئی نہ تھا، اتفاقاً بختاور بیگم کو تقضائے حاجت کا تقاضہ ہوا۔ جونہی آپ بیت الخلا کے قریب پہونچیں، اندر سے بہو کھنکاریں، اجی جناب پھر کیا تھا، زمین پر لوٹ مار کر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پھیل پڑیں۔

ہائے۔ ہے لوگو غضب خدا کا، لو دو پہاڑے میں میٹھی روٹی کھا رہی ہے ...... (سر پیٹ کر) ہائے ہائے دانیال کی بھی مٹی پلید کی، اری ولدالزّنا خور کیا تیرے خاندان میں یہی ہوتا ہے ———؟

ارے توبہ! کہاں کا گھونگھٹ اور کیسی وضعداری اوسان جاتے رہے، چھم سے قدمچہ کو دلپسینہ میں نہائی ہوئی، حلق خشک، زبان بے قابو، صورت تانبہ کا تانبہ، کبوتر کی طرح تھرتھرا کر کے بھرّائی ہوئی آواز سے بولیں:۔

ارے! ارے!! ارے!!!

بختاور بیگم:۔ (غضبناک ہو کر) چُپ مُردار ...... بس اس گھر میں تیرا گذارا نہیں ...... بکٹی بے حیا تو نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

حمیدہ بانو:۔ آپ ...... مجھ سے ...... کیوں ...... ناراض ہیں؟......

بختاور بیگم:۔ شاباش بھئی شاباش! اب یہ بات بنائی، ہائے اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں، اچھے سے اچھا پہناتے ہیں، خوشامد کرتے منہ سوکھا جاتا ہے، تیرے بھاویں نہیں، ہم نے اپنے ہاتھوں اپنی قسمت پھوڑ لی، کلیجہ نکال کر رکھ دیا، ...... آخر آگئی نہ اپنی اوقات پر۔

حمیدہ بانو:۔ (منت سے) میری کھال کی جوتیاں بنائیے، اُف نہ کروں گی، مگر واسطہ خدا کا ایسا بہتان نہ باندھئے، رحم کیجئے میرے حال پر!

بختاور بیگم بھلا کا ہے کو توجہ دینے لگی تھیں، انہوں نے تو لعن طعن کا تار باندھ دیا، حمیدہ بانو کی حالت غیر ہوتی گئی، آخر اُسے وہیں چھوڑ بکتی جھکتی اپنی چارپائی پر آ بیٹھیں، حمیدہ بھی سایہ کی طرح لگی چلی آئی۔ کھڑی کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ آپ نے گھرکا۔

دُور ہو میرے سامنے سے غارت گئی!

بیچاری میں سکت نہ رہی گھٹنوں کے بل زمین پر گری اور ساس کے قدم پکڑ کر گرم گرم آنسوؤں کا مینہ برسانے لگی

ہی روئی ایسی روئی، نجتا و بیگم کا جی بھر آیا، چند سے ساکت رکر ارشاد ہوا۔

"بول! اب کیا چاہتی ہے؟"

حمیدہ:۔ (ہاتھ جوڑکر) میرا قصور معاف کیا جائے۔

نجتا و بیگم:۔ (پُروقار لہجہ میں) اچھا خیر...... اس دفعہ اور صبر کرتی ہوں، جا منہ ہاتھ دھو!۔

اس پر حمیدہ کو ایک بار اور زور و شور سے رونا آیا، پھر خفگی کے خوف سے لرزتی ہوئی اٹھی اور لڑکھڑاتی لڑکھڑاتی، کھڑونچی کے پاس پہونچی، صحنچی میں منہ ہاتھ دھوکر دوسرے دالان کی چارپائی پر جا بیٹھی۔

سوچنے لگی کہ دیکھو یہی ساس ہیں جو مجھے دیکھ دیکھکر پھولی نہ سماتی تھیں، میرے کیسے کیسے چوچلے کرتی رہیں آنکھوں میں ڈال کر رکھا، سوتے سانسیں گنیں، ہائے اب انہیں کیا ہوگیا جو ایسی باتیں کرنے لگیں، یوں ہی بیزار رہیں، تو نہ جانے میرا کیا حشر ہو۔

سوچتے سوچتے بیچاری کے ہاتھ پاؤں سُن ہوگئے، یکایک خیال آیا کہ اُفوہ! ہو نہ ہو یہ سب کچھ حد سے زیادہ خاموشی کا نتیجہ ہے، میری چُپ سے تنگ آکر انہیں ایسی نفرت ہوگئی کہ صورت کی روادار نہ رہیں۔ افسوس! میں نے بڑی غلطی کی۔ ایسی شفیق ساس کا دل دُکھایا ایسی سزا ملنی ہی چاہیئے تھی۔

اتنی پیش کے بعد اصل معاملہ سمجھ میں آیا، پھر نہ یہ گُم سُم رہیں، اور نہ ساس صاحبہ برہم، گھر پہ خوشحالی برسنے لگی۔

جیسے خُدا نے اُن کے دن پھیرے، ایسے سب کسی کے پھیرے۔ آمین۔

میرزا فہیم بیگ چغتائی

محبّت کی پہلی تجلّی

نہ تھا جب کوہکن کے دل میں ارماں چوٹ کھانیکا — نہ پہونچا تھا اُسے جب حکم جوئے شیر لانے کا
نہ تھے دستِ ہوس آگاہ جبِ زُلفوں کی ترئین سے — ہوا تھا جب نہ شیریں کام خُسرو حُسن شیریں سے
الگ معمورۂ حسرت سے قیسِ عامری جب تھا — خموشی آشنا دُنیا میں جب فریاد کا ڈھب تھا
نواحِ عاشقی میں جب اثر اس کا نہ پھیلا تھا — سوادِ دلبری جب پردہ دارِ حُسنِ لیلا تھا
خیال آرا نہ تھا خوابِ زلیخا جب زمانے میں — بھرا جاتا نہ تھا رنگِ فسوں جب ہر فسانے میں
نہ تھا آگاہ جب ذوقِ نظر بازی تکلف سے — نہ تھا یہ خاکداں پُر نور جب تنویرِ یوسف سے
نہ تھا اپنے اثر کا شوخ چشموں کو جب اندازہ — نظر جب نیم باز آتا نہ تھا فتنوں کا دروازہ
نیاز و ناز میں جب فرق کرنا سخت مشکل تھا — محبّت آشنا اُس وقت بھی انسان کا دل تھا
فدا ہابیل نے کی جان اقلیما کی اُلفت میں — یہی پہلا شہید عشق ہے آدم کی عترت میں
انہیں دونوں نے دُنیا میں محبّت کی بنا ڈالی — بہارِ جاوداں تھی مختصر سی ان کی خوش حالی
محبّت کے طرب آموز نغمے مل کے گاتے تھے — جہاں بھی جب کبھی جاتے ہمیشہ ساتھ جاتے تھے
یہ دونوں ایک شب جا بیٹھے دریا کے کنارے پر — تبسّم چاند کا وہ اِنکے ہر دلکش اشارے پر
قضارا اُس طرف قابیل سا سفّاک آتا ہے — اِنہیں اس طرح خوش خوش دیکھتا ہے تاؤ کھاتا ہے
بھڑک اُٹھتی ہے آتش اُسکے سینے میں رقابت کی — نظر آتی نہیں صورت اُنہیں اپنی حفاظت کی

یہیں مَیں ختم کرتا ہوں یہ درد انگیز افسانہ
نتیجہ اس کا مجھ سے کیوں وہ پوچھے ہے جو فرزانہ

علی منظور حیدرآبادی

سچّی کہانی

قارئین ساقی! سینما کے پردہ پر تو آپ بہت سے فلم دیکھ چکے ہیں۔ آج ساقی کے صفحات پر ایک فلم دیکھئے۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر آپ نے توجہ اور اطمینان کے ساتھ اسے ملاحظہ فرمایا اور آپ کے تخیل نے بھی آپکی تھوڑی سی مدد کی تو دورانِ مطالعہ میں یقیناً آپ ایسا محسوس کرنے لگیں گے جیسے کسی سینما ہال میں بیٹھے ایک نہایت دلچسپ فلم دیکھ رہے ہیں۔

شاید اِس حقیقت کا میں پہلے بھی اعتراف کر چکا ہوں کہ کسی افسانہ کا پلاٹ اپنے دماغ سے پیدا کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں صرف واقعات کو افسانہ کی شکل میں پیش کر سکتا ہوں۔ اسی لئے "سچی کہانی" کو میں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ لیکن میری دوسری کہانیوں میں اور اس کہانی میں ایک خاص فرق ہے، وہ یہ کہ جس قدر واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں وہ بعض جزئیات و تفصیلات کو چھوڑ کر تقریباً سب کے سب بجائے خود تو سچے ہیں لیکن آپس میں اُن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے اُنہیں اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ ایک مسلسل داستان بن گئی۔

پریم پجاری

(ایک غریب محلہ۔ چھوٹا سا گھر جسکی ہر چیز سے افلاس برس رہا ہے۔ امر سنگھ پریشان حال گھر میں داخل ہوتا ہے۔)

امر سنگھ کا بوڑھا باپ:- بیٹا، کچھ کام ملا؟

امر سنگھ:- نہیں پتا جی۔ جہاں جاتا ہوں یہی جواب ملتا ہے کہ جگہ خالی نہیں۔

باپ:- دین بابو نے یہ اخبار ابھی بھیجا ہے (اخبار امر سنگھ کی طرف بڑھاتا ہے) اور کہا ہے کہ اس میں ایک نوکری کا اشتہار چھپا ہے۔ تم بھی عرضی دیدو۔

امر سنگھ:- (پہلے اشتہار پڑھتا ہے پھر کہتا ہے) عرضی دیکے کیا ہوگا۔ ایک جگہ کے لئے سَو سَو اُمیدوار ہوتے ہیں۔ پھر جس کی سفارش ہوتی ہے اُسے جگہ مل جاتی ہے۔ لیاقت کا تو کچھ ایسا سوال نہیں۔ ہمارے پاس سفارش کہاں ہے؟

باپ:- یہ نوکری ہے کس محکمہ میں؟

امر سنگھ:- اشتہار پڑھکر سناتا ہے:

"ٹریفک منیجر کے دفتر میں ایک اسسٹنٹ کلرک کی ضرورت ہے۔ تنخواہ پینتیس روپے ماہوار، دو روپیہ سالانہ ترقی۔ بی۔ اے ہونا ضروری ہے۔ عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔ درخواست خود لیکر حاضر ہو۔"

دستخط ٹریفک منیجر۔ ای۔ سی (ریلوے)

باپ:- تو پھر بیٹا تم بھی تو بی۔ اے ہو۔ عمر بھی تمہاری پچیس سال سے کم ہے۔ عرضی دینے میں کیا ہرج ہے۔ شاید بھگوان یہ جگہ تمہیں کو دلوا دے۔

امر سنگھ با دلِ ناخواستہ درخواست لکھکر ریلوے

کے دفتر کو روانہ ہو جاتا ہے۔ وہاں پہونچکر دیکھتا ہے کہ کئی سو آدمی دفتر کے سامنے موجود ہیں۔ سب اُمیدوار ہیں۔ خاصہ ہنگامہ برپا ہے۔ لوگ طرح طرح کے لباس پہنے ہیں۔ رومی ٹوپی۔ پگڑی۔ فیلٹ کیپ۔ دھوتی۔ پاجامہ۔ پتلون سبھی نمونے موجود ہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک چپراسی دفتر سے نکلتا ہے اور کہتا ہے:۔

چپراسی:۔ صاحب ابھی آتے ہیں۔ تم لوگ ایک لین میں کھڑے ہو جاؤ۔

سب ایک قطار بناتے ہیں جو تقریباً ایک فرلانگ تک چلی گئی ہے۔ ٹریفک منیجر اپنے بابو کے ساتھ دفتر سے نکلتا ہے اور اس کثیر جماعت کو دیکھکر حیران رہ جاتا ہے۔

ٹریفک منیجر:۔ مائی گاڈ۔ یہ سب لوگ کینڈی ڈیٹ ہے؟

بابو:۔ ہاں حضور۔ یہ سب کینڈی ڈیٹ ہیں۔

ٹریفک منیجر:۔ ویل۔ ہم ان سبکو نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا وکت نہیں ہے۔ ہم کھالی ایک آدمی مانگتا ہے۔ اچھا صرف ایک ڈزن آدمی روک لو۔ باکی ڈسمس کردو۔

بابو پہلے بارہ آدمیوں کو علیحدہ کرکے باقی سے کہتا ہے کہ آپ لوگ جائیے۔

چند آوازیں:۔ تو پھر بلایا کیوں تھا؟ ہماری عرضی تو دیکھی ہوتی۔

چند اور آوازیں:۔ اور ان بارہ آدمیوں کو تم نے کیسے چھانٹ لیا۔

کچھ اور آوازیں:۔ ہم تو ان سے بہت پہلے کے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے انتظار کر رہے ہیں۔

لائن ٹوٹ کر ہجوم ہو جاتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ کہتا ہے۔

بابو:۔ چلے جاؤ یہاں سے شور نہ مچاؤ جب ہم چاہیں گے رکھیں گے۔

ٹریفک منیجر:۔ *Send them away Babu*

بابو:۔ دفع ہو یہاں سے۔ نہیں تو قلیوں سے پٹوا کے نکلوا دونگا۔

ایک شخص:۔ بدمعاش! تو ہمیں قلیوں سے پٹوا کے نکلوا دیگا۔

یہ کہتے ہوئے بابو کا گریبان پکڑ کر کھینچتا ہے۔ دھینگا مُشتی ہونے لگتی ہے، بابو گر پڑتا ہے۔ دفتر کے قلی اور دوسرے بابو وغیرہ نکل آتے ہیں اور اس شخص کو مارنے لگتے ہیں۔ سب کھڑے دیکھ رہے ہیں۔

وہ شخص:۔ (چلا کر) بھائیو! تمہیں غیرت نہیں آتی۔ ایک بے قصور کو یہ ظالم مارپیٹ کر رہے ہیں اور تم کھڑے دیکھ رہے ہو۔ مجمع بگڑ جاتا ہے اور ریلوے والوں پر حملہ کر دیتا ہے۔

ٹریفک منیجر:۔ *Get away you damned fool. Get away you bloody swines.*

ایک شخص صاحب بہادر کے تمانچہ رسید کرتا ہے۔ ہیٹ دُور جا گرتا ہے، صاحب بھاگتے ہیں۔ بھاگتے میں گر پڑتے ہیں۔ بہر حال دفتر میں گھس جاتے ہیں۔ دفتر کے باقی لوگ بھی کسی طرح دفتر میں داخل ہو کر دروازے بند کر لیتے ہیں۔ مجمع گالیاں دے رہا ہے۔

ایک شخص:۔ توڑ دو دروازہ، مار ڈالو حرامزادوں کو۔ مجمع دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹریفک منیجر پولیس کو ٹیلیفون کرتا ہے۔ اتنے میں دروازہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لوگ اندر گھس جاتے ہیں۔ صاحب بہادر ایک میز کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ بعض بابوؤں اور قلیوں کی تھوڑی سی پٹائی ہوتی ہے اتنے میں شور ہوتا ہے کہ "پولیس آگئی، پولیس آگئی" لوگ دفتر سے نکل کر بھاگتے ہیں۔ پولیس ڈنڈوں سے مارنا شروع کرتی ہے۔ مجمع پھر بگڑ جاتا ہے۔ بھاگنے والے پلٹ پڑتے ہیں۔ پولیس سے مارپیٹ ہوتی ہے۔ ایک پولیس والا گر پڑتا ہے

لوگ اُس کی پگڑی چھین کر دھجیاں کر دیتے ہیں۔ آخر پولیس فائر بریگیڈ کو ٹیلیفون کرتی ہے جو فوراً پہونچتا ہے۔ مجمع پر پانی سے حملہ کیا جاتا ہے لوگ بھاگتے ہیں اور گرتے ہیں۔ کسی کی ٹوپی، کسی کا جوتا، کسی کی پگڑی رہ جاتی ہے۔ سینکڑوں عرضیوں کے کاغذ اُڑتے پھرتے ہیں۔ لوگ کیچڑ میں پھسل پھسل کر گرتے ہیں۔ پھر اُٹھتے ہیں اور بھاگتے ہیں۔ غرض مجمع منتشر ہو جاتا ہے۔ مجمع کا ایک حصہ ایک خاص سمت میں بھاگتا ہے اور ایک پارک میں پہونچکر پھر جماؤ ہوتا ہے۔ اتنے میں مسٹر مکرجی آ پہونچتا ہے۔ ان لوگوں کو اس حال میں دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور پوچھتا ہے۔

مکرجی - یہ کیا قصّہ ہے؟

ایک شخص :- قصّہ کیا ہے بابوجی۔ ٹی۔ ایم۔ کے دفتر میں ایک کلرک کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ کئی سو گریجویٹ عرضیاں لے کر پہونچ گئے۔ ٹی۔ ایم نے اور اُس کے بابو نے لوگوں سے بدزبانی کی۔ بس اس پر جھگڑا ہو گیا اور مار پیٹ ہوئی۔ آخر پولیس آ گئی اور لوگوں کو بہت مارا پیٹا اور آگ بجھانے کے انجن سے پانی برسا کر مجمع کو منتشر کر دیا۔

مکرجی :- ہائے بدنصیب ہندوستان! اچھا آپ سب لوگ بی۔ اے پاس ہیں؟

چند آوازیں :- جی ہاں۔

ایک آواز :- میں ایم۔ اے ہوں۔

ایک اور آواز :- میں ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ہوں۔

مکرجی :- بھائیو! ایسی اعلیٰ تعلیم کے بعد بھی آپ کو بیس۲۰ پینتیس۳۵ روپے کی نوکری نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے مگر سچ پوچھئے تو قصور سارا خود آپ کا ہے۔ کیوں آپ لوگ کوئی اور کام نہیں سیکھتے۔ کیوں پیشہ ور نہیں بنتے۔ کیونکہ صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کیوں ہر شخص اس منحوس تعلیم میں پڑ کر اپنی ساری زندگی برباد کرتا ہے۔ کیوں تعلیم کو تعلیم کے لئے حاصل نہیں کیا جاتا۔ کیوں فقط تعلیم ہی کو روزی کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ سب کو تو نہیں لیکن چند بھائیوں کو میں کام سے لگا سکتا ہوں۔ آپ لوگوں میں سے جو صاحب شادی شدہ ہیں وہ اس طرف آ جائیں اور جو کنوارے ہیں وہ اس طرف۔

(دو گروہ ہو جاتے ہیں)

مکرجی :- (کنواروں سے مخاطب ہو کر) آپ صاحبان میں سے جو لوگ بالکل آزاد ہیں یعنی جن کے ذمہ والدین یا دوسرے عزیزوں کی پرورش نہیں وہ ایک طرف نکل آئیں۔

(تھوڑے سے آدمی نکل آتے ہیں)

مکرجی - (اس قلیل جماعت سے) آپ میں سے جو شخص محض اپنا گذارہ لیکر ملک کی خدمت کرنا چاہے وہ میرے ساتھ چلا آئے۔

(دس آدمی مکرجی کے ساتھ ہو لیتے ہیں)

امر سنگھ :- (آگے بڑھکر) بابوجی۔ میں بالکل آزاد تو نہیں ہوں۔ بوڑھے ماں باپ کی خبرگیری میرے ذمہ ہے مگر میں دیش سیوا کے لئے تیار ہوں۔

مکرجی :- مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر آپکی مدد کرنا اس وقت میرے اختیار میں نہیں۔

(امر سنگھ مایوس ہو کر پلٹ جاتا ہے)

مکرجی :- (اپنے ساتھیوں سے) آیئے۔

سب ساتھ ہو لیتے ہیں۔ پارک سے چلکر سڑک پر آتے ہیں اور ٹرام میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ٹرام سے اُترتے ہیں اور مکرجی کے مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

مکرجی :- بھائیو! میں کوئی دولتمند آدمی نہیں ہوں۔ دیش کا

ایک سیوک اور وطن کی خدمت کرنے والی ایک سوسائٹی کا کارکن ہوں۔ آپکو معلوم ہو کہ آپکو کیا کام کرنا ہوگا؟

کئی آوازیں:۔ آپ فرمایئے۔!

مکرجی:۔ کام بتلانے سے پہلے کئی اور باتیں آپکو بتانا ضروری ہیں۔ میں ایک سوال آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کی مصیبت کا اصلی سبب کیا ہو؟

ایک آواز:۔ یہ بھی آپ ہی بتا دیجئے۔

مکرجی:۔ ہماری تمام مصیبتوں کے ذمہ دار ہمارے دیش کے دولتمند لوگ ہیں جو غریبوں کا خون چوس چوس کر اپنی تھیلیاں بھرتے اور عیش کرتے ہیں۔

ایک آواز:۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں میں جانتا ہوں کہ غریب کسانوں پر کیا گذرتی ہو۔ بدنصیب صبح سے شام تک ہل چلاتا ہو۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی کو جاتا ہے مگر اس محنت کا بدلہ اُسے اتنا بھی نہیں ملتا کہ پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور تن ڈھانکنے کو موٹا جھوٹا کپڑا میسر آجائے۔

مکرجی:۔ اور مزدوروں کی حالت اُن سے بھی بدتر ہے وہ سارے دن اور کبھی کبھی ساری رات محنت کرتے ہیں مگر اُنہیں جو مزدوری ملتی ہے وہ کسی طرح بھی ایک انسان کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ دو پیسے کے چنے چاب کے دن گذار دیا۔ میلی کچیلی پھٹی ہوئی ایک لنگوٹی باندھ لی اور رات کو فٹ پاتھ پر پڑ رہے۔ یہ اُن کی زندگی ہے۔ اس سب کے ذمہ دار مالدار ہیں۔

دو ایک آوازیں:۔ تو بتایئے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

مکرجی:۔ ابھی بتاتا ہوں۔ ہماری سوسائٹی کا مقصد دولتمندوں کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ آپ لوگوں کا یہ فرض ہو کہ گاؤں گاؤں جائیں اور کسانوں میں اُنکے حقوق کا احساس پیدا کریں اور اسی طرح مزدوروں کو سمجھائیں کہ کس طرح مالدار لوگ تمہاری محنت سے کمائی ہوئی دولت اپنی جھولیوں میں بھر لیتے ہیں اور بیدردی سے خرچ کرتے ہیں۔

ایک آواز:۔ اس کے سوا کچھ اور؟

مکرجی:۔ ہر وہ کام اور وہ قربانی جس سے ہماری تحریک کو قوت پہونچے۔ آہستہ آہستہ پورا پروگرام آپ کو بتلا دیا جائیگا جس پر عمل کرنے سے ہماری غلامی کی زنجیریں کٹ کٹ کر گر جائیں گی۔ اور مفلسی اور بے روزگاری کا نشان مٹ جائیگا۔ سوسائٹی یعنی دیش سیوک منڈل کی طرف سے میں آپکا بیس روپیہ ماہوار الاؤنس مقرر کرتا ہوں۔ جن صاحبوں کو ہمارے مقصد سے اتفاق نہ ہو وہ آزاد ہیں۔ جاسکتے ہیں، کوئی مجبوری نہیں۔ اور جن صاحبوں کو اتفاق ہے اُنہیں حلفیہ اقرار کرنا ہوگا کہ وہ آخری دم تک آزادی کی اس جنگ میں شریک رہیں گے۔

سب:۔ ہم تیار ہیں۔ لایئے حلف دیجئے۔

مکرجی:۔ خدا آپکو کامیابی دے۔ آپکا ہی قول آپکا حلف ہے۔ (اس کے بعد مکرجی سبکو بیس بیس روپے تقسیم کرتا ہے اور کہتا ہے:۔)

مکرجی:۔ پروگرام کی تفصیل اور بعض ضروری باتیں دوسرے وقت بتائی جائیں گی۔ اس لئے آپ لوگ رات کو نو بجے تشریف لائیں۔

(سب جاتے ہیں)

پبلک گارڈن

ایک بچی اسکیٹنگ رُوپ پر اُچھل رہی ہو۔ کچھ بچے بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ بعض کھلائیاں بچوں کو گاڑی

میں بٹھائے لئے جا رہی ہیں۔ کہیں لوگ بنچوں پر بیٹھے ہیں، کہیں سبزہ پر۔ ایک چینی کاغذ کے پھول اور کھلونے بیچ رہا ہے۔ بینڈ اسٹینڈ کے گرد بہت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ بینڈ بج رہا ہے۔ ایک جوان آتا ہے اور ایک نوجوان عورت کی پیٹھ چھوتا ہے۔

عورت :۔ (پلٹ کر) ہلّو موہن!

موہن :۔ ہلّو شانتی!

شانتی وہاں سے نکل آتی ہے اور دونوں ساتھ ساتھ ایک طرف کو جاتے ہیں۔

شانتی :۔ حیدر آباد سے کب واپس آئے؟

موہن :۔ آج صبح ہی تو آیا ہوں۔ اس وقت تمہاری طرف گیا تھا معلوم ہوا "کہیں باہر گئی ہیں"۔ میں نے کہا ممکن ہے تم ادھر آئی ہو۔ بس میں بھی چلا آیا۔

شانتی :۔ اب تو تم بھی چھوٹے موٹے پروفٹ (Prophet) ہوتے جاتے ہو۔

موہن (ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک خالی بنچ کی طرف اشارہ کر کے) چلو وہاں چل بیٹھیں۔

شانتی :۔ چلو۔

جا کر دونوں بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اتنے میں ایک نہایت خوبرو جوان فوجی وردی پہنے ذرا فاصلے پر جا رہا ہے۔ موہن اُسے دیکھ کر اپنا ہاتھ بلند کر کے ہلاتا ہے اور کہتا ہے "ہلّو پریم"۔

پریم "ہلّو موہن" کہکر مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔

شانتی :۔ بڑا سجیلا جوان ہے۔ یہ کون ہے موہن؟

موہن :۔ میرا اسکول فیلو اور بہت پیارا دوست ہے۔ اسکا نام پریم سنگھ ہے۔ بڑا خاندانی آدمی ہے۔ بزرگ کبھی بہت دولتمند تھے۔ اب بھی اچھی خاصی حیثیت ہے۔ فوج میں کپتان ہے۔ کچھ ایسا لمبا چوڑا خرچ نہیں۔ بس ایک بوڑھی ماں ہے اور ایک چھوٹا بھائی اندر سنگھ، وہ بھی فوج میں سیکنڈ لفٹیننٹ ہے۔

شانتی :۔ اچھا! تو ابھی شادی نہیں کی؟

موہن :۔ نہیں۔

شانتی :۔ آج کل نوجوانوں میں کنوارے رہنے کی بیماری بہت زور شور سے پھیل رہی ہے۔

موہن :۔ نہیں، یہ بات نہیں شانتی۔ یہ بیچارہ تو ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ روپ کماری کو تو تم جانتی ہو نا؟

شانتی :۔ کون روپ کماری؟

موہن :۔ ارے وہی ڈاکٹر ٹنڈن کی بیوی۔ اس روز اسکول کے جلسہ میں تم سے ملاقات نہیں کرائی تھی؟

شانتی :۔ (کچھ سوچکر) ہاں ہاں یاد آ گیا۔ بڑی مغرور عورت ہے، معلوم ہوتا ہے اُسے اپنی صورت پر بڑا ناز ہے۔

موہن :۔ ہاں وہی۔ پہلے اُس نے پریم سے محبت کے پینگ بڑھائے اور شادی کی خواہشمند ہوئی۔ پریم اسے بہت چاہنے لگا تھا اور بظاہر وہ بھی اُس پر جان دیتی تھی مگر یہ سب مکاری تھی۔

شانتی :۔ یہ کیسے؟

موہن :۔ یہ ایسے کہ پریم کے ایک کشمیری دوست، کپور سے چھپ چھپ کے ملنے لگی۔ ایک روز پریم نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ وہ بہت غیرت دار آدمی ہے۔ بس فوراً تعلقات قطع ہو گئے۔

شانتی :۔ تو پھر ڈاکٹر ٹنڈن سے کیسے شادی ہوئی!

موہن :۔ بات یہ ہوئی کہ کپور تو یکایک ولایت چلا گیا۔ ٹنڈن نے اُسے کہیں ہسپتال کے چیریٹی شو، میں دیکھ لیا اور اسکا گانا بھی سُنا بس لٹو ہو گیا۔ وہ اس کی دولت پر کچھ

گئی۔ بس شادی ہوگئی۔

شانتی:۔ شادی کے بعد ڈاکٹر سے کیسی گذری؟

موہن:۔ ڈاکٹر کو خوب اُلو بنایا۔ اس کے ایک جوان شاگرد ڈاکٹر رستوگی سے کھُل کھیلی۔ اُسی زمانہ میں پریم کو بھی ایک بہت محبت بھرا خط لکھ کر بلُایا تھا۔

شانتی:۔ اچھا! ان سب جھگڑوں کے بعد پھر پریم سنگھ کو خط لکھا؟

موہن:۔ ہاں۔

شانتی:۔ پھر وہ گئے؟

موہن:۔ نہیں جی، وہ کیا جاتے۔ مگر وہ خط اُنہوں نے رکھ لیا اور لکھ بھیجا کہ اب اگر مجھ سے کوئی سروکار رکھا تو یہ خط ڈاکٹر ٹنڈن کو دکھا دونگا۔

شانتی:۔ اس پر تو بہت ناچی ہوگی۔

موہن:۔ اوہو کیا پوچھتی ہو۔ بس اُسی دن سے پریم کی جانی دشمن ہوگئی۔ رستوگی کو اُس کے قتل پر آمادہ کیا مگر رستوگی خود پریم کے ہاتھ سے مارا گیا۔

شانتی:۔ Good God (گڈ گاڈ)

موہن:۔ اب پریم کا یہ عقیدہ ہے کہ سب عورتیں بیوفا ہوتی ہیں اس لئے زندگی بھر کنوارا رہنا ہی بہتر ہے (موہن اپنی گھڑی دیکھتا ہے)

شانتی:۔ کیا بج گیا؟

موہن:۔ پونے سات۔

شانتی:۔ اب چلنا چاہیئے۔

موہن:۔ اچھا۔ (دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

پریم سنگھ آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہے۔

سورج ڈوب چکا ہے۔ باغ (پبلک گارڈن) کا ایک سنسان گوشہ۔ موہنی (ایک نوجوان لڑکی) آہستہ آہستہ جا رہی ہے۔ اُسکے پیچھے یکایک جھاڑی سے تین آدمی نکلتے ہیں اور موہنی کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ موہنی بدحواس ہوکر چلاتی ہے۔ دوڑو۔ دوڑو۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ اور بہت ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور چھوٹ جانے کی کوشش کرتی ہے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ دو آدمی اس کو لئے جاتے ہیں۔ تیسرا ساتھ ہے۔ ایک شخص ہاتھ سے موہنی کا منہ بند کرتا ہے۔ وہ برابر تڑپ رہی ہے۔ پھر یکایک چیخ مارتی ہے بچاؤ بچاؤ۔ شور کی آواز سُنکر سامنے سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص دوڑتا ہوا آتا ہے۔ یہ مکرجی ہے۔

مکرجی:۔ خبردار! بدمعاشو خبردار! (یہ کہکر اُنکی طرف جھپٹتا ہے۔ تیسرا شخص آگے بڑھکر اسکو لپٹ جاتا ہے اور اس طرح روک لیتا ہے۔ باقی دو آدمی موہنی کو لئے کترا کر آگے بڑھتے ہیں۔ موہنی برابر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ مسٹر مکرجی اور اس شخص سے بھی برابر دھینگا مُشتی ہو رہی ہے۔ مکرجی اسے گرا لیتا ہے اور اُسے چھوڑ کر للکارتا ہوا موہنی کو بچانے دوڑتا ہے۔ وہ شخص پھر دوڑ کر مکرجی کو لپٹ جاتا ہے اور اس مرتبہ مکرجی کو گرا لیتا ہے۔ جھاڑی کے دوسری طرف پریم سنگھ شور کی آواز سُنتا ہے اور تیزی سے دوڑ کر اِدھر آتا ہے اور یہ ہنگامہ دیکھکر للکارتا ہے۔)

پریم:۔ بدمعاش، خبردار۔ (اتنا کہکر تیزی سے اُنکی طرف جھپٹتا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی دونوں موہنی کو چھوڑ کر سڑک کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تھوڑے فاصلے پر جو ایک موٹر کھڑی تھی اس میں بیٹھکر فرار ہو جاتے ہیں۔ تیسرا شخص جو مکرجی سے اُلجھا ہوا تھا وہ بھی مکرجی کو چھوڑ کر بھاگتا ہے مگر فوراً پریم دوڑ کر اُسے پکڑ لیتا ہے اور دو چار گھونسے اور لاتیں مار کر گرا دیتا ہے۔ پھر دھکیلتا ہوا اُدھر لاتا ہے۔ جدھر موہنی بدحواس

کھڑی ہے۔)

وہ شخص :۔ حضور (ہاتھ جوڑکے) معاف کردیجئے۔

پریم :۔ چُپ رہو (اس کے بعد موہنی سے) آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔

موہنی :۔ جی نہیں۔ میں آپ لوگوں کی بیحد شکرگذار ہوں کہ آپنے اِن بدمعاشوں سے میری جان بچائی (مکرجی کی طرف اشارہ کرکے) شاید ان بیچاروں کے کچھ چوٹ لگ گئی ہو۔ اس بدمعاش نے انہیں گرالیا تھا۔

پریم :۔ (مکرجی سے) آپکے تو کہیں چوٹ نہیں لگی ؟

مکرجی :۔ جی نہیں۔

پریم :۔ اس بدمعاش کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیئے۔

مکرجی :۔ بیشک۔ مگر افسوس ہے کہ میں آپکے ساتھ نہ چل سکونگا۔ مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے (گھڑی دیکھ کر) افوہ۔ بڑی دیر ہوگئی (یہ کہکر جلد بنا چاہتا ہے)

وہ شخص :۔ (مکرجی کے پیروں کو لپٹ جاتا ہے) حضور خدا کے لئے مجھے بچایئے۔ میں مرجاؤنگا۔

پریم اور موہنی ذرا متعجب ہوکر اُسے اور مکرجی کو دیکھتے ہیں۔ مکرجی کچھ گھبراسا جاتا ہے۔

مکرجی :۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ (یہ کہکر پھر جلد بنا چاہتا ہے۔)

وہ شخص :۔ (پھر مکرجی کے قدم پکڑلیتا ہے اور کہتا ہے) سرکار میں مرجاؤنگا۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آخر میرا کیا دوش ہے۔

پریم سنگھ (اور بھی حیران ہوکر اُس شخص سے) اِدھر دیکھو! (وہ شخص اِدھر متوجہ ہوتا ہے) ہمیں بتاؤ کیا بات ہے ؟

وہ شخص :۔ حضور۔ بابوجی نے ہم لوگوں سے کہا تھا کہ تمہیں پندرہ پندرہ روپے ملیں گے۔ تم لوگ اِن بائی جی کو اُٹھا کر لے بھاگنا۔ ہم پاس ہی چھپے رہیں گے۔ جب یہ شور مچا ئینگی تو ہم نکل آئیں گے اور ان کو چھڑانے کی کوشش کرینگے۔ تم پہلے تھوڑی دیر ہم سے جھگڑا کرنا۔ پھر ان کو چھوڑ کر بھاگ جانا اور ہماری موٹر میں بیٹھکر غائب ہوجانا۔

پریم :۔ Good God! (گڈ گاڈ)

مکرجی :۔ بدمعاش، جھوٹا کہیں کا۔ (مارنے کو چھڑی اُٹھاتا ہے پریم روکتا ہے) میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔

وہ شخص :۔ (گڑگڑاکر) بابوجی غریب آدمی کو کاہے کو پھنساتے ہو (پھر پریم کے پاؤں چھوکر) حضور ہمارے مائی باپ ہیں ہمیں چھوڑ دیجئے۔ ہمارے بال بچے حضور کو دعا دیں گے۔

موہنی۔ مبہوت ہوکر مکرجی کی طرف دیکھتی ہے۔ مکرجی کچھ کہے سُنے بغیر روانہ ہوجاتا ہے۔ وہ شخص رونے اور گڑگڑانے لگتا ہے۔

پریم سنگھ (مکرجی کی طرف اشارہ کرکے) یہ کون شخص ؟

وہ شخص :۔ حضور ہم تو یہ بھی نہیں جانتے۔ ہم سے تو ایک روز بازار میں مُلاقات ہوئی تھی۔

پریم :۔ اور یہ دو آدمی جو بھاگ گئے یہ کون تھے ؟

وہ شخص :۔ حضور اُنہیں بھی بابوجی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم نہیں جانتے۔

پریم موہنی کی طرف دیکھتا ہے۔

موہنی :۔ اب جانے دیجئے اس کمبخت کو۔

وہ شخص :۔ بھگوان آپکا بھلا کرے بائی جی۔

پریم :۔ جاؤ۔ دفع ہو۔

وہ شخص ہاتھ جوڑکے سلام کرتا ہے اور تیز رفتار سے چلا جاتا ہے۔

پریم :۔ (موہنی سے) اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو گھر تک پہونچا دوں۔

موہنی :- میں آپکی بیحد ممنون ہوں۔ مگر آپکو تکلیف ہوگی۔
پریم :- نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔
دونوں چل پڑتے ہیں۔ سڑک پر پہونچکر ٹیکسی لیتے ہیں اور موہنی کے گھر پہونچتے ہیں (موہنی کا مکان دو منزلہ اور عالیشان ہے) موہنی بڑے احترام اور تواضع سے پریم کو بٹھاتی ہے۔
موہنی :- ساری زندگی آپکا احسان نہ بھولونگی (یہ کہکر بڑی محبت بھری نظروں سے پریم کو دیکھتی ہے۔)
پریم :- (بہت متاثر ہوکر) واہ وہ بات ہی کیا تھی۔
موہنی :- کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟
پریم :- میرا نام پریم سنگھ ہے۔ اور آپ کا نام؟
موہنی :- میرا نام موہنی ہے۔
پریم :- موہنی۔
موہنی :- جی۔
پریم اور موہنی دونوں ایک دوسرے کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔
پریم :- آپ اس مکان میں اکیلی رہتی ہیں؟
موہنی :- جی ہاں۔ ایک ملازمہ ہے اور ایک پتاجی کے وقت کا بوڑھا ملازم۔
پریم :- اچھا تو کیا آپکے پتاجی ......
موہنی :- جی ہاں۔ پتاجی کو پرلوک سدھارے کوئی چھ مہینے ہوگئے۔
پریم :- اور آپکی اماں جی؟
موہنی :- وہ تو میری پیدائش ہی کے وقت سورگباش ہوگئی تھیں (ایک منٹ کے بعد نہایت محبت انگیز انداز سے) پریم سنگھ جی! کیا میں آپکا پتہ پوچھ سکتی ہوں۔
پریم :- (مسکراکر) بیشک (یہ کہکر اپنا کارڈ نکال کر موہنی کو دیتا ہے۔)
موہنی :- (کارڈ دیکھکر) اچھا تو آپ کیپٹن ہیں (ذرا وقفہ کے بعد) آپکے ماتا پتا زندہ ہیں؟
پریم :- پتاجی کو دنیا سے سدھارے تو بہت دن ہوئے اماں جی کا سایہ ابھی ہمارے سر پر قائم ہے۔ بس اب ہم گھر کے کل تین آدمی ہیں۔ اماں جی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی اندر سنگھ۔
موہنی :- (سنجیدگی سے) کل تین آدمی۔ یعنی آپ کے بال بچوں کو چھوڑکر۔
پریم :- (مسکراکر) جی نہیں اسکو جوڑکر۔
موہنی :- میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔
پریم :- موہنی دیوی! ابھی میں نے شادی نہیں کی ہے۔
موہنی :- (تعجب اور مسرت کے ساتھ) اچھا!
پریم :- آپ اُس شخص کو جانتی ہیں جسنے آج آپکو یہ تکلیف پہونچائی؟
موہنی :- نہیں پریم سنگھ جی۔ میں نے تو آج سے پہلے کبھی اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔
پریم :- خیال ہوتا ہے کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اچھا اب اجازت ہے؟
موہنی :- بہت اچھا (یہ کہکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ پریم بھی کھڑا ہوجاتا ہے)
موہنی :- اب کب ملاقات ہوگی؟
پریم :- جب آپ چاہینگی۔
موہنی :- (مسرور ہوکر) بہت اچھا۔ ابھی تو میں پورے طور پر آپکا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکی۔ خیر۔ دوسرے وقت سہی (یہ کہکر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتی ہے)
پریم :- چھوڑیئے اب اس ذکر کو (یہ کہتے ہوئے موہنی کا ہاتھ

شام لیتا ہے۔ ٹھیک اُسی وقت چمپا داخل ہوتی ہے اور بڑے غور سے پریم کو دیکھتی ہے۔ ہاتھ ملانے کے بعد:۔

پریم:۔ اچھا۔ آداب۔

موہنی:۔ آداب۔

امر سنگھ کا مکان

دو کابلی دروازہ پر آکر کھٹکا کرتے ہیں۔

اندر سے آواز:۔ کون ہے؟

ایک کابلی:۔ باہر میں آؤ۔

دروازہ کھلتا ہے۔ امر سنگھ کا باپ باہر آتا ہے اور کابلیوں کو دیکھکر سخت پریشان ہوتا ہے اور پوچھتا ہے۔

بڈھا:۔ کیا ہے خان؟

خان:۔ امر سنگھ کہاں ہے؟

بڈھا:۔ باہر گیا ہے۔

خان:۔ کب آئیگا۔

بڈھا:۔ کچھ معلوم نہیں۔

خان (اپنے ساتھی سے پشتو میں کچھ کہتا ہے پھر بڈھے سے) بابو! ہم کتنی دفعہ آیا۔ امر سنگھ ملتا نہیں، شام کو ہم پھر آئیگا۔ اُسکو بولو ہمارا روپیہ آج ضرور دینا ہوگا۔ دو مہینہ ہوگیا، روپیہ بھی دیتا نہیں، سود بھی دیتا نہیں۔ روز وعدہ کرتا ہے۔ آج دیگا۔ کل دیگا، صبح دیگا، شام دیگا۔ اگر آج روپیہ نہیں دیگا تو ہم کل نالش کر دیگا۔ پھر بہت اُس کا مشکل ہوگا۔

بڈھا:۔ خان، آجکل ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ امر سنگھ بے روزگار ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے آپ کے سود میں دیر ہوگئی۔ آپ پندرہ دن اور ٹھہر جائیے جہاں سے ہوگا ایک ایک پائی آپ کا بھگتان کر دینگے۔

اتنے میں امر سنگھ آ پہونچتا ہے۔

امر سنگھ:۔ خان سلام

خان:۔ سلام۔ ہمارا روپیہ کا بندوبست کیا؟

امر سنگھ:۔ خان میں بہت شرمندہ ہوں کہ اس دفعہ بہت دیر ہوگئی۔ آپنے جہاں اتنے روز صبر کیا ہے وہاں چند روز کی مہلت اور دیدیجئے آپکا بڑا احسان ہوگا۔

خان:۔ مہلت، مہلت، مہلت۔ کتنا روز مہلت دیگا۔ ہم نہیں جانتا۔ ہمارا روپیہ ابھی دینا ہوگا۔

امر سنگھ:۔ خان بھلا اسوقت روپیہ میرے پاس کہاں ہے۔

خان:۔ کچھ پروا نہیں۔ گھر کا سامان بیچو اور کسی سے قرض لو۔ مگر ہمارا روپیہ آج دینا ہوگا۔ ہم ابھی لے لیگا۔

امر سنگھ:۔ (باپ سے) پتا جی آپ اندر چلئے۔ (دونوں باپ بیٹے گھر میں جانا چاہتے ہیں۔ خان امر سنگھ کا کوٹ پکڑکر کھینچتا ہے۔ کوٹ جھر سے پھٹ جاتا ہے۔)

خان:۔ کدھر جاتا ہے۔

امر سنگھ:۔ چھوڑ دے میرا کوٹ

خان:۔ نہیں چھوڑیگا۔

امر سنگھ:۔ جا عدالت میں نالش کر دے۔ عدالت سے لے لے۔

خان:۔ عدالت سے کیوں لیگا۔ عدالت کو روپیہ نہیں دیا۔ تمہیں دیا ہے۔ تم سے لیگا۔

دوسرا خان پشتو میں کچھ کہتا ہے۔ راہگیر جمع ہو جاتے ہیں، کچھ محلہ والے آجاتے ہیں۔

ایک پڑوسی:۔ جانے دو۔ جانے دو خان۔ جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ۔

خان:۔ ہم جھگڑا نہیں کرتا۔ ہم اپنا روپیہ مانگتا ہے۔

امر سنگھ:- تو روپیہ دینے سے کس نے انکار کیا۔ یہی تو کہا تھا کہ چند روز ٹھہر جاؤ۔

خان:- ہم ایک دم نہیں ٹھہریگا۔ ابھی لیگا۔ ابھی لیکے جائیگا۔

پڑوسی:- خان ہمارے کہنے سے پندرہ دن کی مہلت اور دیدو۔ اگر پندرہ دن میں یہ نہیں دیگا تو ہم دیگا۔

خان:- تم دیگا؟

پڑوسی:- ہاں ہم دیگا۔

خان:- اچھا، تمہارا بات بھی دیکھے گا۔

یہ کہہ کر دونوں خان پشتو میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ امر سنگھ اور اس کا باپ گھر میں چلے جاتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں۔ راہگیر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ اتنے میں ایک بابو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ امر سنگھ نکلتا ہے۔

بابو:- بڑے جھوٹے آدمی ہو جی تم۔ کہہ کے آئے تھے کہ سات تاریخ کو ضرور دونوں مہینے کا کرایہ پہونچا دونگا آج پندرہ تاریخ آگئی۔ اب تک تمہارا پتہ نہیں۔ تین دفعہ ہمارا آدمی بھی حیران ہوا۔ گھر پر بھی تمہارا پتہ نہیں چلتا۔

امر سنگھ:- بابو جی میں آج کل سخت پریشان ہوں، آخر دو برس سے ہم آپکے کرایہ دار ہیں۔ برابر وقت پر کرایہ دیتے رہے۔ اب چند مہینے سے یہ دیر ہو گئی ہے۔

بابو:- اچھا تو لاؤ اب دو۔

امر سنگھ:- بابو جی میں آٹھ دن سے برابر آپ ہی کے روپے کی فکر میں مارا مارا پھر رہا ہوں مگر اب تک کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ آپ چند روز اور ٹھہر جایئے۔

بابو:- (طنز سے) چند روز اور ٹھہر جایئے۔ شرم نہیں آتی کہتے ہوئے۔ اندھیر ہے ڈھائی مہینہ کا کرایہ چڑھ گیا۔ دمڑی کی کوڑیاں آج تک نہیں دیں۔ اب ان حیلوں سے کام نہیں چلیگا۔ کرایہ ابھی دیدو اور کل صبح مکان خالی کر دو۔ نہیں تو اس کا نتیجہ بہت خراب ہوگا۔

امر سنگھ:- (منت سے) بابو جی بھگوان نے آپکو بہت کچھ دیا ہے، پندرہ بیس روپے بغیر آپکا کونسا کام اٹکا پڑا ہے۔ ہمارے اوپر دیا کیجئے۔

بابو:- (اور تیز ہوکر) بھگوان نے بہت کچھ دیا ہے تو ہم نے کسی کا کچھ چھین لیا ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ کرایہ دیدو۔ اور چپکے سے مکان خالی کر دو۔ نہیں تو کھٹیا پڑا سب نیلام کرا دونگا۔ بہت بے عزت ہوگے۔

امر سنگھ:- (مجبور ہوکر) جو آپکے جی میں آئے کیجئے اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

بابو:- اچھی بات ہے۔ اس کا نتیجہ بھی دیکھ لینا (یہ کہکر بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ امر سنگھ پھر گھر میں آتا ہے)

امر سنگھ:- (اپنی بوڑھی ماں سے) اماں بڑی بھوک لگی ہے۔

ماں:- بیٹا۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں پکایا۔ تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آٹا، دال، چاول، سب چیزیں ختم ہو گئیں۔ اب تم کچھ لاؤ تو پکے۔

امر سنگھ (چپ چاپ چلا جاتا ہے اور محلہ کے بنئے کی دکان پر پہونچکر) لالہ جی۔ دس سیر موٹے چاول اور پانچ سیر ارہر کی دال اور دیدیجئے۔

لالہ:- بھیا ہم نے ادھار کا لین دین بند کر دیا۔ کتنے لوگوں کے پاس روپیہ اٹکا ہوا ہے۔ قرض لے کر کوئی دینا ہی نہیں چاہتا تم نے بھی اب تک پچھلے مہینہ کا بھگتان نہیں کیا اور تازہ قرض لینے کو آ کھڑے ہوتے۔

امر سنگھ:- لالہ جی آخر آپسے ہمارا برسوں سے لین دین ہے کبھی آپکی کوئی کوڑی ماری گئی ہے!

لالہ:- نہیں ماری تو نہیں گئی، لیکن ہم ایسا بیوپار نہیں کرتے۔

پچھلا حساب صاف کردو اور آگے کو بیچاؤ تو کچھ ڈر نہیں مگر اس طرح ہم نہیں دے سکتے کہ جمع ہوتا جائے اور ایک پیسہ ادا نہیں ہوتا۔

امر سنگھ:۔ میں بہت جلد آپکا سب حساب بیباق کر دونگا۔

لالہ:۔ نہیں بھیّا اب ہم اُدھار نہیں دینگے۔

امر سنگھ:۔ لالہ جی آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ ہمارا روپیہ دو روپیہ کا اعتبار نہیں کر سکتے۔

لالہ:۔ اچھا تو کب بھگتان کروگے۔

امر سنگھ:۔ پہلی تاریخ کو۔

لالہ:۔ تمہارے کہنے سے آج دئے دیتا ہوں مگر پہلی تاریخ کو ضرور حساب صاف کردینا۔

امر سنگھ:۔ ضرور۔

لالہ چاول اور دال تول کر امر سنگھ کے حوالہ کرتا ہے امر سنگھ گھر آتا ہے۔

امر سنگھ:۔ (ماں سے) پتا جی کہاں گئے؟

ماں:۔ میں تم سے کہنا بھول گئی تھی کہ نمک بھی نہیں رہا، جب تم چلے گئے تو یاد آیا۔ میں نے اُنہیں ایک پیسہ دیا کہ نمک لے آؤ۔ آتے ہی ہونگے۔

امر سنگھ کا باپ سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ دوراہا آتا ہے، سامنے سے ایک موٹر آرہی ہے۔ موٹر والا شاید نشہ میں ہے ہارن دئے بغیر یکایک موٹر موڑ دیتا ہے۔ بڈھا موٹر سے ٹکرا کر گرتا ہے، موٹر اُس کے اُوپر سے گذر جاتی ہے اور وہ فوراً مر جاتا ہے، مجمع ہو جاتا ہے، لاش خون میں تربتر پڑی ہے۔ اتنے میں امر سنگھ بھی آپہونچتا ہے اور باپ کی لاش دیکھکر چیخ مار کر اُسے لپٹ جاتا ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک سپاہی ڈیوٹی پر کھڑا ہے۔ ہنگامہ دیکھکر وہ بھی آجاتا ہے۔

ایک راہگیر:۔ ساری خطا موٹر والے کی ہے۔

دوسرا راہگیر:۔ ہارن نہیں دیا۔ ایکدم موٹر گھما دی۔

تیسرا راہگیر:۔ ہاتھ نہیں دکھایا۔ غریب کا خون کردیا۔

پہلا:۔ اس کا نتیجہ بھی معلوم ہو جائیگا۔

امر سنگھ (راہگیروں سے) آپ لوگوں کو گواہی دینی ہوگی۔

کئی راہگیر:۔ ضرور گواہی دینگے۔

سپاہی۔ ہم سب رپورٹ بولیں گے۔ غریب کا خون ایسے نہیں جائے گا۔

پولیس والا گاڑی کا نمبر لیتا ہے اور مالک کا پتہ وغیرہ پوچھکر لکھ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ کوتوالی چلو۔

بابو (جو موٹر چلا رہا تھا اور نشہ میں مدہوش ہے) ——

Get away; you go and report. ——

یہ کہہ کر گاڑی چلا دیتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن کی کوٹھی۔ نہایت عالیشان عمارت خوبصورت پائیں باغ۔ کمرے بہترین سامان اور فرنیچر سے آراستہ۔

ڈاکٹر ٹنڈن اپنے کمرہ میں ٹہل رہا ہے۔ ٹائپ کئے ہوئے کچھ کاغذات اُس کے ہاتھ میں ہیں جنہیں بار بار الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ پھر ایک لفافہ میں بند کرکے میز کی دراز میں رکھ دیتا ہے اور تالا لگا دیتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کمرہ میں ٹہلتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ یکایک غصہ کی شکل بنا لیتا ہے، الماری کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے۔ پھر برابر والے کمرہ کو زور زور سے دھپ دھپاتا ہے۔ اُس کمرہ میں اس کی بیوی یعنی روپ کماری اپنے سنگھار میں مصروف ہے۔ زرق برق لباس پہنے آئینہ کے سامنے چہرہ پر پوڈر لگا رہی ہے۔ جب سنگھار

مکمل ہو گیا تو بڑے مغرورانہ انداز سے ڈاکٹر ٹنڈن کے کمرہ میں آتی ہے۔ ایک ہاتھ میں خوبصورت بیگ اور دوسرے میں چھتری ہے۔ گویا کہیں جانے کی تیاری ہے۔ ڈاکٹر ٹنڈن متوجہ نہیں ہوتا۔ چہرہ پر مصنوعی غصہ کے آثار ہیں۔ تھوڑا سا ٹہلنے کے بعد:-

ڈاکٹر ٹنڈن:- رُوپو۔ اس پاجی کمینہ کی بابت میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

روپ کماری:- (متکبرانہ) کون پاجی کمینہ؟

ٹنڈن:- کون پاجی کمینہ؟ وہی جو رات دن مجھے اور تمہیں ذلیل و رُسوا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اور زیادہ صاف صاف کہوں؟ وہی تمہارا پُرانا چہیتا۔ اب سمجھیں؟

روپ کماری:- (نہایت سخت لہجہ میں) ذرا اپنے ہوش میں رہیئے شریفوں کی طرح بات کیجئے۔ کیا اس شخص کا نام نہیں ہے؟

ٹنڈن:- (جو اس اثنا میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کرسی کو آگے گھسیٹ کر) کیسی بھولی ہو ابھی تک نہیں سمجھیں! اس کا نام ہے پریم سنگھ۔ اب سمجھ میں آیا۔ شرم تو نہ آئی ہو گی؟

روپ کماری:- (اس گفتگو سے سخت پراگندہ ہو کر) بابوجی آپ انسانیت سے بات کریں تو میں جواب دوں۔ آخر اُس بدذات نے کیا کیا۔

ٹنڈن:- (دھیما ہو کر) اُس نے تم پر آوارگی کی تہمت لگائی ہے۔ یہ بتاؤ کہ اُس کے پاس تمہارے ہاتھ کی کوئی تحریر سند ہے جس سے وہ اس الزام کو ثابت کر سکے۔

روپ کماری:- (دیوانوں کی طرح اپنی جگہ سے تڑپ کر) سند! میرے ہاتھ کی تحریری سند! ہرگز نہیں۔ میری کوئی تحریر کسی کے پاس نہیں۔ جو کہتا ہے وہ جھوٹا ہے اور جو یقین کرتا ہے وہ احمق ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن روپ کماری کی پراگندگی اور اضطراب دیکھ کر کمرہ سے باہر چلا جاتا ہے۔ روپ کماری دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر صوفے پر گر پڑتی ہے اور گذشتہ واقعات کو سوچنے لگتی ہے۔

(گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال میں)

پریم اپنے کمرہ میں ڈریسنگ گون پہنے کوچ پر لیٹا اخبار دیکھ رہا ہے۔ روپ کماری چپکے سے داخل ہوتی ہے اور پریم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ پریم آہستہ سے روپ کماری کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیتا ہے۔ پھر اس طرح کھینچتا ہے کہ روپ کماری کا گال اس کے گال سے چھو جاتا ہے۔ پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔

پریم سنگھ:- رُوپو!

روپ کماری:- پریم۔

اس کے بعد دونوں ہم آغوش ہو جاتے ہیں اور لب بوس ہوتے ہیں۔

پریم سنگھ:- کیوں روپ کیا تم ہمیشہ مجھے اسی طرح چاہتی رہو گی؟

روپ کماری:- زندگی کی آخری سانسوں تک پریم۔

دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہے۔ دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔

پریم سنگھ:- کون؟

آواز:- کپور۔

پریم سنگھ:- (Come in) کم اِن۔

کپور اندر داخل ہوتا ہے۔ دونوں سے نمسکار کرتا ہے۔ اس کے بعد پریم سے:-

کپور:- واہ جناب۔ ابھی تک آپ ڈریسنگ گون ہی میں ہیں (گھڑی دیکھ کر) آٹھ بجنے میں دس منٹ آتے ہیں، ساڑھے آٹھ بجے میچ شروع ہو جائیگا۔

پریم سنگھ:- میں ابھی دو منٹ میں تیار ہوا جاتا ہوں۔

(روپ کماری ایک جُھرجُھری لیتی ہے)

گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال ہیں

روپ کماری کا مکان۔ روپ کماری پُرتکلف لباس پہنے پیانو بجا رہی ہے، کپور سُن رہا ہے۔ جب وہ ختم کرتی ہے تو کہتا ہے۔

کپور:۔ اچھا روپ اب چلتا ہوں۔

روپ کماری:۔ اچھا۔ (پیانو چھوڑکر کھڑی ہوجاتی ہے اور دونوں ہم آغوش و لب بوس ہوتے ہیں۔ یکایک پریم سنگھ داخل ہوتا ہے اور انہیں اس حال میں دیکھتا ہے۔ پریم سنگھ کو دیکھکر دونوں گھبرا جاتے ہیں۔)

پریم سنگھ:۔ (طنز اور غصّہ سے) معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ (یہ کہہ کر فوراً واپس ہوتا ہے۔ روپ اچانک پریم! کہہ کر اس کے پیچھے لپکتی ہے اور دروازہ تک جاتے جاتے اُسے پکڑ لیتی ہے۔ پریم سنگھ کچھ کہے بغیر روپ کماری کو دھکا دیکر اپنا دامن چھڑا کر چلدیتا ہے۔

روپ کماری ایک جُھرجُھری لیتی ہے

گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال ہیں)

(Charity (Variety) Show for Hospital

اسٹیج پر ایک درجن رقاصاؤں کا ناچ ختم ہوتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں، پردہ گرتا ہے۔ ایک شخص سائڈ میں سے نکل کر کہتا ہے (اُس کے ہاتھ میں پروگرام ہے)

صاحبان! ہمیں افسوس ہے کہ ماسٹر پیارے بابو جنکا پروگرام میں چھٹا نمبر ہے (پروگرام دیکھتے ہوئے) یکایک طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے نہ آسکے۔ اس لئے اب پروگرام کا ساتواں نمبر شروع ہوگا اور مس روپ کماری اپنا لاجواب گانا سُناکر آپ سے اپنے کمال کی داد لیں گی۔

پردہ اُٹھتا ہے۔ روپ کماری بڑے نازو انداز سے سامنے آتی ہیں۔ تالیوں کے شور سے اُنکا استقبال ہوتا ہے۔ کرسی پر بیٹھکر ہارمونیم بجاکر جو برابر ہی میز پر رکھا ہوا ہے، یہ گانا گاتی ہیں۔

اک پیاری صورت ؛ دل کی جو یا ہے
سینہ کے اندر ؛ محشر برپا ہے
کالی کالی مست گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں
مدّت کی بھولی بسری باتیں پھر یاد دلاتی ہیں
آموں کے نیچے ؛ جھولا ڈالا تھا
مستی چھائی تھی ؛ دل متوالا تھا
پینگ بڑھاتے جاتے تھے آواز ملا کر گاتے تھے
جب آنکھیں مل جاتی تھیں شرماکر چُپ ہوجاتے تھے
پھر طوفان اُٹھتا ؛ دونوں کے من میں
بڑھ کر پڑجاتیں ؛ باہیں گردن میں

گانے کے دوران میں ڈاکٹر ٹنڈن اور اس کا ایک دوست جس نے ابھی اعلان کیا تھا ایک طرف کنارے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

ٹنڈن:۔ شنکر، یار کیا غضب کا گلا ہے۔

شنکر:۔ اور صورت۔

ٹنڈن:۔ اوہ۔ صورت تو قیامت ہے۔

شنکر:۔ بدن کس قدر خوبصورت ہے۔

ٹنڈن:۔ تصویر ہے تصویر۔

شنکر:۔ آنکھیں کتنی حسین ہیں۔

ٹنڈن:۔ اوہ، جادو ہیں، جادو۔ شنکر، یار میرا تو دل بے اختیار ہوا جاتا ہے۔

اس کے بعد دونوں کچھ کانا پھوسی کرتے ہیں۔

شنکر:۔ (یکایک ذرا بلند آواز سے) اچھی بات ہے۔

ٹنڈن پھر آہستہ سے کچھ اُسکے کان میں کہتا ہے۔

شنکر:۔ اچھی بات ہے۔

یہ کہہ کر شنکر اُٹھ جاتا ہے۔ گانا ختم ہوتا ہے۔ تالیوں کا شور۔ روپ کماری سامنے آکر تسلیم بجالاتی ہے۔ شنکر اسٹیج پر آکر اعلان کرتا ہے۔

شنکر:۔ صاحبان مس روپ کماری کے گانے سے خوش ہوکر ہمارے شہر کے مشہور اور ہردلعزیز ڈاکٹر ٹنڈن صاحب نے ہسپتال کے اس چیرٹی فنڈ میں پانچ سو روپیہ عنایت فرمایا ہے۔

تالیوں کا شور۔ پردہ گرجاتا ہے

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

ٹنڈن:۔ رُوپو۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں نے صرف تمہارے حسن و جوانی کی وجہ سے تم سے شادی کی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں تمہاری صورت سے زیادہ تمہاری باطنی خوبیوں کا دلدادہ ہوں۔

روپ کماری:۔ اور میرے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ میں نے آپکی دولت کے لالچ میں آپ سے شادی کی۔ کاش وہ جانتے کہ روپ کماری پیسے کی لوبھی نہیں۔ وہ کمال کی قدردان ہے۔ وہ انسانی خوبیوں کی عاشق ہے۔

ٹنڈن:۔ (بے انتہا خوش ہوکر) اصل بات یہ ہے کہ لوگ ہماری خوش قسمتی کو دیکھ دیکھ کر جلتے ہیں اور طرح طرح سے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔ اچھا رُوپو۔ اب دس بج رہے ہیں مریض انتظار میں ہونگے۔ میں بہت جلد واپس آؤنگا۔

(روپ کماری ایک جھرجھری لیتی ہے)

(گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال میں)

روپ کماری پریم کو خط لکھتی ہے۔

"پریم۔ میرے پیارے۔ الفاظ نہیں ملتے جو اپنی شرمندگی اور بیقراری کا اظہار کرسکوں۔ ایشور کی بھی گنہگار اور تمہاری بھی۔ مگر میری حالت رحم کے قابل ہے۔ میں نے ڈاکٹر ٹنڈن سے شادی کرکے اپنے آپ کو تباہ کرلیا۔ خدا کے واسطے میری خطاؤں کو معاف کردو۔ قسم کھاکر کہتی ہوں پریم۔ رات دن تمہاری یاد کے سوا اب مجھے اور کوئی کام نہیں۔ کل رات کو میں اکیلی ہونگی۔ تمہارا انتظار کرونگی۔ دیکھو اگر نہ آئے تو یاد رکھنا میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔"

تمہاری پجارن۔ رُوپ،

رامداس پریم کا خط لاکر دیتا ہے، رُوپ کھولکر دیکھتی ہے۔

مسز ٹنڈن! آپ کا خط ملا۔ افسوس ہے کہ میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے درمیان کسی قسم کا بھی کوئی تعلق باقی رہے۔ مہربانی فرماکر آیندہ مجھے خط لکھنے کی تکلیف نہ کیجئے۔ اگر آپ نے اس کے خلاف کیا تو میں یہ خط ڈاکٹر ٹنڈن کو دکھا دونگا۔ فقط۔

پریم سنگھ

(روپ کماری ایک جھرجھری لیتی ہے)

(گذری ہوئی باتیں۔ عالمِ خیال میں)

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری اور ڈاکٹر سنوگی (ایک نوجوان)

روپ کماری:۔ رستوگی! میں ایک بات تم سے پوچھتی ہوں۔

رستوگی:۔ پوچھیئے۔

روپ کماری:۔ ڈاکٹر ٹنڈن تمہارے اُستاد ہیں نا؟

رستوگی:۔ بیشک۔

روپ کماری:۔ اور میں اُن کی بیوی ہوں؟

رستوگی:۔ بیشک۔

روپ کماری:۔ اور تم نے مجھ سے وہ تعلقات پیدا کئے جو صرف میاں بیوی کے درمیان ہونے چاہئیں۔ تم نے اپنے اُستاد کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔

رستوگی:۔ او۔ رُوپو۔ مجھے اس طرح ذلیل نہ کرو۔ میری رگوں میں شریف خُون ہے۔ مگر ہائے تمہاری محبّت نے مجھے بالکل اندھا کر دیا۔ گناہ کو اب میں گناہ نہیں سمجھتا۔ رُوپو تیرے لئے اب اگر مجھے جہنّم کے غار میں بھی کُودنا پڑے تو میں اسکے لئے تیار ہوں۔

روپ کماری:۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔

رستوگی:۔ کہنے کی باتیں نہیں۔ روپ مرد جو کہتا ہے وہ کرنا بھی ہے۔

روپ کماری:۔ مگر اس کا کیا ثبوت کہ تمہیں واقعی مجھ سے سچّی محبّت ہے؟

رستوگی:۔ ثبوت! ثبوت میں کیا بتاؤں۔ ہاں جس طرح جی چاہے آزما کر دیکھ لو۔

روپ کماری:۔ فرض کرو میں کہوں کہ فلاں شخص کو قتل کر ڈالو۔ تو؟

رستوگی:۔ تو کیا۔ کل ہی اُسکی لاش خُون میں لوٹتی ہوگی۔

روپ کماری:۔ (حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ) اخاہ آپ اسقدر بہادر ہیں۔

رستوگی:۔ بہادر نہیں۔ محبّت میں اندھا اور دیوانہ۔

روپ کماری:۔ اچھا تو سُنو۔

(ایک منٹ کا ناپھوسی ہوتی ہے)

رستوگی:۔ اچھی بات ہے۔ ایشور چاہے تو ایک ہفتہ کے اندر اندر میں اُسے دوسری دُنیا میں بھیجدونگا۔

رات کا وقت ہے۔ پریم آہستہ آہستہ سڑک پر جا رہا ہے۔ ایک گلی آتی ہے۔ گلی کے کنارے ایک شخص مُنہ پر نقاب ڈالے کھڑا ہے۔ جب پریم سنگھ گلی کے برابر سے گذرتا ہے تو وہ شخص پیچھے سے پریم سنگھ پر چھُری کا وار کرتا ہے۔ (پریم اوورکوٹ پہنے ہے)

پریم سنگھ:۔ "آہ مار ڈالا" کہہ کر گرتا ہے۔ قاتل دوسرا وار کرنا چاہتا ہے کہ پریم اس پر پستول کا فیر کرتا ہے۔ وہ گولی کھا کر آہ کرکے، دھم سے پیچھے کو گرتا ہے۔ لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔ پولیس آجاتی ہے۔

پولیس مین:۔ ارے! کپتان پریم سنگھ!

ایک شخص:۔ (قاتل کا نقاب اُلٹ کر) ارے یہ تو ڈاکٹر رستوگی ہے۔

روپ کماری ایک جُھرجُھری لیتی ہے۔ پھر نہایت جوش میں کھڑی ہوجاتی ہے اور خود بخود کہتی ہے:۔

روپ کماری:۔ اچھا پریم! اگر تجھ سے اپنی رسوائی کا بدلہ نہ لیا ہو تو میرا نام روپ کماری نہیں۔

پھر کچھ دیر سوچتی ہے پھر ایک نوکر کو آواز دیتی ہے:۔

رامداس! رامداس!!

رامداس حاضر ہوتا ہے۔

روپ کماری:۔ رامداس، دیکھو بیکر اسٹریٹ میں نمبر ۱۴ مکان پر جا کر کپتان پریم سنگھ کو دریافت کرنا اور موجود ہوں تو اُن سے

کہنا کہ بائی جی نے آپکو بلایا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔ ایک شخص کی جان کا معاملہ ہے۔ آنے کا وقت پوچھ لینا۔

رامداس:۔ بہت اچھا۔

رامداس کو روانہ کرکے روپ کماری خود مکان سے باہر آتی ہے۔ موٹر ڈرائیور کو آواز دیتی ہے:۔

مادھو! مادھو! جلد موٹر نکالو۔

مادھو:۔ (وردی پوش ڈرائیور) بہت اچھا حضور۔

مادھو جلد موٹر نکالکر لاتا ہے۔ روپ کماری سوار ہوتی ہے:

مادھو:۔ کہاں چلئے گا حضور۔

روپ کماری:۔ (کچھ سوچکر) اچھا اسوقت نہیں۔ کل دیکھا جائے گا۔

موٹر سے اُتر پڑتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔

"دیکھو مادھو! بابو جی پوچھیں تو کہدینا کہ ذرا مارواڑی لائبریری تک گئی ہیں۔ ابھی آتی ہیں"

یہ کہہ کر چلدیتی ہے۔ سڑک پر پہونچکر ٹیکسی والے کو آواز دیتی ہے۔ ٹیکسی!

ٹیکسی میں بیٹھکر:۔ لاکس لین چلو۔

ٹیکسی روانہ ہوجاتی ہے۔ لاکس لین پہونچکر روپ کماری اُتر پڑتی ہے۔ اور ٹیکسی والے کو رخصت کرکے کچھ دور پیدل چلکر ایک بوڑھے دوافروش کی دکان پر پہونچتی ہے۔

دوافروش:۔ کیا چاہیے حضور؟

روپ کماری:۔ (اِدھر اُدھر دیکھکر) اندر چلئے تو بتاؤں۔

دونوں اندر جاتے ہیں۔ اندر پہونچکر:۔

روپ کماری:۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ زہر بھی بیچتے ہیں۔

دوافروش:۔ جی ہاں، میں ہر قسم کے زہروں کا لیسنس دار ہوں۔

روپ کماری:۔ مجھے ایک نہایت قاتل زہر چاہیے۔

دوافروش:۔ آپ نسخہ لائی ہیں؟

روپ کماری:۔ نسخہ! نسخہ کیسا؟

دوافروش:۔ زہر تو کسی ڈاکٹر کے نسخہ کے بغیر نہیں مل سکتا۔

روپ کماری:۔ (پریشان ہوتی ہے۔ پھر کچھ سوچکر) میں آپ کو مُنہ مانگی قیمت دونگی۔

دوافروش:۔ بائی جی۔ سوال قیمت کا نہیں، قانون ہے۔

روپ کماری:۔ میں عمر بھر آپکی احسانمند رہونگی۔

دوافروش:۔ (کچھ سوچکر) آپ تو بہت مجبور کرتی ہیں۔

روپ کماری:۔ آپکی مہربانی کا شکریہ ادا نہیں کرسکتی۔

دوافروش:۔ اچھا ایک ڈرام زہر کی قیمت آپ کیا دینگی؟

روپ کماری:۔ جو آپ کہئے۔

دوافروش:۔ ڈھائی سو روپے۔

روپ کماری:۔ (متعجبانہ) ڈھائی سو روپے! ایک ڈرام زہر کی قیمت ڈھائی سو روپے!

دوافروش:۔ جی ہاں ڈھائی سو روپے۔ آپکے خیال میں ایک انسان کی جان کی قیمت ڈھائی سو روپے بہت زیادہ ہے؟

روپ کماری:۔ (کانپ کر بڈھے کی طرف دیکھتی ہے) مگر میں تو اتنا روپیہ ساتھ نہیں لائی ہوں۔ اس وقت میرے پاس کل سو روپے ہیں مگر آپ کے اطمینان کے لئے میں اپنا ہار آپکے پاس چھوڑے جاتی ہوں۔ کل روپیہ بھجوادونگی اور ہار منگا لونگی۔

ہار اُتار کر بڈھے کے حوالے کرتی ہے۔ بڈھا ہار کو اچھی طرح جانچتا ہے۔ اس کے بعد:۔

دوافروش:۔ آپ ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں (کہکر جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی سفید شیشی لیکر آتا ہے) بائی جی! یہ نہایت قاتل زہر ہے۔ پھر خوبی یہ کہ نہ اس میں رنگ نہ بو، نہ مزہ۔ ذرا سی دیر میں کام تمام کردیتا ہے۔ بس ایک بوند کافی ہے۔

روپ کماری:۔ میں آپکی بیحد شکر گذار ہوں (شیشی لیکر اپنے بیگ

میں رکھ لیتی ہے اور سو روپے کے نوٹ بڈھے کے حوالہ کرتی ہے اُسکے بعد چلی جاتی ہے۔

دوافروش :۔ (تنہائی میں) بیوقوف عورت۔ اب مجھے احمق بنانے آئی تھی۔ نہ جانے کس بیگناہ کی جان لیتی۔ خیر ایک ماشہ خالص پانی کی قیمت ڈہائی سو روپیہ کم نہیں۔

پریم سنگھ کا باغیچہ

پریم سنگھ اور موہن ٹہل رہے ہیں۔

موہن :۔ یہ کب کی بات ہے ؟

پریم سنگھ :۔ اُسی دن شام کو جب تم باغ میں نہیں ملے تھے اُسی دن کی بات ہے۔

موہن :۔ اچھا تو پھر دوسری ملاقات کا وعدہ کیوں نہ لے لیا۔

پریم سنگھ :۔ حماقت اور کیا۔

موہن :۔ تعجب ہے کہ تم جیسے اُستاد سے اور ایسی چوک۔

پریم سنگھ :۔ ہاں موہن۔ میں اسوقت کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ سمجھ کچھ ہی نہ سکا۔ رُوپو سے قطع تعلق کے بعد کبھی کسی عورت سے مجھے دلچسپی نہیں ہوئی۔ لیکن اس فتنہ گرنے تو کچھ جادو سا کردیا۔ موہن میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ایسی بھولی اور معصوم صورت ہے کہ بے اختیار دل اس کی طرف کھنچتا ہے۔ اُس دن سے آج تک ایک لمحہ کے لئے وہ تصویر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی۔

ڈاکیہ خط لاکر دیتا ہے۔ پریم سنگھ اُسے کھولکر پڑھتا ہے اور خوشی سے اُس کا چہرہ چمک اُٹھتا ہے۔ پریم سنگھ ابھی خط پڑھ ہی رہا ہے کہ موہن کہتا ہے۔

موہن :۔ موہنی کا خط ؟

پریم سنگھ :۔ آں ہاں۔

موہن :۔ کیا لکھا ہے ؟

پریم سنگھ :۔ بُلایا ہے۔

موہن :۔ کب ؟

پریم :۔ سنو۔ (خط پڑھتا ہے) "پریم سنگھ جی۔ اگر تکلیف نہ ہو تو جمعرات کے دن شام کے پانچ بجے تشریف لائیے۔ بہت شکر گذار ہونگی۔
موہنی"

پریم سنگھ خط کو مکرر آہستہ آہستہ پڑھتا ہے۔ پھر چومتا ہے سونگھتا ہے۔ (موہن سے) دیکھنا موہن! خط عطر میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر یہ تین دن کیسے کٹینگے ؟ آج تو منگل ہے نا ؟

موہن :۔ ہاں منگل ہے۔ تین دن کہاں۔ بس کل ہی کا دن تو بیچ میں ہے۔

پریم سنگھ :۔ پھر تین دن ہو تو گئے۔ آج۔ کل۔ پرسوں۔ موہن نہ معلوم مجھے اِس دفعہ کیا ہو گیا ہے۔ اس قسم کی بے چینی تو پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

دونوں ٹہلتے ہوئے مکان کے اندر چلے جاتے ہیں۔ ملازم اطلاع دیتا ہے کہ ایک شخص کہیں سے آیا ہے۔ ملنا چاہتا ہے۔ پریم سنگھ موہنی کا خط چھپا لیتا ہے اور کہتا ہے :" بلا لو"

رامداس داخل ہوتا ہے اور با ادب سلام کرتا ہے۔

پریم سنگھ :۔ کہاں سے آئے ہو!

رامداس :۔ حضور ڈاکٹر ٹنڈن صاحب کے یہاں سے آیا ہوں۔ بائی جی نے حضور کو بلایا ہے اور کہا ہے کہ جسدن حضور کو فرصت ہو تشریف لائیے۔ بہت ضروری کام ہے۔ ایک آدمی کی جان کا معاملہ ہے ؟

پریم سنگھ :۔ (تیوری چڑھاکر) آخر کام کیا ہے ؟

رامداس :۔ حضور مجھ سے تو بس اتنا ہی کہا تھا۔

پریم سنگھ سوچنے لگتا ہے۔

موہن :۔ پریم میرا خیال ہے کہ بات کو بڑھاؤ نہیں۔ ہو ہی آؤ تو اچھا ہے۔ آخر معلوم تو ہو کہ قصہ کیا ہے۔ جنگ سے صلح بہرحال اچھی۔

پریم سنگھ:- اچھی بات ہے۔ (اپنی ڈائری دیکھتا ہے۔ پھر راماداس سے) کہنا کہ سنیچر کے دن تیسرے پہر کو چار بجے آؤنگا۔

راماداس کے جانے کے بعد پریم سنگھ کو کوچ پر لیٹ جانا ہے (موہن سے) نہ جانے موہن یہ چڑیل مجھے کس مصیبت میں پھنسائے گی۔

موہن:- اسے کچھ بھی نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہی خط واپس مانگے گی۔ دے بھی دو، تمہارے ہے کس کام کا۔

عدالت کا کمرہ

امر سنگھ۔ مدن لال (جس نے موٹر سے امر سنگھ کے باپ کو کچل ڈالا تھا) سپاہی۔ تین گواہ، مجسٹریٹ۔ کورٹ انسپکٹر۔ مدن کا وکیل اور کچھ تماشائی۔

ایک گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ:- تم نے کیا دیکھا۔

گواہ:- حضور میں اس وقت دور ہی سے گذر رہا تھا۔ موٹر سامنے سے آرہی تھی۔ موٹر والے نے ہارن دیا اور موٹر کی طرف ہاتھ دکھایا۔ ہم لوگ رک گئے مگر وہ بڈھا بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر موٹر سے ٹکر ہوگئی۔

امر سنگھ:- (چلا کر) ارے اتنا سفید جھوٹ۔ (مجسٹریٹ سے) حضور اوروں لوگوں سے پوچھئے۔ ساری خطا......

مجسٹریٹ:- خاموش (گواہ سے) ہاں پھر کیا ہوا؟

گواہ:- بس حضور وہ بڈھا موٹر کے نیچے آگیا اور کچل گیا۔

دوسرا گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ:- (دوسرے گواہ سے) تم نے کیا دیکھا۔

دوسرا گواہ:- حضور میں تو موٹر کو سامنے سے آتے دیکھکر پہلے ہی رک گیا تھا۔ موٹر والے نے دور ہی سے ہارن بجایا اور موٹر کے پاس آکر ہاتھ دکھایا مگر وہ بڈھا شاید بہرا تھا کہ اس نے ہارن کی آواز نہیں سنی۔ اور شاید کم سوجھ بھی تھا کہ اس نے موٹر کو آتے ہوئے نہیں دیکھا، آخر موٹر کے نیچے آگیا۔

تیسرا گواہ پیش ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ:- تم نے کیا دیکھا۔

تیسرا گواہ:- حضور اسوقت کئی موٹریں آگے پیچھے آرہی تھیں۔ ہارن کی آواز میں نے ضرور سنی مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس موٹر نے ہارن دیا۔ مگر یہ میں نے دیکھا کہ موٹر کے پاس آکر اس موٹر کے بابو نے ہاتھ دکھایا۔ لوگ ایک طرف ہوگئے مگر وہ بڈھا بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر موٹر سے ٹکر ہوئی اور مر گیا۔

امر سنگھ:- (پھر ایکبار چلا کر) حضور یہ سب جھوٹ ہے۔ ان سب کو رشوت دیگئی ہے۔ اُس وقت تو یہ سب کہہ رہے تھے کہ بابو نے غریب کو مار ڈالا۔ آج کیسے پلٹ گئے۔

مجسٹریٹ:- خاموش۔ خاموش۔ فیصلہ پیر کو سنایا جائیگا۔

یہ کہہ کر مجسٹریٹ ایک کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ تماشائی بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں مکرجی بھی موجود ہے۔

مکرجی:- فیصلہ تو ظاہر ہے۔ غریب کے خون کی قیمت ہی کیا۔

(سب لوگ باہر نکل آتے ہیں۔ امر سنگھ کے آنسو جاری ہیں، مکرجی امر سنگھ کو ایک طرف لیجاتا ہے۔)

مکرجی:- مسٹر امر سنگھ! مجھے سخت افسوس ہے کہ تمہارے بوڑھے باپ کی اس طرح جان گئی۔ امیروں سے جہاں مقابلہ ہو وہاں انصاف کا کوئی سوال نہیں۔ مگر غریبوں کا انصاف کرنے والا خدا ہے۔

امر سنگھ:- (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) نہیں بابو جی، غریبوں کی خدا بھی نہیں سنتا۔ مگر میں اپنا انصاف آپ کرونگا۔

مکرجی امر سنگھ کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے۔ Young man.

ینگ مین۔ غصّہ سے کام نہیں چلیگا۔ صبرو استقلال کی ضرورت ہے۔ کیا ابھی تک آپ کو کوئی کام نہیں ملا؟

امر سنگھ:۔ نہیں بابو جی۔ ابتک بالکل بیکار ہوں۔

مکر جی:۔ مجھے نہایت افسوس ہے۔

امر سنگھ:۔ کیا کہوں بابو جی آجکل میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ بوڑھی ماں کا خیال نہ ہوتا تو آج میں کبھی اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتا۔ (پھر آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں)

مکر جی:۔ کاش اس طرح جان دینے کا کچھ حاصل ہوتا۔ آپکی طرح ہزاروں بے روزگار آپ سے زیادہ مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اسوقت ایک مختصر سا کام تو میں آپ کو دلوا سکتا ہوں۔

امر سنگھ:۔ کیا کام۔

مکر جی:۔ وہ کام جو ہر شریف انسان کو کرنا چاہئے۔ یعنی دیش کی سیوا۔ مگر ہاں اس میں ذرا خطرہ ہے۔

امر سنگھ:۔ میں کسی خطرہ کی پروا نہیں کرتا۔ آخر فاقے کرکے مرنے سے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہے کہ دیش کی سیوا میں جان جائے۔

مکر جی:۔ اچھی بات ہے (اپنا کارڈ دیتے ہوئے) رات کو آٹھ بجے اس پتہ پر مجھ سے ملئے۔ اسوقت تفصیل سے آپکو بتاؤنگا کہ کیا کرنا ہے۔ (جیب سے روپیہ نکالکر) یہ لیجئے بیس روپے۔ اس سے آپ اپنی اسوقت کی ضرورتیں پوری کیجئے۔

امر سنگھ بے انتہا خوش ہوتا ہے اور شکریہ ادا کرکے روپیہ لے لیتا ہے اور دونوں چلے جاتے ہیں۔

موہنی کا مکان

موہنی سادہ مگر خوبصورت لباس پہنے پریم کی منتظر ہے۔ کبھی گھنٹہ پر نظر ڈالتی ہے۔ کبھی اپنی دستی گھڑی دیکھتی ہے۔ میز کے پاس کھڑی ہوکر ایک اخبار کے ورق اُلٹی پلٹتی ہے۔ پھر اُسے رکھدیتی ہے۔ کمرہ میں ٹہلنے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ گنگناتی جاتی ہے۔ پھر گراموفون کھولکر ایک ریکارڈ چڑھا دیتی ہے۔ ایک منٹ قریب کھڑے ہوکر سنتی ہے پھر ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر ایک تصویر کے سامنے ٹھہر کر اُسے غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ پریم آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ موہنی کی اُس طرف پیٹھ ہے۔ پریم سنگھ دبے پاؤں آتا ہے اور دونوں ہاتھ موہنی کے کاندھوں پر رکھ دیتا ہے۔ موہنی چمک کر ایک طرف ہٹ جاتی ہے پھر پریم کو دیکھکر مسکرانے لگتی ہے۔

موہنی:۔ آداب۔

پریم سنگھ:۔ آداب۔

موہنی:۔ میں تو ڈر گئی تھی۔

پریم سنگھ:۔ (مسکراتے ہوتے) آپ کیا سمجھی تھیں؟

موہنی:۔ کچھ بھی نہیں۔

پریم سنگھ:۔ شاید یہ سمجھی ہوں کہ یہ پریم سنگھ بھی کہیں اُس روز والے بدمعاشوں کا ساتھی تو نہیں۔

موہنی:۔ (ہنسنے لگتی ہے) تشریف رکھئے (دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

پریم سنگھ:۔ موہنی دیوی۔ یہ عورت کون تھی جو اُس روز میرے جاتے وقت یہاں آئی تھی۔

موہنی:۔ کون چمپا؟ وہ ڈاکٹر ٹنڈن کے یہاں ملازم ہے۔ اُن کی بیوی نے کسی کام سے میرے پاس بھیجا تھا۔

پریم سنگھ ڈاکٹر ٹنڈن کا نام اور اس کی بیوی کا ذکر سُنکر سخت مضطرب ہوجاتا ہے۔ فقط "وہ" اس کے منہ سے نکلتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔

موہنی:۔ کیوں پریم سنگھ جی۔ آپ پریشان کیوں ہو گئے؟

پریم:- کچھ نہیں۔ میں...... ہیں، کچھ نہیں۔ پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔

موہنی:- شاید آپ اصلی بات مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ اور دراصل مجھے کوئی حق بھی نہیں کہ آپ کا کوئی راز آپ سے پوچھوں۔

پریم سنگھ:- راز تو کچھ ایسا نہیں۔ مگر سنکر آپ کو افسوس ہوگا۔ جو لوگ آپ کے دوست ہیں وہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔

موہنی:- (حیرت سے) کون لوگ؟

پریم سنگھ:- ڈاکٹر ٹنڈن اور اُن کی بیوی۔

موہنی:- مگر آپ نے اُنہیں میرا دوست کیسے سمجھ لیا۔ ڈاکٹر ٹنڈن یوں تو میرے چچا ہیں مگر شاید اُن سے بڑھکر میرا بدخواہ دُنیا میں کوئی نہیں۔

پریم:- (حیرت سے) ڈاکٹر ٹنڈن۔ آپکے چچا؟

موہنی:- جی ہاں۔

پریم:- مگر وہ تو عیسائی ہیں۔

موہنی:- جی ہاں، وہ مشن اسکول اور مشن کالج کی تعلیم کی برکت سے جوانی ہی میں عیسائی ہو گئے تھے۔ سب کُنبہ والوں نے اُنہیں چھوڑ دیا تھا مگر پتاجی آخر دم تک اُن سے ملتے رہے اور اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ عمر میں وہ پتاجی سے بہت بڑے ہیں۔ میری بدقسمتی کہ مرتے وقت پتاجی اُنہیں کو میرا سرپرست مقرر کر گئے۔

پریم سنگھ:- موہنی دیوی! یہ شخص ہاتھ دھوکے میرے پیچھے پڑا ہے اور اس کی بیوی نے بھی اپنے ایک بیہودہ خط کی خاطر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی مگر پرماتما نے بال بال بچا دیا۔

موہنی (بہت متاثر ہوکر) پریم سنگھ جی۔ مجھ پر بھی اُنہوں نے پتاجی کے مرنے کے بعد بڑے بڑے ستم توڑے ہیں کئی دفعہ مجھے بیچنے کی تدبیریں کر چکے ہیں۔

پریم سنگھ:- اوہ! ایسی بے غیرتی!

موہنی:- غیرت کا وہاں سوال ہی نہیں۔

(جایئے آتی ہو۔ دونوں بیٹھے جاتے ہیں اور باتیں کرتے جاتے ہیں۔)

پریم سنگھ:- اب مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر چمپا کے ذریعہ سے ڈاکٹر ٹنڈن کو میرے یہاں آنے کا حال معلوم ہوگیا تو شاید پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔

موہنی:- نہیں۔ اس کا آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ چمپا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں نے پہلے ہی احتیاطاً اس کو منع کر دیا ہے کہ آپ کے یہاں آنے کا حال کسی کو معلوم نہ ہو۔ وہ کسی کو نہیں بتائیگی۔

پریم سنگھ:- خُدا کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا اُس باغ والے بابو کا تو پھر کچھ پتہ نہیں چلا۔

موہنی:- پرسوں میں ٹہلنے گئی تھی تو باغ میں مُلاقات ہوئی تھی۔ بہت معذرت کرنے لگا کہ میرا اس واقعہ سے اور اُن لوگوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ میں تو آپ کا خیرخواہ ہوں۔ اور آج سے نہیں کئی مہینے سے۔ جب سے پہلی مرتبہ آپکو باغ میں دیکھا تھا۔

پریم سنگھ:- اُس کا نام کیا ہے۔

موہنی:- مکرجی اپنا نام بتایا تھا۔

پریم سنگھ:- کرتا کیا ہے؟

موہنی:- کچھ معلوم نہیں۔ مجھے تو وہ کوئی بڑا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اُسکی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔

پریم سنگھ:- پھر آپ نے کیا کہا؟

موہنی:- میں نے کہا کہ مجھے آپکی ہمدردی نہیں چاہیئے آپ مہربانی کرکے تشریف لیجایئے۔ پھر بھی وہ کچھ دیر تک بیہودہ

باتیں بکتا ہی رہا۔ میں اُٹھکر چلی آئی۔

پریم سنگھ:۔ دراصل ابھی ہمارا ملک اس قابل نہیں کہ جوان لڑکیاں تنہا سیر و تفریح کے لئے باہر جائیں۔ ہم لوگوں کے اخلاق جیسے ہیں ظاہر ہے۔ آیندہ آپکو احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر اب کہیں ملاقات ہو اور وہ آپسے کچھ کہے تو فوراً پولیس کو بُلاکر اس بدمعاش کو گرفتار کرا دینا۔ مجھے افسوس ہے کہ اُسدن مجھسے بڑی چُوک ہو دئی۔

موہنی:۔ پریم سنگھ جی۔ میں آپکی مہربانی اور ہمدردی کا شُکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ جسدن سے آپسے ملاقات ہوئی ہے میرے دل کو بڑی ڈھارس ہو گئی ہے اور آج تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ......... (یہ کہتے ہوئے بڑی محبت سے پریم سنگھ کی طرف دیکھتی ہے۔ پریم اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے)

پریم سنگھ:۔ (آنکھیں ملاکر) کیسا محسوس ہو رہا ہے؟

موہنی:۔ (سر جھکاکر) نہ جانے میں کیا کہہ رہی تھی۔

پریم سنگھ موہنی کے ہاتھ سے کھیلتا ہے۔ موہنی سر جھکائے خاموش ہے۔

پریم:۔ اچھا اب اجازت ہے؟

موہنی:۔ اتنی جلدی!

پریم سنگھ:۔ کچھ ضروری کام ہے۔

موہنی:۔ بہت اچھا۔ (دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

موہنی:۔ اب کب ملاقات ہو گی؟

پریم سنگھ:۔ بہت جلد۔ اب میں آپکے خط کا انتظار نہیں کروں گا۔

موہنی:۔ شکریہ۔

پریم موہنی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے پھر دونوں ایک دوسرے کو نہایت پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ موہنی شرما کر آنکھیں نیچی کر لیتی ہے۔

پریم سنگھ:۔ "اچھا آداب" کہکر روانہ ہو جاتا ہے۔

مکرجی کی قیامگاہ۔ چھ بجے شام کا وقت

مختصر مکان۔ تھوڑا سا سامان۔ مگر ہر چیز نہایت صاف سُتھری۔ مکرجی کمرہ میں کھڑکی کے برابر نہایت خوش و خرم آرام کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر ٹنڈن داخل ہوتا ہے۔ مکرجی نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کرتا ہے اور بڑے احترام سے بٹھاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ (مُسکراکر) مکرجی آج تو آپ بہت خوش نظر آتے ہیں۔

مکرجی:۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔ واقعی آج میں بے انتہا خوش ہوں۔ اور آپکو بھی یہ معلوم کرکے خوشی ہو گی کہ دس بلکہ گیارہ بے روزگار نوجوان گریجویٹ اور ہمارے دیش سیوک منڈل میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ (حیرت اور مسرت سے) واقعی؟

مکرجی:۔ واقعی۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ خدا جانے آپ کیا جادو کرتے ہیں کہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ آپکی باتوں میں آجاتے ہیں اور آپکے کہنے سے بڑے بڑے خطرناک کام کر ڈالتے ہیں۔ اچھا ان لوگوں کو کیا سبق پڑھایا۔

مکرجی:۔ وہی پُرانا سبق کہ تمہاری مفلسی اور بے روزگاری کے ذمہ دار دولتمند لوگ ہیں۔ ملک کی غلامی کا سبب صرف مالدار ہیں۔ ان کا خاتمہ ہو جائے تو کل ملک آزاد ہو جائے اور یہ ساری بلائیں ایک منٹ میں کافور ہو جائیں۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ اور سب لوگوں نے اس بات کو تسلیم کیا؟

مکرجی:- تسلیم کیسے نہ کرتے۔ بات ہی معقول ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:- لیکن بڑے زور شور سے آپکی تحریک کی مخالفت شروع ہوگئی ہے۔ کل وکٹوریہ پارک میں جلسہ تھا بابو رامچندر نے بڑی دھواں دھار تقریر کی اور لوگوں کو بتایا کہ مالداروں اور دولتمندوں کے خلاف جو غریب مزدوروں اور کسانوں کو اُبھارا جارہا ہے یہ محض خود غرض لوگوں کی چالیں ہیں جو وہ اپنے ذاتی فائدہ کے لئے چل رہے ہیں۔

مکرجی:- آخر اس کی کوئی دلیل بھی دی یا بس یوں ہی ؟

ڈاکٹر ٹنڈن:- ایک دلیل کیا بہت سی دلیلیں دیں اُنہوں نے کہا کہ اس وقت جو کچھ بھی غریبوں کے فائدہ کا کام ہو رہا ہے وہ سب امیروں ہی کے دم سے ہے۔

مکرجی:- (حقارت سے) ہونہہ۔ غریبوں کے فائدہ کا کام۔ دغاباز مکار کہیں کے۔ ان بے ایمانوں کو ایسی باتیں کہتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔ اور کیا کہا ؟

ڈاکٹر ٹنڈن:- کہا کہ آخر یہ سینکڑوں پبلک ہسپتال یتیم خانے، محتاج خانے کس کے روپے سے چل رہے ہیں۔ یہ ہزاروں اسکول سینکڑوں کالج اور کتنی ہی یونیورسٹیاں جنہیں سرکار سے برائے نام مدد ملتی ہے اور جنہیں کروڑوں روپیہ سالانہ کا خرچ ہے کس طرح قائم ہیں۔

مکرجی:- مگر میں پوچھتا ہوں کہ یہ اسکول اور کالج آخر ہیں کس مرض کی دوا۔ کلرک بنانے کی فیکٹریاں ہیں جو انسانوں کو اپاہج کرکے بے روزگاری پھیلا رہی ہیں۔

ڈاکٹر ٹنڈن:- اُنہوں نے کہا کہ مُلک کی بڑی بڑی پولٹیکل اور سوشل تحریکوں کیلئے روپیہ کہاں سے آتا ہے ؟

مکرجی:- یہ سب تحریکیں مالداروں کی جڑیں مضبوط کرنے کیلئے چلائی جاتی ہیں۔ دولتمند اُن کیلئے روپیہ کیوں نہ دینگے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:- اس پر خاص طور پر زور دیا کہ یہ سینکڑوں ہزاروں مفت کے دھرم شالے، مسافر خانے اور آشرم کون چلا رہا ہے !

مکرجی:- ارے آج ہم مفلس نہ ہوتے تو ہمیں ان خیرات خانوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ڈاکٹر ٹنڈن:- پھر اُنہوں نے کہا کہ مُلک میں صنعت و حرفت کی جو کچھ بھی ترقی ہے یہ کس کے دم سے ہے۔ یہ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں جن کے ذریعہ سے لاکھوں مزدوروں اور غریبوں کا پیٹ پلتا ہے کس کی بدولت قائم ہیں ؟

مکرجی:- یہ کارخانے ہی تو لعنت ہیں جنہوں نے ہندوستان کی ساری دستکاریوں اور صنعتوں کو تباہ کردیا (طنزیہ) اور ان سے غریبوں کا پیٹ پلتا ہے ؟ غریب اور مزدور نہ ہوں تو یہ کارخانے چل بھی سکتے ہیں ؟

ڈاکٹر ٹنڈن:- آخری بات اُنہوں نے یہ بھی کہ دولتمندوں نے کسی کا کچھ چھین تو نہیں لیا۔ اپنی لیاقت اور محنت سے دولت پیدا کی ہے۔ نالائقوں اور کاہلوں کو حسد ہوتا ہے۔

مکرجی:- کیا کہنے تمہاری لیاقت کے۔ ڈاکٹر صاحب آپ یقین کیجئے کہ اس قسم کی تقریروں سے ہماری تحریک کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ یہ لوگ مرض کا سبب جانے بغیر مرض کا علاج چاہتے ہیں۔ جب تک بے روزگاری کے دُور کرنے کی سبیل نہ نکلے گی ہماری تحریک فنا نہیں ہوسکتی اور جب تک یہ ہزاروں اسکول اور کالج موجود ہیں اور اُن میں یہی کلرک بنانے والی تعلیم جاری ہے بے روزگاری روز بروز بڑھتی ہی جائیگی۔ ڈاکٹر صاحب بھوک بُری چیز ہے۔ یہی اسکول اور کالج کے لڑکے، یہی تمہارے بے روزگار گریجویٹ پیٹ کی خاطر ڈاکو اور خونی بن جائیں گے۔ دولتمند

کو لوٹیں گے اور اپنا پیٹ بھریں گے۔ انہیں میں سے انارکسٹ اور ٹیررسٹ پیدا ہونگے جو ملک کے امن و امان کو تباہ کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ مکرجی آپنے تو آج میرے بھی ہوش اڑا دیئے۔ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ جس کے پاس بھی کچھ سرمایہ ہو اسکی جان مال۔ آبرو کوئی چیز محفوظ نہیں۔

مکرجی :۔ ہرگز نہیں۔ میں تو خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ اس موجودہ تعلیم کی اصلاح کی طرف کبھی کا خیال نہ جائے۔ ملک کی غلامی کی زنجیریں انہیں بے روزگار گریجویٹوں کے ہاتھوں کٹینگی۔

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ اچھا مکرجی اب کچھ کام کی بات کیجئے آج کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ کہئے روپیہ بینک سے لے آئے؟

مکرجی :۔ روپیہ تو میں لے آیا مگر وہ رپورٹ ؟

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ (خوش ہو کر کاغذ کا ایک پیکٹ جیب سے نکالتا ہے) رپورٹ یہ موجود ہے۔

مکرجی اسے بڑے شوق سے لیتا ہے۔ کھولکر ایک نظر اس پر ڈالتا ہے اور اٹھکر دوسرے کمرے میں رکھ آتا ہے۔ واپس آکر پھر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ (بے چینی کے ساتھ) اچھا تو اب روپیہ عنایت فرمایئے۔

مکرجی :۔ (نہایت نرمی سے) روپیہ موجود ہے مگر۔۔۔۔۔

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ (نہایت بے صبری سے) مگر کیا ؟

مکرجی :۔ مگر یہ کہ آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کام تو دوسری حکومتوں کا ہے۔ میری ذات کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک ذرا سا کام میرا بھی کر دیجئے تو روپیہ فوراً حاضر ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ (نہایت غضبناک ہو کر) میرے ساتھ آپکی یہ عیاری نہیں چلینگی۔ مہربانی کر کے آپ میرے کاغذات واپس کر دیجئے۔

مکرجی :۔ (ہنسکر) کاغذات تو اب واپس نہیں مل سکتے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ (غصہ میں کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے) کاغذ نہیں مل سکتے! (جیب سے پستول نکالکر) کاغذ تو میں آپ سے ابھی لے لونگا۔ ابھی آپ ڈاکٹر ٹنڈن سے واقف نہیں ہیں۔ اگر مجھے تنگ کیا تو ابھی سازش کا سارا کچا چٹھا کھولدونگا۔ ابھی جناب بڑے گھر میں تشریف رکھتے ہونگے۔

مکرجی :۔ (نہایت اطمینان کے ساتھ) ڈاکٹر صاحب اتنے تیز نہ ہو جیئے۔ یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دکھایئے گا۔ پولیس کو اگر خبر ہو گئی تو مجھ سے پہلے آپ جہنم واصل ہونگے۔ میں دوسری حکومتوں کا باضابطہ ایجنٹ اور جاسوس سہی مگر میرا کام تو سب آپ ہی کرتے رہے ہیں ہندوستان کے متعلق رپورٹیں تو سب آپ ہی نے تیار کرا کے باہر بھجوائی ہیں۔ روپیہ تو اکثر آپ ہی کی معرفت تقسیم ہوا اور جس کی رسیدیں میرے پاس موجود ہیں ہمارے دیش سیوک منڈل کے بعض جلسے بھی تو آپ کے مکان پر ہوئے ہیں۔ میں پھنسا تو آپ ضرور بچ جائینگے۔ یاد رکھئے میرے لئے تو بچت کے اور بھی کئی رستے ہیں مگر آپ یقیناً کتے کی موت مارے جائینگے۔ آیا خیال شریف میں؟

ڈاکٹر ٹنڈن مغلوب ہو کر دھیما ہو جاتا ہے اور نہایت پریشانی اور عاجزی کے لہجہ میں کہتا ہے :۔

اچھا آپکا وہ ذاتی کام کیا ہے ؟

مکرجی :۔ پہلے یہ فرمایئے کہ مس موہنی دیوی سے آپ سے کیا رشتہ ہے!

ڈاکٹر ٹنڈن :۔ وہ میری بھتیجی ہے۔

مکرجی :۔ اور آپ اسکے قانونی سرپرست بھی ہیں؟

ڈاکٹر ٹنڈن :- ہاں۔

مکرجی :- (نہایت خوش ہوکر) تب تو کام سہل ہے۔ دراصل میں موہنی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام کرا دیجئے اور سات ہزار روپے آپ کے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (قدرے اطمینان کے ساتھ) یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ میں کل ہی موہنی کو آپ کے حوالہ کردونگا لیکن اس رپورٹ کے معاوضہ میں ہمارا آپ کا اقرار تو دس ہزار کا تھا۔

مکرجی :- آپ جلدی نہ کیجئے۔ باقی ضروری کاغذات بھی لے آیئے اور وہ تین ہزار بھی لے لیجئے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- اچھی بات ہے۔ میں ابھی موہنی کے یہاں جاتا ہوں۔

مکرجی :- ہاں، ایک بات میں آپ سے کہنا بھول گیا۔ موہنی سے میں کئی مرتبہ مل چکا ہوں۔ مگر کبھی اُس نے مجھے اظہارِ مطلب کا موقع نہیں دیا اور نہایت بداخلاقی سے پیش آئی۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں اُسے ٹھیک کرلونگا۔ (فوراً چلا جاتا ہے)

اس کے چلے جانے کے بعد مکرجی پلنگ پر لیٹ جاتا ہے موہنی کی تصویر نکالکر دیکھتا ہے اور کہتا ہے:-

"کیا پیاری صورت ہے"

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری بناؤ سنگھار کئے بہترین لباس اور زیور پہنے پریم سنگھ کی منتظر ہے۔ چمپا کو آواز دیتی ہے۔

روپ کماری :- چمپا!

چمپا آتی ہے۔

روپ کماری :- (کچھ دیر سوچتی ہے۔ پھر سر اُٹھاکر) چمپا! یہ صاحب جو ہمارے یہاں چائے پر آرہے ہیں یہ بہت تیز چائے پیتے ہیں۔

چمپا :- تو میں بہت تیز چائے بنالونگی۔

روپ کماری :- نہیں۔ اسکی ایک اور صورت ہے۔ ولایت والوں نے چائے کا ایک جوہر نکالا ہے۔ پیالی میں ایک بوند ڈال دینے سے چائے نہایت تیز اور خوش مزہ ہو جاتی ہے۔ مگر جو لوگ اس کے عادی نہیں وہ نہیں پی سکتے۔ میں نے تو ایک دفعہ انہیں کے یہاں پی تھی تو چکر آگیا تھا اور غشی کی سی حالت ہوگئی تھی۔ (یہ کہتے ہوئے میز پر سے ایک صندوقچہ اُٹھاکر کھولتی ہے اور زہر کی سفید شیشی نکالکر چمپا کو دیتی ہے) دیکھو! اس میں سے ایک بوند اُنکی پیالی میں ڈالدینا۔

چمپا :- بہت اچھا۔

روپ کماری :- اچھی طرح خیال رکھنا۔ میری پیالی میں ہرگز نہ ڈالنا۔ دیکھ بھول نہ جانا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کی پیالی میں بھی نہ ڈالے۔

چمپا :- کہیئے تو میں شیشی خود اُنہیں کو دیدوں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق خود ڈال لینگے۔

روپ کماری :- (جھلاکر) اُلو کہیں کی۔ میں کہتی ہوں اُنہیں معلوم نہیں ہونا چاہیئے، تو کہتی ہے شیشی اُنہیں کو دیدوں۔

چمپا :- (ڈرکر) اب سمجھ گئی۔ معاف کردیجئے۔ پہلے میں سمجھی نہیں تھی۔ آپ اطمینان رکھیئے۔ جیسا آپنے حکم دیا ہے ویسا ہی ہوگا۔

(چمپا جاتی ہے۔ روپ کماری اُسے پھر پکارتی ہے اور کہتی ہے)

روپ کماری :- چمپا! میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ یہ جوہر دودھ میں ڈالدینا۔ ممکن ہے کہ بنی بنائی چائے آئے تو وہ سمجھ جائیں۔ سمجھ گئے تو پھر لطف ہی کیا رہیگا۔

چمپا:۔ بہت اچھا۔ (جاتی ہے)

گھنٹہ چار بجاتا ہے۔ رام داس پریم سنگھ کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ روپ دروازہ تک جاکر پریم سنگھ کو لیکر آتی ہے۔ پریم سنگھ روپ کماری سے ہٹ کر بیٹھتا ہے۔ وہ فوجی وردی پہنے ہوئے ہے۔ جیب میں پستول، اور کمر میں تلوار لگی ہے۔ چہرہ پر پریشانی کے آثار ہیں اور ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔

روپ کماری:۔ (مسکراکر) سرکار نے یہ ہتھیار کیوں سجے ہیں۔ خدانخواستہ کہیں دشمن سے لڑنے جانا ہے؟

پریم سنگھ:۔ (متانت سے) نہیں، یہاں سے مجھے پریڈ پر جانا ہے۔ اچھا فرمائیے کیا حکم ہے!

روپ کماری:۔ (نہایت دلربایانہ انداز سے) حکم تو نہیں ایک التجا ہے۔ پریم تمہیں یقین تو کیوں آنے لگا مگر بدنصیب روپو تمہاری محبت کو آج بھی نہیں بھولی۔ میں جانتی ہوں کہ خدا نے تمہیں بہت شریف اور فیاض دل دیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے مجھ سے جو قصور ہوئے تم اُنہیں ضرور بھول گئے ہوگے۔

پریم سنگھ:۔ (اپنی تلوار سے کھیلتے ہوئے) روپ! کیا تم سمجھتی ہو کہ جو کچھ تم نے کیا اُسے بھلا دینا ممکن ہے! ایک بیگناہ جس نے محبت کے سوا اور کوئی جرم تمہارا نہیں کیا تم اُس کے قتل کے درپے ہوئیں۔ شاید تمہارے یہاں کا یہی قانون ہے کہ پہلے ایک شخص سے محبت کرنا۔ پھر اسکا خاتمہ کرکے دوسرے سے دل لگا لینا۔ آہ روپو تم نے میرے کلیجہ میں جو ناسور ڈالدئے ہیں اُنہیں میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔

روپ کماری:۔ (سخت شرمندہ ہوکر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیتی ہے) ہائے پریم۔ ابھی تک تم پُرانی باتوں کو نہیں بھولے۔ ابھی تک تمہارے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔

پریم سنگھ:۔ (روپ کماری کی طرف دیکھکر) روپ ایشور جانتا ہے کہ انتقام کا تو میرے دل میں وہم و گمان بھی نہیں۔ ہاں ....

روپ کماری:۔ (بات کاٹ کے) اگر تمہارے دل میں انتقام کا خیال نہیں تو پھر میرا وہ خط جو میں نے تمہاری محبّت سے مجبور ہوکر تمہیں لکھدیا تھا کاہے کو اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ مجھے واپس کیوں نہیں دیدیتے؟

پریم سنگھ:۔ (متاثر ہوکر) روپو تم یقین رکھو کہ اس خط سے ہرگز تمہیں کوئی نقصان نہیں پہونچیگا اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے نقصان پہونچانے کی کوئی کوشش نہ کی تو میں ہرگز وہ خط کسی کو نہیں دکھاؤنگا۔ اب میرا دل تم سے بالکل صاف ہے۔

روپ کماری پریم سنگھ کی باتوں سے بالکل مطمئن نہیں ہوتی۔ گھنٹی بجاتی ہے۔ چمپا آتی ہے۔ روپ اشارے سے کہتی ہے کہ چائے لاؤ۔

روپ کماری:۔ پریم میں تمہاری بیحد شکر گذار ہوں۔ اب تم وہ خط مجھے دو یا نہ دو، مجھے بالکل اطمینان ہوگیا۔ تم یقین رکھو، میں آیندہ ہرگز تمہیں نقصان پہونچانے کی کوشش نہ کرونگی۔

پریم سنگھ:۔ (آنکھیں ملاکر) اچھا روپو اگر ابھی تمہارا خط واپس دیدوں تو کیا قسم کھاکے وعدہ کروگی کہ پھر مجھ سے کوئی سروکار نہ رکھوگی۔

روپ کماری:۔ (نہایت عاجزی سے) جیسی چاہے قسم لے لو۔ پریم! پرماتما کی قسم۔ اپنی عزّت کی قسم۔

پریم سنگھ کا دل بہت نرم ہوجاتا ہے۔ اپنے کوٹ کی

جیب میں ہاتھ ڈالکے خط نکالتا ہے اور روپ کی میز پر رکھدیتا ہے۔ اتنے میں چمپا چائے لیکر آتی ہے۔ اُسے دیکھکر روپ سخت مضطرب ہوتی ہے۔ ایک سکتہ کی سی حالت اسپر طاری ہوجاتی ہے۔ پریم سنگھ کچھ نہیں سمجھتا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ دو پیالیوں میں چائے اُونڈیلتا ہے، جب دودھ ڈالنا چاہتا ہے تو روپ کہتی ہے:-

روپ کماری:- میری پیالی میں دودھ نہ ڈالنا۔ میں کچھ دنوں سے سادہ چائے پیتی ہوں۔

پریم سنگھ چائے بنا کر بڑے شوق سے پیتا ہے۔ روپ کماری اس تمام وقفہ میں خاموش اور سخت مضطرب رہتی ہے۔ چائے پینے کے بعد:-

پریم سنگھ:- روپو۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت تمہاری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت آرام کرو۔ اچھا پھر کسی دن ملاقات ہوگی (روپ کماری کی حالت اور بھی خراب ہوجاتی ہے)

روپ کماری:- ہاں پریم نہ جانے کیوں اس وقت میری طبیعت بہت بگڑ رہی ہے۔ معاف کرنا۔

پریم سنگھ:- آداب۔

روپ کماری:- آداب۔

پریم سنگھ جاتا ہے۔ روپ کماری اُسی حال میں صوفے پر پڑی رہتی ہے۔ دروازہ سے نکلتے وقت چمپا پریم سنگھ کو روک کے کہتی ہے:-

چمپا:- بابو جی! آج میں نے آپکی جان بچالی۔ اور یہ عرق جو بائی جی نے دیا تھا کہ دودھ میں ڈالدوں، میں نے نہیں ڈالا۔

زہر کی شیشی چمپا کے ہاتھ میں ہے۔ پریم سنگھ سخت حیرت اور غور سے چمپا کو دیکھتا ہے۔

چمپا:- میں اُن کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ ایسے شریف اور بہادر جوان کی جان لینا مہا پاپ ہے۔ میں اس میں ہرگز شریک نہیں ہوسکتی۔

پریم سنگھ کو چمپا کی سچائی کا یقین ہوجاتا ہے۔ شیشی اُس کے ہاتھ سے لیکر دیکھتا ہے۔ اس پر "زہر" لکھا ہے۔ پڑھکر تھرا جاتا ہے۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈالکر کچھ روپے نکال کر چمپا کو دیتا ہے اور کہتا ہے:-

"بھگوان تمہیں اِس نیکی کا بدلہ دیگا" یہ کہہ کے چلدیتا ہے مگر دفعتہً اُس کا خون جوش میں آتا ہے اور دیوانوں کی طرح روپ کماری کے کمرہ کی طرف پلٹتا ہے۔ چمپا سدِّ راہ ہوتی ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتی ہے:-

چمپا:- بابو جی، میرے اُوپر رحم کیجئے! میں تباہ ہوجاؤنگی۔

پریم سنگھ:- تم کچھ فکر نہ کرو۔

روپ کماری پریم سنگھ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اُٹھتی ہے۔ خط میز پر سے اُٹھاتی ہے۔ غور سے دیکھتی ہے۔ دیا سلائی جلاتی ہے کہ اسے جلا ڈالے۔ یکایک بھاری پاؤں کی وحشتناک آواز سُنتی ہے۔ خط کو اپنے بلاؤز میں چُھپالیتی ہے۔ پریم سنگھ سخت غضبناک اور بدحواس گرجتا ہوا داخل ہوتا ہے اور تلوار کھینچکر روپ کماری کی طرف بڑھتا ہے۔ روپ کماری چلاتی ہے۔

آہ۔ پریم۔ ارے تمہیں کیا ہوگیا۔

پریم سنگھ:- (گرجکر) غدار۔ قاتل۔ خونی۔ تونے مجھے زہر دیدیا۔ خط واپس کر۔

روپ کماری پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور کہتی ہے:-

تم سے کس نے کہا کہ تمہیں زہر دیا گیا۔

پریم سنگھ:- کہا کسی نے نہیں۔ میں اپنی حالت سے سمجھ رہا ہوں۔ آہ۔ ارے کلیجہ پُھنکا جاتا ہے۔ جلدی کر میں اب گرتا ہوں۔ اور تجھے بھی ٹھکانے لگاتا ہوں۔

روپ کماری :- (چیخ مار کر) ارے دوڑو۔ دوڑو۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔
پریم سنگھ تلوار اُس کے گلے پر رکھدیتا ہے اور کہتا ہے :-

" خط فوراً واپس دیدے "

روپ کماری خوف کے مارے بلاؤز میں سے خط نکالکر پریم سنگھ کے سامنے ڈالدیتی ہے۔

پریم سنگھ :- (خط اُٹھا کر) زندہ رہگیا تو اس دغابازی کا مزہ چکھاؤنگا، اسوقت تو چھوڑے دیتا ہوں۔

فوراً کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ روپ کماری بڑی بُری حالت میں اٹھکر صوفے پر جا پڑتی ہے۔ پھر چند منٹ میں اٹھکر :-

" بدبخت! کل تک تُو خود راکھ کا ڈھیر ہوگا "

رایل بیکری Royal Bakery

ایک شخص صندوق لے بیکری میں داخل ہوتا ہے۔ اسکے بعد ایک اور۔ اسکے بعد ایک اور۔ پھر مکرجی پہنچتا ہے جلسہ شروع ہوتا ہے۔

مکرجی :- آج ایک خاص ضرورت سے میں نے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے۔ باہر سے جو خبریں آرہی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شہروں میں ہمارے دیش سیوک اب اُس سرگرمی سے کام نہیں کررہے ہیں جس طرح ابتدا کی تھی۔ شاید انکا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ یا وہ تھک گئے ہیں بہرحال جو صورت بھی ہو۔ ایک بار پھر اُن میں اسٹیم بھرنے کی ضرورت ہے۔

ایک شخص :- پھر آپنے اسکے لئے کوئی تدبیر سوچی ؟

مکرجی :- ہاں۔ اس مطلب کے لئے مجھے دورے پر جانا ہوگا۔ ممکن ہے واپسی میں تین چار مہینے لگ جائیں۔ اتنی مدّت تک ہمارا (centre ـــــ) سینٹر بغیر لیڈر کے نہیں رہنا چاہیئے ورنہ بہت سے کام خراب ہوجائینگے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو منڈل کا سردار مقرر کردیا جائے۔ تاکہ میری غیر حاضری میں سب کاموں کو اپنی ذمہ داری سے انجام دے۔

ایک شخص :- تو پھر جسے آپ پسند کریں مقرر کردیجئے۔

مکرجی :- جہاں تک بھروسے اور لیاقت کا سوال ہے میرے نزدیک آپ سب لوگوں کا مرتبہ برابر ہے مگر دیش سیوک بننے کے بعد نمبر ۱۱۱ ایک سو گیارہ نے جو قربانیاں کی ہیں انہیں دیکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ اگر آپ لوگ بھی پسند کریں تو انہیں کو اس مدّت کیلئے سردار مقرر کردیا جائے۔

سب۔ ہمیں آپکی رائے سے بالکل اتفاق ہے۔

امر سنگھ :- (کھڑے ہوکر) میں سب بھائیوں کا اور سردار کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے یہ عزّت دی گئی۔

مکرجی :- اچھا یہ مسئلہ تو طے ہوا۔ اب ایک سوال اور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت کی ضرورتوں کیلئے ہمارے پاس کافی روپیہ موجود ہے لیکن پھر بھی ہمیں اس طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ آج کل پولیس چونکہ بڑی سرگرمی سے ہماری جماعت کا پتہ لگانے میں مصروف ہے اس لئے کچھ دنوں قتل، خون اور اسی قسم کے دوسرے ہنگاموں سے دُور رہکر زیادہ آسان اور خاموش طریقوں سے روپیہ حاصل کرنا بہتر ہے۔

ایک شخص :- خاموش اور آسان طریقہ کیا ہوسکتا ہے ؟

مکرجی :- سُنیئے میں بتاتا ہوں۔ رائے بہادر بنارسی داس کو تو آپ سب لوگ جانتے ہیں ؟

ایک شخص :- شہر میں اُنہیں کون نہیں جانتا۔

مکرجی :- ہاں وہ ہمارے شہر کے سب سے بڑے رئیس اور کروڑپتی آدمی ہیں اُنکے صرف ایک ہی بچہ ہے۔ اگر اُسے (kidnap کرکے) کڈنیپ کردیا جائے تو چالیس پچاس ہزار روپیہ مل جاتا

معمولی بات ہے۔

ایک شخص :۔ مگر خود بچّہ کا کڈنیپ کرنا تو سہل نہیں جس وقت گھر سے نکلتا ہے اس کی حفاظت کیلئے کتنے ہی آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مکر جی :۔ یہ سب پہلو میں نے سوچ لئے ہیں۔ بچّہ کی نرس ایک جوان چھوکری ہی نمبر ۱۲ نے اُس سے دوستی کرلی ہی ہر شام کے وقت وہ بچہ کو ہوا کھلانے اور باغ میں ٹہلنے کے لئے نکلتی ہے۔ نمبر ۱۲ سے ملنے کیلئے باغ کی باونڈری تک آ جائیگی۔ بچّہ بھی ساتھ ہوگا۔ باقی کام آسان ہے۔ نمبر ۱۲ کے علاوہ دو آدمیوں کی اور ضرورت ہوگی۔

ایک شخص :۔ جسے آپ حکم دیں وہ چلا جائے۔

مکر جی :۔ نمبر ۵ اور نمبر ۱۰۔

دونوں :۔ (کھڑے ہوکر) بہت بہتر

موہنی کا مکان

(پریم سنگھ داخل ہوتا ہے)

پریم :۔ (ملازمہ سے) بائی جی ہیں۔

مُلازمہ :۔ جی ہاں۔

پریم سنگھ :۔ کیا کر رہی ہیں۔

مُلازمہ :۔ اُدپر کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔

پریم سنگھ :۔ اچھا ہمارے آنے کی اطلاع کردو۔

ملازمہ :۔ بہت اچھا۔ (جاتی ہی۔ جسوقت زینے پر چڑھنے لگتی ہے پریم اُسے پھر آواز دیتا ہے۔)

پریم سنگھ :۔ مگر دیکھو۔

مُلازمہ پلٹتی ہے۔

پریم سنگھ :۔ اطلاع کی ضرورت نہیں۔ ہم خود چلے جائینگے۔

دبے پاؤں زینہ پر چڑھتا ہی اور آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوتا ہی۔ موہنی میز پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ پریم سنگھ آہستہ آہستہ جاکر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے۔ موہنی تڑپ کر اُس کی گود سے نکل جاتی ہی۔

پریم سنگھ :۔ موہنی دیوی مجھے معاف کرنا۔ میں بالکل بے اختیار ہوگیا تھا جو بالکل دیوانوں کی طرح تمہیں آغوش میں لے لیا۔

موہنی :۔ (بیتابانہ پریم سنگھ کی طرف بڑھتی ہی اور شرمائے ہوئے انداز سے) پریم سنگھ جی! (یہ کہکر پریم سنگھ کا ہاتھ تھام لیتی ہے)

پریم سنگھ :۔ یہ کیا لکھا جا رہا تھا۔

موہنی :۔ کچھ نہیں (یہ کہہ کر میز کی طرف بڑھتی ہی اور خط اُٹھاکر چاک (دو ٹکڑے) کرڈالتی ہے۔

پریم سنگھ :۔ شاید کوئی راز کی بات ہی۔ معاف کیجئے گا میں نے تو یونہی بے خیالی میں پوچھ لیا تھا۔

موہنی :۔ (گھبراکر) نہیں پریم سنگھ جی۔ راز کیسا۔ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔

پریم سنگھ :۔ میرے دیکھنے کی چیز ہوتی تو آپ اسے پھاڑ ہی کیوں ڈالتیں۔

موہنی :۔ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں (کاغذ پریم سنگھ کی طرف بڑھاکر) میری خاطر سے دیکھ لیجئے۔

پریم سنگھ :۔ زبانی ہی بتادیجئے۔

موہنی :۔ نہیں۔ میں نہیں بتاؤنگی۔

پریم سنگھ :۔ آخر کیا ہرج ہے۔

موہنی :۔ اور آپ خود ہی پڑھ لیں تو کیا ہرج ہے۔

پریم سنگھ خط لیکر باآواز بلند پڑھتا ہے :۔

"پریم۔ تم نے تو کہا تھا کہ اب جلد ملاقات ہوگی۔ اب میں

تمہارے خط کا انتظار نہیں کرونگا۔ مگر تمہیں اپنی مصروفیتوں میں شاید ایک........

موہنی :۔ (پریم سنگھ کے ہاتھ سے خط چھین کر) بس اب نہیں پڑھنے دونگی۔

پریم سنگھ بیتاب ہوکر دونوں ہاتھ موہنی کے کاندھوں پر رکھدیتا ہے۔ پھر دونوں ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔

پریم سنگھ :۔ موہنی، یہ تین دن اور تین راتیں جس بےچینی اور بیقراری سے کٹی ہیں، بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ خاصکر کل سے تو میری بُری حالت تھی۔ تڑپ تڑپ کے رات کاٹی ہے۔ مگر یہ نوکری کمبخت غلامی ہے، لاکھ چاہا کہ آؤں مگر نہ آسکا۔

موہنی :۔ (نظر نیچی کئے ہوئے) پریم سنگھ جی۔ کیا واقعی آپکو میرا اتنا خیال ہے۔ کیا میں ان سب باتوں کا یقین کرلوں! ایک مرد جسے خدا نے حُسن، دولت، عزت، جوانمردی سب ہی کچھ دیا ہے وہ ایک بے یارو مددگار اور گمنام لڑکی سے بھلا کیوں محبت کریگا۔

پریم سنگھ :۔ موہنی، میں تمہاری محبت کے قابل تو نہیں مگر ایشور جانتا ہے کہ تمہاری محبت کچھ اس طرح میری رگ رگ میں.....

موہنی :۔ (بیتابانہ) "آہ۔ پریم پیارے" کہکر پریم سے ہم آغوش ہوجاتی ہے۔ پریم اُسے زور سے بھینچ لیتا ہے اور اُس کے لبوں کو چومتا ہے۔ موہنی پر ایک بیخودی سی طاری ہوجاتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کرلیتی ہے اور اُس کا سر پریم کے بازو پر پیچھے کو ڈھلک جاتا ہے۔ ایک منٹ کے بعد دونوں جُدا ہوتے ہیں اور پھر گفتگو شروع ہوتی ہے۔

پریم سنگھ :۔ اُس دن کے بعد پھر تو مکرجی سے بھینٹ نہیں ہوئی۔ خُدا جانے کیوں مجھے اُس شخص سے دلی نفرت ہوگئی ہے۔

موہنی :۔ (کچھ سوچ رہی ہے۔ پریم کے سوال کا جواب نہیں دیتی، پھر کہتی ہے) آہ پریم اگر تمہیں معلوم ہوجائے کہ اس تین دن میں میں کیسی بیقرار رہی ہوں۔ ایک ایک گھڑی کس طرح ایک ایک برس کی مانند گذاری ہے۔ جیسے کوئی قید میں ہو۔ تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں میرے حال پر ترس آجائے اور تم مجھ سے محبت کرنے پر مجبور ہوجاؤ۔

(موہنی کی آواز بھرا جاتی ہے۔ ذرا دیر خاموش رہتی ہے اس کے بعد) ہاں تو پریم، تم مجھے میرے دشمنوں سے بچاؤ گے۔ مجھ بیکس کی مدد کروگے؟ مجھے اپنی حفاظت میں لے لوگے؟ (آنسو گرنے لگتے ہیں۔)

پریم سنگھ :۔ او۔ جان۔ خُدا کیلئے...... مجھے سخت تکلیف ہورہی ہے۔ بتاؤ تو آخر تمہارے دشمن ہیں کون لوگ؟

موہنی :۔ ایک تو یہی، مکرجی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص دن رات میری فکر میں لگا رہتا ہے۔ کل صبح میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی، راستہ میں ملگیا۔ کہنے لگا کہ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے۔ میں نے کہا مجھے فرصت نہیں۔ اور میں چل پڑی۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا کہ تمہیں میری بات سُننی ہوگی۔ میں نے کہا تم اپنا راستہ لو نہیں تو میں ابھی پولیس کو بُلاتی ہوں۔ پولیس کا نام سُنکر گھبرا گیا اور کہنے لگا کہ اچھا میں تو جاتا ہوں مگر اس بدسلوکی کا نتیجہ بھی دیکھ لینا۔ بس جب سے میرا دل لرز رہا ہے۔ خُدا جانے یہ بدمعاش کیا کریگا۔

پریم سنگھ :۔ نہیں موہنی تم بالکل فکر نہ کرو۔ وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔

موہنی :۔ (کچھ سوچکر) اور دوسرا دشمن۔ خود میرے چچا ڈاکٹر منڈن۔

پریم سنگھ :۔ چچا۔ تم اُسے چچا کہتی ہو۔ موہنی، آدم کُش خونخوار کہو

(یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالکر زہر کی سفید شیشی نکال کر موہنی کو دکھاتا ہے) اپنی بیوی کی معرفت اس بدمعاش نے مجھے زہر دلوا ہی دیا تھا۔ وہ تو یہ کہو کہ چمپا کو مجھ پر رحم آگیا۔

موہنی :- (نہایت گھبراکر شیشی پریم سنگھ کے ہاتھ سے لیتی ہے اور دیکھتی ہے۔ لیبل پر "زہر" لکھا ہے) آہ۔ یہ تو کوئی بڑا قاتل زہر معلوم ہوتا ہے۔ کیا چمپا نے تمہاری جان بچائی؟

پریم سنگھ :- ہاں چمپا نے۔

موہنی کچھ کہنا چاہتی ہے کہ یکایک ملازمہ گھبرائی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔

بی بی۔ بی بی۔ ڈاکٹر صاحب آگئے۔

پریم سنگھ موہنی کی طرف دیکھتا ہے۔ موہنی نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھکر پریم سنگھ کا ہاتھ پکڑ کے :-

موہنی :- پریم اس کمرہ میں آجاؤ۔

پریم سنگھ :- مگر۔۔۔۔۔۔

موہنی اُسے کھینچتی ہے اور زبردستی اُس کمرے میں داخل کر دیتی ہے اور کہتی ہے :-

موہنی :- پیارے میری رسوائی کا خیال کرو۔ (پھر خود کرسی پر بیٹھکر کتاب دیکھنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر ٹنڈن داخل ہوتا ہے)

موہنی :- (بڑے احترام سے) نمشکار، چاچا جی۔ مزاج کیسا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- جیتی رہو بیٹی۔ بہت دنوں سے تمہیں دیکھا نہ تھا۔ ملنے کو بہت جی چاہ رہا تھا مگر کاموں میں اُلجھا رہا۔ اِدھر مریضوں کا ہجوم۔ اُدھر سا سائٹیوں کا کام۔ سر کھجانے کی مہلت نہ تھی۔ آج جیسے تیسے وقت نکالا۔ تم تو اچھی ہو؟

موہنی :- ہاں چاچا جی آپ کی دُعا سے اچھی ہوں۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (کچھ دیر سوچکر) موہنی آج تمہارے لئے ایک بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے ایک نہایت دولتمند آدمی سے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ کل صبح آٹھ بجے میں آکر تمہیں لیجاؤنگا۔ شادی کی رسم میرے مکان پر ادا ہوگی۔

موہنی ٹنڈن کی یہ باتیں سُنکر بالکل بدحواس ہوجاتی ہے۔ کتاب کھولکر پڑھنے لگتی ہے تاکہ ٹنڈن اس کی حالت کا کچھ اندازہ نہ کرسکے۔ ٹنڈن جواب کا انتظار کرتا ہے۔ جب کچھ جواب نہیں ملتا تو کہتا ہے :-

ٹنڈن :- موہنی تم جانتی ہو کہ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں، رشتہ کے علاوہ قانوناً بھی میں تمہارا سرپرست ہوں۔ اور تمہارے متعلق ہر بات کے طے کرنے کا مجھے پورا اختیار حاصل ہے۔

موہنی اب بھی کچھ جواب نہیں دیتی۔ برابر کتاب دیکھے جاتی ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- بیٹی میں تمہارے اس شرم ولحاظ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ تمہارا ہونے والا شوہر کیسا نیک، شریف اور معزز آدمی ہے۔

پھر کچھ دیر چُپ رہتا ہے۔ موہنی اب بھی خاموش ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- موہنی تم سُنتی نہیں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کل صبح آٹھ بجے تمہیں میرے یہاں پہنچ جانا چاہیئے۔ سمجھ گئیں۔

موہنی :- (برافروختہ ہوکر کتاب کو پٹک دیتی ہے) چاچا جی میں بہری نہیں ہوں۔ سب کچھ میں نے اچھی طرح سُن لیا اور آپ بھی میرا جواب سُن لیجئے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر ٹنڈن :- (جھلّا کر) کیا کہا۔ ایسا نہیں ہوسکتا (میز پر گھونسا مارکر) ایسا ضرور ہوگا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ کل صبح تمہیں یہ کام کرنا ہی ہوگا۔

موہنی:۔ (حقارت آمیز تبسّم کے ساتھ) آپ کو میرے ساتھ اس قدر ہمدردی کب سے ہو گئی جو......

ٹنڈن کچھ جواب دینا ہی چاہتا ہے کہ برابر کے کمرہ میں سے چینی اور شیشہ کے برتنوں کے زمین پر گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔

ٹنڈن (گھبرا کر) کمرہ کی طرف جاتا ہے۔ دروازہ کھولنا چاہتا ہے مگر دروازہ اندر سے بند ہے۔

ٹنڈن:۔ (موہنی سے) باہر سے بھی تو اس کمرہ کا دروازہ ہے نا؟ موہنی سر کے اشارہ سے "ہاں" کہتی ہے۔ ٹنڈن باہر جاتا ہے۔ پریم سنگھ اس کمرہ میں خاموش کھڑا دروازہ سے کان لگائے ان دونوں کی باتیں سنتا ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ ٹھٹک کر ذرا پیچھے ہٹتا ہے تو میز سے ٹکر لگتی ہے اُس پر چینی اور شیشہ کے برتن رکھے تھے۔ وہ سب زمین پر گر پڑتے ہیں اور چُور چُور ہو جاتے ہیں۔ پریم جب سنتا ہے کہ ٹنڈن دوسرے دروازہ سے آ رہا ہے تو فوراً بیساور دروازہ کھول موہنی کے کمرہ میں آ جاتا ہے۔ موہنی اس ہنگامہ سے سخت بدحواس ہے اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔

پریم سنگھ:۔ (آہستہ سے) موہنی تم اپنے چچا سے اتوار تک کی مہلت مانگ لو اور شادی کا وعدہ کر لو۔ باقی میں دیکھ لونگا۔

یہ کہہ کر موہنی کا ایک پیار لیکر خاموشی کے ساتھ مکان سے نکل جاتا ہے۔ ٹنڈن اس کمرہ کا کونا کونا دیکھتا ہے مگر کوئی وہاں موجود نہیں۔ پھر جس دروازے سے گیا تھا اسی دروازہ سے واپس آتا ہے۔

ٹنڈن:۔ تعجب ہے۔ یہ کون تھا جس نے تمام برتنوں کا چُورا کر دیا۔

موہنی:۔ میری بدقسمتی ہے اور کیا۔ بیٹھے بٹھلائے مفت میں اتنا نقصان ہو گیا۔ اب یہ چیزیں مجھے کہاں نصیب ہونگی۔

ٹنڈن:۔ اوہ۔ یہ ہے کیا بلا۔ تمہارا شوہر اس سے دس گنا زیادہ اور بہتر تمہیں خرید دیگا۔

موہنی:۔ چاچا جی۔ کیا واقعی وہ بہت مالدار آدمی ہیں؟

ٹنڈن:۔ (نہایت مسرور ہو کر) ہاں بیٹی۔ ڈھائی ہزار روپیہ مہینہ تو انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ جائداد کی آمدنی الگ ہے۔ لکھپتی آدمی ہیں۔

موہنی:۔ (مصنوعی حیرت سے) لکھپتی آدمی ہیں! اچھا چاچا جی۔ آپ جیسا حکم دینگے میں ویسا ہی کرونگی۔

ٹنڈن کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

موہنی:۔ مگر آپ نے اُن کا نام نہیں بتایا۔

ٹنڈن:۔ (مسکرا کر) میرا خیال ہے کہ تم اُنہیں جانتی ہو۔ شاید باغ میں ایک دفعہ وہ تم سے مل بھی چکے ہیں۔

موہنی:۔ (گھبرا کر) کیا آپ کا مطلب مکر جی سے ہے؟

ٹنڈن:۔ تم ٹھیک سمجھیں۔

موہنی سخت پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لیکر ایک آہ کرتی ہے اور کچھ دیر خاموش رہتی ہے سوچتی ہے پھر کہتی ہے۔

اچھا چاچا جی، ایک میری عرض ہے۔ میں شادی کیلئے تیار ہوں مگر مجھے اتوار تک کی مہلت دیجئے۔ اس کے بغیر ناممکن ہے۔

ٹنڈن:۔ (کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر کہتا ہے) خیر اس میں کوئی ہرج نہیں لیکن وعدہ کرو کہ اتوار کے دن تم بخوشی اس رسم کو ادا ہونے دوگی۔

موہنی:۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔

ٹنڈن:۔ (کرسی سے کھڑے ہو کر) تو بس ٹھیک ہے۔

موہنی کی پیشانی کا بوسہ لیکر روانہ ہو جاتا ہے۔

پریم سنگھ اپنے کمرہ میں بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے کبھی مسکرا دیتا ہے کبھی اُس کا چہرہ نہایت غمگین ہو جاتا ہے کبھی جماہیاں لیتا ہے۔ گویا رات بھر نہیں سویا ہے۔ نوکر آکر خبر دیتا ہے کہ ایک چھوکری آئی ہے۔

پریم سنگھ:۔ یہاں بھیجدو۔

(چمپا داخل ہوتی ہے)

چمپا:۔ نمسکار۔ بابو جی۔

پریم سنگھ:۔ (نہایت خوشی کے لہجہ میں) چمپا۔ کہو آج ادھر کیسے بھول پڑیں۔

چمپا:۔ ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی مسٹر مکرجی کے یہاں گئے ہیں۔ چلتے وقت کچھ ضروری کاغذات میز پر بھول آئے۔ بائی جی نے کہا کہ ابھی اُنکے پاس پہونچا دو۔ ساتھ ہی آپ کی خبر معلوم کرنے کو بھی کہدیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ آپکے دشمن کبکے اس دُنیا سے سدھار چکے ہونگے۔ بابو جی، انہیں کسی طرح معلوم نہ ہونے پائے کہ اس معاملہ میں میرا بھی ہاتھ ہے۔

پریم سنگھ:۔ نہیں چمپا تم بالکل اطمینان رکھو۔ اور یہ کاغذات کیسے ہیں؟ میں دیکھ سکتا ہوں؟

چمپا:۔ (کاغذات پریم کی طرف بڑھاکر) دیکھ لیجئے۔

پریم سنگھ بغور کاغذات کو دیکھتا ہے اور یکایک اسکے مُنہ سے نکلتا ہے (Good God) گڈ گاڈ۔ پھر کچھ پڑھتا ہے۔ پھر کچھ سوچتا ہے۔ پھر سر اُٹھا کر چمپا سے:۔

پریم سنگھ۔ میں ان میں سے ایک کاغذ خریدنا چاہتا ہوں۔ بولو کیا قیمت لوگی؟

چمپا:۔ بابو جی کیا آپ مجھے بنا رہے ہیں۔

پریم سنگھ:۔ نہیں چمپا۔ دل لگی نہیں۔

چمپا:۔ (حیران ہوکر) کیا سچ مچ آپ ان میں سے ایک کاغذ خریدنا چاہتے ہیں؟

پریم سنگھ:۔ سچ مچ۔

چمپا:۔ (مسکراکر) اچھا کتنے میں لیجئے گا۔

پریم سنگھ:۔ جو قیمت تم مانگو۔

چمپا:۔ نہیں آپ بتا دیجئے۔

پریم سنگھ:۔ ننلو روپے۔

چمپا:۔ (خوشی سے بیتاب ہوکر) ننلو روپے! آپ ننلو روپے مجھے دیدینگے۔

پریم سنگھ:۔ بیشک۔ اسی وقت۔

چمپا:۔ مگر میں بائی جی کو کیا جواب دونگی؟

پریم سنگھ:۔ تمہیں اب وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے اگر تم پسند کرو تو میرے یہاں رہ سکتی ہو۔

چمپا:۔ اور کوئی اونچ نیچ ہوگی تو آپ سنبھال لیں گے۔ میرے اوپر تو کوئی بات نہیں آنے گی؟

پریم سنگھ:۔ نہیں۔ تم بالکل بیفکر رہو۔

چمپا:۔ (خوشی سے اُچھل کر) تو میں بھی تیار ہوں۔

پریم سنگھ ننلو روپے کے نوٹ نکالکر چمپا کے حوالے کردیتا ہے۔

مکرجی کا مکان

ڈاکٹر ٹنڈن سخت بدحواس داخل ہوتا ہے۔

ٹنڈن:۔ مکرجی غضب ہوگیا۔ جلد کوئی تدبیر کیجئے نہیں تو ہم سب کا خاتمہ ہے۔

مکرجی:۔ (حیران و پریشان ہوکر) آخر ہوا کیا۔

ٹنڈن:۔ وہ کاغذات گم ہوگئے۔

مکرجی :- (اور بھی گھبرا کر) کون سے کاغذات ؟

ٹنڈن :- وہی رپورٹ۔

مکرجی :- اوہ غضب۔ آخر گم کیسے ہو گئے ؟

ٹنڈن :- آج صبح یہاں آتے وقت میں نے وہ کاغذات بکس میں سے نکالے اور کوٹ پہنتے وقت جیب میں رکھنے کے بجائے وہیں میز پر بھول آیا۔ رستے میں خیال آیا۔ جیب میں دیکھا تو ندارد۔ فوراً گھر واپس گیا۔ لفافہ میز پر موجود نہ تھا۔ مسز ٹنڈن نے کہا "میں نے اس خیال سے کہ آپکو دوبارہ آنے کی تکلیف نہ ہو چمپا کے ہاتھ وہ کاغذات مسٹر مکرجی کے یہاں بھیجدئے۔" میں فوراً پلٹا۔ راستہ بھر چمپا کو دیکھتا ہوا آپکے یہاں آیا۔ آپکے دروازہ پر تالا پڑا دیکھکر پھر گھر واپس گیا مگر چمپا نہ یہاں پہنچی نہ وہاں۔ میں نے اور میرے نوکروں نے سارے دن اُسے تلاش کیا مگر کہیں کمبخت کا پتہ نہ چلا۔ نہ جانے اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

مکرجی :- چمپا کو اُن کاغذات کی اہمیت معلوم تھی ؟

ٹنڈن :- نہیں۔ اُسے کیا خود مسز ٹنڈن کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس لفافہ میں کیا ہے۔

مکرجی :- تب تو کچھ ایسی خوف کی بات نہیں۔ آپ موہنی کو میرے حوالے کر دیجئے۔ میں فوراً ہندوستان سے روانہ ہو جاؤنگا۔ پھر آپکے لئے کوئی اندیشہ نہیں۔

ٹنڈن :- موہنی سے تو میں رات مل لیا اور سب معاملہ طے ہو گیا اتوار کے دن صبح کو آپ کی شادی ہو جائیگی۔

مکرجی :- (بہت خوش ہو کر) ڈاکٹر ٹنڈن ! سچ تو یہ ہے کہ میں نے آپکی طرح محبت والے اور شریف انسان نہیں دیکھے۔ اچھا موہنی بخوشی راضی ہو گئی ؟

ٹنڈن :- ہاں بخوشی راضی ہو گئی۔

مکرجی :- شادی کے بعد میں فوراً ہی موہنی کو لیکر یہاں سے روانہ ہو جاؤنگا (بے انتہا خوش ہے۔)

ٹنڈن :- اچھا تو اتوار کے دن صبح کے ۹ بجے مع اپنے چند دوستوں کے میرے مکان پر پہونچ جایئے۔ مہمانوں کا زیادہ ہجوم نہ ہو۔

مکرجی :- نہیں۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔

ٹنڈن چلا جاتا ہے۔ مکرجی آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہے اور گنگنانے لگتا ہے۔

موہنی کا مکان

موہنی نہایت بیقرار نظر آتی ہے۔ کھڑکی کے باہر جھانک کر بار بار دیکھتی ہے۔ پھر یکایک رونے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔ موہنی اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے۔ پریم اُس کے گلے میں بانہیں ڈالکر پیار کرتا ہے۔ موہنی اُسی طرح بیٹھی رہتی ہے۔

پریم سنگھ :- (موہنی کا چہرہ غور سے دیکھکر) یہ کیا ؟ تم رو رہی تھیں ؟

موہنی :- رونے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اپنی آنکھوں کے سوا اور کسی پر بس نہیں چلتا۔

پریم سنگھ :- لیکن آخر اس کا سبب ؟

موہنی :- سبب ؟ ہاں ٹھیک تو ہے۔ آپکو اپنے کاموں میں کہاں خیال رہا ہوگا۔ لیکن میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ کل اتوار ہے۔ میری شادی یعنی موت کا دن۔ آپ ایسے گئے کہ خبر ہی نہ لی۔ اس مصیبت سے بچنے کا اب تو صرف ایک ہی رستہ ہے کہ آج رات کو کچھ کھا کے سو رہوں (یہ کہہ کر پھر اسکی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگتے ہیں۔ پریم اُسے اپنے آغوش میں لے کر آنسو پونچھتا ہے۔)

پریم سنگھ :- اچھا تو اس کے لئے آپ اتنا پریشان ہو رہی تھیں۔ (موہنی کے ہاتھ لیکر اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہے) موہنی! کل صبح تمہاری سب مصیبتوں اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تمہارے سب دشمن ایک ساتھ جیل کی اندھیری کوٹھریوں میں پڑے ہونگے۔ آج تو تمہارے لئے انتہائی خوشی کا دن ہے۔

موہنی :- میں تو کچھ نہیں سمجھی آپ کا کیا مطلب ہے؟

پریم سنگھ :- یہ بدمعاش ڈاکٹر ٹنڈن ہندوستان کے متعلق خفیہ رپورٹ مرتب کرکے مکرجی کی معرفت کسی بیرونی حکومت کو بھجوا تا رہا ہے۔ مکرجی اُس حکومت کا جاسوس اور ایجنٹ ہے۔ اسکے علاوہ اس مکرجی نے ایک زبردست سازشی پارٹی بنائی ہے۔ جو دلیش اور قوم کا نام لیکر چوری۔ ڈاکہ۔ قتل۔ خون اور اسی قسم کے تمام خطرناک کام کر رہی ہے۔ ملک کے امن و امان کو تباہ کر ڈالا ہے۔ کسی کی جان، مال، آبرو، کوئی چیز محفوظ نہیں۔ وہ خفیہ رپورٹ چمپا کی معرفت میرے ہاتھ آگئی اور میں نے اُسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس طرح ان سب شیطانوں کی تباہی کا پورا پورا بندوبست ہو گیا۔

موہنی :- چمپا کے ہاتھ وہ رپورٹ کہاں سے لگی؟

پریم سنگھ :- مکرجی کے یہاں جاتے وقت ڈاکٹر ٹنڈن وہ کاغذات اپنی میز پر بھول آیا۔ اسکی بیوی نے چمپا سے کہا کہ یہ کاغذات مکرجی کے یہاں ڈاکٹر صاحب کو دے آ۔ نہیں تو انہیں پھر آنا پڑیگا اور یہ بھی دیکھتی آنا کہ پریم سنگھ ابھی مرا یا نہیں۔ چمپا پہلے میرے یہاں آگئی، اکا غذات اُس سے لیکر میں نے دیکھے۔ اُن میں یہ رپورٹ بھی تھی جو میں نے تنلو روپے میں چمپا سے خرید لی۔

موہنی :- مگر اب چمپا بیچاری کا کیا حشر ہو گا۔

پریم سنگھ :- حشر کیا ہونا۔ اب وہ میری ملازم ہے۔

موہنی :- (مسرور ہو کر) یہ تو خوب ہوا۔

پریم سنگھ :- مگر اب تھوڑی سی تکلیف تمہیں بھی کرنی پڑیگی۔

موہنی :- وہ کیا؟

پریم سنگھ :- طے یہ پایا ہے کہ ایک ایسی مجلس ترتیب دی جائے جس میں یہ سب سازشی شریک ہوں اور ایک ساتھ گرفتار کرلئے جائیں۔

موہنی :- نقشہ تو خوب ہے مگر مجھے کیا کرنا ہو گا۔

پریم سنگھ (مسکرا کر) کل صبح مکرجی سے تمہاری شادی ہونا؟

موہنی :- آنہاں۔

پریم سنگھ :- بس تو قصہ تمام ہوا۔ تم حسب وعدہ اُس مجلس میں حاضر ہو جانا۔ باقی میرے ذمہ۔

موہنی :- پیارے مجھے تو اس بکھیڑے سے الگ ہی رکھو تو اچھا۔

پریم سنگھ :- موہنی میں خود اسے پسند نہیں کرتا مگر اسکے بغیر چارہ نہیں۔ ابھی میں نے تم سے بیان کیا کہ یہ سازش ملک کے رہے سہے امن و امان کو تباہ کردینے والی ہے اور ہر شخص کے جان و مال کے لئے اس سے خطرہ ہے۔ اس کا مٹانا دلیش کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے اسلئے ان غداروں کی گرفتاری میں تمہیں بھی مدد کرنی چاہیئے۔

موہنی :- جیسی آپکی خوشی۔

پریم سنگھ :- تم بالکل اطمینان رکھو۔ اب ہمارے راستے میں کوئی کانٹا باقی نہ رہیگا۔ اچھا اب چلتا ہوں۔ ابھی اور بھی کچھ کام باقی ہے۔

موہنی :- اچھا۔

پریم سنگھ۔ موہنی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیکر پیار کرتا ہے اور جلدی سے روانہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن کی کوٹھی

ٹھیک آٹھ بجے صبح مسٹر مکرجی معہ اپنے چند دوستوں کے ڈاکٹر ٹنڈن کے مکان پر پہونچ جاتا ہے۔ روپ کماری سب کا بڑے تپاک سے استقبال کرتی ہے اور ڈرائنگ روم میں لیجاکر بٹھاتی ہے۔

مکرجی:۔ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟

روپ کماری:۔ ابھی آتے ہیں۔ آپکی دُلہن کو لینے گئے ہیں۔

خوشی سے مکرجی کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اتنے میں ڈاکٹر ٹنڈن کی موٹر آ پہونچتی ہے۔ ٹنڈن اور موہنی اُترتے ہیں۔ موہنی نہایت سادہ لباس پہنے ہوئے ہے۔ مکرجی موٹر کی آواز سُنکر کمرہ کے باہر چلا جاتا ہے اور ڈاکٹر اور موہنی سے "آداب عرض" کرتا ہے۔ موہنی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے اور روپ کماری بھی اسکے ساتھ جاتی ہے۔ ٹنڈن اور مکرجی ڈرائنگ روم میں آتے ہیں۔ مکرجی اپنا اٹیچی کیس کھولکر چند زیورات نکالکر دیتا ہے۔

مکرجی:۔ یہ میری طرف سے موہنی دیوی کو پہنا دیجئے۔

پھر اپنے مُلازم کو آواز دیتا ہے۔

مکرجی:۔ فوددار! فوددار!

فوددار:۔ حضور۔

مکرجی:۔ وہ کپڑوں کا بکس لاؤ۔

فوددار فوراً ایک چھوٹا سا بکس پیش کرتا ہے۔

مکرجی:۔ (بکس کھولکر) یہ موہنی دیوی کی ساڑی اور باقی کپڑے ہیں۔ یہ بھی انہیں پہنا دیجئے۔

ٹنڈن:۔ بہت اچھا۔

یہ سب چیزیں نوکر کے ہمراہ دوسرے کمرہ میں بھیجتا ہے۔ جہاں موہنی اور روپ کماری بیٹھی ہیں۔ کپڑے اور زیورات دونوں کو دکھاتا ہے اور تعریف کرتا ہے۔ روپ کماری ایک ایک چیز کو اُٹھاکر دیکھتی ہے اور تعریف کرتی ہے۔ موہنی بالکل خاموش ہے۔ ٹنڈن واپس آجاتا ہے۔ اتنے میں میرج رجسٹرار صاحب بھی آجاتے ہیں اور اب یہ سب لوگ دوسرے کمرے میں جاتے ہیں۔ موہنی وہ سب زیورات اور وہی ساڑی پہنے دُلہن بنی شرمائی بیٹھی ہے۔ سب اُسے دیکھکر متاثر ہوتے ہیں۔

مکرجی کا ایک ساتھی:۔ (آہستہ، اپنے ہمراہی سے) چندو! یہ تو بالکل چھوکری ہے۔ یہ بڈھا اس سے بیاہ کریگا۔

چندو:۔ اس میں نئی بات کونسی ہے۔ ہمارے یہاں ہمیشہ ہی سے ایسا ہوتا آیا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن:۔ اچھا رجسٹرار صاحب۔ اب آپ اپنا کام شروع کیجئے۔

رجسٹرار:۔ بہت اچھا۔ (چپراسی سے) بھولو رجسٹر لاؤ۔

مکرجی نے آج خلاف معمول بہت زیادہ شراب پی لی ہے۔ نشے میں بالکل مدہوش ہو رہا ہے۔ یکایک کھڑا ہوجاتا ہے اور ٹنڈن سے مخاطب ہوکر کہتا ہے:۔

مکرجی:۔ ڈیر ڈاکٹر ٹنڈن۔ اگر وہ بدمعاش عورت چمپا ہاتھ آجائے تو اُسکی بوٹی بوٹی کرڈالنا۔

چمپا کا ذکر سُنکر موہنی بیچین ہوتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔

ٹنڈن:۔ (گھبراکر) اس وقت ان باتوں کا کیا موقع ہے۔

مکرجی:۔ نہیں۔ اگر آپنے اس کام میں ذرا سستی کی تو میں آپسے بھی ناراض ہوجاؤنگا۔

یکایک پاؤں کی چاپ سُنائی دیتی۔ سب کان کھڑے کرتے ہیں۔ پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔

مکرجی:۔ (پریم سنگھ سے) آپ کون صاحب ہیں؟

پریم سنگھ:۔ شاید آپ بھول گئے۔ اُس روز شام کو جب

آپ اپنی دُلہن کو کِڈنیپ (kidnap) کرا کے نئے باغ میں
آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔
مکرجی :۔ (دیوانہ وار اُٹھکر) بس خاموش۔ فوراً یہاں سے نکل جا۔
نہیں تو مارا جائیگا۔
ٹنڈن :۔ (پریم سنگھ سے) یہ شادی کی محفل ہے۔ میدان جنگ
نہیں۔ آپ نے کیسے تکلیف فرمائی۔
پریم سنگھ :۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ اس شادی کا انجام
بخیر نہ ہوا۔
مکرجی :۔ کیا بکتا ہے ؟
پریم سنگھ :۔ (ہاتھ اُٹھاکر) خاموش!
اسی لمحہ آٹھ پولیس والے داخل ہوتے ہیں۔ اُن کا افسر
آگے بڑھکر :۔
"عورتوں کے سوا آپ سب لوگوں کو میں سرکاری حکم
سے گرفتار کرتا ہوں" سب بدحواس ہوجاتے ہیں۔ موہنی پریم
کا ہاتھ پکڑ کے کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ مکرجی یہ دیکھکر ایک آہ
کرکے دھم سے گر پڑتا ہے۔ روپ کماری بھی حیران ہے صرف
"اچھا" اُسکے منہ سے نکلتا ہے۔ پولیس والے سب کو ہتھکڑیاں
پہنا دیتے ہیں۔ باہر لاری کھڑی ہے اس میں بٹھا کر سب کو
قیدخانے لیجاتے ہیں۔

پریم سنگھ کا مکان

پریم سنگھ کا چھوٹا بھائی اندر سنگھ اور اُسکی بوڑھی ماں۔
بڑھیا کرسی پر بیٹھی کچھ بُن رہی ہے۔ اندر سنگھ اپنی بندوق صاف
کررہا ہے۔ دیواری گھڑی پانچ بجاتی ہے۔
بڑھیا :۔ اندر! پریم اب تک نہیں آیا۔ صبح سے یہ وقت ہوگیا۔
نہ جانے سارا دن کہاں گذار دیا۔ چھٹی کے دن بھی گھر پر رہنا
نصیب نہیں ہوتا۔
اندر سنگھ :۔ اماں جی۔ اب آتے ہی ہونگے۔
اخبار بیچنے والے لڑکے کی آواز آتی ہے :۔
"ایک زبردست سازش کا انکشاف۔ کپتان پریم سنگھ
کا کارنامہ۔ سازشیوں کا سرغنہ گرفتار ہوگیا"
ماں بیٹے دونوں کان کھڑے کرتے ہیں۔ اندر سنگھ کچھ کہے
بغیر فوراً اپنی بندوق چھوڑ باہر نکل جاتا ہے۔ اور اخبار کا پرچہ
لیکر پڑھتا ہوا آتا ہے۔
بڑھیا :۔ کیا خبر ہے بیٹا ؟
اندر سنگھ پڑھکر سناتا ہے۔
"ایک زبردست سازش کا انکشاف۔ کپتان پریم سنگھ
کا کارنامہ۔ سازشیوں کا سرغنہ گرفتار ہوگیا۔ کچھ مدت سے
ایک انقلابی جماعت مُلک میں بڑی سرگرمی سے کام کررہی ہے۔
یہ لوگ مُلک اور قوم کا نام لیکر بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان
کو اپنے گروہ میں شامل کرتے ہیں اور اُن سے طرح طرح کے
خطرناک کام لیتے ہیں۔ تفصیل ابھی معلوم نہیں مگر سُنا جاتا
ہے کہ پچھلے دنوں سیٹھ کُندن لال کے یہاں جو ڈاکہ پڑا تھا وہ
انہیں لوگوں کا کام تھا اور دیوالی کے موقع پر بم کا جو حادثہ
ہوا تھا اُس کے بھی یہی لوگ ذمہ دار ہیں۔ دولتمندوں کو لوٹنا
اور غریبوں کی تھوڑی بہت مدد کرنا یہ ان لوگوں کا شغل رہا
ہے، دوسری حکومتوں سے خفیہ سازباز بھی رکھتے ہیں۔ اور
پوشیدہ طور پر ہر قسم کی اطلاعیں ہندوستان کے متعلق یہ
لوگ دوسری حکومتوں کو بھیجتے تھے۔ کپتان پریم سنگھ نے
اس سازش کا پتہ لگایا اور آج صبح جبکہ اس جماعت کا سرغنہ
مکرجی نامی، ڈاکٹر ٹنڈن کی نوجوان بھتیجی موہنی دیوی سے
شادی کی غرض سے اپنے چند ساتھیوں سمیت اُن کے مکان پر
پہونچا اور شادی کی رسم ادا ہونے ہی والی تھی کہ پولیس نے

چھاپا مارا اور سب کو گرفتار کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ٹنڈن جو شہر کے مشہور ڈاکٹر اور پبلک ورکر ہیں وہ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔"

ماں بیٹے دونوں خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنے میں پریم سنگھ داخل ہوتا ہے۔ موہنی اس کے ساتھ ہے۔ بڑھیا اُٹھکر پریم سنگھ کو گلے لگاتی ہے۔ پریم سنگھ اپنی ماں اور بھائی سے موہنی کا تعارف کراتا ہے۔

پریم سنگھ:۔ (ماں کی طرف اشارہ کرکے۔ موہنی سے) میری اماں (اندر سنگھ کی طرف اشارہ کرکے) میرا بھائی اندر سنگھ۔ (ماں اور بھائی سے مخاطب ہوکر موہنی کی طرف اشارہ کرکے) مس موہنی دیوی (موہنی ہاتھ جوڑکر دونوں کو نمسکار کرتی ہے۔ بڑھیا اور اندر سنگھ دونوں موہنی کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں)

پریم سنگھ:۔ یہ آپ لوگوں سے ملنے کی بہت آرزومند تھیں۔

بڑھیا:۔ بیٹھو بی بی۔

موہنی آداب کرکے بیٹھ جاتی ہے۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔

پریم سنگھ:۔ اماں! اخبار میں آپ نے پڑھ لیا ہوگا کہ میں نے ہی ان کے چچا اور ہونے والے شوہر کو گرفتار کرایا اور شادی روکدی۔ آپ حیران ہونگی کہ پھر یہ میرے ساتھ کیسے چلی آئیں۔ اور آپ لوگوں سے ملنے کی کیوں آرزومند تھیں۔ دراصل ڈاکٹر ٹنڈن کی زبردستی سے۔ اِن کی مرضی کے بالکل خلاف یہ شادی ہو رہی تھی۔ میرے وقت پر پہونچ جانے سے یہ بلا ان کے سر سے ٹل گئی۔ اب میں نے ہمیشہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے کیونکہ اِن کا کوئی سرپرست اور والی وارث نہیں ہے۔

موہنی:۔ (پریم کی ماں سے) اماں جی۔ دراصل میں پریم سنگھ جی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے میری شادی نہیں روکی بلکہ میری جان بچائی ہے۔ میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ اس منحوس رسم کے ادا ہونے سے پہلے کچھ کھا کے سو رہونگی۔ دُنیا میں اب آپ لوگوں کے سوا میرا کوئی نہیں (یہ کہہ کر رونے لگتی ہے)

بڑھیا:۔ بیٹی۔ اب جی نہ کُڑھاؤ۔ بھگوان اچھا ہی کرے گا۔ جو کچھ مدد ہم سے ہوسکتی ہے اُسکے لئے ہم ہر وقت تیار رہیں۔

موہنی:۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے۔

اندر سنگھ:۔ بھیّا آپ نے تو ہمیں کچھ بھی نہ بتایا۔ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ اخبار میں تو کوئی تفصیل نہیں لکھی۔

پریم سنگھ:۔ اس کام کا میرے ہاتھ سے ہونا کچھ ایشور ہی کو منظور تھا ورنہ میں نے تو کوئی خاص کوشش نہیں کی تفصیل فرصت میں سُناؤنگا۔ مجھے ابھی پولیس کے دفتر واپس جانا ہے۔ خیال تھا کہ اماں پریشان ہونگی۔ اِدھر موہنی دیوی سے بھی وعدہ کیا تھا کہ تیسرا پہر کو آپ لوگوں سے ملا دونگا اِسلئے چلا آیا۔

بڑھیا:۔ بیٹا بھگوان تجھے کامیاب کرے اور اس سے زیادہ عزّت دے۔

پریم سنگھ:۔ (اندر سنگھ سے) ہاں اندر ایک ضروری بات تمہیں بتا دوں۔ پولیس کی تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان لوگوں کی ایک خاص علامت ہے یعنی (Red Cross) ریڈکراس (ایک گاڑھے کی ٹوپی دکھا کر جس پر ریڈکراس بنا ہے) اس طرح کی جماعت میں داخلہ کے وقت ممبروں کے نام ایک دوسرے کو نہیں بتائے جاتے۔ نہ بعد میں معلوم ہوتے ہیں۔ ہر شخص کا ایک نمبر مقرر کر دیا جاتا ہے اور اس علامت کے ذریعہ سے یہ لوگ اپنے ساتھیوں کو پہچان لیتے ہیں۔ کوئی اس علامت کو ٹوپی پر بنا لیتا ہے کوئی کوٹ پر۔ کوئی نکٹائی پر۔ کوئی بٹن یا انگوٹھی میں اور جب ایکدوسرے سے ملتے ہیں تو سلام کی جگہ "دیش سیوک کی جے"۔ کہتے ہیں۔ پولیس نے ابھی اِس بات کو پوشیدہ رکھا ہے کہ کہیں سازشی اس سے مطلع

ہوکر اس علامت کو علیحدہ نہ کردیں۔
موہنی :- (یکایک) دیکھنا پریم سنگھ جی۔ اس انگوٹھی میں بھی یہی نشانی بنی ہوئی ہے۔
پریم، اندر اور بڑھیا تینوں اس انگوٹھی کو دیکھتے ہیں۔
پریم سنگھ :- یہ شادی کے تحفہ والی انگوٹھی ہے نا؟
موہنی :- جی ہاں۔
پریم سنگھ :- ٹھیک ہے۔ اب آپ اسے پہنے ہی رہیے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے کوئی مفید کام نکلے۔ (ماں سے مخاطب ہوکر) اچھا تو اماں اب میں جاتا ہوں۔
موہنی بھی کھڑی ہوجاتی ہے۔
موہنی :- (پریم کی ماں سے مخاطب ہوکر) اماں جی آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوجایا کروں۔
بڑھیا :- بڑے شوق سے۔ جب تمہارا جی چاہے آسکتی ہو۔ تمہارا گھر ہے۔
موہنی :- میں آپکی بہت شکر گذار ہوں۔ اچھا آداب۔
بڑھیا :- جیتی رہو۔
موہنی :- (اندر سے) بھیّا آداب۔
اندر سنگھ :- آداب۔
پریم سنگھ اور موہنی دونوں جاتے ہیں۔ بڑھیا پھر بُننے لگتی ہے۔ اندر سنگھ پھر اپنی بندوق صاف کرنے لگتا ہے۔
اندر سنگھ :- (ماں سے) اماں۔ بھیّا ضرور موہنی دیوی سے شادی کرلیں گے۔
بڑھیا :- پھر کیا ہرج ہے بیٹا۔ ہمیں تو اُنکی خوشی سے خوشی ہے اور یہ سچ یہ ہے کہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔
اندر سنگھ :- ہاں یہ بات تو ہے۔

مدن لال (جسکے موٹر سے امر سنگھ کا باپ کُچل کر مر گیا تھا) اپنے بیڈ روم میں سلیپنگ سوٹ پہنے مسہری پر لیٹا ہے۔ انگڑائیاں لے رہا ہے آنکھیں کھولتا ہے۔ پھر بند کرلیتا ہے۔ یکایک کہیں قریب سے گانے کی آواز آتی ہے۔ مدن چونکتا ہے۔ آنکھیں ملتا ہے۔ جدھر سے آواز آرہی ہے اُدھر کان لگاتا ہے۔ گانے کی آواز برابر آرہی ہے۔ دو تین منٹ تک اسی طرح سُنتا رہتا ہے پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس جاکر ہمہ تن گوش ہوکر سُنتا ہے۔ پھر یکایک کسی خیال کے آجانے سے اپنی میز کی طرف پلٹتا ہے۔ دراز میں کوئی چیز تلاش کرتا ہے۔ نہیں ملتی۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈتا ہے۔ آخر ایک کرسی پر شال پڑی ہوئی ہے اُسے اُٹھا کر دیکھتا ہے وہاں ایک چمڑے کا بکس پڑا ہے۔ اُٹھاکر کھولتا ہے۔ اس میں دُوربین ہے۔ دُوربین لیکر فوراً پھر کھڑکی کی طرف پہنچتا ہے اور گانے والے کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گانے کی آواز برابر آرہی ہے۔ روپ کماری لپنے مکان کی دوسری منزل میں اپنے کمرہ میں بیٹھی تان پورے پر گا رہی ہے، مدن بابو اُسے دیکھکر اپنا ہونٹ کاٹتا ہے اور گانا سُن رہا ہے۔ اتنے میں گانے کی آواز بند ہوجاتی ہے۔ روپ کماری تان پورا رکھدیتی ہے اور رام داس کو آواز دیتی ہے۔
رامداس! چائے لاؤ۔
یہ کہہ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے۔ گانا بند ہوجانے کے بعد مدن فوراً برابر والے کمرہ میں جاتا ہے۔
مُنّو! مُنّو!!
مُنّو ابھی تک پلنگ پر پڑا سو رہا ہے۔ مدن اُسکو جھنجھوڑتا ہے۔
مُنّو! مُنّو!!
مُنّو فوراً کھڑا ہوجاتا ہے۔

منّو:- سرکار!

مدن:- جلدی اِدھر آؤ۔

منّو کو ساتھ لیکر مدن اپنے کمرہ میں آتا ہے۔ کھڑکی کے برابر کھڑا کر کے دُوربین اُسکے ہاتھ میں دیتا ہے۔

مدن:- سامنے دیکھو!

منّو دُوربین سے دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے:-

منّو:- واہ وا۔ کیا پیاری صورت ہے۔

مدن:- منّو! میں تو مر گیا۔

منّو:- سرکار وہ چیز ہی ایسی ہے۔

مدن:- ارے کمبخت تُونے اسکی آواز نہیں سنی۔ قیامت کا گلا ہے۔

منّو:- سرکار آپنے کہاں سُنا؟

مدن:- ارے میں تو سو رہا تھا۔ یکایک کان میں گانے کی آواز آئی بس آنکھ کُھل گئی۔ پھر میں نے دُوربین اُٹھا کے دیکھا۔ ابھی ابھی یہ تان پُوراسے گا رہی تھی۔ منّو سچ کہتا ہوں یہ اندو بالا، اور اختری اور کملا و ملا سب اس کے آگے ہیچ ہیں۔ ہائے کیا پیاری آواز ہے۔ ہمیں اس مکان میں آئے آج چار دن ہوگئے اور آج تک خبر نہ ہوئی کہ یہ آسمان کی حور بغل ہی میں موجود ہے۔ منّو! کچھ تدبیر کرو۔

منّو:- سرکار تدبیر تو کی جائے مگر.....

مدن:- مگر کیا؟

منّو:- مگر یہ کہ کوئی بازاری چیز تو ہے نہیں کہ روپیہ پھینکدیا اور خرید لی۔ وہ تو ایک بڑے معزز اور دولتمند آدمی کی بیوی ہے۔

مدن:- کس کی بیوی ہے؟

منّو:- ڈاکٹر ٹنڈن کی۔

مدن:- کون ڈاکٹر ٹنڈن۔ وہی تو نہیں جو دس پندرہ دن ہوئے سازش کے سلسلے میں پکڑا گیا ہے۔

منّو:- جی ہاں وہی۔

مدن:- تب تو اور بھی رستہ صاف ہے۔

منّو:- نہیں سرکار۔ یہ کام ایسا سہل نہیں۔

مدن:- منّو کچھ بھی ہو۔ یہ کام تو کرنا ہی ہوگا۔ میں تو بُری طرح مر گیا۔

ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ مدن سے مخاطب ہو کر آداب عرض ہے سرکار!

مدن:- آؤ پہلوان میں ابھی تمہیں بُلوانے ہی والا تھا۔

پہلوان:- بندہ خود ہی حاضر ہوگیا۔ فرمایئے کیا حکم ہے۔

مدن:- پہلوان آج تمہاری عقلمندی اور دوستی کا امتحان ہے۔

پہلوان:- سرکار! خادم اسی دن کیلئے ہوتے ہیں کہ وقت پر آقا کے کام آئیں۔ اسمیں جان بھی جائے تو پروا نہیں۔

مدن:- (انگلی سے اشارہ کر کے) جانتے ہو اِس مکان میں کون رہتا ہے؟

پہلوان:- نہیں سرکار مجھے تو نہیں معلوم۔

مدن:- یہ ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان ہے۔

پہلوان:- کون! وہی ڈاکٹر ٹنڈن جو سازش کے سلسلے میں پکڑا گیا ہے؟

مدن:- ہاں وہی۔ تم نے اُسکی بیوی کو دیکھا ہے!

پہلوان:- نہیں سرکار، میں نے تو نہیں دیکھا۔

مدن:- ہائے قیامت ہے قیامت۔ اور کہیں تم اس کا گانا سُن لو تو اپنی جانکی بائی اور زہرہ بائی اور گوہر جان سبکو بھول جاؤ۔

پہلوان:- سرکار سے کہاں مُلاقات ہوئی۔

مدن:- ایسے مُلاقات ہی ہو جاتی پھر کیا مشکل تھی۔ میں نے ابھی ابھی اُسے سامنے والے دروازے میں (اشارہ کر کے) کھڑے

دیکھا اور ذرا دیر پہلے وہ یہیں بیٹھی گا رہی تھی۔ بس دل تڑپ گیا میں تو بُری طرح مر گیا پہلوان۔ ملاقات کی کوئی تدبیر کرو نہیں تو میری جان پر بن جائیگی۔

پہلوان:۔ سرکار معاملہ تو بہت ٹیڑھا ہے مگر ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔

مدن:۔ وہ کیا؟

پہلوان:۔ دُرگا پُوجا کے بہانے سے سرکار ناچ اور ڈنر کا ایک جلسہ کریں اور اُس میں سب پڑوسیوں کو بلائیں۔ اس طرح تعارف ہو جائیگا بعد میں سَو رستے نکل آئیں گے۔

مدن:۔ اور اگر اُنہوں نے دعوت قبول نہ کی تو۔

پہلوان:۔ نہیں سرکار پہلے ہم اُن سے دعوت میں شریک ہونے کا وعدہ لے لیں گے بعد میں بندوبست کریں گے۔ بلکہ اس قصہ کو ابھی فیصل کئے دیتے ہیں، سرکار وہاں تشریف لے چلیں اور خود دعوت دیں۔ ممکن نہیں کہ وہ انکار کرسکیں۔

مُنّو۔ ہاں سرکار پہلوان کی رائے بالکل ٹھیک ہے۔

مدن:۔ تو پھر میں کپڑے پہن لُوں۔ اتنے تم معلوم کرلو کہ گھر پر ہیں کہیں باہر تو نہیں چلی گئیں۔

پہلوان:۔ اچھا سرکار۔

مُنّو اور پہلوان جاتے ہیں۔ راستہ میں:۔

پہلوان:۔ کہو دوست کیسی جڑی۔

مُنّو:۔ اُستاد قائل ہیں تمہاری حکمت کے۔ مگر بات تو جب ہے کہ کھیل ذرا لمبا چلے تو یاروں کا بھی کچھ ہاتھ ہو۔

پہلوان:۔ تم دیکھتے جاؤ۔ اب یہ احمق جاتا کہاں ہے۔

مدن تیار ہو جاتا ہے۔ اتنے میں پہلوان اور مُنّو واپس آجاتے ہیں۔

پہلوان:۔ سرکار ابھی وہ باہر نہیں گئیں۔

مُنّو، پہلوان اور مدن تینوں موٹر میں بیٹھکر برابر والی کوٹھی میں جاتے ہیں۔ اطلاع کراتے ہیں۔ نوکر ڈرائنگ روم میں لیجا کر بٹھاتا ہے۔ روپ کماری داخل ہوتی ہے۔ تینوں کھڑے ہو کر اُسے آداب عرض کرتے ہیں۔ وہ بھی جواب دیتی ہے۔

پہلوان:۔ آپ ہمارے راجہ مدن لال صاحب آف بنج پورہ ہیں۔

روپ کماری:۔ اچھا! آپ ہی نے یہ برابر والی کوٹھی لی ہے؟

مدن:۔ جی ہاں۔

روپ کماری:۔ تشریف رکھئے۔

سب بیٹھ جاتے ہیں۔

روپ کماری:۔ جناب نے کیسے تکلیف فرمائی۔

مدن:۔ میں آپکو تھوڑی سی تکلیف دینے آیا ہوں۔

روپ کماری:۔ فرمایئے۔

مدن:۔ بات یہ ہے کہ دُرگا پُوجا کے موقع پر ہر سال ہمارے یہاں بنج پورہ میں ناچ گانے کا جلسہ ہوا کرتا ہے۔ اب جو نکہ میں تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں آیا ہوا ہوں اس لئے خیال ہے کہ جلسہ یہیں کرلیا جائے۔ دراصل یہ ایک خاندانی رسم ہے اور پُشتوں سے ہوتی چلی آئی ہے اس لئے میں اسے بند کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہم لوگ یہاں پردیسی ہیں اور جب تک ہمارے سب پڑوسی

روپ کماری گھنٹی بجاتی ہے۔ راماداس آتا ہے
روپ کماری:۔ سگرٹ لاؤ۔
راماداس سگرٹ لاتا ہے۔

شریک نہ ہونگے۔ جلسہ بالکل بے لُطف رہے گا۔

روپ کماری خود راجہ صاحب کو سگرٹ پیش کرتی ہے۔ راجہ صاحب "شکریہ" کہہ کے سگرٹ لے لیتے ہیں۔ روپ کماری ڈبّہ میز پر رکھدیتی ہے اور مُنّو اور پہلوان سے کہتی ہے کہ "آپ بھی شوق فرمایئے"۔ دونوں ایک ایک سگرٹ لے لیتے ہیں

اِس لئے آپ سے عرض ہے کہ پرسوں شام کو ہمارے یہاں تشریف لائیے اور ہمیں شکریہ کا موقع دیجئے۔

روپ کماری :- بہت اچھا۔ میں حاضر ہونگی۔

مدن :- مگر شب کا کھانا بھی آپکو وہیں کھانا ہوگا۔

روپ کماری :- اِس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔

مدن :- تکلف تو کچھ نہیں لیکن اگر آپ اس حقیر دعوت کو قبول کرلیں گی تو مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔

روپ کماری :- آپکی خوشی اسی میں ہو تو مجھے کوئی عذر نہیں۔

مدن :- بڑی مہربانی۔

پہلوان :- ہم لوگ آپکے بہت شکر گذار ہیں۔

روپ کماری :- واہ صاحب اسمیں شکریہ کی کونسی بات ہے۔

منّو :- (پہلوان سے) پڑوسی ہونے کی حیثیت سے آخر ہمارا بھی تو آپ پر کچھ حق ہے۔

روپ کماری :- ضرور۔

مدن :- تو اب اجازت ہے۔

روپ کماری :- بہت اچھا۔

مدن :- آداب۔

روپ کماری :- آداب۔

منّو اور پہلوان :- آداب۔

موٹر میں بیٹھکر اپنی کوٹھی میں واپس آتے ہیں۔

مدن :- پہلوان دیکھا؟

پہلوان :- ہاں سرکار دیکھا۔ سرکار کا انتخاب پھر ایسا ویسا تو نہیں ہوتا۔

مدن :- اور اخلاق کیسا اچھا ہے۔

منّو :- کیا بات ہے اخلاق کی۔

پہلوان :- مگر ایک بات میں کہونگا۔ سرکار کے قدموں کی قسم بار بار سرکار کو میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آخر ایسے سجیلے جوان بھی تو روز روز دیکھنے میں نہیں آتے۔

مدن :- اب لگے تم مجھے بنانے۔

منّو :- نہیں سرکار، یہ تو پہلوان نے سچ کہا۔ جس وقت اُس نے سگرٹ سرکار کے سامنے پیش کیا اُس وقت سرکار دیکھتے کہ کس انداز سے اُس نے سرکار کو دیکھا۔

مدن :- (مسکراکر) اور تم سمجھتے ہو کہ میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ ارے میں تو اُس کی ایک ایک ادا کو تاڑ رہا تھا۔ اچھا پہلوان۔ اب یہ کھانے اور گانے والے کا انتظام سب تمہارے ذمہ ہے۔

پہلوان :- سرکار سب چٹکی بجاتے میں ہوجائیگا۔ میں ابھی جاکر دو طائفوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ اور کھانے کے لئے فرپو کمپنی کو ٹھیکہ دیدینگے۔

مدن :- اچھی بات ہے۔ کتنا روپیہ درکار ہوگا!

پہلوان :- بس یہی کوئی سات آٹھ سو روپیہ میں سب انتظام ہوجائیگا (مدن نوٹ نکالکر دیتا ہے۔ پہلوان نوٹ لے کر منّو کو دیتا ہے اور کہتا ہے :-)

پہلوان :- لو بھئی منّو یہ روپیہ تم رکھو اور حساب بھی تم ہی رکھنا۔ حساب کتاب سے میری جان اُلجھتی ہے۔

منّو روپیہ لے لیتا ہے۔

مدن :- تو حساب کتاب کی ضرورت ہی کیا ہو۔ کسی غیر کا معاملہ ہے! جتنا اُٹھیگا اُٹھ جائیگا۔

پہلوان :- نہیں سرکار۔ حساب جَوجَو بخشش سوسو۔

دونوں سلام کرکے چلے جاتے ہیں۔

Royal Bakery رایل بیکری

سازشی جمع ہیں۔

امر سنگھ :- جو صورت بھی ہو۔ سردار کا چھڑانا ہمارا فرض ہے۔

چاہے اس میں چند جانیں ہی کیوں نہ جائیں۔

ایک:۔ لیکن فقط جان دیدینے سے کیا نتیجہ اگر ہم سردار کو نہ چھڑا سکیں، جان دینے والے ہمارے پاس کافی ہیں، لیکن ہتھیار تو نہیں۔

امر سنگھ:۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ سردار کی گرفتاری سے ساری اسکیمیں تباہ ہوگئیں ورنہ اب تک ہتھیاروں کی کیا کمی ہوتی۔

دوسرا:۔ اگر کافی قیمت دی جاتے تو ہتھیار آج بھی جتنے چاہیں مل سکتے ہیں۔

ایک:۔ لیکن اس وقت زیادہ روپیہ بھی تو ہم خرچ نہیں کرسکتے۔

امر سنگھ:۔ راجے بہادر بنارسی داس کے بچّے کو (Kidnap) کڈنیپ کرنے کی اسکیم آج تک یونہی پڑی ہوئی ہے۔ کیوں اُسی پر عمل نہ کیا جائے۔

دوسرا:۔ بات تو ٹھیک ہے۔

ایک:۔ ہاں اگر یہ تدبیر چل گئی تو سب کام درست ہوجائینگے۔

امر سنگھ:۔ تو پھر آج ہی اُسکے لئے دن مقرر کردینا چاہیئے۔

مسٹر نمبر ۱۲ آپ کب آسانی سے اسکا بندوبست کرسکیں گے۔

نمبر ۱۲:۔ کل بتا سکونگا۔

امر سنگھ:۔ اچھی بات ہے۔

راجہ مدن لال کے یہاں ڈنر اور ڈانس پارٹی

کھانا ہو رہا ہے۔ بہت سے مرد اور عورتیں شریک ہیں۔ روپ کماری مدن لال کے برابر بیٹھی ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ کھانا ختم ہوتا ہے۔ سب بڑے کمرہ میں آتے ہیں، گانا شروع ہوتا ہے۔ مس کنول کماری ایکٹریس یہ غزل گاتی ہیں:۔

ہنس رہا ہوں، لبِ مجبور پہ فریاد نہیں
کوئی کیا جانے کہ غمدیدہ ہے دل، شاد نہیں

میں نے سمجھا تھا کہ ہے عہدِ وفا، عہدِ وفا
سچ کہا تم نے کہ مجبور تو آزاد نہیں

کیا کہوں کسلیئے رہ رہ کے تڑپ اُٹھتا ہوں
دل میں اک تیر ہے پیوست، تری یاد نہیں

کیا مرے خواب میں آنیکا بھی قدغن ہے تمہیں
قید ہے جسم، تو کیا رُوح بھی آزاد نہیں

کیا کروں آہ بُھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں

بنتے بنتے تری تصویر بگڑ جاتی ہے
یاس میں آہ تصوّر بھی تو آزاد نہیں

چاندنی، موسمِ گُل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

گانا ختم ہونے کے بعد محفل برخاست ہوتی ہے۔ مدن لال مہمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

مدن لال:۔ میں آپ صاحبان کا بیحد شکر گذار ہوں کہ آپنے تکلیف فرما کر اس محفل میں شرکت کی اور مجھے عزّت بخشی۔

ایک مہمان:۔ میں سب لوگوں کی طرف سے اور خود اپنی طرف سے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ سے تعارف ہوگیا۔ اور آپکی انتہائی عنایت ہے کہ آپنے ہم لوگوں کو مثل اپنے خاص دوستوں کے دعوت

اور محفل میں شریک کیا۔ اچھا گڈ نائٹ۔

مدن لال:۔ گڈ نائٹ۔

مہمان اپنی اپنی گاڑیوں اور موٹر کاروں میں سوار ہو کر روانہ ہوجاتے ہیں۔

مدن لال:۔ (روپ کماری سے) آپکی کار نہیں آئی؟

روپ کماری:۔ میں نے خود ہی منع کردیا تھا۔ وہ ہے ہی کے قدم کا فاصلہ۔ یوں ہی چلی جاؤنگی۔

مدن لال:۔ اجازت ہو تو میں پہونچادوں۔

روپ کماری:۔ نہیں۔ اب آپ تکلیف نہ کیجئے۔

مدن لال:۔ تکلیف تو نہیں خوشی ہوگی۔

روپ کماری:۔ اچھا تو چلئے۔

دونوں ساتھ جاتے ہیں۔ جب روپ اپنے مکان میں داخل ہونے لگتی ہے۔ مدن اسکے ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے:۔

مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے۔

روپ کماری:۔ اب کل۔

یہ کہکر ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتی ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن کی کوٹھی

تقریباً آدھی رات کا وقت۔ روپ کماری ابھی مدن لال کی پارٹی سے واپس آئی ہے۔ اپنے سونے کے کمرہ میں پہونچ کر سب زیورات اُتار کر میز پر ڈالدیتی ہے اور کپڑے اُتار کر ایک طرف کرسی پر رکھدیتی ہے۔ لباس شب خوابی پہن لیتی ہے۔ بڑے آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔ پھر ایک انگڑائی لیتی ہے اور روشنی گل کر کے مسہری میں داخل ہوجاتی ہے۔ نائٹ لائٹ روشن ہے۔ امر سنگھ خاکی لباس پہنے مُنہ پر نقاب ڈالے۔ مکان کے عقب سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوتا ہے اور بیرونی زینہ کے راستہ اُوپر کی منزل میں پہونچ جاتا ہے۔ پستول ہاتھ میں ہے۔ ایک کمرہ میں سے گذر کے۔ کھڑکی سے کود کر روپ کماری کی خوابگاہ میں پہونچتا ہے۔ میز پر پڑے ہوئے زیورات کو دیکھتا ہے۔ سبکو آہستہ سے اُٹھاکر اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔ پھر باقی کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ میز پر ایک صندوقچہ رکھا ہے۔ اُسے کھولتا ہے۔ کسی چیز سے ٹھوکر لگتی ہے۔ کھٹکا ہوتا ہے۔ روپ چونکتی ہے۔ امر سنگھ فوراً پردہ کے پیچھے چھُپ جاتا ہے۔ روپ کماری مسہری سے نکل آتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ پھر پردہ کو ایک طرف کھینچتی ہے جس کے پیچھے امر سنگھ ہاتھ میں پستول لئے مُنہ پر نقاب ڈالے کھڑا ہے۔ روپ کماری اُسے دیکھکر چیخ مار کے گرتی ہے اور بیہوش ہوجاتی ہے۔ امر سنگھ ایک لمحہ خاموش کھڑا اُسکو دیکھتا ہے پھر کچھ سوچکر اپنا نقاب اُلٹ دیتا ہے۔ روپ کماری کو اُٹھاکر مسہری پر لٹاتا ہے۔ میز پر صراحی رکھی ہے۔ گلاس میں پانی اُنڈیل کر روپ کماری کے برابر مسہری پر بیٹھکر روپ کماری کے چہرہ پر پانی کے چھینٹے دیتا ہے۔ میز پر سے رائٹنگ پیڈ کا گتّا لے کر روپ کماری کو پنکھا جھلتا ہے۔ دو منٹ میں روپ کماری آنکھیں کھولتی ہے اور خاموشی کے ساتھ خوفزدہ آنکھوں سے امر سنگھ کو دیکھتی ہے۔

امر سنگھ:۔ بائی جی آپ ڈریئے نہیں۔

روپ کماری اُٹھکر بیٹھ جاتی ہے۔ امر سنگھ کھڑا ہوجاتا ہے۔

روپ کماری:۔ آپ کون ہیں؟

امر سنگھ:۔ میں کون ہوں؟ (سر جھکاکر) آپکو کیسے بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ جو کوئی بھی ہوں آپکا مجرم ہوں۔

روپ کماری بڑے غور اور دلچسپی سے امر سنگھ کو دیکھتی ہے، امر سنگھ جیب سے روپ کماری کے زیورات نکالکر اُسکے سامنے

ڈالدیتا ہے۔

امر سنگھ :۔ دیوی مجھ سے بڑا قصور ہوا۔ معاف کر دیجئے۔

روپ کماری سخت حیران ہو کر امر سنگھ کو دیکھتی ہے

پھر کہتی ہے :۔

روپ کماری :۔ آپکو بتانا پڑیگا کہ آپ کون ہیں!

امر سنگھ :۔ دیوی، وہ کوئی اچھی بات نہیں جسے آپ جاننا چاہتی ہیں۔

روپ کماری :۔ نہیں۔ بتائیے۔

امر سنگھ :۔ میں ایک چور، ڈاکو، خونی ہوں اور کیا بتاؤں یا ایک مصیبت کا مارا ہوا ایک بدنصیب انسان۔

روپ کماری :۔ (امر سنگھ کا ہاتھ پکڑ کے) بیٹھ جائیے۔

(امر سنگھ بیٹھ جاتا ہے) اب تفصیل سے سنائیے کہ آدھی رات کے وقت آپ میرے کمرہ میں کیسے آئے۔

امر سنگھ :۔ چوری کرنے آیا تھا۔

روپ کماری :۔ تو پھر چوری کر کے بھاگ کیوں نہیں گئے؟

امر سنگھ :۔ جب آپ گر کر بیہوش ہو گئیں اور میں نے آپکو دیکھا تو میرا دل بے اختیار ہو گیا۔ آپکی موہنی صورت نے مجھے قید کر لیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ خوف بھی ہوا کہ بیہوش چھوڑ جانے میں کہیں آپ کی جان کو کوئی صدمہ نہ پہونچ جائے۔ میرا ارادہ بدل گیا۔ پھر دراصل میں آپکے یہاں چوری کے ارادہ سے آیا بھی نہ تھا۔ مجھ سے بھول ہوئی مجھے بتایا گیا تھا کہ نمبر ۱۸ کی کوٹھی میں پنج پورہ کا جوان اور بدمعاش راجہ ٹھہرا ہوا ہے۔

روپ کماری :۔ اوہ۔ وہ تو نمبر ۱۷ میں ہیں۔

امر سنگھ :۔ تھوڑے دن ہوئے اس نے شراب کے نشے میں میرے بوڑھے باپ کو اپنی موٹر سے کچل کر مار ڈالا پھر رشوت دے کر گواہوں کو توڑ لیا اور جس طرح دولتمند انصاف خریدتے ہیں۔ وہ بھی عدالت سے صاف چھوٹ گیا۔ میں اسی کو لوٹنے اور قتل کرنے کے لئے آیا تھا۔ کمرہ میں داخل ہونے کے بعد جب میں نے میز پر زیورات اور کرسی پر آپکے کپڑے پڑے دیکھے تو یقین ہو گیا کہ میں غلطی سے کہیں اور گھس آیا لیکن ان زیورات کو میں نے اپنی اور دوسرونکی مفلسی اور فاقہ کشی کا علاج سمجھکر اٹھا لیا، کمرے کی تلاشی لے رہا تھا کہ شاید کچھ اور مل جائے کہ کھٹکے سے آپکی آنکھ کھل گئی۔

روپ کماری :۔ آپ تو کوئی بہت ہی شریف اور تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔

امر سنگھ :۔ دیوی۔ کیا شریفوں کے یہی کرتوت ہیں۔ آہ خدا اس بے روزگاری کو غارت کرے، جس نے چور، ڈاکو، خونی سب کچھ بنا دیا۔

روپ کماری :۔ کیا میں آپکی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟

امر سنگھ :۔ میں آپکا بیحد شکرگذار ہوں۔ بس اتنا کیجئے کہ میرے قصور کو معاف کر دیجئے۔

روپ کماری :۔ اب اس ذکر کو جانے دیجئے۔

اٹھکر میز کی دراز کھولتی ہے اس میں سے کچھ نوٹ نکالتی ہے۔

روپ کماری :۔ مجھے آپکے ساتھ بے انتہا ہمدردی ہے اور مجھے بے انتہا خوشی ہوگی اگر آپ میری اس حقیر مدد کو قبول فرمالیں گے۔

امر سنگھ :۔ (محبت اور تشکر کی نظروں سے روپ کو دیکھتا ہے) اگر آپ یہ رقم مجھے قرض کے طور پر دیدیں تو عمر بھر آپکا احسان نہ بھولونگا۔

روپ کماری :۔ جس طرح آپ کا جی چاہے۔

امر سنگھ :۔ (روپیہ لیکر) آپکا بہت ممنون ہوں۔

روپ کماری :۔ (ایک منٹ کے وقفہ کے بعد) آپ سے ایک

اور بھی التجا ہے۔ کیا میں اُمید رکھوں کہ میری خاطر آپ اُسے پورا کر دینگے۔

امر سنگھ:- ہاں۔ اگر میرے امکان میں ہو۔

روپ کماری:- ہاں۔ آپکے اختیار میں ہے۔

امر سنگھ:- تو پھر فرمائیے۔ میں بسروچشم اُسکی تعمیل کرونگا۔

روپ کماری:- مدن لال کے قتل کا ارادہ ترک کر دیجئے۔ اور قسم کھا کر مجھ سے وعدہ کیجئے کہ اب آپ اُس طرف کا رُخ بھی نہ کرینگے۔

امر سنگھ:- (متحیرانہ) وہ آپکے کوئی عزیز یا دوست ہیں؟

روپ کماری:- نہیں۔ میں تو اُنہیں جانتی بھی نہیں۔

امر سنگھ:- تو پھر آپکو اُن سے کیا ہمدردی ہے۔

روپ کماری:- مجھے اُن سے کوئی ہمدردی نہیں مگر میں نہیں چاہتی کہ کسی طرح آپکی جان خطرہ میں پڑے۔

امر سنگھ:- (بہت ہی متاثر ہوکر) دیوی۔ خدا نے آپکو کیسا شریف اور محبت والا دل دیا ہے۔ اچھا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس ارادہ سے باز رہونگا۔

روپ کماری:- بہت ممنون ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ اور بھی ضروری باتیں کرنی ہیں۔ شاید میں آپکی کچھ اور بھی مدد کرسکوں۔ اگر فرصت ہو تو کل شام کو تشریف لائیے۔ میں آپ کا انتظار کرونگی۔

امر سنگھ:- ضرور حاضر ہونگا۔

روپ کماری:- (اُٹھکر دروازہ تک پہونچانے جاتی ہے (راستہ میں) جلدی میں میں نے آپکا نام بھی تو نہیں پوچھا۔

امر سنگھ:- مجھے امر سنگھ کہتے ہیں۔

روپ کماری:- (دروازہ پر پہونچکر) اچھا گڈ نائٹ امر سنگھ جی۔

امر سنگھ:- گڈ نائٹ دیوی۔

رائے بہادر بنارسی داس کی عالیشان کوٹھی اور وسیع باغ

نرس:- (Sunny) سنّی! سنّی!!

بچّہ دوڑتا ہوا آتا ہے۔

نرس:- چلو۔ ہوا کھانے چلیں۔

بچّہ:- چلو۔

ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ٹہلتے ہوئے جارہے ہیں۔ لڑکے کے پاس گیند ہے۔ اُس سے دونوں کھیلتے ہیں۔ کبھی یہ پھینکتی ہے وہ اُٹھا کر لاتا ہے۔ کبھی وہ پھینکتا ہے یہ اُٹھا کر لاتی ہے۔ اسی طرح چلے جارہے ہیں۔ کوٹھی سے دُور اور باغ کی دیوار سے نزدیک ہوتے جاتے ہیں۔ دیوار کے اُس طرف نمبر ۱۲ کھڑا ہے، نرس دیوار کے قریب پہونچکر بچّہ کی گیند زور سے پھینکدیتی ہے اور کہتی ہے۔ سنّی! دوڑکے اُٹھاکے لاؤ۔

بچّہ دوڑ جاتا ہے۔ نرس نمبر ۱۲ کے قریب پہونچکر:-

ڈارلنگ معاف کرنا۔ بہت دیر ہوگئی۔

نمبر ۱۲:- چھٹی مل گئی؟

نرس:- ہاں تین دن کی چھٹی مل گئی۔

نمبر ۱۲:- میں نے ایک ہاؤس بوٹ کرایہ کرلی ہے۔ راتیں بھی چاندنی ہیں۔ بڑا لطف رہیگا۔

بچّہ گیند لیکر آرہا ہے۔ نمبر ۱۲ ایک طرف کو ہٹ جاتا ہے۔ نرس پھر بچّہ کی گیند بہت دُور پھینکدیتی ہے وہ پھر گیند کے پیچھے دوڑ جاتا ہے۔ اتنے میں ایک موٹر ان لوگوں سے دُور باغ کی دیوار کے برابر آکر رُکتی ہے اور دو آدمی اُس میں سے اُترکر دیوار پھاند کے بچّہ کو اُٹھا کر لیجاتے ہیں اور موٹر میں بٹھکر فوراً روانہ ہوجاتے ہیں۔ نمبر ۱۲ پھر قریب آجاتا ہے۔

نرس:۔ لیکن سُندر اگر کسی کو خبر ہوگئی تو غضب ہو جائیگا۔
سُندر:۔ خبر کیسے ہوجائیگی۔ تم اپنی خالہ کے گھر دیبی پور جارہی ہو۔
نرس:۔ (مسکراکر) یہ تو ٹھیک ہی۔ مگر......
اتنا کہہ کر پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہی۔ بچہ غائب ہے۔
نرس:۔ (گھبراکر) ستّی کہاں چلا گیا۔
گھبرائی ہوئی اس طرف جاتی ہی اور چلّا کر پکارتی ہے:۔
ستّی۔ ستّی۔ ستّی۔
اور نہ پاکر شور مچاتی ہے۔
ارے دوڑو۔ دوڑو۔ ستّی کو لے گئے۔ ستّی کو لے گئے۔
نمبر ۱۲ چپکے سے کھسک جاتا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری اور امر سنگھ ایک صوفے پر پاس پاس بیٹھے ہیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں۔
روپ کماری:۔ رات آپکے جانے کے بعد بہت دیر تک نیند نہ آئی، آنکھ لگی تو پھر آپکو خواب میں دیکھا۔ یہ نہیں بتا سکتی کس طرح دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر میں آنکھ کھل گئی۔
امر سنگھ محبت بھری نظروں سے روپ کماری کو دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے:۔
یہ آپ کا ریڈیو کام کرتا ہے۔
روپ کماری:۔ آنہاں۔
اُٹھکر ریڈیو کو (set) سٹ کردیتی ہے۔ خبریں بیان کی جارہی ہیں۔
(۱) ریاست رامپور میں ایک دو سر کا بچہ پیدا ہوا ہی۔
(۲) دہلی میں لالہ ہرنام داس کی سات برس کی بچی نے بیان کیا کہ میں پچھلے جنم میں متھرا کے ایک صراف کُندن لال کی بیوی تھی۔ کُندن لال اپنے پچھلے جنم کی بیوی سے ملنے کے لئے دہلی بُلائے گئے ہیں۔ روز ہزاروں مرد عورت اس لڑکی کو دیکھنے آتے ہیں اور لالہ صاحب کے مکان پر ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔
(۳) بے روزگاری سے تنگ آکر ایک نوجوان بلدیو سہائے نے کانپور میں، دریائے گنگا میں ڈوب کر جان دیدی معلوم ہوا ہے کہ دو برس ہوتے اُس نے قانون کا امتحان بھی پاس کرلیا تھا مگر اب تک بالکل بیکار تھا۔
(۴) بھوک ہڑتال کی وجہ سے دیش سیوکوں کے سرغنہ مسٹر مکرجی کی حالت رات سے بہت نازک ہی۔
(۵) آج کپتان پریم سنگھ کی کوششوں سے ایک دیش سیوک اور گرفتار ہوا ہے اور عارضی طور پر کپتان صاحب کی خدمات محکمہ پولیس کو دیدی گئی ہے۔
امر سنگھ غصّہ سے کانپنے لگتا ہے۔ پھر جیب سے رومال نکالکر چہرہ کا پسینہ پونچھتا ہے۔ روپ کماری کی نظر رومال پر پڑتی ہے۔ اُس پر (Red Cross) ریڈ کراس بنا ہے۔
روپ کماری:۔ (متحیرانہ) اچھا امر سنگھ جی آپ بھی دیش سیوک ہیں؟
امر سنگھ:۔ (حیران و مضطرب ہوکر) آپنے کیسے جانا؟
روپ کماری:۔ (رومال کی طرف اشارہ کرکے) اس ریڈ کراس سے۔
امر سنگھ:۔ آپ بھی دیش سیوک ہیں؟
روپ کماری:۔ (اپنی انگشتری دکھلاکر جس پر ریڈ کراس بنا ہی) جی ہاں میں بھی دیش سیوک ہوں۔ لیکن مکرجی کی گرفتاری کے بعد سے میں دیش سیوک منڈل کے حالات سے بالکل بیخبر ہوں۔ اس وقت مجھے یہ معلوم کرکے بے انتہا خوشی ہوئی کہ

آپ ولیش سیلوک ہیں۔
امر سنگھ:- اور مجھے آپ سے زیادہ خوشی ہوئی۔
روپ کماری:- اچھا اب تک آپ لوگوں نے پریم سنگھ کی کوششوں کے روکنے کا کیا بندوبست کیا۔ دراصل ہماری جماعت کی بربادی کا باعث یہی شخص ہے۔
امر سنگھ:- ایشور چاہے تو ولیش کا یہ دشمن اسی ہفتہ گرفتار ہو جائیگا۔ اور جلد اپنے کئے کی سزا پائیگا۔
روپ کماری:- امر سنگھ جی میں بیان نہیں کر سکتی کہ اسوقت آپ کے اِن چند جملوں نے مجھے کس قدر خوش کر دیا۔ بھگوان آپ کو کامیاب کرے۔ ہاں ایک بات تو میں آپ سے پوچھنا بھول ہی گئی۔
امر سنگھ:- وہ کیا؟
روپ کماری:- اسوقت منڈل کا سردار کون ہے؟
امر سنگھ:- نمبر ایک سو گیارہ۔
روپ کماری:- میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔
امر سنگھ:- اُن سے ملکر کیا کیجئے گا۔
روپ کماری:- میں اُن سے التجا کرونگی کہ جس طرح ہو جلد سے جلد اس بدمعاش پریم سنگھ کا خاتمہ کر دیا جائے۔
امر سنگھ:- میں آپکا یہ پیغام سردار کو پہونچا دونگا۔
روپ کماری:- شاید آپ کو مجھپر اعتماد نہیں جو آپ مجھے اُن سے ملانا نہیں چاہتے۔
امر سنگھ:- تعجب ہے آپکو امر سنگھ کے متعلق ایسی بدگمانی ہے۔ اچھا فرمائیے۔ منڈل کا سردار آپ کے سامنے موجود ہے۔
روپ کماری:- (متحیرانہ) امر سنگھ جی۔ آپ خود!
امر سنگھ:- جی ہاں۔ (یہ کہہ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ روپ اُس کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھکر بڑی محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتی ہے۔ امر سنگھ بیتاب ہو کر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے اور لب بوس ہوتا ہے۔)

شارعِ عام

ایک شخص نہایت بدحال سڑک پر چلا جا رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بھوکا ہے، چلتے چلتے سڑک کے کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ امرودوں کی ٹوکری لئے ایک کنجڑن برابر سے گذرتی ہے۔ یہ شخص للچائی ہوئی نظروں سے امرودوں کو دیکھتا ہے پھر چُپکے سے پیچھے پیچھے جاکر ٹوکری میں سے کئی امرود اُٹھا لیتا ہے اور فوراً کھانا شروع کر دیتا ہے۔ عورت خبردار ہو کر شور مچاتی ہے۔ لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور باقی امرود اُس سے چھین کر کنجڑن کو دیدیتے ہیں اور اس شخص کو بُرا بھلا کہنا شروع کرتے ہیں۔
وہ شخص:- تمہیں کیا خبر کہ میرا کیا حال ہے۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بھوک سے جان نکل رہی ہے۔
ایک راہگیر:- تو مزدوری کی ہوتی یا لوگوں کا مال لُوٹنا شروع کر دیا۔
وہ شخص:- مزدوری! کہاں ہے مزدوری؟
ایک اور راہگیر:- (طنز و حقارت سے) کہاں ہے مزدوری! بدمعاش کہیں کا۔ چوروں کیلئے مزدوری کہاں سے آئی۔
وہ شخص:- بس خبردار۔ اب ایک لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا۔
ایک اور راہگیر:- اس چوٹے کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے۔
ایک اور آدمی:- (جواب تک نہیں بولا تھا) اجی جاؤ بھیا جاؤ۔ کاہے کو کسی کے پیچھے پڑتے ہو۔ جاؤ اپنا اپنا کام دیکھو۔

(اُس شخص کا ہاتھ پکڑ کے) تم میرے ساتھ آؤ بھائی۔

مجمع منتشر ہوجاتا ہے۔ یہ آدمی ایک دوانی نکال کر اُس شخص کے حوالہ کرتا ہوا کہتا ہے:۔

لو، کچھ لیکر کھا لینا (دوانی دیکر اپنی راہ لیتا ہے)

وہ شخص کچھ دیر کھڑا سوچتا ہے۔ پھر ایک دُکان سے پوریاں خرید کر کھاتا ہے۔ اسکے بعد آہستہ آہستہ روانہ ہوجاتا ہے۔ لیول کراسنگ (Level Crossing) آتا ہے۔ ریل کا پھاٹک بند ہے۔ یہ شخص کود کر ریل کی پٹری کے کنارے کنارے ایک طرف کو چلا جاتا ہے اور غائب ہوجاتا ہے۔

امر سنگھ کاندھے پر ایک چھوٹا سا صندوق لئے جارہا ہے۔ صندوق پر لکھا ہے (Royal Bakery) رایل بیکری۔ (Level Crossing) لیول کراسنگ آتا ہے۔ پھاٹک بند ہے۔ امر سنگھ ٹھہر جاتا ہے۔ دو ایک منٹ کھڑا رہتا ہے۔ اِدھر اُدھر ٹرین کو دیکھتا ہے۔ بہت اندھیرا ہے۔ ایک جانب پٹری پر کوئی چیز پڑی نظر آتی ہے۔ امر سنگھ اپنا صندوق اُتار کر زمین پر رکھدیتا ہے۔ کھولکر اُس میں سے ایک ٹورچ (torch) نکالتا ہے اور اُس طرف روشنی ڈالتا ہے۔ روشنی میں فاصلے پر ایک شخص پٹری پر لیٹا نظر آتا ہے۔ امر سنگھ پھاٹک کو پھاند کر اس طرف جاتا ہے اور اُس شخص کو اُٹھاتا ہے۔

وہ شخص:۔ (بگڑ کر) جاؤ اپنا راستہ لو۔

امر سنگھ:۔ بھیّا اسوقت آپکی عقل ٹھکانے نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ چلئے۔

وہ شخص:۔ میری عقل بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم اپنا کام دیکھو۔

امر سنگھ:۔ نہیں۔ اب میں آپکو اکیلا ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔

وہ شخص:۔ ہائے قسمت۔ دُنیا نہ جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔ بھائی میں آپکے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔

امر سنگھ:۔ آخر کچھ اپنا حال تو کہئے۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔

وہ شخص:۔ مجھے آپکی مدد نہیں چاہیئے۔ بس مجھے اس نامُراد زندگی کا خاتمہ کر لینے دیجئے۔

امر سنگھ:۔ ہمّت سے کام لو بھائی۔ جوان ہو، تندرست ہو، خودکُشی بزدلوں کا کام ہے۔ اور جان ہی دینا ہے تو دیش کی سیوا میں جان دو کہ نام بھی ہو اور کام بھی۔

وہ شخص:۔ اجی جہنّم میں جائے وہ دیش جو اپنی اولاد کو روٹی بھی نہ دے سکے۔

امر سنگھ:۔ بھائی آپکی طرح لاکھوں انسان بے روزگاری سے بدحال ہیں۔ نہ پیٹ کو روٹی نہ تن کو کپڑا۔ کیا آپ کے جان دینے سے یا اور بہتوں کے خودکُشی کر لینے سے یہ بے روزگاری کی بلا دیش سے دُور ہو سکتی ہے۔

وہ شخص:۔ تو پھر آپکا یہ مطلب ہے کہ فاقے کر کر کے مرجانا چاہیئے۔

امر سنگھ:۔ نہیں آپ میرے ساتھ آیئے میں آپکو وہ تدبیر بتلاؤنگا جس سے آپ کو بھی فائدہ پہونچے اور دیش کا بھی بھلا ہو۔

دونوں چُپ چاپ پھاٹک کے اُس طرف آجاتے ہیں۔ اتنے میں ٹرین گذر جاتی ہے۔ پھاٹک خود بخود کھُل جاتا ہے۔ امر سنگھ اپنا صندوق اُٹھا لیتا ہے اور اُس شخص کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ دونوں روانہ ہوجاتے ہیں۔

امر سنگھ:۔ آپکو کام ملجائیگا آپ گھبرائیے نہیں۔

وہ شخص:۔ کہاں سے ملجائیگا۔ آج ڈیڑھ مہینہ ہوگیا مارے مارے پھرتے ہوئے۔ جہاں جاؤ یہی جواب ملتا ہے کہ جگہ خالی نہیں۔

امر سنگھ:۔ آپ کیا کام جانتے ہیں۔
وہ شخص:۔ جو ہر گریجویٹ جانتا ہے وہی میں بھی جانتا ہوں۔ یعنی لکھنے پڑھنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتا۔ سو وہ کس مرض کی دوا ہے۔
امر سنگھ:۔ آپ جانتے ہیں کہ اس بے روزگاری کا سبب کیا ہے؟
وہ شخص:۔ کیا سبب ہے؟
امر سنگھ:۔ سبب صرف یہ ہے کہ سرمایہ داروں نے دولت اکٹھی کر رکھی ہے اس لئے وہ افراد پر تقسیم نہیں ہو سکتی۔ جب تک سرمایہ داری کا خاتمہ نہ کیا جائیگا مفلسی اور بے روزگاری کی بلا ہرگز ملک سے دُور نہیں ہو سکتی ہے، ملک میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانیاں پیش کر رہی ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو آپ بھی اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔
وہ شخص:۔ ایسے مفید کام میں شریک ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے میں بخوشی اسکے لئے تیار ہوں۔

اتنے میں دونوں (Royal Bakery) رائل بیکری کے دروازہ پر پہونچ جاتے ہیں اور اندر داخل ہوتے ہیں۔ بیکری میں لوگ مختلف کاموں میں مصروف ہیں۔ کئی آدمی میز پر آٹا گوندھ رہے ہیں۔ کوئی بسکٹ بنا رہا ہے۔ کوئی پیسٹری وغیرہ سانچوں میں بھر رہا ہے۔ ایک طرف تنور روشن ہے۔ کچھ لوگ اس میں کچھ پکا رہے ہیں۔ امر سنگھ کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور ہر شخص کام چھوڑ کر آجاتا ہے سب ایک خاص کمرہ میں جمع ہوتے ہیں جو بظاہر ڈائننگ روم ہے۔
ایک:۔ سردار بہت دیر لگائی۔
امر سنگھ:۔ ہاں دیر اس لئے ہوئی کہ میں ایک نیا دیش سیوک تیار کر کے لایا ہوں (اُس شخص کو سب کے سامنے پیش کرتا ہے) جان دینے کے لئے یہ ریل کی پٹری پر لیٹے تھے۔ یہ بھی اُسی مصیبت میں مبتلا ہیں جس نے ہم سب کو دیش سیوک بنا دیا (اس شخص سے مخاطب ہو کر) آپ بخوشی دیش سیوک بننے کے لئے تیار ہیں؟
وہ شخص:۔ مجھے کیا کام کرنا ہوگا۔
امر سنگھ:۔ جس طرح ممکن ہو مالداروں سے دولت چھین کر غریبوں کی مدد کرنا۔ کسانوں اور مزدوروں میں اُن کے حقوق کا احساس پیدا کر کے اُنہیں دولتمندوں کی تباہی کے لئے تیار کرنا۔ بس یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے اور اسی میں ہمارے دیش کی رکشا ہے۔ آزادی کا اور دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ آپکے ضروری خرچ کا ذمہ دار دیش سیوک منڈل رہے گا۔
وہ شخص:۔ میں تیار ہوں۔
امر سنگھ:۔ اپنی عزت اور شرافت کی قسم کھا کر وعدہ کیجئے کہ زندگی کی آخری سانسوں تک آپ آزادی کی اس جنگ میں ہمارے شریک رہینگے۔
وہ شخص:۔ میں اپنی عزت و شرافت کی قسم کھا کر آپ سب لوگوں کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ مرتے دم تک آپ لوگوں کا ساتھ دونگا۔
امر سنگھ:۔ ہمارے منڈل میں ایک ممبر کو دوسرے کا نام نہیں بتایا جاتا کہ بُزدلوں کو غداری کا موقع نہ ملے' منڈل کی طرف سے ہر ممبر کو ایک نمبر دیدیا جاتا ہے۔ سب ممبر بیکری کے خریدار کہلاتے ہیں (سکرٹری سے مخاطب ہو کر) دیکھئے تو کونسا نمبر خالی ہے۔
سکرٹری:۔ (رجسٹر دیکھکر) نمبر ۷۵۔
امر سنگھ:۔ آج سے آپکا نمبر ۷۵ ہے اور یہی آپ کا نام ہے'

اس کے علاوہ سوسائٹی کی ایک خاص نشانی بھی ہے یعنی (Red Cross) ریڈکراس۔ یہ ہر وقت آپکو اپنے پاس رکھنی چاہیئے۔ چاہے ٹوپی پر بنا لیجئے، چاہے کوٹ پر، چاہے انگوٹھی یا بٹن میں۔ اس کی مدد سے سوسائٹی کے سب ممبر ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں (اسکے بعد سکریٹری سے) مسٹر نمبر ۷۵ کا الاؤنس دیدو۔

سکریٹری بیس روپے کے نوٹ اُس شخص کے حوالے کرتا ہے۔

امر سنگھ:۔ یہ آپکا ایک مہینہ کا الاؤنس ہے۔

وہ شخص:۔ میں آپکا بیحد شکر گذار ہوں۔

امر سنگھ:۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہ درپیش ہے کہ کپتان پریم سنگھ جس نے ہماری جماعت کو تباہ کر ڈالا ہے۔ جس طرح بنے جلد سے جلد اُسے گرفتار کیا جائے۔

سب:۔ بیشک۔

امر سنگھ:۔ اس لئے کل چار آدمیوں کی ضرورت ہوگی، (سکریٹری سے) دیکھو تو کل کس کس کی ڈیوٹی کا دن ہے؟

سکریٹری:۔ نمبر ۱۳۔ نمبر ۱۷۔ نمبر ۲۳ اور نمبر ۱۱۳ سے نمبر ۱۲۱ تک۔

امر سنگھ:۔ بس تو پہلے چار آدمی جائینگے۔ تفصیل کل صبح بتائی جائیگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اسوقت تک ہتھیاروں کی بہت کمی ہے۔ آپ لوگوں کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ تھوڑی سی ہمت سے اس کا بندوبست بھی بہت آسانی سے ہوجائیگا۔

ایک:۔ وہ کیا صورت ہے؟

امر سنگھ:۔ آج ہی مجھے خبر ملی ہے کہ شکاریوں کی ایک پارٹی رام نگر کے جنگل میں شکار کھیلنے کیلئے جارہی ہے۔ یہ لوگ اتوار کی رات کو روانہ ہونگے۔ ان کے ساتھ کم سے کم دس بارہ بندوقیں ہونگی۔ میگزین بھی کافی ہوگا، اگر یہ سب سامان ہاتھ آگیا تو بہت سی مشکلیں آسان ہوجائینگی۔ اس کے متعلق مفصل پروگرام کل رات کو طے کیا جائیگا۔

مجلس برخاست ہوتی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر لگ جاتے ہیں۔

نمبر ۷۵:۔ (امر سنگھ سے) اگر آپکی اجازت ہو تو کل کی مہم پر میں بھی جانا چاہتا ہوں۔

امر سنگھ:۔ اچھی بات ہے۔ تو پھر رات کو یہیں رہ جایئے کیونکہ صبح ہی جانا ہے۔

نمبر ۷۵:۔ بہت اچھا۔

ڈاکٹر ٹنڈن کا مکان

روپ کماری اور مدن لال ایک صوفے پر بیٹھے ہیں۔ مدن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ روپ کماری خاموش ہے۔

مدن:۔ تو آپکا خیال ہے کہ میری محبت محض بناوٹی اور نمائشی ہے۔

روپ کماری:۔ میں نے تو یہ نہیں کہا۔

مدن:۔ ہاں کہا تو نہیں۔ مگر میرے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے اُس کے تو یہی معنی ہیں۔ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ایک عیاش آدمی محبت کرنا کیا جانے۔ روپ! یہ سچ ہے میں نے بہت آوارگی کی ہے لیکن پھر بھی آخر میں انسان ہی تو ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل اور دل میں محبت کا جذبہ ہے۔

روپ کماری:۔ شاید ہو۔

مدن:۔ شاید ہو؟ ہاں تمہیں کس طرح یقین آسکتا ہے روپ مجھے اقرار ہے کہ میں آوارہ تھا۔ ہرجائی تھا۔ عیاش تھا مگر تم نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ میری ساری آرزوؤں کا مرکز

اب صرف ایک ذات ہو اور وہ تم ہو۔ روپ اب مجھ میں بالکل صبر کی تاب نہیں۔

روپ کماری:۔ مجھے بہت افسوس ہے۔

مدن:۔ نہیں بہت افسوس ہو۔ کاش افسوس کی جگہ تمہیں ہمدردی ہوتی۔ آہ۔ روپ تمہیں کیسے بتاؤں کہ میرے سینہ کے اندر کیسا طوفان مچا ہوا ہو۔ کیا قیامت ہو کہ تم میرے پاس ہو پھر بھی مجھ سے دُور ہو۔ کیوں روپ تمہیں مجھ پر بالکل ترس نہیں آتا تمہاری صورت سے تو نہیں معلوم ہوتا کہ تم اسقدر بیدرد ہو۔

یہ کہکر روپ کماری کے ہاتھ تھام لیتا ہے۔

روپ کماری:۔ (سر جھکا کر) مدن میں سب کچھ جانتی ہوں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ لیکن جب تک اپنے دل کو چین نہ ہو انسان کسی سے محبت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

مدن:۔ روپ میری ساری دولت تمہارے قدموں پر نثار ہو۔ اگر تم اس سے اپنے دل کا چین خرید سکو۔

روپ کماری:۔ آپکی محبت کا شکریہ۔ مگر افسوس ہے کہ دولت میرے درد کا علاج نہیں۔ عیش و راحت کے ضروری سامان تو خدا کی مہربانی سے یہاں بھی کم نہیں مگر اس سے میرے کلیجہ کا ناسور تو نہیں بھر سکتا۔

مدن:۔ آخر بیان تو کرو۔ شاید میں کسی کام آسکوں۔

روپ کماری:۔ بیکار ہو بیان کرنا۔ یہ کام آپکے بس کا نہیں۔

مدن:۔ پھر بھی بتانے میں کیا نقصان ہو۔

روپ کماری:۔ آپ کو اصرار ہے تو سُن لیجئے۔ پریم سنگھ کو آپ جانتے ہیں؟

مدن:۔ وہی نا جس نے ڈاکٹر صاحب اور مسٹر مکرجی کو گرفتار کرایا ہے۔

روپ کماری:۔ ہاں وہی۔ اس ظالم نے میرے کلیجہ میں ناسور ڈالدیئے ہیں۔ میرا بھرا گھر بلکہ میری ساری زندگی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ جب تک اُسے موت کی گود میں نہ دیکھ لونگی میرے دل کو چین نصیب نہ ہوگا۔

مدن سناٹے میں آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہتی ہے۔

روپ کماری:۔ (طنز سے) سُن لیا آپنے؟

مدن:۔ ہاں سُن لیا۔ روپ شاید تم یہ سمجھتی ہوگی کہ میں محبت کی دیوی کو جان کی بھینٹ دینے سے ڈرتا ہوں۔

روپ کماری:۔ شاید۔

مدن:۔ نہیں روپ اس کا تجربہ تم ابھی کر سکتی ہو۔ (دیوار پر سے ایک چھری اُتار کر جو آرائش کے لئے لگی ہوئی تھی) اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالو۔ اگر اُف کروں تو مرد نہیں۔ اور اگر کہو تو اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ کے رکھدوں۔

روپ کماری:۔ اس سے مجھے کیا فائدہ۔

مدن:۔ فائدہ؟ ہاں تمہیں اس سے کیا فائدہ۔ خیر جو کچھ بھی ہو میں تمہارے لئے اپنی جان قربان کر سکتا ہوں لیکن کسی اور کے خون سے ہاتھ رنگنا اسکے لئے میرا دل کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا۔ روپ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ تمہارا یہی سلوک رہا تو ....

روپ کماری:۔ (بات کاٹ کر) ایک اور سہل تدبیر بھی ہے۔

مدن:۔ وہ کیا؟

روپ کماری:۔ پریم ایک چھوکری پر بُری طرح مرتا ہے۔ اگر چند روز کے لئے اُسے غائب کر دیا جائے اور یہ افواہ اڑادی جائے کہ وہ مار ڈالی گئی تو مجھے یقین ہے کہ پریم دیوانہ ہو جائیگا۔ اور خود سر ٹکرا ٹکرا کے مر جائیگا۔

مدن:۔ (خوش ہو کر) ہاں یہ کام میں کر سکتا ہوں۔

روپ کماری:۔ کب؟

مدن:۔ تین دن کے اندر اندر۔

روپ کماری:- یقیناً۔

مدن:- یقیناً (ایک منٹ خاموش رہکر) اچھا اسکے بعد۔

روپ کماری:- اس کے بعد روپ تمہاری ہوگی۔

مدن:- (خوشی سے بیتاب ہوکر) ہوئی شرط! لاؤ ہاتھ!

روپ کماری ہاتھ دیتی ہے۔ مدن چومنا چاہتا ہے۔

روپ کماری ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔

روپ کماری:- پہلے شرط پوری ہونی چاہیئے۔

مدن:- (افسردہ ہوکر) اچھی بات ہے۔

پریم سنگھ کا مکان

پریم سنگھ اپنے کمرہ میں کپڑے پہنکر باہر جانے کیلئے تیار ہو رہا ہے۔ ملازم داخل ہوتا ہے۔

ملازم:- حضور ایک سپاہی پولیس صاحب کے یہاں سے آیا ہے۔ ملنا چاہتا ہے۔

پریم سنگھ:- کہدو آتے ہیں۔

اس کے بعد کوٹ پہنکر باہر نکلتا ہے۔ سپاہی باقاعدہ سلام کرتا ہے اور کہتا ہے:-

سپاہی:- حضور، بڑے صاحب نے سلام بولا ہے اور حضور کو فوراً بلایا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔

پریم سنگھ:- (کچھ سوچکر) اچھا تو ایک گاڑی لے لو۔

سپاہی:- حضور موٹر موجود ہے۔

پریم سنگھ اور سپاہی دونوں موٹر میں سوار ہوتے ہیں۔ دو سپاہی پہلے سے موٹر میں موجود ہیں۔ موٹر چل پڑتی ہے جس وقت آبادی کے باہر سنسان سڑک پر پہونچتے ہیں اچانک دو سپاہی پریم سنگھ کو لپٹ جاتے ہیں۔ تیسرا بھی مدد کرتا ہے۔ تینوں ملکر پریم سنگھ کو باندھ لیتے ہیں اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیتے ہیں۔ موٹر کا ہڈ چڑھا دیتے ہیں اور موٹر تیزی سے روانہ ہوجاتی ہے۔

پبلک گارڈن

باغ کے ایک ایسے حصہ میں جہاں نسبتاً بہت کم لوگ آجا رہے ہیں موہنی ایک بنچ پر نہایت افسردہ بیٹھی ہے۔ ایک نوجوان مرد اُدھر سے گذرتا ہے۔ موہنی کو دیکھکر ٹھٹکتا ہے پھر چل پڑتا ہے کچھ دُور جاکر آہستہ آہستہ پلٹتا ہے قریب آکر پھر ٹھٹکتا ہے۔ اس وقت موہنی کا ہاتھ بنچ کی پُشت پر رکھا ہوا ہے۔ اس طرح کہ (Red Cross) ریڈ کراس والی انگوٹھی جو اُس کی اُنگلی میں ہے سامنے ہے۔ اُسے دیکھکر نوجوان یکایک موہنی کے سامنے آکر:-

"دیش سیوک کی جے"!

موہنی چونک پڑتی ہے۔ مگر فوراً سنبھل کر اسی طرح جواب دیتی ہے۔

"دیش سیوک کی جے" آپ کا نمبر؟

نوجوان:- نمبر ۹۹ (ننیانوے)

موہنی:- تشریف رکھیئے۔

نوجوان:- (بہت خوش ہوکر بیٹھ جاتا ہے) دیوی! میں نے کبھی آپکو منڈل کے جلسوں میں نہیں دیکھا۔

موہنی:- میں منڈل کے جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔ میں دیش سیوک منڈل کے سردار مکرجی کی چیلی ہوں۔ جس دن وہ گرفتار ہوئے اُسدن بلکہ اُسی وقت ہماری شادی ہونیوالی تھی۔

نوجوان:- (چونک کر) اچھا تو موہنی دیوی آپ ہی ہیں۔

موہنی:- جی ہاں۔ جب سے وہ گرفتار ہوتے میں منڈل کے حال سے بالکل بیخبر ہوں۔ آہ، بھگوان ناس کرے اس بدذات

پریم سنگھ کا جس نے ہم سبکو برباد کردیا (ذرا سا وقفہ) میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے اُس کا خون نہ بہالونگی آرام سے نہ بیٹھونگی۔ اس ارادہ سے میں کئی دن سے اُسکی گھات میں تھی مگر پرسوں سُنا کہ وہ یکایک غائب ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کردں؟

نوجوان:۔ دیوی آپ یہ سُنکر خوش ہونگی کہ پریم سنگھ دلیش سیوکوں کی قید میں ہے۔

موہنی:۔ (بے انتہا خوشی کا چہرہ بناکر) واقعی؟

نوجوان:۔ جی ہاں۔

موہنی:۔ او بھگوان۔ تیری بڑی مہربانی۔ بھائی کسی طرح مجھے وہاں تک پہونچا دو۔ غصہ اور رنج سے میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میں چھُری کے ایک ہی وار میں اُس خونی کا کام تمام کردونگی۔

نوجوان:۔ پرسوں صبح میں ڈیوٹی پر وہاں جاؤنگا۔ سردار بھی وہیں ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اُن سے مل لیں۔ پھر جیسی اُن کی صلاح ہو ویسا کیا جائے۔ آپ کہیں تو میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں۔

موہنی:۔ میں عمر بھر آپ کا احسان نہ بھولونگی۔ پرسوں صبح کو آپ جہاں کہیں وہاں آپ کو مل جاؤں۔

نوجوان:۔ یہیں مل جایئے۔

موہنی:۔ بہت اچھا۔ دلیش سیوک کی جے۔

نوجوان:۔ دلیش سیوک کی جے۔ (دونوں جاتے ہیں)

پریم سنگھ کا مکان

موہنی بہت ہی گھبرائی داخل ہوتی ہے۔

موہنی:۔ اماں جی آداب۔

بڑھیا:۔ جیتی رہو بیٹی۔ اسقدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟

موہنی:۔ اماں! پریم سنگھ جی کا پتہ لگ گیا۔ وہ دلیش سیوکوں کی قید میں ہیں۔ پرسوں صبح میں اُنہیں چھُڑانے کے لئے جا رہی ہوں۔

بڑھیا:۔ بیٹی خدا کیلئے کہیں تم خود ان بدمعاشوں کے جال میں نہ پھنس جانا۔ پولیس کو اطلاع کیوں نہ کردی جائے۔

موہنی:۔ نہیں اماں جی۔ اسوقت پولیس کو اطلاع کرنے میں پریم سنگھ جی کی جان کا خطرہ ہے۔ بھیّا اندر سنگھ ابھی نہیں آئے۔

بڑھیا:۔ وہ تو ابھی گیا ہے اور کل کسی وقت آئیگا۔

موہنی:۔ تو پھر جس وقت آئیں مجھے چھپاکے ہاتھ فوراً بلا بھیجئے گا اُن سے کچھ ضروری مشورہ کرنا ہے۔

بڑھیا:۔ اچھی بات ہے۔

موہنی نمسکار کرکے رخصت ہوتی ہے۔

آدھی رات کا وقت

ایک موٹر موہنی کے مکان سے کچھ فاصلہ پر آکر ٹھہرتی ہے۔ تین نقاب پوش اس میں سے اُترتے ہیں۔ مکان کا دروازہ بند ہے۔ یہ لوگ اُتر کر ادھر اُدھر دیکھتے ہیں اور مکان کے اندر پہونچنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک مکان سے ملا ہوا ایک بلند درخت ہے۔ ایک آدمی اسپر چڑھ جاتا ہے۔ اور اس پر سے مکان کی چھت پر کُود جاتا ہے۔ وہاں سے چھتوں چھتوں، چھپتا ہوا موہنی کے مکان کی چھت پر پہنچتا ہے۔ مکان میں اُتر جاتا ہے اور دروازہ کھولدیتا ہے۔ اسکے باقی دو ساتھی بھی مکان میں داخل ہوجاتے ہیں۔ مکان میں بالکل اندھیرا ہے۔ ٹورچ کی روشنی میں ڈھونڈتے ہوئے ایک کمرہ میں پہونچتے ہیں جس میں ایک پلنگ پر کوئی سو رہا ہے۔

ایک شخص آگے بڑھکر ایک کمبل اُسکے اُوپر ڈالدیتا ہے۔ عورت جاگ اُٹھتی ہے اور چیخ مارتی ہے۔ ایک آدمی اُسکے مُنہ میں کپڑا ٹھونس دیتا ہے۔ پھر اُسے باندھ لیتے ہیں اور کاندھے پر ڈالکر باہر لے آتے ہیں۔ پھر موٹر میں ڈال کے روانہ ہوجاتے ہیں۔

مدن لال بیحد مسرور روپ کماری کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ روپ کماری سنگھار کر رہی ہے۔

مدن:- روپ، کام ہوگیا۔

روپ کماری:- (بے انتہا خوش ہوکر) سچ!

مدن:- سچ۔

روپ کماری:- (بیتابانہ دوڑکر مدن کو لپٹ جاتی ہے پھر یکایک تڑپکر اُسکے آغوش سے نکل جاتی ہے) مگر جب تک میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لوں مجھے اطمینان نہیں ہوسکتا۔

مدن:- تو وہ کونسا مشکل کام ہے۔ ابھی چل کے دیکھ لو۔

روپ کماری:- اچھا۔

یہ کہہ کر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کمرہ سے باہر نکلتے ہیں اور بڑی عجلت سے موٹر میں سوار ہوجاتے ہیں جو باہر انتظار کر رہی ہے۔ موٹر تیزی سے روانہ ہوجاتی ہے۔

موٹر چلی جارہی ہے۔ ایک دفعہ مدن روپ کماری کو زور سے چمٹا لیتا ہے۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد روپ اُس سے جُدا ہوجاتی ہے۔ موٹر بیج پورہ پیلیس پہونچتی ہے۔ نوکر چاکر استقبال کو دوڑتے ہیں۔ منّو اور پہلوان بھی موجود ہیں۔

مدن:- (پہلوان سے) کہاں ہے پہلوان!

پہلوان:- سرکار تشریف لایئے۔

پہلوان آگے آگے اور مدن اور روپ پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ کئی کمروں سے گذر کر ایک کمرہ میں پہونچتے ہیں۔ ایک عورت رسیوں سے بندھی ہوئی ایک کرسی پر پڑی ہے۔ روپ کماری کو دیکھکر ایک چیخ مارتی ہے، روپ اُسے دیکھکر آگ بگولا ہوجاتی ہے۔

روپ کماری:- آہ! حرامزادی۔ اب دغابازی کا نتیجہ دیکھ لے۔

یہ کہہ کر چھری لیکر لپکتی ہے۔

مدن:- روپ خُدا کیلئے۔ یہ کیا غضب کرتی ہو۔

روپ کماری:- (مدن کو جھٹکا دیکر) چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ سارے فساد کی جڑ یہی بدذات ہے۔

مدن اور روپ میں کشمکش ہورہی ہے۔

مدن:- مگر پہلے تو کبھی تم نے موہنی کا کوئی قصور نہیں بتایا۔

روپ کماری:- ارے یہ موہنی ہے کب؟ یہ تو میری مُلازمہ چمپا ہے۔ جو میرے یہاں سے خفیہ کاغذات لیکر بھاگ گئی تھی اور جس کی وجہ سے ہم پر یہ تباہی آئی۔

سب حیران ہوکر چمپا کو دیکھتے ہیں۔

مدن:- چمپا؟

روپ کماری:- ہاں چمپا۔ مدن دیکھو اس وقت مجھے چھوڑ دو۔ میرا خُون کھول رہا ہے۔ مجھے انتقام لے لینے دو۔

مدن:- روپ ذرا صبر سے کام لو۔ یہاں سے یہ کہاں جاتی ہے۔ موہنی کا حال تو اس سے پوچھ لینے دو۔ پھر تمہیں اختیار ہے۔

روپ کماری بیٹھ جاتی ہے۔

مدن:- چمپا۔ موہنی کیا ہوئی۔

چمپا:- مہاراج مجھے کچھ نہیں معلوم۔ شام کو پریم سنگھ جی کی امّاں نے مجھے بھیجا کہ موہنی دیوی کو بلا لاؤ۔ میں گئی۔ انہوں نے

کہا نہ میری ملازمہ کام سے اپنے گھر گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہر جاؤ اور جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں رہنا۔ وہ جو گئیں تو پھر نہ آئیں۔ شاید رات کو وہیں رہ گئی ہونگی۔ سرکار میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی مخبری نہیں کی۔

روپ کماری:۔ (جھلا کر پھر کرسی سے کھڑی ہو جاتی ہے) حرامزادی، مکار، جھوٹی کہہ کر پھر چمپا کی طرف جھپٹتی ہے مدن روک لیتا ہے اور کہتا ہے۔

مدن:۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اسے یہیں قید رکھا جائے۔ اس سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہونگی۔ اور اب چلکے موہنی کا پتہ چلا کے اُسکی گرفتاری کا انتظام کرنا چاہیئے۔

یہ کہہ کر روپ کا ہاتھ پکڑ کے کمرہ سے باہر آتا ہے اور موٹر میں بیٹھنا چاہتا ہے۔

روپ کماری:۔ اچھا میں اس سے ایک بات اور پوچھ لوں۔

سب پلٹتے ہیں۔ روپ اطمینان سے چمپا کے پاس جاتی ہے۔ چھری جو مدن نے اُس کے ہاتھ سے چھین کر میز پر ڈال دی تھی۔ اُٹھا کر اچانک چمپا کے سینے میں بھونک دیتی ہے سب ارے کرکے رہجاتے ہیں چمپا تڑپنے لگتی ہے اور ذرا سی دیر میں سرد ہو جاتی ہے۔

مدن:۔ (سخت بدحواس ہو کر پہلوان اور منو سے) جلد سے جلد اسے دفن کرادو اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ نہیں تو ہم میں سے کسی کی جان کی خیر نہیں۔

پہلوان:۔ (نہایت پریشانی کے عالم میں) اچھا سرکار۔

دن کا وقت۔ موہنی اور اندر سنگھ ساتھ ساتھ پریم سنگھ کے مکان سے نکلتے ہیں۔ باہر موٹر کھڑی ہے۔ اُس میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔

موہنی:۔ اوّل تو امید ہے کہ میں اکیلی ہی اُن کے چھڑانے میں کامیاب ہو جاؤنگی لیکن اگر ہم لوگ رات میں کسی وقت واپس آجائیں تو دن نکلنے سے پیشتر آپ مع مسلح پولیس کے پہونچ جایئے۔

اندر سنگھ:۔ بہن تم خواہ مخواہ اپنے کو خطرہ میں ڈال رہی ہو، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

موہنی:۔ نہیں بھیا آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ ایشور چاہے تو سب اچھا ہی اچھا ہوگا۔

یہ لوگ موٹر میں (پبلک گارڈن) باغ کے دروازہ پر پہونچ جاتے ہیں۔

موہنی:۔ بس اب آپ یہیں کہیں ٹھہر جایئے۔

موہنی باغ کے اندر چلی جاتی ہے۔ اندر سنگھ باہر رہ جاتا ہے۔ موہنی اُسی جگہ پہونچی ہے نمبر ۹۹ اُس کا منتظر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھکر دیش سیوک کی جے۔ کہتے ہیں۔ دونوں بہت خوش نظر آتے ہیں۔ باغ سے نکل کر نمبر ۹۹ ایک ٹیکسی کو آواز دیتا ہے۔ دونوں اسمیں بیٹھکر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اندر سنگھ اپنی موٹر میں اس ٹیکسی کا تعاقب کر رہا ہے۔ موہنی کی ٹیکسی بہت آگے ہے۔ اندر سنگھ باربار دوربین سے دیکھتا ہے۔ آخر موہنی کی ٹیکسی ٹھہرتی ہے اندر سنگھ بھی اپنی موٹر روک لیتا ہے۔ نمبر ۹۹ اور موہنی اُتر پڑتے ہیں اور ٹیکسی رخصت کردی جاتی ہے۔ نمبر ۹۹ اور موہنی کچھ دُور پیدل چلتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک اور موٹر اُنکی منتظر ہے اُس میں بیٹھکر پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اندر سنگھ فاصلے سے تعاقب کر رہا ہے۔ آخر موہنی کی موٹر رکتی ہے۔ موہنی اور نمبر ۹۹ دونوں اُتر کر گھنے جنگل میں داخل ہوتے ہیں۔ اندر سنگھ بہت دُور فاصلے پر اپنی موٹر روکتا ہے اور اور موٹر کو ایک طرف چھپا دیتا ہے۔ خود دوربین ہاتھ میں لئے چھپتا ہوا اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ یہ لوگ ایک پرانی گڑھی میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے کچھ حصے ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر

ہوگئے ہیں اور کچھ حصے ابھی تک صحیح و سالم باقی ہیں۔ اندر سنگھ پلٹ آتا ہے۔

نمبر ۹۹ دروازہ پر "دیش سیوک کی جے" کہتا ہے۔ دروازہ کھل جاتا ہے۔ دونوں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ پھر بند کردیا جاتا ہے۔

نمبر ۹۹:۔ (پہرہ دار سے) سردار ہیں؟

پہرہ دار:۔ نہیں۔ وہ تو صبح سے کسی ضروری کام سے شہر گئے ہیں۔

نمبر ۹۹:۔ (موہنی سے) سردار کے آنے تک آپکو انتظار کرنا پڑے گا۔

موہنی:۔ (چھری نکالکر) آہ! کب تک انتظار کرنا پڑیگا۔

نمبر ۹۹ موہنی کو اپنے ساتھ ایک کمرہ میں لیجاتا ہے جہاں کافی ہتھیار اور میگزین موجود ہے۔ کمرہ میں داخل ہوکر نمبر ۹۹ پٹیاں نیکر وغیرہ فوجی وردی پہن لیتا ہے اور موہنی سے کہتا ہے۔

نمبر ۹۹:۔ آپ تھوڑی دیر یہاں آرام کیجئے۔ میں ڈیوٹی پر جاتا ہوں۔ سردار کے آتے ہی آپ کو اُن سے ملا دونگا۔

یہ کہہ کر چلا جاتا ہے۔ پریم سنگھ کی کوٹھری کے دروازہ پر پہونچکر پہرہ دار سے کنجی لیتا ہے اور اُسکو رُخصت کرتا ہے۔ پہرہ دار اُسی کمرہ میں آتا ہے جس میں موہنی بیٹھی ہے۔ موہنی کو دیکھکر "دیش سیوک کی جے" کہتا ہے۔ موہنی بھی اسی طرح جواب دیتی ہے۔ یہ شخص وردی اُتار کر سادہ کپڑے پہن لیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد موہنی اُٹھکر ادھر اُدھر ٹہلتی ہے۔ ہر چیز کا اندازہ کرتی ہے۔ خصوصاً ہتھیاروں کا جائزہ لیتی ہے۔ پھر اپنے کپڑوں میں سے ایک پستول نکالکر اچھی طرح اُسکی جانچ کرتی ہے اور پھر اپنی ساڑی میں چھپا لیتی ہے۔ دو منٹ کے بعد کمرہ سے باہر نکلتی ہے اور اُس طرف پہونچتی ہے جہاں پریم سنگھ قید ہے۔ صرف نمبر ۹۹ پہرے پر ہے۔ بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا ہے۔ موہنی کی طرف اُس کی پیٹھ ہے۔ موہنی چپکے چپکے جاکر پستول اُسکے سامنے کردیتی ہے اور کہتی ہے۔

خاموش! کھڑے ہوجاؤ۔

نمبر ۹۹ کھڑا ہوجاتا ہے۔ موہنی اُسے ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتی ہے۔ وہ ہٹتا ہے۔ پریم سنگھ دوڑکر اپنی کوٹھری کے دروازہ پر آتا ہے اور حیران ہوکر کہتا ہے۔

موہنی!

موہنی:۔ پریم سنگھ جی۔

پریم سنگھ:۔ موہنی کوٹھری کی کُنجی اسکی جیب میں ہے۔

موہنی:۔ (نمبر ۹۹ سے) کُنجی زمین پر ڈالدو۔

نمبر ۹۹ کُنجی جیب سے نکالکر موہنی کے آگے ڈالدیتا ہے۔ موہنی کُنجی اُٹھاکر دروازہ کھولدیتی ہے۔ پریم سنگھ نکل آتا ہے اور نمبر ۹۹ کی بندوق اُٹھا لیتا ہے۔

پریم سنگھ:۔ (نمبر ۹۹ سے) آگے آگے چلو۔

نمبر ۹۹ آگے آگے چلتا ہے اور یہ دونوں پیچھے پیچھے ایک دروازہ سے گذرتے ہیں۔ چند قدم چل کر نمبر ۹۹ اس زنجیر کو کھینچ لیتا ہے جو چھت میں لٹک رہی ہے۔ الارم بج جاتا ہے۔ پریم سنگھ جھلاکر اُسکے گولی ماردیتا ہے۔ وہ آہ کرکے گرتا ہے۔

پریم سنگھ:۔ موہنی جلدی کرو۔

موہنی کا ہاتھ پکڑکے تیزی سے بھاگتا ہے۔ ابھی چند قدم جاتا ہے کہ بہت سے قدموں کی آواز آتی ہے۔

پریم:۔ آہ! قسمت نے اب بھی ساتھ نہ دیا۔

دونوں پھر پلٹتے ہیں اور دروازہ بند کرلیتے ہیں۔ دروازہ کے دوسری طرف بہت سے مسلح لوگ آجاتے ہیں۔

کئی آدمی:۔ (چلاکر) دروازہ کھولدو۔

پریم سنگھ کچھ جواب نہیں دیتا۔

ایک:- دروازہ توڑ ڈالنا چاہیئے۔

دروازہ توڑنا شروع کرتے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص کہتا ہے ٹھہرو! دروازہ مت توڑو۔ ادھر سے بھی بند کردو کہ نکل نہ سکیں اور بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مرجائیں۔

ایک اور:- بالکل ٹھیک۔

فوراً لکڑیوں، پتھروں اور مٹی کے انبار سے دروازہ ادھر سے بند کردیا جاتا ہے۔

دس بارہ شکاریوں کی ایک پارٹی جنگل میں چلی جارہی ہے۔ کچھ برجیس پہنے ہیں۔ کئی ہاف پینٹ پہنے ہیں۔ ایک بہت چوڑے چکلے صاحب فقط کرتہ پاجامہ میں ہیں۔ ہیٹ سب کے سروں پر ہیں۔ کئی ملازم ساتھ ہیں۔ ایک کے پاس شکار کئے ہوئے پرند ہیں۔ ایک کے پاس ٹفن کیریر ہیں، ایک کے سر پر صندوق ہے۔ ایک کے سر پر کچھ اور سامان لدا ہے۔

ایک شکاری:- (کرتہ پاجامہ والا) بس بھائی۔ اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔

دوسرا شکاری:- بڑے ڈھیلے آدمی ہو جی۔ صبح ڈھائی سیر پکا ناشتہ ٹھونس چکے ہو۔ اب بھوک کے مارے دم نکلا جارہا ہے۔

پہلا شکاری:- اچھا جو کچھ کہو۔ مجھ سے اب آگے نہیں چلا جائیگا۔ اب ایک قدم بڑھے تو میں گر پڑونگا۔

(سب ٹھہر جاتے ہیں۔)

تیسرا شکاری:- اچھا تو پھر اب یہیں ٹھہر جائیں۔ کھانا کھالیں اور تھوڑا سا آرام کرلیں اس کے بعد آگے چلیں گے۔

سب سامان اُتارا جاتا ہے۔ بندوقیں ایک طرف کھڑی کردی جاتی ہیں۔ کارتوسوں کی پیٹیاں اُنہیں پر لٹکا دی جاتی ہیں۔ جازم بچھائی جاتی ہے۔ صندوق میں سے رکابیاں، گلاس اور تھرماس نکلتے ہیں۔ کھانا نکالا جاتا ہے۔ سب کھانا شروع کرتے ہیں۔ جب کھانا قریب قریب کھایا جاچکتا ہے یکایک دیش سیوکوں کی ایک مسلح جماعت جس کا سردار نمبر ۵ ہے اُنہیں گھیر لیتی ہے۔ اور سب بندوقیں اور کارتوس لیکر چشم زدن میں غائب ہوجاتے ہیں۔

ایک شکاری:- (کرتے پاجامہ والے صاحب سے) یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ دو دو ڈیڑھ میل پر تو یہاں سے گاؤں ہے۔ وہاں چل کے کھانا کھالیتے تو ایسی مصیبت تھی۔ مگر تمہارا تو دم نکلا جارہا تھا۔

پاجامہ والا:- میری وجہ سے ہوا یا بندوقوں کی وجہ سے ہوا، میں تو اسی وجہ سے ہمیشہ سے مچھلی کے شکار کا طرفدار ہوں۔ پھر میں نے کیا ان حرامزادوں سے سازش کرلی تھی کہ ہمیں لوٹ کے لیجانا۔

ایک اور شکاری:- میری بندوق دادا جان کے وقت کی تھی، غدر میں اُنھوں نے کسی رئیس سے چھینی تھی۔ اب ایسی چیز نصیب نہیں ہوسکتی۔

پاجامہ والا:- بس تو یہ ساری نحوست تمہاری ہی بندوق کی تھی۔ چوری کا مال چوری میں گیا اور دوسروں کا بھی نقصان کرگیا۔

ایک اور شکاری:- اب ان فضول باتوں سے کیا فائدہ۔ فوراً چل کے پولیس کو خبر دینی چاہیئے۔

پاجامہ والا:- (پریشان ہوکر) کیا؟ ابھی پھر چلنا ہوگا! ابھی کھانا کھایا ہے۔ یار کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ ذرا دم تو لینے دو۔ پولیس کو فوراً خبر کرنے سے بندوقیں تو ملنے سے رہیں۔

ایک اور شکاری:- (جھلاکر) اچھا تو اب تم یہاں آرام کرو ہم تو جاتے ہیں۔

(سب چل پڑتے ہیں)

پاجامہ والا:- توبہ توبہ۔ عجب نامعقول آدمی ہو۔

سب کے پیچھے گرتا پڑتا روانہ ہوتا ہے۔

موہنی اور پریم بند ہیں۔ دونوں بھوک اور پیاس سے بدحال ہیں

موہنی:- آہ! پیاس کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔

پریم:- ابھی تو پانی باقی ہے۔ (صراحی اٹھا کر لاتا ہے اور موہنی کو پانی پلاتا ہے۔)

موہنی:- (صراحی میں پانی کا اندازہ کرکے) بس کوئی آدھا گلاس اور ہوگا۔ اگر جلدی اندر بھیا نہ آگئے تو ہمارا خاتمہ ہے۔

پریم بھی پیاس سے بدحال ہو رہا ہے۔ اسکی تشنگی کو دیکھ کر:-

موہنی:- پریم۔ تھوڑا سا تم بھی پی لو۔ میرے پیارے بس ایک گھونٹ۔

پریم:- نہیں موہنی۔ یہ تم اپنے لئے رہنے دو۔ میں ابھی پیاس کو برداشت کر سکتا ہوں۔

پولیس پارٹی اور اندر سنگھ لاری میں دلش سیوکوں کی گڑھی کی طرف جا رہے ہیں۔ لاری رکتی ہے۔ سب اتر کر اندر سنگھ کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور گڑھی کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔

پریم اور موہنی کی حالت لحظہ بلحظہ بدتر ہو رہی ہے۔ پریم دیوانہ وار ادھر ادھر دوڑتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پانی ختم ہو چکا ہے۔ موہنی تڑپ رہی ہے۔ پریم صراحی سے باقی ماندہ چند قطرے موہنی کے حلق میں ٹپکاتا ہے۔

موہنی:- (آنکھیں بند کئے ہوئے) آہ - اوف - (گلے پر ہاتھ رکھ کے) ارے۔

پھر آنکھیں کھول دیتی ہے اور بیٹھنا چاہتی ہے۔ مگر کمزوری سے گر پڑتی ہے۔

دونوں طرف سے گولی چل رہی ہے۔ دو سپاہی زخمی ہو کر گرتے ہیں۔ آخر دھاوا کرکے پولیس والے دروازہ توڑ ڈالتے ہیں اور اندر گھس جاتے ہیں۔ زور کی جنگ ہوتی ہے۔ کتنے ہی سازشی زخمی اور مقتول ہوتے ہیں۔ بالآخر پولیس اس راستہ کے سرے تک پہونچ جاتی ہے۔ آگے راستہ بند ہے۔ اندر سنگھ ایک سازشی کا گلا دباتا ہے۔

بتا! پریم سنگھ اور موہنی کہاں ہیں؟

سازشی:- (گھٹی ہوئی آواز سے) ارے۔ ارے۔ ارے۔ اچھا بتاتا ہوں۔ یہ جو دیوار ہے اس کے اسطرف کمرے میں بند ہیں (پولیس مٹی، پتھر، اور لکڑیاں ہٹانا شروع کرتی ہے۔)

موہنی اب بری طرح تڑپ رہی ہے۔ پریم کا بھی حال خراب ہے، آخر موہنی پریم کے زانو پر گر کر بیہوش ہو جاتی ہے۔

پریم دیوانہ وار چلاتا ہے:-

موہنی! موہنی! - آہ موہنی! ارے ارے - آہ - آہ -

خود بھی پیاس کی شدت سے گرتا ہے۔ ایک منٹ تک دونوں بے حال پڑے رہتے ہیں۔ پھر پریم سنبھلتا ہے۔ پھر موہنی موہنی کہہ کر چلاتا ہے۔ پھر موہنی آنکھیں کھولتی ہے مگر ضعف کے مارے بول نہیں سکتی۔ اشارے سے کہتی ہے کہ دم نکل رہا ہے اور پریم کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے۔

اس طرف دیوار ٹوٹ چکی ہے۔ اندر سنگھ چلاتا ہے:-

بھیا! بھیا!! دروازہ کھولدو۔ ہم لوگ آگئے۔

پریم سنگھ :- اِندر- آہ- ارے-

کوشش کرکے دروازہ کھولنے کو اُٹھتا ہے- ضعف سے گر پڑتا ہے- پھر اندر کو آواز دیتا ہے:-

اندر! اندر!! پانی-

اندر سنگھ :- بھیّا آپ دروازہ تو کھول دیجئے- پریم پھر ایکبار کوشش کرتا ہے- بڑی دشواری سے اُٹھتا ہے- کُنڈی تک ہاتھ لیجاتا ہے اور پھر گرتا ہے- پھر اُٹھتا ہے اور آخر کُنڈی کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اب کے جو گرتا ہے تو بیہوش ہو جاتا ہے- لوگ پانی لیکر دوڑتے ہیں- پریم کے منہ میں تھوڑا سا پانی چُواتے ہیں- ایک شخص موہنی کے مُنہ میں پانی ڈالتا ہے- پریم سے پہلے موہنی ہوش میں آتی ہے اور پریم! پریم!! کہہ کر چلّاتی ہے-

اندر سنگھ :- بہن گھبرائیے نہیں- اب کچھ خطرہ نہیں-

موہنی اُٹھنا چاہتی ہے اور کہتی ہے-

اندر بھیّا! پریم سنگھ جی.......

اتنا کہہ کر پھر گر جاتی ہے- اتنے میں پریم کی حالت سنبھل جاتی ہے اور وہ اُٹھکر موہنی کا سر اپنے زانو پر رکھکر تھوڑا سا پانی اُسے اور پلاتا ہے- موہنی کی حالت سنبھلتی ہے- جسوقت یہ ہنگامہ ہو رہا ہے- ایک ولیش سیوک ایک کمرہ میں سے راتے بہادر بنارسی داس کے بچّہ کو نکالتا ہے اور لیکر بھاگتا ہے بچّہ چلّاتا ہے- اندر سنگھ دوڑ پڑتا ہے- اس کے ساتھ اور سپاہی بھی- آخر دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بچّہ کو لئے جاتا ہے-

اندر سنگھ :- خبردار بدمعاش- کہاں جاتا ہے-

ولیش سیوک پلٹ کر پستول کا ایک فیر کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"میرا پیچھا کیا تو دوسری گولی اِس بچّہ کے سینے میں ہوگی-

یہ کہہ کر پھر بھاگتا ہے-

اندر سنگھ اور سپاہی یکایک ٹھہر جاتے ہیں- مگر فوراً ہی اندر سنگھ ایک سپاہی سے بندوق لیکر نشانہ لگاتا ہے- گولی ولیش سیوک کی ٹانگ میں لگتی ہے- اندر سنگھ اور سپاہی جھپٹتے ہیں- ولیش سیوک لڑکھڑا کر گرتا ہے- بچّہ اُس سے چھوٹکر ایک طرف گرتا ہے- ولیش سیوک سنبھل کر اُس پر پستول چلانا چاہتا ہے- اندر سنگھ ایک فیر اور کرتا ہے جس سے ولیش سیوک وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے- اندر سنگھ دوڑ کر بچّہ کو گود میں اُٹھا لیتا ہے- پیار کرتا ہے- اور لیکر واپس آتا ہے-

---

جیل سے ایک موٹر لاری میں مُکرجی- ٹنڈن- اور دوسرے سازشی عدالت کو لیجائے جا رہے ہیں- جس وقت یہ لاری سڑک کے ایک سُنسان موڑ پر پہونچتی ہے- ایک طرف سے گولی چلتی ہے- موٹر لاری کے ٹائر پھٹ جاتے ہیں اور ذرا دُور گھسٹ کر لاری ٹھہر جاتی ہے- اُسی طرف سے کئی فیر اور ہوتے ہیں جیل گارڈ سب اُسی طرف بندوقیں جھپٹیا کر دوڑتے ہیں اور فیر کرتے ہیں- مخالف فیر کرتے جاتے ہیں اور بھاگتے جاتے ہیں- گارڈ تعاقب کر رہا ہے- جب وہ لاری سے کافی دُور ہو جاتا ہے تو سڑک کے دوسری جانب سے ایک اور مسلح دستہ نمودار ہوتا ہے- ان میں امر سنگھ بھی ہے جو لاری پر پہونچکر سازشیوں کی ہتھکڑیاں کھول دیتا ہے- سب لاری سے اُترنے لگتے ہیں- کچھ دُور پر ایک خالی موٹر اور کھڑی ہے اس طرف لپکتے ہیں- اتنے میں مدن کی موٹر آ پہونچتی ہے جو بنج پورہ سے واپس آ رہا ہے- مدن کا موٹر ڈرائیور یہ ہنگامہ دیکھکر موٹر روک لیتا ہے-

امر سنگھ کی نظر روپ کماری اور مدن لال پر پڑتی ہے- وہ سب کو چھوڑ کر اُدھر جھپٹتا ہے اور روپ سے مخاطب ہو کر:-

امر سنگھ :- اب سمجھا۔ مجھے کس لئے اس خونی کے قتل سے روکا گیا تھا۔

پھر فیر کرتا ہے اور کہتا ہے :-

خون کا بدلہ خون۔

پستول خالی جاتا ہے۔ مدن گاڑی میں نیچے دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ روپ کماری شور مچاتی ہے۔

روپ کماری :- امر سنگھ! خدا کے لئے اب فیر نہ کرنا۔

امر سنگھ :- (گرج کر) بس خاموش رہو۔

یہ کہہ کر ایک فیر اور کرتا ہے۔ گولی مدن کی پیٹھ میں لگتی ہے اور وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اتنے میں پولیس کی لاری جس میں پریم سنگھ۔ اندر سنگھ۔ موہنی۔ بچہ اور پولیس والے ہیں آپہونچتی ہے۔ اب دونوں طرف سے گولیاں چلتی ہیں۔ آخر سازشی مغلوب ہو جاتے ہیں اور سب گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔

روپ کماری ایک مقتول سازشی کی کمر سے چھرا نکال کر اچانک موہنی پر حملہ کرتی ہے مگر پریم درمیان میں آجاتا ہے۔ موہنی کے اوچھا سا زخم لگتا ہے۔ روپ اپنی ناکامیابی دیکھ کر وہی چھرا اپنے سینے میں بھونک لیتی ہے اور گر کر مر جاتی ہے۔

قارئین ساقی! خاتمہ پر اس افسانہ کے معرض تحریر میں آنے کی وجہ بھی سن لیجئے کہ وہ بھی دلچسپی خالی نہیں بلکہ اس داستان کا ایک حصہ ہے۔ کپتان پریم سنگھ میرے بہت عزیز دوست ہیں۔ جس روز موہنی دیوی سے اُن کی شادی ہوئی میں نے یہ پوری داستان اپنے ہاتھ سے لکھ کے اور نہایت خوبصورت جلد بندھوا کر "ہدیہ عروسی" کے طور پر اُنکے نذر کی۔ موہنی اور پریم دونوں نے اس ناچیز ہدیہ کو اُن بہت سے قیمتی تحفوں سے کہیں زیادہ پسند کیا جو شادی کے موقع پر اُن کے دوستوں نے اُنہیں دئے تھے۔

جیسا کہ میں ابتدا میں بیان کر چکا ہوں اس افسانہ کے بعض واقعات کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں نے افسانہ کی خاطر اُنہیں باہم مربوط کر دیا ہے۔ تاہم اس داستان کا ایک بہت بڑا حصہ پریم اور موہنی کے واقعات زندگی پر مبنی ہے۔

پریم پجاری؛

فولادی عشق

م۔و

وائرلس کی ایجاد کے بعد بجلی جو کبھی عضب الٰہی کی ایک لہرتی قدرت کی مہر ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے حیرت انگیز کارناموں سے دنیا اب تک جسقدر واقف ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ معجز نمایہ ثابت ہونے والی ہے۔ ہر انسانی ضرورت اس کی منت مند ہوتی جاتی ہے۔ رزم سے لے کر بزم تک اسی کے کرشمے نظر آنے لگے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے لئے ابھی بہت سی چیزیں اس "قہر و مہر" کے پُراسرار خزانہ میں موجود ہیں۔ قدرت کی لامتناہی فضا میں سائنٹیفک جد وجہد کا جتنا وسیع میدان اس نے پیش کیا ہے شاید ہی فطرت کی کسی دوسری مخفی طاقت کو نصیب ہوا ہو۔ اس کی سیکڑوں کرامتیں، ہزاروں جادوگریاں ہم دیکھ چکے ہیں، دیکھ رہے ہیں اور خدا معلوم کتنی ابھی دیکھنی باقی ہیں۔

ایکس ریز کے کمالات ہم دیکھ چکے۔ باطن کے سارے راز کھل گئے۔ وائرلس جہاز ہماری نظروں کے سامنے ہیں جن کا آبی سفر ریڈیو کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ریڈیو طیارے بھی کرہ ہوائی پر اپنا تسلط جمانے کے لئے موجود ہیں نہ کسی ہواباز کی ضرورت ہے نہ پائلٹ کی حاجت۔ آوازوں کا انضباط اور انتشار بھی معمولی بات ہوگیا ہے۔ لندن کی تقریریں دہلی میں سن لیجئے۔ موٹر میں سفر کرتے کرتے دنیا کے واقعات سے باخبر ہو جائیے۔ ٹیلی وژن پر آواز بھی سنئے اور صورت بھی دیکھئے۔ سینما میں بغیر پردے کے تصویریں ناچنے لگی ہیں۔

یہ عجائبات تو تھے ہی۔ اب کچھ دن سے ایک عجیب تر چیز ظہور میں آئی ہے جس کو ریڈیو روبوٹ (Radio Robot) کہتے ہیں۔ یہ مصنوعی انسان ہے جو ریڈیو کے ذریعہ سے سارے کام کرتا ہے۔ چوراہوں پر اس سے رہنمائی کی جاتی ہے۔ ناجائز ہجوموں میں یہ مضبوط سپاہی کا فرض انجام دیتا ہے۔ بنکوں اور پبلک اداروں میں بلوائیوں کا حملہ نہیں ہونے دیتا۔ اسٹیج پر ہاتھوں کے اشارے سے رقص سکھاتا ہے۔ یہ پتلے مختلف شکل وصورت کے ہوتے ہیں۔ جو کام ان سے لینا منظور ہوتا ہے اس لحاظ سے ہاتھ پاؤں سر اور گردن حرکت کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں برچ لائٹ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس فولادی پتلے میں کچھ اس قسم کی احساسی قوت رکھی ہے کہ پیر کی آہٹ اور روشنی کی شعاع سے یہ زندہ ہو کر فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔

ایک پروفیسر نے اس میں تکلم اور نشست وبرخاست کا خاصہ بھی رکھا ہے۔ مزاج پوچھتا ہے۔ جواب دیتا ہے۔ شکریہ ادا کرتا ہے۔ سگرٹ پیتا ہے۔ دوسرے کا سلگاتا ہے۔ تھیٹر کے ٹکٹ گھر کے پاس کھڑے ہو کر تماشائیوں کی گنتی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح طب کے ایک ماہر نے ایسا روبوٹ بنایا ہے جو علم تشریح کی تعلیم کے لئے ایک بہترین چیز ہے۔ اس کے اندر تمام انسانی اعضا موجود ہیں اور وہ سب متحرک ہو سکتے ہیں۔ علاج ہی سے یہ تکلیف کا اظہار کرتا ہے۔ امراض کی زحمتوں کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ ہنسی کے موقع پر ہنستا ہے اور رونے کی جگہ روتا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بالکل آنکھ کی ساخت پر بنائی گئی ہیں۔ آنکھ بنانے کی مشق ان پر کی جاتی ہے۔

جرمن کے ایک جادوگر نے تو یہ غضب دکھایا ہے کہ اس بجلی کے کھلونے میں جان ڈال دی ہے۔ ستم ظریف نے اس میں جذبات بھی پیدا کرنے چاہے ہیں لیکن پہلے صرف حسن وعشق کے جذبے کی آزمائش کی گئی۔ اور جیسا یہ انسانوں کے لئے ہلاکت آفریں اور تکلیف دہ ہے ویسے ہی ان فولادی دل وگردہ والوں کے واسطے بھی ثابت ہوا۔ بنانے کو تو بنانے والے نے یہ طلسمی پتلے بنا ڈالے۔ اور ان کا چہرہ مہرہ۔ خد وخال۔ ہاتھ پاؤں۔ کمر۔ چال ڈھال۔ لب ولہجہ، وہی نزاکتیں اور دلفریبیاں بھی بھر دیں جو اس قسم کے جذبات کے لئے ضروری ہیں۔ مگر جب ہر طرف سے ان کے معاشقہ کی داستانیں، ان کے پریشان کن واقعات سامنے آنے لگے اور پولس کی بازپرس نے ناک میں دم کر دیا تو یہی ایجاد ایک عذاب بھی ہوگئی۔

یورپ تنوع پر مرتا ہے۔ وہاں کی جدت پسندی نے اول اول اس طرف کافی توجہ کی۔ سینکڑوں پتلے فروخت ہوگئے۔ کسی نے اپنی خدمت کے لئے نوجوان حسین کا پتلا خریدا۔ تو کسی نے ایک حسین پتلی اپنی دل لگی کا مشغلہ سمجھ کر خریدی۔ چنانچہ ایک امیر گھر میں اس طرح کی ایک پتلی تھی۔ اور قریب کے مکان میں ایک پتلا۔ دونوں اپنے مالکوں کی فراخ دستیوں کی بدولت پرستان کی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ نکلتے بیٹھتے دونوں کا آمنا

سامنا ہو گیا۔ جذبہ محبت رنگ لایا۔ شام ہوئی اور دونوں غائب، رفتہ رفتہ مالکوں کو ان کی عدم موجودگی محسوس ہوئی۔ فہمائش کی گئی۔ مگر بے سود ایک روز اس فولادی پتلی للی کے آقا ہوا کھاتے ہوئے اتفاق سے قریب کے پارک میں نکل گئے۔ پھرتے پھرتے ایک گوشہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی للی اور ان کے پڑوسی نواب کا فولادی خدمت گار ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انھیں پہلے غصہ آیا، پھر تعجب ہوا چند منٹ تک ان کے معاشقہ کی سیر دیکھتے رہے۔ لیکن جب ان کی بے تکلفی ختم ہونے پر ہی نہیں آئی تو انھوں نے تحکمانہ لہجہ میں پکار کر کہا۔

للی! یہ کیا ہو رہا ہے؟

للی نے پلٹ کر جو دیکھا تو اپنے آقا پر نظر پڑی۔ بغیر کچھ جواب دیئے وہ تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئی۔ اور وہ فولادی نوجوان منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ گھر پہنچ کر مالک نے اپنے پڑوسی نواب کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اور ایک خط ان کے موجد ڈاکٹر کو لکھا کہ آپ کے ان پتلوں کا جذبہ عشق حد سے گزر گیا ہے۔ اس کی تدبیر ہونی چاہیئے۔

ادھر تو للی کی مالکہ نے للی کو ڈانٹا ڈپٹا اور ادھر اس نواب کی بیگم نے اپنے ڈارلنگ کو ملامت کی اور اس سے وعدہ لیا کہ آئندہ للی کے ساتھ کہیں نہیں جائیگا۔ لیکن گوشت کے بنے ہوئے انسانوں میں جب محبت کے نقش بن کر نہیں مٹ سکتے ہیں تو ان فولادی پتلوں کے یہ جذبات کیونکر فنا ہو سکتے تھے۔ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اور جب کبھی ان پر سختی کی گئی یہی جواب ملا کہ "ہم مجبور ہیں۔ فولادی انجن نے ہمیں وابستہ کر دیا ہے۔" مجبوراً للی کارخانہ بھیج دی گئی اس درخواست کے ساتھ کہ اس کے دماغ کا وہ خانہ جس میں محبت پرورش پاتی ہے فنا نگ کر دیا جائے۔ کارخانہ جاتے جاتے للی ڈارلنگ سے اشارے کرتی گئی جو اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کھڑا ہوا دیدار بازی کا منتظر تھا۔

للی دست بدست دگرے کارخانہ پہنچی۔ تو ڈارلنگ بھی تماشائیوں کی بھیڑ میں موجود تھا۔ ڈاکٹر جب للی کو اپنے خاص کمرے میں لیگیا تو ڈارلنگ نے دروازہ کے شیشوں میں سے جھانکنا شروع کیا۔ ڈاکٹر نے اپنے اوزار درست کرتے ہوئے للی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"للی! تم نے ہماری ہنرمندی کو بدنام کر دیا۔"

"بدنامی! میں نے تو آپ کے کمال کو چار چاند لگا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب!

"پھر تمھارے مالک کو تمھاری شکایت کیوں پیدا ہوئی؟"

"رقابت!"

"رقابت کیسی؟"

"وہ اپنے لئے میری محبت کا طلبگار رہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کی ہوس رانیوں کا جواب دوں۔ مگر فولاد میں نرمی کہاں۔ فولادی دل کو متاثر کرنے کے لئے فولادی ہی دل چاہیئے۔"

ڈاکٹر یہ سن کر متحیر ہو گیا۔ وہ اپنی ایجاد پر نازاں تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے پیدا کئے ہوئے احساسات اس درجہ مکمل ہیں۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس اثنا میں للی کی نظر دروازے پر پڑی۔ دیکھا کہ ڈارلنگ کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ للی بے چین ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ڈاکٹر نے اپنے اوزار سنبھالے للی کے قریب گیا اور اس کے بالوں کے نیچے گدی پر کچھ ٹٹولنے لگا۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ للی رو رہی ہے اس نے پوچھا۔ للی! تم کیوں رو رہی ہو؟"

للی۔ "اس لئے کہ آپ محبت کو مٹانا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر۔ وہ محبت جس سے دوسروں کو تکلیف ہو مٹانے کے قابل ہے۔

للی۔ محبت اگر مٹ گئی تو زندگی میں لطف کیا؟

ڈاکٹر۔ بات تو ٹھکانہ کی ہے۔

للی۔ تو پھر یہ آپ کا ظلم ہوگا۔

ڈاکٹر۔ کس طرح؟

للی۔ اس طرح کہ میرے ساتھ ایک اور زندگی تباہ ہونے والی ہے۔
ڈاکٹر۔ وہ کون ہے؟
للی۔ ڈارلنگ!

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنسا اور یہ کہہ کر "مصنوعی زندگی بھی کتنی محسوسات سے لبریز ہوسکتی ہے" اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اس مشین کا اوپر کا حصہ کھول ڈالا۔ دماغ کے کل پرزوں پر غور کیا۔ کچھ چھوٹی چھوٹی ہیبتیں تھیں۔ کسی کے نقوش چاقو کی نوک سے کھرچے کسی کے گہرے کئے۔ کوئی پیچ ڈھیلا کیا۔ کوئی کسا۔ اور پھر اس نے ہر پرزہ کو اپنی جگہ رکھکر سر کو سر کی جگہ جوڑ دیا۔

للی زندہ ہوگئی اب اس کی نگاہوں میں نہ پہلا سا رسیلا پن تھا نہ اس کے چہرے پر وہ تاثرات قلبی کی علامتیں۔ وہ محض ایک فولادی پتلا تھی۔ ڈاکٹر نے کمرے کے کواڑ کھول دیئے اور کہا "للی جاؤ۔ اپنے مالک کے پاس جاؤ۔ اب تم سے اس کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

آگے آگے للی تھی اور پیچھے پیچھے ڈارلنگ۔ راستہ میں کئی مرتبہ ڈارلنگ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن للی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس جگہ پہنچ کر جہاں سے دونوں کو الگ ہونا چاہیئے تھا جب ڈارلنگ نے للی کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا کہ "للی کیا تمہاری محبت میرے لئے ختم ہوگئی؟ کیا مجھ کو تمہاری طرف سے مایوس ہوجانا چاہیئے؟" تو وہ ہاتھ جھٹک کر یہ کہتی ہوئی کہ "محبت! کیسی محبت! میں اس جذبہ سے بالکل خالی ہوں" روانہ ہوگئی۔ اور ڈارلنگ حیرت زدہ مایوس کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایک عجیب تماشہ تھا۔ فولادی پتلے کا دل پانی ہو ہو کر آنکھوں سے بہ رہا تھا۔ جسم تھرتھرا رہا تھا اور اس کی ساری مصنوعی دنیا تاریک تھی۔

خدا معلوم کتنی دیر ڈارلنگ اس چوراہے پر کھڑا رہا۔ آخر ایک سخت گرفت نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنے مالک کو خفا ہوتے ہوئے دیکھا۔ آقا کی ہر ملامت کا جواب صرف آنسو تھے۔ جب ملامت اور آنسوؤں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تو تنگ آکر ڈارلنگ بولا "میرے آقا! اب میں آپ کے مطلب کا نہیں رہا۔ مجھکو میرے حال پر چھوڑ دیجئے یا کارخانہ بھیجکر للی کی طرح میرے دماغ کی کل بھی درست کرا لیجئے۔" آقا نے ڈارلنگ کو کوئی جواب نہیں دیا اور اس کو ساتھ لے کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ بھر ڈارلنگ کی نگرانی کرنی پڑی کیونکہ وہ ہر دس قدم پر رک جاتا تھا اور بچوں کی طرح مچلنے لگتا تھا۔

گھر پہنچکر آقا اور ان کی میم صاحب میں دیر تک مباحثہ رہا۔ صاحب ڈارلنگ کو بھی للی جیسا جذبات محبت سے بیگانہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ اس کو محض ایک بوائے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ لیکن گھر کی مالکہ یہ سادگی چاہتی نہ تھی۔ وہ اس میں حسن و عشق کے تمام کرشمے دیکھنا چاہتی تھی جو فیشن ایبل دنیا کا ایک ضروری جزو ہے۔ ایسے معاملات میں فتح ہمیشہ صنف نازک کی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ڈارلنگ کا عشق بدستور کارفرما رہا۔ اور ڈارلنگ ہر طرف سے بے نیاز ہوکر للی اور صرف للی کے خیال میں محو ہوگیا۔ مالک اور مالکہ میں اس کے متعلق کئی دفعہ شکر رنجی بھی ہوئی۔ خانہ داری کی زندگی بدمزہ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مگر نہ ڈارلنگ کا علیحدہ کرنا امکان میں تھا اور نہ ڈاکٹر سے اس کی اصلاح کرانا۔

ڈارلنگ اس اندرونی کش مکش سے بہت بے چین تھا۔ ادھر للی کی محبت اس کو چیرتی چلی جاتی تھی اور ادھر مالکہ کا ظالمانہ شوق آٹھ پہر اس کی جان نکالے لیتا تھا۔

دوگونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را ؛ بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلےٰ

اس کشاکش کا انجام یہ ہوا کہ ایک دن ڈارلنگ نے اس حرماں نصیب زندگی سے تنگ آکر خودکشی کی ٹھان لی۔ بندوق ریوالور، خنجر یا کوئی زہریلی چیز تو اس فولادی جان کے لئے کچھ مؤثر نہ تھی۔ مشین کی موت کے لئے تو مشین کی ترتیب کا انتشار ہی ہونا چاہیئے اور یہ ترکیب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ جہاں للی پر دستکاری کی گئی تھی۔ چنانچہ وہ موقع کا منتظر رہا اور شام کو جب اس کی مالکہ ہوا خوری کو گئی تو یہ بھی چپکے سے نکل گیا اور قریب کے پارک میں ایک سنسان جگہ جا بیٹھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنی گردن کے پیچ ڈھیلے کرنے شروع کئے۔ جو پیچ کھلتا یہ اسے دور جا کر پھینک آتا۔ اس طرح دماغ کے کئی ضروری پرزے بھی اس نے نکال کر پھینک دیئے۔ اب اس کے بے جان ہونے میں صرف اتنی کسر تھی کہ سر دھڑ سے الگ کر دیا جاتا جس کے لئے مددگار کی ضرورت تھی۔ مددگار وہاں کہاں؟ آخر اس نے کھڑے ہوکر زور سے اپنے بدن کو جنبش دی۔ اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنے سر کو دور پھینک دیا۔

سر کا الگ ہونا تھا کہ ایک ہولناک آواز نکلی۔ پانی کا ایک فوارہ سا چھوٹا اور ڈارلنگ کا سارا جسم پرزے پرزے ہو گیا۔

صبح کو پولیس اسٹیشن پر ہزاروں تماشائیوں کا اجتماع تھا۔ بیسیوں فولادی پرزے بکھرے پڑے تھے۔ "فولادی پتلے کی خودکشی" کے عنوان سے اخباروں میں خبریں شائع ہو رہی تھیں اور خفیہ پولیس اس خودکشی کی تفتیش کے لئے سرگرم کار تھی۔ محکمہ سراغرسانی میں یہ ایک نئی چیز تھی اس لئے ہر شخص دلچسپی لے رہا تھا۔

اشرف صبوحی (منشی فاضل)

"پروین!"

بہت ممکن تھا میں راز محبت فاش کر دیتا

مگر دنیائے شعر و نغمہ کا خواب حسیں "پروین!"

ترے دلکش تکلم کی حسیں خاموشیاں آئیں
حسیں خاموشیوں کے بعد نغمہ کوشیاں آئیں

یہ نغمہ کوشیاں گذریں تو پھر بیہوشیاں آئیں

نہ کر سکتا میں اظہار —— گو کئی پہلو میں دل ہوتے

"ندامت" نے مری دیکھے —— عزائم مضمحل ہوتے

جو دل میں ہے وہ تجھ پہ ہی عیاں اے کاش کر دیتا

× × × × × × × ×

بہت ممکن تھا راز عشق طشت از بام ہو جاتا

مگر حسن و لطافت کا ہجوم مرمریں "پروین!"

تری پر کیف نظروں کی سرور افشانیاں آئیں
تری معصوم باتوں کی جنوں سامانیاں آئیں

ترے جوش جوانی کی حسیں طغیانیاں آئیں

نہ ہو سکتا یہ ظاہر —— گو کئی پہلو میں دل ہوتے

مرے جذبات نے دیکھے —— عزائم مضمحل ہوتے

یہ حسرت ہی رہی اے کاش میں "بدنام" ہو جاتا

اثیم نیازی

ایک خط

ایک دن صبح ہی صبح اختر میرے ہاں آئے۔ کہنے لگے چلو عثمان ساگر چلیں۔ عثمان ساگر دکن دیس کا ایک خوبصورت تالاب ہے۔ تالاب کیا ہے؟ سخی کا دل ہے کہ خود بھی شاداب ہے، دوسروں کو بھی شادکام کرتا ہے۔ ابھی شہر میں چہل پہل نہ ہوئی تھی۔ زندگی کچھ سوتی کچھ جاگتی تھی۔ کہیں سڑکوں پر ایک دو رہرو نظر آجاتے۔ کبھی سن سے کوئی موٹر گزر جاتا۔ اس وقت اختر موج (موڈ) میں تھے۔ یہ موج میں ہوں تو احباب ان کے ساتھ ساتھ بہے پھرتے ہیں۔ میں بھی ساتھ ہوگیا۔ موٹر نے ہنکارا بھرا۔ ایک نرم ہچکولے سے چلا۔ پھر یہ جا، وہ جا۔ بات کی بات میں عثمان ساگر جا پہونچے۔ شہر سے اس تالاب تک صبح کی تازگی اس طرح مربوط تھی۔ جیسے کنول تہِ آب سے ابھر کے سطحِ آب پر کھل جائے! یہاں پارک کے ایک گلپوش حصے میں لبِ آب ہو بیٹھے۔ ہلکا ہلکا ابر چھایا تھا۔ تالاب کا پانی جھولا جھول رہا تھا۔ بڑی ہی پیاری صبح تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھینی فضا، ٹھنڈی ہوا، دھیمی روشنی آج ہم سے محبت کر رہی ہے! یہیں اختر نے اپنے یورپ جانے کا بھی ذکر چھیڑا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ پرند قفس سے سیرِ چمن کو جاتا تھا! جتنی دیر ہم وہاں بیٹھے رہے، جتنے رومانی سانس لئے، اب تک چیتے سے نہیں اترے۔ اختر کو ولایت جاکر برس بھر سے اُدپر ہوگیا۔ آج بھی جب کبھی جدائی کا خیال آتا ہے وہی منظر آنکھوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ اور جیسا کہ ایک منچلے نے کبھی کہا ہے، اپنا دل بھی بے اختیار کہنے لگتا ہے کہ جدائی ایک ہیرا تیار کرتی ہے جس کا نام یادِ دوست ہے!

اسی پردیسی دوست کے ایک خط سے آپ کی ادبی ضیافت کرنی ہے۔ یہ امانت میں خیانت کی صورت ضرور ہے کہ ایک ذاتی چیز منظرِ عام پر آرہی ہے۔ مگر میں اس خیال سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتا کہ اس خط کی داد نہ دینا بلکہ داد نہ دلوانا بھی بدتوفیقی ہے!

لندن

جنوری ۱۹۰۰ء

ڈیر......!

یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ میں برابر خط لکھے جاؤں، آپ یا تو جواب نہ دیں، یا دیں تو دو حرفی۔ گویا دنوں میں تو باتیں ہوں، وہ بھی اڑان گھائی کہ دل بھی نہ بھرے، سوچا تھا اب کے میں بھی نہ لکھوں گا۔ مگر ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ لکھنا ہی پڑا۔ اچھا سنئے، مگر حواس جمع کیجئے۔ جگر بھی تھام لیجئے، مجھے یاد پڑتا ہے، پہلے خطوں میں میں نے پکے ڈلی سرکس کا کچھ حال لکھا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ بڑے منجھ کا مقام ہے۔ یہاں ایک زمین دوز اسٹیشن ہے۔ جس سے اوپر آنے کے کئی راستے ہیں، ہر راستہ ایک علیحدہ سڑک پر نکلتا ہے۔ ان راستوں کے بیچوں بیچ جو جگہ چھوٹی ہوئی ہے، اسی کے نیچے اسٹیشن ہے۔ اور اوپر کا حصہ سرکس کہلاتا ہے۔ یہاں سرِ راہ بیسیوں کامنی صورتیں مل جایا کرتی ہیں۔ جیسے کسی کے انتظار میں ہوں۔ آپ ان کے پاس سے گزرئے انہوں نے تبسم فرمایا، جی چاہے تو آپ بھی ہنس دیجئے۔ چلئے دوستانہ ہوگیا! کیوں نہ ہو، یورپ متمدن اور آزاد ملک ہے۔ یہاں عورت کے مرد سے زیادہ حقوق ہیں۔ مگر یہ بات ہندوستان میں بیٹھکر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ مشاہدے کی چیز ہے! تو ہاں پرسوں کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر نیاز اور فہیم کرسمس کی چھٹیاں منانے ہمارے پاس آئے ہیں۔ یہاں کرسمس کا کیا پوچھنا۔ دس پندرہ دن پہلے سے بازاروں میں گہما گہمی ہونے لگتی ہے۔ گویا ہمارے ہاں عید کی تیاریاں ہورہی ہیں۔ خرید و فروخت بڑھ جاتی ہے۔ دکان مکان سجتے ہیں۔ چوطرف خوشی خرمی چھا جاتی ہے۔ مگر مزے کی سیر یہ ہے

کہ عین کرسمس کے دن بازاروں میں بالکل سناٹا ہو جاتا ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں جشن مناتے ہیں۔ یہ بھی عجب سیر ہوتی ہے۔ لیکن سالِ نو جیسے نوروز کہیئے بڑی بہار کا دن ہوتا ہے۔ اسی طرح اکتیس دسمبر کی رات میں پکے ڈلی سرکس خصوصیت سے دُلہن بن جاتا ہے۔ اچھی اچھی صورتیں، اچھی اچھی پوشِشیں، جدھر دیکھو آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ جوں جوں رات بڑھتی ہے، دل کی خوشیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ یہانتک کہ ادھر رات کے بارہ بجنے کو ہوئے اُدھر سب کی نظریں گھڑیوں پر جم گئیں۔ بارہ بجنے لگے تو سب خاموش ہو گئے۔ بارہ بج چُکے تو سالِ نو کی مُبارک سلامت ہونے لگی۔ اک دُھوم مچ گئی۔ مصافحے ہوئے، مُعانقے ہوئے، آرزوئے شباب کے نقشے کھنچ گئے! خیر ہم سب یار دوست مل کے نکلے۔ رات کا کھانا کوہِ نور رسٹران میں کھایا کرتے ہیں۔ بعد میں سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ دوستوں میں ایک صاحب ہیں، ان کی ذرا اور قسم کی طبیعت ہے، اس لئے ہم اُنہیں علیشی کہا کرتے ہیں۔ اتفاق سے آج وہ بھی ساتھ ہیں۔ ان کی سنگت سے اس وقت ہمیں بھی اپنے آپ یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو بڑا غضب ہے کہ سینما میں چلنے آئیں، سب کے ساتھ کوئی ہو۔ اور ہم ہجوم میں تنہا رہیں! کچھ ہو آج تو تنہا نہ جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے رسٹراں گئے۔ کچھ کھایا پیا۔ اور ٹرین میں بیٹھکر ہنڈن سنٹرل اسٹیشن پہونچے۔ وہاں اُترے۔ باہر آئے تو دیکھا کہ بلوریں دروازوں کی جھُوت میں ایک لڑکی نیچی نظروں چُپ چاپ کھڑی ہے۔ علیشی دوستانہ کرنے میں جراٰت کے آدمی بن گئے ہیں۔ مگر پھر ہندوستانی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ پُشت ہا پُشت سے جو چیز لحاظ بنکر خون میں رچ گئی ہو اُس کا سال دو سال میں نکل جانا آسان نہیں۔ اس لئے سُنا ہے، جراٰت کرتے ہیں، مگر نیا دوستانہ کرنے میں بیشتر جھجک بھی جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لڑکیوں کو مخاطب کرنے میں اُنہیں پسپائی ہوئی۔ پھر بھی اس لڑکی کو دیکھکر سوائے علیشی کے بھلا کون تھا جسے بھیجتے۔ ہم ان سے زیادہ ہندوستانی ہیں! لیکن ڈاکٹر کو مذاق سُوجھا۔ فرمایا، ان کو بھیجتے ہو؟ علیشی نے ڈاکٹر کو بغور دیکھا، کیوں؟ ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ آپ خیر سے باتیں بہت بناتے ہیں! یہ سُنکر سب نے قہقہہ لگایا۔ اور علیشی آسانی سے بن گئے مگر پھر کچھ سنبھل کر کہا۔ برادر، تم زاہدِ خشک! تم صابن کا بھاؤ کیا جانو؟! اس پر ڈاکٹر نے مُسکراکر کہا۔ صابن کا بھاؤ تو آپ جانیں! میں تو یہ جانتا ہوں کہ ابھی سے آپ کے ہونٹ خُشک ہو گئے۔ چہرے پر ہوائیاں سی چھُوٹ رہی ہیں!۔ اسپر سب ہنسنے لگے اور علیشی نے مزاحاً کہا۔ اچھا صاحب! تو پھر تم ہی یہ ثواب کما دو! جب اوروں نے بھی علیشی کی ہاں میں ہاں ملائی تو ڈاکٹر راضی ہو گئے۔ کہا اچھی بات ہے، تم سب کی یہی خوشی ہے تو یہی سہی۔

ڈاکٹر کی اس بات پر سب کو حیرت ضرور ہوئی۔ یہ بڑے مضبوط کردار کے انسان ہیں۔ کبھی اس قسم کی باتوں میں نہیں پڑتے۔ مگر صرف یہ دیکھکر کہ احباب لُطف کے خواہاں ہیں، چلے گئے۔ اور ایک دو منٹ میں اُسی لڑکی کو ساتھ لے آئے۔ بھئی، لڑکی کیا تھی۔ گوہرِ شب چراغ تھی! میانہ قد، گداز جسم، بھولی بھالی۔ بُشرے پر صحت کا اُجالا۔ سانس میں نگہت شباب!! ڈاکٹر نے پیرِ طریقت بنکر ہم سب سے تعارف کرایا۔ پھر سب ملکر سینما چلے گئے۔ سینما کا نام امبیسیڈر ہے۔ یہاں کے متوسط سینماؤں میں ہے۔ ٹکٹ لئے۔ اندر گئے۔ اندر جاتے ہوئے ایک بڑے نفیس قالین پر سے گزرتے ہیں۔ گیٹ پر سے ایک سُندری ساتھ ہو گئی تھی۔ جس نے رہبری کر کے آرام سے بٹھا دیا۔ ہال میں سبز دھیمی روشنی تھی۔ اور بڑے تال میل کے ساتھ ایک سُریلا نغمہ بج رہا تھا۔ یہاں کی ساری نشستیں گلنار مخمل کی ہیں اور بڑی خوبصورت بنی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان نوخیز حُسن کی دُلاریاں کوئی سیاہ، کوئی گلنار لباس زیبِ تن کئے، سفید سفید تاج نما ٹوپیاں پہنے پھرا کرتی ہیں۔ اُفقی سینے پر پیاری پیاری کشتیاں آویزاں۔ جن میں مختلف قسم کے چاک لیٹ۔ اور یہہ

حورانِ ارضی اِدھر اُدھر خاموش ٹہلتی رہتی ہیں۔ منشا یہ کہ بلائیے۔ دل معطر اور منہ میٹھا کیجئے! تھوڑی دیر میں کھیل شروع ہوا۔ اس میں پیار کا رنگ غالب تھا۔ اِدھر بھی اخلاص بڑھنے لگا۔ کھیل ختم ہوا تو سب گولڈرز گرین گئے۔ وہاں ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا۔ لڑکی بے تکلفی سے ہنس بول رہی تھی۔ مگر اس بے تکلفی میں بھی غیور اور بلند فطرت رہی۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ یارک شائر کی رہنے والی ہے۔ آئلین ایلس نام ہے۔ ڈاکٹری کی تعلیم پا چکی ہے، لندن تلاشِ روزگار میں آئی اور تین ہفتے سے یہاں ٹھیری ہوئی ہے۔ اسپورٹس کی بہت شائق ہے۔ نہایت خوشدل ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ہمارے ساتھ گھر بھی آئی۔ ہم نے موٹر بس میں چلنے کے لئے کہا تو کہا۔ مجھے چہل قدمی اچھی معلوم ہوتی ہے! یہ کہہ کر ہمارے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور قدم ملا کر چلنے لگی۔ دیکھئے! ہمیں برا بھلا نہ کہئے گا۔ یہ ہندوستان نہیں، یورپ ہے، آزاد سرزمین، یہاں یہ عیب نہیں۔ سارے رستے مزیدار باتیں ہوتی رہیں۔ ایک طرف مستقل طور پر علیشی تھے، ایک طرف کبھی ہم اور ڈاکٹر اور معصوم فہیم ہو جاتے تھے! اس وقت بڑی خوش وقتی سے کہنے لگی۔ کاش میرے کئی ہاتھ ہوتے۔ غرض گھر پہونچے۔ ہم تو تھوڑی دیر ہنس بول کر کھسک گئے۔ علیشی اس سے باتیں کرتے ہوئے بیٹھے رہے۔ بعد میں جو کچھ پیش آیا، اُسے انہیں کی زبانی لکھتا ہوں۔ قسم کھا کر کہتے تھے، تم لوگ چلے گئے۔ ہم دونوں اکیلے ہوئے تو فتنہ نگاہی بڑھنے لگی۔ طرفین میں سرخوشی کی ایک موج آگئی۔ اور اس لڑکی کی ہر بات امرت کا گھونٹ بن گئی۔ زندگی کو ایک نیند سی آئی۔ کانوں میں دل کی دھیمی صدا اس طرح چلی آتی تھی جیسے ہلکی نیند میں پانی برسنے کی آواز آتی ہو۔ اسی نیند میں اٹھا۔

پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے!

اور آگے بڑھ کے اُس سے کچھ کہا۔ نیند اسی کو بھی تھی۔ جواب میں دبی زبان سے صرف میرا نام لیا۔ علیشی! گویا دھیمے سُروں سازِ طرب چھیڑا۔ نغمۂ حیات بجنے لگا۔ پھر مجھے پُرنم آنکھوں سے بغور دیکھا۔ جن میں جوانی تھی۔ حیا تھی۔ مگر حسرت بھی برستی تھی! بعد میں نظریں نیچی کرلیں۔ اور متاملانہ کھڑی ہوگئی۔ میری زبان سے بھی نکلا۔ ایلس! جس سے شادمانی کی ایک ہلکی لہر اُسکے رخساروں پر دوڑ گئی۔ اور کہنے لگی۔ علیشی! تم جانتے ہوگے، موج کی زندگی کیا ہے؟ ساحل سے ٹکرانا! ساحل آغوش میں لے لے تو وہ فنا ہو جاتی ہے!۔ اس وقت میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ دل باغی ہوگیا تھا۔ میں نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی، اور اپنے کہے پر زور دیا۔ جواب میں اُسنے دو جملے اور کہے کہ علیشی! ٹھیرو۔ مجھے اتنا بتا دو! دُنیا کے ایک ہاتھ میں بھلائی، اور ایک میں بُرائی ہے، کیا تم بُرائی مول لوگے؟!— اختر! نہیں کہہ سکتا کہ ان الفاظ میں کیا قوت تھی، کیا جادو تھا۔ معلوم ہوا کہ مجھے کسی نے چپڑا اندھیرے سے اُجالے میں کھینچ لیا۔ میرے دل کا بوجھ اُتر گیا اور میری روح مجھے واپس مل گئی! ششدر ہو کر میں اُس دیبی کا منہ تک رہا تھا۔ وہ نیچی نظروں خاموش کھڑی تھی۔ مگر مجھے دل ہی دل میں محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے راز و نیاز کا اس وقت ساری کائنات طواف کر رہی ہے! میں دو قدم اس کے پیچھے ہٹ کر مبہوت بیٹھ گیا۔ وہ اس خیال سے کہ مبادا مجھے اس کے کہے کا ملال ہوا ہو مُسکراتے ہوئے آہستہ قدم آگے بڑھی اور میرے پاس ہی سوفا پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرنے لگی گویا بہن بھائی کو بُرائی بھلائی سمجھاتی ہو۔ میں نے پشیمانی کے ساتھ معافی چاہی تو کہا نہیں، کیا مضائقہ ہے۔ وہ تو تقاضائے بشریت تھا۔ کمرے سے باہر آئی تو اُس کے چہرے پر شکن تک نہ تھا۔ بڑی خندہ پیشانی سے کل پھر ملنے کا وعدہ کیا۔ اور شب بخیر کہکر چلی گئی۔ مگر مشفق! سچ کہتا ہوں، میری زندگی کی تو رَو بدل گئی!۔

دوسرے دن علیشی تو نوٹنگھم چلے گئے۔ میں اور ڈاکٹر اُس سے گولڈرز گرین اسٹیشن ملے۔ اُسی خندہ پیشانی اور مہربانی

سے پیش آئی۔ بعد میں سینما گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے پوچھا "اَیس! تعجب ہے تم کل ہم اجنبیوں کے ساتھ چلنے پر برملا راضی ہوگئیں؟ کہا۔ تم نے کچھ ایسی مہربانی سے مدعو کیا تھا کہ مجھے انکار کا یارا نہ رہا۔ اسکے بعد علیشی کا رات والا قصہ چھڑا۔ ہم نے کہا کہ وہ آپ سے بہت نادم ہیں۔ تو ہنسنے لگی اور کہا یہ بات یہ ہے انہیں غلط فہمی ہوئی۔ انہوں نے مجھے بھی یہاں کی اور لڑکیوں جیسا سمجھا۔ مگر نہ میں خود ناشائستہ تھی، نہ انہیں بننے دیتی! ارے میاں! ٹیپ کا بند تو یہ ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ کیوں اَیس! تم بلا کھٹکے کل ہمارے ساتھ چلی آئیں۔ تمہیں یہ خیال بھی نہ گزرا کہ ہم لوگ "کالا آدمی" کہلاتے ہیں! یہ سنکر خوب ہنسی اور کہا۔ ڈاکٹر! کیسی باتیں کرتے ہو۔ کیوں جی یہ تو بتاؤ خدا کا بھی کوئی رنگ ہے؟!! مختصر یہ کہ بھئی لڑکی کیا ہے آفت جان ہے! خوبصورت، خوب سیرت، بتایئے "ایمان" جانے کے لئے کچھ باقی رہا! اس لئے سینما سے اُسے گھر پہونچا کر ہم تو ایسے ٹک ٹٹ چلے کہ مڑکر بھی نہ دیکھا اور اپنے ٹھکانے آکر ہی دم لیا۔ رات میں دو گھنٹے تک ان واقعات پر غور ہوتا رہا۔ آخر اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اب بھول کر بھی اس سے نہیں ملیں گے۔ یار کہو گے تو سہی کہ بڑے بے حِسے ہو، مگر کیا کریں، اَیس سی لڑکی، یورپ سا مقام، ہم سے بے زبان، یقین مانو ان عناصر کے سنجوگ پر بھک سے اُڑ جانے والا مادّہ ہی پیدا ہوتا!!۔

وزیر حسن دہلوی

"سراب"

کل شام ٹہلتا ہوا اک راہ سے گذرا
کرتا ہوا دُنیائے تخیل کے نظارے

وہ دن کا سیاہی سے بدلتا ہوا نقشہ
جیسے کوئی گیسوئے پریشاں نہ سنوارے

اس تیرگیِ شام کے پردے میں اُفق سے
رہ رہ کے فضا میں کوئی کرتا تھا اشارے

تھی نبض کی جُنبش جو سرود آفریں مجھکو
بہتے نظر آئے مجھے نغمات کے دھارے

اک برق سی نظروں میں مری کوندرہی تھی
انفاس میں جذبات سے رقصاں تھے شرارے

ہر نقشِ قدم راہ کا تھا ماہِ منوّر
تھے خاک کے ذرّات دمکتے ہوئے تارے

اس درجہ فضا نُور سے لبریز تھی، گویا
پانی سے چھلکتے ہوئے کوثر کے کنارے

ناگاہ مرے پاس سے اک شوخ ستمگر
قشقہ بہ جبیں، گیسوئے شب رنگ سنوارے

ہر گام پہ اک حشر اُٹھاتا ہوا گذرا
کرتا ملک الموت کو نظروں سے اشارے

اک تیر ہوا آکے مرے دل میں ترازو
بھرتا ہوا خاموش فضاؤں میں طرارے

مظلوم نگاہی نے مری داد طلب کی
آیا رُخِ رنگیں پہ عرق شرم کے مارے

"بلبل ہمہ تن خوں شدہ و گل ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر این است بہارے"

تابش دہلوی

بلّی بچہ

گھر میں ایک شربتی نام کی لڑکی تھی۔ پیچھے سے وہ موٹی ہوگئی، چار بچوں کی ماں بنی اور چل بسی۔ سنتے ہیں بڑی ہو کر اپنے تیز مزاج کے لئے سرنام تھی۔ (سنتے ہیں) مجھے اس لئے کہنا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ میری لڑکی تھی پر میرے سامنے تو اس کے مزاج کی ترشی ظاہر ہوتے ہوئے میں نے نہیں پائی۔ ہاں بدن کی بھاری، طبیعت میں اور عادت میں آرام پسند وہ پیچھے سے ضرور ہوگئی۔

میں تب کی بات کہتا ہوں جب شربتی بہت چھوٹی تھی۔ کوئی تین برس کی ہوگی۔ اُس وقت وہ بہت دُبلی پتلی تھی، توتلی بولتی تھی اور بین اُس کی بڑی میٹھی لگتی تھی۔ لڑکیوں میں چھٹپن سے کچھ ماں پن ہوتا ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی جس کا نام بجّی بھی تھی اور وجے کمار بھی تھا اس کو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ پیسہ ملتا تو سینت کر اپنے بجّو کے لئے رکھ لیتی۔ مٹھائی ملتی تو بھی خود نہ کھا کر اُسی کیلئے الگ دھر چھوڑتی۔ کئی بار دیکھا گیا کہ طاق کی جس گولک میں من مار کر وہ جن پیسوں کو جمع کرتی رہی ہے اُن میں سے زیادہ تر کبھی کبھی غائب بھی ہوگئے ہیں۔ اور مٹھائی اُس کے بھنڈار میں کچھ بچی بھی ہی ہے تو وہ سوکھ سا کھ کر نکمی ہوگئی ہے۔ لیکن ان باتوں سے سبق لیکر شربتی اپنے چلن کو نہیں بدلتی تھی۔ پیسے ملتے تو پھر وہیں بٹور رکھتی اور اپنے حصّے کے کھیل کھلونے یا میوہ مٹھائی بھی اسی طرح بجّو کے لئے جمع کر چھوڑتی۔

اِدھر بجّو اصلی بجّو سے کم نہ تھا۔ بڑا اودھمی لڑکا تھا۔ شروع ہی سے جیسے وہ نواب صاحب ہے شربتی کا سب پیار لیتا ہے۔ اور بدلے میں اُسے خوب مارتا ہے۔ وہ کاٹتا ہے نوچتا ہے اور بہن کو خوب رُلاتا ہے۔ بڑی بہن ہونے کا ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ شربتی بچاری خوب روتی ہے، روتی روتی اماں کے پاس جا کر شکایت کرتی ہے اور کچھ دیر بیتتی نہیں کہ وہی شربتی آکر کہنے لگتی ہے "بجّی لے، بلفی نہیں لے گا؟"

بجّو کلکاری بھر کر لپکتا ہے اور برفی منہ میں رکھکر شربتی کا چہرہ نوچنے لگتا ہے۔ جس پر شربتی کہتی ہے "ہٹ بدمعاش" بدمعاش بھلا کیوں ہٹنے والا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں کے پنجوں سے اس کا ایسا مُنہ کھسوٹتا ہے کہ شربتی چلّا پڑتی ہے "دیکھ لے ری اماں، تو پھر مجھے کہے گی"

پیڑے پر بیٹھی اماں کہتی ہے "اور کِھلا برفی۔ تجھے یہ بڑا نہال کر رکھیگا جو تو اِسے برفی کِھلاتی مانتی نہیں"

اُسکے چار مہینے بعد ہماشہ وجے کمار چلدئیے اُنہیں بُلانے چیچک ماتا آگئیں اور وہ بچائے نہ بچے۔ پہلے تو خوب بڑے بڑے ماتا کے دانے سارے بدن پر ہوگئے۔ بدن پر کہیں تِل رکھنے کو ٹھور نہ بچا۔ جیب جرد ہی پھپولے اُٹھ آئے اور تالو پر بھی، پلک کے اوپر بھی دانے تھے۔ ویسے ہی پلک کے نیچے۔ چھ روز تک ہو کے اُوپر تین تین چار چار ڈگری بخار رہا۔ آنکھیں بند ہوگئیں وانکے اُوپر موٹے موٹے پھپولے سے اُٹھ آئے۔ ہماشے وجے کمار کو ایک پل چین نہ ملی وہ نہ اس کروٹ سو پاتے نہ اُس کروٹ۔ جدھر ہوئے اُدھر ہی سمجھئے شریر میں بندھے ہوئے کانٹے اور گہرے بندھ جاتے تھے۔ کل کسی طرح نہ تھی۔ کنٹھ میں سُر رہتا تب تک وجے بابو چچیاتے رہتے۔ دم نہ رہا تب بے دم ہو رہتے تھے۔ چیچک کے دانوں سے وجے بابو کا کنول سا سندر مُنہ ایسا ہو گیا تھا کہ ڈر لگتا تھا۔ آنکھیں اُس میں ندارد تھیں۔ چہرے پر اُٹھی ہوئی ناک شناخت نہ ہو پاتی تھی۔ اور مُنہ کی بات پوچھئے نہیں۔ اس حالت میں اُن کے پیٹ میں نہ کچھ کھانا پہونچتا نہ کوئی پینے کی چیز۔ کچھ ٹھنڈے پانی کی بوندیں جو ماں نے اندازاً پہچان کر اُس کے مُنہ کے ہونٹوں کے بیچ میں چوا دی جاتیں وہ پانی

وجے بابو کو ما نو بیحد ٹھنڈک اور تسکین پہونچاتا۔ وجے بابو گویا تب مسکرانا چاہتے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھکر آنسو روکنا مشکل ہوجاتا۔ منہ ایسا ڈراؤنا پھر بھی ایسا پیارا لگتا تھا کہ ـــــ

خیر وہ دوسری کہانی ہے۔ سات آٹھ روز اپنی ماں کی گود میں پڑے رہکر اُن کی اور ماتا سیتلا کی چھینا جھپٹی میں وجے بابو نے ایک ہفتہ تو نکالا۔ اس ہفتے کے بعد بابو یہاں سے لنگر توڑ خدا جانے کہاں کیلئے چل پڑے۔ ڈاکٹر بھی رہ گئے، اُن کی اماں بھی رہ گئیں، ہم بھی رہ گئے۔ ان دو ہی رہ جانے والوں میں شربتی کا نام ایکا ایک نہیں آتا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنی کسی گنتی کے لائق نہیں تھی۔ لیکن وجے کے چل دینے پر وہ تو جیسے ایک ہی دن میں چالیس برس کی ہوگئی۔ اس کا بچپن غائب ہوگیا۔ اس کے متعلق اُس نے نہ کچھ پوچھا نہ پاچھا۔ وہ بالکل نہیں روئی۔ جب کھانا دیا کھالیا اور کام کہا کام کرلیا۔ اور اُس کا ہنسنا اُڑ گیا تھا۔ نہ اب وہ مچلتی تھی نہ شکایت کرتی تھی۔

میں نے کہا "بیٹا شربت"!

اُس کے منہ پر سُنکر کوئی سُرخی نہیں آئی۔ مانو اُسے کچھ چیت نہ ہو۔ وہ میرے پاس آگئی اور آکر کھڑی ہوگئی۔ گویا کہہ رہی ہو۔ "بابو جی مجھے گود میں لینا چاہتے ہو تو لیلو۔ میں کھڑی ہوں، میں سامنے ہوں تو"

میں نے اُسے گود میں کھینچکر کہا "بیٹا شربت" ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر کہا "بیٹا سرو کیا بات ہے؟"

اُس وقت وہ رو پڑتی تو میرا جی کچھ ہلکا ہوتا۔ وہ نہ روئی نہ کچھ بولی۔ میں نے گود میں نزدیک کھینچکر اُسے چوما پچکارا۔ میں نے کہا "بیٹا، بجو تجھے یاد آتا ہے۔ وہ تو چلا گیا بیٹا"

میرا دل یہ کہتے کہتے خود بھر آتا۔ یہ بات منہ سے نکالنے کی ہمت میں نے جان بوجھکر کی تھی کہ جس سے لڑکی روئے تو، لیکن وہ لفظ مجھے بھی بھر لائے۔ میں نے دیکھا کہ وہ لفظ شربتی کے بھیتر تک بھی گئے ہیں۔ اُمید ہوئی کہ شربتی ابھی سُبک اُٹھے گی۔ مجھے اُس کے چہرے پر دکھائی دیا گویا اُس کے اندر کی جمی ہوئی تکلیف چھڑ گئی ہے۔ وہاں جیسے اُس کے درد کو متھا جا رہا ہے۔ گویا کنارے توڑ کر وہ درد اب ضرور بہہ پڑیگا۔ لیکن کنارے آ آ کر بھی آنسو کنارہ لانگ کر نہیں آئے، وہ نہیں روئی۔

اُس کی ماں اِس بات پر ڈر سے بھر گئی۔ شربتی کو ایک ساتھ ایسی عقلمند ہوجاتے دیکھ کر اُس کی ماں بیحد بےبس اور لاچار اپنے کو محسوس کرنے لگی۔ شربتی کا من نہیں بہلا، نہیں بھٹکا، اور وہ خالی بھی نہیں ہوئی۔ وہ ایسی بھری رہی کہ کنارہ توڑکر بہنے کی ضرورت ہی گویا اُسے نہ ہو۔ اس کی ماں نے بیچارگی کے لہجے میں مجھ سے بار بار کہا "ارے کیا وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اُسے کیا ہوگیا ہے۔ تم بتاؤ نا میں کیا کروں؟"

لیکن میں کیا بتلاتا۔

تین روز کھینچکر چوتھے دن شربتی کھاٹ پر گر گئی۔ اُسے بخار ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے بخار بہت تیز ہوگیا۔ وہ بےہوش ہوجاتی اور بڑبڑانے لگتی۔ اُس کی ماں کی فکر کا ٹھکانا نہ تھا۔ ڈاکٹر بھی آئے حکیم اور وید بھی آئے پر بچی کی بیکلی کم ہونے میں نہ آئی بیہوشی سویرے کے گھنٹوں میں کچھ اُترتی۔ اُس وقت گم سُم شربتی کمرے کی چھت کی طرف دیکھتی یا دیوار کو دیکھتی۔ تب وہ اپنی ماں کو بھی پہچانتی تھی مجھے بھی پہچانتی تھی پر ہمارے لئے مانو اُسے کچھ کہنا نہ تھا، ہمیں سونی آنکھوں سے دیکھتی اور اُسی طرح نگاہ لوٹا لیکر اُنہیں آنکھوں سے وہ دیوار کی طرف دیکھنے لگتی۔

میں پکارتا "بیٹا شربت!"

ماں پکارتی "او ستو، او میری بیٹا رانی، او میرے بیٹے راجہ!"

شربتی سُنکر چونکتی اور آنکھیں پھیلا کر ہمیں دیکھتی رہتی۔

وہ بہت دُبلی ہوگئی تھی۔ تن میں سینکھ سی ہڈیاں باقی تھیں اُس وقت جب کبھی سوتے سوتے وہ مسکراتی تھی تب دیکھ کر من

ایک مسرت کے ساتھ بڑے درد اور ڈر سے بکھر جاتا تھا۔ لیکن نیند اُسے بہت کم آتی تھی۔ اتنی کل ہی اُسے کب پڑتی تھی کہ اُسے نیند آئے۔ نیند آتی تو اُسے بیہوشی کی نیند کہنا چاہیئے۔ اس بے ہوشی میں بڑبڑاہٹ جاری رہتی جو اس میں سے مانو بچی بچائی جان کو کھینچکر باہر پھینک رہی تھی۔

ایسے ہی دیدھا میں سات روز بیتے۔ اُس کی ماں سب سُدھ بسار کر سب کال اُسی کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ بچی کی پلکیں ذرا دیر کو لگ جاتیں تب ہی اُس کی کھٹولے کی پٹی کو چھوڑتی تھی۔

بڑے دھیمے تھپکی دے کر مُنّی کی ماں نیند کی پری کو مانو مُنّی کی پلکوں پر بُلاتی اور جب وہ نیند کی پری اُن پلکوں پر چُپ ہو کر سو جاتی تب ہی وہ ماں ہلکے ہلکے پاؤں دھرتی ہوئی وہاں سے کہیں جاتی۔

بچی کی حالت گرتی ہی گئی۔ جینے کی چاہ ہی جیسے بھیڑ سے دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر ہارنے لگے اور حکیم ویدوں کی سمجھ میں بھی کچھ بات ٹھیک نہ بیٹھی۔ بس بچی کی اماں کا جی ہی کچھ اس بارے میں پکا تھا کہ میں مُنّی کو نہ جانے دونگی۔

بُخار تو ٹوٹ گیا تھا پر بدن چھیجتا ہی چلا جاتا تھا۔ غذا کوئی انگ نہ لگتی تھی۔ مانو اب تو وہ اپنی ماں کی دُعاؤں اور اُسکے ارادے کی پختگی کے بل پر ہی جی رہی تھی۔

ایک روز شرتی کی آنکھ چھبیس گھنٹے کے بعد کہیں جا کر لگی۔ اُس وقت ماں ذرا اُسے چھوڑ کر وہاں سے اُٹھی پر اس بیچ وہ ادھر جو گئی ہی تھی۔ کوئی آہٹ ہو کہ وہ جھٹ بچی کے پاس دوڑ آئیگی وہ ابھی گئی ہی تھی کہ اُس طرف سے کسی کے باریک چچیانے کی آواز اُس نے سُنی۔ وہ بھاگی گئی کہ دیکھتی ہے کہیں سے مُنّی کے کھٹولے پر ننھا سا بلی کا بچہ ایک آگیا ہے۔ مُنّی نے دونوں ہاتھوں میں اُسے زور سے دبوچ رکھا ہے اور وہ کیں کیں کر رہا ہے۔

اماں کو آتے دیکھکر ہی مُنّی نے کہا: "اماں بلی بچہ!"

اُس گھڑی اُس کے چہرے پر جیسے کچھ لوٹی ہوئی سُدھ کی جھلک دکھائی دی اور یہ کہتے کہتے اُس بلی کے بچے پر سے اُس کی انگلیاں کہیں کچھ ڈھیلی نہ ہو گئی ہوں اس لئے اور بھی اُس بچے کو پنجوں میں دبوچ کر مُنّی نے کہا "اماں بلی بچہ!"

بلی کے بچے نے بھی زور سے کہا "کیں کیں کیں"۔ تو بھی گویا وہ اپنے پر قابض اُس مالک پن سے بچھڑنا نہ چاہتا تھا۔

بلی کا بچہ سوکھا سا تھا۔ مانو کسی نے مُنہ میں لیکر اُسے بُری طرح جھنجوڑ دیا ہو۔ وہ سہما ہوا تھا۔

مُنّی نے کہا: "اماں دُودھ!"

اماں نے خوش ہو کر کہا "دودھ پیئے گی بیٹا؟"

مُنّی نے بلی کے بچے کو دکھا کر کہا "بلی بچہ اماں!"

ماں ڈر کر بولی۔ "بیٹا اُسے چھوڑ دے، پنجے ونجے مار دیگا"

یہ کہکر ماں اُس کے ہاتھوں میں سے اُس بچے کو لیکر الگ کر دینے کے لئے آگے بڑھی۔ مُنّی نے اپنی مٹھیوں کو مضبوط کر لیا۔ اُسکے چہرے پر دکھائی دیا کہ گویا وہ مقابلہ کریگی اور بچہ بھی مانو مخالفت میں لگ گیا۔

ماں پاس آتے آتے رُک گئی۔ دھیمی اور مُلائم اور میٹھی بانی سے بولی۔ "بیٹا اُسے چھوڑ دے۔ جانور ہے، پنجے ونجے گاڑ دیگا۔"

مُنّی نے کہا "اماں بلی بچہ دُودھ پیئے" یہ کہکر بچے کو اُس نے زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

ماں لوٹ کر ایک کٹوری میں دُودھ لے آئی۔

مُنّی نے بچے کو گردن دبوچ کر اُس کا مُنہ کٹوری میں کرتے ہوئے کہا "پی، دودھ پی بلی بچے!"

لیکن بچہ اپنی گردن چھُڑانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ دودھ کی طرف مخاطب نہیں ہوا۔ مُنّی نے اس پر تین چار تھپڑ اسکو

جمائے۔ کہا: "نہیں پیئے گا تو دُودھ، نہیں پیئے گا" اور پھر بے رحمی سے اُسکے مُنہ کو کٹوری میں ٹھونس کر کہا: "پی، پی!"

لیکن اب بھی بلی کا وہ بیوقوف بچّہ اپنی ہٹ پر ہی قائم رہا۔ اُس نے دُودھ پیا ہی نہیں۔ مُنّی نے اُسے پیٹا، منایا۔ اُس کے بعد اُس کو بڑے پیار سے تھپکا۔ اُسکے بدن کو سہلایا۔ اُس کے مُنہ کو اپنے مُنہ کے پاس لیجاکر پیار کیا اور اُس کے گالوں کو اپنے گالوں سے رگڑ کر کہا: "پی لے میرے بلی بچے، میرے بچے" کہکر اُس بدشعور اُس بلی کے بچے کا مُنہ بھی اُسنے چُوم لیا۔

اِس مرتبہ بلی کا بچہ اپنی چھوٹی سی جیب نکال کر کٹوری کا دُودھ چاٹ کر پینے لگا۔ لڑکی کو یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی اُس میں اِس بچے کے لئے محبّت جاگ آئی۔

پھر وہ یک بیک زندگی کی محبّت بھی اُس میں کھوئی نہ رہی۔ اُس دن سے وہ اچھی ہونے لگی۔ ہمیشہ بلی کے بچّے کو اپنے سے چپٹا کر ہی سوتی۔ جگنے پر کبھی وہ نہ ملتا تو اُسے پائے بِنا خود چین لیتی نہ ہمیں چین لینے دیتی۔

اُسکے بعد تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک دن وہ بھی آیا کہ وہ پھل پھولکر خُوب موٹی بھی ہوگئی۔

آپ کا تقاضا پایا کہ کہانی لکھو۔ کہانی لکھنے کو تیار ہو کر سوچتا ہوں کہ کیا لکھنا ہوگا۔ ایسے ہی آڑے وقت تار والا آکر ایک تار دے گیا۔ خُدا کا رحم دیکھو کہ کیسا عجیب وغریب ہے۔ تار میں خبر آئی ہے کہ شربتی مرگئی۔ تار والا ابھی گیا ہے۔ شربتی میری اپنی بیٹی تھی۔ اکلوتی تو آپ یوں نہ کہنے دینگے کہ وہ جے بھی مجھے ملا تھا جو بچپن میں مجھ سے لُٹ بھی گیا، تو بھی زندگی بھر شربتی کو اکلوتی ہی سمجھتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے چار بچے چھوڑ گئی ہے۔ خیر، تار پاکر مجھے بلی بچے کی یاد ہو آئی سو آپ کو سُنادی ہے۔ اُمید ہے کہ سُنکر آپ کہانی ٹیکھک ہونے سے ہمیشہ بچیں گے۔

جینندر کمار

فاؤسٹ

مُترجمہ

شاہد احمد بی۔اے (آنرز) دھلوی

کوکلا

اساڑھ کا مہینہ آیا ہمارے گاؤں بدن پور کے نصیب جاگ اُٹھے، اگر ایک طرف کسان کھرے کھرے برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے تو دوسری طرف گاؤں کا بنیا نہال تھا اُس کے گھر میں چاندی برس رہی تھی۔ مگر مجھے ان جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، آم اور جامن کے باغوں میں بہار تھی۔ میں گاؤں کے چند نشانہ باز منچلے لڑکوں کو اپنے ساتھ لیکر باغوں کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ جس باغ میں ہمارا گذر ہوتا تو قیامت ہی آجاتی، پکے آم تو دوچار ہی گرتے مگر ہمارے ڈھیلوں کی بوچھار سے کچے آموں کا زمین پر ڈھیر لگ جاتا، میں زمیندار کا لڑکا تھا۔ زمیندار اپنے گاؤں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ غریب آسامیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ میری شرارت پر کوئی فریاد کریں۔ میرے ہی بل پر گاؤں کے لڑکے بھی اکڑتے پھرتے تھے۔

ساون کا مہینہ شروع ہوتے ہی ہم نہال ہو گئے۔ وہ جھوم جھوم کر بادلوں کا آنا۔ مینہ کی چھما چھم۔ پانی کا شور، ہوا کی سائیں سائیں۔ کوئل کی کوک۔ مور کی جھنکار۔ گاؤں میں چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ باغوں میں آم کا ٹپکا لگ رہا ہے۔ جامنیں پٹاپٹ گر رہی ہیں اور ہم ان کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا نہ فکر معاش تھی اور نہ دُنیا کے جھگڑوں سے کوئی خاص غرض۔ دن بھر کبڈی۔ گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلنا اور باغوں کی سیر کرنا اور رات کو آرام سے سو جانا ہی ہماری زندگی تھی۔

ہمارے گاؤں کے قریب ہی ٹھاکر چھتر لال سنگھ کا بھی ایک گاؤں رام نگر تھا ہم نے سُنا کہ ان کے باغ میں نہایت عمدہ اور شیریں آموں کے درخت ہیں، رات کو ہم نے مشورہ کیا اور علی الصباح ان کے باغ پر دھاوا بول دیا۔ چھوٹے کمسن بچوں کو عقل و تمیز سے ایک قسم کی نفرت ہوتی ہے، میں اپنے ساتھیوں میں زیادہ عقلمند اور سمجھدار مانا جاتا تھا پھر بھی میں اپنی عقل سے کام نہ لے سکا میں نے ٹھاکر صاحب کے باغ کو بھی اپنے ہی گاؤں کا باغ سمجھا۔ ابھی دوچار ہی آم توڑنے پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ کمبخت مالیوں نے ہمیں کچھ اس ترکیب سے گرفتار کیا کہ کسی کو فرار ہونیکا موقعہ ہی نہ مل سکا ورنہ اپنے گاؤں میں تو ہم شیر تھے ہمیں اس کا ناز تھا کہ ہمیں پکڑنا آسان نہیں ہے۔

باغ کے قریب ہی ٹھاکر صاحب کا خوشنما مکان تھا، مالی ہمیں گرفتار کر کے ان کے پاس لے گئے ٹھاکر صاحب اپنے گھر کے سامنے نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی پر بیٹھے تھے، ان کے قریب ہی ایک من موہنی جیتی جاگتی گڑیا کھیل رہی تھی۔ مجھ سے شاید دو ہی ایک سال چھوٹی رہی ہوگی۔ ٹھاکر صاحب کا بارعب چہرہ دیکھکر سب کے ہوش اُڑ گئے۔ ہم نے سمجھ لیا کہ اب ہم پر مار پڑیگی لیکن جب مالیوں نے "مال مسروقہ" جو انہوں نے ہماری جیب تلاشی سے برآمد کیا تھا ٹھاکر صاحب کے سامنے رکھا تو وہ مُسکرائے۔ سوکھے دھانوں پر پانی پھر گیا، ان کو مُسکراتے دیکھکر ہماری جان میں جان آئی۔ چونکہ ظاہری حیثیت اور لباس سے میں ہی اپنے ساتھیوں میں کچھ ممتاز نظر آیا۔ اس لئے ٹھاکر صاحب نے سب سے پہلے میرا ہی حسب نسب دریافت کیا۔ میں نے بھی طفلانہ اکڑ کے ساتھ اپنے پتا جی کا نام بتا دیا اُن کا نام سُنتے ہی ٹھاکر صاحب نے مجھے پیار سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میری وجہ سے سب ساتھیوں کو بھی

معافی مل گئی۔ "مال مسروقہ" کے علاوہ اور بھی عمدہ عمدہ خوش رنگ پکے ہوئے آم میرے سب ساتھیوں میں تقسیم کر کے انکو رخصت کر دیا گیا۔ لیکن جب میں [illegible] کو تیار ہوا تو ٹھاکر صاحب نے مجھے روک لیا اور کہا کہ تم ٹھہرو شام کو میں تم کو تمہارے گھر پہنچا دونگا۔ اتنا کہہ کر انھوں نے مجھے اس موہنی خوبصورت گجریا سے ملا دیا۔ اس کا نام "گوکلا" تھا وہ ٹھاکر صاحب کی لاڈلی بیٹی تھی۔ گوکلا سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہم دونوں تھوڑی ہی دیر میں ایسے گھل مل گئے گویا ہم عرصہ سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اُس نے مجھے اپنی گڑیاں دکھائیں۔ مجھے گڑیوں سے کوئی خاص اُنسیت نہ تھی، میں اس فن کا ماہر نہ تھا پھر بھی میں نے ان گڑیوں کی دل کھول کر تعریف کی، میری طرف سے گوکلا، بہت خوش ہوئی جب میں شام کو اُس سے رُخصت ہونے لگا تو وہ بہت روئی مگر جب میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں پھر جلدی ملوں گا تو وہ چُپ ہو گئی، ٹھاکر صاحب ہم دونوں کی بے لوث بال پن کے پریم سے بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ گوکلا کی ماں نے تو یہاں تک کہا کہ ان دونوں کی جوڑی بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ میرے ساتھ ٹھاکر صاحب نے نفیس اور لذیذ آموں کی ایک ٹوکری بھی بھیجی۔ جب میں ٹھاکر صاحب کے ملازم کے ساتھ اپنے گھر پہنچا تو پتاجی مجھے مارنے کو دوڑے، لیکن ٹھاکر صاحب کے ملازم نے بچا لیا۔ ٹھاکر صاحب نے میرے والد کے نام میرے متعلق ایک سفارشی چٹھی لکھدی تھی جسکو پڑھکر والد صاحب کا غصہ جاتا رہا۔

اب مجھے رات دن گوکلا ہی کا خیال رہنے لگا۔ اس کے ساتھ کھیلنے میں مجھے خاص خوشی حاصل ہوتی تھی، میں ہر دوسرے تیسرے دن رام نگر پہنچنے لگا، آموں کے لالچ سے نہیں بلکہ اپنی پیاری گجریا گوکلا کے ساتھ کھیلنے کیلئے! ایک مرتبہ میری ماں نے گوکلا کی ماں کی دعوت کی، جب گوکلا اپنی ماں کے ساتھ میرے یہاں آئی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، میں نے بھی گوکلا کو اپنی پھٹی پرانی کتابیں۔ اچھی خراب پنسلیں وسلیٹ وغیرہ دکھائیں۔ باطن میں چاہے گوکلا کو وہ چیزیں اچھی نہ معلوم ہوئی ہوں مگر اُس نے میری خاطر "میری علمیت" پر اظہار خوشنودی کیا۔

کچھ دن یوں ہی گذرے مگر پھر پتاجی نے مجھے دیہاتی مدرسے میں داخل کر دیا۔ اب مجھے گوکلا سے ملنے کا بہت کم موقع ملنے لگا۔ جب اتوار کی چھٹی ملتی تو میں رام نگر ضرور جاتا اور اپنی گوکلا سے مل آتا۔ دو چار سال کے بعد جب میں نے دیہاتی مدرسہ کا چوتھا درجہ پاس کر لیا تو پتاجی نے مجھے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کیلئے میرے چچا کے پاس سہارنپور بھیجنے کا ارادہ کیا۔ مجھے اس خبر سے کچھ خوشی ہوئی لیکن رنج زیادہ ہوا۔ خوشی اس کی تھی کہ شہر میں ریل۔ موٹر۔ کھیل تماشے وغیرہ کا لطف اُٹھاؤں گا، شہر کی بہت تعریف سُنتا تھا مگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ رنج اس کا تھا کہ میں اب گوکلا سے جُدا ہو جاؤنگا۔ مگر مجھے ایک دن گوکلا سے جُدا ہونا ہی پڑا۔ سہارنپور جانے سے ایک دن پہلے جب میں گوکلا سے ملا تو وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، میں بھی اُس کے ساتھ اُس وقت تک روتا رہا جب تک میری آنکھوں کے آنسو خشک نہ ہو گئے۔ اب ہم چھوٹے بچے نہ تھے ہم نے لڑکپن میں پریم کا جو پودا لگایا تھا وہ اب درخت کی شکل اختیار کرنے ہی والا تھا کہ قسمت نے ہمیں جُدا کر دیا۔ رُخصت ہونے سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو اپنی دائمی محبت کا یقین دلایا۔

(۲)

سہارنپور پہنچ کر عرصہ تک میرے دل میں گوکلا کی یاد چٹکیاں لیتی رہی لیکن نئے نئے دوستوں کی صحبتوں میں پڑ کر رفتہ رفتہ میرے دل سے گوکلا کا خیال کم ہونے لگا۔ میں نے اُس سے کیا قول و قرار کیا تھا سب بھول گیا۔ شہر کی دلچسپیوں نے دیہاتی زندگی کی یاد کو میرے دل سے محو کر دیا۔ اپنے دوستوں میں گلی ڈنڈا اور کبڈی کا ذکر کرنے سے میں شرمانے لگا۔ اب تو کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی کے کھیلوں ہی سے مجھے ایک قسم کا عشق تھا۔ میں جب کبھی شہری زندگی کا اپنی دیہاتی زندگی سے مقابلہ کرتا تو مجھے رنج معلوم ہوتا کہ پرماتما نے مجھے دیہات میں کیوں پیدا کیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی اپنے گاؤں بدن پور نہ گیا۔ چچا نے جب اس کی وجہ پوچھی تو میں نے کہدیا کہ میری تعلیم کا نقصان ہوگا۔ مگر دوسرے سال پتا جی نے گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے زبردستی گھر بُلا لیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میری آمد کی خبر سُن کر میرے لڑکپن کے ساتھی میرا بخش جُلاہا۔ رام پھل بنیا۔ رام بھروس ملاح۔ جگروا دھوبی۔ مکنا چمار وغیرہ وغیرہ ملنے آئے۔ گاؤں میں اونچ نیچ کا بہت کم سوال ہوتا ہے آپس میں برادرانہ محبت ہوتی ہے میری آمد سے میرے لنگوٹیا یاروں کو بہت خوشی تھی گاؤں بھر میں یہی چرچا تھا کہ "ہمارے راجن بابو آئے ہیں اب پھر گلی ڈنڈا اور کبڈی کے جشن ہوں گے"۔ چنانچہ جب سب میرے دروازہ پر آکر جمع ہو گئے تو مجھے مجبوراً گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ شہر میں رہ کر اب میں اپنے خیال سے مہذب بن چکا تھا۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں ان گنوار لڑکوں سے ملوں مگر ماتا جی نے مجھے سمجھایا کہ ان غریبوں سے نفرت کرنا اچھی بات نہیں اپنے پتا جی کو دیکھو وہ سب سے کیسا مل جُل کر رہتے ہیں، یہ سب لڑکے تو تمہارے بچپن کے ساتھی ہیں، بہت دنوں کے بعد تم آئے ہو جا کر ان سے دو چار باتیں کر لو اس سے تمہاری عزت کم ہو جائے گی۔ جب میں گھر سے باہر نکلا تو سب لڑکوں نے جُھک کر مجھے نہایت ادب سے سلام کیا۔ انہیں کے ساتھ میں نے اپنے لڑکپن کا زمانہ گذارا تھا۔ ان کے ساتھ گائیں بھی چرائی تھیں باغوں میں چوریاں بھی کی تھیں۔ خاک دُھول میں لت پت ہو کر کبڈی اور گلی ڈنڈا کا کھیل بھی کھیلا تھا۔ نمک مرچ، دھنیا پودینہ کے ساتھ کچے بیر کھائے تھے، بیساکھ جیٹھ کی آندھی میں انہیں کے ساتھ کبھی باغوں میں آم چنے تھے، لڑکپن کی سب باتیں یاد آگئیں، میری شہریت خاک میں ملنے والی تھی کہ ایک گنوار لڑکا مجھے خاموش دیکھکر بول اُٹھا۔ "راجن بابو! تو کوٹ پتلون مان کرسٹان مالوم (معلوم) ہوت ہیں"۔ اتنا سُنتے ہی میں چونک اُٹھا۔ اس گنوار کی بدتہذیبی دیکھکر مجھے ان سے نفرت معلوم ہونے لگی شہر کی تربیت و معاشرت نے مجھے مہذب بنا دیا تھا میں نے ان کے پاس کھڑا رہنا یا ان سے باتیں کرنا بھی ہتک سمجھا، چنانچہ میں اپنا مُنہ پھیر کر وہاں سے چلدیا۔ میری اس بے رُخی کا ان سب پر خاص اثر ہوا۔ سب ہنستے آئے تھے مگر مُنہ لٹکا کر واپس ہوئے مگر مجھے اِسکی کوئی پروا نہ تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ گنواروں کی چاہے کتنی ہی ہتک کیوں نہ کی جائے مگر ان کے دل پر اُس کا کچھ اثر نہیں ہوتا مگر یہ میری بھول تھی غلطی تھی، آج جب کہ میں اپنی زندگی کے قریباً اڑتیس سال گذار چکا ہوں مجھے اس کا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ محبت و پریم سے آپ دیہاتیوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں لیکن شانِ امارت دکھا کر آپ ان کے دلوں کو موہ نہیں سکتے۔ غریب گنواروں میں بھی خودداری کا مادہ ہوتا ہے یہ اب مجھے پتہ چلا ہے۔

بدن پور پہنچ کر مجھے گوکلا کی پھر یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ معلوم نہیں اب گوکلا مجھ سے ملے گی بھی یا نہیں، اب تو وہ

شاید محبت پردہ کرے گی، دو تین دن تک یہی سب کچھ سوچتا رہا مگر پھر دل کے ہاتھوں سے مجبور ہوکر ایک دن رام نگر پہنچ گیا مگر افسوس وہاں گوکلا نہ تھی وہ کئی مہینے سے اپنی نانی کے یہاں متھرا گئی ہوئی تھی۔

اسی طرح جب کبھی میں چھٹیوں میں بدن پور گیا تو اتفاق سے گوکلا سے ملاقات نہ ہوسکی۔

(۳)

کئی برس گذر گئے۔ زمانے کے انقلاب سے بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوئے، میں نے میڈیکل کالج لکھنؤ سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ اور سول ہسپتال غازی پور میں میری تعیناتی ہوئی وہاں مجھے ہر قسم کا آرام تھا تنخواہ کے علاوہ پرائیویٹ پریکٹس سے بھی میری کافی آمدنی ہوجاتی تھی ملازمت سے پہلے ہی میری شادی ہوچکی تھی اور اب میری شریمتی جی بھی میرے ہی ہمراہ رہتی تھیں۔

برکھا رت کی اندھیری رات تھی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں، رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ ہوا سن سن چل رہی تھی گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں کہ باہر سے کسی نے مجھے آواز دی، ایسے وقت میں باہر نکلنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا مگر غلامی بری بلا ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے کہ اسپتال میں کسی مریض کی حالت بہت خطرناک ہو اور کمپونڈر مجھے بلانے آیا ہو میں مجبوراً گھر سے باہر نکلا۔ میرا کمپونڈر کسی اجنبی کے ساتھ کھڑا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ نے مجھے فوراً بلایا ہے موٹر سامنے کھڑی ہے۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کا نام میں نے سنا تھا وہ غازی پور کے ایک مشہور ٹھیکیدار تھے مگر مجھے ان سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کو اپنی فیس سے غرض رہتی ہے میں ان کے ملازم کے ہمراہ فوراً ان کے مکان پر پہنچا۔ راستہ میں ملازم سے دریافت کرنے سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ "ملکن" بہت بیمار ہیں۔

ٹھاکر صاحب کے دروازہ پر جب موٹر کھڑی ہوئی تو ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ میری پیشوائی کیلئے آگے بڑھے یہی ٹھاکر صاحب تھے، ان سے ملنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ تھے تو گورے چٹے مگر ضعیفی نے ان پر اپنا قبضہ جما لیا تھا چہرہ پر جھریاں پڑی تھیں اور کمر کچھ جھک چلی تھی، ان کے قریب ہی ایک ملازم لالٹین لئے کھڑا تھا، معمولی مزاج پرسی کے بعد ٹھاکر صاحب مجھے مریضہ کے کمرے میں لے گئے چلنے میں ان کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے میں سمجھ گیا کہ ٹھاکر صاحب پر لال پری کا نشہ تھا۔ مریضہ بیہوش تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں، اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے گھونگھر والے سیاہ بال ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھونرے پھول پر بیٹھے ہوئے رس چوس رہے ہیں، ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھا تھا اور دوسرا دل کے قریب پڑا تھا، اس حالت میں بھی مجھے وہ حسن کی دیوی نظر آئی اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال کی رہی ہوگی مجھ سے ملازم نے تو کہا تھا کہ "ملکن" بیمار ہیں لیکن میں نے اس مریضہ کو ٹھاکر صاحب کی لڑکی سمجھا۔ میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہے، میں ضروری دوائیوں کا بکس اپنے ہمراہ لے گیا تھا، بڑی مشکل سے مریضہ کے منہ میں ایک دوا ڈالی، اس کا فوری اثر ظاہر ہوا اور مریضہ نے کچھ حرکت کی۔ ٹھاکر صاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے جھوم رہے تھے یکبارگی فرمانے لگے "ڈاکٹر صاحب علاج ماکول (معقول) ہونا چاہیے روپے کی کوئی فکر نہ کیجیے گا

ہا ہا ہا ہا ......" ٹھاکر صاحب کی "علمیت" کا مجھے یہ پہلا تجربہ تھا میں نے ان کی بکواس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور مریضہ کو پھر دوا پلائی اس مرتبہ مریضہ نے دوا پیتے ہی یکبارگی آنکھیں کھول دیں بیہوشی میں اُس کا چہرہ روشنی سے کچھ ہٹا ہوا تھا ہوش میں آتے ہی اُس نے میری طرف دیکھا چہرہ پر لالٹین کی روشنی پڑی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے سامنے میرے لڑکپن کی ساتھی میری پیاری گجر یا گوکلا لیٹی تھی۔ گوکلا کے چہرہ اور ہاتھ پر تل تھے اُن کے دیکھنے سے مجھے اور بھی اطمینان ہو گیا گوکلا نے بھی مجھے پہچان لیا۔ جس طرح پانی کی لہروں سے ٹکرا کر کنول کا پھول ہچکولے کھانے لگتا ہے اُسی طرح گوکلا کی مدہ بھری آنکھیں آنسوؤں میں تیرنے لگیں۔

میں نے گھبرا کر ٹھاکر صاحب کی طرف دیکھا۔ شراب نے اُنہیں مدہوش بنا دیا تھا وہ اب کرسی پر غافل پڑے تھے۔ میں نے اپنے دل کو بہت سنبھالا پھر بھی میری زبان سے نکل گیا۔ "گوکلا!" کوئل کوکی "راجن بابو"۔ خوابیدہ محبت نے کروٹ لی، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کریدنے سے چمکنے لگی میری طبیعت بگڑنے لگی اب وہاں زیادہ ٹھہرنا میں نے مناسب نہ سمجھا میں نے گوکلا سے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں اب آرام سے سو کل سویرے میں دوسری دوا بھیجوں گا"۔ گوکلا نے دبی زبان سے کہا "آپ سا ہمدرد ڈاکٹر علاج کرنے کو ملے تو میں روز بیمار ہونے کو تیار ہوں راجن بابو! آپ کیا سمجھتے ہیں میرا مرض لاعلاج ہے" میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" چلتے وقت میں نے رُک رُک کر گوکلا سے ٹھاکر صاحب کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟" گوکلا پھر آبدیدہ ہو گئی اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "یہی تو میری جیون نیّا کے کھیویّا میرے سوامی ہیں" یہ سُن کر رنج و غم سے میرا سینہ پھٹنے لگا۔ آہ گوکلا کے ماں باپ نے کیا سمجھ کر اپنی کمسن پھول سی قبول صورت لڑکی کا بیاہ اس شرابی بوڑھے سے کر دیا اس وقت کچھ اور پوچھنے کا موقع نہ تھا۔ ایک طرف گوکلا سسکیاں بھر رہی تھی اور اُس کے قریب ہی اُس کا لاپروا شرابی شوہر بدمست پڑا تھا میں ان دونوں کی حالت پر آنسو بہاتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ ساری رات مجھے اچھی طرح سے نیند نہ آ سکی۔ میں اتنے عرصہ تک گوکلا سے کیوں غافل رہا؟ اب آنسو بہانے سے کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں نے لڑکپن میں گوکلا سے جو قول و قرار کیا تھا وہ نباہ نہ سکا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔

(۴)

گوکلا اچھی ہو گئی اس کے بعد ہمارے یہاں اُس کی آمد و رفت شروع ہو گئی میری بیوی سے اس کا بہناپا ہو گیا۔ وہ اب مجھ سے کانا پردہ کرتی تھی گو وہ کبھی کبھی مجھ سے دو چار باتیں کر لیتی تھی، میں نے کئی مرتبہ اُس سے دریافت کیا کہ وہ ٹھاکر صاحب کے ساتھ خوش ہے یا نہیں مگر اُس نے اِس کا جواب کبھی نہ دیا، مجھے چند دنوں کے بعد یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ چونکہ گوکلا کی ماں کے خاندان میں کچھ نقص تھا اسی وجہ سے جب برادری میں کوئی معقول شوہر نہ مل سکا تو گوکلا کے پتا نے مجبوراً اپنی لڑکی کو بوڑھے ٹھاکر صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔

گوکلا کے شوہر بوڑھے ہونے پر بھی بہت رنگین مزاج تھے۔ خود کو بازارِ حسن کا جوہری سمجھتے تھے۔ پڑھے لکھے تو معمولی تھے مگر قسمت کے دھنی تھے ٹھیکداری میں ان کو کافی منافع ہو جاتا تھا ان کا خیال تھا کہ عورت صرف دولت کی پرستار ہوتی ہے

اسی وجہ سے وہ گوکلا کو بھی دولت کی باندی سمجھتے تھے گھر میں خادمہ تھی گوکلا کیلئے ہر قسم کا آرام میسر تھا، اگر ٹھاکر صاحب کے گھر میں کسی بات کی کمی تھی تو وہ محبت کی۔ ٹھاکر صاحب کو شاید اس کا تجربہ ہی نہ تھا کہ جوان عورت دولت سے زیادہ پریم کی بھوکی ہوتی ہے بازاری عورتوں کو رجھانے کیلئے ٹھاکر صاحب بالوں میں خضاب اور آنکھوں میں سرمہ بھی لگاتے تھے مگر گوکلا سے محبت آمیز باتیں کرنے کا انہیں وقت ہی نہ ملتا تھا۔ گوکلا کے لئے ٹھاکر صاحب دوچار نفیس ساڑیاں لائے تھے وہ اُسی کو بڑا احسان سمجھتے تھے۔ حالانکہ میں نے سُنا تھا کہ ٹھاکر صاحب نے بازار حُسن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یا اپنے اور کبھی کام کے بہانے سے گوکلا سے اس کے طلائی زیورات تک (جو وہ اپنے میکے سے لائی تھی) مانگ لئے اور کبھی مہاجن کے یہاں گروی رکھدئے جنہیں چھڑانے کی اُنہیں کوئی فکر نہ تھی، یہ تھی ٹھاکر صاحب کے گھر کی حالت، مگر جب کبھی میں نے گوکلا سے اس کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہا تو وہ ٹال گئی۔ شراب کی زیادتی نے ٹھاکر صاحب کے دونوں پھیپھڑے خراب کر دئے تھے جس سے رات کو انہیں کھانسی کی بہت تکلیف رہتی تھی اس سے ان کی صحت پر بھی بہت بُرا اثر پڑا تھا ایک مرتبہ رات کو ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی وہ کبھی اور ڈاکٹر کے زیر علاج تھے مگر اس مرتبہ غالباً گوکلا کی سفارش سے میں بلایا گیا۔ دس بجے رات کا وقت رہا ہوگا کالی سردی پڑ رہی تھی جب میں ٹھاکر صاحب کے کمرہ میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ٹھاکر صاحب پلنگ پر نڈھال پڑے ہیں۔ ان کے پلنگ کے پاس ہی گوکلا سر جھکائے کھڑی تھی اس کے دونوں گال جو انار کے پھول کے مانند سُرخ تھے پیلے پڑ گئے تھے۔ اس دن اس نے مجھ سے کوئی خاص پردہ نہیں کیا بلکہ میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں مایوسی بھی تھی اور حسرت بھی، اور کہا "ڈاکٹر صاحب! جس طرح بھی ہو میرے پتی کو بچا لیجئے میں آپ کا بہت احسان مانوں گی"

میں نے گوکلا کو ہر طرح سے اطمینان دلایا اور ٹھاکر صاحب کا بہت دل لگا کر علاج کیا جس سے اُن کو بہت فائدہ ہوا لیکن مکمل فائدہ نہ ہونے پایا تھا کہ ٹھاکر صاحب نے میرا علاج بند کر دیا۔ میں نے شراب پینے کی ممانعت کر دی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے میرا کہنا نہ مانا۔

گوکلا میرے یہاں تیسرے چوتھے دن آجایا کرتی تھی، میری بیوی سے اس کا دل بہت بہل گیا تھا لیکن عورتیں شک و بدگمانی کی مورتی ہوتی ہیں، اس سے میری نیک خصلت بیوی بھی نہ بچ سکی۔ جس طرح روشن چراغ سے کالا کاجل نکلتا ہے اُسی طرح میری بیوی کے پریم سے بھی شک و شبہ کے کالے بادل اُمنڈتے دکھائی دینے لگے، اُس نے گوکلا کو بیکا یک چھیڑنا شروع کیا، پہلے تو گوکلا نے مذاق سمجھا لیکن وہ آخر کار میری بیوی کے دلی جذبات کو سمجھ گئی اور اُس نے میرے یہاں کا آنا یک لخت بند کر دیا۔

اس کے تھوڑے دنوں کے بعد میرا تبادلہ غازی پور سے بنارس کا ہو گیا۔ چلنے سے پہلے میں نے بہت چاہا کہ گوکلا سے مل کر میں اُس سے اپنی بیوی کی بے وجہ بدگمانی کی معافی مانگ لوں لیکن مجھے اِس کا موقع نہ مل سکا۔

(۵)

سال بھر کے بعد میں تین ماہ کی رُخصت لیکر جب اپنے گاؤں بدن پور پہنچا تو مجھے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ گوکلا بیوہ ہو گئی ہے اُس کا سُہاگ اُجڑ گیا ہے۔ میں نے لڑکپن میں گوکلا ہی سے محبت کا سبق پڑھا تھا، جوانی میں جب میں اُسے

بھول چکا تھا تو اتفاقاً اُسے ایک بوڑھے کی شریک زندگی کی حیثیت میں دیکھکر میری محبت میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ لیکن اب ـــــ جب کہ وہ بیوہ ہوگئی تو محبت د ہمدردی کے ساتھ ہی میں اس کا سچا پُجاری بن گیا۔ وہ مصیبت کی ماری۔ دُنیا کی ستائی اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی تھی اگر اس کیلئے میرے دل میں سچی اور پاک محبت نے جگہ پائی تو یہ کوئی پاپ کی بات نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ سماج کے ٹھیکیدار میری سچی و پاک محبت کو اچھی نظروں سے نہ دیکھیں گے مگر میں نے اس کی کوئی پروانہ کی۔ میں وقت نا وقت جنگل کی طرف نکل جاتا اور کوکلا کی بدنصیبی ہی پر نہیں بلکہ اس سماج کی حالت پر بھی آنسو بہاتا جو کمسن لڑکیوں کو بوڑھے مردوں کے سپرد کردیتا ہے۔ میں رام نگر بھی کئی مرتبہ گیا لیکن مجھے کوکلا سے ملاقات کرنے کا موقع نہ مل سکا میری دلی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ تنہائی میں کوکلا سے مل کر اُسے اطمینان دلادوں کہ میں اُس کا دلی ہمدرد ہوں اور اس کے دُکھ درد میں شریک ہوں اسے کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

الہ آباد کا ماگھ میلہ قریب تھا میں نے سُنا کہ کوکلا وہاں اشنان کرنے جائے گی۔ جس روز میلہ تھا میں علی الصبح مادھو پور اسٹیشن پر پہنچ گیا میں نے اپنی بیوی سے بھی نہ کہا کہ میں الہ آباد جارہا ہوں وہ ہمارے پاک صاف دلوں سے واقف ہی نہ تھی اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ میں الہ آباد جارہا ہوں تو شاید وہ شکی مزاج عورت خود بھی میرے ہمراہ جاتی۔ اسٹیشن پر پہنچکر میں نے دیکھا کہ کوکلا گاؤں کی عورتوں کے ساتھ جارہی ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی خاص رشتہ دار نہ تھا۔ میلہ کی وجہ سے بہت بھیڑ تھی پلیٹ فارم پر ٹرین آئی تو ایک شور مچ گیا، کسی کو کسی کی خبر نہ رہی، دیہاتی عورتیں اور مردوں کو جہاں بھی جگہ ملی گھُس پڑے میں نے سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا بیچاری کوکلا حیران و پریشان اِدھر اُدھر جگہ کی تلاش میں پھر رہی تھی گاڑی نے سیٹی دی، اب میں نے دُنیا کی جھوٹی لاج کو چھوڑ دیا اور اپنے ڈبہ کا دروازہ کھول کر کوکلا کو آواز دی "کوکلا یہاں آجاؤ" کوکلا نے میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا، پہلے کچھ ٹھٹکی اور پھر میرے ڈبہ میں چلی آئی۔ اس ڈبہ میں میرے اور کوکلا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے اس کے بعد میں نے کہا "کوکلا! میری اس جرأت کو معاف کرنا۔ میں بہت چاہتا تھا کہ تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کروں آج مجھے اِس کا موقع مل گیا"

میں سمجھتا تھا کہ کوکلا میری اس جرأت یا گستاخی پر کچھ لعنت ملامت کرے گی یا خفا ہوگی مگر اُس نے اپنی شرافت سے مجھے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر تک وہ چُپ رہی اس کے بعد وہ کہنے لگی "مگر آپ جانتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کا اس طرح تنہائی میں ملنا کوئی اچھی بات نہیں ہے دُنیا کیا کہے گی"

"جب ہم دونوں کے دل صاف ہیں تو ہمیں دُنیا سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں"

"لیکن ہم کو دُنیا میں رہنا ہے۔ آپ تو مرد ہیں آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا لیکن میں ایک بیوہ عورت ہوں جلد بدنام کردی جاؤں گی"

"کوکلا! تم اس کی پروا نہ کرو۔ میں تمہارا سچا ہمدرد ہوں، میرے دل میں کوئی برائی نہیں۔ میں تم سے سچی و پاک محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ بالے پن سے!"

"کیا آپ قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے سچی اور پاک محبت ہے؟"

"کیا اس میں تم کو کوئی شک ہے؟"

"شک ہوتا تو میں آپ سے اس وقت تنہائی میں کیوں ملتی؟"

میں نے جب قسم کھا کر کوکلا کو اپنی پاک محبت کا یقین دلا دیا تو اس سے کہا کہ "کوکلا! یہ تو بتاؤ کہ تم مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہو۔ کیا اپنوں سے کوئی پردہ کرتا ہے؟"

کوکلا نے کہا۔ "مجھے شرم معلوم ہوتی ہے، اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ کہیے۔"

اب جدائی کی گھڑی قریب آ رہی تھی میں نے معصوم کوکلا کے نرم و گداز ہاتھ کو تھام لیا اور بیخودی میں اسکو دبانے لگا اس وقت ہم کانپ رہے تھے دونوں طرف سے پریم ساگر موجیں مارنے لگا میں نے کہا "کوکلا! میں تم سے کس طرح بتاؤں کہ میرے دل میں تمہاری کتنی عزت ہے۔ تم اپنے دل کو کبھی چھوٹا نہ کرنا مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ سمجھنا جس طرح تم نے آج مجھ سے میرے دل کا حال دریافت کیا ہے کیا تم بھی مجھ سے سچ سچ بتا سکتی ہو کہ تم کو بھی مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟"

کوکلا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ الہ آباد کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا اس کی خاموشی سے بے چین ہو کر میں نے پھر کہا۔ "بیکدل کوکلا! ہاتھ جوڑتا ہوں میرے سوال کا جواب جلدی دو۔ تم کو میری قسم! اپنی پاک محبت کی قسم جلدی جواب دو!"

کوکلا نے مجھے ہاتھ جوڑتے دیکھ کر کہا "ہاں! ہاں! یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ میں تو آپ سے چھوٹی ہوں آپ میرے دل کو نہ چھیڑتے تو بہتر تھا۔ یہ سوال مجھ سے نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ راجن بابو! آپ نے آج میرے ضبط پر بجلی گرا دی، بارود کے اندر آگ نہیں چھپ سکی، آپ مجھ سے پاک محبت کرتے ہیں مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی، شاید آپکو معلوم نہ ہو مگر میں آپ کے دلی حالت سے آج سے نہیں بلکہ عرصہ سے واقف ہوں لیکن میری ہمیشہ یہ خواہش تھی کہ آپ کی محبت کا جواب محبت میں نہ دوں، لیکن جب آج بات کھل ہی گئی آپ نے قسم بھی کھالی کہ آپ کی محبت سچی و پاک ہے تو اب کچھ چھپانا بیکار ہے۔ سنیئے عورتوں کو دنیا میں سب سے بڑھ کر پیارا پریم ہوتا ہے، وہ پریم ہی کی بھوکی ہوتی ہیں، جو اُن کی عزت کرتا ہے جو اُن سے محبت کرتا ہے وہ بھی اُن سے محبت کرتی ہیں، جو انہیں اپنا سمجھتا ہے اس کیلئے وہ جان دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ عورتوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اپنے چاہنے والے کو نہیں پہچان سکتا، لیکن وہ شرم و حیا سے اس کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ لیکن آج جن باتوں کو میں نے اب تک چھپا رکھا تھا اُن کو مجبوراً ظاہر کرنا پڑا۔ میری اس کمزوری کو معاف کیجئے گا۔ مگر راجن بابو! میں یہی کہوں گی کہ آپ نے اپنی محبت کی ہوا سے میری محبت کی چنگاری کو بھڑکا دیا۔ سوچئے تو سہی اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کیا دنیا ہماری اس پاک محبت کو اچھی نظروں سے دیکھے گی۔ جب آپکی بیوی بھی اس بات کو پسند نہ کر سکیں کہ ہم ملیں یا باتیں کریں تو دوسرے تو نہ معلوم کتنا بدنام کریں گے۔ مگر ٹھہرئیے......

آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ میں نے سمجھ لیا ——— برسوں سے میں نے آپ سے محبت کی مگر آپ کو اس کا پتہ بھی نہ چل سکا آج تک کسی کو خواب میں بھی میری محبت کا حال نہ معلوم ہوا۔ دیکھئے عورتیں اپنے دل کو کتنا سنبھال سکتی ہیں۔ میں نے آج تک کبھی نظر بھر کر بھی آپ کو دیکھنے کی جرأت نہیں کی، درشن کے سُکھ سے بھی میں نے خود کو محروم رکھا مگر آج آپ نے میرے دل کو ایسا چھیڑا کہ سب کچھ کہنا ہی پڑا، اب میں اور کچھ کہنا بیکار سمجھتی ہوں اب کچھ کہتے بھی نہیں بنتا مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آپ سے زیادہ دُنیا میں کسی سے بھی محبت نہیں کرتی اور جب تک جیوں گی اس محبت کو نباہونگی۔ آپ بھی میری اس محبت کی لاج رکھیئے گا، اگر میں آپ کو اِس جنم میں نہ پاسکی تو دوسرے جنم میں اُمید ہے کہ ضرور پاؤں گی۔ ——— لیکن یہ کیا؟ آپ روتے کیوں ہیں، رونا تو عورتوں کی قسمت میں لکھا ہے آپ تو مرد ہیں آپ کو رونے سے کیا کام۔ آپ کے لئے تو دُنیا میں سُکھ ہے چین ہے آرام ہے مجھ غریب بیوہ کے لئے آپ کیوں آنسو بہاتے ہیں۔ مجھ ایسی ہزاروں بیوائیں ہندوستان میں پڑی ہیں آپ کہاں تک روئیے گا ———"

میں جوشِ محبت میں دیوانہ ہوگیا مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا میں نے اس کے خوبصورت نرم و نازک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاکر پیار کیا۔ کوکلا نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میری اس گستاخی پر وہ جتنا بھی لعنت ملامت کرتی میرے لئے کم تھا لیکن پاک طینت صاف دل کوکلا نے مجھے معاف کر دیا۔

مدتیں گذریں زمانہ ہوگیا لیکن میرے دل سے کبھی وقت بھی کوکلا کی یاد نہیں جاتی، اس کا پاکیزہ مکھڑا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہی اور کوکلا! جہاں تک مجھے معلوم ہے کوکلا صدق دل سے مجھے یاد کرتی ہے۔ ہمارے درمیان سماج کی دیوار کھڑی ہے جس کا توڑنا آسان نہیں۔ لیکن ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت دُور کرنا بھی سماج کی طاقت سے باہر ہے۔ ممکن ہے کہ جٹا دھاری مہنت اور سماج کے وہ بھگت جو یتیموں اور بیواؤں کے مال پر ہاتھ صاف کرکے "مال پوا" کھا کھا کر اپنے بدن کو اور موٹا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جو بیواؤں کی کوئی ہستی ہی نہیں سمجھتے، ہماری اِس پاک محبت کو بھی گناہ سمجھیں لیکن اگر پریم کرنا بھی پاپ ہے تو دُنیا میں کوئی کام پُن نہیں ہوسکتا۔

(اعظم کُریوی)

تائیس

یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اُردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ یہ فرانسیسی مصنف اناطول فرانس کا شہ پارہ ہو اس میں جسم و روح کے تصادم کے مسئلہ کو مصرِ قدیم کی ایک عروس بازاری کی داستان کے طور پر نہایت دلفریبی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول تمام دُنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے، عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادر الکلامی اور اعجاز بیانی سے کیا ہے کہ اُردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بن گیا ہے۔ قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

اندھا بھکاری

کلکتہ کا ایک مکروہ محلّہ ——— پچھلے پہر کا وقت
جاڑے کی راتیں ——— ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ

ہوا تاڑی اور بنگلا[1] کی بدبو سے بوجھل ہو رہی ہے۔ گلیوں میں آبخوروں کے ٹکڑے، بوتلوں کی کرچیں، جھوٹے بتّل اور انڈوں کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں۔ طوائفیں منہ چھپائے سو رہی ہیں تکیوں کے نیچے انکی نسوانیت کی قیمت رکھی ہوئی ہے ——— روپے کم اور پیسے زیادہ۔ پہرے داروں کے "جاگتے رہیو ہو" کی صدائے بازگشت کتوں کی "بھوں بھوں بھوں" میں سنائی دیتی ہے۔ آسمان پر کچھ تارے کوڑھ کے داغوں کی طرح جھلملا رہے ہیں۔

وہاں ایک گھر ہے جس کی دیواریں بانس کی کھپچیوں پر مٹی کے تودے چڑھا کر بنائی گئی ہیں۔ چھپّر پھوس کا ہے اور دروازہ ٹین کا۔ دروازے کے سامنے ایک بھینسا گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ بھینسے سردی کے مارے کبھی کبھی اپنی موٹی کھال کو سکوڑ لیتے ہیں اور پھر اطمینان سے جگالی کرنے لگتے ہیں۔ دور سے دیکھو تو انکی آنکھیں مندر کے چھوٹے چھوٹے دیوں کی طرح چمک اٹھتی ہیں۔

اس گھر کو سب لوگ "اندھا ٹولا" کہتے ہیں۔

گاڑی بان کے جسم پر ایک موٹا کمبل تھا، ایک ہاتھ میں ناریل کی گڑگڑی، دوسرے میں چمڑے کا چابک۔ اس نے ٹین پر چابک کے دستے کا ایک ہاتھ لگایا اور بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ دفعتاً اندر اندھیرے میں کچھ لوگوں کے جمہائی لینے اور کھکھارنے کی آواز سنائی دی۔ کتے کان پھڑپھڑا کر ایک طویل "اوہو" کے ساتھ صبح کا بھجن گانے لگے۔ پھر آدمیوں کے ٹٹول ٹٹول کر چلنے اور لڑکھڑانے کی آہٹ سنائی دی۔

اندھے بغل میں اپنا جھولا دبائے، ہاتھ میں لکڑی لئے یکے بعد دیگرے باہر نکلنے لگے۔ ان کے پیچھے کتوں کا غول ایک دوسرے کو بھنبھوڑتا ہوا باہر آیا۔ گاڑی بان چابک سے کونچ کونچ کر انہیں گننے لگا۔ سولہ سترہ ——— دو اب بھی سو رہے ہیں۔ ایک اندھا ایک اندھی۔ ایک دوسرے کا لحاف بنے اب بھی سو رہے تھے۔

گاڑی بان اندر گیا۔ ایک لمحہ کا وقفہ۔ پھر چابک کا جھپاٹا اور اندھوں کی چیخ۔ مردہ بیل کی کھال زندہ انسان کی کھال پر، اور ران دونوں کی رگڑ، ایک دردناک فریاد بنکر عرش کی دم سے ٹکرائی اور اسی میں کھو گئی . . . . .

روز یہی ہوتا تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے یہ اندھے ایک گاڑی میں بٹھا کر مختلف چوراہوں پر چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ دن بھر وہاں بیٹھ کر وہ بھیک مانگا کرتے تھے۔ راہ چلتوں کا رحم حاصل کرنے کے لئے ان میں سے کوئی لنگڑا بن جاتا تھا کوئی اپنا چمڑا اودھیڑ لیتا تھا اور کوئی ٹانگیاں لپیٹ کر سڑک پہ پڑ جاتا تھا۔

وہ سب اندھے تھے، وہ کبھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان میں سے کسی کی پتلیاں سفید تھیں۔ کفن کی طرح۔ کسی کی آنکھیں سرخ تھیں،

[1] ایک قسم کی دیسی شراب۔

خون کی طرح۔ کسی کی آنکھوں میں دو گڑھے تھے ــــ قبر کی طرح، یہ بے بصر اور پتھرائی ہوئی آنکھیں خلا میں کسی نامعلوم شے کو ڈھونڈا کرتی تھیں۔ ان میں کبھی آنسو نہ آتے تھے۔ وہ اندھے بھکاریوں کی آنکھیں تھیں۔

وہ سب خدا کو یاد کرتے تھے: "اندھا گھوڑا کالا کمبل دے خدا کی راہ پر"۔ "میرا جھبل بھر دے تجھے مولا ملے"۔ "اندھے کا سوال ہے سب کے اوپر"۔

خدا کی رحمت چھوٹے ٹکڑوں اور کانی کوڑیوں کی شکل میں ان پر نازل ہوا کرتی تھی۔ اُنکے بے رنگ تخیل میں ہمیشہ سوکھی روٹیاں اور پھٹی چٹائیاں اڑا کرتی تھیں۔ راہگیروں کی ٹھوکر سے بچنے کے لئے وہ چوراہے کے تاب دان کے قریب بیٹھ جاتے تھے۔ اس تاب دان میں سماج کی ساری عفونت اور غلاظت یک جا جمع ہوا کرتی تھی۔ جو مرغی کلمہ طیبہ کے فیض سے کھانے والوں پر حلال ہو کر راہیٔ ملک بقا ہو گئی، اُسکے پیٹ کی آلائش اور بچے ہوئے پر تاب دان میں پڑے رہتے تھے۔ نرم نرم گوشت انسان کے لئے، گرم گرم خون کتوں کے لئے اور آنتیں چیل کوؤں کے لئے۔ شریفوں کے کھانے سے جو کچھ بچ جاتا تھا ــــ سڑے ہوئے پھل اور سوکھی روٹیاں ــــ وہ تاب دان کے حصے میں آتا تھا۔ دوپہر کو جب آمد و رفت کچھ کم ہو جاتی تھی تو اپنے کتوں کی مدد سے اندھے تاب دان کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ گوشت خور کتے سڑی گلی ترکاریاں اور پھل اپنے اندھے دوستوں کے آگے ڈال دیتے تھے اور وہ اُسے ایک نعرۂ مسرت کے ساتھ حلق کے نیچے اُتار لیتے تھے۔ پھر وہ جھوم جھوم کر سڑک پر چلنے والوں کو دعائیں دینے لگتے تھے۔

اس طرح اندھیرا ہو جاتا تھا۔ وہ بھینسا گاڑی آتی تھی اور یکے بعد دیگرے ان اندھوں کو لاد کر اپنے ٹھکانے لے جاتی تھی۔ وہاں پہونچکر چودھری ان سب کی جامہ تلاشی لیتا تھا۔ ہر فقیر کو روز کم از کم چونی کمانا ہی پڑتی تھی۔ اگر کوئی اس سے کم لاتا تو اُسے کھانا نہیں ملتا تھا اور مار الگ پڑتی تھی۔

محلہ کے بھٹیار خانوں میں برتنوں سے جو جھوٹا بچ رہتا تھا وہ ایک جگہ جمع کر کے اندھوں کے لئے بھجوا دیا جاتا تھا۔ اُنکے جھبل میں چسی ہوئی ہڈیوں، پسیجے ہوئے چاولوں اور باسی روٹیوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ کتے جھبل میں منہ ڈال کر ہڈی نکالتے تھے اور اُسے جبڑے میں دبا کر اس اس طریقے سے چباتے تھے گویا کوئی پکا گویا الاپ رہا ہو۔ اندھے انہیں دیکھ نہ سکتے تھے جب آواز سے پتہ چلتا بھی تو وہ ایک آدھ بار دھتکار کر چپ ہو رہتے تھے۔ کتوں کے سوا ان کا ہمدم اور غمگسار کون تھا۔ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔

پھر وہ پھٹی اور سیلی ہوئی چٹائیوں پر اپنی گدڑیاں بچھا کر لیٹ جاتے تھے۔ اندھے ایک طرف اندھیاں دوسری طرف ــــ اور کتے ان دونوں کے مابین، سخت گیر والدین کی طرح، ایک سدِ سکندری قائم کر دیتے تھے۔ جب اندھے کورس میں اپنی دعائیں یاد کیا کرتے تو پہلے تو کتے دھیان سے سنتے اور آخر میں ایک درشت آمین، کے ساتھ وہ بھی اُنکے ہمنوا ہو جاتے تھے۔

پھر اندھوں کی اندھیری دنیا میں خاموشی چھا جاتی تھی۔ آرتی کا گھنٹہ ہوا میں ہلکا سا ترنم پیدا کر کے چپ ہو جاتا تھا اور اذان کی آواز بھی فضا پر تھرتھرا کر کھو جاتی تھی۔ البتہ بہت دور سے ایک دکھی سارنگی کی ریں ریں، جھینگروں کی طرح بھنبھناتی اٹھتی تھی۔

جب اندھیرا دور ہو گا تو صبح ہو گی۔ لیکن اندھوں کی دنیا میں کبھی سورج نہ چمکے گا۔ دعائیں، کوڑے، سوکھی روٹیاں اور کتے ــــ یہی اندھوں کا سنسار تھا۔

ایک شام کو جب اندھے اپنی کوٹھری میں آئے تو کتّوں کی باز پرس سے انہیں کسی اجنبی کی موجودگی کی اطلاع ہوگئی۔ انہوں نے اپنی حسّاس ناکوں کو ہر طرف گھما کر فوراً بھانپ لیا کہ ان کے گروہ میں کوئی اندھی عورت شامل ہوگئی ہے۔

"کیا نام ہے جی تمہارا" — "جمنا"

آواز میں جوانی گا رہی تھی۔

نینا جنم اندھا نہ تھا۔ کبھی وہ بھی آنکھ والا تھا، کبھی وہ بھی ہر رنگ کو دیکھ سکتا تھا۔ ہر صورت کو پہچان سکتا تھا۔ وہ کیمیا سازی کے کسی کارخانے کا مزدور تھا۔ ایک روز تیزاب کی بوتل پھٹ گئی، اسکے کچھ چھینٹے نینا کی آنکھوں میں پڑے اور وہ اندھا ہوگیا۔ کارخانہ والوں نے اُسے نکالدیا۔ برسوں وہ مارا مارا پھرتا رہا اور اب یہاں آپھنسا۔

ابھی اس کے تن میں جوانی کی رگ ماؤف نہ ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ شدّت سے محسوس کرتا تھا کہ تاریکی کی عمیق چادر کو پھاڑ کر کوئی چیز روشنی میں آنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی اسے خیرات میں کچھ دیتا تو اُس کی پیٹھ پھرتے ہی وہ اسے ایک گندی گالی دیتا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ اگر اس میں قوت ہوتی تو وہ ان پیسوں کو آگ میں تپا کر ان سخیوں کے پپوٹوں پر رکھ دیتا۔ وہ بآواز بلند راہگیروں کو بددعائیں دیا کرتا تھا اور یہ لوگ کوئی پہونچا ہوا درویش سمجھکر اُسکی عزّت کرتے تھے۔

جوانی کا مقناطیس جوانی ہی۔ جب رات بھیگنے لگی تو نینا کو نیند میں یہ محسوس ہوا کہ کوئی اُس کی گدڑی کھینچ رہا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کوئی کتا ہے لیکن ایک نرم ہاتھ اُس کے پیروں سے لگا اور وہ اٹھکر بیٹھ گیا۔

"جاڑا لگ رہا ہے جمنا؟"

"ہاں جی"

نینا نے اپنی گدڑی اُسے اُڑھا دی اور خود پیتانے بیٹھ گیا۔ اس کی زندگی بنجر زمین تھی جس میں ایک پودا خود بخود اُبھر آیا تھا۔ نینا اندھیرے میں دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب اُس کی رگوں میں تازہ خون بہتا تھا۔ کس طرح کھیت کی مینڈھوں پر وہ دیہاتی لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا، غلیل سے پانی کی کلسیوں کو توڑ دینا، سر سے گھاس کے گٹھوں کو گرا دینا، لڑکیوں کے میٹھے میٹھے کوسنے ——

وہ دن اور اب!!

اندھوں کو ایسا لگنے لگا گویا جاڑے کی راتوں میں دھوپ نکل آئی ہے۔ جمنا کے بھولے گیت سنکر اُن کی بے نور آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ اس کی الھڑ ہنسی انہیں ایک نئی مسرّت کا پیام دیتی تھی۔ جب وہ چلتی تھی تو اندھے سہم جاتے تھے کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔

کئی راتیں آئیں اور گذر گئیں۔ ایک بار جب سب سو چکے تھے تو جمنا نے نینا کو اپنی زندگی کا افسانہ سنایا تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور اندھی ہونے کے باوجود حسین تھی۔ اس کا باپ کسی مہاجن کی دوکان پر منشی تھا۔ جب جمنا کی عمر چودہ سال کی ہوئی تو اُس کا باپ مر گیا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو بوڑھی ماں اور اندھی بیٹی کی دستگیری کرتا۔ ایک ایک کر کے تمام زیور اور برتن بنیئے کی نذر ہو گئے۔ تاہم ان کے دکھ کے دن نہ بیتے۔ خستہ حالی بڑھتی گئی اور فاقوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے تو محلہ والوں میں سے کوئی ایک دو وقت روٹی دیدیتا تھا۔ لیکن آخر کبتک۔

انہیں دنوں جمنا کے گھر اُس کی کسی دور دراز کی خالہ کا آنا ہوا۔ جانے کیوں ماں عرصہ سے اُس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

کئی روز تک اماں اور خالہ ایک کونے میں بیٹھکر سرگوشیاں کرتی رہیں۔ ایک روز ماں نے جمنا سے کہا کہ آج تجھے اپنی خالہ کے گھر جانا ہے۔ صبح سے اس کی کنگھی چوٹی ہونے لگی، اور جب جمنا اپنی پُراسرار خالہ کے ساتھ رکشا پر بیٹھ گئی تو اُسے اپنی ماں کی ہچکیوں کی واز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں جمنا کا دل اندر سے بیٹھنے لگا اور وہ کسی آنے والی مصیبت کے خوف سے آپ ہی آپ لرز اُٹھی۔

خالہ نے جمنا کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ گھر پہونچتے ہی اُسے طرح طرح کی مٹھائیاں کھلائیں۔ دیر تک اسکا بناؤ سنگار کرتی رہی۔ تاہم جمنا کا خوف ہر آن بڑھتا ہی جاتا تھا۔

بہت دیر ہو گئی، دیا جلے، نیچے کی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ سُنائی دی، قدم اتنے بھاری تھے کہ جمنا سمجھ گئی، کوئی مرد ہے۔

دروازہ کھلا اور خالہ جان "آئیے سیٹھ جی" کہتی ہوئی آگے لپکیں۔ تھوڑی دیر دونوں میں کانا پھوسی ہوتی رہی، پھر روپوں کی چھن چھن ہوئی خالہ ہنسی ہوئی جمنا کے پاس آئی، اُسکے آنچل میں روپے باندھ دئے اور اُسے چمکار پچکار کر باہر چلی گئی۔

قبل اس کے کہ جمنا کچھ سمجھے، اُسے اپنے منہ پر کسی جانور کا گرم گرم سانس محسوس ہوا۔ اس کے سخت ہاتھوں نے جمنا کی کلائیاں پکڑ لیں اور اُسے اپنے آغوش میں گھسیٹ لیا ــــــ

جب جمنا گھر لوٹی تو وہ عورت بن چکی تھی۔

کسی شام کو جب حسب دستور اندھے فقیر بھینسا گاڑی پر لوٹ رہے تھے، تو گاڑی بان اور چودھری میں باتیں ہونے لگیں۔

"چودھری، اور جو بھی ہو تھی تو لونڈیا سُندر"

"اجی، ایسی ویسی، سونے کی چڑیا تھی۔ پورے پانچ سو روپے ملے، تھوڑے نہ بہت، بھیّا، لڑکی کیا تھی، گڑیا تھی گڑیا۔ آنکھ نہ ہونے سے کیا ہوا۔"

نینا کے ہوش اُڑ گئے۔ بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا "چودھری، کیا بات ہے؟"

گاڑی بان زور سے ہنسا اور اُس کے منہ پر کوڑے کا دستہ کونچ کر کہا "بیٹا، بہت مزے کئے، اب چڑیا اُڑ گئی۔ وہ اندھی ٹھکانے لگ گئی، اب لکیر پیٹا کرنا"

چودھری نے گاڑی بان کے ہاتھ سے کوڑا لیا اور نینا کو بیدردی سے پیٹنا شروع کیا۔ لیکن نینا بےحس و حرکت بیٹھا رہا۔ وہ کیوں روئے، کیوں تڑپے، اب زندگی میں رہ کیا گیا تھا۔ اُس کی دُنیا ایک مرتبہ پھر روشن ہوئی تھی۔ لیکن آج وہ جوت سدا کیلئے بجھ گئی۔

سُورج مغرب میں ڈوب چکا تھا اور بجلی کے قمقمے گھنگھروؤں کی طرح ہوا میں ناچ رہے تھے۔

نینا نے کھانے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ جب چودھری کا بیٹا فقیروں کے جنگل میں ٹکڑے ڈال کر باہر چلا گیا تو وہ چپکے سے اُٹھا، لکڑی ہاتھ میں لی اور باہر نکل گیا۔

سڑک چل رہی تھی۔ اندھا لپکتا ہوا ایک گلی میں گھُسا اور اس بھول بھلیاں میں غائب ہو گیا۔

ہر راہگیر سے وہ پوچھتا "بھائی تم نے کسی اندھی بھکارن کو ادھر جاتے دیکھا ہے؟" کوئی حقارت سے اُسے گھور کر چلا جاتا تھا، کوئی ایک دھپ جما دیتا تھا، کوئی ہنس پڑتا تھا۔ جب کوئی سنسان سڑک آتی تو اندھا اپنی بے بصر آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر نحیف آواز میں "جمنا جمنا" پکارنے لگتا تھا۔

آدھی رات گذر گئی اور نینا چلتے چلتے تھک گیا۔ جھولا سرہانے رکھکر وہ فٹ پاتھ پر لیٹ گیا اور فوراً ہی سوگیا۔ معلوم نہیں وہ کب تک سوتا رہا لیکن سینکڑوں آدمیوں کے شور و غوغا نے اُسے چونکا دیا۔ پہلے تو وہ سمجھا ہی نہیں کہ ماجرا کیا ہے۔ لیکن جب تابڑ توڑ کئی لٹھ اُس کے سر پر پڑ چکے تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ پولیس والوں کی لاٹھیاں ہیں۔ پولیس کی لاٹھیاں ــــــ قسمت سے زیادہ جابر اور دوست سے زیادہ بے مروّت! ــــــ پولیس کی لاٹھیاں ــــــ طوفان سے زیادہ تیز اور امیروں سے زیادہ بےحس! فٹ پاتھ پر سونے والے آوارہ گردوں کی سرزنش کے لئے آج پولیس کا میعادی "ہلہ" نکلا تھا۔

اندھا بھکاری کہاں بھاگتا۔ وہ سر پر ہاتھ رکھکر پکارتا رہا "بابا میں اندھا ہوں" لیکن لاٹھی بھی اندھی ہوتی ہے۔

جب یہ آندھی گذر چکی تو نینا آگے بڑھا۔ اس کے سر اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ کئی بار گرا اور پھر اُٹھکر چلنے لگا۔ جب وہ اس سڑک کے موڑ پر پہونچا تو اُسے سامنے کے کوٹھے سے گانے کی آواز سنائی دی۔ اندھے کی روح کانپنے لگی۔ یہی وہ آواز تھی جس کی جستجو میں وہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ لیکن یہ آواز کہاں سے آرہی تھی؟ ــــــ گیت کی تان اکثر وحشیانہ قہقہوں میں ڈوب جاتی تھی۔ بیچ بیچ میں بوتلیں اُوپر سے نیچے گر کر چکنا چور ہو جاتی تھیں۔

اندھا سڑک پر بیٹھ گیا۔

آسمان سے ایک تارا ٹوٹا، اُس نے اندھے کو دیکھا لیکن اندھا اُسے نہ دیکھ سکا۔

اختر حسین رائے پوری

عقدِ مکرّر

جمالی کے چہرے پر جوانی کی شان ابھی باقی تھی؛ اور اُس کے گھنے بال بانکپن کا طرّہ معلوم ہوتے تھے۔ اُسکی روشن آنکھوں سے نکلنے والی نگاہیں نرم بھی تھیں اور نفوذ کر جانے والی بھی۔ اُس کی شان میں غرور کی آمیزش تھی اور اُس کی ادا خودداری و سربلندی کی صورت تھی۔ اُس کی شخصیت کچھ اس نوع کی تھی جس میں سے سکون آمیز اطاعت طلبی کی قوت نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ اور اس میں ایک فاتح کا سا انداز تھا جسے اُس کے اُونچے قد نے اور اُبھار دیا تھا۔ وہ اعلیٰ اور اثر انداز ذہانت کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔

مُلک کے ایک سِرے سے دوسرے سرے تک اُسکے نام کا شہرہ تھا، اور دولت اُسکی کنیز بن گئی تھی۔ کوئی دروازہ ایسا نہ تھا جو اُسکے لئے ہر وقت کھلا نہ ہو، اور کوئی صحبت ایسی نہ تھی جہاں اس کا خیر مقدم تپاک سے نہ ہوتا ہو۔

وہ ایک شاعر تھا، ایک خوش فکر انسان جس کا ذہن تصور کر سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا؛ اور پھر اُسے ایسی خوش اسلوبی سے ترتیب دے سکتا تھا کہ دوسرے اپنی اپنی ذہانت کے مطابق تصوّر و مشاہدہ کر سکیں۔ بغرض اس کی انفرادیت کا پودا بڑھکر بار آور ہو رہا تھا۔ جمالی کے متعلق بلا تامّل کہا جاسکتا ہے کہ اس کی فلک پیما ذہانت کے قدرتی حق نے اُسے انسانوں میں بادشاہ بنا رکھا تھا۔ اُس کے عالی تخیلات اور روشن تصوّرات، انسانی زندگی کے آلام و مصائب کا مرہم ثابت ہوتے تھے۔ اسکی تخیّل کے باغ میں فرزانگی کے پھول کھلتے تھے۔ فطرت یعنی زندگی کے گوناگوں پہلو اس کی زبان سے بولنے لگتے، چشموں کی گنگناہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، محبت کی محویت، احساس کی نزاکت، تہذیب کے انداز، اور تمدّن کی آویزشیں، اُسکی بنائی ہوئی تصویروں میں زندہ ہو جاتے تھے ——— اس کا فنِ شعر ایک جادو تھا!۔

سیر کی غرض سے جمالی لاہور سے کلکتے آیا ہوا تھا۔

۲

نجمہ کے خدوخال میں بلا کی جاذبیت تھی۔ اس کی صورت میں انتہا کی نظر فریبی تھی۔ اُس کی آنکھیں مدھ ماتی تھیں، اُن سے نکلنے والی نگاہیں خنک محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے دہانے کی ساخت نجمہ کے اندر بڑھتے ہوئے جذبۂ اُمیّت کا اظہار کر رہی تھی۔ بل کھائی ہوئی زُلفوں کی ایک خودسر لٹ اس کی نیچی مگر فراخ پیشانی پر کھیلتے رہنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسا رنگِ استہزا تھا جو انسانی طبع و مزاج کا مطالعہ کرنے والوں یا ایک جاہل و ناتراشیدہ آقا کے ذہین و مہذب غلام یا اس شخص کی صورت میں نظر آتا ہے جسے حقیقت و صداقت کے خنجر کی خوفناک دھار کا احساس ہو چکتا ہے ——— اس استہزا سے میرا مطلب اندازِ طبیعت کے اس اظہار سے ہے جسے اصطلاح میں "کلبیت" (متعلق بہ دیوجانس کلبی) کہا جاسکتا ہے[ا]۔

سینما میں ابتدائی نغمہ بج رہا تھا، آرکیسٹرا کسی اچھے اُستاد کے تخیلات بیان کر رہا تھا۔ بیلے اور سارنگی سے دل آویز بول نکل

[ا] "کلبیت" کو میں نے انگریزی لفظ Cynicism کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

رہے تھے۔ رُوح کو حرکت میں لے آنیوالا نغمہ اپنی زندگی جی رہا تھا۔ یہ نغمہ نجمہ سے باتیں کر رہا تھا، اُس کی رُوح کو غسل دے رہا تھا۔ وہ اس موسیقی کو سُنکر ایک اہتزاز محسوس کر رہی تھی۔ اس کے اندر نجمہ کو ایک سُنا ہوا ترانہ سُنائی دے رہا تھا ——— آہ، کیا وہ اس آواز کو پھر کبھی سُن سکے گی!۔

اس موسیقی نے اُسے محسوس کرا دیا کہ وہ جو کچھ بھی بن گئی ہو، اُسکی رُوح ملوث نہیں ہے، وہ ہنوز بے داغ ہے! اُسکی رُوح کو مردوں اور روپے کی فناکاریاں نہیں چھو سکی ہیں! نجمہ کو اسوقت کی موسیقی خدا کی آواز معلوم ہورہی تھی!۔

(۳)

جمالی جب سینما میں داخل ہوا تو اُس کی نگاہیں اُس عورت پر پڑیں جو موسیقی میں ایسی محو تھی، موسیقی نے جس کے چہرے پر عفت کا یہ غازہ چڑھا دیا تھا! نجمہ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک سا پڑا۔ اسکے اس وقت کے احساسات عجیب تھے!

"اوہ، آخرکار نجمہ مل گئی!"۔ اس خیال کے ساتھ وہ ایک تڑپ میں اُسکے پاس پہونچ جانا چاہتا تھا۔ نجمہ کے خلاف توقع مل جانیکی خوشی خود اس کے لئے بھی حیرتناک تھی، اور دریا کے ایک زوردار ریلے کی طرح تھی جو پیراکوں کے بھی پاؤں اُکھیڑ دیتی ہے۔" اوہ، نجمہ!" اسکے بطون نے یہ نام دوہرایا۔ لیکن اس جذبے کی عین عروجی حالت میں اس پر اوس سی پڑ گئی، اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ——— اسی لمحے میں اسکی نگاہوں نے نجمہ کے انداز و لباس سے کچھ سمجھا: نجمہ ..... یہ کچھ ہوگئی!۔

اس احساس و خیال کے ساتھ اُس کے قوائے ذہنی مفلوج ہوگئے، اور وہ بے حس حرکت کھڑا رہا۔ اب اُسکے سامنے نہ تماشائی تھے اور نہ تماشہ گاہ، نہ روشنیوں کی جگمگاہٹ تھی اور سازوں کی دل رُبائی۔ وہ اس وقت شاعر بھی نہ رہا تھا۔ بس ایک معمولی رسم ورواج کا پابند انسان۔

یاد ماضی نے اُس کے دماغ کو گزرے ہوئے مناظر کی جولانگاہ بنا دیا۔ اور جمالی "بیتے ہوئے دن عیش کے" پھر جینے لگا: ایک ایک واقعہ زندہ ہو کر اُسکے سامنے آنے لگا۔

کہر یا دُھند لکے میں جس طرح نظر آتا ہو، جمالی ایک نوجوان کو دیکھتا ہے جو عسرت وکس مپرسی کی زندگی جی رہا ہے، لاغر جسم، دُرشت خط وخال کا ایک انشائی نوجوان جس کے نتائج فکر شاذونادر ہی "منظور" ہوتے ہیں؛ کیونکہ وہ زمانہ وابنائے زماں کے متعلق کچھ ایسے جاندار خیالات لئے ہوتے ہیں کہ اخبار اور رسالے اُن کو شائع کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس نوجوان کے مضامین اور نظمیں مُسترد ہوتی ہیں اور وہ فاقے کرتا ہے ——— بیکس وتنہا نوجوان بھوک اور تمدن کے دو خوفناک دیوؤں سے جنگ کر رہا ہے ——— ایسی جنگ جو ذہانت کو اگر تباہ نہیں کر دیتی تو پھر اُسے خوفناک حد تک تیز کر دیتی ہے۔ یہ اوقات بسری اس نوجوان کو خود سر بنا دیتی اور اس میں غصّہ آمیز ضد پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر ایک وقت آجاتا ہے کہ اس جوانی کی حالت میں تغیر ہوتا ہے، وہ جب تکلیفوں سے دم خفا ہونے کی حد تک تباہ ہو چکتا ہے تو اپنے "حال" کو بُرا کہنا اور اُسے مٹا سکنے کی آرزو کرتا ہے ——— وہ نیم دیوانہ ہو جاتا ہے!۔

اب وہ جو کچھ لکھتا ہے اس میں سماج سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے، اس میں سے قاتلانہ ارادوں کی بو آتی ہے۔ وہ سب کو فنا کر دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ خود فنا کیا جا رہا تھا۔

ٹھیک اس حالت میں ایک فرشتۂ غیب نمودار ہوتا ہے، اور یہ فرشتہ اس کا محافظ فرشتہ ثابت ہوتا ہے: ایک سترہ سال کی لڑکی پژمردہ سے پھول کی ایک تصویر، رات کے وقت ایک گلی میں موٹر سے بچتے ہوئے نالی میں گر جاتی ہے۔ یہ اُسے اٹھاتا ہے۔ وہ ناتواں ہے، اس لئے کہ بھوکی ہے حُسن اتفاق سے نوجوان کی جیب میں کچھ دام تھے۔ وہ چوٹ لگ جانے کے خیال سے گرم دودھ لاکر پلاتا ہے۔ لڑکی کے حواس برجا ہو جاتے ہیں۔ وہ اُس کے گھر پہونچانے جاتا ہے۔ راستے میں اُسے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کا شوہر اوباش ہے اور اپنی کمسن بیوی سے بس اتنا تعلق رکھتا ہے کہ وقت بیوقت جب ضرورت پڑتی ہے، بیوی کو مار پیٹ کر اُس کے میکے بھیجدیتا ہے تاکہ وہ اپنے باپ سے کچھ رقم لے آئے یا ماں کا اندوختہ۔ ورنہ ہفتوں صورت نہیں دکھاتا اور نہ پرواکرتا ہے۔ طلاق دینے پر بھی رضامند نہیں ہوتا کہ اُسے اپنی ضرورتیں رُک جانے کا اندیشہ تھا۔

اس بلانصیب نوجوان کو اس روز ایک متشاعر سے ایک نظم کی قیمت حاصل ہوئی تھی۔ اور شاید وہ اس طرح اپنے نمائندہ ہائے طبع کو کسی کا متبنّٰی نہ کرتا اگر وہ اس رقم کو احتیاج سے دائمی مفارقت کے بیمے کیلئے نامزد نہ کرتا۔ اُس نے دن میں ٹھان لیا تھا کہ ایک شب حسبِ خواہشِ دل کھاپی کر اس زندگی کو خیرباد کہدے گا۔ لیکن اِس وقت اُس کے سامنے ایک اہم تر مسئلہ پیش ہوگیا تھا۔ وہ اپنی ساری پونجی اُس لڑکی کو دیدیتا ہے۔ اور جب اُس کے گھر سے اپنے مکان پر پہونچتا ہے تو اپنی خودکشی یا صبح کی نان و نمک کی فکر کے عوض اپنی طبیعت میں ایک قسم کی جولانی اور اُمنگ محسوس کرتا ہے۔ زمانے کو تاریک و غلیظ دیکھنے کے بدلے اسے شفاف و نورانی دیکھتا ہے۔ اب وہ دُنیا سے نفرت نہیں کرتا بلکہ رافت برتنا چاہتا ہے۔

صبح جب وہ بیدار ہوتا ہے تو نہایت سکون آمیز حسیات کی حالت میں ایک منظوم افسانہ لکھتا ہے — خود اپنا افسانہ جو ابھی انجام کو نہیں پہونچا ہے، لکھ چکنے کے بعد اس کو پڑھتا اور مسکراتا ہے۔ ایک مؤقر رسالے کے دفتر میں جاتا ہے اور معقول معاوضہ پاتا ہے۔ یہ کامیابی اُسے براہِ راست اس لڑکی کے پاس لے پہونچتی ہے، کیونکہ اس کے خیال میں اس کامیابی کا سبب اسی کی ذات تھی۔ وہاں پہونچکر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ رات اُس کا شوہر آیا تھا اور یہ راز نہ بتانے پر کہ اُس نے یہ رقم کہاں سے پائی لہولہان کرکے ڈال گیا اور رقم چھین لے گیا ہے۔

نوجوان حُسنِ مجروح و سوگوار کی اِس مُورت کو شفاخانے لے جاتا ہے اور جب تک اُس کی چوٹیں اچھی ہوں برابر اُسکے پاس جاتا رہتا ہے، اُس کی دوا، و غذا میں اہتمام کرتا ہے، اُس کے لئے لباس مہیا کرتا ہے — اُسکے پاس بیٹھکر اس کا دل بہلاتا اور لطف و مہربانی کی باتیں کرتا ہے۔ لڑکی جس نے اس مہر و التفات کا مزا کبھی نہ چکھا تھا اُس سے مالوف ہوجاتی ہے۔ اور جب وہ شفاخانے سے نکلتی ہے تو نوجوان کے ساتھ چلی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔

ایک مُصیبت زدہ کی احسانمندی، اور ایک محبت کی بھوکی کی محبّت کے جذبات، ایک غریب لڑکی سے جو اور جیسی خدمت کرا سکتے ہیں وہ اس نوجوان کی ویسی ہی خدمت شرُوع کردیتی ہے۔ اس محبّت آمیز خدمت کا تجربہ اس نوجوان کو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

لڑکی نہ صرف خوش جمال تھی بلکہ ذہین بھی تھی، اور اس کے ساتھ جب محبّت بھی شامل ہو تو نوجوان پھر کیوں نہ فردوسی مسرتوں سے آشنا ہو جائے! اب وہ جو کچھ لکھتا ہے وہ شائع ہوتا ہے، اور اُس کی شہرت، عزّت، اور ساتھ ساتھ دولت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

عیش و عشرت کی زندگی بعض نازک فطرتوں کو چوندھیا دیتی ہے، اور بعض شستہ طبیعتوں کے لئے ناقابل مزاحمت کشش رکھتی ہے۔ فراوانی دولت کی جگمگاہٹ سے ایک تفلسف ہی بچ سکتا ہے۔ شاید اس نوجوان کی شاعری نے ابھی تک اسے فیلسوفیت کا سبق نہیں دیا تھا۔ ورنہ کامیاب و کامران ہو کر اُس میں یہ تغیر رُونما نہ ہوتا۔ یہ نوجوان سماج میں مقبول عام پاکر رفتہ رفتہ اس لڑکی کی طرف سے بے پروا ہونے لگتا ہے، اور پھر بے رحمی سے بھی باز نہیں رہتا۔ یہانتک کہ وہ لڑکی اس حالت کو سہار نہیں سکتی تو ایک روز اُسے چھوڑ کر بھاگتی ہے اور پھر پتا نہیں چلتا۔

اس نوجوان کی کامرانیاں اتنی مکمل تھیں کہ اس لڑکی کے چلے جانے کا اس پر معمولی اثر ہوتا ہے، اور اس کی معمولی تلاش و جستجو بھی اُس کی بڑھی ہوئی مصروفیتوں میں گُم ہو جاتی ہے۔ فطری رنج و افسوس ہوتا ہے لیکن سوسائٹی کی رنگ رلیوں میں جلد محو ہو جاتا ہے۔ اسکی آرزوؤں کے پورا ہوتے رہنے اور اُمیدوں کے برآتے رہنے سے اِس نوجوان میں غرور کی شان پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ اپنی حالت پر مفتخر ہے، کیونکہ عالی خاندان اور پُر جمال خواتین کا تبسّم اس کے خیر مقدم میں فرشِ راہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب یہ تمام مصروفیتیں اور دلکشیاں اُس کا دل نہیں بہلا سکتیں اور وہ اپنے قلب کے اندر ایک خلا کا احساس کرتا ہے ــــــ اس ذلیل اور مستحرِم حالت کا احساس کرتا ہے جو کہ ایک مرد کو ایسی ہی حالتوں میں ہو سکتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ہلکی سی ٹیس اُس وقت اُٹھتی ہے جب اُسے وہ لڑکی یاد آتی ہے جس نے اُسے فنا ہونے سے بچا لیا ــــــ جس سے وہ واقعی محبّت کرتا ہے!۔

یہ نوجوان خود جمالی تھا۔

گزرے ہوئے زمانے کا خیال گزر گیا۔ جمالی کی چشمِ تصوّر کے سامنے سے ماضی کا غبار چھٹ گیا اور سامنے نجمہ بیٹھی نظر آئی۔ وہ لڑکی نجمہ ہی تھی۔ لیکن کیا وہ واقعی نجمہ کو دیکھ رہا تھا؟ کیا نجمہ سچ مچ ...... اس درجہ ذلیل ہو گئی ہے؟ اسکے آگے جمالی کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا، بجز اسکے کہ ایسا کیوں ہو سکا؟

اس سوال کے ساتھ اُستادِ عشق نے اُسے فلسفے کا پہلا سبق پڑھایا۔ کیا نجمہ اب ملعون ہے؟ کیا اسے ملعون ہی رہنا چاہیئے؟ اگر ایسا ہی تو ساری دُنیا ملعون ہے ــــ وہ خود سب سے پہلے ملعون ہے! اسی خیال میں اس کا سر چکرانے لگا۔

لیکن یہ حالت بھی آئی تھی۔ فرزانگیٔ محبّت نے اُس کے کان میں کہا کہ اس کی یہ عصبیت ایک خام کاری ہے اور یہ اظہار اس خام کاری کا آخری اظہار تھا! جمالی نے محسوس کیا کہ محبّت کا ضابطہ تمام قوانین سے بالاتر و قوی تر ہے۔ اِس خیال کے ساتھ اس پر ایک سکون، ایک پُر مسرّت سکون کی حالت طاری ہو گئی۔ اب وہ روشنیوں کو زیادہ جگمگ دیکھ رہا تھا، موسیقی زیادہ شاندار محسوس ہو رہی تھی۔

جمالی نے محسوس کیا کہ نجمہ درحقیقت اُس کے جذبات اور خیالات کی ملکہ ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ نجمہ کو بے خطا سزا ملی! اس خیال نے اس کی آرزوؤں میں ہیجان پیدا کیا اور اس کی ساری ہستی ہل گئی۔ بیلا اور سارنگی آخری سانس لینے ہی کو تھے، اب وہ خُدا سے باتیں کر رہا تھا یا خدا اس سے!

نجمہ نے ابھی تک جمالی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو نغمۂ و ساز کو دیکھ سُن رہی تھی، موسیقی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی ــــ اور

"نہیں بہرصورت تم میری ہو۔ اچھا اپنی پیاری زبان سے بھی کہدو کہ تم میری ہو"

"ہاں شاعرانہ زبان میں تمہاری ہوں۔ لیکن ہم میں بہت بُعد ہے زاہد۔ مجھے تعجب ہے کہ تم مجھ سے کس طرح محبت کر بیٹھے۔ میرا تم سے محبت کرنا بجا تھا۔ کیونکہ میں ابھی آزاد ہوں۔ لیکن تم "برائے دیگراں" ہوتے ہوئے بھی میری محبت میں کیوں پھنس گئے"

"سبحان اللہ! گویا تمہارے خیال میں آزاد و پابند کی تخصیص محبت کیا کرتی ہے۔ نہیں میری جان۔ دل جس کو پیار کرے"

شمسہ خاموش ہوگئی۔

"شمسہ" میں نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا "آؤ اب ہم ذرا وضاحت سے بات چیت کریں۔ اگر قضاو قدر ہمارے "موانعات" کو ہماری راہ میں سے ہٹا دینے کا کرم کرے"

—میں خود بخود چپ سا ہوگیا۔ بیمار کا مسترحم و ملول چہرہ میری آنکھوں کے آگے آگیا اور اس کی زبان سے کبھی یہ نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں کے گوشے گوشے میں گونجتے ہوئے۔ "تم میرے علاج میں کس قدر انہماک سے کام لے رہے ہو زاہد۔ تم مجھے نہیں مرنے دوگے۔ مجھے امید ہے نہیں مرنے دوگے"

دفعتاً میرے منہ سے ایک وحشت کی چیخ نکل گئی میں کپکپا اُٹھا۔ بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالا اور بے اختیار شمسہ کے سامنے سے اٹھکر بھاگا۔ بیوی کے پاس پہونچا تو اُس کی آج حالت خراب پائی۔ مجھے دیکھکر ایک تبسم افسردہ اُس کے خشک لبوں پر آگیا۔ اُس نے اپنے لاغر ہاتھ سے میرا ہاتھ تھاما۔ اور بولی "جب تم میرے پاس آجاتے ہو تو میری بیماری آدھی جاتی رہتی ہے۔ بیٹھے رہو۔ میرے ہی پاس بیٹھے رہو۔ اب کہیں نجانا"

"نہیں کہیں نہیں جاؤنگا۔ گھبراؤ نہیں میں یہیں بیٹھا رہونگا" یہ کہتے ہوئے مجھے پہلی بار ایسا محسوس ہوا گویا میں نے کوئی زبردست کام کیا ہے۔

شمسہ تندرست، جوان، حسین، شوخ و ذہین اور محبت پرست۔ رضیہ بیمار، موت کے چنگل میں گرفتار، لاغر، کمزور، صحت باختہ۔ اور —— اور میری راہ میں، ہر راہ میں سنگ گراں۔ شادی سے قبل میں اُس کو نہیں جانتا تھا نہ وہ مجھے جانتی تھی لیکن شادی کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو مدت سے جانتے تھے۔ وہ مجھے کس قدر چاہتی تھی اور میں بھی اس کی محبت کی کس قدر قدر و اعتراف کرتا تھا! آہ لیکن وہ بیوی تھی۔ یعنی اس حقیقت مسلمہ کی شکار ہستی جس کو اثرات یکجائی ایک بالکل معمولی ہستی بنا دیا کرتے ہیں۔ لیکن میں اس کا شوہر تھا۔ فرض شناس شوہر میں اس کو آسانی سے نہیں مرنے دے سکتا تھا۔ نہیں کسی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا تھا، شمسہ کی محبت کی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا! شمسہ کی دراندازی بڑی ہی بے محل تھی۔ میں نے اس کو کیوں چاہنا شروع کر دیا۔ میری تمام توجہ کی مستحق میری بیوی تھی۔ وہی رہے گی۔ شمسہ کی کل شادی ہوجائے گی۔ وہ دوسرے کی امانت ہے۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو یہ اُس کی غلطی ہے جس کا ازالہ بہت جلد ہو جائیگا۔ ہاں اُس وقت یقینی ہوجائے گا جب وہ دوسرے کے آغوش میں پہونچ جائیگی——

میں رضیہ کے سرہانے آرام کرسی پر اسی خیال میں دراز ہوگیا اور نہ معلوم کب نیند آگئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو تین باتوں کا مجھے سب سے پہلے احساس ہوا۔ میری گردن انسانی بازوؤں سے کسی ہوئی تھی۔ میں کرسی میں بالکل بھنچا ہوا پڑا تھا۔ اور میرے قریب کسی سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور شمسہ کو اپنے قریب پاکر دیوانوں کی طرح اسکی طرف نظریں جمادیں

پھر فوراً ہی کسی خیال سے پریشان ہو کر رضیہ کے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب خالی پڑا ہوا تھا۔

"رضیہ کہاں گئی؟" میں نے اپنی حالت سنبھالکر اور شمسہ کے نازک بازوؤں سے اپنی گردن آزاد کر کے دریافت کیا۔

"حکیم جی کے ہاں۔"

"اور تم یہاں کب نازل ہوئیں؟"

"ہاں میں بلا ہوں کہ نازل ہوئی۔ کیوں؟ زاہد اس میں تمہا قصور نہیں ہے میرا ہی ہے۔ میں اندھی تھی کہ تم کو چاہ بیٹھی۔ حالانکہ تم ایک محبت پرست بیوی کے شوہر ہو۔ میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ اور وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ آپکی بیوی کے اور آپکے مابین حائل نہیں ہونگی۔"

ہائے اس وقت مجھ پر کس قدر نفسیاتی دباؤ پڑا۔ اگر شمسہ یہاں آکر اس وقت اپنی محبت بگھارتی تو میں اپنے اگلے تہیہ کی بنا پر ضرور اس کو مایوس کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن وہ ظالم تو خود کھنچنے لگی۔ آہ عورت جب محبت قبول محبت کر کے مرد سے کھنچنے لگتی ہے تو مرد کی روح جسم سے کھنچنے لگتی ہے۔ اس وقت تمام مردانہ خودداری۔ عہد پندار وغیرہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نفسیاتی مسئلہ کی بنا پر شمسہ نے بھی مجھے پھر جیت لیا۔ میں اپنے تمام پچھلے فیصلے کو فراموش کر کے دیوانہ وار کھڑا ہو گیا اور اس کو اپنے بازوؤں میں جمع کر کے بولا۔ "میری روح ایک ذرا سے مذاق کا اتنا برا مان گئیں۔ شمسہ محبت تو جس کے حصے کی ہوتی ہے اسی کو ملکر رہتی ہے۔ اس میں بیوی وغیرہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ تو میری ہے اور میں تیرا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تیرا ہوں شمسہ۔"

جب بیوی کو یہاں بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تو میں واپس اس کو اپنے وطن لے آیا۔ جنگ عظیم کو آپ کیا اہمیت دیتے ہیں۔ میرے مختصر سینے میں آج کل صدہا جنگ عظیم کے خونیں حشر موجود تھے۔ قوت فیصلہ بالکل مر چکی تھی۔ پاس فرض شمسہ کی سنان محبت کے چرکے کھاتے کھاتے میری آنکھوں کے سامنے پڑا تڑپ رہا تھا۔ انسانیت وہمدردی مجروح ہو کر کونے میں منہ دئے رو رہی تھیں۔ بس دنیا کے نظام کو تہ وبالا کر دینے والی شے جسکو محبت کہتے ہیں۔ اپنے قوی ہاتھ میں فتحمندی کا نشان لئے سکندرانہ شان سے کھڑی نظر آرہی تھی۔ میری حالت بڑی ہی قابل رحم تھی۔ اس قدر قابل رحم کہ مجھ کو خود کو اپنی حالت زار پر ترس آنے لگتا تھا۔ یہ انسان کی انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے کہ اسکو خود اپنے پر رحم آنے لگے۔ بقول امیر ؎

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی حالت پہ خود آتا ہے ترحم مجھکو

عید کا مہینہ بھی آگیا لیکن مع پیام محرم کے۔ ایک روز شمسہ کے والد کا خط آیا۔ ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ کھولتا ہوں تو اس کے اندر ایک چھپا ہوا کارڈ نکلا۔ وہی پرانے زمانے کی اردو۔ شمسہ کی شادی طے ہو چکی تھی اور یہ اسی کا دعوت نامہ تھا۔ خوب! آخر اس کی شادی قرار پا ہی گئی۔ اس شادی میں مجھے شریک ہونے کی کیوں دعوت دی جا رہی ہے۔ میری تو بیوی بیمار ہے۔ دل بیمار ہے۔ شمسہ کیا کہتی ہے۔ کیا وہ بھی چاہتی ہے کہ میں اپنی قبر اپنی آنکھوں سے بنتی ہوئی دیکھوں؟ یہ لوگ مجھے شادی میں شریک کر کے متوقع ہیں کہ میں اپنی تمناؤں کی پامالی پر دل کھولکر مسرور رہوں؟ ان کے فریب مسرت میں برابر کی شرکت کروں! معاذاللہ۔

اگر اس شادی کو ہونا تھا تو اس کو میرے علم میں آنیکی کیا ضرورت تھی۔ چپ چاپ کیوں نہیں ہو گئی۔ ہم پر جو مصیبتیں نازل کی جاتی ہیں کیا ان کا قدرت کی جانب سے ہم کو کوئی نوٹس دیا جاتا ہے؟ پھر اس ام المصائب شادی کے باب میں مجھ پر یہ کرم کیوں کیا گیا؟ کیا یہ بات تیری شان کریمی کے

شایاں تھی؟ اُف خدا۔

شمسہ کی شادی ہوگئی۔ میں کس دل سے اس میں شریک ہوتا لیکن جانا پڑا۔ قدرت کا عتاب صرف اسی پر ختم نہیں ہوگیا تھا کہ میں اس اپنی غارت گر تمنا شادی میں شریک ہوا۔ بلکہ میں نے اپنی منحوس آنکھوں سے اُس کو دُلہن بنتے دیکھا۔ میں نے اپنے دیدۂ خونبار سے اُسکو رُخصت ہوتے ہوتے دیکھا اور میرے علم میں اسکی سہاگ کی رات کو لایا گیا۔ یہ ہیں جناب محبت کے انعامات۔

کہتے ہیں اور ہم بھی مدت سے سُن رہے ہیں کہ اس خراب آبادِ گیتی کا نظام نہایت ہی معقول طریقے پر قائم ہے۔ اس لغو خیال پر میں تمام دُنیا کو ایک قہقہہ حقارت بلند کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ نظامِ عالم کے یہ معنی ہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کا سازگار ہے وہ ہماری زندگی سے مساعدت کرے۔ اگر پراگندیوں کے باوجود بھی آپ اس پوچ نظامِ عالم کے مدّاح ہیں تو ایک گول روزن میں چوکور کیل ٹھوکنے کی کیوں نہیں تعریف کرتے! اسکی شادی کے پندرہ ہی یوم بعد میری بیوی کا انتقال ہوگیا جی ہاں انتقال ہوگیا ــــــ تاکہ میں سمجھ سکوں کہ میں منزل پر اسوقت پہونچا ہوں جب نشانِ منزل ہی نہ رہا۔ حسرتیں اُس وقت پوری ہونگی جب سینہ مدفنِ حسرت بن جائے گا۔ میں کہتا ہوں اگر بیوی کو مارنا ہی تھا۔ اگر یہ ہونا ہی تھا تو اُس وقت کیوں نہ ہوا جب اُسکو ہونا چاہیئے تھا۔ یہ پندرہ بیس روز پہلے کیوں نہ ہوا؟؟

میں نے بھی میدانِ زندگی کے بہت سے ہزیمت خوردہ بر خود غلط صوفیوں کی طرح تصوف کے دامن میں پناہ لینی چاہی۔ نماز، ذکر و تلاوت کو شعارِ حیات بنالیا۔ زندگی کی لذتوں کو تج دیا۔ لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا حقیقی مسجود کون ہے۔ اگر اسکو بھی عبادت و ریاضت شمار کیا جاسکتا ہے کہ انسان اسلامی ارکان کے ساتھ کامل بُت پرستی کرے تو میں آجکل ایک زبردست مرتاض ہوں۔

قیسی رامپوری

ہر دلعزیز مصنّفین کی کتابیں

ہدی۔ حُسن کی شوخیوں اور عشق کی گرمیوں کا ایک دلگداز اور جاں نواز افسانہ بڑا سائز۔ ۲۷۰ صفحے خوبصورت جلد۔ قیمت ۳ روپے

گناہ کی راتیں۔ سات عورتوں نے اپنے گوہرِ عصمت کو کس طرح کھویا؟ وہ کیوں اس پر مجبور ہوگئیں؟ عورت کی بے بسی دیکھئے۔ ” عہ

ناظمہ کی آپ بیتی۔ ایک خاتون کی عبرت انگیز آپ بیتی۔ عشق کی دلخراش داستان حُسن کی دردناک کہانی۔ خوبصورت جلد۔ ” ۱۲

طلسم سامری۔ پنجاب کے مشہور جرنلسٹ حضرت ایم۔ اسلم کی تازہ ترین تصنیف جسمیں حیرت انگیز پیرائے میں ہوشربا واقعات درج ہیں۔ ” عہ

نغمۂ حیات۔ رنگین لیلیٰ مضامین کا قابل قدر مجموعہ۔ ادبِ لطیف کے دلکش شہ پارے، جذبات و تاثرات کی مصوری۔ ” عہ

لیلیٰ کے خطوط اور روزنامچہ۔ دو آتشہ کی یہ ایک نئی کشید ہے جو میٹھی کم اور تلخ زیادہ ہے۔ ایک ہی تصویر کے دو رُخ۔ قیمت ہر دو حصص ” ۳ روپے

عجیب۔ عجیب کلب کے عجیب ممبروں کے عجیب حالات۔ پھڑکتی ہوئی آپ بیتیاں۔ ” عللہ

ایوانِ تصوّر۔ بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کے رنگین گیتوں کا دلکش ترجمہ۔ مشرقی تمدن کی خوبصورت تصویر۔ ” ۱۲

نغماتِ موت۔ حجاب تیاز علی کے غمناک مضامین کا مجموعہ۔ ہر مضمون بیحد متاثر کرتا ہے اور دُنیا کی بے ثباتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ” ۱۲

ادبِ زرّیں۔ حجاب تیاز علی کے مختصر مضامین کا مجموعہ۔ ہر مضمون تیر و نشتر بنکر دل میں اتر جاتا ہے ادبِ لطیف کے بہترین نمونے۔ ” ۸

ملنے کا پتہ۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی

مسوکو

ایک گاؤں میں کسان کے کچے گھر کے سامنے تار والے نے بامشکل ٹھیرائی اور "ڈیمپو ڈیمپو" کہکر آواز دی۔ کسان کی ضعیف العمر بیوی چکی پیس رہی تھی۔ تار کا نام سنکر پریشان دروازے پر گئی۔ تار لیکر شکریہ ادا کیا اور کسان کو جاکر دیدیا۔ وہ دھان صاف کرنے میں ونددھا ہوا تھا۔ تار پڑھکر اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی لہریں ہویدا ہو گئیں۔ دوران مطالعہ میں کئی بار وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے گھدرے دانت نکال نکال کر بے ساختہ ہنس دیا۔ بڈھی کسانی جو ہنوز سہمی ہوئی کسی خبر کی منتظر کھڑی تھی کچھ مطمئن ہوئی اور اب بغیر پوچھے نہ رہ سکی "تار کیسا ہے؟" کسان نے اپنی رفیقِ حیات کی طرف انتہائی مسرت خیز نظروں سے دیکھکر کہا "یامادا آرہا ہے۔ آج ہمارے لئے کیسا خوشی کا دن ہے۔ ہم دونوں کو خدا کی درگاہ میں شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ وہ کامیاب ہوکر وطن واپس آرہا ہے" ماں، بیٹے کی آمد کا مژدہ سنکر باغ باغ ہو گئی۔

دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کاموں سے بے نیاز ہوکر بچھڑے بیٹے کی آئندہ زندگی پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ دفعتاً دھرتی ماتا لرزنے لگی اور اس غضب کا شدید زلزلہ آیا کہ تمام گھر مثل ہنڈولے کے جھولنے لگا۔ دونوں دم بخود ایک دوسرے کو مایوسانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھئے زمین کسے نگلے گی۔ کسان کی چھوٹی بچی مارے خوف کے ماں کے سینے سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ اسکی خوبصورت اور بیشمار گڑیاں جن سے بیٹھی وہ کھیل رہی تھی آناً فاناً تختوں سے گر گر کر فرشِ زمین پر دراز ہو گئیں۔ کسی کو کچھ سدھ نہ تھی، جو جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا۔ زلزلہ سے گاؤں کو کافی نقصان پہونچا۔ خدا خدا کر کے امن ہوا۔

"یامادا" نے ایک معمولی پڑھے لکھے کسان کے گھر میں جنم لیا تھا۔ اس کا عہدِ طفلی گاؤں کی فضا ہی میں بسر ہوا۔ باپ نے اپنی حیثیت کے مطابق تعلیم دلائی۔ مگر یہ ابھی تشنہ تھا۔ اس کا نصب العین بڑا شاندار تھا۔ وہ اپنے مستقبل کو بڑے اونچے پیمانے پر سنورتے ہوئے دیکھنے کا آرزومند تھا اور قدرتاً اعلیٰ دماغ کا مالک۔ ہر وقت اپنی ترقی کے لئے ہاتھ پیر مارتا۔ بچپنے سے بڈھے باپ کو کھیتوں میں چاولوں کی کاشت کرتے دیکھا کرتا تھا جس میں انتہائی محنتِ شاقہ کے باوجود خاطر خواہ پیداوار نہ ہوتی تھی۔ یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یورپ جاکر جدید کاشت کاری کے طریقے سیکھے۔ ہر وقت یہی خیال دل و دماغ میں جاگزیں تھا۔ جب موقع ملتا باپ سے کہتا سنتا۔ غریب کسان اپنی مفلوک الحالی سے ناچار من مار کر مایوس ہو جاتا۔ وہ کسی طرح بھی یورپ کی تعلیم کا کفیل نہ ہو سکتا تھا۔ بڈھی کسانی سے بارہا کہا کاش میرے پاس اتنی جمع پونجی ہوتی کہ "یامادا" اپنی آرزو پوری کر سکتا۔ "کامی ساما" اگر مہربانی کرے تو چاول کی فصل اچھی ہونے لگے اور میں پھر سب اخراجات کو پسِ پشت ڈال کر اس کو یورپ بھیجدوں۔ اُسے وہاں جانے کا بڑا شوق ہے۔ "یامادا" ہونہار زمانے کے ساتھ چلنے والا ذوی فہم تھا۔ وہ ہر سخت سے سخت محنت کو بخوشی برداشت کر سکتا تھا۔ اس کا حوصلہ بلند اور دماغ روشن تھا۔ ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ جہاں اور جس کھیت میں جا نکلتا سب آنکھوں پر بٹھاتے۔ گاؤں کے لوگوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

لڑکی والے عام طور سے اچھے بروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لیکن بڈھے کسان کے ہم عمر پڑوسی نے پائپ کا لمبا کش

کھینچتے ہوئے کہا " کچھ " یامادا ساں " کا بھی فکر کیا۔ اب تو وہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا ہے اپنی زندگی میں ہاتھ پیلے کر دو " کسان نے اپنے ستے ہوئے سیپی نما چہرے پر ہاتھ پھیر کر ایک ہلکی سی مگر معنی خیز گہری سرد آہ کھینچی۔ اور زمین پر درما کی شکل بنانے لگا۔ " تاکے اوچی " نے کہا بڑے فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ جواب نہ دیا " کیا کہوں شادی بیاہ سب پیسے کا کھیل ہے۔ اگر میرے پاس کچھ اثاثہ ہوتا تو یقین جانو سب سے پہلے اُسے کچھ سیکھنے یورپ روانہ کرتا " " تاکے اوچی " کسان کے اس خیال کو سنکر دنگ رہ گیا۔

" کیا سچ کہہ رہے ہو اگر یہ ہی مُبارک خیال ہے تو میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ تمہارے لڑکے کی نسبت بڑے امیر اور سموراٰئی خاندان میں بہ آسانی کرا سکتا ہوں "

" کیوں غریب آدمی سے مخول کرتے ہو "

" مخول کیسا تم راضی ہو جاؤ پھر دیکھ لینا "

کسان کے دل ہی دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے۔ تاہم اُسے یقین نہ آتا تھا کہ ایسا نایاب رشتہ میرے جیسے معمولی شخص کے لڑکے کو خواب میں بھی میسر آسکتا ہے۔ اُس نے اپنی تھکی ماندی بڑھاپے سے بے رونق آنکھیں جن سے شکر گزاری [illegible] "تاکے اوچی" کو دیکھا اور جاپانی دستور کے موافق کمر کو خم دے دیکر شکریہ ادا کیا " مجھے ہر طرح منظور ہے۔ اگر تم [illegible] عمر بھر احسان مند رہونگا میری مالی حالت تم پر خوب روشن ہے۔ ہر بات صاف اور اچھی طرح فریق ثانی پر واضح کر دینا "

امداد غیبی چتر پھیلائے آنے والے وقت کی گھڑیاں گن رہی تھی " مسوکو " ایک بڑے امیر اور سموراٰئی خاندان کی چشم و چراغ۔ آرد نعم میں پلی بڑھی۔ قبول صورت، نازک اندام، وضعدار ہے۔ " وتانابے " اور " فجی موتو " اپنی لخت جگر کو لاڈ و پیار میں پال پوس کر محض گوشت اور جاہل و پھوہڑ دیکھنے کے حاشا حاشا آرزو مند نہیں۔ اُن کی دلی تمنا ہے کہ اسکو بہتر سے [illegible] ہنائیں اور ہنر میں ماہر کرنے کی سعی بلیغ کریں۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی جو کچھ جانتے ہیں بیٹی کے سکھانے میں ہمہ تن منہمک ہیں۔ [illegible] کے معلمات ملازم رکھ چھوڑے ہیں۔ ہر تعلیم اور فن سکھانے کیلئے دن اور اوقات مقرر ہیں " مسوکو " بذات خود تمام ہنروں میں کمال کیلئے اپنے ماں باپ سے زیادہ شوق کا اظہار کر رہی ہے اور سرگرم عمل ہے۔

جاپانی وضع کے چھ تتامی والے کمرے میں فرشی میز پر ایک جرمن اتالیق خوبصورت نوجوان لڑکی کو سبق پڑھا رہا ہے۔ لڑکی " کلثور " کا نام دہرایا اور جرمن " کلثور " پر سوالات کرنے لگی " مسوکو " بڑے شوق و محنت سے جرمن زبان سیکھ رہی ہے۔ اس کا باپ بھی باوجو عمر رسیدہ ہونے کے جرمن زبان کی باریکیاں عبور کرنے میں بڑی تندہی سے مصروف ہے۔

ساڑھے چار تتامی والے کمرے میں باپ بہ حیثیت مہمان کے ضابطے کے لباس میں دو زانو بیٹھا ہوا ہے " مسوکو " میزبان کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ خوشنما کیمونو زیب تن کئے " چانویو " کا کل سامان سامنے رکھے اسکی تیاری میں مصروف ہے۔ سامنے " توکونما " مشہور آرٹسٹ کی قد آدم تصویر آویزاں ہے۔ اس کے نیچے چوبی چوکی پر " اکے نوبو " طرز کی آرائش گل ہے اور اسکے پہلو میں بدھا کا مجسمہ رکھا ہے۔ دونوں کی نشست برخاست اور آداب مجلس سے کسی قریبی رشتہ کا احتمال تک نہیں ہوتا۔ ہر دو طرف مدبر خاموشی طاری ہے " مسوکو " نے بڑی نزاکت سے پھول دار ڈبہ اُٹھایا اور نرالے انداز سے بانس کے چمچے سے چائے کا سبز سفو

نکال کر پیالے میں ڈالا۔ پھر سُرخ ریشمی رومال سے چمچہ پونچھکر مقررہ جگہ پر رکھدیا۔ اب آہنی کیتلی سے ننھی سی ڈونگیا سے گرم پانی نکالا اور پیالے میں ڈال کر تکلف سے کیتلی کے مُنہ پر ڈونگیا رکھدی اور بانس کے بُرش سے چائے کو پھینٹا۔ اس کے بعد سُرخ رومال پر چائے کا پیالہ رکھکر دلفریب ادا سے باپ کے سامنے لاکر رکھا۔ اُس نے پیالہ اُٹھاکر اپنے سامنے رکھا اور کمر کو خم دیکر "مِسُوکو" کا شکریہ ادا کیا۔ پھر پیالہ اُٹھاکر ہتیلی پر رکھا۔ تین دفعہ چکر دے کر اس کے تین گھونٹ پیئے۔

آٹھ تتامی کے کمرے میں ایک جاپانی خاتون کی شاگردی میں "مِسُوکو" "یوری" پھول کی شاخ کو خم دیکر "شِن" کی جگہ لگا رہی معلّمہ نے "تائی" شاخوں کے مجموعے کی اصلاح کر کے اس سے "سوئے" کی شاخیں سجوائیں اور پھر گلدان پر نقادانہ نظر ڈال کر شاباشی دی کہ خوب پھول سجائے۔

کئی دن کی مسلسل بارش سے نیلگوں سائبان اپنا گرد وغبار دھو دُھلاکر صاف سُتھرا اُبھر آیا ہے۔ مطلع صاف ہے۔ دن بڑا پیارا خوشگوار ہے۔ بادِنسیم پیامِ بہار لئے اِٹھلاتی پھر رہی ہے۔ برف کے مارے لُنڈ مُنڈ برہنہ درخت نئی پوشش کے لئے گرما رہے سردی سے ٹھٹھری ہوئی شاخیں برگ وگل لانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ ٹہنیوں پر نکی دانے اُبھر آئے ہیں۔ ہر شاخِ گل زمین کی ان پر نگاہ جمائے ہوئے اپنا اپنا کمال دکھانے کے لئے مضطرب ہے۔ باہر میدان میں "مِسُوکو" باپ کے ساتھ تیر اندازی ف کر رہی ہے۔

سُورج کی ضیاتاب کرنیں دن بدن قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ مادرِ گیتی جو کڑوڑوں من برف کو اپنے شکم میں لئے منجمد تھی، آمدِ بسم اللہ کا ختم پڑھ چکی۔ اور اب جاڑے کی تمام نمی کو ابخرات کی شکل میں اُگل اُگل کر ہلکی ہو رہی ہے۔ "مِسُوکو" نازک کمر باندھے باپ کی منتظر ہے۔ "پھری گتکا" میں اُس نے بڑی ہوشیاری اور پھرتی سے تلوار کا وار لمبی تلوار سے اِس روکا کہ باپ خوشی سے اُچھل پڑا۔

جاپانی ناچ گانا اور "کوتو" بجانا ہوشیار جاپانی معلّمہ کی زیر نگرانی جاری ہے۔ "پیانو" سکھانے کے لئے مغربی اُستانی رہی ہے۔

چینی امبرائیڈری میں مدرسے سے اوّل انعام حاصل کر چکی ہے۔ کشتی رانی اور تیرنے میں باپ کی شاگرد ہے۔ ایک ماہر اُستاد موسیقی میں خوش نویسی سیکھ رہی ہے۔ نقاشی پر نمائش میں تمغہ مل چکا ہے۔ چینی ادب کی تعلیم کچھ تو مدرسہ میں حاصل کی تھی اور اب ایک رسٹی کے پروفیسر سے اس کی تکمیل کر رہی ہے۔ غرضکہ کوئی ہُنر ایسا نہیں جو شائستہ خاتون کا زیور ہو اور وہ اس سے محروم

بہار کا موسم شروع ہوگیا۔ ہری ہری کونپلیں پھُوٹنے لگیں۔ درخت نئے نئے لباس پہنے تشکرِ معبود میں جھوم رہے ہیں۔ زمین اُگ آیا۔ کلیوں نے چونچیں کھول کر ترانۂ فطرت گایا۔ غنچوں نے وا ہوکر بہار میں بہار کر دی۔ نسلِ آدم نے لبادے اُتار پھینکے۔ اور ہلکے پیارے پیارے لباس پہن لئے۔ یہی موسم جاپانی خواتین کی طرح طرح کی خوبصورت "اوبیوں" کا منظر پیش کرتا ہے۔ "مِسُوکو" کمیونو اور اس پر مور کی امبرائیڈری کی "اوبی" باندھے گھر کے وسیع باغ میں چہل قدمی کر رہی ہے۔ حوض میں قسم قسم کی پالتو چھوٹی ہوئی ہیں اور وہ اُن کو آٹے کی گولیاں بنا بنا کر کھِلا رہی ہے۔ جانوروں کو کھِلاتے پلاتے دُور جا نکلی۔ یہاں ہرنوں

نے آن گھیرا۔ انہیں ترکاری کے ٹکڑے دے رہی ہے۔ بڑی شاداں و فرحاں ہے۔ یکایک دور سے کسی کی آواز پر کان کھڑے کئے اُس کی نوکر "اوجو سما" "اوجو سما" پکار پکار کر تلاش کر رہی ہے۔ وہ لپے دیکھکر دوڑی ہوئی آئی۔ اور جھک کر کان میں، خوشی سنسنی پیدا کرنے والا مژدہ سُنایا۔ "اونیساں" واپس آرہے ہیں۔ (بڑا بھائی یعنی منگیتر) خوشی میں اچھلنے لگی۔ "سچ کہتی ہو" آپ سب جانوروں کو چھوڑ چھاڑ ترکاری پھینک واپس چلی۔ اُچھلتی کودتی جا رہی ہے۔ راستہ میں جو جانور ملتا ہے اُس سے کہتی ہے۔ "اونیساں" واپس آگئے۔ اسی بیخودی میں ایک جگہ ٹھوکر کھا کر دھما ہوگیا۔ خوشی میں ایسی وارفتہ تھی کہ بھنوں تک نہ سُکڑی۔

کمرے میں پہونچی باپ سے کہا "اوتوسما" "اونیسا" کو لینے "یوکوہامہ" چلیں گے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ جب "توکیو" آجائیں گے اُس وقت ملنے جائیں گے: رات کو عالم خواب میں بندرگاہِ یوکوہامہ کی سیر کر رہی ہے۔ جہاز یوکوہامہ سے روانہ ہو رہا مُسافر ڈک پر کھڑے ہیں۔ الوداع کہنے والے احباب و اعزا بندرگاہ کے کنارے کھڑے کاغذ کی رنگین پٹیاں جہاز پر پھینک رہے ہیں زمین اور جہاز کے درمیان ہوا میں رنگین پٹیوں کی چادر تنی ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔ ہجراں نصیب سماں ہے میں ہے۔ یکایک اسکی پٹی ٹوٹ گئی۔ گھبرا کر باپ کو پکارنے لگی کہ یہ کیا بدشگونی ہوئی۔ وہ قریب ہی سو رہا تھا۔ بیدار ہوا۔ خواب سُنکر تسلی کہ پراگندہ خیالات میں پریشان نہ ہو، وہ تو یورپ سے واپس بھی آگئے۔

"پچی بومارو" جہاز یورپ سے واپس آرہا ہے۔ ڈک پر ایک نوجوان کے پہلو بہ پہلو دلکش خدوخال کی جرمن لڑکی اپنی سنہری لٹ پریشاں میں نازک انگلیوں سے چھلوں کو سنوارتی ہوئی سمندر سے لُطف اندوز ہو رہی ہے۔ "یامادا" اپنی محبوب جرمن دوست کے حسن زیبا پر لٹو ہے۔ اس کی محبت میں سرشار دُنیا و مافیہا سے بے خبر الفت کے سُر الاپ رہا ہے۔ دوسرے خیال کا دل و دماغ میں گُزر تک نہیں۔ اُس نے "رو تھ" کو دُنیا کا گلو... [illegible] میدانوں میں کاشت کاری کرنے کا آرزومند ہوں۔ ہمارے پاس اب پانی اور زمین [illegible] ہیں۔ رُوتھ بھی سُہانے خواب دیکھ رہی ہے۔ دونوں ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں انجینیر ہیں۔ "یامادا" جدھر جدھر جاتا ہے پری سایہ کئے ساتھ ساتھ ہے۔

جب جہاز بندرگاہِ یوکوہامہ کے قریب پہونچا تو کوہ فجی نے بادلوں سے سر نکال کر اُن کا استقبال کیا۔ پہاڑ کی چوٹی برف ڈھکی ہوئی بقعہ نور نظر آرہی ہے۔ بڑا دلفریب منظر ہے۔ نگاہ واپس لوٹنے پر ایڑیاں رگڑ رہی ہے اور کسی قیمت پر بھی اس پیارے نظارے سے محروم ہونے کیلئے رضامند نہیں۔ "یامادا" نے انگلی سے پہاڑ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے رُوتھ کو دکھایا۔ دُنیا میں کوئی پہاڑ اس کی طرح یکہ و تنہا کھڑا ہوا اس کا مدمقابل نہیں۔ جاپانیوں کا یہ محبوب ترین "یاما" ہے۔ "یوکوہامہ" پر دونوں جہاز سے اُتر پڑے اور ریل میں سوار ہو کر توکیو روانہ ہوئے۔ راستہ میں فلک بوس عمارتیں دلکش مناظر دل کو لُبھانے کیلئے دلچسپی میں مزید اضافہ ہیں۔ "رُوتھ" نے سوالات کی بھرمار کر دی۔ "یامادا" بڑے شوق و انبساط کے ساتھ اپنی منظورِ نظر کو وطن کی ایک ایک چیز دکھا دکھا

دونوں نے امپریل ہوٹل میں قیام کیا۔ داخل ہوا ہی تھا نام وغیرہ لکھنے کے لئے قلم نکالا تھا کہ ہوٹل کے ملازم نے "وتانابے" کا خط دیا۔ لکھا تھا میں لڑکی سمیت آپ سے ملنے آرہا ہوں۔ خط پڑھکر جبیں پر فکر کی موٹی موٹی شکنیں پڑ گئیں۔ دوسرے روز "وتانابے" "مسوکو" کو ساتھ لیکر ہوٹل پہونچے۔ چونکہ کچھ روز ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتے تھے اس لئے انہیں بھی پتہ لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ "مسوکو" یورپین لباس میں ملبوس باپ سے کچھ دور کھڑی تھی۔ سامنے کے زینے سے جاپانی چینٹے کا ایک نوجوان ایک غیر ملکی لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستا ہوا نیچے اترا۔ وہ اُسے دیکھکر ٹھٹکی۔ اس کے حسرت و ارمان سے پُر، مسرت سے لبریز اچھوتے دل میں گھونسا لگا۔ روتھ نے یونہی سی اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور دونوں آگے بڑھ گئے۔ ایک دوسرے کو کوئی نہ پہچان سکا۔ "وتانابے" لکھ ہی رہے تھے کہ "یامادا" نے پہچان کر ہاتھ ملایا۔ یورپ کی آب و ہوا نے اُس کو کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔ "وتانابے" اس کو مضبوط قد آور چونچال دیکھکر خوش ہوئے مگر ساتھ ہی ایک خوش رو کامنی سی پری جمال حسینہ کو زیب پہلو دیکھکر دل ہی دل میں متعجب ہوئے۔ یامادا نے خود روتھ کا اپنی دوست کہکر تعارف کرایا۔ جرمن حسینہ سے ہاتھ ملانے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھکر کہا "مسوکو" کہاں ہے۔ وہ غریب افسردہ خاطر دل کو سنبھالے قریب ہی کھڑی تھی۔ لمحہ بھر پہلے اُس کا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ حیران و ششدر تھی کہ جن کانوں کو محبت بھرے کلام اور فراق کے گلے شکوے سننے کی اُمید تھی وہ کیا سن رہے ہیں۔ کاش کانوں میں پارہ بھر جاتا۔

باپ اپنے ساتھ لیکر آیا اور "یامادا" سے کہا "یہ مسوکو ہے" اُس نے دور سے نیچی نگاہ سے جھک کر سلام کیا اور پھر سکوت لگائے پرے ہٹ کر فرش کو گھورتی رہی۔ روتھ نے خود ہاتھ بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ "مسوکو" کے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ قلبی صدمے نے صاف شفاف رنگ پر زعفران مل دی۔ پل بھر میں مُرجھا گئی۔ باپ کے ساتھ کمرے میں آئی اور کرسی پر نڈھال پڑکر رونے لگی۔ باپ سمجھدار اور زمانہ شناس تھا۔ اپنے غم کو چھپا کر بیٹی کی دلجوئی کرنے لگا۔ "مسوکو" کے ہنسمکھ اور بشاش چہرے پر غم و الم کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں دن میں بار بار آنسو بہاتیں۔ جنہیں دیکھ کر باپ کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ [illegible] امید المناک واقعہ سے سراسیمہ تھا۔

روتھ بڑی شریف نیک طینت اور سمجھدار تھی۔ جلد بات کی تہ کو پہونچ گئی۔ اور پہیلی بوجھ لی۔ اُس نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا کہ یامادا نے نسبت کو پردے میں رکھا۔ اُس کے نیک دل میں "مسوکو" سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا اور عزم مصمم کیا کہ یامادا کا دل کسی نہ کسی طرح اپنی طرف سے پھیر کر محبت کی اصل مستحق کی طرف مائل کر دے۔ یہ خیال کرکے کہ اس لڑکی کی زندگی میں میں حائل ہوں بڑی پشیمان ہوئی۔ اس نے "مسوکو" سے رسم بڑھانی چاہی۔ ہوٹل ہی میں اُس کے کمرے میں آنے جانے لگی۔ "مسوکو" کے شکستہ دل میں روتھ سے ملنے کا قطعی سکت نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کے خیال سے آنکھوں سے دریا رواں ہو جاتا تھا۔ وتانابے ہمیشہ روتھ سے تپاک سے ملا کرتے تھے۔ باپ کے مجبور کرنے سے بیٹی بھی بادلِ ناخواستہ ملتی تھی۔ پہلی مرتبہ جب روتھ ہوٹل کے کمرے میں "مسوکو" سے ملنے آئی تو وہ آنسوؤں کے موتی پرو رہی تھی۔ باہر سے اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باپ نے "مسوکو" کو آواز دی جب اسکی آواز پر بھی آنسو نہ تھمے تو کہنے لگا کیا تم سمورائی کی بیٹی نہیں ہو؟ کیا سمورائی اپنے غم پر قادر نہیں ہوتے؟ اس پر "مسوکو" کو کچھ غیرت آئی اور آنسو پوچھ کر اسکو آواز دی کہ اندر آجائیے۔ آنے پر اس سے خلق سے ملی۔ وتانابے دو تین روز ہوٹل میں رہے اور چلتے وقت یامادا کو دعوت دیکر رخصت ہوئے۔

ایک دن یاما دا اور رُوتھ ہوٹل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ سامنے سڑک پر جاپانی سپاہ کا ایک دستہ مارچ کرتا ہوا نظر آیا۔ سپاہ کا دیکھنا تھا کہ اس کے خیالات میں ایک ہیجان برپا ہوگیا۔ چونکا۔ میں کس نشے میں سرشار ہوں، اور کس راہ پر جارہا ہوں۔ ہمارا مسلک ملک و قوم کے لئے ایثار و قربانی ہے۔ اگر اِن صفات کا میں اہل نہیں تو کیا جاپانی قوم کا ایک فرد کہلانے کا کسی طرح بھی مستحق ہو سکتا ہوں۔ میرے ملک کا ایک ایک بچّہ مادرِ شکم سے سپاہی پیدا ہوتا ہے اور تلواروں کی چھاؤں میں پل بڑھکر ملک و قوم کا محافظ بنکلیف سہی اور بہرخوشی قربان کرنی اس کا شیوہ۔ اسی قربانی سے ہماری قوم کی ترکیب ہوئی ہے اور اسی سے ہم نے دُنیا کی نظروں میں عزت حاصل کی ہے۔ کیا میرے لئے زیبا ہے کہ ایثار سے گھبراؤں! نہیں! مجھے رُوتھ کی محبت کی بھینٹ والدین کے حکم کی بجاآوری پر چڑھانی چاہیئے!... اِن خیالات میں ہر وقت غرق رہنے لگا۔ سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے یہی فکر تھا کہ کسی طرح اِس گتھی کو سُلجھاؤں۔ اگرچہ اُس نے رُوتھ سے کوئی وعدہ وعید نہیں کیا تھا تاہم اتنے عرصے کی دوستی کا پاس تھا۔ گھنٹوں خاموش ٹہل ٹہل کر غور و فکر کرتا کہ خوش اسلوبی کا معاملہ یکسو ہو جائے۔ خود بخود اُس کی دلچسپیاں پھیکی پڑنے لگیں اور اب یہ رُوتھ سے کترانے لگا۔ رُوتھ متحمّل اور الله اف پسند لڑکی تھی۔ اُس کے اطوار کو تاڑ گئی۔ وہ اپنی لمبی چوڑی داستانِ محبت کی جڑیں تک عرصہ ہوا اکھاڑ کر پھینک چکی تھی۔ کوشش کرنے لگی کہ "مِسوکو" کا خیال اچھی طرح اُس کے دل میں جما دے۔ یہی مشغلہ تھا جب اور جس وقت مُلاقات ہوئی "مِسوکو" اور اُس کے آئندہ عزائم کی بابت گفتگو کرتی۔ یاما دا کے لئے طبیعت کا خلجان اس درجہ ناقابل برداشت ہوا کہ طوعاً کرہاً ایک دن وہ اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر رُوتھ کو الوداع کہکر رخصت ہوا۔

سید ھا اپنے باپ کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ کھیتوں میں ہل چل رہے تھے، زمیندار بیج بونے میں مصروف تھے۔ جب اپنے باپ کے گاؤں میں پہونچا تو راستے میں دیکھا بُڈھا باپ پنڈلی پنڈلی دلدل میں کھڑا ہل چلا رہا ہے۔ چند منٹ کھڑا دیکھا کیا۔ آخر قدم بڑھا کر "اوتوساں، اوتوساں" پکارا۔ باپ دیکھکر دوڑا ہوا آیا۔ حالتِ بیتابی میں مٹی کے لتھڑے پتھڑے ہاتھوں سے بغلگیر ہونا چاہتا تھا کہ دفعتاً کپڑے خراب ہونے کا خیال آیا اور ہاتھ ویسے ہی کھینچ لئے۔ یاما دا نے بھرے ہاتھوں سے مُصافحہ کیا۔ "انوٹے" نے بہ اصرار بیٹے کے ہاتھ کا سوٹ کیس لے لیا اور گھر کو روانہ ہوئے۔ تھوڑی دُور چلے تھے کہ بہن نظر آئی۔ وہ پانی کے گڑھے میں گڑیوں کی کشتی چلا رہی تھی۔ اُسے دیکھکر گود میں اٹھا لیا۔ بہن نے چھوٹتے ہی سوغات طلب کی۔

گھر پہونچا تو ماں کو انگیٹھی کے پاس بیٹھا دیکھکر ڈیوڑھی ہی سے "اوکاساں، اوکاساں" آواز دی۔ بُڈھی کسانی نے مُڑ کر دیکھا تو یاما دا کھڑا تھا۔ اُٹھکر قریب آئی اور کہا "ما! کتنا بڑا ہو کر آیا ہے اوبیا! اوبیا!" محبت مادری جوش میں آئی اور ہڈیلے پچکے رُخساروں پر خوشی کے آنسو ڈھلکنے لگے۔ یاما دا دونوں ہاتھ فرش پر ٹیکے ہوئے جھکا ہوا تھا۔

کئی دن بعد بنیان اور نیکر پہن کر کھیتوں میں جا دھمکا۔ نئے اور جدید اوزاروں سے بنجر زمین صاف کی جنگلی جھاڑیاں اور الابلا سب کاٹ کر پھینک دیں۔ انوٹے دیکھکر متعجّب ہوا کہ دنوں کا کام گھنٹوں میں کرکے میدان صاف کر دیا۔ یاما دا نے کھیت کی مٹی دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر دیکھی اور چکناہٹ دیکھنے کی غرض سے ویسے ہی دونوں ہاتھ منہ پر مل لئے۔ "انوٹے" نے کہا "ای سوچی وار کیوں چھی مٹی ہے نا" کھیتوں میں ہل چلانے کیلئے خچروں کی جانوں پر عذاب تھا۔ یاما دا نے آب پاشی اور ہل چلانے کے لئے انجن منگوانے

کی تجویز باپ کے سامنے پیش کی۔ یہاں سے فراغت پاکر بہن کو کندھے پر بٹھا گھر پہونچا۔ کسان کسانی باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکیہ نے یاما وا کے نام کا خط دیا۔ "الزوٹے" نے لفافے کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور بیٹے کو دیدیا۔ خط پڑھکر یاما وا سوچ میں پڑ گیا اور بغیر کچھ کہے کپڑے پہن موٹر میں چل پڑا۔

روتھ کی آمد و رفت مِسُوکو کے ہاں برابر جاری تھی۔ وتانابے نے وضعداری کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ ایک دن روتھ کی دعوت تھی جب وہ مکان پر پہونچی تو مِسُوکو زار و قطار رو رہی تھی۔ باپ نے بہتیرا سمجھایا مگر اس کا آنسو تھمنا تھا نہ تھما۔ بدقت بولی یہ رنج میرے لئے بڑا صبر آزما ہے۔ یاما وا نے کہا تمہیں اس بات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کہ وہ تمہارے والدین کی مہمان ہے۔ کیا مہمان کا اسی طرح استقبال کیا کرتے ہیں۔ اِس فقرے نے جادو کا اثر کیا اور فوراً آنسو خشک کر کے اُسے ڈیوڑھی میں لینے گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے کھانے کے کمرے میں لائی۔ مِسُوکو نے خود روتھ اور یاما وا کے سامنے پُر تکلف کھانا چُنا۔ بار بار بیٹھکر کمرے کے بغلی دروازے کا "فسوما" کھولتی اور کھانے کی کشتیاں لا لاکر دونوں کے سامنے رکھتی۔ جب سب کھانا قرینے سے چُن چکی تو روتھ کے سامنے بیٹھکر کھانا پیش کرنے کے آداب کے موافق شکریہ ادا کیا۔ روتھ، ہاشی (تیلیوں) سے کھانا کیا جانے لُسے بڑی دقت ہوئی۔ ہاشی سے کھانے کی کوشش کرتی تھی مگر کوئی چیز گرفت میں نہ آتی تھی۔ مِسُوکو نے ہاشیاں پکڑنی سکھائیں۔ کھانے کے بعد روتھ مِسُوکو کا کمرہ دیکھنے گئی اور وہاں اس سے شادی کا کیمونو دکھانے کی درخواست کی۔ مِسُوکو نے بڑے غور و فکر کے بعد الماری کھولی اور کیمونو نکال کر دکھایا۔ روتھ نے تعریف کی اور مِسُوکو کو پہنکر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے عذر کیا کہ وقت سے پہلے میں نہیں پہن سکتی۔

وتانابے بیٹی کی زدہ حالت دیکھکر شب و روز فکر میں تھے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک مجلس چند عزیزوں کی موجودگی میں منعقد کی جائے اور اُس میں یاما وا کو مدعو کر کے معاملہ کو یکسو کیا جائے۔ مجلس میں تمام لوگ جمع تھے۔ یاما وا کا انتظار ہو رہا تھا کہ وہ داخل ہوا اور سلام کر کے صدر جگہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے تقریر کی اور مِسُوکو سے گفتگو کرنی چاہی۔ وتانابے نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

مِسُوکو بہت رنجیدہ اور شکستہ دل ہو رہی تھی۔ اُس نے پوشیدہ طور سے ممبرانِ مجلس کے مشورے سُنے اور دل میں ٹھانی کہ اس پاپی دُنیا سے سوائے مُنہ موڑنے کے دوسرا علاج نہیں۔ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آئی۔ اور الماری سے بہ حسرت و یاس اشکبار آنکھوں سے شادی کا کیمونو نکال کر فروشکی میں باندھا، اور گھر سے زار و نزار غائب ہو گئی۔ چلتے وقت کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظم کے کچھ بند لکھکر چھوڑ گئی۔

جس وقت گھر کے دروازے سے نکلی مُڑ مُڑ کر کوئے پر الوداعی نظر ڈالی۔ مندر میں پہونچی خشوع و خضوع سے دُعا مانگی مندر کے دو طرفہ آسمان تک پہونچنے والے سکورا کے درخت پھولوں سے لدے پھندے ترانۂ وحدت گا رہے تھے۔ تمام میدان پر پیازی رنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی تھی درختوں پر پھول ہی پھول تھے۔ پتوں کا نام نہ تھا۔ شاخیں بھی ان میں چھپ

رہ گئی تھیں۔ ٹھنڈ درختوں پر پھولوں کا نکل آنا طلسم معلوم ہوتا تھا۔ کائناتِ قدرت کی مدح ثنائی سے عقل عاجز اور زبان گنگ تھی۔ بھلا ہوا سکورا بلاشبہ باغِ ارم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سوختہ دل مسّو کو دنیا کی ہر چیز سے بیزار منہ اٹھائے اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی۔ ٹریم کا اسٹیشن آیا۔ مسافروں سے بھری ہوئی ٹریم گڑگڑاتی ہوئی درآمد ہوئی۔ مسّو کو سوار ہو گئی۔ اسامہ پہاڑ کے دامن میں ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں کچھ لئے کھڑی ہے۔ چند منٹ کے توقف کے بعد اس نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ پہاڑ کی چڑھائی اچھے اچھے سورما کا سانس پھلا دیتی ہے۔ یہ ننھی پھلکی چھٹانک بھر کی لڑکی بہ ہزار دقت اپنے کو کھینچ رہی ہے۔ دم پھولا جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں۔ پیشانی عرق ریز ہے۔ راستہ ٹیڑھا سیدھا، اونچا نیچا دشوار گزار ہے۔ جگہ جگہ تھک کر دم لیتی ہے اور چاروں طرف مایوسانہ نگاہ ڈالتی ہوئی گھبراتی اٹکتی آتش فشاں پہ پہنچا ادر کرتی چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تشنگی سے برا حال ہے۔ بار بار خشک زبان لبِ نازک پر پھیرتی ہے۔ منہ کا لعاب بھی تقریباً خشک ہو چکا۔ ہوا اس قدر مخالف ہے کہ چلتی کسی طرف ہے اور ہوا کے بے در پے جھونکے لئے کسی طرف جاتے ہیں۔

یاما دا جب مسّو کے کمرے میں پہونچا تو وہ موجود نہ تھی۔ چاروں طرف تلاش ہوئی۔ ماں گھبرائی گھبرائی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ یاما دا کا سامنا ہوا تو اس نے بڑی غم سوز آواز میں کہا "سارا گھر چھان مارا مسّو کا پتہ نہیں۔ وہ اپنا دلہن کا کیمونو بھی ساتھ لے گئی۔" یہ سنکر یاما دا کا دل مٹھی میں آگیا۔ پہلو کی دیوار پر اس کی تحریر کردہ نظم نظر پڑی۔ ایک ایک مصرعہ تیر کی طرح دل میں گھستا چلا گیا۔ نظم:-

بہار آئی —\
سکورا کے پھول کھلے۔\
ہوا چلی۔\
عین شباب میں شیرازہ بکھر گیا۔\
آہ! اسمورائی کی جان!\
سکورا رہنمائی کر رہا ہے۔

پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ حالت سراسیمگی میں کبھی کمرے میں آتا اور کبھی برآمدے میں۔ حواسِ خمسہ سست پڑ گئے، کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ باہر بے اوسان کھڑا تھا کہ نگاہ اوپر اٹھی۔ کوہِ آتش فشاں سے دھواں نکلتا دیکھکر ایکدم خیال اس طرف منتقل ہو گیا۔ موٹر پر سوار ہوا اور نہایت تیز رفتاری سے چلاتا ہوا دامنِ کوہ میں پہونچا۔

بدقسمتی سے گھبراہٹ اور جلدی میں لیے دامن میں پہونچا جس کے نیچے جھیل پڑی بہہ رہی تھی۔ اس کو دیکھکر پریشان ہوا۔ کنارہ جھیل پر کوئی اجنبی بیٹھا کش لگا رہا تھا۔ لپکا ہوا اس کے پاس گیا اور راستہ دریافت کیا۔ اجنبی نے کہا جھیل کو پار کرکے پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔ مگر آج دن خراب اور ہوا تیز ہے۔ پہاڑ پر چڑھنا خطرناک ہے۔ یاما دا پر کسی نصیحت کا اثر نہ ہوا۔ اور کچھ سوچکر پہاڑ پر چڑھنے کا جوتا اتار پھینکا۔ دھم سے جھیل میں کود پڑا۔ تیرتا ہوا کچھ دور پہونچا تھا۔ دم گھٹنے لگا۔ جھیل پر گندھک کا کثیف دھواں

چھایا ہوا تھا۔ سانس لینا دشوار تھا۔ کھانسی کے مارے بُرا حال۔ کہیں کہیں ٹھنڈ درخت جھیل میں کھڑے اپنی زیر آب زندگی پر نوحہ خواں تھے۔ تھک جاتا تو اُن کا سہارا لیتا۔ اور پھر تیرنا شروع کر دیتا۔ بڑی تکلیف اور دشواری کے بعد کنارے لگا۔ چند قدم زمین پر چلکر اوندھا گر گیا۔ تھوڑی دیر بے حال پڑا رہا۔ پھر پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ پہاڑی راستہ ٹیڑھا سیدھا، ڈھلوان تھا۔ جگہ جگہ سے دُھواں نکل رہا تھا۔ آگے چڑھکر جلتے جھلستے پتھر آنے لگے اور پاؤں کباب ہونے لگے۔ ہمت کرتا تھا مگر پاؤں یاری نہ دیتے تھے۔ جرابیں جل جلکر چھلنی ہو گئیں۔ تلووں میں چھالے پڑنے لگے۔ خدا یاد آرہا تھا۔ ایک جگہ تکلیف سے بیقرار ہو کر پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مگر متلاشی نگاہیں برابر آتش فشاں کی چوٹی پر لگی رہیں۔ چند ہی منٹ میں کھڑا ہو گیا۔ آتش اُلفت کی دبی ہوئی چنگاری بھڑکی اور درد دل نے اُکسا کر چلنے پر امادہ کیا۔ لنگڑاتا ہوا تپتے ہوئے پتھروں اور ناہموار راستے پر چڑھنے لگا۔ دیوانوں کی طرح حال سے بیحال دونوں ہاتھ منہ پر رکھکر ہولناک آوازیں مِسُّو کو، مِسُّو کو پکارتا۔ زہریلی گیسیں تمام پہاڑ پر منڈلا منڈلا کر آنیوالوں کو دعوتِ اجل دے رہی تھیں۔ کئی دفعہ سوختہ پاؤں نے جواب دے دیدیا۔ اور پاؤں کو ہاتھ میں لے کر ہو بیٹھا۔ مگر مقناطیسی کشش کبھی منٹ دو منٹ سے زیادہ آرام نہ لینے دیتی تھی۔

مِسُّو کو چوٹی پر پہونچی تو آتش فشاں کا کھولتا ہوا غار نظر آیا۔ اس میں چنگاریاں چمک رہی تھیں اور دلدل پک رہی تھی۔ کتنی ہی جوانمرگ اس کے پیٹ میں سما چکے تھے مگر اُس کی جوع کم نہ ہوئی تھی۔ جب اور جس وقت دیکھئے اپنی آغوش کھولے منتظر تھا۔ خون شباب منہ کو لگا ہوا تھا۔ ہر سال نوجوان سپوت اور لاڈلی کنیوں کو ہضم کر جاتا اور ڈکار نہ لیتا۔ مِسُّو کو منحوس غار کو دیکھکر سہم رہی تھی! اور آنکھیں بند کر لیتی۔ صورت پر ہوائیاں اُڑ گئی۔ پژمردہ رخساروں پر آنسو کی لڑیاں ڈھلکنے لگیں۔ جوانا مرگ تن تنہا موت کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ خوف سے رواں رواں لرز رہا تھا۔ آخر سوچنے لگی دُنیا فانی غم و الم کا گھر ہے۔ گوتم بدھا کے پاس پہونچکر یزداں مل جائے گا۔ عقبیٰ میں آرام ہی آرام ہے۔ اب مجھے کس کا خوف۔ اس خیال کے آتے ہی بدھا کی خیالی تصویریں سامنے آنے لگیں۔ اور مصروفِ دُعا ہوئی۔ طبیعت کو قدرے سکون ہوا۔ الا اللہ کر کے اُٹھی کانپتے ہاتھوں سے فرغل کی کھولی اور بادلِ گریاں کیمونو کو کندھے پر ڈالا۔

یاماداچلتے چلتے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ پاؤں تقریباً زخمی ہو چکے تھے۔ چوٹی سے چند گز کے فاصلے پر بیجان سا پڑا تھا۔ سامنے مِسُّو کو کیمونو پہنتی ہوئی دکھائی دی۔ رہے سہے اوسان خطا ہو گئے۔ آواز دینی چاہی مگر نہ نکلی۔ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس خیال نے کہ اب گری اب گری طاقت رفتار سلب کر لی۔ اُٹھنا چاہا مگر ڈھیر تھا۔ جوں توں کر کے چلا ایک ایک قدم سو سو من کا تھا۔ مِسُّو کو اپنے خیال میں محو خُدا سے لو لگائے کیمونو پہن رہی تھی کہ دفعتاً یامادانے پیچھے سے جا کر بغیر ایک حرف کہے جھٹ سے کیمونو اُتار لیا۔ مڑ کر دیکھا، سکتہ میں رہ گئی۔ خاموش تکتی رہی۔ پھر خفیف سے زیر لب تبسم کے ساتھ سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی۔ سوختہ پاؤں نے دامنِ صبر کی دھجیاں اڑادیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیروں کو تھام کر وہی کیمونو ان پر ڈالدیا۔ شادیٔ مرگ نے غشی سے ہم آغوش کر دیا اور گر پڑی۔

کوہِ آتش فشاں جوش میں آکر پتھر، چنگاریاں، لاوا اُگلنے لگا۔ پہاڑ پر دُھواں ہی دُھواں مسلط ہوگیا۔ اس ستم کی آتش فشانی ہوئی کہ پہاڑ سے پتھر نکل نکل کر جھیل میں ہتابیاں چھوڑنے لگے۔ زلزلہ نے اور آفت ڈھائی۔ آس پاس کے مکان فرش کر دیئے۔ بہزار دقت یاما دا بیہوش مِسُوکو کو گود میں اُٹھائے پہاڑ سے اُترا اور نیچے سرائے میں لایا۔ ہوش میں لانیکی تدابیر کیں۔ بار بار حلق میں پانی چواتا۔ تھوڑی دیر میں مِسُوکو نے آنکھ کھولی۔ یاما دا نے فرطِ محبت سے صرف اپنی پیشانی اُسکی پیشانی پر رکھدی اور آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔

سخت محنت اور رنج والم نے یاما دا کی صحت پر ناخوشگوار اثر ڈالا۔ اور وہ بسترِ علالت پر پڑگیا۔ صورت مُرجھا گئی۔ رنگ سنولا گیا۔ دونوں پیر بندھے آرام کرسی پر پڑا تھا۔ مِسُوکو اُس کی بیماری سے فکرمند ہے۔ طرح طرح سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہر وقت اُس کے سامنے مثلِ گُل کے کھِلی رہتی ہے۔ سامنے بیٹھی کوتو بجا رہی ہے اور وہ سُریلا نغمہ چھیڑا کہ یاما دا سر دُھننے لگا۔ لیٹے لیٹے اُٹھ بیٹھا۔ پرستار نگاہوں سے دیکھا۔ مِسُوکو پاس آئی، دونوں زخمی پاؤں کو ہاتھ میں لیکر ہو بیٹھی۔ فجی موتو چائے کی کشتی لے کر آئیں اسی میں ایک خط رکھا تھا۔ یاما دا نے خط پڑھا اور مِسُوکو کو دیکر کہنے لگا "روئی تھ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ میں تمہیں کھو چکا تھا اُسی نے واپس دلایا ہے"۔

مسز برلاس (از جاپان)

فرحت کا انجام

سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کی اُداس تاریکی پھیلتی جارہی تھی۔ کمرے کے دروازے کے گرد نوکروں کا ہجوم تھا جن کے زرد متوحش چہروں پر خوف و دہشت کے آثار تھے۔ میرے پہونچتے ہی سب نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے چلا کر آوازیں دیں۔ "فرحت!! فرحت ——!!" دروازے میں اندر سے قفل لگا ہوا تھا۔ جب سب زور لگا کر ہار گئے تو بدقت تمام اوزاروں کی مدد سے دروازہ توڑا گیا۔ میں تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ نوکروں میں سے کوئی بھی میرے ساتھ اندر نہیں آیا۔ کسی نامعلوم خوف نے غیر محسوس قوت کے ساتھ اُن کو روکے رکھا۔ کمرے کی اتاہ تاریکی میں میں اکیلا کھڑا تھا، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بجلی کے سوئچ کی تلاش میں میرے نم آلود ہاتھ بیسیوں چیزوں سے ٹکرائے، چینی کے خوشنما مرتبان، آبنوسی چوکھٹوں والی تصویریں۔ کانسی کے گلدان وغیرہ بیش قیمت نوادر جو اُس کمرے میں بے گنتی بھرے تھے میرے رستہ میں حائل ہوئے۔ میرا سر چکرایا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی طویل القامت انسان سفید لبادہ پہنے اپنے برف جیسے خنک ہاتھوں سے مجھے پکڑ رہا ہے۔ میں نے پھر پکارا "فرحت ——!!" لیکن میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی —— اچانک میرا ہاتھ کسی گداز اور چکنی سی چیز پر پڑا جس کو چھونے پر ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مُردے کا سرد جسم۔ خوف و دہشت کی ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ میں پیچھے ہٹا اور لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ چند سکنڈ کے بعد جب حواس ذرا مجتمع ہوئے تو میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا۔ سوئچ بورڈ اتفاق سے قریب ہی تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے میں نے بٹن دبایا۔ بجلی کی کپی خونخوار درندے کی خوں آلود آنکھوں کی طرح دہک اٹھی —— میں نے دیکھا کہ فرحت سنگار میز کے سامنے ایک کرسی پر نیم دراز ہے —— میرا دل حلق کے قریب دھڑکتا ہوا معلوم ہوا۔ "فرحت —— بیگم!!" کہتا ہوا میں اُس کی طرف لپکا —— کیا واقعی یہ پتھر کا مجسمہ فرحت ہی تھی؟ سفید براق ریشمی ساری میں لپٹی ہوئی یہ بیجان مورتی کیا میری بیوی ہی تھی؟؟ مجھے اس کے پہچاننے میں کافی دیر لگی۔ اپنی جلتی ہوئی وحشت زدہ آنکھوں سے حیرت، ڈر اور استعجاب کے ساتھ میں اس برف کے مانند سرد سفید ڈھیر کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی بے نور آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور سامنے والے بڑے آئینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ پتلیاں کچھ کچھ اُوپر کو چڑھی ہوئی تھیں سیاہ گھونگریالے بال پوری لمبائی تک بکھرے پڑے تھے جیسے غضبناک سمندر کی موجیں —— بایاں ہاتھ کرسی کے نیچے گر پڑا تھا —— ڈرتے لرزتے کپکپاتے ہوئے میں نے اُس کے ہاتھ کو چھوا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا —— بجلی کے سے جھٹکے کے ساتھ میرا ہاتھ خود بخود کھنچ گیا۔ وہ اپنے تمام زیورات جو بڑے چاؤ اور شوق سے بنوائے گئے تھے پہنے ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ کے جھٹکے سے اُس کا مُردہ ہاتھ ہلا۔ چوڑیوں کی جھنکار نے مجھے پھر ڈرا دیا۔ کہیں یہ لاش زندہ تو نہیں؟؟ ڈر سنبھلکر میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا —— اس کا لباس نفیس اور بھینی خوشبو سے معطر تھا۔ میں نے اُسکے بھیانک چہرے کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر سامنے والے آئینے میں اُس کے عکس کو —— کیا واقعی یہ فرحت ہی تھی؟ فرحت تو حُسن کی دیوی تھی اور یہ عورت تو مٹیالی راکھ کا ڈھیر ہے۔ لیکن اُسکے نیلے ہونٹوں پر اُسکی وہی مخصوص زہریلی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ یہ تلخ استہزا آمیز مسکراہٹ صرف فرحت ہی کے ہونٹوں پر آسکتی تھی۔ شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے اپنے قدیم نوکر عبدل کو آواز دی۔ عبدل ڈرتا ہوا آیا اور ایک ہی نظر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ وفادار ملازم نے اپنی مالکہ کے ہاتھ چومے اور قدم چھو کر ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔

میں نے اپنی مُردہ بیوی کی قیمتی پوشاک اور بھیانک چہرے کی طرف دوبارہ نظر ڈالی۔ اور پھر عبدل کی سچی عقیدت پر ہنسا۔ یہ مسکین شخص اس مکارہ کے سامنے جھک کر اپنی شرافت کا خون کر رہا تھا۔

"عبدل ــــ جاؤ ــــ" میں نے چلا کر کہا "تم نہیں جانتے کہ یہ عورت کیسی تھی۔ میں اسے فرشتہ سمجھتا تھا مگر اصل میں یہ زہریلی ناگن تھی ــــ شاید تم کو اس رات کا واقعہ معلوم نہیں ــــ مگر خیر، تم جاؤ۔ اس کمرے سے فوراً نکل جاؤ۔ کل صبح بیگم صاحبہ کا شاندار جلوس نکلے گا۔ اسکے لئے انتظام کرو، جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"اکیلا؟" عبدل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں، کل چاہے زمین اسکی مالک بنجائے لیکن آج یہ میری ملکیت ہے" میں نے کہا۔

"مگر صاحب، یہ تو دیکھنا چاہیئے کہ موت کیسے واقع ہوئی" عبدل نے مستفسرانہ کہا۔

"یہ تو صاف ظاہر ہے ــ" میں نے میز پر سے ایک چھوٹی سی خالی شیشی اٹھاتے ہوئے کہا "یہ دیکھو اس پر پوٹاشیم سائنائیڈ لکھا ہے۔ نہایت سہل ترکیب ــــ اور یہ دیکھو ــــ" میز پر بہت سے کاغذ بکھرے پڑے تھے ــــ "بیگم صاحبہ نے چند دلچسپ دستاویزات بھی تحریر کی ہیں ــــ محبوبہ کا آخری پیامِ الفت تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ بیگم صاحبہ ادب سے بھی شغف رکھتی تھیں ــــ اب تم جاؤ اور مجھے اس شہ پارے کو پڑھنے دو ــــ جاؤ"

عبدل بادلِ ناخواستہ چلا گیا۔ اور میں اپنی جاں نواز فرحت سے آخری باتیں کرنے کے لئے اور اُن کی رومان انگیز تحریر سے بصیرت حاصل کرنے کے لئے اکیلا رہ گیا۔

خوف و ہراس، غم و غصّہ کے تمام آثار میرے دماغ سے یک قلم محو ہو گئے۔ حواس بجا تھے البتہ دل کی دھڑکن بدستور تیز تھی۔ میں فرحت کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"ہاں! فرحت۔ مجھے یقین تھا کہ تم یہی کرو گی۔ اُس رات کی ناپاک حرکت کے بعد تمہیں دُنیا میں رہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا تھا۔ اب تمہاری وہ سحر انگیز آنکھیں کیوں پتھرا گئیں جن سے تم میرے صادق دوست کو اپنا گرویدہ بنانا چاہتی تھیں۔ وہ شیرینی، وہ ملاحت اور تمہاری مُسکراہٹ کا وہ زہر ہلاہل سب فنا ہو گئے۔ اچھا ہوا ــــ کہو تمہیں کیا کہنا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مُردے سُن سکتے ہیں۔ کیا تم نہیں سُن رہیں؟ خود فطرت نے انتقام لے لیا۔ میرے معصوم دل کو ٹھکرا کر تم نے میرے سچے دوست پر اپنا جادو چلانے کی کوشش کی۔ یہ اس کا انجام ہے۔ تمہیں بدلہ دینا ہوگا اُس بیوفائی کا جو تم نے میرے ساتھ کی۔ اُس رُوحانی تکلیف کا جو تم نے اپنی شرمناک حرکتوں سے مجھے پہونچائی۔ اس دغا، فریب، جھوٹ اور مکر کا جو تمہارے خمیر میں داخل تھا ــــ کیا میں تمہارا معافی نامہ پڑھوں؟"

میں نے بکھرے ہوئے کاغذات کو یکجا کیا ــــ ساتھ ہی میں نے اپنی جامد و ساکن سرد و سنگین فرحت کا دوبارہ جائزہ لیا۔ ہلکے آبی جمپر کے نیچے سے سفید ریشمی انڈرویر جھلک رہا تھا۔ میں نے بڑھکر اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ خدا معلوم کیوں، ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس کے قلب کی نازک دھڑکن سُن سکوں۔ لیکن وہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو چکا تھا ــــ کسی گلگلی سی چیز پہ میرا ہاتھ لگا۔ میں نے ڈر کر ہاتھ گھسیٹ لیا۔ ایک سیاہ بھونرا لا سانپ اُس کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا ــــ یہ تحفہ میرے اُس دوست نے نذر کیا تھا جس پر میری رومانی فرحت فریفتہ تھی۔ سیاہ موتیوں کا نہایت خوبصورت سانپ جس کی آنکھوں میں لعل

میرے جبڑے ہوئے تھے اور منہ میں کلس تھا جس سے یہ سانپ ایک پیٹی کی خدمت انجام دیتا تھا ـــــ اُف وہ مرتے دم تک فرحت نے اس عزیز سانپ کو اپنے سے الگ نہ کیا ـــــ مُردہ جسم سے لپٹا ہوا یہ سانپ اس وقت بالکل زندہ معلوم ہوتا تھا اور یقیناً مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوتی اگر یہ اس وقت اپنا پھن اٹھا کر پھنکارے مارنے لگتا ـــــ سامنے والے آئینے میں میں نے اپنا عکس دیکھا، فرحت کے ہیبتناک عکس کے برابر ـــــ ہماری آنکھیں چار ہوئیں ـــــ ایسا معلوم ہوا کہ فرحت کی مثالی پیشانی پر نفرت کی شکنیں پڑیں لیکن نہیں اُس کے نیلے لبوں پر وہی مسکراہٹ قائم تھی ـــــ البتہ جبڑے کے سختی کے ساتھ بند ہو جانے سے یہ مسکراہٹ اور زیادہ بھیانک ہو گئی تھی۔

تند ہوا کا جھونکا آیا۔ فضا میں ہلکی چیخیں سنائی دیں۔ کھڑکیاں ہلیں۔ پردے کانپے۔ فرحت کے لمبے سیاہ بال لہرائے۔ کمرے کی فضا میں خوشبودار تیل کی مہک پھیل گئی۔ لیکن اس خوشبو کے بین بین شاید ایک قسم کی بساند بھی تھی ـــــ جب سکون ہوا تو میں نے خط سنبھالا اور اطمینان سے پڑھنا شروع کیا۔

بغیر کسی القاب آداب کے خط اس طرح شروع ہوا۔

"میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں مر کر رہونگی ـــــ کسی جذباتی ہیجان کے تحت نہیں بلکہ پورے غور و خوض کے بعد میں نے یہ اٹل فیصلہ کیا ہے۔ میرا دماغ شدید کرب میں مبتلا ہے اور میرا جسم زندگی کے بوجھ سے دبا جاتا ہے۔ ان سب تکلیفوں کا خاتمہ کر دینا ہی انسب ہے ـــــ موت کے خیال سے اس وقت خوف کی بجائے کچھ انسیت سی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ اپنی مصیبتوں کے اختتام کے لئے میں کسی غیبی طاقت کی ممنونِ احسان نہ ہونگی بلکہ خود اپنے ہاتھ سے ان کا خاتمہ کر دونگی۔ دل کی اس بیجا دھڑکن اعصاب کے ارتعاش اور خون کے اُبال کو میں اپنی مرضی سے ذرا سی دیر میں ساکت کر دونگی ـــــ مبارک ہے یہ ارادہ اور شاباش ہے اس اقدام کو ـــــ اپنی بھرپور جوانی میں میں اس زندگی، اس لیل و نہار اور اس دُنیا سے بیزار ہوں۔ الحمدللہ کہ جلدی میری آنکھیں کھل گئیں ـــــ دُنیا سے جاتے وقت مجھے اپنے محبّ کی نورانی آنکھیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور بس ـــــ چوبیس برس کی طویل عمر میں صرف چند لمحوں کیلئے میں نے اُسے اپنا بنایا۔ یہ چند لمحے میری زندگی کا عطر تھے۔ افسوس اب وہ چلا گیا۔ وہ جسکے دم سے میری دُنیا آباد تھی۔ جس کی زندگی سے لبریز مسکراہٹ میرے ارمانوں کی آبادی میں چراغاں کر رہی تھی۔ وہ چلا گیا اور اسکے بغیر میرا زندہ رہنا عبث ہے۔ میرا وجود دُنیا کی پیٹھ پر بوجھ ہے ـــــ اپنے جاہل اور منحوس شوہر کا مجھے ذرا بھی خیال نہیں، بلکہ خوشی ہے کہ میں اُس کی مہلک گرفت سے نجات حاصل کر رہی ہوں۔ یہ حضرت بھی خودداری اور ناموس کا پاس رکھتے ہیں، چہ خوش!! اور انہیں بے معنی الفاظ کا آسرا لیکر حضرت سلامت نے مجھ سے علیحدگی اختیار کرنے کی دھمکی دی ہے۔ بڑے عزت والے!۔ اس قسم کا آدمی اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا تھا ـــــ اگر اُس نے مجھے سمجھا ہوتا۔ میرے جذبات کا پاس کیا ہوتا ـــــ اگر اُس عشق و محبت کا ذرا سا بھی اظہار کیا ہوتا جس کی میں بھوکی تھی تو شاید مجھے اُس کی طرف سے افسوس ہوتا۔ لیکن اُس نے میرے ساتھ بالکل وہی برتاؤ کیا جو ہر مرد ہر عورت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہے۔ مجھے اچھے سے اچھا کھلایا۔ اچھے سے اچھا پہنایا۔ رہنے کو کوٹھی، خدمت کو نوکر چاکر، اور اُس کی ناشائستہ خواہشات کی آسودگی کے انعام میں زر و جواہر کے انبار۔ لیکن کیا کبھی اُس نے

میرے ساتھ ہمدردی کا ذرا سا بھی برتاؤ کیا۔ کبھی میرے مضطرب دل کی دھڑکن محسوس کی۔ کبھی میری خاطر سے اپنے جذبات کی فراوانی کو روکا۔ کبھی خفیف سے ایثار سے بھی کام لیا ـــــ کبھی نہیں۔ شادی کے چار طویل سالوں میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ـــــ اب جبکہ میرا راحتِ روح اور یہ خبیث دونوں عمر بھر کے لئے مجھ سے علیٰحدہ ہوگئے تو میں آزاد ہوں ـــــ اس چھوٹی سی نبض کو جس کا اتنا بڑا نام یعنی زندگی ہے، جس کی بساط ایک کمزور تاگے سے زیادہ نہیں، میں ابھی آسانی سے توڑ ڈالونگی ـــــ مجھے خوشی ہے کہ آج اس وقت مجھے اس ارادے سے باز رکھنے والا کوئی نہیں ـــــ دنیا میں میرا کوئی نہیں جو میرا ہاتھ پکڑ لے اور اس کمزور تاگے کو نہ توڑنے دے ـــــ کوئی نہیں!!۔

آج قبر کے کنارے تک پہونچکر میں اپنی گذشتہ عمر پر نظر ڈالتی ہوں ـــــ مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ زندگی جس کو میں اب ختم کر رہی ہوں کس طرح شروع ہوئی ـــــ ایک سبق جو مجھے بچپن سے سکھایا گیا یہ تھا کہ میں اچھے اچھے کپڑے پہنوں اور بناؤ سنگار کرکے لوگوں کو پرچایا کروں۔ بھولی بھالی فرحت کے نرم رخساروں پر بڑے بڑے کھوسٹ اپنے تمباکو کی بو والے ہونٹوں سے بڑی شفقت کیساتھ پیار کیا کرتے تھے "کتنی پیاری بچی ہے!" "کیسی بھولی!" وہ مجھے اپنے ہوسناک بازوؤں میں گھیر کر اپنے سینوں سے چمٹایا کرتے تھے۔ کتنی حرمزدگی تھی ـــــ بچپن ختم ہوا جوانی آئی۔ شوق وارمان کی چنگاری جو اپنے بزرگوں کی عادات وخصائل کے مشاہدے سے میرے دل میں پیدا ہوچکی تھی ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ میرا دل چاہنے لگا کہ ہر مرد میری طرف دیکھکر سرد آہیں بھرے۔ ہر نوجوان مجھے حاصل کرنے کی تمنا میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور میں سب کے خوابوں کی اچیت دیوی بن بنکر سب کو خوش رکھوں اور کسی کے ہاتھ نہ آؤں ـــــ چنانچہ اس شغل لطیف میں اپنی بہترین کوشش صرف کرنے لگی۔ طبیعت میں جولانی، ولولہ اور خیالوں میں رومانی محبت رچ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ادب کی طرف مائل ہوئی۔ شاعری اور محبت کے افسانوں میں میں خود اپنی واردات تلاش کرنے لگی۔ ہر بگڑا دل شاعر اور ہر محبت کا پجاری افسانہ نویس میرا ہی مبتلا نظر آنے لگا ـــــ عشق ومحبت کے جوشیلے قصے، عاشق ومعشوق کی رنگینی ملاقاتوں کے عریاں بیانوں میں مجھے خاص لطف آنے لگا۔ ہر وقت انہی خیالی قلعوں میں رہنے لگی ـــــ مجھے خود اپنی ذات اور اپنے ان جاں نواز رومانی خیالوں سے کس قدر انسیت ہوگئی تھی۔ صبح سے شام تک میں اپنے خیالی مجنوں کے انتظار میں بیٹھی رہتی ـــــ آہ! دنیا سے جاتے وقت یہ خیال کتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں ـــــ یہاں کی تمام رنگینیوں اور بہار آفرینیوں سے رخصت ہوتے وقت جب اپنے گذشتہ خیالات کا جائزہ لیتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے ـــــ کھڑکی میں رکھے ہوئے پنجرے میں سے بنگالی مینا اپنی مٹھاس بھری آواز میں کوکی ـــــ "فرحت کی مینا" "بیگم کی پیاری!!" ـــــ "یہ پیاری مینا کتنی خوش ہے ـــــ اسے تو خوش ہونا ہی چاہیئے کیونکہ وہ انسان نہیں ہے ـــــ اس کی پیاری باتیں مجھے کتنی پسند تھیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ بیچاری مجھے کتنا یاد کرے گی ـــــ یہ خیال کہ میں اس کی مالکہ مرچکی ہونگی اور یہ پھر بھی اپنے شیریں لہجے میں بولا کرے گی ـــــ فرحت کی مینا ـــــ!!

یہ کمزور خیالات میری ہمت پست کئے دیتے ہیں ـــــ میں نے مینا کو پنجرے سے رہا کر دیا۔ محبت کی ماری مجھ سے جدا

نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میں نے جھٹک کر پرے کر دیا۔ اب دو پائیں باغ میں پھر پھر کرتی ہوئی، ایک درخت سے دوسرے درخت پر اڑتی پھر رہی ہے ــــ قید سے رہائی حاصل کرنے پر کتنی خوش ہے ــــ کیا مجھے بھی اپنے قفسِ عنصری سے نجات حاصل کرنے پر خوشی حاصل ہوگی ــ؟ ــ شاید!!

دو ایک فقرے ذرا درد بھرے آگئے۔ جن پر مجھے ندامت ہے ــــ مجھے مرنے کا ذرا بھی افسوس نہیں ــــ مجھے اپنا بیان جاری رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح میں اپنی افتادِ طبع کا تجزیہ کر سکوں گی ــــ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میری رومانی ذہنیت اور شباب کی شعلہ روانیوں کی واحد ذمہ دار میری تعلیم اور میرا ماحول ہے ــــ خیر ــــ سترہ برس کی عمر میں میرے والدین نے "شادی کے بازار" میں مجھے ایک انمول سودے کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر۔ جلسوں میں ادھر اُدھر، بڑی بوڑھیوں کی لالچی نظریں مجھ پر پڑنے لگیں۔ اپنے ہونہار اقبالمند صاحبزادوں کے لئے انہیں ایک معقول دلہن کی تلاش تھی۔ ادھر میرے والدین بیچارے قرضے میں گرفتار تھے۔ ان کو ضرورت تھی ایک ایسے الدار شخص کی جس کی عنایت سے انکے تمام دلدر دور ہو جائیں ــــ ان حالات میں مجھے بہت جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ میرا عنقریب سودا ہونے والا ہے ــــ محبت کے خیال ہی سے محبت کرنے والی دوشیزہ کے لئے یہ خیال سوہانِ روح ہو گیا ــــ اپنے خیالی صنم کے انتظار میں زیادہ بے چینی محسوس کرنے لگی ــــ اس عرصے میں میرے بیسیوں فوٹو کھنچے اور جگہ جگہ بھیجے گئے ــــ بعض حلقوں میں میری قیمت کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی تھیں بعض خریداروں کے لئے میری مقررہ قیمت حوصلہ شکن ثابت ہوئی ــــ اسی اثناء میں میری ملاقات میری موجودہ ہمسائی سے ہوئی۔ یہ نیکی کا مجسمہ، اخلاق کی پتلی اور محبت کی دیوی تھی۔ اس نے مجھے چند عمدہ کتابیں پڑھنے کو دیں۔ جن سے میں نے اپنے خیالات میں نمایاں تبدیلی محسوس کی ــــ اس وقت جبکہ میں اب گور بیٹھی ہوں میری نیک ہمسائی اپنے گھر میں بفراغت دلچسپ گھریلو کاموں میں مصروف ہوگی ــــ میں چاہوں تو اپنی مدد کے لئے اُسے بلا سکتی ہوں۔ وہ دوڑی دوڑی آئے گی اور نسائیت کے تقاضہ سے مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کے سو سو جتن کرے گی۔ مجھ سے لپٹ جائے گی۔ زہر کی یہ شیشی جو میرے قریب رکھی ہے اسے توڑ پھینکے گی۔ مجھے پکڑ کر اپنے گھر لے جائیگی ــــ ایک عجیب خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا ــــ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اُسے آہستہ سے بلاتی ہوں۔ شاید وہ سن لے اور آجائے اور پھر شاید میرا ارادہ بدل جائے ــــ قسمت شاید دوسرا راستہ اختیار کر لے۔ شاید ــــ!!

میں نے اس کا نام لیکر پکارا۔ آہستہ سے تین مرتبہ۔ اس نے نہیں سنا۔ وہ نہیں آئے گی ــــ آج خدا اسے اپنا فرشتۂ رحمت نہیں بنائے گا ــــ اسے میرے دل کے زخموں کی کیا خبر ــــ اگر وہ میری اصلی سرشت جان لے تو مجھ سے کس قدر نفرت کرنے لگے ــــ خیر ــــ

اب وہ زمانہ آیا جبکہ میرا خیالی محبوب جس کی پرستش کرنا میرا واحد مقصد تھا تسلیم کی شکل میں نمودار ہوا ــــ ایک وحشیانہ مسرت نے مجھے دیوانہ بنا دیا ــــ میرے دماغ پر کیسی مدہوشی طاری ہوگئی۔ میرے خون میں کیسے خوش آئند شعلے بھڑک اٹھے!ــــ

میں نے سلیم کو دیکھا اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی فرشتے کی طلسماتی آنکھوں نے مجھ پر جادو کر دیا ——— پر افسوس اُس کا منّی بنا ہوا وہ شخص آیا جس نے بیشمار دولت سے مجھے خرید ڈالا ——— وحشی، خبیث طینت، منحوس، بوزنہ صفت انسان جو میرا قانونی شوہر ہے ——— شوہر ——— ہوں!!! ———"

یہاں میں پڑھتے پڑھتے رُکا اور فرحت کی طرف نظر کی ——— اُس کا سر سینے کی طرف جھک گیا تھا۔ "میں بیوقوف تھا جو میں نے تجھ سے محبت کی ——— تجھے حاصل کرنے میں میں نے اپنی جان تک بیچ ڈالی ——— اگر تو دوبارہ زندہ ہو سکتی تو پھر میں دیکھتا ———" غصہ کے مارے میرا دماغ پریشان ہو گیا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور چندے توقف کے بعد پھر پڑھنا شروع کیا۔

"میری شادی اُس کروڑپتی وحشی سے ہو گئی۔ ظاہرا میں نے اُس سے محبت کا برتاؤ روا رکھا لیکن سلیم کیلئے میرا دل ہمہ وقت بیتاب رہا اور میں موقع کی تلاش میں رہی۔ میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد مجھے زیادہ آزادی حاصل ہو جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ شادی کے بعد عیاشی کرنا فیشن میں داخل ہے۔ میری سہیلیوں میں سے زیادہ تر ایسی ہی تھیں جو شادی کے بعد اپنے محبوبوں سے دزدانہ ملتی رہتی تھیں ——— میرا خیال تھا کہ سلیم بھی میری اس مصلحت کو پسند کریگا۔ لیکن آہ! اُس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اور یہیں سے میری ناکامیوں کا دُکھڑا شروع ہوتا ہے ——— ایک بار، دوبار ہزاروں بار میں سلیم کے سامنے گڑگڑائی۔ اُس کے قدموں پر سر رکھا لیکن وہ سنگدل ذرا نہ پسیجا ——— تعجب ہے وہ اسے گناہ کیوں خیال کرتا تھا ——— فی زمانہ یہ نہایت معمولی سی بات سمجھی جاتی ہے۔ شوہر کے علاوہ ہر فیشن ایبل عورت کا ایک عاشق ہونا ضروری ہے ——— قریب قریب تمام شہرۂ آفاق مصنفین اس کی حمایت کرتے ہیں ——— اس مسئلہ پر میں نے ملک کے مایۂ ناز رسالوں میں لاتعداد مضامین دیکھے ہیں ——— پھر آخر اس قسم کی کوئی خواہش رکھنے پر میں مجرم کیوں قرار دی جاؤں ——— سب کہتے ہیں کہ بدنامی نہ ہو تو یہ نسخہ نہایت کام کا ہے۔ میرے معاملے میں بھی بدنامی کا کوئی سوال نہیں تھا ——— پھر آخر اس میں کیا نقصان تھا ——— لیکن میری قسمت!

ابھی ابھی ایسا معلوم ہوا جیسے سلیم نے مجھے پکارا۔ اُس کا شیریں لہجہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے لیکن اُسے میری پروا نہیں ——— کوئی مضائقہ نہیں آج اُس کے نام پر، اُسکی محبت کے نام پر میں اپنی جانِ عزیز قربان کرتی ہوں ——— میں نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ میں کیسی خوبصورت ہوں ——— بے انتہا حسین! مجھے یاد ہے گزشتہ سال ایک نجومی نے کہا تھا کہ "تیری خوبصورتی یا تو کسی کو ہلاک کریگی یا خود فنا ہو جائے گی۔" مجھے خوشی ہے کہ اس پیشینگوئی کا دوسرا حصہ آج سچا ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے غور سے اپنی مدبھری آنکھوں کی گہرائیوں کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ان میں طلسمات پوشیدہ ہیں۔ لمبی اور نکیلی پلکیں ریشمی جھالروں کی طرح ان جادوگرنیوں کی پردہ پوشی کرتی ہیں۔ پدمنی کے سے رخسار، پتلے حلاوت سے بھرے متبسم ہونٹ، شفاف گردن ——— یہ تمام تحائف کس کے لئے ——— فطرت نے یہ بیش بہا نعمتیں مجھے اسی لئے بخشی تھیں کہ مردوں کے دل لبھاؤں۔ لیکن افسوس سلیم ان تمام سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔

زہر کی شیشی میرے قریب رکھی ہے ـــــ میں نے اچنبھے سے اُس کی طرف دیکھا ـــــ مجھے اِس ننھی سی شیشی سے کس قدر اُنسیت معلوم ہوتی ہے ـــــ سفید جیسے موتی ـــــ ایک چُچہ بھر بھی نہیں ـــــ پھر بھی یہ بُوند بھر پانی مجھے موت کے تاریک طبقے میں پہونچا دیگا اور دُنیا کی تمام رنگا رنگ محفلوں سے ہمیشہ کیلئے جُدا کر دیگا ـــــ اس ننھی سی شیشی کو کتنی عظیم الشان خدمات انجام دینی ہیں ـــــ میرے جسم میں خفیف سا ارتعاش ہی جو خوف و ہراس کے سبب سے نہیں بلکہ اعصاب کی کمزوری کے سبب سے اسوقت مجھے پریشان کر رہا ہے۔ موت کے قُرب کی وجہ سے گوشت پوست اعصاب خود بخود ولرزرہے ہیں ـــــ اُف زندگی تیری محبت انکو کتنی عزیز ہے!!۔

. . . .

اب میں بالکل تیار ہوں ـــــ مجھے اور کچھ نہیں کہنا ـــــ اپنے اس اقدام پر میں تاویلیں اور خواہ مخواہ کے عذرات تراشنا نہیں چاہتی ـــــ میں جیسی پیدا ہوئی اور میرے ماحول نے جیسا مجھے بنا دیا ویسی ہی ہوں ـــــ مغرور، سرکش اور باغی ـــــ خود پسند، جذباتی ـــــ اُسے جس کو میں چاہتی ہوں حاصل کرنے میں مجھے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی، چاہے اس میں مجھے اپنے شوہر کے ساتھ بیوفائی کرنی پڑے ـــــ شوہر کے ساتھ وفا میرے نزدیک اجتماع ضدین ہے ـــــ اگر میں بُری ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ آنکھ کھول کر میں نے دُنیا میں دیکھا کہ سب اسی طرح کرتے ہیں۔ صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ میں نے ذرا ضد سے کام لیا اور دوسرے خوشامد اور چاپلوسی سے کام نکالتے ہیں ـــــ میں صاف صاف کہہ سکتی ہوں کہ میرے تمام افعال کی ذمّہ دار وہ سوسائٹی ہے جس میں میں پلی بڑھی اور مُلک کے وہ مایۂ ناز فلسفی ہیں جن کی تصانیف پر میں ایمان لائی۔ میری شادی ہوئی بالکل اسی طرح جیسے میرے طبقہ کی ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے ـــــ یعنی روپیہ سے ـــــ میں نے محبت کی بالکل اُسی طرح جیسے میری قماش کی ہر لڑکی محبت کرتی ہے یعنی جسمانی حُسن سے ـــــ اور آج میں مر رہی ہوں بالکل ایسے ہی جیسے میری فطرت اور میری ذہنیت کی ہر لڑکی مرتی ہے۔ قدرتی موت سے یا میری طرح از خود ـــــ!!

. . . .

میں زہر پینے ہی والی تھی کہ سامنے والے آئینہ میں مجھے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ میری ماں کا چہرہ تھا۔ اُن کے نورانی چہرے پر آنسو بہ رہے تھے ـــــ اُنہوں نے میرا نام لیکر پکارا ـــــ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا ـــــ میرا دل زور سے دھڑک اُٹھا اور سر چکرا گیا۔ کچھ دیر تک میں کرسی کے سہارے کھڑی رہی ـــــ پھر میں نے میز کی دراز میں سے یوڈی کلون کی شیشی نکالی اور اپنا رومال اس خوشبو میں تر کر کے پیشانی اور کنپٹیوں پر رکھا تاکہ طبیعت ذرا بحال ہو جائے ـــــ طبیعت بحال ہو جائے!!۔ اِس فقرے میں کتنی تُرشی ہے ـــــ قبر کے قریب پہونچکر طبیعت کی بحالی کا خیال ـــــ کیا خوب!! اس عطر کی خوشبو کتنی عُمدہ ہے ـــــ مجھے خوب یاد ہے یہ میں نے کہاں سے خریدی تھی۔ ہماری شادی نئی نئی ہوئی تھی ـــــ نئی نویلی دُلہن کے چاؤ میں میرے سرتاج بہادر نے یہ شیشی شملہ میں خرید وائی تھی جبکہ ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے مال پر ٹہل رہے تھے ـــــ اس "سہانی" یاد پر میں ہنس پڑی موتی کی سی چمک والے خوبصورت دانت آئینے میں نظر آئے۔ انہیں اچھی طرح دیکھنے کے لئے میں دوبارہ ہنسی۔ آواز سے۔ میری آواز کتنی شیریں صاف، اور دلکش ہے۔ کاش ان بیش بہا تحائف کی قدر کرنے والا کوئی ہوتا!!!

. . . .

زہر کی خالی شیشی پر میں نظریں گاڑے دیکھتی رہی ــــ میں اسے غٹ غٹ پی گئی جیسے کڑوی دوا پی جاتی ہے ــــ آنکھیں میچکر۔ خفیف سے جبر کے ساتھ ــــ مُنہ کا مزہ بدلنے کے لئے میں نے اناناس کا مُربہّ کھایا۔ یہ مُربہّ قلب کو فرحت پہونچاتا ہے ــــ قلب کو فرحت!! لیکن فرحت کیلئے فرحت کہاں؟؟؟ ــــ میں اپنے چہرے کے عکس کی طرف بغور دیکھ رہی ہوں اور ہر خفیف سی تبدیلی کا اچھی طرح جائزہ لوں گی ــــ کم از کم یہ مشغلہ انتظار کی گھڑیوں کو خوشگوار بنا دیگا ــــ لیکن شاید زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ موت میرے گھر کے دروازے تک پہونچ چکی ہے ــــ سلامتی ہو تجھ پر اے قوتِ عظیم!!۔

ناقابلِ بیان ــ سخت تکلیف ــ بےچینی ــ اختلاج ــ اعضا کا تشنج ــ اندر سے کلیجہ کٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میرا رواں رواں کانپ رہا ہے ــــ اور پسینے سے شرابور ــــ میری آنکھیں کچھ عجیب طرح جُھلس رہی ہیں، اپنا عکس بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی۔ گلے کے پاس والی رگ کچھ عجیب تیزی سے چل رہی ہے ــــ میرے پیارے خوشبو میں بسے ہوئے بال ــ میں نے اُن کے سنوارنے بنانے کا کتنا خیال رکھا، اب مجھے نظر نہیں آتے ــــ مجھے سخت پیاس لگ رہی ہے۔ حلق میں کانٹے پڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے ٹھنڈی صراحی میں سے پانی پیا ــــ مگر اب مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ پانی پیکر صراحی تک پہونچنے میں مجھے کئی سہارے لینے پڑے۔ میرے ہونٹ کچھ کچھ نیلاہٹ مائل ہوتے جاتے ہیں جیسے چوتھی کی دُلہن کے مسّی مالیدہ ہونٹ ــــ میرا سر تیزی سے گردش کر رہا ہے۔ دل کی دھڑکن کا کچھ ٹھکانا نہیں ــ یہ ننھا سا دل جو بیس برس سے برابر دھڑک رہا ہے۔ اب سے آرام ملے گا ــــ میرے ہونٹ اب میرے قابو سے باہر ہیں۔ میں اُنہیں نہ بند کر سکتی ہوں نہ کھول سکتی ہوں ــــ کانوں میں عجیب قسم کی گنگناہٹ ہے ــــ ہاتھ بھی لرز رہے ہیں لیکن میں اپنے آخری سانس تک لکھے جاؤنگی۔

میرے مُنہ سے آواز بھی نہیں نکلتی۔ میں نے پوری طاقت سے اپنا نام پکارا لیکن خود میں ہی اس نام کو نہ سُن سکی ــــ میرے پیچھے میری ماں سفید لباس پہنے کھڑی ہیں ــــ یہ دھوکہ نہیں، واہمہ نہیں۔ میں خود اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہی ہوں۔ یہ دیکھو اُنہوں نے میرا نام لیا "فرحت ــــ فرحت" میں جواب دینا چاہتی ہوں مگر بول نہیں سکتی۔ میں نے انکی طرف ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا ــــ اُنہوں نے آنسو بھر کر کہا "میری فرحت! تیرا یہ انجام؟؟؟"

اے خدا ــــ! مجھے لکھنے دے۔ طاقت عطا کر کہ میں چند سطریں اور لکھ سکوں۔ ہائے میرا دل!! اس ایک سہارے کو پکڑے رہنے دے جو مجھے دُنیا والوں میں شمار کر رہا ہے۔ میری ٹانگیں بالکل ساکت ہیں۔ میں اُنہیں جنبش بھی نہیں دے سکتی۔ رُوح آہستہ آہستہ کھنچ رہی ہے۔ میرے کانوں میں عجیب وغریب آوازیں آرہی ہیں۔ میز پر رکھی ہوئی شیشیاں مجھے چمکتی ہوئی تلواریں معلوم ہورہی ہیں ــــ اب میں کوئی آواز نہیں سُن سکتی نہ بول سکتی ہوں۔ قلم بھی بمشکل پکڑا جا رہا ہے ــــ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن کوئی چیز

تکلیف سے بھی زیادہ تکلیف وہ ہے جو میرے سینے میں چھریاں چلا رہی ہے ـــــ میری ماں اور بھی قریب آگئی ہیں۔ اُنکا ٹھنڈا برف ہاتھ مَیں اپنے ماتھے پر محسوس کر رہی ہوں ـــ میری پیاری ماں !!۔

ت ت ت ت ت ت ت

ہر طرف اندھیرا۔ اب مجھے اپنا چہرہ بالکل نظر نہیں آتا۔ ایک دُھندلا سا عکس معلوم ہوتا ہے اور بس ـــ مجھے سانس لینا بھی دُشوار ہے۔ سخت پیاس۔ میں اُٹھ بھی نہیں سکتی ـــ آہ! کوئی ہوتا جو مجھے دو گھونٹ پانی پلا سکتا۔ خُدا۔ مجھے قوت دے کہ میں اِس ٹکڑ کو چندے اور پکڑے رہوں۔ لیکن نہیں میرا وقت آپہونچا ـــ بہت سی عجیب عجیب شکلیں میرے ارد گرد جمع ہوتی نظر آرہی ہیں۔ ـــ تاریکی۔ آگ۔ گرمی۔ پیاس ـــ اے میرے مُردہ ہاتھ صرف ایک لحظ اور میرا ساتھ دے۔ میں اپنے محبوب، اپنے سلیم کو آخری سلام لکھنا چاہتی ہوں ـــ ٹھیرو۔ یہ لوگ مجھے گھسیٹ رہے ہیں۔ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں ـــ یہ کون ہے جو مجھے دھکیل رہا ہے۔ سب چیزیں ناچ رہی ہیں ـــ آہ! پیاس۔ سلیم ـــ پانی ـــ آگ ـــ"

ت ت ت ت ت ت ت

میں نے خط ختم کیا ـــ اچانک دیوار پر مجھے کسی کا سایہ نظر آیا۔ اور میں دہشت کے مارے بیہوش ہوگیا۔

ـــــــــــــــ انصار ناصری۔

مسٹر انصار ناصری کی تین کتابیں

چندرا موہنی حُسن وعشق کی دردناک داستان۔ چندرا نے محبت کی اور اپنا سب کچھ اس کے پیچھے تج دیا۔ عزیز اقربا۔ دوست احباب مال و دولت۔ خاندانی اعزاز۔ یہ سب کچھ اُس نے اِس لئے چھوڑا کہ ایک محبت بھرا دل اُس کے لئے دھڑک رہا تھا۔ پھر عیش کا زمانہ آیا مگر چندرا کے لئے یہ بہت مختصر تھا۔ اور مصائب۔ نے ہجوم کیا۔ عشق کی ناکامیوں اور نامُرادیوں نے محبت کی کہانی میں خون کا رنگ بھرنا شروع کیا۔ یہانتک کہ ـــــــــ قیمت ایک روپیہ (عہ)

نجمہ نوری نجمہ ایک محبت کرنے والی بیوی اور اپنے بچے پر جان چھڑکنے والی ماں تھی۔ مگر محبت نے اُسکے جذبات کو اندھا کر دیا اور اُس نے اپنے عشرت کدہ کو ایک اوباش کی خاطر چھوڑ دیا۔ مگر اس کا ردّ عمل ہوا اور بہت خوفناک ہوا بچے کی مامتا نے اُس کا سکون خاطر غارت کر دیا۔ اپنا غم بُھلانے کیلئے وہ دُنیا کی آلائشوں میں پھنستی چلی گئی۔ یہانتک کہ اُس نے اپنے عاشق کو مار ڈالا۔ گناہ اور موت کی یہ لرزہ خیز تمثیل آپکے رونگٹے کھڑے کر دیگی۔ قیمت ۱۲؍

سلمیٰ آسکر وائلڈ کے ڈرامے سالومی کا ترجمہ۔ سلمیٰ کا ناچ ایسا ہیجان انگیز تھا کہ اُس نے اپنے سوتیلے باپ حاکم صوبہ کو بیخود کر دیا اور انعام میں یوحنان پیغمبر کا سر مانگا۔ حاکم قول ہار چکا تھا۔ اِس لئے پیغمبر کا سر کاٹ کر سلمیٰ کو دیدیا گیا۔ سلمیٰ نے اِس کٹے ہوئے سر کے مُردہ ہونٹ کو دیوانہ وار چُومنا شروع کیا اور حاکم کے حُکم سے سلمیٰ کو فوراً مار ڈالا گیا۔ ناصری صاحب کے ترجمے میں اصل کی سب خوبیاں منتقل ہوئی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی ۔

افرودائتی کا ایک باب۔

استقبال

باقص کو شاہدِ بازاری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہوئے پچیس[25] سال گزر چکے تھے۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور اِس اثنا میں اُس کے حُسن کی رعنائیاں کئی بار رنگ بدل چکی تھیں۔

اُس کی ماں نے جو عرصہ دراز تک اُس کے مکان کی مُنتظمہ اور تعمیرِ حیات کے ضمن میں بطور مشیر کار رہی تھی، اس کو حسنِ اخلاق اور کفایت شعاری کے وہ زرّیں اُصول سمجھا دیے تھے جن پر عمل پیرا ہو کر اُس نے رفتہ رفتہ کافی سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ لہٰذا اب وہ اپنے ذوقِ تعیش گذاری و نشاط طلبی کی تسکین دولت کے ذریعہ بآسانی کر سکتی تھی جبکہ باقتضائے عمر اُس کا حُسنِ ظاہری دورِ انحطاط کی تمام منزلیں طے کر چکا تھا۔

زرِ کثیر کے عوض نوجوان کنیزوں کو بازار سے خریدنا ایک ایسا اصراف تھا جسے دوسری بازاری عورتیں ضروری سمجھتیں اور اکثر تباہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس باقص نے کامل دس برس تک صرف ایک جشن کو اپنے لئے کافی سمجھا۔ اور آئندہ کے لئے بغیر کسی مزید خرچ کے پورا ایک کنبہ بھی پیدا کر لیا جو اس کے لئے باعثِ منفعت ثابت ہونے کے لائق تھا۔

دس سال کے عرصے میں اس کی کنیز کے بطن سے سات خوبصورت مخلوط النسل لڑکیاں پیدا ہوئیں اور تین لڑکے بھی جن کو فوراً چلتا کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی غلام جوان ہو کر کاروبارِ محبت میں رقیبِ روسیاہ ثابت ہونے لگتے ہیں۔ اس نے ساتوں لڑکیوں کے نام سات سیاروں کے موسوم کئے تھے۔ اور اُن کے پیشے جداگانہ طور پر جہاں تک ممکن ہو سکا انکے ناموں کے معنوی اعتبار سے مُنتخب کئے گئے تھے۔ ہیلیوپ[1] کے ذمے دن کی خدمات تھیں۔ اور سیلینس[2] کے ذمے رات کی۔ آریتی[3] صدر دروازے کی محافظ، افرودیسیہ[4] بسترِ عشرت کی نگہبان۔ ہرمیون[5] خرید و فروخت کی محاسب، کرونومیگرا[7] داروغہ مطبخ۔ اور سب سے آخری دایومیدی[8] ناظرِ خصوصی تھی جو رقوم کے جمع خرچ اور اہم ذمہ داریوں کی انجام دہی پر مامور تھی۔

افرودیسیہ عزیز از جان تھی۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ حسین اور لائقِ محبت تھی۔ اکثر وہ اپنی مالکہ کے ساتھ تماش بینوں کو رجھانے میں شریک کار رہتی تھی۔ اسی لئے وہ ادنیٰ قسم کے سخت کاموں سے مستثنےٰ تھی تاکہ اُس کے نازو نازک و حسین اور ہاتھ ملائم و نرم رہ سکیں۔ اسی استثناء کے ماتحت وہ اپنے بالوں کو بھی غیر مستور رکھ سکتی تھی۔ اسی لئے اکثر لوگ اُسے ایک آزاد عورت تصور کرتے تھے۔ اور اس مخصوص شام کو وہ پینتیس مینا کی کثیر رقم کے عوض بالکل آزاد ہونیوالی تھی۔

باقص کی ساتوں کنیزیں اس درجہ نوخیز اور لائقِ تحسین حد تک شائستہ تھیں کہ وہ ان پر بہت زیادہ فخر و ناز کرتی تھی۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اُن کو ہمراہ لئے بغیر باہر نکلی ہو۔ حالانکہ مکان کو بالکل اکیلا چھوڑ دینا خطرناک تھا۔ اُس کی اسی ناعاقبت اندیشی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ڈیمیٹریوس کو اندر داخل ہونے کا بآسانی موقع مل گیا تھا۔ تاہم وہ اس دعوت کے انعقاد تک جس میں قرالقصص بھی مدعو تھی گردشِ تقدیر کی حقیقت سے لاعلم محض تھی۔

اُس شام قرالقصص سب سے پہلے وارد ہوئی۔

وہ سبز رنگ کی پوشاک میں ملبوس تھی جس کے دامنوں پر

---

[1] سورج دیوتا۔ مصر کے عہدِ قدیم میں نیل کے دہانے پر اس نام کا شہر اور ایک عظیم الشان ہیکل تھا۔ [2] چاند کی دیوی۔ اصل لفظ سیلینی ہے۔ [3] غالباً مریخ سے مطلب ہے جو جنگ کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن لکھنے کے لئے بھی اصل لفظ آریس ہے۔ [4] شہوت پرستی کی دیوی۔ افرودائتی سے متعلق ہے۔
[5] یونانی صنمیات میں تجارت کے دیوتا کو ہرمیس کہتے ہیں۔ اسی سے ہرمیون بنا لیا۔ [7] زحل۔ یونانی صنمیات میں اصل لفظ کرونوس ہے۔ اسی سے بنایا گیا ہے۔ [8] ان ستاروں میں سے جو زحل کے گرد گھومتے ہیں ایک کا نام دایومن ہے۔ اسی سے دایومیدی بنا لیا گیا ہے۔ دراصل یہ ساتوں لفظ مصنف نے زبردستی مشتق کئے ہیں۔

زرکار شاخہائے گل مُکاڑھی گئی تھیں۔ اس طرح کہ انکے پھُول سینے کے قریب پہونچکر شگفتہ ہورہے تھے۔

اس سے قبل کہ وہ دستک دے آرتیِ نے دروازہ کھول دیا۔ اور رسومِ یونان کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو ایک مختصر کمرے میں لے گئی۔ جہاں اُس کے سُرخ جوتے اُتارے اور برہنہ پاؤں نرم ہاتھوں سے دھوڈالے۔ پھر اُس کے لباس پر جہاں جہاں ضروری تھا عطر لگایا۔ کیونکہ مہمانوں کو ہر قسم کی دقت سے بچایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ کھانا کھانے سے قبل تزئینِ جمال بھی میزبان کے فرائض میں شامل تھا۔ پھر اُس نے ایک کنگھی اور پنیں دیں تاکہ بالوں کو آراستہ کر دیا جائے۔ اِن کے علاوہ لبوں اور رخساروں کے لئے خشک رنگ اور غازہ وغیرہ۔

جب قرانصص ہر لحاظ سے تیار ہوگئی تو اُس نے کنیز سے پوچھا۔

"طفیلی کون کون ہیں؟"

یہ رسم تھی کہ سوائے ایک کے جو حقیقتاً مہمان ہوتا تھا باقی سب طفیلی کہلاتے تھے۔ یہ واحد ہستی جس کے اعزاز میں دعوت دی جاتی تھی اپنے ہمراہ جس کو چاہتی لا سکتی تھی۔ اور باقی "طفیلیوں" کو اپنے بیٹھنے کے لئے گدیلے لانے پڑتے تھے۔ ان کے لئے لازمی تھا کہ شائستگی کا خیال بھی رکھیں۔

قرانصص کے سوال پر آرتیِ نے جواب دیا۔

"نقراطہ نے فلودیس اور اُس کی شریکِ حیات نوسطینہ کو جسے وہ اٹلی سے ساتھ لایا تھا مدعو کیا ہے۔ اُس نے فراسیلاس درطائمن کو نیز نیدوس والی تیری سہیلی سیسو کو دعوت دی ہے۔"

"میں اس ... [illegible] ... ہوئی ہوں" قرانصص ...

"ہاں عزیز من۔"

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں اور اس زریں موقع کی خوشی میں جس نے ان دونوں کو دوبارہ یکجا کر دیا تھا، آپے سے باہر ہوگئیں۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے" سیسو نے کہا "اس موئے ارقیطاس کی وجہ سے مجھے دیر ہوگئی۔ ...."

"ہیں! ابھی تک اس سے؟"

"صورتِ حال بدستور ہے۔ جب کبھی میں دعوت میں شریک ہونے کے لئے شہر آؤں وہ خیال کرتا ہے کہ ہر شخص مجھ پر ہاتھ ڈالیگا۔ چُنانچہ بطور پیش بندی اُس کی دل جمعی ضروری ہوتی ہے۔ جس کیلئے وقت درکار ہوتا ہے۔ آہ! جانِ من! کاش وہ میری حقیقت بہتر طریقے پر سمجھ سکے۔ میں اس کو فریب دینا نہیں چاہتی۔ اسکے مزاج میں رشک کا مادّہ بہت کافی ہے۔ جیسا کہ ہونا بھی چاہیے۔"

"اور اس کا بچہ۔ کیا کسی کو معلوم ہوگیا ہے کہ تو واقف ہے؟"

"مجھے اُس کی امید نہیں۔ تیسرا مہینہ ہے۔ بدبخت کہیں کا۔ خیر ابھی اس کا وجود میرے لئے باعثِ تکلیف نہیں ہے۔ جب ایسا ہوگا تو میں جلدی ہی اُس سے چھٹکارا پا لونگی۔"

"میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں" قرانصص نے کہا۔ "اس مُصیبت میں پھنسکر اپنے خدوخال کو نہ بگاڑ لیجو۔ پیدائشِ اطفال صنفِ نازک کی جوانی پامال کر دیتی ہے۔ کل فلیبیٹس سے جو ہماری دیرینہ سہیلی ہے ملاقات ہوئی۔ وہ گذشتہ تین سال سے ایک گندم فروش کے خاندان میں بمقام بہاستس زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیا تو بتا سکتی ہے کہ اُس نے سب سے پہلے کون سی بات کہی؟" "اُف! کاش تو معلوم کر سکتی کہ اُسنے کس کس طرح مجھے خراب کیا ہے"۔ اور اس وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ہر چند میں نے کہا کہ ابھی تیرے حُسن وجمال کی رعنائیاں باقی ہیں۔ لیکن وہ یہی کہتی رہی "کاش تو دیکھ سکتی۔ کاش مجھے یاد ہوتا" وہ باقیلس کی طرح رو رہی تھی۔ پھر میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے اپنا ہم خیال بنانا چاہتی تھی۔ اور اس لئے میں نے کہا کہ دکھا جو کچھ تو دکھانا چاہتی ہے۔ آہ جانِ من! اس کی جلد ایک چمڑے کی مانند۔ اور شاید تو واقف نہیں کہ پہلے وہ کس قدر خوبصورت تھی۔ کوئی شخص اس کی انگلی کے پوروں پر بھی نظر ڈالنے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ صرف زیادہ سُرخ تھیں، عورت کے خدوخال اسکے جواہرات سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔"

ابھی یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ دونوں عورتوں کی تزئین ختم ہوگئی۔ اس کے بعد وہ دونوں اکٹھی ایوانِ طعام میں داخل ہوئیں۔ جہاں باقیس پہلے ہی سے منتظر تھی۔ ان کے کمروں میں پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ اور گردن طلائی ہاروں سے اس قدر لدی ہوئی تھی کہ وہ ٹھوڑی تک پہونچ گئے تھے۔

"آؤ میری پیاری سہیلیو! نقراطہ نے آج شام تم دونوں کو

سے اسجگہ انگریزی لفظ شیڈو ہے جس کے معنی سایہ کے ہیں۔ جس کا لفظی ترجمہ کرنا درست نہیں۔ میرا خیال ہے کہ نفسِ مضمون کے لحاظ سے طفیلی مناسب ہے۔

مدعو کرکے بہت عقلمندی کا اظہار کیا ہے۔"

"ہم اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ اتفاق خود تمہارے عشق کدے سے پیدا ہوا" فرانتصص نے یہ ظاہر کرتے ہوئے گویا وہ اس طنز کو نہیں سمجھی ہے جواب دیا۔ اور پھر فوراً ذرا جلانے کی نیت سے حاشیہ آرائی کی "دورانگلس کا کیا حال ہے؟"

یہ ایک امیر نوجوان عاشق تھا جس نے باقص سے ناتا توڑ کر صقلیہ کی ایک حسینہ سے شادی کرلی تھی۔

باقص نے بے حیائی سے جواب دیا "میں نے خود ہی اُنکو چلتا کر دیا ہے۔"

"تمہیں یہ زیبا نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر عنقریب شادی کرنے والا ہے لیکن مجھے قوی اُمید ہے کہ وہ شادی کی صبح ہی میرے پاس آن موجود ہوگا۔ وہ میری محبت میں دیوانہ ہے۔"

جب فرانتصص نے یہ سوال کیا تھا کہ "دورانگلس کا کیا حال ہے؟" تو اُس کے ذہن میں یہ دوسرا سوال بھی موجود تھا کہ "تیرا آئینہ کہاں ہے؟" لیکن باقص کی آنکھیں نظر ملا کر اُس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے فرانتصص ایک مبہم اور بے معنی وحشت کے سوا کسی دوسرے جذبے کا مطالعہ نہ کرسکی۔ اسی وجہ سے اُس نے انتہائی بے صبری کے باوجود اپنے سوال کو کسی آئندہ مناسب موقع کیلئے اُٹھا رکھا۔

وہ دوبارہ آغازِ گفتگو کرنا چاہتی تھی کہ اچانک فلو دمیس، فوسطینہ اور نقراط کے آجانے سے رُک گئی۔ انہوں نے باقص کو اپنی طرف متوجہ کرکے اس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا۔ وہ دونوں شاعر (فلودمیس) کی زرکار پوشاک اور اُس کی اطالوی شریکِ حیات (فوسطینہ) کے حریری لباس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوگئیں۔ یہ نوجوان خاتون اسکندریہ کے رسم و رواج سے قطعی ناواقف تھی۔ اس لئے یونانی طرز کا لباس مناسب سمجھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس طرح ملبوس ہوکر دعوت میں شریک ہونا غیر موزوں ہے۔ جبکہ وہاں پیشہ ور رقاصائیں اُس جیسے نیم برہنہ لباس میں رونق افروز ہونے والی تھیں۔ تاہم باقص نے اشارتاً بھی یہ ظاہر نہ کیا کہ اس کی غلطی محسوس کرلی گئی ہے۔ بلکہ مناسب الفاظ کے ذریعے شاعرانہ انداز میں فوسطینہ کے گھنے چمکدار سیاہی مائل نیلگوں بالوں کی جو روحِ افزا عطریات میں ڈوبے ہوئے تھے تعریف کرتی رہی۔ اس کے بالوں کا جوڑا ایک طلائی پن کے ذریعے پشتِ گردن پر بندھا ہوا تھا۔ تاکہ عطر کے داغ اُسکے باریک حریری لباس پر نہ لگ سکیں۔

وہ سب میز کے گرد اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کا ارادہ ہی کررہے تھے کہ ساتواں مہمان وارد ہوا۔ جس کا نام طائمن تھا۔ اس نوجوان کی بے قاعدگیاں گویا قدرتی عطیہ تھیں۔ تاہم اپنے زمانے کے علماء کی صحبت میں رہ کر اور اُن کے اقوال سے فیضیاب ہوکر اپنے کردار کو لائقِ تحسین بنالیا تھا۔

"میں اپنے ہمراہ کسی اور کو بھی لایا ہوں" اُس نے ہنسکر کہا۔

"وہ کون ہے؟" باقص نے باز پرس کی۔

"وہ میندیس کی رہنے والی ایک دیمو ہے۔"

"دیمو! تم مذاق تو نہیں کررہے ہو میرے دوست۔ وہ تو ایک ادنیٰ قسم کی لڑکی ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں زیادہ اصرار نہیں کروں گا" نوجوان طائمن نے کہا۔ "ابھی ابھی راستے کے موڑ پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس نے درخواست کی کہ مجھے کچھ کھانا کھلوادو۔ میں اس کو اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ اگر تمہیں پسند نہیں تو ......"

"یہ طائمن تو بہت ہی فضول قسم کا آدمی ہے" باقص نے زور دیکر کہا۔

اُس نے ایک کنیز کو آواز دی۔ "ہیلیوک! جا اپنی بہن سے کہہ کہ دروازے پر ایک عورت کھڑی ہوگی۔ اُسے خوب اچھی طرح مار کر نکالدے۔ جلدی جا۔"

وہ ایک متجسس نظر ڈالتے ہوئے مُڑی۔

فراسیلاس ابھی تک نہیں آیا۔

فضل حق قریشی دہلوی

سونے کی تلوار

کل پھر رہا تھا صحنِ چمن میں کشاں کشاں اپنی ادھیڑ زوجہ کے ہمراہ اک جواں
شوہر کی بے وسیلہ جوانی پہ الاماں بیوی کے الداز بڑھاپے کی سختیاں
بے مال و زر شباب کا تھا شیب پر مدار

تھیں جھریاں جو زوجہ کے چہرے پہ بیش و کم اُن جھریوں کی راہ پہ چاندی کے تھے قدم
شوہر کے عارضوں میں بافراطِ رنج و غم سویا ہوا تھا سازِ جوانی کا زیر و بم
گاتی ہوئی خزاں تھی، سسکتی ہوئی بہار

پانی کی ایک بوند سے مرعوب تھا شرر حیرانِ شکوہ قطرۂ شبنم سے تھا گہر
چھالے کے طمطراق سے لرزاں تھا نیشتر ذرّے پہ آفتاب جھکائے ہوئے تھا سر
کمزوریوں کو زور پہ حاصل تھا اقتدار

ٹھنڈی ہوا سے وجد میں تھی رُوحِ بوستاں سرشار ہو چلی تھی زمیں، پست آسماں
زوجہ کے ساتھ ساتھ تھا شوہر رواں دواں اک موڑ پر مُڑے ہی تھے دونوں کہ ناگہاں
گزری اُدھر سے ہو کے اک آئینہ رُونگار

اس طرح جیسے ناؤ کوئی ڈولتی ہوئی ابرو کے بل سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
تلوار سی ہر ایک پھبک تولتی ہوئی گاتی ہوئی ادائیں، نظر بولتی ہوئی
زُلفوں کے پیچ و خم میں لئے موجِ آبشار

شوہر کی اُٹھ کے جم گئی اُس شوخ پر نگاہ پلکوں نے سسکیاں سی بھریں، دِل نے کہا آہ
چمکی نگاہِ زوجہ میں شمشیرِ اشتباہ پیدا ہوئی وہ آگ کہ اللہ کی پناہ
آفت کی کشمکش تھی، قیامت کا خلفشار

رحمت سے آس جیسے گنہگار توڑ دے کوئی بہک کے ساغرِ سرشار توڑ دے
گھبرا کے جیسے دم کوئی بیمار توڑ دے جس طرح کوئی جنگ میں تلوار توڑ دے
شوہر نے یوں جھکائی نظر ہو کے شرمسار

اتنا ڈرا غریب کہ تپنے لگا جگر بیگانہ وار آنکھ اُٹھائی اِدھر اُدھر
گردن ہلائی بیوی نے غصّے سے دیکھ کر یعنی متاعِ زوجہ نے شوہر کے حلق پر
سونے کی بڑھ کے پھیر دی شمشیرِ آبدار

جوش ملیح آبادی

مسٹر شمس الحسن

مسٹر شمس الحسن گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے۔ ہر سال چھ مہینے دلی اور چھ مہینے شملہ پر رہا کرتے۔ پہاڑ پر جانے کا بھتہ ملتا تھا، سرکاری کوارٹر کا کرایہ بہت کم تھا، اس لئے اوپر نیچے آنے جانے کی زحمت کے علاوہ کوئی اور تکلیف نہ تھی۔ پھر وہ رؤسا اور افسران کے ساتھ ہر سال پہاڑ پر جاتے تھے۔ گھر پر اور دوستوں اور جاننے والوں میں ان کی عزت زیادہ تھی۔ ہر شخص کا بل بوتہ نہیں کہ ہر سال پہاڑ پر جایا کرے۔ پہاڑ کی اور نیچے کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ شملہ پر لوگوں کے لئے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مکانوں کے کرائے حد سے زیادہ تھے، دوسرے زندگی بڑی مہنگی۔ پھر مراد آباد سے شاید ہی کوئی ہر سال پہاڑ پر جایا کرتا ہو، البتہ سر محمد ایوب ہر سال جایا کرتے تھے، اور ان کے بعد مسٹر شمس الحسن۔ چنانچہ لوگوں کی نگاہوں میں مسٹر شمس الحسن، جو اب اپنے آپ کو "ایس حسن" لکھنے لگے تھے، سر ایوب کے بعد دوسرا درجہ رکھتے تھے۔ شاید اگر ان کے پہلے بھی 'سر' لگا ہوتا تو وہی بازی جیت جاتے۔

بہر کیف جو کچھ بھی ہو۔ اب تو مسٹر ایس حسن تھے اور شملہ دلی کی رہائش۔ یار دوستوں میں، جو دفتر ہی کے لوگ تھے مسٹر حسن کافی ہر دلعزیز تھے۔ لیکن بس ملاقات دور ہی کی تھی۔ البتہ کبھی کبھی چار وغیرہ کی دعوت کر دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں کچھ زیادہ خرچ نہ ہوتا تھا۔ بیوی سلیقہ والی تھیں سب کچھ گھر ہی میں تیار ہو جاتا۔ تاہم مسٹر حسن بازار سے بھی کچھ منگوا لیا کرتے، اس لئے نہیں کہ وہ اچھا ہوتا تھا، بلکہ اس لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ صرف گھر کی بنی ہوئی چیزوں پر ٹال دیتا ہے۔

ان کی شادی ہوئے چھ برس ہو چکے تھے، اور اب ایک لڑکی اور ایک لڑکا موجود تھا، بچے ہوتے تو اس سے بھی زیادہ لیکن اتفاق سے شملہ پر لوئر بازار میں ایک کباڑیئے کی دکان سے انھیں "میری سٹوپس" کی ایک آدھ کتاب سستے داموں مل گئی۔ ان کتابوں کا ان پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے علاوہ وہ برابر اس بات پر بھی غور کیا کرتے تھے کہ آخر انگریزوں کے اتنے کم بچے کیوں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی بیویاں تندرست و توانا اور خوش و خرم رہتی ہیں۔ ان کے جسم کیسے سڈول اور سڈول ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے بھی طے کر لیا کہ "میری سٹوپس" کی تمام ہدایتوں پر عمل کر کے اپنی بیوی کو بھی تندرست اور خوبصورت بنائے رکھیں گے۔ یہ بچے بھی بس غلطی سے ہو گئے۔ بہرحال اب ان بچوں کی وجہ سے مسٹر حسن کی فکر میں تو اضافہ ہو گیا لیکن ان کی بیوی کی حیثیت بڑی حد تک اُن کے بچوں کی آیا کی ہو گئی۔ ہر وقت ان کی وجہ سے بیچاری کچھ نہ کچھ سنا کرتیں مسٹر حسن کے سپرنٹنڈنٹ نے اپنے بچوں کے لئے ایک گھوڑا رکھ چھوڑا تھا۔ وہ خود اتنا تو خرچ نہ کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایک گدھا پال لیا۔ جس پر ان کے بچے ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔

مسٹر حسن کو قدرت نے فطرتاً بے نیازی اور اطمینان دے رکھا تھا۔ اُن کو اپنے سوائے کسی اور چیز سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ گھر میں بچے بیمار پڑتے تو ان کو پرواہ نہ ہوتی۔ حالانکہ بڑا بچہ ان کا بڑا لاڈلا تھا۔ بیوی بیچاری بخار میں جلا کرتیں تب بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ البتہ ان کی تکلیف اور بے چینی اور بڑھ جاتی۔ اس لئے جب سے شام کو گھر میں گھستے اور دوسرے دن جب تک دفتر نہ چلے جاتے ہر وقت چڑچڑایا ہی کرتے۔

"نہ کھانے کا ٹھیک ہے، نہ بیٹھنے کا۔ سارے گھر میں بچوں کے پوتڑے پڑے رہتے ہیں۔ یہاں ایک نے پیشاب کر دیا، وہاں دوسرے نے گندہ کر ڈالا۔ ڈرائنگ روم میں منوں خاک جمع ہو گئی۔ کوئی آجائے تو کیا کہے گا۔"

غرض یہ خراب ہے، وہ خراب ہے۔ بہرحال انھیں اپنی تکلیفوں کا تو پورا احساس ہوتا تھا، لیکن بیوی بیچاری کی مدد کرنی درکنار الٹے کر پوچھتے بھی نہ تھے۔ وہ غریب بخار میں جلتی رہتیں لیکن وہ ہل کر کبھی پانی بھی نہ دیتے۔ ایسی حالت میں بھی بیچاری میاں کی ہر آسائش کا برابر خیال رکھتیں۔ اور صبح سے شام تک بچوں، ناشتہ، کھانے وغیرہ میں لگی رہتیں مشکل سے کوئی گھڑی فرصت کی ملتی جو اپنی پڑوسنوں سے جا کر ملتیں۔ اس پر بھی تکا فضیحتی ہوتی رہتی۔ میاں کسی بات سے بھی خوش نہ ہوتے تھے۔ ان کو کام صرف اتنا تھا کہ صبح کو بڑے دن چڑھے اُٹھتے اور دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے دانتوں، آنکھوں، بال، غرض ہر چیز کا بغور معائنہ کرتے۔ گھنٹہ بھر تو صرف کپڑے پہننے میں لگا دیتے پھر چھڑی ہاتھ میں لیکر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سیٹی بجاتے، دفتر روانہ ہو جاتے۔

دفتر میں کسی کو "ہلو" کسی کو "گڈ مارننگ" کرتے ہوئے گھستے۔ پھر ٹائپ کرنے والی لڑکیوں کی طرف سے گذرتے۔ اگر کسی نے نظر اٹھا کے دیکھ لیا تو باچھیں کھل گئیں۔ دور ہی سے ہلو، گڈ مارننگ کرتے۔ اور خوش خوش اپنی میز پر بیٹھتے۔ اگر سویرا ہوا تو کسی اور کی میز پر بیٹھ جاتے۔ اور پھر وہی دفتر کی باتیں چھڑ جاتیں۔ یعنی کام کی کثرت کی شکایت یا کسی کی برائی

"ذرا سنگھ کو دیکھو۔ کس قدر بنتا ہے۔ جس دن سے فرسٹ ڈویژن ملا ہے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ کام تو آتا نہیں، لیکن اپنے آپ کو فرعون سمجھتا ہے۔ کل ہی میرے پاس فائل لے کے دوڑا ہوا آیا مسٹر حسن ذرا یہ تو بتانا کہ کیا نوٹ لکھوں۔ اور اگر میرا کوئی کام ہو تو ٹکا سا جواب دیدیتا ہے۔ میاں قسمت کی کھاتا ہے ہیں تو اس جیسے دس کا کام ایک دن میں نکال کر پھینک دوں۔ مگر یہاں خوشامد کسے کرنی آتی ہے۔ اور وہ صبح سے شام تک ڈارون کے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ اگر ڈارون (سپرنٹنڈنٹ) کو ڈالیاں نہ چڑھاتا تو مر کر بھی فرسٹ ڈویژن نہ ملتا۔ مگر بھئی ہم سے تو اس طرح خوشامد ہو نہیں سکتی۔ دفتر کے بعد اٹھ کے بھی صاحب کے پاس سلام کرنے پہنچ جاتا ہے۔ اور بازار سے سودا تک لا دینے میں عار نہیں۔ انھیں دھوتی بندوں نے تو ہم سب کا ستیاناس مار رکھا ہے۔ یہ بے ایمان اینگلو انڈین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کے جوتے ہی صاف کیا کریں۔ اور سب انہی خوشامدیوں کی بدولت اور اوپر سے بڑے پیٹریٹ بنتے ہیں۔ یہاں تو دن بھر جی حضور کرتے رہتے ہیں، باہر نکلتے ہی گالیاں سناتے ہیں، اور ملک کی آزادی کے گیت گاتے ہیں جیسے گویا ملک کو آزاد ہی کرلیں گے لیکن انگریز بھی دبتے ہیں تو ان ہی لوگوں سے، اور یہ تو دیکھو کہ ایک دوسرے کو کیسا گھسا لیتے ہیں۔ بس ایک کے پیر جمنے کی دیر ہے پھر تو چاروں طرف ہندو ہی ہندو دکھائی دیتے ہیں رائے صاحب جمنا داس نے دیکھو سپرنٹنڈنٹ ہوتے ہی اپنی برانچ میں چھ ہندو بھر لئے۔ ہم لوگ تو بلی کا گو ہیں، منصور صاحب ڈپٹی سکریٹری ہوگئے لیکن ایک آدھ مسلمان کو رکھوا لینا کیسا ہم لوگوں کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیسے وعدے کر رہے تھے لیکن جب کام پڑا تو کہنے لگے کہ سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ میں مجبور ہوں۔ میرا حق کاٹ کے اس نے سنگھ کو فرسٹ ڈویژن دیدیا۔ اور اس سے کام تک نہیں سنبھلتا"

غرض اسی طرح کی باتوں میں وقت کٹتا۔ دوپہر کو ٹفن کے وقت جب چھٹی ہوتی تو ٹفن روم سے چائے، توس، سینڈوچیز وغیرہ منگا کر کھا لیتے۔ بیوی برابر کہتی تھیں کہ ناشتہ ساتھ لے جایا کیجئے اور لوگ بھی تو لے جایا کرتے ہیں۔ لیکن یہ تکلیف کون گوارا کرتا۔ شروع شروع میں ٹکیاں اور شامی کباب لے لے گئے۔ پھر کچھ روز تھرماس میں چائے کچھ توس اور انڈا وغیرہ لے جانے لگے۔ لیکن یہ تجربہ بھی کچھ کامیاب نہیں ہوا۔ دفتر میں جتنے انگریز اور اینگلو انڈین تھے ان کے گھروں سے نوکر ٹفن لے آتے تھے۔ کچھ اینگلو انڈینوں کے نوکر اپنے ساتھ ان کے کتے بھی لے آتے تھے۔ کچھ لوگوں نے دفتر ہی میں انتظام کر لیا تھا۔ مسٹر حسن نے بھی دفتر ہی میں انتظام کر لیا۔ مگر پوری چیزیں لینے میں کافی خرچ بیٹھتا تھا، اس لئے چار اور توس پر ہی اکتفا کی۔ کھا پی کر میز پر پاؤں کا کے کرسی میں بیٹھ جاتے۔ اور چھت کی طرف دھواں اڑا اڑا کے بڑی آسودگی سے سگریٹ پیتے، یا کچھ اور لوگوں سے وہی دفتر کی ہانکتے۔

شام کو مال روڈ کا چکر لگا کے، عورتوں کو گھورتے اور ٹہلتے ٹہلاتے اپنا بھاری جسم لئے، ہانپتے ہوئے بہت دیر میں گھر آتے۔ یہاں پر چڑھائی اتار کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی۔ چائے پی، اور اگر جی چاہا تو کچھ دیر بیوی سے بات چیت کی یا بچوں سے کھیلے، نہیں تو ڈرائنگ روم میں کوئی پرانا میگزین یا انگریزی کا کوئی معمولی ناول جو کسی کباڑیئے کے یہاں سے خرید لاتے تھے لے کے بیٹھ جاتے۔

وہ بیوی سے اکثر کہا کرتے تھے:۔

"ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں بیٹھتیں؟ انگریزوں کی عورتوں کو دیکھو کتنے آرام اور عیش سے رہتی ہیں شام کو، کھانے کے بعد، ہمیشہ ڈرائنگ روم میں سب بیٹھتے ہیں۔ کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن تم تو سنتی ہی نہیں"

بیوی بیچاری ذرا پرانے خیال کی تھیں، ان سے کرسیوں پر چڑھ کے نہ بیٹھا جاتا تھا۔ ایک آدھ بار انھوں نے کوشش کی لیکن ان کی ٹانگیں ہمیشہ اٹھ کر کرسی پہ آ جاتیں اور وہ آلتی پالتی مار لیتیں

لیکن مسٹر حسن کو یہ بُرا معلوم ہوتا تھا۔

"کوئی دیکھے گا تو مذاق اُڑائے گا۔ انھیں کرسی پر بھی
بیٹھنا نہیں آتا"

بیوی بیچاری عادت سے مجبور تھیں۔ دوسرے جب کبھی وہ اس کمرے میں بیٹھتیں تو خواہ مخواہ مسٹر حسن کو اس بات کا خیال آتا اور وہ اپنی بیوی سے کہتے :۔

"دیکھو تو انگریزوں کی بیویاں کیسے اپنا سب کام
خود کرتی ہیں۔ کپڑے دھونا بازار سے سودا لانا، آخر
تم بھی کیوں نہیں کرتیں۔ اس سے صرف کفایت
ہی نہیں ہوتی بلکہ سامان بھی اچھا آجاتا ہے اور صحت
بھی اچھی بنی رہتی ہے۔ مسٹر نرائن کی میم کو دیکھو آخر
وہ بھی تو انگریز ہے، لیکن میاں کے لئے سگریٹ
تک خود ہی بازار سے لاتی ہے"

آخر کو بیوی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ آئے دن ذرا ذرا سی بات پر میموں کے حوالے دیئے جاتے اور نکا فضیحتی ہوتی۔ کبھی صفائی پر، کبھی بچوں پر، کبھی بیوی کی "ہندوستانی" عادت پر۔

آخر کار بیچاری کو دق ہو گئی۔ کچھ روز تو وہ اپنے بخار کو چھپائے رہیں۔ جوشاندہ وغیرہ پی لیتیں۔ لیکن مرض میں روز بروز زیادتی ہی ہوتی گئی۔ مسٹر حسن روز کہتے :۔

"یہ کیا ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ کام وام کچھ نہیں کرتیں۔ بچے الگ رُلتے پھرتے ہیں۔ نہ مجھے وقت پر ناشتہ ملے نہ کھانا۔ مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ دن بھر دفتر کی بیٹیوں اور گھر پر یہ اور مصیبت"

جب تک بنا بیچاری کرتی گئیں۔ ہندوستانی بیوی کی بھی کیا زندگی ہے!۔ اپنے آپ کو میاں کا غلام سمجھتی ہے۔ مصیبتیں اٹھائے بُرا بھلا سنے، بچے جنے، ان کو پالے۔ میاں کا خیال رکھے، کام کاج کرے اور بجائے آواز احتجاج بلند کرنے کے منہ سے اُف تک نہ نکالے۔

غرض بیگم حسن کا حال ابتر ہی ہوتا گیا، اب تو مسٹر حسن کو بھی خیال آیا اور ایک روز ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دیا۔ اور پھر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ اور ڈاکٹر سے حال کہنے کے لئے بھی کوئی نہ ہوتا۔ غرض دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب ان کا یہ حال ہو گیا کہ چارپائی پر پڑی رہتیں۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے اور رنگ سیاہ ہو گیا۔ بخار سے جسم تپتا رہتا اور کھانسی کے مارے بُرا حال۔ اکثر تو انھیں ایسی کھانسی اٹھتی کہ معلوم ہوتا اب آنکھیں باہر نکل پڑیں گی ..... لیکن مسٹر حسن دفتر سے آتے تو چڑچڑ ہی کرتے رہتے۔

"ایک تو ویسے ہی کونسا آرام ملتا تھا اور اب یہ
مصیبت اور آن پڑی ہے۔ کسی بات کا بھی ٹھیک
نہیں"

بیوی بیچاری تو مُردہ ہو ہی رہی تھیں، یہ سنکر اور بھی سہم جاتیں۔ جو کچھ ہو سکتا پلنگ پر پڑے ہی پڑے کرتیں، میاں کے ناشتہ کے لئے ٹکیاں تلنا، انڈا پکانا یا حلوا بنانا۔ مگر اپنے لئے کچھ نہیں۔ بچے بیچارے دن بھر مارے مارے پھرتے۔ گھر میں ایک مرد اور ایک لڑکا نوکر تھا۔ جب بیوی کا یہ حال ہوا تو نوکروں نے بھی لاپرواہی شروع کر دی بچوں کے کپڑے بدلے ہوئے دنوں گذر جاتے۔ شام کو مسٹر حسن اس پر بھی بکتے۔

"بچوں کا تو ذرا حال دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے اُن کی
ماں مر گئی اور وہ یتیم ہو گئے ہیں کس قدر میلے کپڑے
پہنے ہیں۔ نوکروں کے بچے بھی اتنے گندے نہ رہتے
ہوں گے"

بیوی کا یہ حال تھا کہ پانی پینے کے لئے اٹھنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ میاں کو یہ توفیق کہاں کہ نام ہی کے لئے ذرا گھر کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ ان کو اپنے آپ ہی سے فرصت نہ ملتی تھی۔

آخر کار بیوی نے اپنی علالت کا حال اپنے گھر لکھ دیا۔ اُن کی ماں تو بچپن ہی میں مر چکی تھیں۔ والد نے سُنا تو بہت پریشان ہوئے۔ اور خود آ گئے، اُن کی خالہ بھی جنھوں نے ان کو پالا تھا سن کر بولائی ہوئی آئیں۔ دونوں والد اور خالہ، اُن کی حالت دیکھ کر ...... رونے پیٹنے لگے لیکن مسٹر حسن بگڑ کر بولے :۔

"اجی صاحب! آپ لوگ ناحق اس قدر پریشان
ہو رہے ہیں۔ گھبراہٹ کی کیا بات ہے معمولی
بخار ہے۔ ڈاکٹر کو دکھا ہی چکا ہوں۔ کچھ روز میں
ٹھیک ہو جائیں گی۔ نہ معلوم انھوں نے آپ کو
لکھ ہی کیوں دیا"

اب چونکہ گھر میں اور آدمی آ گئے تھے مسٹر حسن اور بھی بےفکر ہو گئے۔ شام کو مال روڈ کے بجائے ایک چکر کے دو چکر لگاتے۔ رات گئے گھر آتے، اور بغیر بیوی کے کمرے میں جھانکے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ اگر بہت ہوا تو اتوار کے دن جیسے مکان

کی صفائی کی جاتی ہے مسٹر حسن کوئی دس یا پندرہ منٹ کے لئے بیوی کے پاس جا بیٹھتے، لیکن تمام وقت اس طرح کا لیکچر دیتے کہ بیوی کے آنسو بہنے لگتے۔ وہ کہتے:۔

"کام کاج میں دل لگاؤ۔ اُٹھ کے کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔ ذرا ٹہلو طبیعت ٹھیک کیسے ہو۔ پڑے پڑے کھانا بھی ہضم نہیں ہو سکتا۔"

اور بیوی کا یہ حال تھا کہ پلنگ پر بھی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ سکتی تھیں۔

جب کبھی خسر سے بات چیت ہوتی کام کی شکایت کرتے۔

"آج ان کا کیا حال رہا؟ مجھے تو آجکل کام کی وجہ سے سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ہوتی۔ اتنے کیسز (Cases) آ گئے ہیں کہ ڈھیر اکٹھا ہو گیا ہے اس قدر کام ہے کہ اب جا کر فرصت ملی ہے۔"

پھر کھانا کھانے کے بعد اگر بہت خیال آیا تو بیوی کے پاس ایک آدھ منٹ کو کھڑے کھڑے ہو آتے اور اس کے بعد بستر میں لیٹ جاتے، اور کتاب پڑھتے پڑھتے سو جاتے۔

ایک روز رات کو انھیں بیوی کی کچھ ایسی محبت آئی کہ تھوڑی دیر کے لئے ان کی چارپائی کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اُن کے خسر اسی وقت کہیں چلے گئے تھے۔ بیوی کی خالہ دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ مسٹر حسن کی بیوی چارپائی سے لگی مُردے کی طرح پڑی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں اور سانس کے چلنے کی آواز خرخر آ رہی تھی، جیسے پہاڑ کی چوٹی پر درختوں میں ہوا کا غنا ٹا۔ مسٹر حسن نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ سامنے میز پر بوتلوں، ڈبوں اور گدڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فرش پر پونڑے اور کپڑے چھیتڑے پڑے تھے۔ مسٹر حسن کی نگاہ ان چیزوں پر پڑی اور ان کی تیوری پر بل آ گئے۔ وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بیوی کے کمزور جسم کو جنبش ہوئی، اور مڑ کر کانپتی ہوئی نحیف آواز میں وہ کہنے لگی:۔

"میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اور شادی کر لیجئے۔ میں بچوں گی نہیں میری وجہ سے آپ تکلیف نہ اٹھائیے۔"

اُن کی آواز بھرا گئی، اور ایک گرم آنسو اُن کے کلّہ پر بہتا ہوا تکیہ پر گرا۔ مسٹر حسن نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سامنے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ رات کی تاریکی میں سیاہ اور تدھم، آسمان تک چلا گیا تھا۔ پہاڑ کے دامن پر یکایک ایک الاؤ کی آگ بھڑکی، لیکن فوراً ہی دب گئی۔ اور اندھیرے کے علاوہ کچھ نہ دکھائی۔۔ دیتا تھا۔

بیوی کے ان مایوس کُن الفاظ نے مسٹر حسن پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ اپنا غصہ بھول گئے۔ اور بیوی کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر بولے:۔

"نہیں اس طرح کی باتیں مت کرو۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ اتنی ہراساں کیوں ہوتی ہو؟ کل میں ڈاکٹر مینکیبن کو بلا کر تمھیں دکھا دوں گا۔ بڑا ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔"

ایسا معلوم ہوا جیسے ان جملوں نے ان کے اندر نئی جان ڈال دی۔ ان کے چہرے پر اس خوشی کے آثار نمایاں ہونے لگے جو ایک غلام کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس کا آقا اس سے کبھی اچھی طرح بات کرے، یا کتے کی وہ وجدانہ کیفیت جو اپنے مالک کے پیار کرنے اور چمکارنے سے اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت بیگم حسن کا جی ہی چاہتا تھا کہ بچڑ کر اپنے میاں کے قدم چوم لیں۔ اور وہ بستر ہی پر پڑے پڑے اپنے اچھے ہونے اور میاں کی خدمت کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔

صبح اٹھ کر مسٹر حسن نے ڈاکٹر مینکیبن کو ٹیلیفون کیا۔ اُسے دس بجے سے پیشتر فرصت نہ تھی، اس لئے اس نے دس اور گیارہ کے درمیان آنے کا وعدہ کیا۔ مسٹر حسن کو تو دفتر جانا تھا اس لئے اپنے خسر سے کہہ کر چلے گئے۔۔۔۔۔

شام کو وقت سے ذرا جلد واپس آ گئے اور خلاف معمول اپنی بیوی کے کمرے میں چلے گئے اور خسر سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیا کہتا تھا۔ انھوں نے کہا:۔

"وہ دیکھ گیا ہے، دوا بھی تجویز کر دی ہے لیکن وہ کہتا تھا کہ میں ان کے شوہر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس پر مسٹر حسن بولے:۔ "کیوں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ وہ کچھ انجکشن وغیرہ دینے کو کہتا تھا۔"

"تو مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتا ہے؟"

"میاں تم آخر کو شوہر ہو۔ اس خیال سے کہتا ہوگا کہ تم ذمہ دار ہو۔"

"میں کیا کرلوں گا؟ دوا کے لئے کہتا ہوگا کہ بازار سے لا دو۔ اور کیا۔ لیکن مرض کیا بتاتا تھا؟"

"یہ تو مجھ سے کہا نہیں۔ غالباً۔ وہ کہتا تھا انشاء اللہ آرام ہو جائے گا۔"

"تو آخر مرض کیا تجویز کیا؟"

پہلے تو خسرے خاموش رہے پھر کچھ دیر بعد بولے:-

"شاید تم سے اسی کے بارے میں بات چیت کرے گا۔"

"تو صاحب میں کیا کرلوں گا۔ کیا آپ سے نہیں کہہ سکتا تھا؟"

"میاں تم آخر شوہر ہو۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کرلوں گا۔ آپ آخر چھپا کیوں رہے ہیں؟ کہہ کیوں نہیں دیتے کہ دق بتاتا تھا۔۔"

خسرے ویسے ہی متفکر اور پریشان تھے۔ یہ سن کر غصے سے لال ہوگئے۔ مریض کے منہ پر اس صفائی سے کہہ دینا تم کو دق ہوگئی ہے لیکن وہ پُرانے خیال کے آدمی تھے اور داماد سے کچھ نہ بولے۔

مرض جڑ پکڑ چکا تھا، اور ڈاکٹر مینکین کے علاج سے بھی بیوی کو کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ چنانچہ انکی خالہ اور والد نے یہ صلاح دی کہ ان کو دلی لے جاکر حکیموں کو دکھائیں۔ پہلے تو مسٹر حسن نے کہا کہ "دق کے مریض کو گرمی میں لے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اور حکیموں کے علاج میں دھرا کیا ہے، صرف بھر بھر کے قدحے پلاتے ہیں۔ نہ مرض پہچانیں، نہ ٹھیک علاج کریں۔"

لیکن ان لوگوں کے اصرار سے راضی ہوگئے۔

اتوار کا دن ان لوگوں کے دلی جانے کے لئے مقرر ہوا۔ ہفتہ کی رات کو چونکہ خسرے اور خلیہ ساس اسباب وغیرہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے، مسٹر حسن اپنی بیوی کے پاس جا بیٹھے۔ وہ چارپائی کے پاس خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور پچھلی آسائشوں کا خیال کرکے ایک حد تک مغموم تھے۔

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے کبھی کبھی کڑک کی آواز ہوتی تھی۔ بادلوں میں تیزی سے بجلی چمکتی اور پھر پہلے کی نسبت زیادہ اندھیرا ہوجاتا۔ بجلی کی چمک میں بیوی کا زرد چہرہ سفید اور مرجھایا ہوا چمک اٹھتا، اور آنکھوں کے گڑھے اور چہرے کی ہڈیاں نمایاں ہوجاتیں۔ باہر درختوں میں ہوا کا چلنا ایک آہ کی طرح مایوس کن معلوم ہوتا تھا۔

مسٹر حسن کی بیوی نے ان کی طرف کئی دفعہ غم اور یاس سے دیکھا اور وہ بھی بیوی کو تسلی دینے لگے۔ لیکن بیوی نے میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ان کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔ وہ ناامیدی سے اپنے میاں کا ہاتھ بھینچے رہیں، جیسے اب ان کو بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اور جیسے دنیا میں سہارے کے لئے ان کے پاس اپنے میاں کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس معصومانہ حرکت میں وہ درد اور گداز تھا، زندگی میں وہ مایوسانہ التجا جو انسان موت سے کرتا ہے۔ وہ حسرت بھری خواہش جو کوئی مرتے وقت اپنے محبوب سے کرتا ہے کہ مجھے اس آخری وقت میں نہ چھوڑنا، اس میں موت کی ہولناکی تھی، وہ ڈر جو موت کے سامنے انسان پر غالب آجاتا ہے، وہ درد انگیز حسرت جو دنیا کی چیزیں چھوڑتے وقت، اپنے حبیبوں سے جدا ہوتے ہوئے انسان کو اس بات کا احساس دلا دیتی ہے کہ ہم رخصت ہو رہے ہیں اور پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ یہ زندہ رہنے۔ ہنسنے بولنے، محبت کرنے اور محبت کئے جانے کی موہوم خواہش تھی۔ اس وقت جب انسان ناامید ہوچکتا ہے کہ اب اُسے موت سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس ذرا سی درد بھری حرکت میں وہ دریائے محبت موجزن تھا جس نے مسٹر حسن کو بھی افسردہ کردیا۔ ان کا ہاتھ کانپنے لگا، اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔۔۔۔۔ ایک بھٹکا ہوا جگنو کمرے میں آگیا لیکن ایک لمحہ چمکنے کے بعد پھر تاریکی میں غائب ہوگیا، زور سے بجلی چمکی، اور پہاڑوں میں ہوا کا سناٹا بڑھ گیا۔

مسٹر حسن کالکا تک اپنی بیوی کو پہونچانے گئے۔ اور دلی کی گاڑی میں سوار کرانے کے بعد شملہ واپس آگئے۔ گھر ان کو اکیلا اکیلا اور سونا معلوم ہوا۔ لیکن ایک آدھ روز میں وہ اس کے عادی ہوگئے۔

دلی سے روزانہ بیوی کی خیریت کے خط آتے رہے لیکن حکیموں کے علاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مولویوں کو دکھایا۔ ٹونے ٹوٹکے کئے گئے۔ گنڈے تعویذ کئے گئے لیکن کسی چیز سے افاقہ نہ ہوا۔

روز بروز حالت خراب ہی ہوتی گئی۔ آخر کار ایک روز مسٹر حسن کے پاس تار آگیا کہ انکی بیوی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئیں۔ اور آپ آزاد ہیں۔

کچھ روز تو مسٹر حسن افسوس میں رہے۔ گھر کی بربادی اور آرام کے ختم ہونے کا خیال دس پندرہ روز تک ان پر نمایاں اثر کئے رہا۔ اور بچوں کے خیال نے ان کی پریشانی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ لیکن چند ہی روز کے بعد وہ نئی زندگی کے خواب دیکھنے لگے۔

اور اب وہ دوسری شادی کرنے کی فکر میں ہیں۔ کئی ایک پیغام آچکے ہیں لیکن انھوں نے طے کر لیا ہے کہ بغیر لڑکی کو دیکھے اور بغیر اس سے ملے ہوئے شادی نہ کریں گے ...

احمد علی

صبوحی

نور کے دامن میں جمنا کا وہ سُندر استھان
چوٹی کی ملکوتی گت جل پریوں کا اشنان
وہ کافر نظاری
یہ نغمے خاموش
شردھا میں مدہوش
چھین رہے ہیں ہوش
یہ کافر نظاری

تو یہ اشنان کی ماتی کیا چھل بل دکھلائیں
لہریں جب لہرا کر آویں ساپین سے بل کھائیں
دھرتی کو یہ تاری
عُریاں اور مستور
شردھا مد سے چور
دستِ طلب سے دُور
یہ کافر نظارے

اُف کافر نوڑوں کے توڑے چھیڑوں کی یہ آواز
ہردے کی دھڑکن پہ ناچے پریم کا کومل راز
گیت وہ پیاری پیاری
کانوں میں بس گھولیں
بول انوکھے بولیں
پٹ ہردے کے کھولیں
یہ کافر نظارے

بھجنوں کے وہ بول رسیلے شردھا کے وہ راگ
اُٹھ من پاپی پاپ کو دھوئے جاگ خدارا جاگ
لوبھ موہ کو مارے
نغموں کے شیدائی
دیوانے، سودائی
اُٹھ، دے رام دُہائی
یہ کافر نظارے

مندر چُپ، نغمات ہیں ساکن، اور دیوی خاموش
ساری کے دُربار کنارے چھین رہے ہیں ہوش
پانی کو انگارے
نیر میں آگ لگائیں
دُوری سے تڑپائیں
اب نہ دیکھے جائیں
یہ کافر نظارے

⁂

سروپ رانی نگار

پریم کہانی

۱

میری شادی کو تقریباً دو برس گذر رہے ہونگے کہ یک لخت ایک ناخوش گوار حادثہ نے میری ہر مسرت زندگی کو دشوار بنا دیا۔ میرے شوہر کمار کے دماغ میں کچھ ایسا خلل رونما ہو گیا جو دیوانگی کے مترادف تھا۔ مجھے خود اس امر کا احساس ایک ماہ بعد ہوا جبکہ وہ ایک نیکدل و فیاض انسان کی بجائے ظالم۔ کنجوس اور وحشی بن چکا تھا۔ دراصل کمار میں یہ تبدیلی موٹر کے حادثہ کا نتیجہ تھی۔ اس کی موٹر یک لخت ایک درخت سے ٹکرائی تھی اور اس کے سر میں بظاہر ایک خفیف سی چوٹ آئی تھی۔ مگر وہ قریباً ایک گھنٹہ بیہوش رہا تھا۔ ابتدا میں تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ شدت ضرب کا اثر ہے جو خودبخود رفع ہو جائیگا۔ چار پانچ ماہ گذرنے کے بعد جب کمار کا دماغی توازن بگڑتا گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ فی الحقیقت اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ اس کی حرکات بسا اوقات نہایت وحشیانہ ہوتیں اور نہایت معمولی سی بات پر بھی وہ غضب آلودہ ہو کر مجھے کوسنے لگتا۔

میری طبیعت مضمحل اور میرا دل مضطرب رہنے لگا۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ اپنی نسبت کسی ڈاکٹر سے مشورہ لے۔ مگر وہ مجھے الٹا ڈانٹتے ہوئے مارنے پر آمادہ ہو جاتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی صحت بالکل درست ہے۔ مارے خوف کے میں خاموش ہو جاتی اور اس سے یہ کہنے کی جرأت نہ کرتی کہ اس کے دماغ میں خلل آ چکا ہے۔ حادثہ سے پیشتر کمار مجھ پر بہت مہربان تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جان سے عزیز رکھتے تھے اور ہمارے دن نہایت سکون و راحت سے گذر رہے تھے۔ بہترین لباس زیب تن کرنا۔ سینما جانا۔ دوستوں اور عزیزوں کو دعوتیں دینا۔ ہر روز شام کو موٹر میں سیر و تفریح کے لئے نکلنا غرضیکہ تمام دنیاوی آسائشیں ہمیں میسر تھیں۔ کمار ایک انگریزی فرم میں مشنری بنانے پر انچارج تھا اور اس کی تنخواہ نہایت معقول تھی۔ اس کا دستور تھا کہ ہر ماہ تنخواہ لا کر میرے حوالے کر دیتا۔ اور میں حسب ضرورت اسے صرف کرتی۔ گویا ہم خوب ٹھاٹھ سے امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر اب کمار میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ وہ بہت بخیل بن گیا تھا۔ وہ مجھے ایک حقیر سی رقم گھر کے ضروری اخراجات کے لئے دیدیتا۔ اور بقیہ تمام روپیہ اپنے پاس رکھتا۔ بجلی کی روشنی و آگ کی بجائے اب وہ پھر مجھے تیل کا لیمپ جلانے اور آئیل اسٹو سے کھانا پکانے پر مجبور کرتا۔ حادثہ کے فوراً بعد اس نے موٹر فروخت کر دی اور ریڈیو سٹ بھی اس بہانہ سے فروخت کر ڈالا کہ وہ اس کی آواز سے بیزار ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہمارے کپڑے بوسیدہ رہتے۔ اور اگر میں اسے نیا لباس خریدنے کو کہتی تو غصہ سے آگ بگولا ہو کر مجھے کوسنے لگتا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہت فضول خرچ ہوں۔ حالانکہ میرا مطالبہ محض ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہوتا۔ چند مرتبہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کمار سے علیحدگی اختیار کر لوں۔ مگر پھر مجھے اس کی حالت پر رحم آ جاتا۔ گذشتہ دو سال اس نے مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ لہٰذا میں اس کی سابقہ عنایات یاد کر کے اس ارادہ سے باز رہتی۔ میں نے سوچا کہ کچھ عرصہ بعد وہ خودبخود صحیح الدماغ ہو جائیگا۔

اب کمار کو ایک اور عادت بدلاحق ہو گئی تھی کہ وہ اکثر نصف شب کے وقت بیدار ہو کر مکان میں ادھر اُدھر گھومنے لگتا چنانچہ ایک مرتبہ آدھی رات کو جب اچانک میری آنکھ کھلی تو میں اسے بستر پر نہ پاکر سخت متعجب ہوئی۔ ایک لمحہ بعد مجھے ملحقہ کمرہ سے جہاں چند پرانے صندوق اور ٹرنک وغیرہ رکھے ہوئے تھے کچھ آواز سنائی دی۔ میں فوراً دروازہ کے قریب پہنچی اور کواڑ ذرا سا کھول کر اندر جھانکنے لگی۔ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور کمار ایک چھوٹا سا ٹرنک کھولے ہوئے کپڑوں کی تہ میں نہایت احتیاط سے کوئی چیز چھپا رہا تھا۔ میں حیران ہو کر واپس لوٹی اور چارپائی پر لیٹ کر صبح تک اس معاملہ پر غور کرتی رہی۔ کیا اس نے اپنا تمام سرمایہ اس ٹرنک میں چھپا رکھا تھا۔ مجھے خوب یاد تھا کہ جب سے اس کا دماغ خراب ہوا تھا اس نے ایک کوڑی کا حساب کسی بینک میں نہیں رکھا تھا۔ اور اسی ایک برس کے دوران میں نہ معلوم کہاں روپیہ جمع کرتا رہا تھا۔ اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے واقعہ مذکورہ کے چند دن بعد ایک دن دوپہر کے وقت جبکہ کمار گھر پر موجود نہیں تھا میں نے

اس کے خفیہ خزانہ کا پتہ لگانا چاہا۔ میں اپنی چابیوں کا گچھا لیکر فوراً اس کمرے میں پہنچی اور خوش قسمتی سے کمار کا ٹرنک کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ دیکھکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کپڑوں کے درمیان ایک کثیر رقم نقدی اور نوٹوں کی صورت میں نہایت احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ قریباً ایک ہزار روپیہ ٹرنک میں موجود تھا۔ فی الحقیقت اس نے اپنی تمام کمائی اس ٹرنک میں جمع کر رکھی تھی۔ میں نے چاہا کہ چند ایک نوٹ چرالوں مگر کمار کے غصہ و ظلم کے خیال سے لرز گئی۔ اگر اُسے پتہ لگ گیا تو میرا پٹنا یقینی تھا کیونکہ اس نے پیشتر تین چار مرتبہ وہ مجھے زدوکوب کر چکا تھا۔ لہٰذا میں بدستور ٹرنک مقفل کر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

دن گذرتے گئے۔ مگر کمار کے خفیہ خزانے کا خیال ہر وقت میرے دل و دماغ پر مستولی رہتا۔ مجھے اپنی خستہ حالی پر رونا آتا تھا کیونکہ اب تک پہلی سی امیرانہ زندگی بسر نہیں کر سکی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہی پہلی سی فارغ البالی کے ایام بسر کروں۔ مگر اتنا روپیہ پاس ہونیکے باوجود کمار مجھے ایک پائی تک دینے کا روادار نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک مرتبہ پھر اُسے ڈاکٹر سے مشورہ لینے پر مجبور کروں۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اگر اس کے علاج کے لئے آپریشن یا ایکس رے کرنیکی ضرورت پڑے تو بھی وہ بآسانی اخراجات برداشت کرے گا۔ چنانچہ ایک دن ڈرتے ڈرتے نہایت الفت آمیز لہجہ میں اس سے کہا۔ "کمار! تم جانتے ہو کہ میں تمھیں کتنا چاہتی ہوں۔ ہماری شادی کے ابتدائی دو سال کتنی خوشی و مسرت میں بسر ہوتے تھے۔ تم نے بھول کر بھی کبھی کوئی بات پردۂ اخفا میں نہیں رکھی تھی مگر اب میں دیکھتی ہوں کہ تم ہمیشہ مجھ سے متنفر رہتے ہو۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ تمھارے دماغ میں ضرور کچھ خلل واقع ہو چکا ہے۔ بس تم سے منت کرتی ہوں کہ میری خاطر تم فقط ایک مرتبہ کسی ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کراؤ۔ یقیناً تمھاری حالت اچھی ہو جائیگی۔"

جونہی میرے منہ سے اس نے یہ الفاظ سُنے وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ مجھے بُرا بھلا کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ کر اس زور سے دبائی کہ میری آنکھیں اُبلنے لگیں۔ نہایت غضب آلودہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "خوب! تم سمجھتی ہو کہ مجھے یوں اپنے راستہ سے ہٹا کر میری تمام عمر کی کمائی پر اپنا ہاتھ صاف کر دو گی۔"

قریباً ایک ہفتہ تک میری گردن میں درد محسوس ہوتا رہا۔ اب میں کمار سے انتہائی خائف رہنے لگی۔ کیونکہ میرا شوہر دیوانہ ہو چکا تھا اور میری زندگی اس گھر میں نہایت مخدوش تھی۔ اب میں کمار سے علیحدگی اختیار کرنے کی تجاویز سوچتی رہی۔ میں ابھی خوبصورت و جوان تھی اور مفت میں اپنی جوانی برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بھی مضبوط تھے۔ اور میں محنت کر کے اپنا پیٹ پال سکتی تھی۔

(۲)

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک شام کو کمار اپنے ہمراہ پریم نامی ایک خوب صورت نوجوان کو گھر لایا جو کئی سال سے اس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ وہ پہلے بھی چند مرتبہ ہمارے مکان پر آیا تھا جبکہ کمار کی حالت درست تھی۔ کمار نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ "کملا! آج سے پریم ہمارے ہاں رہا کریگا۔ کیونکہ جس جگہ وہ رہائش رکھتا ہے وہ اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ میں نے اسے وہ باغ والا کمرہ کرایہ پر دینے کا وعدہ کیا ہے جو ہمارے مکان کے عقب میں واقع ہے۔"

روپیہ حاصل کرنے کی کتنی معقول تجویز ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے پریم کا استقبال کیا۔ پریم ایک دراز قد خوش وضع اور خوب صورت نوجوان تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں اور اس کے گھنگریالے بال نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کمار کا مزاج نہایت ضدی اور چڑچڑا تھا۔ مگر پریم کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کی مہماں نوازی سے متفکر ہو رہی تھی۔ کیونکہ اپنی مفلسانہ حالت کے مدنظر میں اس کی کچھ بھی خدمت نہ کر سکتی تھی۔ خیر! جو کچھ روکھی سوکھی روٹی میسر ہو سکی میں نے پریم سے معذرت کرتے ہوئے دستر خوان پر لا رکھی اور جب ہم کھانا ختم کر چکے تو کمار ہمیں باتیں کرنے کے لئے چھوڑ کر کسی کام کے لئے باہر نکل گیا۔

"کملا!" پریم نے مجھ سے کہا "اگرچہ میں کمار کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔ مگر دراصل میں خود تمھارے ساتھ چند باتیں کرنی چاہتا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کچھ عرصہ سے کمار کی حالت بدل چکی ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"اس کا دماغ صحیح نہیں رہا۔" میں نے متانت سے جواب دیا۔ "دن بدن اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش بھی کی ہے۔ مگر وہ ڈاکٹر سے مشورہ لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔"

"تمھارے خیال میں یہ اس موٹر کے حادثہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے؟" پریم نے استفسار کیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے مجھے پُر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہمدردی سے میں دل ہی دل میں اپنی حالت پر افسوس کر رہی تھی۔

"میں اس سے بہت ڈرتی ہوں پریم!" میں نے بالآخر جواب دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور ندامت سے میں نے منہ پھیر لیا۔

"میرا خود یہی خیال تھا کہ کمار کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔" پریم نے کہا "کام پر بھی اس کی حرکات تعجب خیز ہوتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب وہ پہلا سا خوش خلق انسان نہیں رہا۔ وہ کہتا تھا کہ تم اسے تباہ کرنا چاہتی ہو۔ اور وہ تمہیں زد و کوب بھی کر چکا ہے۔ اگرچہ میں اس معاملہ میں تمہاری خاطر خواہ امداد نہیں کر سکتا تاہم میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالت میں تمہاری حفاظت کے لئے میرا یہاں ٹھیرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ کمار کی وحشت سے یہ بعید نہیں کہ وہ غصہ میں آکر کسی دن تمہیں جان سے مار ڈالے۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" میں نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا۔ "پریم! اگر تم میرے پاس رہنا پسند کرو تو میں تمہاری بے حد ممنون ہوں گی۔"

اگلے دن باغ والا کمرہ پریم کے لئے خالی کر دیا گیا اور وہ اپنا سامان وغیرہ لے آیا۔ اب میرے دن کچھ اطمینان سے گذرنے لگے۔ کمار نے بھی مجھے خرچ کے لئے کچھ زیادہ رقم دینی شروع کر دی۔ اور میں دو وقت کا کھانا بہترین و لذیذ پکاتی۔ میں خود کو نئے سرے سے خوبصورت جوان محسوس کر رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہی سابقہ ٹھاٹھ کی امیرانہ زندگی گذاروں۔ مگر میں مجبور تھی۔ پریم بظاہر میری مجبوریوں کو سمجھتا تھا مگر مجھ سے اس کے متعلق کچھ نہ کہتا۔

چند ہفتے آرام سے گذرے ہونگے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کوئی نصف شب کا وقت ہوگا۔ میری طبیعت قدرے مضمحل تھی۔ اور نیند نہ آنے کے باعث میں اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ کمار میرے قریب ہی اپنی چارپائی پر محو خواب تھا۔ یکایک ایک حرکت غیر ارادی سے میرا ہاتھ کمار کے تکیہ کے نیچے جا لگا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی کیونکہ میرا ہاتھ کسی تیز دھار آلہ سے مس ہوا تھا۔ میں نے اسے نہایت احتیاط سے تکیہ کے نیچے سے نکالا۔ اور کھڑکی کے قریب سے جاکر چاند کی روشنی میں بہ نظر غور دیکھا۔ یہ ایک لمبا سا خنجر نما چاقو تھا جو چند روز قبل باورچی خانہ سے کھو گیا تھا۔ خوف کے مارے میرا دل سینے کے اندر شدت سے دھڑکنے لگا۔ کیا اس چاقو سے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یا اپنی حفاظت کے لئے پاس رکھکر سوتا تھا۔ چاقو بدستور اپنی جگہ رکھدیا اور خوف زدہ ہو کر دوسرے کمرے میں آئی۔ تمام رات میں کرسی پر بیٹھی ہوئی خوف سے بیدار رہی۔ ذرا آنکھ لگی تو کمار نے مجھے آکر جگایا۔

"تم یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟" اس نے غصہ سے مجھے ... ہوئے کہا۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا۔ مگر پریم کی موجودگی کا خیال میری ہمت بندھی اور میں نے چاقو کا واقعہ اسے صاف صاف بتا...

"کمار! اس چاقو کو اپنے پاس رکھ کر مت سویا کرو مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"سنو!" کمار نے جواب دیا۔ "اگر تم نصف شب کو اٹھ ... سامان کا جائزہ لیا کرو گی تو میں یہی چاقو تمہاری گردن میں پیو... دوں گا۔" وہ انتہائی غیظ میں تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے ...

وہ گھڑی میں تمام عمر نہ بھولوں گی۔ جو مکان کسی وقت ... لئے گہوارہ عیش و مسرت تھا اب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ ... سہمی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی اور کمار میری جانب رخ کئے کھڑکی ... کھڑا تھا۔ سورج کی اولین شعاعیں اس کے سر کو سنہری بنا ... مگر اس کی غضبناک نگاہیں مجھے قتل کا پیام دے رہی تھیں۔ یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی کمار ہے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ... اور جسے میں اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی۔

(۳)

اس دن کمار بغیر ناشتہ کئے سویرے ہی کام پر چلا گیا ... کی میز پر میں نے رات کا واقعہ من و عن پریم سے بیان کیا۔ اس نے رائے دی کہ کمار کو زبردستی ہسپتال بھیجکر اس کے دماغ کا معائنہ ... چاہئے۔ اگر وہ دیوانہ ثابت ہو تو اس سے علیحدگی نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے پاس رہنے سے میری زندگی مخدوش تھی اور جان کو ہلاکت میں ڈالنا سخت نادانی تھی۔

"فرض کرو کہ ڈاکٹر اسے دیوانہ قرار نہ دیں تو پھر گھر آتے ہی وہ میرا خاتمہ کر دے گا۔" میں نے گھبرا کر پریم سے پوچھا۔

"کملا! میرے یہاں ہوتے ہوئے تم اس بات کی فکر نہ کرو" پریم نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت کیوں مجھ پر نیم بے ہوشی کی حالت طاری ہونے لگی۔ شاید یہ شب بیداری کا نتیجہ تھا یا ان نا ملائم احساسات کا جو کمار کے سفاکانہ طرز سلوک نے میرے دل و دماغ میں پیدا کر دیئے تھے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ کمرے کا تمام ساز و سامان مجھے گھومتا دکھائی دیا اور میں میز پر کہنیاں ٹیک کر جھک گئی۔ عین اسی وقت میں نے پریم کے بازو اپنی کمر میں حائل ہوتے محسوس کئے۔ چند لمحات کے بعد جب میرے حواس بجا ہوئے تو پریم بدستور میری کمر میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے سچے دل سے پیار کرتا ہے۔ میں حیران تھی کہ آج کیوں خود بخود میرا دل پریم کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ میں بے ارادی طور پر پریم کی آغوش تمنا میں گر رہی تھی اور اس کے بازو میری کمر کے گرد سخت ہو رہے تھے۔

"جان سے عزیز کملا!" پریم نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ اور بے اختیار ہو کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے شیریں لب خود بخود میرے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ یکلخت وہ مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ندامت سے لرز رہا تھا۔

"کملا! مجھے معاف کر دو!" اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا "میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا۔ پیاری کملا! میں کیسے کہوں کہ مجھے تم سے الفت ہے۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ کمار کی دوستی کو بالائے طاق رکھکر اس کی بیوی سے میں نے معاشقہ شروع کر دیا۔ میں کتنا بزدل ہوں!"

"نہیں پریم! قصور ہم دونوں کا ہے" میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ آہ میرا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ "بہتر یہی ہے کہ اب تم ہمارے یہاں سے چلے جاؤ"۔

"نہیں کملا! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا!" پریم نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "میں تمہیں کمار کے پاس تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہیں ہلاک نہ کر دے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب کبھی تمہارے قریب آنے کی جرأت نہ کروں گا"۔

پریم سچ مچ اپنے قول کا پکا نکلا۔ اگرچہ میں اُسے اپنے دل سے دور کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ تاہم اس کا خیال آتے ہی میرے جسم میں سر سے پاؤں تک خون کی ہر دوڑ اٹھتی اور میں اس کے اولین بوسہ محبت کی چاشنی اپنے ہونٹوں پر محسوس کرتی۔ کمار کے طرز عمل میں مطلق تبدیلی نہ ہوئی۔ وہ بدستور چاقو اپنے پاس رکھکر سوتا اور مجھے جان کے خوف سے تمام رات دوسرے کمرے میں صوفے پر سونا پڑتا۔

(۴)

چند روز بعد میں نے ڈاکٹر سے ملاقات کی اور اسے کمار کے طرز عمل کی نسبت مفصل حالات بتلائے۔ میری التجا پر وہ ایک دوست کے ہمراہ کمار کو دیکھنے کے لئے مکان پر آیا۔ کمار کا غصہ اور تلخ کلامی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ جو کوئی بھی اس کے غصہ کی زد میں آتا وہ اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا۔ ڈاکٹر نے اس کی بدحواسی اور بہکی بہکی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ قطعی طور پر دیوانہ ہو چکا ہے۔ دو ہفتے بعد جبراً اور بڑی مشکل سے کمار کو علاج کے لئے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے ڈاکٹر دوڈل نے بتایا کہ میں نے اپنے شوہر کے علاج میں سخت کوتاہی سے کام لیا تھا۔ کیونکہ اس کے سر میں چوٹ آنے کے باعث اس کے دماغ پر غیر ضروری دباؤ پڑ چکا تھا اور یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ جو اس کے ہاتھوں سے زندہ بچی رہی۔ دراصل اس کی وحشت نے اسے اتنا سنگدل بنا دیا تھا کہ وہ قطعی طور پر مردم کشی پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ آپریشن کا ہونا نہایت ضروری معلوم ہوتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر اس کے خلاف تھے کیونکہ اس صورت میں بھی کامیابی کی ایک فیصدی امید تھی۔

گھر آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ ایک بہت بڑا وزن میرے کاندھوں سے اتر گیا ہے۔ کمار کو ہسپتال میں داخل کرانے میں پریم نے میری کافی مدد کی اور دوسرے دن وہ خود بھی اپنا سامان وغیرہ باندھکر کسی دوسری جگہ کرایہ پر جا رہا۔ اب میں نے کمار کے خزانہ کو صرف کرنا شروع کیا۔ میں نے چند ضروری اشیا خریدیں۔ اپنے لئے کئی عمدہ لباس سلوائے۔ اور مکان کو از سر نو رنگ کرا کر تمام کمرے بیش قیمت سامان سے آراستہ کئے۔ میں نے اپنا پیانو درست کرایا اور ریڈیو بھی نیا خریدا۔ الغرض میں نہایت خوش تھی کہ ایک مرتبہ پھر زندگی کی کھوئی ہوئی مسرتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ کمار کے علاج کے لئے میں نے ایک خاصی رقم ہسپتال میں جمع کرا دی۔

پریم اب بہت کم میرے یہاں آتا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ پھر میرے پاس چلا آئے کیونکہ میں اسے دل سے پیار کرتی تھی۔ اور مقتضائے شباب بھی یہی تھا کہ میں زیادہ عرصہ تک تنہا نہ رہوں۔ جب میں اپنا بنا لباس زیب تن کر کے پیانو بجانے میں مصروف ہوتی تو میرا دل بے اختیار پریم کو اپنے پہلو میں دیکھنا چاہتا۔ کئی مرتبہ میں نے خیال کیا کہ خود پریم کے مکان پر جاؤں مگر میری ہمت نہ پڑتی تھی اور میں خاموش ہو کر رہ جاتی۔ ایک رات میں نے پریم کو کسی ضروری کام کے بہانہ

بلا بھیجا۔ میں ایک بیش قیمت ساڑھی میں ملبوس بے چینی سے اس کا انتظا
کر رہی تھی۔ جب وہ آیا تو میں دروازہ تک اس کو لینے گئی۔ ......
...... میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے رنج و خوشی کے ملے جلے آثار ہویدا تھے۔ پہلے تو کچھ دیر ہم ریڈیو سنتے رہے۔ پھر کمار کی نسبت بات چیت کرنے لگے جواب ہمارے نزدیک عرصہ سے مرچکا تھا۔ پریم نے اس زمانہ کے واقعات سنائے جب اس کی کمار سے انتہائی دوستی تھی اور جب کمار شریف الطبع و نیکدل انسان تصور کیا جاتا تھا۔ میں نے بھی اپنی خوشی کے بھولے ہوئے ایام کا تذکرہ کیا۔ جب کمار کو مجھ سے انتہائی الفت تھی اور ہم نہایت راحت و اطمینان سے دن گذارتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمار کی روح ہمارے درمیان کھڑی ہوئی ہماری ہمدردی کا کام کر رہی ہوئی تھی۔

آخرکار پریم رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ میں اُسے دروازہ تک چھوڑنے آئی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اُسے جانے نہ دوں۔ اور بے اختیار اس سے اپنی محبت کا اظہار کردوں۔ یکلخت وہ دروازے پر آکر رک گیا۔ اگرچہ اس کے لب بند تھے تاہم اس کی آنکھیں اس کے دل کا راز کہہ رہی تھیں۔ اچانک ایک نامعلوم جذبہ سے متاثر ہوکر میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے محبت بھری آواز میں کہا "پریم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں یہاں تنہا نہیں رہ سکتی" میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے قدرے تامل کیا۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنی آغوش محبت میں لیکر کہنے لگا "کملا پیاری! میں تمھیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس والہانہ شیفتگی کا کیسے اظہار کروں جس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ مجھے تمہاری خوشی جان سے عزیز ہے اور میں خود نہیں چاہتا کہ تمھیں ایک لمحہ کے لئے جدا کروں۔ میں کل ہی یہاں چلا آؤں گا۔"

اب پریم اور میں نہایت خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔ میں نے خدمت کے لئے ایک ماما مقرر کرلی۔ وہی مکان جو میرے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا اب فردوس بریں سے کم نہ تھا۔ ہماری زندگی قابل رشک تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ ہماری یہ مسرت ابدی صورت اختیا
کرچکی ہے۔

(۵)

دن نہایت ہنسی خوشی گذرتے گئے۔ کمار کا خیال قریباً قریباً میرے دل سے محو ہوچکا تھا کہ یکلخت بجلی کی سرعت کے ساتھ مجھے ہسپتال سے ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں کمار کے دماغ کا آپریشن کرنے کیلئے میری اجازت طلب کی گئی تھی۔ انگلستان سے ایک ماہر ڈاکٹر مارٹن نامی جو دماغی امراض کا معالج خصوصی تھا چند روز کے
میں آیا ہوا تھا۔ کمار کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے یقین د
اپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔ اس خبر کو سنتے ہی پریم اور میں حیر
و دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ میں حیران تھی کہ ایسی زبردست ذمہ
برداشت کروں۔ اگر اپریشن سے کمار کی موت واقع ہوگئ
میرا ہوگا۔ اور اگر وہ صحت یاب ہوگیا تو میرا اور پریم کا م
ناممکن تھا۔ پریم کے کہنے پر میں نے اپریشن کی اجازت بھیجدی او
درخواست کی کہ وہ نتیجہ سے بذریعہ تار مجھے مطلع کرے۔ اگلے
کے وقت کمار کا اپریشن کیا گیا۔ دوپہر کے بعد میں اور پریم
گفتگو میں مصروف تھے کہ اچانک ہسپتال سے مجھے حسب ذیل
ہوا:—

"اپریشن کی حیرت انگیز کامیابی پر آپ کو مبارکباد
دیتا ہوں" ڈاکٹر مارٹن

تار کا مضمون پڑھکر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی میں
نہیں کرسکتی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری آنکھوں تلے اند
چھا گیا اور میں ایک دم بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ جب مجھے ہوش
میں اپنے پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ پریم میرے قریب بیٹھا ہوا
ہاتھ پاؤں دبا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مہر سکوت ثبت تھی اور چ
سے پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔ میں سخت مضطرب تھی۔ تار
نے میرے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا تھا۔ اپریشن کی کامیا
امر کی دلیل تھی کہ کمار اب وہ بخیل و ظالم نہیں رہا ہوگا۔ جس
برسوں تک میری زندگی کو دوبھر بنا رکھا تھا۔ بلکہ دوبارہ خوش خلق
شوہر بن گیا ہوگا اور یقیناً حقارت آمیز لہجہ کی بجائے ہونٹوں پر
تبسم رقصاں ہوگا۔ جس کی ایک جھلک مجھے بیخود بنا دیا کرتی تھی۔
اس بات سے ڈرتی تھی کہ جب وہ میری محبت کا خیال دل میں
واپس آئے گا تو میری اور پریم کی الفت کا نقشہ دیکھکر کیا خیا
کرے گا۔

اس تار نے مجھ سے زیادہ پریم پر اثر کیا۔ متواتر کئی روز
نے کچھ نہ کھایا۔ اور نہ ہی مجھ سے کچھ بات چیت کی۔ میں یہ سمجھنے
تھی کہ وہ کس سوچ میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ کمار کو پورے طور
یاب ہونے کے لئے ابھی چند ماہ ہسپتال ٹھہرنا پڑیگا۔ لیکن ایک
بعد جب دروازہ پر دستک سُن کر میں باہر نکلی تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیر
ہوئی کہ کمار دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا اگرچہ وہ پہلے کی نسبت

اغ تھا تاہم اس کی آنکھوں میں وہی پہلی سی محبت کی
ے ابتدائی زمانہ مسرت میں مجھے مجبور بنا دیا کرتی ۔ میں کافی
کے بعد یکلخت پکار اٹھی "کمار! میرے پیارے کمار
تندرست ہوگئے ؟"

!" اس نے مجھے حاسدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے
ے تاسف آمیز تھا ۔ شاید وہ اپنے پراگندہ خیالات
لیف محسوس کر رہا تھا ۔
ا معلوم ہوتا ہے" کمار نے کہا ۔ "جیسے میرے
تاریک پردہ اٹھ گیا ہے "
کے اشارے پر وہ مکان میں داخل ہوا ۔ اور آتے ہی
اپنی دیرینہ کرسی پر بیٹھ گیا ۔ کمرے کے ساز و سامان کا
ئے وہ بولا "تم نے مکان کی آرائش میں نمایاں تبدیلی
! ریڈیو بھی نیا معلوم ہوتا ہے ۔ مگر اس پرانے ریڈیو کا

نے خود اسے عرصہ ہوا فروخت کر دیا تھا ۔ کیا تم بھول گئے
نے پوچھا ۔
ے کچھ کچھ یاد آرہا ہے" اس نے ماتھے پر شکن ڈالکر اور سر
ے کہنے لگا "مگر موٹر کے حادثہ سے قبل کے واقعات
ل ہوچکے ہیں میں زیادہ آسانی سے سمجھ سکتا ہوں کملا!
ہ میں تمہیں کافی عرصہ تک ایذا پہنچاتا رہا "
ار!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ تمہارا قصور نہیں
ھوں میں آنسو بھر آئے اور میں آگے نہ کہہ سکی ۔
ہوں پریم مجھ سے ملنے ہسپتال آیا تھا" کمار نے یکلخت
ا ۔
سے ملنے" میں نے حیرت سے پوچھا ۔
ں" وہ کہتا تھا تم دونوں ایک دوسرے کو دل سے

ر! میں سخت نادم ہوں کہ میں نے تم سے بیوفائی کی" میں
سے رک رک کر یہ الفاظ ادا کئے ۔
س بات کی ضرورت نہیں" اس نے فوراً کہا "پریم نہایت
ہ دل آدمی ہے اور یقیناً مجھ سے بہ حالت بہتر ہے ۔
تمام واقعات من و عن سنا دیے ہیں ۔ شاید وہ سمجھتا
علی میں مکان پر آیا تو تمہارے راز سے آگاہ ہو کر میرے

دل کو صدمہ نہ ہوگا"

میرا جسم لرز اٹھا ۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھی ۔ میرے
لئے پریم کو چھوڑنا بہت مشکل تھا ۔ کیونکہ اس کی بدولت میں نے نئے سرے
سے زندگی کی مسرتیں حاصل کی تھیں ۔ وہ میری زندگی کا جزو لاینفک
بن چکا تھا ۔

"کملا! اب صرف تم ہی اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہو" کمار
نے میرے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا "پریم یا کمار تمہیں دونوں میں سے ایک کا
انتخاب کرنا ہوگا"

"کمار! مجھے معاف کر دو" میں نے اپنے منجمد لبوں کو بہ مشکل
وا کرتے ہوئے کہا "میں سمجھتی تھی کہ تمہارا صحت یاب ہونا ناممکن ہے ۔
اس لئے میں نے تمہیں اپنے دل سے محو کر دیا ۔ میرے نزدیک تم
بالکل مر چکے تھے ۔ آہ! میں نے شباب کی لذتوں سے مسرور ہونے
کے لئے کس قدر غلطی کی ۔ اور کتنی عجلت سے کام لیا ۔ مجھے چاہیے تھا کہ
تمہاری محبت کی یاد میں مصیبت کے دن گذار دیتی" میں نے دونوں
ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور زار زار رونے لگی ۔

چند منٹ بعد جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو کمار بدستور
میرے پاس کھڑا تھا "بس میں صرف یہی جاننا چاہتا تھا" اس نے
پریشان نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ۔ اور پھر اس کی نگاہیں
کمرے کا جائزہ لینے لگیں "میں تمہیں زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا ۔
چونکہ تم پریم کو دل سے چاہتی ہو ۔ اور یقیناً پریم ہی تمہارا انتخاب ہے ۔
لہٰذا اب جہاں تک تمہارا اور پریم کا تعلق ہے تم مجھے اپنے نزدیک مردہ
ہی سمجھو اور بے خوف آرام سے زندگی بسر کرو" اتنا کہہ کر وہ دروازہ
کی جانب مڑا ۔ اور میرے اصرار کے باوجود مجھے تنہا چھوڑ کر بہ سرعت
باہر نکل گیا ۔ میں بے بس ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور کافی دیر تک روتی
رہی ۔

اس واقعہ کے تیسرے روز پولیس نے مجھے ایک نعش کی شناخت
کے لئے بلایا جو دریا سے برآمد ہوئی تھی اور جسے وہ کمار کی نعش تصور کرتے
تھے ۔ میں نے جا کر دیکھا تو نعش کمار ہی کی تھی ۔ اور سچ مچ اس نے پانی میں
ڈوب کر جان گنوا دی تھی ۔ پولیس نے رپورٹ کر دی کہ دیوانگی کے
باعث خودکشی کا ارتکاب کیا گیا ۔ مگر یہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ کمار کی موت
کیونکر واقع ہوئی ۔ اس کے یہ الفاظ بدستور میرے کانوں میں گونج رہے
تھے کہ "جہاں تک تمہارا اور پریم کا تعلق ہے تم مجھے اپنے نزدیک مردہ
ہی سمجھو" سچ مچ اس نے اپنا آخری وعدہ پورا کر دکھایا تھا ۔
(بقیہ بر صفحہ ۲۳۹)

الہام

ملک کا سب سے بڑا شاعر رات کے دو بجے مشاعرہ سے لوٹا اس دن اسی کی نظم حاصل مشاعرہ سمجھی گئی۔ اس لئے ایک ادبی رسالہ کا نمائندہ اسے حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ ساتھ آیا۔

قیام گاہ پر پہنچکر شاعر نے اسے اپنی نظم [illegible] دی۔

دنیا ایک زبردست [illegible]
یہاں کی تمام چیزیں [illegible]۔
اس میں بسنے والے ہر شخص [illegible] اپ کو دھوکے میں
مبتلا کر رکھا ہے۔
زندگی خود ایک فریب ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

ہم کسب زر کے لئے اپنی چھوٹی چھوٹی مسرتیں قربان کر
دیتے ہیں۔
اور اپنی اس قربانی کی حقیقی قیمت کو نہیں سمجھتے ہیں۔
ہم جائز اور ناجائز طریقے سے دولت سمیٹتے ہیں۔
اس امید میں کہ یہ ہماری آئندہ زندگی کو پُر مسرت بنادیگی،
لیکن ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوتیں،
کیونکہ ہم زندگی کے آخری لمحہ تک طلبِ دولت میں مصروف
رہتے ہیں،
اور موت کے بعد ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ
نہیں ملتا۔

⁂ ⁂ ⁂

ہماری روحیں اپنی محنت سے اوروں کو مستفید ہوتے دیکھ
کر بیقرار ہو جاتی ہیں،
کیونکہ ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں اپنے لئے کرتے ہیں،
صرف اپنی ذات کے لئے!!

ملک کے سب سے بڑے شاعر کا تازہ ترین شہپارہ حاصل کر کے ادبی رسالہ کا نمائندہ اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرنے لگا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے شاعر سے دریافت کیا۔

"کسی نہایت ہی غیر معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر آپ نے یہ نظم سپرد قلم کی ہوگی؟"

"تمہارا خیال غلط ہے" اس نے جواب دیا "بڑے بڑے شعراء اور ادبا کے مایۂ ناز شاہکار اکثر انتہائی معمولی تحریک پہ وجود میں آتے ہیں۔ نہایت کم مایہ سے اعلیٰ تر [illegible] بعد اکثر کا [illegible] سو فیصدی الہام ہوتا ہے اور نظر یا نحرک صرف برائے نام۔ تم شاید باور نہ کرو اگر میں کہوں کہ میں نے یہ نظم ایک چیونٹی کی موت سے متاثر ہو کر لکھی ہے"

نمایندہ حیرت و استعجاب سے اس کا منہ تکنے لگا۔

شاعر نے اس کے شکوک رفع کرنے کیلئے وہ واقعہ اس طرح بیان کیا۔

"ہفتے کے چھ روز میں مشین کی طرح کام کرتا ہوں میری مصروفیات اس قدر بڑھی ہوئی ہیں کہ اگر اتفاقاً میرا وقت کہیں زیادہ صرف ہو جاتا ہے تو مجھے اپنے دیگر مشاغل ایک نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کر دینے ہوتے ہیں لیکن اتوار کو میں آرام کرتا ہوں، مکمل آرام! اس دن میں کسی اہم سے اہم کام کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ گذشتہ اتوار کو میں وقت گذاری کیلئے صحن میں ٹہل رہا تھا کہ میری نظر گملوں کے قریب چیونٹیوں کی ایک قطار پر پڑی جیسا چیونٹیاں جفاکش مزدوروں کی طرح اپنے کُنڈ کا بوجھ اٹھائے ایکطرف جا رہی تھیں۔ دوسری قطار کی چیونٹیاں اپنا بوجھ ڈھو کر واپس آ رہی تھیں۔ وہ تمام کی تمام کسی ظالم نگران کی زیر سرپرستی کام کرنیوالے مزدوروں کیطرح نہایت سرگرمی اور ہم آہنگی کے ساتھ اپنے اپنے فرض کو انجام دے رہی تھیں میں نے ملازم سے اس جگہ تھوڑی سی شکر ڈلوا دی اور چیونٹیاں اس پر ٹوٹ پڑیں۔

اسکے بعد میں آرام کرسی پر لیٹ گیا اور تپائی پر رکھی ہوئی ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا میں مطالعہ میں محو تھا کہ ایک چیونٹی صفحہ کے سرے پر نمودار ہوئی، اور انتہائی سرعت سے پورے صفحہ کو طے کر کے دوسری جانب مڑ گئی میں نے کتاب الٹ کر اسے مخاطب کیا، تم یہاں کہاں بھٹک گئیں ضیافت میں شریک نہ ہو گی کیا؟ آؤ! میں تمہیں پہنچا دوں۔ یہ کہہکر میں نے اُسے چٹکی میں پکڑ لیا اور گملوں کے قریب بچھی ہوئی شکر کے پاس لیگیا: یہاں پہنچکر مجھے معلوم ہوا کہ میری چٹکی میں چیونٹی نہیں بلکہ اسکی لاش ہے

غلام عباس مولوی

(طبع زاد)

پلیگ زدہ ہوٹل

...... دھڑ دھڑ دھڑ

کوئی میری خواب گاہ کے کمرے کے کواڑ ٹھونک رہا تھا۔ کب سے؟ یہ میں نہیں جانتا! البتہ اتنا خیال ہے کہ اوّل تو میں سمجھا کہ خواب میں الف لیلہ والی کہانی "کھل جا سم سم اور بند ہو جا سم سم" دیکھ رہا ہوں اور شاید دل ہی دل میں خوش تھا کہ ادھر دروازہ کھلا اور اُدھر خزانہ ہی خزانہ ہے اور بس۔

"کھل جا سم سم" زیر لب بڑبڑا رہا تھا کہ میں نے دروازہ کھلنے [illegible] دیکھا۔ اب مجھے اپنی کرامت پر شبہ نہ تھا۔ اور میرا دل خوشی سے بلّیوں اچھل رہا تھا ـــ مگر دروازہ کھلتے ہی ایک شخص عفور (میرے پرانے نوکر کا نام) کی صورت شکل کا میری طرف آتا نظر آیا۔" ارے یہ عفور کہاں میرے پوشیدہ خزانہ کے پاس!" میں نے دل میں کہا " بڑا نالائق ہے یہاں بھی پہنچ گیا کمبخت!"

"سرکار! سرکار!!" عفور میرے قریب پہنچ کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اوّل تو مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہ ہوتا تھا۔ پھر کانوں [illegible]معاملات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے سمجھنے تک کمبخت نے مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر ہوشیار کرنا شروع کیا۔ اور جب اس طرح گت بنی تو میری عقل نے کام کرنا شروع کیا "کہاں کا خزانہ اور کہاں کی الف لیلہ کی داستان۔ وہی میرا گھر تھا۔ وہی خوابگاہ اور وہی میرا نوکر عفور!"

اب صرف تشویش یہ تھی کہ اتنی رات گئے وہ مجھے کیوں جگا رہا تھا۔ رمضان کا مہینہ تو تھا نہیں کہ شریف آدمی تین بجے صبح ہی سے اٹھ بیٹھے۔ پھر بات کیا ہوئی ـــ چور یا شیطان تو کہیں گھر میں گھس نہیں گیا۔ عفور تھا بھی ویسے دل کا بودا اور میں سمجھا کہ ہو نہ ہو یہی واقعہ ہے۔ ریح جانئے میں کوئی ڈرپوک تو ہوں نہیں لیکن بہرحال انسان ہوں اور تقاضائے بشری یہی ہے کہ بھاگنے والوں کے آگے اور لڑنے والوں کے پیچھے ہو جائے۔ میں بس اسی خیال سے بستر سے اٹھ بیٹھا اور جائے امن تلاش کرنے کی فکر میں دماغ لڑانے لگا۔

"معاف کیجئے سرکار! کیا آپ کے پاس ڈھائی روپئے ہیں"

عفور نے خلاف توقع پوچھا۔

"ڈھائی روپیہ؟" چونکہ میں اس قدر متعجب تھا کہ کوئی دوسرا سوال کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے یہی دوہرایا۔

"جی ہاں سرکار ڈھائی روپیہ" وہ کہنے لگا "باقر میاں آئے ہیں اور ان کی موٹر کا کرایہ ادا کرنا ہے۔"

"باقر آیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تین بجے صبح کے؟"

"جی [illegible]"

"[illegible] ہو گیا اُن کا؟"

"نہیں [illegible] معلوم [illegible]"

میں سمجھ نہ سکا کہ باقر کا اسی رات گئے آنا کیا معنی رکھتا ہے اور سمجھتا بھی تو کیسے کہ جبکہ کچھ عرصے سے اس کا رویّہ میرے لئے متحیّر کن ہو رہا تھا۔ یا تو ایک زمانہ تھا کہ شاید ہی کوئی ایسا منحوس دن ہوگا۔ جبکہ ہم ایک دوسرے سے ملتے نہ ہوں گے اور یا یہ کہ پہلے کئی مہینوں سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے مکان سے اب بہت دور رہنے لگا تھا لیکن یہ رہائش کا سلسلہ عارضی تھا۔ اور ان کے چچا کی غیر حاضری میں وہ "گوشۂ عافیت" کی نگرانی کر رہا تھا۔ "گوشۂ عافیت" آبادی سے دور ایسا پُرفضا مقام پر خوشنما بنگلہ تھا جس کو باقر کے چچا باقر سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس دفعہ گرمیوں میں وہ چھٹیاں منانے ٹھنڈے مقام پر چلے گئے تھے۔ اور چونکہ مکان خالی رکھنے میں صفائی اور دیکھ بھال نہ ہونے کا خطرہ تھا۔ اس لئے انھوں نے بطورِ خاص باقر کو گوشۂ عافیت میں چھوڑا کہ وہ اسکی نگہداشت کرے۔ گھر میں باقر کے علاوہ پُرانے نوکر چاکر بھی تھے۔

ہاں تو جب سے باقر کا قیام "گوشۂ عافیت" میں ہوا تھا مجھ سے ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ کوئی خط و کتابت۔ البتہ تھوڑے دن پہلے خلاف توقع ایک لفافہ مجھے ملا۔ یہ باقر نے میرے نام بھیجا تھا۔ اسمیں پچیس روپئے کا ایک چیک تھا۔ اور اسمیں مختصر سا خط جس میں صرف یہ لکھا تھا کہ یہ رقم انھوں نے مجھ سے کوئی چھ ماہ قبل بطور قرض حسنہ لی تھی۔ اور اب چونکہ ان کی مالی حالت درست ہو رہی ہے اس لئے انھوں نے قرض کی ادائی کی طرف توجّہ کی۔ مالی حالت ہی کے سلسلہ میں غالباً انھوں نے لکھا تھا کہ وہ کوئی کاروبار کر رہے ہیں۔ مجھے آ

وقت اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ کونسا کاروبار لکھا تھا۔

"موٹروالا انتظار کررہا ہے سرکار!"

عفور کے اس جملہ نے مجھے چونکا دیا۔ اور یہ جان کر کہ یہ وقت سوچ بچار کا نہیں ہے میں نے عفور کو بتایا کہ وہ دو روپے آٹھ آنے میز کی دراز میں سے لے سکتا ہے۔ یہ معلوم کر کے عفور چلا گیا اور میں ذرا سنبھل کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر خیال کیا کہ کیوں نہ باقر سے مل ہی لوں۔ اور واقعات معلوم کرلوں۔ اس خیال سے برابر کے کمرے میں گیا جہاں باقر پہلے سے موجود تھا۔

"ہائیں! یہ کیا ہوا؟ اس حالت میں!" میرے منہ سے باقر کے لباس کو دیکھکر بے ساختہ نکلا۔

واقعہ یہ تھا کہ باقر کے جسم پر صرف قمیص اور پاجامہ تھا۔ نہ ٹوپی، نہ شیروانی، نہ جوتہ اور نہ آنکھوں پر چشمہ جس کے بغیر وہ باہر نکل ہی نہ سکتا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور صورت پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"کیا تم اس لباس میں اتنی رات گئے شہر میں گھوم رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! گھوم نہیں رہا تھا بلکہ سیدھا تیر کی طرح 'گوشۂ عافیت' سے تمھارے ہاں چلا آیا۔" باقر نے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تمھارے ہاں کوئی زائد ٹوپی مل سکے گی؟"

"زائد ٹوپی؟ اس وقت؟"

"ہاں زائد ٹوپی۔ اسوقت نہیں، کل۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے تم ہمیشہ دو دو ٹوپیاں رکھتے ہو اور سب سے زیادہ کام کی بات یہ ہے کہ تمھارا اور میرا سر بالکل برابر ہے اس لئے تمھاری ٹوپی میں پہن سکتا ہوں۔ اور ہاں شیروانی اور جوتہ تو خیر مل ہی جائیگا۔ تم حیرت سے میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟ —— دیکھتے نہیں کہ میں بہ یک بینی و دو گوش آیا ہوں۔ اور کل تمھارے لباس میں زندگی کا ایک نیا ورق اُلٹنے والا ہوں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ کیونکہ میں تو اس قدر حیرت زدہ تھا کہ کچھ کہتے بن نہیں پڑتا تھا۔ اور باقر کی حالت یہ تھی کہ گویا وہ کسی سوچ میں ہے۔

"تجارت کا بھی عجب حال ہے، ابھی مالدار ابھی دیوالیہ۔" باقر نے آخرکار پھر سکوت توڑی۔

میری سمجھ میں خاک نہ آیا کہ تین بجے صبح کے کوئی شخص بغیر شیروانی، ٹوپی اور جوتے کے چلا آتے اور پہلے کپڑے مانگے یہ کہکر کہ وہ نئی زندگی شروع کرنیوالا ہے اور پھر تجارت کے نشیب و فراز پر طبع آزمائی کرنے لگے تو اس کے دماغی توازن کے متعلق کیا خیال کرنا چاہئے اسی لئے میرے جی میں آئی کہ کہوں "انسانی دماغ کا بھی عجب حال ہے ابھی سمجھدار اور ابھی پاگل!" مگر میں اس وقت جبکہ میں یہ فقرہ کہنے ہی والا تھا اس نے پوچھا:۔

"تمھیں پچیس روپے کا چک ملا ہوگا؟"

"ہاں! ملا تو تھا" میں نے اقرار کیا۔

"غیر متوقع طور پر —— ہوں!"

"ہاں یونہی سمجھ لو"

"ان دنوں تمھیں معلوم ہے کہ میری آمدنی کیا تھی؟" اس نے پوچھا اور جواب کے انتظار کے بغیر سلسلہ جاری رکھا "بس یہ سمجھ لو کہ پچیس روپے کی رقم اتنی حقیر تھی ان دنوں کہ اس سے پہلے شاید ہی میری نظر میں اس کی اتنی کم وقعت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ میرا کاروبار دراصل اس وقت خوب زوروں پر چل رہا تھا۔"

"تمھارا کاروبار —— ؟"

"ہاں ہاں میرا کاروبار۔"

"کس قسم کا؟"

"ہوٹل کا —— ہوا یہ کہ ڈیڑھ مہینے قبل جبکہ چچا ابا گرمیاں گذارنے "اُوٹی" چلے گئے اور 'گوشۂ عافیت' کی نگرانی میرے سر کر گئے۔ تو مجھے دفعتہً خیال گذرا کہ کیوں نہ اس دلکش بنگلہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ کس قدر پُرفضا مقام پر ہے اس کے علاوہ چونکہ وہ کافی اونچے مقام پر ہے اس لئے ٹھنڈا بھی رہتا ہی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کو چچا ابا کی واپسی تک ہوٹل میں بدل دیا جائے تو بہت آمدنی ہوسکتی ہے۔ تم نے تین مہینے قبل اخباروں میں اشتہارات دیکھے ہوں گے کہ ایک نیا ہوٹل پُرفضا اور ٹھنڈے مقام پر کُھلا ہے۔ جہاں بہ نسبت شہر کے گرمیاں آرام سے گذر سکتی ہیں۔ وہ اشتہارات دراصل میرے ہی دیئے ہوئے تھے ——"

"جہاں تک مجھے یاد ہے تمھارے چچا تو مکان کو کرایہ پر بھی دینا نہ چاہتے تھے۔ بلکہ وہ اکثر اُن لوگوں کو بُرا بھلا کہتے تھے جو مکان بناتے اس لئے ہیں کہ خود رہیں لیکن جب وہ بن جاتا ہے تو کرایہ کی حرص میں اس کو دوسروں کے حوالے کردیتے ہیں۔" میں نے بیچ میں دخل دیا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" وہ کہنے لگا" اور اسی لئے تو انھوں نے جاتے جاتے جو مجھے نصیحت کی وہ یہ تھی کہ خبردار کہیں مکان کرایہ پر نہ دے دینا لیکن تم ہی سوچو یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں اتنے بڑے مکان میں تن تنہا رہتا اور خصوصاً یہ خیال پیدا ہونے کے بعد کہ اس موقع سے بہت فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے ——— خیر تو ہوا یہ کہ جو نہی میں نے اشتہارات دیئے جوق در جوق لوگ قیام کے لئے "گوشۂ عافیت" آنے لگے۔ نوکر چاکر سب ہی میرے ساتھ اشتراک عمل پر آمادہ تھے۔ اس لئے میں نے بسم اللہ کہہ کر لوگوں کو ٹھیرانا شروع کیا۔ ابتدا ہی میں آٹھ مسافر قیام پزیر ہوئے"

"روزانہ کیا کرایہ لیا کرتے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"پانچ روپئے روز"

"کھانے کے ساتھ؟"

"ہاں"

"تو گویا اس طرح روزانہ چالیس روپیہ کی آمدنی تھی۔

"اور خرچ بالکل نصف گویا بیس روپیہ۔ اس طرح چھ سو روپئے ماہوار قطعی منافع تھا۔ میرا خیال تھا کہ چچا ابا کے واپس ہونے تک یہ کاروبار چلاؤں گا۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ کم از کم تین مہینے میں واپس ہوں گے۔ اور میرا اندازہ تھا کہ انھیں اس سے زیادہ ہی عرصہ لگے گا"

"اچھا تو تم نے خورد و نوش اور رہائش کا انتظام کیونکر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ! یہ کیا مشکل تھا۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ بہت سی مسافروں نے تو ایک ایک ہفتے کے اخراجات پیشگی ادا کر دیئے تھے۔ ان کی تعداد نصف تھی۔ تین چار مہمانوں نے چالیس چالیس روپیہ ادا کر دیئے۔ اور ایک صاحب کوئی فوجی عہدہ دار تھے وظیفہ یاب انھوں نے تو ایک ایک مہینے کی رقم ادا کر دی۔ بیچارہ کرنل کتنا نیک آدمی تھا ——— مزید فرنیچر وغیرہ کی تو ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ چچا ابا نے ضرورت سے زیادہ سامان جمع کیا ہے۔ گھر کے نوکر چاکروں کے علاوہ دو ایک میں نے ہنگامی طور پر ملازم رکھ لئے تھے ——— کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تم جانتے ہو میں یوں تو مہمان بھی اچھا ہوں لیکن میزبان کی حیثیت سے میری قابلیت بہت زیادہ اچھی ہے۔ مہمانوں کی ضروریات کا خیال ان کی آسائش کا لحاظ اور خورد و نوش کی پسندیدہ اشیا کی فراہمی میں میں بہت مشاق ہوں اور اس دفعہ تو انتظام اس قدر حسن سلیقہ کے ساتھ کیا کہ سب کے سب مہمان میری خاطر داریوں کے سبب ممنون احسان تھے۔

سچ کہتا ہوں کہ وقت ایسا مزے میں کٹتا تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ گپ شپ، سیر و تفریح اور عیش و عشرت کا ہر وقت بازار گرم رہتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ نہ مہمانی کا تکلف نہ میزبانی کی تکلیف، بس چین سے کٹتی تھی۔ اپنی بہادری کے کارنامے، جنگ کی نقشہ کشی، شکست و فتح کی تفصیل کرنل کچھ اس طرح نمک مرچ لگا کر بیان کرتا تھا کہ گھنٹوں گذر جاتے تھے اور وقت محسوس تک نہ ہوتا تھا۔ شیخ جی کا برج کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھی سے الجھ جانا۔ اور اپنی "برج دانی" کے ثبوت میں ہمیشہ دوسروں کو "اناڑی" سمجھنا اور وہ سید صاحب کا کرنل کو شہ دے دے کر شیخ جی کیخلاف کھڑا کرنا بڑا ہی مزا دیتا تھا۔

تم جانتے ہو کہ عیش کے دن کتنے مختصر ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ مہینہ ہو گیا اور مجھے کوئی نو سو روپیہ فائدہ ہو گیا۔ لیکن مجھے توقع تھی کہ کم از کم ڈیڑھ دو مہینے یہی رفتار اور رہے گی۔ اور یہ میری امید کچھ بیجا بھی نہیں تھی۔ کیونکہ چچا ابا کی عادت ہے کہ جب وہ سیر و تفریح کے لئے باہر جاتے ہیں تو کبھی جلدی واپس ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔"

مگر ایک صبح جبکہ میں بازار گیا تھا اور سامان خریدنے میں مصروف تھا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور یہ انداز ایسا بے تکلفانہ تھا کہ میں نے نہایت خلوص کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو سامنے بیرسٹر صاحب کھڑے ہیں۔ تم جانتے ہو نہ بیرسٹر صاحب کو وہ جو چچا ابا کے ہاں اکثر آتے جاتے ہیں اونچے پورے ہٹے کٹے ——— !"

"کہا ہے باقر اچھے تو ہو؟" بیرسٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں! آپ کی دعا سے" میں نے جواب دیا۔

"تمھیں تو اطلاع مل چکی ہوگی؟"

"کاہے کی؟"

"تمھارے چچا ابا کی واپسی کی" انھوں نے جواب دیا۔

"سچ کہتا ہوں کہ میرا خون خشک ہو گیا" چچا ابا کی واپسی! میں نے دل میں کہا "ہائے اب کیا ہوگا میرے انتظامات، میرا ہوٹل اور وہ جو میں نے ابھی ابھی متعدد مہمانوں سے پیشگی رقم حاصل کر لی ہے اور اس کو بڑی حد تک رنگ رلیاں منانے میں اڑا بھی چکا ہوں ——— کس طرح مکان خالی کرا سکوں گا، اور کیوں کر معاملات پر قابو پا سکوں گا"

بیرسٹر صاحب جا چکے تھے اور میں اسی سوچ میں کھڑا ہوا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہوٹل میں آیا تو سامان خریدے بغیر واپس ہو گیا اور دن بھر یہی سوچتا رہا کہ کس طرح مکان خالی کراؤں۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں ان سے صاف صاف کہہ دیتا۔ کیونکہ پیشگی رقم اور قیام کے معاہدات میں نے کچھ اس طرز میں کئے تھے کہ وہ مجھ پر قانونی چارہ جوئی کر سکتے تھے بلکہ مکان خالی کرانے کے لئے اُلٹے چچا ابا کو ایک عرصہ تک مہمانوں کے خلاف عدالتی کارروائی کرنی پڑتی۔ بالآخر میں نے اپنے ملازمین کی ایک کانفرنس طلب کی کہ ان سے مشورہ کروں۔

شام کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں اس کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ جوتوں کو پالش کرنے والا ایک لڑکا۔ دو بیرے۔ ایک باورچی۔ ایک منیجر اور دو نوکرانیاں سب کے سب وقت مقررہ پر جمع ہو گئے۔ عورتوں کو میں نے کرسی دی اور باقی سب کھڑے رہے۔ البتہ لڑکا فرش پر ہی ٹک گیا۔ میں میز پر بیٹھا تھا۔ کارروائی شروع ہوئی اور میں نے واقعات "الف سے ی" تک سنا دیئے۔ اور اس کے بعد اظہار افسوس کے کئی ووٹ پاس ہوئے پھر تدبیریں اور تجویزیں پاس ہونی شروع ہوئیں۔

"میری رائے میں" جوتوں کو پالش کرنے والے لڑکے نے تجویز پیش کی "ہم سب کو فوراً بھوتوں کا لباس پہن لینا چاہئے۔ اور آٹھوں مہمانوں کے کمرے میں آدھی رات گئے گھس جانا چاہئے اور کچھ ایسی حرکتیں کرنی چاہئیں کہ وہ صبح ہونے سے پہلے اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیں۔"

ایک نوکرانی تو بھوت کے خیال ہی سے سہم گئی لیکن باورچی نے یہ کہہ کر تردید کی کہ "فرض کرو اگر ان میں سے کوئی نہ کوئی بہادر نکلا اور بھوت پریت کو خاطر میں نہ لایا تو ۔۔۔؟"

"یقیناً کرنل تو بھوت سے ڈرنے والے معلوم نہیں ہوتے اس لئے میرے خیال میں یہ رائے فضول ہے" میں نے کہا۔

"اچھا تو یوں ہو سکتا ہے" لڑکے نے دوبارہ مشورہ دیا کہ "ہم میں سے کوئی اسٹیشن پہنچے اور آپ کے چچا ابا کو وہاں سے اُڑا لے۔"

"اڑا لے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں میری مراد اسی حرکت سے ہے جو چور اچکے کیا کرتے ہیں۔" اس نے سلسلہ جاری رکھا "اور ایسی جگہ پر انھیں قید رکھیں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ آپ ان سے وقتاً فوقتاً تار دیں یہ بھی اگر ضرورت پڑے تو وصول کر سکتے ہیں۔ اور ہوٹل کا کاروبار دائمی طور پر چند سکتے ہیں۔"

نہیں معلوم وہ اور کیا کیا کہتا مگر اس کو منیجر نے اس سختی سے ٹوک دیا کہ وہ کمبخت خوف سے لرز گیا۔

"میرا ایک دوست ہے" باورچی نے تجویز پیش کرنے کی تمہید شروع کی "ذرا غنڈے قسم کا اگر اس کی خدمات حاصل کی جائیں تو وہ بہت جلد ہمیں اس مشکل سے نجات دلا سکتا ہے۔"

"کس طرح" ایک بیرے نے پوچھا۔

"ایک صبح وہ صفائی کے انسپکٹر کے لباس میں نازل ہوگا اور بڑے تحکمانہ انداز میں مکان کی صفائی پر اعتراضات شروع کریگا۔" باورچی نے اپنی تجویز ذرا پھیلا کر بیان کرنی شروع کی "آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ آجکل لوگوں کو کس درجہ خبط ہو گیا ہے کہ موریوں، نالیوں اور صفائی کے دوسرے انتظامات خراب ہونے سے وبائیں پھیلتی ہیں لہذا اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر وہ ایک ماہرانہ تنقید کرے گا تو لوگ یقیناً بیماریوں کے خوف سے بھاگ جائیں گے۔"

چنانچہ یہ تجویز مجھے بہت معقول اور شریفانہ معلوم ہوئی۔ اور اس کے علاوہ کسی اور نے دوسری تجویز اس سے بہتر پیش نہیں کی۔ اس لئے بالاتفاق آرا جلسہ میں طے پایا کہ باورچی کے غنڈے دوست کی خدمات مستعار طریقہ پر فوراً حاصل کی جائیں۔

دوسرے دن میں حسب قرارداد اپنے مہمانوں کے کمروں میں یہ پوچھنے گیا کہ آیا وہ کسی قسم کی بدبو تو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ سبھوں نے انکار کیا مگر میں برابر اصرار کرتا گیا کہ مجھے رات بھر نیند محض اس لئے نہیں آئی کہ بدبو نے ناک میں دم کر رکھا تھا اور یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ ہوا خراب ہونے کا امکان نظر آ رہا ہے۔

شیخ جی نے تو میری بات کی طرف توجہ بھی نہ کی البتہ کرنل چونکہ پلیگ سے بہت ڈرتے تھے اس لئے انھیں ایک قسم کا شبہ پیدا ہوا۔ کہ کہیں چوہا وغیرہ تو نہیں مرا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ کرنل کی تبلیغ نے ایک ہلکا سا انتشار پیدا کر دیا۔ میں خوش تھا کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

پہر میں باورچی کا دوست اپنے آپ کو صفائی کا انسپکٹر بنائے ہوئے پہنچا اور مکان کی نالیوں اور دوسرے صفائی کے انتظامات کی دیکھ بھال کر کے قسم قسم کے نقائص بیان کرنے لگا۔ بدبو کے متعلق کہنے لگا کہ ہو نہ ہو کوئی چوہا مرا ہوگا کیونکہ شہر میں اکثر جگہ چوہے گر رہے ہیں اور چونکہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ چوہا کہاں مرا ہے اس لئے خطرہ ضروری ہے

کہ سارا مکان صاف کرایا جائے اور فوراً خالی کر دیا جائے ورنہ پلیگ سے متاثر ہونے کے کافی امکانات ہیں۔

اس نقلی انسپکٹر کے جاتے ہی لوگ اپنے اپنے بستر باندھنے لگے اور میں بہ ظاہر ان سب کی جدائی پر افسردہ نظر آرہا تھا لیکن دل ہی دل میں خوش تھا کہ تیر نشانہ پر لگا۔ لیکن عین اسی وقت سید صاحب جو بازار گئے ہوئے تھے وارد ہوئے اور یہ چل چلاؤ کی تیاریاں دیکھکر حیران ہو گئے۔

"ہائیں کرنل صاحب یہ کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

"چلو چلو تم بھی بستر باندھ لو۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟"

"ارے میاں خیریت ویریت کہاں کی۔ یہ مکان تو پلیگ سے متاثر ہو رہا ہے پلیگ سے۔"

"پلیگ سے؟" کس نے کہا۔

"ابھی ابھی ایک صفائی کا انسپکٹر آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو ایک قسم کی بدبو آرہی ہے یہ ہو نہ ہو پلیگ کا چوہا مرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔"

"مجھے تو کسی قسم کی بدبو وغیرہ آ نہیں رہی ہے۔" سید صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "تعجب ہے کہ آپ لوگوں کی ناکیں اس درجہ کیوں تیز ہو گئی ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے تنقیح شروع کی اور سارا گھر چھان ڈالا۔ سب کمرے اور سب نالیاں اور ہر ہر چیز ڈھونڈا لیکن ان کی تفتیش میں نہ چوہا ہی ملا اور نہ انھیں کہیں کسی قسم کی بو ہی آئی۔

"کون انسپکٹر آیا تھا نامعقول۔" انھوں نے سلسلہ جاری رکھا۔ "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تم اناڑیوں کو دیکھکر وہ اُلّو بنا گیا۔ کرنل صاحب شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے بھی محکمہ پلیگ میں چند سال ملازمت کی ہے اور صفائی کے سارے انتظامات اور چوہوں کی بو وغیرہ سے خوب واقف ہوں اور اسی تجربہ کی بنا پر سو سو روپیہ شرط بدنے کو تیار ہوں۔ ناممکن ہے کہ اس گھر میں کوئی پلیگ کا چوہا مرا ہو۔ بات یہ ہے کہ بہت سے بدمعاش انسپکٹر خواہ مخواہ اپنا رعب گانٹھتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ وہ معاملات کی دُم بھی نہیں جانتے۔"

"تو سید صاحب آپ کے خیال میں وہ انسپکٹر یوں ہی کوئی لفنگا تھا۔" شیخ جی نے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا لفنگا، بدمعاش اور دغاباز کہیں کا۔ سچ کہتا ہوں کہ اگر میں ہوتا اس وقت تو خوب گت بناتا مردود کی۔"

"تو پھر ہمیں مکان نہیں چھوڑنا چاہیئے۔" کرنل نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں چاہے آپ لوگ چھوڑ دیں مگر بندہ تو ہرگز نہیں جانے کا۔" سید صاحب نے عزم صمیم کا اظہار کیا۔

"تو بھئی ہم بھی تمھارے ساتھ ہیں۔" شیخ جی نے کہا۔

"اور جب تم دونوں ہو تو ہم بھی ہیں۔ سمجھ لو۔" کرنل نے کہا۔

ان تینوں کا ساتھ دوسرے پانچ مہمانوں نے دینے کا تہیہ کر لیا۔

"مگر سید صاحب انسپکٹر بلا وجہ جھوٹ موٹ کیوں کہتا" میں نے اپنی اسکیم کو ناکام ہوتے دیکھکر کہا۔

"بھائی صاحب تم کیا جانو ابھی بچے ہو ہمارے سامنے کے۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ اصلی انسپکٹر ہی نہ تھا۔" سید صاحب نے نیا انکشاف کیا اور میرا خون خشک ہو گیا۔

"کیا کہا! اصلی نہ تھا؟" شیخ جی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں آجکل لچے اور غنڈے بہت سے ایسے نکلے ہیں جو خواہ مخواہ شریفوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔"

"میرا اول تو کہنا ہے کہ وہ کوئی چوروں اور لٹیروں کا ساتھی تھا۔" کرنل نے جدت پیدا کی۔ "آپ لوگ تو خوب جانتے ہی ہیں کہ لٹیرے اپنی ٹولی میں سے ایک ہوشیار شخص معائنۂ موقع کے لئے ایک دن قبل اس مکان میں بھیجتے ہیں۔ جہاں انھیں ڈاکہ ڈالنا منظور ہوتا ہے۔"

"کرنل نے میرے منہ سے بات چھین لی۔" سید صاحب نے کہا۔

"مگر یہ تو اس سے بھی بری خبر ہے۔" شیخ جی نے دبی زبان سے کہا۔

"تو یہ تم تو سمجھے جاتے ہو۔ ارے میاں مرد بنو مرد۔ اس تن و توش پر یہ دل گردہ۔ لاحول ولا۔"

شیخ کو غیرت آگئی اور انھوں نے حاضرین کو یقین دلایا کہ وہ خود دوسروں کے خیال سے کہہ رہے تھے۔ ویسے وہ تن تنہا چار چوروں کے لئے کافی ہیں۔ اس پر کرنل نے اپنے طمنچے اور اپنی نئی بندوق کا ذکر کرکے سب کو ہمت دلائی بلکہ یہاں تک صاف صاف کہدیا کہ ہم میں سے کوئی بھی بھاگ نہیں سکتا اور جو بھی ایسی کوشش کریگا کرنل اس سے الجھ جائیں گے۔ مزید اطمینان کے لئے انھوں نے اپنی خدمات ہر شخص کے لئے وقف کر دیں۔ خواب گاہ کا کمرہ کھلا رکھنے کا وعدہ کیا اور ہر شخص کے کمرے سے اپنے کمرے کو ایک تار کے ذریعہ ملحق کر لیا۔

اس طرح سے کہ ضرورت کے وقت اگر کوئی اپنے کمرے کی گھنٹی بجائے تو فوراً ہی اس کی اطلاع کرنل کو اپنے بستر پر ہو جایا کرے گی۔ اس کے علاوہ دو ایک گھنٹہ تک ڈاکوؤں کے طریق کار، ان کی شناخت اور ان سے مقابلہ کرنے پر کرنل نے بڑا دلچسپ لکچر دیا۔ اور بات بات پر اپنے تجربات بیان کئے۔

میں اپنی ساری تجاویز کو ناکام دیکھکر بیحد پریشان تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد رہائی کی ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ ساتھ ہی میں نے باورچی کو طلب کیا۔ اور جب وہ آیا تو اس سے یوں مخاطب ہوا۔

"تم کل صبح ناشتہ پر مجھے یہ خبر دینا کہ ایک بیرا سخت بیمار ہے بلکہ یہ صاف صاف کہہ دینا کہ اس کو پلیگ ہو گیا ہے۔ سمجھے نا ___؟"

"جی بہت اچھا سرکار!"

"مگر احتیاط یہ کرنا کہ جس بیرے کی بیماری کی اطلاع دو وہ یہاں نہ رہے بلکہ اپنے گھر چلا جائے"! میں نے اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔

"بہت اچھا"

"اور ہاں سارے نوکر بھی اس سے آگاہ ہو جائیں اور سب کے سب اگر ضرورت پڑے تو تمھارے ہم زبان ہوں"!

"بہت خوب"

باورچی چلا گیا اور میں جتنا زیادہ اس تجویز کے جزئیات پر غور کرتا جاتا تھا اتنا ہی زیادہ مجھے اس کی کامیابی کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تو میری یہ حالت ہوئی کہ مارے خوشی کے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا اور اسی بے اختیاری میں ممکن تھا کہ سارے مہمانوں سے کہہ دیتا کہ اب تو تدبیر اُلٹ نہیں سکتی۔ بھاگو یہاں سے چپ چاپ۔ مگر میں نے بہت ضبط سے کام لیا۔

دوسری صبح کو جب میں سب کے ساتھ میز پر بیٹھا روٹی پر مکھن لگا رہا تھا۔ باورچی بہت ہی روتی صورت بنائے داخل ہوا۔ سب مہمان اس کی یہ حالت دیکھکر پریشان ہو گئے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے کچھ اس عمدگی سے اداکاری کی تھی کہ میں بھی بہت قریب تھا کہ اس کے تصنع کو حقیقت سمجھ لیتا۔

"سرکار" کہنا شروع کیا لیکن اس کی آواز گلوگیر تھی۔

"کیوں! کیا حال ہے! کہتے کیوں نہیں کیا پریشانی ہے"

میں نے بھی بناوٹی انتشار کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار! بیرے کو پلیگ ___"

"ہائیں پلیگ!" میں نے کرسی سے اچھلتے ہوئے کہا "کیسا بیرے کو؟"

"محمد قاسم کو!"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ کرنل کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ اور اس نے کھنکارتے ہوئے بڑی مشکل سے چاء کے گھونٹ کے ساتھ اس کو اُتارا! اور اس کے ساتھ ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اب تو ہم کو بھاگنا ہی پڑا"! کرنل نے کہا۔

دوسرے ساتھیوں نے بھی بے چینی کا اظہار کیا اور بھاگنے پر کمر کس لی۔ لیکن سید صاحب کا یہ حال تھا کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتے اور برابر نوالہ پر نوالہ اُڑائے جا رہے ہیں۔

"کس نے کہا کہ پلیگ ہو گیا" سید صاحب نے کہنا شروع کیا۔

"شام کو اچھا بھلا تھا"

"جی ہاں شام کو اچھا تھا"! میں نے کہا "مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا پلیگ کے لئے کوئی مدت معین ہے! رات کی رات میں ہو گیا پلیگ بیچارے کو"!

"مگر وہ ہے کہاں؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں ایک نظر" سید صاحب نے پوچھا۔

میں نے دل میں کہا "آپ کے دیکھنے کے لئے رکھا تھوڑا ہی ہے اسے یہاں۔ اتنے بیوقوف تو ہیں نہیں ہم"!

"وہ صبح گھر سے نہیں آیا۔ باورچی نے کہنا شروع کیا" میں ناشتہ تیار کر کے ابھی ابھی بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا لڑکا دوڑتا ہوا چلا آیا۔ اور رو رو کر یہ خبر دے گیا"

"اوّل تو یہ یقین نہیں کہ اسے پلیگ ہو گیا ہے! اور دوسرے یہ کہ وہ تو یہاں ہے نہیں جو ہم گھبرا کر مکان خالی کر دیں" سید صاحب نے اپنی منطق شروع کی!

"یہاں نہیں ہے تو کیا ہوا۔ مُبتلا تو یہیں ہوا" کرنل نے نہایت معقول جواب دیا۔

"مُبتلا ہوا تو کیا ہوا مقام صاف کرا کے رہ سکتے ہیں" سید صاحب بولے۔

"نہیں یہ تو اصولِ حفظانِ صحت کے خلاف ہے" کرنل بولا۔

"اچھا تو کرنل صاحب مجھے حفظانِ صحت کے اصول سمجھا رہے ہیں۔ خدا کی شان! سچ کہتا ہوں کرنل صاحب ابھی آپ کو پچاس

برس سکھا سکتا ہوں۔ ایک مدت تک پلیگ کے محکمہ میں ملازمت کی ہے۔ اور یہ نہیں کہ اِدھر اُدھر رہا ہوں بلکہ ذمہ دار عہدہ دار کے فرائض انجام دیئے ہیں۔"

"ارے بھائی اُلجھتے کیوں ہو" شیخ جی نے مصالحت آمیز طرز اختیار کی۔

"دیکھئے تو شیخ جی! کرنل صاحب رعب گانٹھتے ہیں ہم پر۔ میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں لیکن ذلت اور ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی کوئی فوجی کندہ ونِدہ سمجھ رکھا ہے" سید صاحب نے جُھنجھلا کر کہا۔

"اب آپ تو فوجیوں پر حملہ کرنے لگے" کرنل نے بھی ذرا تیز ہو کر کہا "آپ تو اپنے پیشہ کے متعلق کچھ سُن نہیں سکتے۔ اور میں بھلا اپنے پیشہ کے متعلق کس طرح سُن سکوں گا اور پھر یوں بھی فوجی ذرا ہوتے ہی ہیں تیز مزاج"

قریب تھا کہ دونوں میں زبانی جمع وخرچ کے بعد دونوں گتھم گتھا ہو جائیں۔ کیونکہ کرنل بار بار آستین اُلٹ رہے تھے۔ اس لئے میں نے بیچ بچاؤ کیا۔ کبھی کرنل کو سمجھاتا اور کبھی سید کو روکتا۔

جوں توں کر کے دن گذر گیا لیکن کسی نے بھی جانے کا نام نہ لیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اسی سوچ بچار میں شام ہو گئی اور رات کا کھانا کھا کر میں مہمانوں سے معافی چاہ کر اپنے کمرے میں واپس ہو گیا۔ نیند تو کیا آتی بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ نصف کے قریب رات گذر چکی تھی کہ یکایک میں نے پستول کی آواز سنی اور ابھی ہوش وحواس یکجا نہ کئے تھے کہ دوسری آواز آئی۔ اب تو بستر پر لیٹا نہ گیا۔ فوراً اُٹھ بیٹھا اور دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ جو کھولتا ہوں تو کرنل صاحب ہوا میں پستول گھماتے اور چال میں ایک خاص بانکپن پیدا کئے جھومتے جھامتے چلے آ رہے ہیں۔

"کیوں کرنل صاحب خیریت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ وہ انسپکٹر چوروں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا" کرنل نے سلسلہ شروع کیا۔ "میں بستر پر ذرا دیر سے گیا اور یوں بھی خیال کر چکا تھا کہ ذرا ہوشیار سوؤں گا — آپ تو جانتے ہی ہیں ہم فوجی نیند کے قابو میں نہیں آتے بلکہ ہمیشہ نیند کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں، جونہی میں نے سیڑھیوں پر کسی کے پاؤں کی چاپ کی آواز سنی، فوراً پستول سنبھالتا ہوا بستر سے کود کر نکلا اور سیڑھیوں پر کسی کا سایہ دیکھ کر فیر کرنا شروع کیا۔ مگر کمبخت بچ کر نکل گیا۔"

"کرنل صاحب مگر آپ کے نشانہ نے خطا کیسے کیا؟" میں نے کرنل کی رعونت کو دھکا دینے کے لئے کہا۔

"ہم فوجیوں کا نشانہ خطا کرنا ناممکن تھا۔ میں نے عمداً ہوا میں پستول چلایا" کرنل نے جھوٹ موٹ کہنا شروع کیا "کیونکہ میرا مقصد تو قتل کرنا نہ تھا بلکہ ڈرانا تھا اور وہ بدرجۂ اتم پورا ہو گیا۔ چھ گولیوں کا پستول ہے۔ دیکھا آپ نے" (یہ کہہ کر کرنل ... اپنا پستول مجھے تفصیل کے ساتھ دکھانے لگے)"

"آیئے ذرا تلاش کریں چور کی اِدھر اُدھر" میں نے مشورہ دیا۔

"وہ کہیں دبک کر بیٹھا تھوڑا ہی ہوگا۔ اتنا نڈر چور نہیں کہلاتا۔ اس قسم کے بہادر سوائے فوجیوں کے اور کوئی پیشہ ور نہیں ہوتے" کرنل نے سلسلہ جاری رکھا "میری رائے میں تو آرام سے سو رہنا چاہئے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب کی دفعہ اگر اس نے جرأت کی جس کی توقع قطعی نہیں ہے تو میں مار ہی ڈالوں گا مردود کو۔ آپ بےفکر رہیں۔"

میں نے بھی بات نہیں ختم کرنی مناسب سمجھی اس لئے ان کی رائے سے اتفاق کیا بلکہ انھیں کمرے تک چھوڑ آیا۔ لیکن رہ رہ کر ایک بے اطمینانی سی پیدا ہو رہی تھی کہ کس نے ایسی جرأت کی ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کس چور کی کارروائی ہوگی۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور خیال بھی گذر نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر اسی فکر میں مبتلا رہا۔ آخر سونے کے لئے لیٹا۔ بمشکل میری آنکھ لگی ہوگی کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔ اور سچ کہتا ہوں کہ مجھ جیسا نڈر شخص کی بھی روح فنا ہونے کے قریب ہو گئی۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی میں نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو وہ چور ہوگا۔ چیخنے کی کوشش کرتا ہوں تو آواز حلق سے نہیں نکلتی۔ اور مقابلہ کی فکر کرتا ہوں تو جرأت نہیں ہوتی۔

"باقر! باقر!" میرے کانوں میں آواز آئی۔

"ہائیں یہ تو چچا ابا کی آواز ہے" میں نے دل میں کہا۔

اور اب جو آنکھیں کھولتا ہوں تو سچ مچ چچا ابا کھڑے ہیں سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔

"باقر! یہ باورچی کو کیا ہو گیا؟ دیوانہ تو نہیں ہو گیا کمبخت" چچا نے رازدارانہ طریقہ پر پوچھا۔

میں اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے بغیر کچھ سوچے سمجھے کہنے لگا

"جی۔ جی!"

"باورچی پاگل ہو گیا معلوم ہوتا ہے" چچا ابا نے سلسلہ جاری رکھا "لیکن اس کے ہاں پستول کہاں سے آ گیا۔ کہیں کمبخت نے میرا

پستول تو نہیں چھین لیا؟"

"جی! جی!" میری سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا۔

"یہ جی جی کیا کہہ رہے ہو؟ کہتے کیوں نہیں کچھ۔ کب سے دیوانہ ہوا ہے کمبخت؟"

"جی۔ جی!"

"معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ڈر گئے ہو بہت۔" چچا نے تسلی آمیز لہجہ اختیار کیا۔ "میں چونکہ بغیر اطلاع کے دفعتہً آ گیا تھا اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ تمھاری نیند میں خلل انداز ہوں۔ اس لئے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سیدھا خواب گاہ پہنچ کر چپکے سے سو جاؤں لیکن میں جیسے ہی سیڑھیاں ختم کر چکا تھا باورچی میری خواب گاہ سے نکلا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک فیر کیا۔ میں نے آواز بھی دی اور یقیناً اس نے میری آواز پہچانی ہوگی اس پر بھی اس نے دوبارہ فیر کیا۔ وہ تو خیریت گذری کہ وہ بلا نشانہ جمائے پستول چلا رہا تھا۔ میں اسی کو غنیمت جان کر واپس ہوا اور سیڑھیوں کے نیچے ایک جائے امن تلاش کر کے اب تک ٹھیر گیا۔ ذرا اطمینان ہوا تو تمھارے کمرے میں چلا آیا کہ پوچھوں کہ واقعہ کیا ہے؟"

"جی ہاں باورچی رات ہی سے کچھ دیوانہ پن کی حرکتیں کر رہا تھا۔ اور یقیناً اب تو پریشان ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پستول یقیناً خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے چچا ابا آپ میری بات سنئے اور فوراً کسی ہوٹل کا راستہ لیجئے صبح کو میں واقعات پر قابو پا کر آپ سے ملوں گا۔"

میں نے بات بنتی دیکھ کر جھوٹ موٹ کا قصہ گھڑ لیا۔

"لیکن یہاں تمھارا تنہا رہنا بھی تو خطرناک ہے۔" چچا نے از راہِ محبت کہا۔

"نہیں نہیں آپ میری فکر نہ کیجئے۔" میں نے خلوص کا اظہار کیا۔ "میں جانتا ہوں کہ باورچی کو کس طرح قابو میں لانا چاہئے۔ اب آپ جلدی کیجئے۔"

چچا ابا اور میں دالانوں سے گذر رہے تھے اور وہ میری رائے پر عمل کرنے کو تیار تھے۔ لیکن چلتے چلتے جونہی انھیں اپنا لباس تبدیل کرنے کا کمرہ نظر پڑا بغیر کچھ کہے سنے وہ اس میں گھس پڑے۔ میں نے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی کیونکہ اس میں سید صاحب رہتے تھے مگر چچا میرے روکے نہ رُکے۔ ان کا دروازہ کھولنا تھا کہ سید صاحب جو اب تک بستر پہ پڑے تھے اور پستول کی آواز پر اوسان خطا کر چکے تھے دفعتہً چیخ اٹھے۔ ان کی چیخ سن کر کرنل صاحب شیخ جی اور دوسرے مہمان سب ہی دوڑ پڑے۔

اب بات بنانی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھی اسلئے میں نے بھی غنیمت جانا کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلوں سب کو ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے کیلئے میں مکان کے باہر دوڑا اور حسن اتفاق سے ایک کرایہ کی موٹر پاس ہی نظر پڑی تو اس میں سوار ہو کر تم تک پہنچ سکا۔

"اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"چاہے کچھ بھی ہو میرا ارادہ تو یہ ہے کہ صبح کی پہلی گاڑی سے بنگلور چلا جاؤں" باقر نے بیان کیا۔ "کیا تم مجھے پچاس روپیہ قرض نہ دے سکو گے؟"

سید بادشاہ حسین (حیدر آباد دکن)

پریم کہانی بسلسلہ صفحہ ۲۳۰

(۶)

ایک ہفتہ بعد پریم سے میں نے شادی کر لی۔ اس واقعہ کو اب ایک سال گذر چکا ہے۔ میں اب ایک بچہ کی ماں بن چکی ہوں۔ لیکن اکثر مرتبہ کمار کی معصوم دلآویز شکل مجھے خواب میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہے۔

اور میں ایک دم سوتے سے چونک اٹھتی ہوں۔ پھر تمام رات مجھے خوف سے نیند نہیں آتی۔ میرا ضمیر اندر ہی اندر مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے شباب کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کی خاطر اس نیکدل شوہر کی پرواہ نہ کی۔ اور یاس و محرومی نے اُسے جان دینے پر مجبور کر دیا۔

ساغر جعفری
بی اے، ایل ایل بی

محبت کی فتح

کاظمی خاندان سیکڑوں برس سے شرافت اور نجابت میں مشہور چلا آتا تھا۔ پُشت ہا پُشت سے ان کے ہاں اپنے خاندان ہی میں شادیاں ہوتی تھیں۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم اصل نسل سادات ہیں جن میں کسی قسم کا میل نہیں۔ ان کے غرور کا یہ حال تھا کہ اور عام مسلمان تو پرے رہے وہ دوسرے سیّد خاندانوں کو بھی اپنے سے کم ذات سمجھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ جس نے اپنی بیٹی یا بیٹا غیر جگہ بیاہ دیا اس کی نسل خراب ہو گئی۔ وہ اپنے لڑکوں لڑکیوں کو بن بیاہا رکھنا گوارا کرتے مگر کسی دوسرے خاندان میں شادی نہ کرتے۔ ایک کم عمر بچّی بوڑھے کھوسٹ سے بیاہنی منظور، ایک نوجوان لڑکی کا دودھ پیتے بچّے سے شادی کرنا روا مگر اور کسی جگہ بیاہ کرنا خاندان کو داغ لگانا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خاندان جو کبھی ستّر اسّی آدمیوں کا تھا مختصر ہوتے ہوتے بالکل چھوٹا سا رہ گیا۔ اب صرف احمد کاظمی اور محمود کاظمی اس خاندان کے نام لیوا باقی تھے۔ محمود کاظمی اور ان کی بیوی سیّدہ کچھ عرصہ سے حیدر آباد میں رہنے لگے تھے۔ اور احمد کاظمی اپنی لڑکی رشیدہ کے ساتھ سید نگر میں جو خود ان کی ملکیت تھا رہتے تھے اور کبھی کبھی دہلی جا کر اپنی کوٹھی احمد منزل میں قیام کرتے تھے۔

رشیدہ جب پیدا ہوئی اس وقت اس کی ماں گزر گئی تھی۔ اس کو ایک عورت کریمن نے پالا تھا۔ یہ ذات کی پٹھانی بڑی شریف اور وفادار عورت تھی۔ جس روز رشیدہ پیدا ہوئی اسی روز کریمن کے بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ بچاری کا خاوند دو مہینے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ احمد کاظمی نے رشیدہ کو اس کے سپرد کر دیا اور اس نے اس محبت اور پیار سے رشیدہ کو پالا جیسے سگی ماں پالتی ہے۔ رشیدہ کو بھی کریمن سے بڑی محبت تھی اس سے ایک دن بھی جدا رہنا گوارا نہ کرتی تھی۔ تاہم خاندانی غرور اس میں بھی موجود تھا۔ یہ بات اس کو نہ بھولتی تھی کہ کریمن ذات کی پٹھانی ہے اور وہ خود اصل نسل سیدانی۔

احمد کاظمی کو رشیدہ سے بہت محبت تھی۔ ان کی زندگی کی کل کائنات یہ لڑکی ہی تھی۔ ان کی محبت میں پدرانہ شفقت سے زیادہ مادرانہ محبت کا رنگ تھا۔ وہ اس بچّی ہی کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ انھوں نے اسے اعلیٰ درجہ کی اردو فارسی اور عربی اور انگریزی تعلیم دلوائی تھی۔

اگرچہ رشیدہ نے گھر پر ہی تعلیم پائی تھی مگر وہ قابلیت میں بی۔ اے پاس لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ وہ اپنی ماں اور باپ کی جائداد کی واحد وارث تھی۔ اپنے علاقہ کا انتظام وہ خود کرتی تھی اور اس عمدگی سے کہ احمد کاظمی جو خود بڑے منتظم تھے اس کی قابلیت کے معترف تھے۔ کریمن نے خانہ داری اور دستکاری میں بھی رشیدہ کو برق کر دیا تھا۔

احمد کے چھوٹے بھائی محمود کاظمی نے جوانی ہی میں اپنی اور اپنی بیوی کی جائداد برباد کر دی تھی۔ اور اب حیدر آباد میں دو ڈھائی سو کے نوکر تھے اور اسی میں اپنا گذارہ کرتے تھے۔ ان کا اکلوتا لڑکا اسلم عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک وجیہ، خوش مزاج نوجوان تھا اس کے خیالات بلند اور ارادے اونچے تھے۔ تاہم ورثہ میں خاندانی غرور اسے بھی ملا تھا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ ہم ذات میں سب سے اونچے ہیں۔ کوئی اور ہماری برابری نہیں کر سکتا۔

رشیدہ اور اسلم میں بچپن سے بہت دوستی تھی۔ ایک تو قریبی عزیز پھر ہم عمری کی وجہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں کو سوائے ایکدوسرے کے اور کسی کے ساتھ کھیل کود کی اجازت نہ تھی۔ دس پندرہ برس کی عمر تک ان دونوں کا ہر وقت کا ساتھ رہا۔ اس کے بعد محمود حیدر آباد چلے گئے۔ اور ان دونوں رفیقوں میں جدائی ہو گئی۔ اسلم اگرچہ نئی جگہ جا کر بہل گیا۔ اسے نئے نئے دوست مل گئے مگر اب بھی اس کے دل میں رشیدہ کی یاد چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ جب سے اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی شادی رشیدہ سے ہو گی اسے رشیدہ کی یاد اور بھی بیقرار رکھنے لگی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کب سید نگر جائے اور رشیدہ کو دیکھے۔ بارے وہ ایم۔ اے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی ماں اس کے ساتھ سید نگر روانہ ہوئی۔

رشیدہ کو اسلم بہت یاد آتا تھا۔ جب وہ حیدر آباد گیا تو وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ وہ ہر وقت اُداس رہتی۔ اور کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا۔ احمد بچّی کی تنہائی اور پریشانی سے گھبرا گئے۔ انھوں نے طرح طرح سے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ کبھی گاؤں سے باہر لے جا کر گھوڑے کی سواری سکھاتے۔ کبھی اپنے ساتھ شکار کو لے جاتے۔ قسم قسم کے کھیل اس کے لئے منگائے۔ کئی ایک استاد اور استانیاں اس کے پڑھانے کو

رکھیں۔ رفتہ رفتہ رشیدہ اپنے پڑھنے لکھنے اور دوسرے مشاغل میں مصروف ہوگئی مگر اسلم کی یاد اس کے دل میں بدستور باقی رہی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو اس کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ اس کا بیاہ اسلم سے ہوگا تب سے وہ اسلم کا ذکر کرتے بھی جھجکتی تھی مگر تنہائی میں اسلم کی تصویر سامنے رکھ کر اُسے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اسلم میری پاس ہو اور میں اس سے جی بھر کر باتیں کروں مگر دل کی بات زبان پر کیسے لاتی گھٹ گھٹ کر رہجاتی۔

جب اسلم سینڈ نگر آیا اور رشیدہ سے ملا۔ تو وہ حیرت میں رہگیا جب اس نے آخری بار رشیدہ کو دیکھا تھا اس وقت وہ دس گیارہ برس کی الھڑ شریر لڑکی تھی۔ اب اس شوخ اور بے پرواہ لڑکی کو شباب نے شرمیلی نازنین بنا دیا تھا۔ کلی کھل کر پھول بن گئی تھی۔

شروع شروع میں رشیدہ اسلم سے بہت جھجکتی تھی مگر رفتہ رفتہ دونوں میں بے تکلفی ہوگئی۔ دونوں اکثر ایک جگہ بیٹھے دکھائی دیتے۔ گھنٹوں علمی اور معاشرتی مسائل پر بحث کرتے۔ اسلم حیدرآباد کے تذکرے سناتا جو رشیدہ بڑے شوق سے سنتی۔ رشیدہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس نے اپنا ایک کتب خانہ بنایا تھا جس میں اچھے اچھے مصنفین کی عمدہ عمدہ تصانیف جمع کی تھیں۔ اسلم کی کتابی واقفیت بہت کم تھی مگر رشیدہ کے سامنے اپنی اس کمی کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اگر کبھی اسلم دبی زبان سے اپنی محبت کا ذکر کرتا تو رشیدہ شرما جاتی اور بات کاٹ کر کوئی اور ذکر چھیڑ دیتی۔

اسلم کی ماں سعیدہ اور کریمن دونوں ان کی یگانگت کو اچھی نظر سے دیکھتی تھیں اور انھیں ملنے کا موقع دیتی رہتی تھیں۔ سعیدہ بہت خوش تھی کہ ایسی حسین پڑھی لکھی نیک اور سب سے زیادہ یہ کہ اتنی مالدار بہو میرے گھر آئیگی۔ اس نے حبیبہ سے کہا اور چند دن بعد دونوں کی باقاعدہ نسبت کر دی گئی۔ اور یہ طے پایا کہ جب رشیدہ کا اٹھارواں سال لگے تو شادی کر دی جائے۔

اسلم کو بڑی فکر تھی کہ رشیدہ کو نسبت کے بعد اس سے پردہ نہ کرا دیا جائے۔ اس نے اپنی ماں سے کہا اور وہ بیٹے کی خاطر اس پر راضی ہوگئی کہ وہ دونوں دن میں ایک بار مل لیا کریں۔ کوئی اور گھر میں ایسا تھا ہی نہیں کہ اس پر اعتراض کرتا۔ اس طرح یہ دونوں وارفتۂ محبت نسبت طے ہونے کے بعد بھی ملتے رہے۔ اسلم اکثر رشیدہ کو اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا کرتا مگر رشیدہ اس کے جواب میں صرف مسکرا دیتی تھی جس میں کچھ بے اعتمادی پائی جاتی تھی۔ اس کو اکثر یہ خیال آتا کہ اسلم مجھ سے صرف اس وجہ سے محبت کرتا ہے کہ میں اس کے چچا کی بیٹی ہوں ذات میں اس کے برابر ہوں اور ایک بڑی جائداد کی وارث ہوں۔ اگر میں کسی غیر خاندان کی غریب لڑکی ہوتی کیا تب بھی وہ مجھے محبت کے قابل سمجھتا اور مجھ سے شادی کرتا؟ یہ سوال بار بار اس کے دل میں پیدا ہوتا اور اس کو بے چین کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اسلم کے سامنے بھی اس کا ذکر آیا تو اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کا یقین دلایا کہ اسے رشیدہ سے بے لاگ محبت ہے اور اگرچہ اس کے نزدیک حسب نسب بڑی چیز ہے لیکن رشیدہ اگر اس کے چچا کی بیٹی نہ بھی ہوتی کسی اور خاندان کی غریب لڑکی ہوتی تب بھی وہ اسے اتنا ہی چاہتا۔ اور ذات پات کے بندھن توڑ کر اس سے شادی کر لیتا۔ مگر رشیدہ اس لمبے چوڑے دعوے کے جواب میں صرف مسکرا دیتی۔

آج رشیدہ کی سالگرہ کا دن ہے اس نے خیر سے انیسویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اس کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ بہت سے مہمان جمع ہوئے۔ محمود بھی شادی کی شرکت کے لئے حیدرآباد سے آئے ہوئے ہیں۔ احمد اپنی پیاری بیٹی کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے ہیں۔ محمود اور سعیدہ اپنے لائق بیٹے اور پیاری بہو پر فخر سے نظر ڈالتے ہیں۔ اور پھولے نہیں سماتے۔ کریمن کے بھی اسلم اور رشیدہ کو دیکھ کر جان آ رہی ہے۔ رشیدہ اور اسلم کی خوشی کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ اسلم موقع کی تلاش میں ہے کہ تنہائی میں رشیدہ کو سالگرہ کی مبارکباد دے۔

اور رشیدہ تمام دن کی مصروفیت سے تھک کر اپنے کمرے میں ایک آرام کرسی پر لیٹی آنیوالی خوشی کے خیال میں مگن ہے۔ رہ رہ کر اسلم کا وجیہ و بشاش مکھ چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے اور وہ خود اپنے سے شرما کر جھیپ جاتی ہے۔ رشیدہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی کہ اس کی پیاری دایہ کریمن اس کے قریب آئی اور پیار سے کر بولی۔

کریمن۔ میری بچی خدا تمھیں ہزاروں برس سلامت رکھے سیکڑوں خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ یہاں کیوں لیٹی ہو۔ کیا تھک گئیں؟

رشیدہ۔ ہاں انّا اماں میں دن بھر کی محنت سے خاصی تھک گئی ہوں چاہتی ہوں کہ زیور کپڑے اتار کر سونے کا لباس پہن لوں اور جلد سو جاؤں۔

کریمن۔ بیٹیا کیا اتنا تھک گئی ہو کہ اسلم سے بھی نہ ملوگی۔

رشیدہ۔ (آنکھیں جھکا کر) مجھے تو اب ان کے سامنے جاتے شرم آتی ہے۔

کریمن ۔ میری جان ایسا نہ ہو کہ تمھاری شرم ان کی محبت کم کر دے ۔

رشیدہ ۔ نہیں نہیں انّا ایسا نہیں ہے وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ شاید ہی کسی نے کسی کو اتنا چاہا ہوگا ۔

کریمن ۔ کیا تمھیں پکا یقین ہے ؟

رشیدہ ۔ بے شک ۔

کریمن ۔ اچھا بیٹی اتنی تکلیف کرو کہ سونے سے پہلے میری ایک بات سن لو

رشیدہ ۔ ہاں ہاں کہو کیا کہنا ہے ۔

کریمن ۔ بی بی میں نے اٹھارہ برس سے یہ راز اپنے سینے میں دفن کر رکھا ہے میرا ارادہ تھا کہ اسے تم پر کبھی ظاہر نہ کروں مگر اب مجھ سے زیادہ ضبط نہیں ہوتا ۔ مجھے یقین ہے کہ ہفتہ بھر بعد اسلم میاں سے تمھاری شادی ہو جائیگی اور تمھاری آئندہ زندگی کی طرف سے پورا اطمینان ہو گیا ہے ۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تم پر اس راز کو ظاہر کر دوں ۔

رشیدہ ۔ (بیقراری سے) انّا خدا کے لئے تمہید چھوڑ کر اصل مطلب بیان کرو ۔ میرا دم الٹا جاتا ہے ۔

کریمن ۔ (آہستہ آہستہ رازدارانہ لہجہ میں) بات اصل یہ ہے کہ تم احمد کاظمی اور ان کی بیوی کی اولاد نہیں ہو بلکہ ۔ ۔ ۔ ۔

رشیدہ ۔ (کرسی سے اچھل پڑتی ہے) ہیں ہیں ! کیا کہا پھر تو کہنا میں اپنے ماں باپ کی بیٹی نہیں ہوں (غصہ سے لال ہو کر طنزیہ) تو کیا پھر تمھاری ہوں ؟

کریمن ۔ (اطمینان سے) ہاں میری جان تو میری بیٹی ہے ۔ جس دن تم پیدا ہوئیں اسی دن احمد میاں کے بھی مری لڑکی پیدا ہوئی ۔ دائی بڑی پریشان ہوئی مجھ سے کہا کہ اگر میں زچہ سے کہتی ہوں کہ مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کا بچنا مشکل ہو جائیگا ۔ میں نے کہا تم میری بچی لے جاؤ اور مری ہوئی بچی مجھے دیدو ۔ اس نے ایسا ہی کیا دو چار دن بعد بیگم کا انتقال ہو گیا ۔ میرا ارادہ تھا کہ جب وہ اچھی ہو جائیں گی تو ان سے اصل حال کہہ دونگی ۔ ان کے بعد احمد میاں سے میں نہ کہہ سکی کیونکہ میں ان کے غصہ سے ڈرتی تھی ۔ اسی عرصہ میں بچاری دائی بھی مر گئی اور میرے سوا کوئی اس راز کا جاننے والا نہ رہا میرے میاں یعنی تمھارے باپ تمھاری ہونے سے دو مہینے پہلے مر چکے تھے ۔

رشیدہ اس تمام عرصہ میں پاگلوں کی طرح کریمن کو تک رہی تھی ۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ عورت سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ ۔ کچھ دیر تک وہ بالکل ساکت بیٹھی رہی اور پھر یکایک غصہ سے کانپ کر بولی "یہ مکر و فریب ۔ یہ دغا بازی ، لعنت ہے تم پر ، ہائے میرا سارا عالی نسبی کا غرور خاک میں مل گیا ہائے عزت و اسلم دونوں ہاتھ سے گئے ۔

کریمن ۔ پیاری بیٹی یہ کیا کہہ رہی ہو ۔ احمد میاں تمھیں جان سے زیادہ چاہتے ہیں اور یہی حال اسلم کا ہے ۔ بیٹی تم خفا کیوں ہوتی ہو ۔ میں نے تو یہ سب تمھارے ہی بھلے کو کہا ہے تم اس قدر دولت کی مالک ہو کہ اسلم کے پاس اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے ۔

رشیدہ ۔ (بیقراری سے) کیا تم سمجھتی ہو کہ میں دغا بازی سے اسلم کی بیوی ہوں گی ؟ جس دولت کا در اصل وارث وہ ہے اس پر قابض رہونگی ۔ اس کی ذات میں بٹہ لگاؤنگی ؟ ابھی جا کر سب حال اس سے کہتی ہوں ۔ اس وقت اس کی محبت کا امتحان بھی ہو جائیگا ۔ بہت دعویٰ کرتا تھا کہ مجھے تیری ذات خاص سے الفت ہے ۔ اب حقیقت معلوم ہو جائے گی ۔

کریمن ۔ (اس کے پاؤں پکڑ کر) خدا کے لئے بچی میرے سفید چونڈے کی لاج رکھ لے نہیں تو تیری ماں بے عزتی سے نکالی جائے گی ۔

رشیدہ ۔ (اسے اٹھا کر) کچھ بھی ہو تم میری ماں ہو تمھیں یہ زیبا نہیں کہ میرے پاؤں پکڑو ۔ مگر اماں سوچو تو سہی ۔ میں اسلم کے ساتھ کیسے فریب کر سکتی ہوں ۔ اگر تم پر آفت آئی تو تمھاری بیٹی پر بھی آئیگی اور ہم دونوں مل کر اس مصیبت کو برداشت کریں گے ۔ آہ ماں کے گناہ کا کفارہ بدنصیب بیٹی ادا کرے گی ۔ مگر میں اسلم کے ساتھ دغا نہیں کر سکتی اگرچہ اس کی جدائی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی ۔

یہ کہہ کر رشیدہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا ۔ اور زار و قطار رونے لگی ۔ کریمن نے اسے پیار کیا ۔ دلاسہ دیا ۔ اور پھر دونوں ماں بیٹی سچی اور اصلی محبت کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگیں ۔ تھوڑی دیر اسی حالت میں گزری ۔ یکایک رشیدہ کھڑی ہو گئی ۔ سب زیور ایک ایک کر کے اتارے ۔ بھاری کپڑے اتار کر سفید لباس پہن لیا ۔ اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی ۔

اسلم اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ رشیدہ سے کیسے ملاقات کروں ۔ کہ اس نے دیکھا رشیدہ ایک سفید ساڑھی پہنے چلی آ رہی ہے جسم پر زیور کا نام نہیں ۔ ہاں بائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک سرخ رنگ کی انگوٹھی ضرور ہے ۔ چہرہ بھی بالکل سفید ہو رہا ہے ۔ اسلم جس نے ہمیشہ رشیدہ کو زیور کپڑے سے آراستہ دیکھا تھا اس سادی وضع میں دیکھ کر اور بھی مفتوں ہو گیا ۔ اور جلدی سے بڑھا ۔ ایک آرام کرسی کھینچ کر بولا ۔

اسلم ۔ رشیدہ پیاری زہے قسمت کہ آج تم اپنے چاہنے والے کے پاس خود سے آئیں ۔ آؤ بیٹھو !

رشیدہ ۔ (کانپتی آواز میں) اسلم میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں ۔ مجھے تم سے ایک اہم بات کہنی ہے اور بس ۔

اسلم ۔ (ہنس کر) کیا اہم بات بیٹھ کر نہیں کر سکتے ؟

رشیدہ ۔ (ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر) اسلم لو یہ انگوٹھی ۔ میں تمہیں یہ نشانی واپس کرنے آئی ہوں ۔ میں اس قابل نہیں کہ تم مجھ سے شادی کرو ۔

اسلم ۔ (بھونچکا ہو کر) کیا مطلب ؟

رشیدہ ۔ (بڑے ضبط سے کام لے کر) اسلم میں تمہارے چچا کی بیٹی نہیں ہوں ۔ ان کی بچی مری ہوئی پیدا ہوئی تھی ۔ کریمن نے مجھے اس بچی کی جگہ رکھدیا تھا ۔ ان کی جائداد کے وارث تم ہو ۔ میں آج تک تمہارے حق پر ناداستہ طور پر قابض رہی ۔ میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

اسلم ۔ (حیران ہو کر) رشیدہ تم کیا کہہ رہی ہو ۔ (پھر قہقہہ لگا کر) اچھا سمجھ گیا تم میرا امتحان لے رہی ہو ۔ بھئی لاؤ ہاتھ مان گیا تمہارے دماغ کو مگر یاد رکھو اسلم ہر حال میں ثابت قدم ہے ۔ وہ تم سے تمہاری دولت یا نسب کی وجہ سے محبت نہیں کرتا ۔

رشیدہ ۔ (بیقرار ہو کر) اسلم خدا کے لئے اسے مذاق نہ سمجھو ۔ یہ بالکل اصلیت ہے ۔ میری اصلی ماں نے خود مجھ سے کہا ہے ۔

اسلم ۔ (رشیدہ کی حالت دیکھکر حیران ہو جاتا ہے) ۔ رشیدہ تم مجھے پاگل بنا دوگی ۔ کیا کہہ رہی ہو ۔ کون ہے تمہاری ماں ؟

رشیدہ ۔ (سر جھکا کر) کریمن ۔

اسلم بھونچکا ہو کر رشیدہ کی صورت دیکھتا ہے کہ اتنے میں کریمن آکر اس کے قدموں میں گر جاتی ہے اور سارا واقعہ اسے سناتی ہے ۔ اسلم یہ سب سن کر سر جھکا لیتا ہے اور کسی گہری سوچ میں چلا جاتا ہے ۔ رشیدہ کچھ دیر امید وبیم کی حالت میں اسلم کو دیکھتی رہتی ہے اور پھر یہ کہہ کر "اسلم مجھے معاف کرنا مجھے پہلے سے کچھ معلوم نہ تھا خدا حافظ" چپ چاپ نکل جاتی ہے اور کریمن کی کوٹھڑی میں جا کر ایک پلنگ پر گر پڑتی ہے ۔ اس کے جانے کے بعد اسلم نے سر اٹھایا تو رشیدہ کو نہ دیکھکر گھبرایا کریمن سے بولا "کریمن میری رشیدہ کہاں ہے ۔ وہ کہاں چلی گئی ؟"

کریمن ۔ بیٹا شاید باہر گئی ہے ۔

اسلم ۔ وہ کیوں گھبراتی ہے ۔ اسلم کی محبت اب بھی اس کے ساتھ ویسی ہی ہے ۔ اگر پہلے نہیں تھی تو وہ اب اس گھر کی مالک بن جائے گی ۔

اسلم نے بات پوری نہ کی تھی کہ اس کی ماں سیدہ، احمد اور محمود کمرے میں داخل ہوئے جو اتفاق سے برابر والے کمرے میں سب سن رہے تھے ۔ سیدہ غصہ سے لال ہو رہی تھی ڈانٹ کر بولی :۔

سیدہ ۔ خبردار اسلم جو تو نے اس مُردار سے کوئی وعدہ کیا ۔ لو صاحب ہمارا ہی نمک کھائیں ہم ہی سے دغا کریں ۔ کیا میں اس نوکرنی کی بیٹی کم ذات کو بیاہ کر اپنی ذات میں بٹہ لگاؤنگی ۔"

اسلم ۔ (غصہ کو پی کر) اماں جان ذرا صبر سے کام لیجئے ۔ سوچئے تو رشیدہ کا اس میں کیا قصور ہے ؟

محمود ۔ بیٹا میں مانتا ہوں کہ رشیدہ بے قصور ہے ۔ مگر تم اس سے شادی کیسے کر سکتے ہو ۔

اسلم ۔ آخر کیوں نہیں کر سکتا ؟

محمود ۔ ایک نوکر کی لڑکی، ذات کی پٹھانی کیسے میری بہو بن سکتی ہے ؟ بھائی صاحب کیا میں غلط کہتا ہوں ؟

احمد ۔ (جو اب تک بالکل خاموش اور بہت متاثر تھے) محمود مجھ سے کچھ مت پوچھو یہ ایسی بات ہے جس کا مجھے گمان بھی نہ تھا ۔ رشیدہ چاہے میری لڑکی ہو یا نہ ہو وہ اب بھی میری جان کے برابر ہے ۔ میں نے اسکو جس طرح پالا ہے اس کی کیا تمھیں خبر نہیں ؟ وہ لڑکی مجھے جان سے بڑھکر عزیز ہے ۔ خواہ وہ میری ہو یا نہ ہو ۔ جائداد بے شک اسلم کو ملے گی رہی شادی اس کے متعلق تم جانو اور اسلم مجھ سے کوئی واسطہ نہیں اس معاملہ میں میں کچھ نہ بولوں گا میں لڑکی کا باپ ہوں ۔

سیدہ ۔ جائداد تو خیر اسلم کو ملے ہی گی ۔ مگر اس کی شادی کیسے رشیدہ سے ہو سکتی ہے ۔ رشیدہ کی شادی اس کے کسی ہم قوم سے کر دیجائیگی ۔

اسلم ۔ لیکن اماں جان میں کیوں رشیدہ سے شادی نہیں کر سکتا ؟ میں ذات پات کا قائل نہیں ۔ رسول اکرمؐ نے اپنی پھوپھی کی شادی ایک آزاد شدہ غلام سے کی تھی ۔ انھوں نے نہ ذات پات کی قید لگائی تھی نہ امیر غریب کی ۔ ہندوؤں سے آپ لوگوں نے یہ رسمیں سیکھی ہیں ۔ میں مسلمان ہوں اس کی پابندی نہیں کر سکتا ۔

سیدہ ۔ کچھ بھی ہو مگر یہ شادی نہیں ہو سکتی ۔

اسلم ۔ اماں میں کہتا ہوں یہ شادی ضرور ہوگی ۔

سیدہ ۔ (رو کر) اسلم یاد رکھ میں تیری ماں ہوں اگر تو نے میری مرضی کے خلاف شادی کی تو عمر بھر تیری صورت نہ دیکھونگی ۔ اور مرتے وقت دودھ نہ بخشوں گی ۔

رشیدہ ۔ (جو احمد کی بلوائی ہوئی آئی تھی اور دروازہ میں کھڑی

سب سن رہی تھی، اسلم میں نہیں چاہتی کہ تم میری وجہ سے اپنی ماں کو ناراض کرو۔ میں خود اس خاندان میں نہ آؤنگی جو میری عزت نہ کرے۔

اسلم۔ اچھا اماں جان آپ ہی کی ضد سہی میں رشیدہ سے بیاہ نہ کرونگا مگر خوب سمجھ لیجئے کہ کسی اور سے بھی نہ کروں گا۔ یہ کاظمی خاندان بے نام ونشان رہ جائیگا۔

سیّدہ۔ (غصّہ سے چلّاکر) بہت اچھا ہوگا۔

رشیدہ۔ (جو برسوں کی بیمار معلوم ہوتی ہے) اسلم خداحافظ قیامت میں ہماری تمھاری ملاقات ہوگی۔ (احمد سے) اباجان گو میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں مگر میرے دل میں آپ کی وہی محبت ہے جو اب سے پہلے تھی۔ اگر آپ نے اجازت دی تو کبھی کبھی قدمبوسی کو حاضر ہوا کرونگی (کریمن کا ہاتھ پکڑکر) اماں چلو۔

احمد۔ (بڑھ کر رشیدہ کو سینے سے لگاتے ہیں) میری بچی میری جان تو کہاں جانے پر آمادہ ہے۔ کیا تو اپنے باپ کو چھوڑ کر چلی جائیگی؟ اسلم سے تجھے کیا مطلب۔ تو میری بیٹی ہے میرے پاس رہیگی۔

محمود۔ رشیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرکر) رشیدہ آج تک تو میری بھتیجی تھی، اور اب میری پیاری بہو ہے۔ (بیوی سے) سیّدہ آؤ اور غصّہ کو تھوک دو۔ اب تک ہمیں خاندانی غرور نے اندھا کر رکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو ہماری ہدایت کرنی منظور ہے۔ اس نے شاید یہ آخری موقع دیا ہے کہ اب تک جو ہم لوگ اسلام کے احکام کے خلاف ذات پات کی قید رکھتے تھے اسے دور کردیں۔ آؤ اپنی بہو کو پیار کرو۔

سیّدہ۔ مگر.....

محمود۔ اگرمگر کچھ نہیں۔ رشیدہ سی بہو تمام دُنیا میں نہ ملے گی اور کچھ دن بعد تمھارے خاندان کا نام ونشان تک مٹ جائیگا۔

سیّدہ۔ (بادل ناخواستہ رشیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور رسماً کہتی ہے) خدا تم دونوں کو شاد و آباد رکھے۔

محمود کاظمی نے آگے بڑھ کر رشیدہ کا ہاتھ اسلم کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور بھائی سے بولا۔ بھائی صاحب اب یہاں سے چلئے، کل ان دونوں کا عقد کردیا جائیگا۔ اب اس کام میں دیر نہ کرنا چاہیئے سب لوگ باہر چلے جاتے ہیں۔

رشیدہ جو یہ سب کچھ خواب کی سی حالت میں دیکھ رہی تھی اسلم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہوجاتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

اسلم۔ پیاری رشیدہ میری اپنی رشیدہ اب کیوں روتی ہو؟

رشیدہ۔ (کانپتی آواز سے) اسلم میرے اسلم یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ اب مجھے یقین آگیا کہ تمھیں مجھ سے سچی محبت ہے۔

یہ کہکر اسلم کے کاندھے پر سر رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کرلیتی ہے۔ اسلم بڑی محبت سے سہارا دے کر اُسے آرام کرسی پر لٹادیتا ہے۔ اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے۔

* * * * *

صالحہ عابد حسین

بسلسلہ صفحہ ۲۲۴

میکے چلی گئی۔ تم سے سب ناراض ہیں۔ میں نے کہا کمرہ کھولو۔ وہ بولی کنجیاں میرے پاس نہیں ہیں۔ میں پریشان تھی کہ اب کہاں جاؤں۔ آخر ایک نوکروں کی کوٹھڑی میں جو ہمارے مکان کے ساتھ ہی تھی رہنے لگی۔

ایک دن مکان میں کچھ آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ میں نے سوچا وہ زمینداری سے واپس آگئے ہوں گے۔ اب انھیں سارا حال معلوم ہوگا تو وہ مجھے لینے کے لئے ضرور آئیں گے۔ مگر افسوس وہ میں پڑی سوچتی رہی کہ کیا وفا کا یہی انجام ہے۔ میں نے جن پر بھروسہ کیا، کیا مجھے وہ اتنے جلد بھول گئے اور اس بُری طرح بھول گئے میں اندر جانا چاہتی تھی کہ نوکرانی نے روک دیا۔ اس نے کہا "ترہنیا کرنیوالی عورت اس دہلیز کے پار نہیں جاسکتی"۔ میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ کون آیا ہے؟" اس نے بتایا کہ میری ساس اور بابو وغیرہ آگئے ہیں۔ میں نے کہا ان سے کہو کہ میں بلاتی ہوں۔ نوکرانی نے جاکر کہدیا۔ جواب میں بابو نے ایک چٹ لکھی جو یہ تھی:۔

"مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے مگر کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دُنیا کے سامنے بے بس ہوں۔ میں نے تو تمھیں نہیں چھوڑا لیکن تمھیں اپنے گھر بھی دوبارہ نہیں بُلاسکتا تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

میں نے یہ پڑھا تو سر چکرانے لگا۔ اپنے پتی دیو کی اس بے رُخی پر افسوس بھی کیا اور دل ہی دل میں کہا "پوچھتے ہیں کیا کروں جب مرد ہوکر میرے لئے کچھ کام نہیں کرسکتے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں کہ کیا کروں تم تو مرد ہو اور عورت کمزور ہے پھر بھی اسی سے پوچھتے ہو کیا کروں! میں تو طوفان میں گھری ہوئی ہوں تم ہی مجھے بتاؤ کیا کروں۔ میں نے تو تم پر بھروسہ کیا تھا اور تم مجھے سماج میں پاپی کرکے چھوڑ گئے میں تم سے پوچھتی ہوں کیا کروں۔

ظفر قریشی

بنت البحر

ساحل بہت زیادہ کٹا پھٹا تھا اور جگہ جگہ چھوٹے بڑے غار اس قدر زیادہ تعداد میں نظر آتے تھے گویا کسی نے مصلحتاً کھود کھود کر بنائے ہیں۔ ان میں سے اکثر سمندری گھاس، گھونگوں، مری ہوئی ننھی ننھی مچھلیوں اور سنگریزوں سے لبریز تھے۔ ساحل پر اُگنے والی بعض خودرو بیلیں کسی اونچی چیز پر نہ چڑھ سکنے کے باعث نیچے کے رُخ اس طرح لٹک آئی تھیں گویا تشنگی بجھانے کے لئے پانی کا منہ چوم لینا چاہتی ہیں۔ کہیں کہیں بیلوں کی ان قدرتی پردوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے غار چھپے ہوئے تھے جن کے وجود کا علم صرف اس وقت ہوتا جب مد و جزر کے ساتھ پانی کی موجیں بل کھا کھا کر چادرِ گیاہ کی درزوں اور سوراخوں میں سے اندر گھستیں اور باہر نکلتیں۔ اور اس آمد و شد میں کچھ پانی کے زور سے اور کچھ ہوا کے دباؤ کے باعث مختلف النوع سُروں میں باجہ سا بجنے لگتا تھا۔ بڑے غاروں میں آواز گونجتی بھی تھی لیکن چھوٹے غاروں میں ہلکی ہلکی سسکیاں سی سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی پانی پر چھائے ہوئے بلند درخت سے کسی پھل کا ٹوٹ پڑنا۔ یا ننھی ننھی مچھلیوں کا کیڑوں کو پکڑنے کی جستجو میں سطحِ آب سے سر بلند کر کے پھر ڈبکی لگا لینا اس مسلسل بحرِ نغمہ میں رنگ مستزاد پیدا کر دیتا تھا۔ پھر عموماً صبح کے وقت لاکھوں پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور ہزاروں طیور کے شہپروں کی پھڑپھڑاہٹ جب شریکِ موسیقی ہوتی تو اچھی طرح محسوس ہونے لگتا گویا بھیرویں کی لے پر پاؤں کی ضربات سے تال دے کر کوئی رقص بھی کرتا جا رہا ہے۔ عقب میں پہاڑوں کی بلندیاں جنھیں دامن کی سینیوں نے اٹھا رکھا تھا۔ وادی میں شگوفوں کا تبسم جو اچھی طرح کھلنے سے پہلے ہی جھلکنے لگتا تھا۔ غنچوں کی مہک جو مرکز سے جدا ہونے کے بعد بھی وہیں پھیلی رہتی تھی، پھولوں کے مختلف رنگ جو صبح کی سپیدی، رات کی سیاہی، شفق کی سُرخی، بادل کی دُھند، بجلی کی چمک، چاندی کی روپہلی اور سورج کی سُنہری کرنوں سمو کر جمائے گئے تھے۔ اور ان سب سے زیادہ سبزہ کی ترادت جو ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں کھُبی جاتی تھی ——— ہر چند اُن میں سے کوئی لطافت بھی وہاں کی موسیقی میں ممتزج نہ ہوتی تھی۔ تاہم ماحول کو زیادہ سے زیادہ شاعرانہ بنانے میں برابر کی شریک تھی۔

ضرورت تھی کہ ایسے پُر فضا مقام کو فرشتوں کی معصومیت یا آسمانی دیویوں کی [illegible] کہ اس جگہ کو جو یکسر موضوعِ شعر تھی، بنات البحر کی آماجگاہ بنا رکھا تھا جن کے حُسن کی ہلاکت [illegible] فرسا ہوں سے تمام سیاح واقف تھے۔ اور جن کے خونچکاں افسانوں کا اشارۃً تذکرہ ادبیاتِ عالم میں زیبِ داستان سمجھا جاتا تھا۔

ایک صبح کا ذکر ہے :—

جب تحت البحر سے اٹھنے والی طوفانی موجیں ساحلی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر دم توڑ چکیں، جب سمندر کا کف بے حس و حرکت ہو کر ایک کنارے لگ گیا۔ جب اپنے نشیب میں پہاڑوں کو ڈبو لینے والے عمیق گرداب اُبھر کر سطحِ آب کے متوازی ہو گئے۔ جب ہوا کے تُند و تیز جھونکوں نے نسیمِ سحر سے زیادہ نازک خرامی اختیار کر لی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں سکون و طمانیت کے آثار نظر آنے لگے تو ملاحوں نے خوش ہو کر لنگر اُٹھایا اور بادبانوں کی ڈوریاں کھول دیں۔ کچھ دیر پہلے بے کسی کے عالم میں ہچکولے کھانے والا جہاز آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

شہرۂ آفاق ساحرہ سرسی نے سمندر کے اس مخصوص حصے کے جس خطرناک ماحول سے آگاہ کیا تھا اس کا تصور یولیسیز کے دماغ [illegible] ہوا تھا۔ وہ حُسن کا پرستار اور موسیقی کا دلدادہ نہ سہی لیکن اُن کی بے پناہ قوتوں اور حشر سامانیوں کے تسلیم کرنے میں اُسے قطعی تامل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ [illegible] کی ایک گُریز پا جھلک اور نغمہ کا ایک خفیف ارتعاش حد سے زیادہ صمیم القلب انسان کے دل میں بھی لغزشیں پیدا کر سکتا ہے۔ اُس کی نگاہیں وہ نگاہیں جو عقاب سے زیادہ تیز اور دُوربین تھیں ——— اُفق کے آخری سرے پر تلاش و تجسس میں سرگرداں تھیں۔ حتیٰ کے جب اُس کے شبہات نے [illegible] کی صورت اختیار کر لی اور آئندہ رُونما ہونے والے حادثات کا امکان قطعی طور پر محسوس ہونے لگا تو اس نے ساحرہ کی بتائی ہوئی تدبیر کو عمل میں لانے کے لئے پوری احتیاط سے تیاری شروع کر دی۔

دبیز کپڑے کی چوڑی چوڑی پٹیاں پھاڑ کر اس نے تمام ملاحوں کی آنکھوں پر لپیٹ دیں۔ تاکہ اُن کی نظریں گرد و پیش کے ہوش [illegible] سے مُتاثر نہ ہو سکیں۔ اور پگھلا ہوا موم کانوں میں بھر کر عارضی طور پر اِن سب کو سماعت سے محروم کر دیا تاکہ بیرونی نغمہ کی کوئی خفیف سے خفیف

ے بھی ان کی رگوں میں خون کی گردش کو تیز تر نہ کر سکے۔ پھر اپنے جسم کو مضبوط رسیوں کے ذریعہ چوبی مستول کے ساتھ جکڑوا لیا۔ اس طرح کہ اگر وہ خود بھی کوشش کر کے اس قید و بند سے آزاد ہونا چاہے تو اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ تاہم اس نے نہ اپنی آنکھوں پر کپڑا لپیٹا اور نہ کان بند کئے۔ کیونکہ وہ ذاتی طور پر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حسن کا جادو، موسیقی کا سحر، اور سرمستی شباب کی فسوں کاری کسے کہتے ہیں۔

ساتوں بہنیں باہر نکل آئیں اور چٹان پر بیٹھ گئیں۔ کیونکہ انھوں نے بھی جہاز کو آتا دیکھ لیا تھا۔ ان کا نصف بالائی جسم بالکل عورت کی مانند تھا لیکن حصۂ زیریں مچھلی سے مشابہ۔ پانی میں تیرنا ان کے لئے آسان بلکہ عینِ فطرت تھا۔ لیکن خشکی پر بھی وہ ہاتھوں کے بل کچھ دور تک چل کر جا سکتی تھیں۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر کے خوش ہونے لگیں کہ عرصۂ دراز کے بعد انسان کا خون اُن کے کام و دہن کی لذت بنے گا۔ وہ غیر فانی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود تھوڑی بہت غذا جسمانی تحفظ کے لئے ضروری تھی۔ آبی جانوروں سے لے کر ہوا میں پرواز کرنے والے پرندوں تک اور یہ بھی میسّر نہ آنے کی صورت میں درختوں سے گرے ہوئے پھل، خشک پتّے، گلی سڑی سمندری گھاس، غرض ہر چیز ان کی غذا بن سکتی تھی۔ لیکن انسان کا خون انھیں سب سے زیادہ مرغوب تھا۔ کیونکہ اسے چوسنے کے بعد آسودگیٔ شکم کے علاوہ سرمستی و سرشاری کی کیفیات بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ ان جذبات کی تسکین کے لئے کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو اپنے تیز ناخنوں سے نوچتی، دانتوں سے کاٹتی اور آخر کار بیہوش ہو کر ساحل کے قریب ہی گر جاتی تھیں۔ کیونکہ ہم جنس ہونے کے باعث صنفی تعلقات ان میں قائم ہی نہ ہو سکتے تھے۔ تاہم وہ بے خودی کی ان کیفیات ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتی تھیں۔ اسی لئے عرشہ جہاز پر انسانی صورتوں کے نظر آتے ہی ان کے جسموں میں حیاتِ تازہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔

شکار کو پھانسنے کی اُن کے پاس صرف یہی ایک تدبیر تھی کہ وہ گلے کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے نغمہ سرائی شروع کر دیں۔ جب تک جہاز دُور رہا، وہ خاموشی کے ساتھ انتظار کرتی رہیں۔ لیکن جب فاصلہ صرف اتنا رہ گیا کہ ان کے قیاس کے مطابق آواز وہاں پہنچ سکے تو انھوں نے گانا شروع کر دیا۔ ابتدا گنگنانے سے ہوئی اور بڑھتے بڑھتے تانیں اتنی بلند ہو گئیں کہ ان کے ارتعاش سے یولیسیز کا جسم سر سے پاؤں تک کپکپا اُٹھا۔ جلدی ہی ضبط و تحمل کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بیتاب ہو کر وہ چلایا۔ رسیاں توڑنے کی کوشش کی۔ سر ٹپکا۔ پاؤں لکڑی کے تختوں پر مارے۔ مگر بے سود۔ وہ رسّی سے جکڑا ہوا تھا۔ کشمکش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

قریب کا ایک شخص جس کی آنکھوں سے پٹی کسی قدر سرک گئی تھی، یولیسیز کی اس مجنونانہ حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا نام یوفورین تھا۔ اس نے قیاس لگایا کہ جب یولیسیز جیسے راسخ عزم رکھنے والے انسان کا یہ حال ہو گیا ہے تو خدا جانے وہ موسیقی کس نوع کی ہوگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ایسے ت میں کانوں کو سماعت سے محروم رکھنا نفس پر سب سے بڑا ظلم کرنا ہے۔ بنات البحر کا افسانوی حسن اور ان کی روایتی موسیقی اس کے علم میں تھی ۔ ن دوسروں سے سُن کر اور کتابوں میں دیکھ کر۔ لہٰذا ذاتی مشاہدے کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ اپنے سردار کے احکام کی خلاف ورزی کر کے ے آنکھوں کی پٹی کھول دی، کانوں کا موم نکال دیا۔

روح پرور تانیں سینے کو برماتی ہوئی دل میں پیوست ہو گئیں۔ حسن کی رنگینیاں تحلیل ہو کر دل میں اُتر گئیں۔ حسن کا جادو، موسیقی کا سحر اور مستی شباب۔ ں سازی ایک طرف یولیسیز کو آپے سے باہر کر رہی تھیں اور دوسری طرف یوفورین کو بے قابو۔ مگر یولیسیز خود اختیاری قید و بند میں پھنسا ۔ اور "خود کردہ را علاجے نیست"، کے مصداق وہ ذاتی کوششوں سے رہائی بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔ تاہم یوفورین آزاد تھا۔ اس کے لئے کوئی ب نہ تھی۔ اسے کوئی روک نہ سکتا تھا۔ اس نے چپّوؤں کو سمندر کی نذر کیا اور خود بھی پانی میں کود پڑا۔ یولیسیز نے چاہا کہ چیخ کر چلا کر اُسے ے۔ مگر نغموں کی تانوں کے سوا کوئی دوسری آواز بھاگنے والے کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ اسے نہ یہ خوف تھا کہ سمندر کا کوئی خونخوار جانور ہا ہے اور نہ یہ اندیشہ تھا کہ اس کا جسم کسی پوشیدہ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتا ہے۔ وہ فضائی تیر کی مانند تیزی سے تیرتا ہوا مقصود تک پہنچ گیا۔

جب شکار جال میں پھنس کر قریب آ گیا تو جل دیویوں کے گیت ختم ہو گئے۔

ہیبت ناک چیخیں اُن کے منہ سے نکلنے لگیں۔ وہ بھوکی شیرنی کی مانند یوفورین پر اس طرح جھپٹیں گویا ایک ہی لقمہ میں ہضم کر جائینگی۔ نے اپنے تیز تیز ناخنوں سے اس کے جسم کو کئی جگہ سے نوچ ڈالا۔ اور ساتھ ہی دانت جیسے جوہی کیلوں سے زیادہ نوکیلے اور چمکدار تھے اس گی میں پہلی مرتبہ اس یونانی نوجوان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ شاعروں کا خیال صحیح ہے جو کہتے ہیں کہ گلاب کا کوئی پھول بغیر کانٹے

کے نہیں ہوتا۔

یوفوزین کو عورت ذات سے بہت کم واسطہ پڑا تھا۔ تاہم وہ نسوانی فطرت کی اس کمزوری کو بخوبی جانتا تھا کہ عورت کے حسن و جمال کی تعریف کرنا گویا اس پر حاوی ہو جانا ہے۔ ہرچند وہ بنات البحر صنف نازک میں سے نہیں تھیں اور نہ ہی ان کا شمار انسانی مخلوق میں ہو سکتا تھا۔ تاہم ان کے نصف بالائی جسم کو عورت نما دیکھ کر یہ گمان ہو سکتا تھا کہ شاید نسوانی فطرت کا کچھ نہ کچھ عکس اُن کی ذہنیت میں موجود ہوگا۔

اسی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یوفوزین نے ایک جل دیوی کو جو اپنی بہنوں میں نسبتاً زیادہ حسین، زیادہ کم سن اور بہ ظاہر زیادہ رحمدل معلوم ہوتی تھی مخاطب کر کے کہا:۔

"میں بہ خوشی مرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس لئے کہ تمہارے سماوی نغمے سُن لینے کے بعد کسی کے دل میں زندہ رہنے کی آرزو باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ امر میرے لئے زیادہ باعثِ مسرت ہے کہ میرا خون ان لبوں سے چوسا جائیگا۔ جن پر الہامی موسیقی کی سرمدی تانیں رقص کرتی ہیں۔ لیکن مجھے ہلاک کرنے کے لئے اگر سب سے پہلے تیرے نازک ہاتھوں کو جنبش ہو۔ اور میرے خون کا سب سے پہلا قطرہ تیرے ذوقِ خون آشامی کی تسکین کرے تو یقیناً مرنے کے بعد میری روح موسمِ بہار کی سہانی رات میں دیکھے ہوئے خواب کی ابدی لذت میں سرشار رہیگی۔ کیونکہ تو ایسے غنچہ کی مانند ہے جو آمدِ بہار سے قبل ہی ڈالی پر نظر آتا ہے۔ اور موسم ختم ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح شگفتہ، عطر بیز اور متبسم رہتا ہے۔ شاید تیری تخلیق میں کفِ سمندر کے علاوہ آسمان کے شاعرِ اعظم کا کچھ حسین تخیل بھی صرف ہوا ہے۔ لہٰذا آ، اور اگر ممکن ہو سکے تو مجھے سینہ فگار کرنے سے پہلے اپنے حیات آفریں لبوں کا ایک بوسہ دیدے کیونکہ مجھے تجھ سے محبت ہے"

غیر ممکن تھا کہ ان الفاظ کا جادو سننے والے کے دل پر نہ ہوتا۔ اس نے سر اٹھایا اور اس عزم کے ساتھ جو ایک عاشق کے دل میں اپنے محبوب کی خاطر اپنی ہستی کو مٹا دینے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اس نے کسی قدر تحکمانہ لہجہ میں باقی چھ بہنوں سے کہا "تم پرے ہٹ جاؤ۔ یہ شکار صرف میری ملکیت میں رہے گا"

بالکل خاموشی کے ساتھ اس کی بہنیں وہاں سے چلی گئیں۔ ممکن ہے اس سب سے چھوٹی بہن کا اقتدار سب سے زیادہ ہو۔ یا آپس میں یہ مفاہمت ہو کہ اگر کسی ایک شکار کو کوئی بہن اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہے تو دوسری اعتراض نہ کریں۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ یوفوزین صرف ایک جل دیوی کے رحم و کرم پر رہ گیا جس کا نام لیوکوسیہ تھا۔

بہنوں کے چلے جانے کے بعد اُس نے کہا: "اے اجنبی! تو کون اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ تجھ جیسا کوئی انسان آج تک اس طرف سے نہیں گذرا۔ جس کے محبت بھرے الفاظ ہمارے غیر فانی دلوں میں محبت کی خاطر فنا ہو جانے کی ترغیب دیتے۔ کسی سے محبت کرنا ہماری فطرت ہی کے خلاف ہے لیکن یقین مان کہ میں تجھ جیسی ہو کر تیرے ساتھ رہنے کے عوض اپنی ابدی زندگی قربان کر سکتی ہوں۔"

بنت البحر کے لئے انسان بن جانا غیر ممکن تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی والہانہ محبت جس میں نفس کی ہوا و ہوس کا نام تک نہ تھا یوفوزین کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ ان کا تمام دن ایسی دلچسپیوں میں بسر ہوتا جن میں سرشار رہ کر یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کس سمت سے طلوع ہو کر کس سمت میں غروب ہوا ہے۔ صبح و شام وہ دونوں کئی گھنٹے تک ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے سمندری موجوں پر پڑے رہتے۔ یوفوزین ملاح ہونے کے باعث اچھا تیراک تھا۔ لیکن لوکوسیہ نے ایسے ڈھب سکھا دیئے تھے کہ فنی استعداد سے قطع نظر پانی میں رہنا ایک حد تک اس کی فطرت میں شامل ہو گیا تھا۔ جب ان لہروں سے دل گھبراتا تو دونوں مرغزار کے کسی سایہ دار کنج میں جا لیٹتے۔ فیاضِ قدرت کے کھلائے ہوئے پھول اس قدر مقدار میں جمع کر لئے جاتے کہ ان سے ایک نہایت نرم اور آرام دہ سیج تیار ہو جاتی۔ پھر گانا شروع ہوتا۔ اور اس قدر تسلسل کے ساتھ کہ وہ داد موسیقی دیتے دیتے تھک جاتا۔ مگر وہ بس نہ کرتی۔ اس کے روح پرور گیت ختم نہ ہوتے تھے۔

اسے جو گیت یاد تھے ان کا موضوع خاص صرف مناظرِ قدرت تھا۔ موسمِ بہار کی کیفیات، طلوع و غروب کی دلچسپیاں، نسیمِ سحر کی اٹکھیلیاں، غنچوں کا تبسم، چڑیوں کے چہچہے وغیرہ، یا پھر وہ نظم تھی جسے گا کر بحری مسافروں کو دام میں پھانسا جاتا تھا۔ لیکن یہ تمام شاعری حسن و جمال کی عشوہ طرازیوں اور عشق و محبت کی حسرت نصیبیوں سے قطعی معرا تھی۔ چنانچہ یوفوزین نے جب یونانی شعراء کا کچھ کلام مغنیانہ سنایا تو اس نے بڑی دلچسپی سے سُنا۔ اور جلدی ہی یاد کر لیا۔ کیونکہ وہ اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ محبت کے متعلق وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ یہ ایک لطیف جذبہ ہے جو نوعِ انسان کے

لئے مخصوص ہے۔ مگر اس کی صحیح لذت سے نا آشنا تھی۔ البتہ ایک جوان مرد کے ساتھ ہر وقت رہتے سہتے سے اتنا اثر ہو گیا تھا کہ جب وہ اس کے لبوں سے اپنے لب مس کرتا یا اس کے مینائے شباب کو اپنی انگلیوں سے چھوتا یا پہلوؤں میں گدگدی کرتا تو خفیف سی کپکپی ایک ہلکا سا ارتعاش سر کے بالوں کی جڑوں سے شروع ہوتا اور کمر تک آ کر ختم ہو جاتا۔ اس سے آگے نہیں کیونکہ جسم کا باقی حصہ مچھلی کی مانند تھا۔ بالکل غیر حساس اور پانی سے نکلنے کے بعد ایک حد تک بے جان۔ یوفوزین کی زبان سے مرد و عورت کے اتصال باہمی اور جنسی تعلقات کی بے پناہ لذتوں کا حال سن سن کر وہ تڑپتی کہ کاش اس کے جسم میں یہ تغیر پیدا ہو جائے۔ کہ وہ از سر تا پا عورت کہلانے لگے۔ اور اگر کلیتہً نہیں تو جزواً ہی وہ اعضا میسر آ جائیں جو نسائیت کا مظہر خاص ہیں۔ مگر اسے کس قدر اذیت ہوتی اس خیال سے کہ سمندر کی دیوی ہونے کے باوجود اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنی بہنوں سے ہمیشہ کے لئے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ نہ اُن کے ساتھ مل کر گاتی نہ ان کے پھانستے ہوئے شکار میں حصہ لیتی۔

یوفوزین کی نگاہ کے سامنے اس کی جنس کے بہت سے افراد کا خون چوسا گیا۔ مگر اس کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دنیا سے منہ موڑ کر دنیا والوں سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس شاعرانہ فضا میں ایک حسین ترین محبوبہ کی معیت کے باوجود وہ رفتہ رفتہ تنہائی سی محسوس کرنے لگا۔ اور بسا اوقات فرصت کے لمحات میں وہ اپنے خیالات کے اندر وہ اس قدر غرق ہو جاتا کہ لیوکوسیہ کے چھیڑنے پر اچانک اس طرح چونکتا کہ خود اس کی نگاہ کے سامنے ہر چیز رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگتی۔ اس کی وحشت ایک قسم کا رنگ جنون اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جب وہ اس بنت البحر کے لبوں کو اچھی طرح چوسنے، اس کے جسم کو چھونے، گدگدانے اور اپنی آغوش میں لے کر دبوچنے کے بعد اس قسم کی سوزش محسوس کرتا جو آتی ہوئی چھینک کے رک جانے کی صورت میں پیدا ہو جاتی ہے تو گھبرا کر کبھی پہاڑوں کی طرف اور کبھی سمندر کی جانب دیوانہ وار بھاگتا۔ لیکن سمندر کی لامتناہی وسعت و بے پایاں عمق اور پہاڑوں کی فلک بوس بلندی و سنگلاخ جمودیت درمیان میں حائل ہو کر سد راہ بن جاتی۔ وہ پلٹ کر اسی آغوش میں جا پڑتا جو صحیح معنوں میں اس کے لئے کوئی سامان نشاط پیدا نہ کر سکتا تھا۔

لیوکوسیہ بھی اچھی طرح اس اجتناب کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اور جان گئی تھی کہ اس کا تمام اظہار عشق و محبت محض تصنع اور بناوٹ پر مبنی ہے لیکن وہ کیا کرتی مجبور تھی۔ اس یونانی نوجوان کی تشنگی بجھانے کے لئے اس کے پاس کوئی سبیل نہ تھی۔ بارہا اس نے آرزو کی کہ کاش اس کی بہنیں چند ایسے سیاحوں کو جال میں پھنسائیں۔ جن کے ساتھ کوئی عورت بھی ہو اور یہ اپنی بہنوں سے درخواست کر کے اپنے محبوب کے لئے اُسے حاصل کر لے جس طرح خود یوفوزین کو صرف اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ یا پھر اس کی بہنیں اس تجویز کو منظور کر لیں کہ اس نوجوان کو کسی جہاز میں سوار کر کے انسانی آبادی کی طرف چلتا کر دیا جائے۔ وہ اپنے اس محبوب کی جدائی کو گوارا کر لیتی ایسی صورت میں کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔ آنکھوں سے اوجھل سہی لیکن وہ ہمیشہ مسرور و شاداں رہے۔ کیونکہ اُسے سچا عشق اور بے لوث محبت تھی۔ اُسے یقین تھا کہ میں اپنے محبوب کا دیدار خواب کی نگری میں کر لیا کروں گی خواہ وہ تخیل کی سرحدوں سے دور ہی کیوں نہ جا رہے۔

اُس کی زبان سے یونانی افسانہ ہائے عشق سن سن کر متعجب ہوا کرتی تھی کہ اگر محبت صرف جسمانی اتصال کا نام ہے تو یقیناً جسم کے انحطاط کے ساتھ ساتھ جذبۂ محبت بھی زوال پذیر ہو جاتا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ معیار محبت کو اس سطح سے بہت بلند رکھنا چاہیئے۔

دونوں میں سے کوئی صورت بھی ممکن نہ ہوئی۔ اس کی بہنیں کسی عورت کو دام موسیقی میں پھنسانے میں کامیاب نہ ہوئیں اور نہ کوئی جہاز قریب آیا جس میں سوار ہو کر یوفوزین اپنے وطن جا سکتا۔ آخر بدرجۂ مجبوری لیوکوسیہ نے کہا کہ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چل کر سرزمین یونان کو آباد کرتی ہوں۔ شاید وہاں کی فضا میرے اندر ایسا تغیر پیدا کر دے۔ جس کے بعد تم مجھ سے مانوس ہو جاؤ۔ اور میں تمہاری دیرینہ تشنگی کو بجھا سکوں۔

یوفوزین نے بتایا کہ یونان تک مسلسل تیر کر جانے میں کم از کم ایک ہفتہ لگے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس صعوبت کو برداشت کرنا میری ہمت اور فطرت سے باہر ہے۔ خشکی پر چلتے رہنا ممکن ہو سکتا ہے لیکن متواتر اتنے عرصہ تک پانی میں تیرتے رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ لیوکوسیہ کے پاس اس کا حل موجود تھا۔ اس نے کہا کہ تم صرف گذارے کے لئے کھانے کی چیزیں جمع کر لو اپنے جسم پر اٹھا کر تمہیں سمندر پار لے جانا میرا کام ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ خشکی شروع ہو جانے کے بعد جہاں میرے لئے لگاتار چلنا غیر ممکن ہے تم کو میری مدد کرنی ہوگی۔

سخت قسم کی قید تنہائی کے بعد آزادی ——— خواہ کسی شرط پر ہو ——— فوراً منظور کر لی جاتی ہے۔ اس لئے یوفوزین نے بلا سوچ

(بقیہ صـ ۲۶۷ پر)

پابریں

مصر کے مشہور افسانہ نگار علامہ محمود تیمور کا شاہکار افسانہ

میرے دوست نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

پہلے میں اپنی والدہ کے ساتھ ایک پرانی وضع کے محلے میں رہتا تھا۔ جیسا کہ محلہ پرانی وضع کا تھا اسی طرح ہمارا مکان بھی چھوٹا اور تنگ و تاریک تھا۔ میں اسی مکان میں پیدا ہوا۔ یہیں پلا بڑھا اور یہیں میری جوانی بھی گذر گئی۔ ہمارے مکان کے سامنے ہی ایک چھوٹی سی جلد سازی کی دوکان تھی جس کے ابتدائی حالات سے میں بالکل ناواقف تھا۔ چونکہ جب میں پیدا ہوا اور ہوش سنبھالا اس وقت سے میں نے اُسے اپنی اسی قدیم وضع پر قائم دیکھا۔ اس کے پرانی طرز کے کواڑ اب بالکل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ان کے شیشے جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے تھے۔ جن کے بجائے پُرانے اخبارات کے کاغذ چپکا دیئے گئے تھے۔

ابتدائے عمر میں، جبکہ میں بچہ ہی تھا، مجھے اس تنگ و تاریک دوکان سے بہت خوف معلوم ہوتا تھا۔ میں اس کو طلسم ہوشربا کا کنواں سمجھتا تھا۔ جس میں سوائے دیو پریوں کے اور کسی کا گذر ممکن نہیں۔ اس دکان کا رنگ باہر سے سیاہی مائل تھا۔ ہر چیز پر نا امیدی مسلط تھی۔ اور اندر کی فضا تیرہ و تار مصائب سے پُر تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ میں اس سے مانوس ہو گیا، اور اس دکان میں کام کرنے والوں سے، جن کے مجھے سائے ہی نظر آتے تھے واقف ہوتا گیا یہ دو انسان تھے، ایک نوجوان اور ایک کم عمر بچہ۔ پہلا شخص اس دکان کا مالک تھا جس کا نام محمد عوف تھا۔ یہ ایک قوی الجثہ شخص تھا۔ لمبا قد، بھرا ہوا جسم، چوڑا چکلا سینہ اور قوی بازو۔ اس کے گول چہرے پر شباب کی سُرخی دوڑی ہوئی تھی، جس پر لمبی مونچھیں بہت زیب دیتی تھیں۔

میں جب تک اس محلے میں رہا، اُس کو ایسا ہی دیکھتا رہا۔ بلکہ میں محسوس کرتا تھا کہ جوں جوں وہ عمر کے لحاظ سے پختہ ہوتا جا رہا ہے اس کا شباب اور قوت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُر خوف ساحرانہ قوت پنہاں تھی۔ جس سے عوام الناس خواہ مخواہ مرعوب رہتے تھے۔ اس کے ساتھ جو لڑکا تھا اس کا نام عبد العزیز تھا۔ اور دوکان میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا، اس کی عمر اس وقت کم سے کم بھی دس برس کی ہو گی۔

لیکن کمزوری اور دُبلے پن کی وجہ سے میرا اندازہ کوئی پانچ برس کا تھا اس کا چہرہ اُترا ہوا اور خاموش تھا۔ رنگ پھیکا پھیکا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہر قسم کے جذبات سے محروم تھیں۔ وہ جب اپنے مقررہ انداز سے سامنے سے گذرتا چلتا تھا تو میں بلاشبہ اُسے لکڑی یا کسی اور دھات کا ایک پُتلا سمجھتا تھا جو کسی پوشیدہ قوت کے ذریعے حرکت کر رہا ہو۔ یہ ایک یتیم لڑکا تھا جو اپنے اُستاد ہی کے گھر میں پلا بڑھا اور اس کی دکان پر جلد سازی کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک مطیع و فرمانبردار مشین کی طرح زندگی گذارتا تھا۔ جسے اس کا استاد جب چاہتا اور جس طرح چاہتا حرکت دید یتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس لڑکے سے میری جان پہچان ہو گئی۔ میں اکثر شام کو جب مدرسہ سے آتا تھا۔ تو اُسے باہر دکان پر بیٹھا ہوا پاتا تھا، جہاں وہ بیچارہ شاید ستانے کی غرض سے تھوڑی دیر بیٹھ جاتا۔ میں بھی دکان کے باہر بچھے ہوئے بوسیدہ سے تختے پر بیٹھ کر زبردستی اس سے باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ میری باتوں کا جواب نہایت اختصار کے ساتھ دیتا تھا۔ اس طرح مجھے اس کی زندگی اور عادات کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں جو اکثر مجھے بے چین رکھتی تھیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اُس غریب کی قوتِ ارادی بالکل کمزور ہے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کوئی کام بھی بغیر اپنے استاد کے حکم کے انجام نہیں دے سکتا۔

اور سب سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پہ تھا کہ وہ اپنے اُستاد کی سختی سے بخوبی واقف تھا لیکن پھر بھی اس کے احکام کو بالکل اسی طرح قبول کر لیتا تھا، جیسے کہ لاسلکی کے آلات آوازوں کو فضائے آسمانی سے جذب کر لیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں کے تعلقات اور بھی مضبوط ہوتے گئے یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے کو مختلف چیزیں تحفتہً دینے لگے۔ میں اسے اکثر کھانے کی چیزوں میں اپنے ساتھ شریک کر لیتا تھا۔ اور وہ بھی دکان کے بچے کھچے کاغذ سے بنائی ہوئی چھوٹی چھوٹی کاپیاں مجھے دیتا تھا، اور بسا اوقات اسکول کی کتابوں پر میرا نام سونے کے ورق سے چھاپ دیتا تھا۔

ایک روز صبح ہی صبح جب میں سکول جا رہا تھا، تو عبدالعزیز کو خلافِ معمول دکان سے باہر کھڑا دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، پیشانی پر پُرالم شکنیں اور آنکھوں کے اردگرد سیاہی مائل حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بے چین روح ہے جو قبر سے گھبرا کر نکل آئی ہے۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر تعجب سا ہوا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس سے سوال کرتے ہوئے کہا:۔

"تم دکان میں کیا کر رہے تھے عبدالعزیز؟"

اس نے میری طرف نظر تک نہ کی۔ میری بات کا جواب اس نے اس طرح دیا گویا وہ کوئی گہرا خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا:۔

"میں نے ساری رات تنہا اسی میں گذاری ہے۔"

"اس اندھے کنوئیں میں ۔۔۔ اور تنہا!"

"ہاں ۔۔۔ اور بغیر روشنی کے۔"

"تم اس خوفناک جیل خانہ میں کیوں مقید رہے؟"

"ہاں! ۔۔۔ یہ استاد کا حکم تھا۔"

"لیکن کیا تمہیں ڈر نہیں لگا؟"

"اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ ساری رات جاگتے ہوئے اس دکان میں گذاروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔"

وہ اپنے مخصوص لہجے میں مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اور دورانِ گفتگو میں اس نے میری طرف ایک دفعہ بھی نہ دیکھا۔ اس کے بعد میں نے بہتیری کوشش کی کہ وہ کسی طرح اس زیادتی کا سبب بتا دے۔ لیکن میری کوشش بالکل رائیگاں گئی۔

میں چونکہ اب اس دکان اور اس کے رہنے والوں سے مانوس ہو چکا تھا اس لئے اب اندر جاتے ہوئے بھی نہ ڈرتا تھا۔ بسا اوقات میں استاد کی غیر موجودگی میں اپنے دوست سے ملاقات کی غرض سے دوکان میں چلا جاتا تھا۔ یہ ایک وحشت ناک مقام تھا جہاں عین دوپہر کے وقت بھی کافی اندھیرا ہوتا تھا۔ میں دروازے کے پاس ہی ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ جاتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اپنے دوست سے باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور اس کے کام کو بھی بہ نظرِ غور دیکھتا رہتا تھا جسے وہ پورے انہماک سے کرتا رہتا تھا۔ اور ساتھ ہی میری باتوں کا بھی مختصراً جواب دیتا جاتا تھا۔ وہ کتابوں کے اجزاء تلے اوپر رکھ کر نہایت صفائی سے جز بندی کرتا تھا اور کبھی کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں میرے لئے سب سے زیادہ پُراثر نظارہ وہ ہوتا تھا جبکہ وہ کتابوں کے کنارے تلوار کی طرح تیز سیفے سے ہموار کیا کرتا تھا۔ یہ ایک دھار دار آلہ ہوتا ہے جس کے دونوں طرف دھار ہوتی ہے اور کتابوں کے کنارے اس طرح چھانٹ دیتا ہے جس طرح جلاد کی تلوار مجرموں کی گردنیں اڑا دیتی ہیں۔ میں اس آلہ سے بہت ڈرتا تھا اور اس کے قریب بھی نہ پھٹکتا تھا۔ میں نے ایک روز عبدالعزیز سے کہا:۔

"تمھیں اس آلہ سے ڈر نہیں لگتا، عبدالعزیز؟"

یہ سن کر وہ مسکرایا اور اس کی دھار کو چوم کر کہنے لگا:۔

"میں اس سے کیوں ڈروں، یہ تو میرا رفیق ہے، جو مجھے کبھی ایذا نہیں پہنچاتا۔"

"اگر اس کی دھار کسی کے ہاتھ میں بیٹھ جائے؟"

"اسی وقت اُسے اُڑا دے۔"

"کبھی کسی کے ساتھ ایسا واقعہ ہوا بھی ہے؟"

"ہاں۔ ہاں! یقیناً، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔"

آخرکار خود اس کے اُستاد محمد غوث سے بھی میری صاحب سلامت ہو گئی۔ اور میں بعض قیمتی کتابوں کی جلدیں اس سے بندھوانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ ناولوں اور دیگر کتب کی بھی جلد سازی اسی دکان سے کرانے لگا۔ یہ شخص اپنی چکنی چپڑی باتوں اور تیز تیز نظروں سے متاثر کر کے خواہ مخواہ مجھ سے کام حاصل کر لیتا تھا اور میں بھی نہ جانے کیوں کبھی اس سلسلے میں انکار نہ کرتا تھا۔

اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ استاد کو جلد سازی میں کمال حاصل تھا اور وہ خوبصورتی اور مضبوطی کے اعتبار سے ہمیشہ جدت طرازی سے کام لیتا تھا۔

عبدالعزیز اپنے استاد کے ساتھ دکان کے اوپر ہی ایک فصیل سے کمرے میں رہتا تھا۔ استاد کی بیوی کا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو چکا تھا۔ میں جب تک قاہرہ میں رہا کبھی یہ نہ معلوم کر سکا کہ اس کا دُور پرے کا کوئی عزیز یا رشتہ دار بھی اس دنیا میں موجود ہے یا نہیں۔ استاد نے ہمیشہ مجھ پر اپنا اثر جمائے رکھا۔ اور میں کبھی بھی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا کہ اپنی کتابوں کی جلد سازی کا انتظام کسی دوسری دکان پر کر سکوں۔

اس کے بعد میں اپنی نوکری کے سلسلے میں اسکندریہ چلا آیا۔ اور یہاں تقریباً پانچ سال تک رہا۔ اس دوران میں میرا ایک دفعہ بھی قاہرہ آنا نہ ہوا۔ اس مدت میں سوائے عبدالعزیز کی شادی کے اور کوئی اہم واقعہ قابلِ ذکر نہیں۔ اب وہ لمبی لمبی گھنی موچھوں والا

ایک نوجوان تھا لیکن پھر بھی اس کی فطری عادات میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ اب بھی وہی دُبلا پتلا کمزور ارادے والا عبدالعزیز تھا جو مشینوں کی طرح حرکت کرتا تھا ۔۔۔ وہی خاموش طبیعت والا مغلوب الجذبات انسان ..... !

کچھ دنوں بعد جب میں قاہرہ آیا تو سب سے پہلے میرے دل میں یہی خیال پیدا ہوا کہ اپنے پُرانے رفیقوں استاد محمد عوض اور اس کے شاگرد عبدالعزیز سے کسی نہ کسی طرح ملاقات کروں ۔ یہ سوچکر میں نے دوکان کا راستہ لیا اور ساتھ ہی اپنی کتابیں لیتا گیا جن کی جلد سازی کی مجھے ضرورت تھی عبدالعزیز دوکان میں اکیلا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف دوڑا اور اپنا سخت ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے اپنے پرانے انداز میں مسکرا دیا۔ میں بھی اس سے لپٹ گیا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری کیا ۔

"کیا اب تک تم اسی دوکان میں ہو۔ عبدالعزیز ؟"

"کیا آپ کے خیال میں مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیئے تھا ؟"

"کم از کم میرا تو یہی خیال تھا کہ اب تمہاری اپنی دوکان ہوگی ۔ اور دوسرے شاگرد تمہاری دوکان پر کام سیکھتے ہوں گے ۔"

اس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی ۔ اس نے جواب دیا ۔

"میں اپنی دوکان الگ کرلوں ! میں اپنے استاد کو بالکل چھوڑ دوں ! "

"تو کیا تم تمام عمر بچے ہی بنے رہو گے ؟ "

اس نے اپنا ہاتھ پشت اور ہتھیلی کی طرف سے چوما اور نہایت متشکرانہ انداز میں کہنے لگا ۔

"ہاں ! اور اس حال میں ہر طرح خوش ہوں ! "

بھلا عبدالعزیز کو اپنی اس حالت سے پورا پورا اطمینان کیوں نہیں ہوتا ۔ جبکہ وہ ابتدائے عمر سے ہی اس ذہنی پستی کی چار دیواری میں زندگی کے دن گذار رہا تھا ۔ اس نے کبھی اپنے استاد کی قائم کردہ حدود سے باہر قدم نکال کر دنیا کو دیکھنا نہ چاہا ۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

"استاد کہاں ہے عبدالعزیز ؟ "

اس کے چہرے پر رنج و الم کے بادل چھا گئے ۔ اس نے اپنی گردن کو حرکت دی لیکن میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا ۔ مجھے اس پر بہت تعجب ہوا ۔ میں سمجھا شاید استاد کا انتقال ہو چکا ہے ۔ میں گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا ۔

"کیا وہ مر گیا ؟ "

عبدالعزیز نے سر اُٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا :۔

"نہیں ! بلکہ وہ بیمار ہے ۔"

"کیا کوئی خطرناک مرض ہے ؟ "

"نہیں تو ۔۔۔ !

"تو پھر تم اس طرح کیوں روتے ہو ؟ "

وہ میرے قریب آ گیا ۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ۔ اور پھر دباتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا :۔

"اس کے دونوں پاؤں ضائع ہو گئے ہیں ۔"

"یہ کیا ہوا ؟ "

"ٹریم کے حادثہ میں اس کے دونوں پاؤں جڑ سے کاٹ دیئے گئے ۔"

"ارے ! یہ تو بہت افسوس کی بات ہے ۔"

یہ اندوہناک خبر سُن کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اور تھوڑی دیر تک میں سکتے کے عالم میں رہا ۔ اس وقت میں اس شخص کی بدنصیبی پر دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا ۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کو کتنی بڑی شکست ہوئی ہے ۔۔۔ اس پُرہیبت انسان کو جو ہر جگہ اپنی شخصیت اور عادات سے رعب جما لیا کرتا تھا ، اور اپنے ارادے کی مضبوطی کی وجہ سے ہر شخص کو دبا لیا کرتا تھا ۔

میں نے عبدالعزیز کی طرف دیکھا اور رنجیدہ لہجہ میں پوچھا ۔

"کیا استاد اپنے اسی پُرانے مکان میں رہتا ہے ؟ "

"جی ہاں ! "

"تب تو میں اس سے ضرور ملوں گا ۔ کیا تم بھی میرے ساتھ چل سکتے ہو ؟ "

"بسر و چشم ! "

ہم دوکان سے نکلے اور استاد کی قیام گاہ کی طرف چلے جو خود اسی دوکان کے اوپر تھی ۔ عبدالعزیز میرے آگے آگے تھا تاکہ رہبری کرسکے جب ہم باہر کے دروازہ سے گذر گئے تو لکڑی کی سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی ایک چھوٹے سے کمرے کے سامنے پہنچے ۔ ہم ابھی چوکھٹ کے قریب بھی نہ پہنچے تھے کہ ایک دردناک چیخ میرے کانوں کے پار ہو گئی ۔ جیسے کوئی زخمی شیر جال میں ڈکار رہا ہو ۔ میں بے حس و حرکت بُت کی طرح خاموش کھڑا رہا ۔ اس وقت خلاف معمول مجھے ڈر معلوم ہو رہا تھا ۔ میں نے عبدالعزیز

کی طرف نظریں جمائیں اور اس کے کان میں کہا:—

"کیا یہ استاد ہی کی چیخ تھی؟"

اس نے سر کے اشارے سے میرے سوال کا جواب دیا۔ اور پھر استاد کے کمرے میں مجھے پہنچا دیا۔ میں نے ایک شخص کو طویل و عریض چوبی تخت پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ اس کے چاروں طرف بہت سے تکئے رکھے ہوئے تھے۔ میں اس کی طرف تیزی سے بڑھا اور مصافحہ کرتے ہوئے کہا:—

"استاد! اللہ آپ کی تکلیف کو دور کرے"

اس نے تشکرانہ انداز میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور غم آگیں تبسم کے ساتھ سخت آواز میں کہنے لگا:—

"رنج و راحت اللہ ہی کے ہاتھ ہے — بھائی!"

کمرے میں روشنی کافی تھی اس لئے میں استاد کو اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا جسم بھاری ہو گیا تھا۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں، اور بہت دنوں سے حجامت نہ بنوانے کی وجہ سے ڈاڑھی کے میلے کچیلے بال اُلجھے پڑے تھے۔ لیکن وہ ان تمام باتوں کے باوجود جوان تھا۔ بھرا بھرا سُرخ چہرہ، چوڑا چکلا سینہ، اور گٹھے ہوئے بازو! — اس کی آنکھوں میں ابھی وہی چمک موجود تھی اور اس عرصہ میں ان میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ بلکہ اب اُن میں اور بھی تیزی پیدا ہو گئی تھی۔

جب علیک سلیک سے فراغت ہوئی اور وہ میری اس طویل غیر موجودگی کے اسباب دریافت کر چکا تو، نہایت پُر درد لہجہ میں اپنی ٹانگوں کے ضائع ہونے کی داستان سنانے لگا۔ اس اثنا میں عبد العزیز قہوہ بنا کر لے آیا۔ اب استاد نے اپنی گفتگو کا رُخ پلٹا اور اپنی سوءِ حالی اور پُر مصائب زندگی کی شکایت کرنے لگا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:—

میری زندگی اُجیرن ہو گئی ہے اور میں اس متعفن قید خانہ میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں جہاں مجھے اپنی باقیماندہ زندگی کے ایام گذارنے ہیں۔ آہ! ٹرام نے میرا کام ہی کیوں تمام نہ کر دیا۔ دو مہینے کے طویل عرصہ سے برابر میں اسی کونے میں پڑا ہوا ہوں گویا میں پتھر ہوں جس کا کوئی مصرف ہی نہیں ہے۔ میرا آدھا جسم تو مر چکا ہے، یہی نہیں بلکہ میں ایک متعفن لاش ہوں جس کو دیکھنے سے لوگوں کو گھِن آتی ہے۔ وہ مجھ پر آوازے کستے ہیں، تیز تیز نظروں سے گھورتے ہیں، میں ہر دم اُن کی آوازیں سنتا ہوں، گویا وہ خود میری کھڑکی کے نیچے مجھ پر قہقہے مار رہے ہیں۔ اس دُنیا میں اکیلا ہوں اور ایسی بے کسی کی حالت میں جی رہا ہوں کہ کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا.... اور وہ....

یہ کہہ کر استاد نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا سختی سے اشارہ کیا۔ میں نے عبد العزیز کو دیکھا کہ وہ تھر تھر کانپ رہا ہے اور گردن جھکائے خاموش کھڑا ہے۔

"وہ.... وہ جو آپ کے سامنے کھڑا ہے، جس کی تعلیم و تربیت میں میں نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ جسے میں نے آدمی بنا دیا کہ اپنی ذات اور کاریگری پر فخر کر سکے۔ جس کو میں نے اپنے لڑکے کی طرح پالا۔ یہ سب کچھ میں نے صرف اس لئے کیا کہ میری سگی اولاد کی طرح بڑھاپے کا سہارا ہوگا.... لیکن میری سب امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وہ بڑا ناشکرا نکلا... میں آپ سے قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ اُسے میری اس ناگہانی مصیبت سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ اس کی نظریں سب کچھ بتائے دیتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ دُنیا کسی طرح میرے بوجھ سے سُبک دوش ہو جائے۔ وہ کمرے میں آتا ہے اور مجھے دونوں ہاتھوں کے بل گھسٹتے دیکھتا رہتا ہے۔ وہ اس وقت پُر معنی انداز سے مجھکو گھورتا ہے۔ گویا وہ مجھ سے کہتا ہے "تو اسی طرح زمین پر گھسٹتا رہ، میرے سامنے سر جھکائے رہ اور میرے قدموں کو چوم" اُف ذلیل کتے! عبد العزیز!..... تو کیوں نہ میری مصیبتوں پر قہقہے لگائے، کیوں نہ میری تکلیفوں پہ خوش ہو؟ کیا تیرے پاس صحیح سلامت ٹانگیں اور مضبوط پاؤں نہیں ہیں؟ تو شاید ان ٹانگوں سے مجھے لاتیں مارنی چاہتا ہوگا۔ آ۔ اپنے دل کی حسرت پوری کر لے! کیا تو میرے گھر کا واحد مالک اور حکمراں نہیں ہے؟ تو کیا میرا حاکم نہیں ہے؟ تو حکم کرنے کے لئے ہے اور میں فرماں برداری کرنے کے لئے۔ آنابکار! میرا گلا گھونٹ دے اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے۔ آ۔ مجھے اس کھڑکی میں سے نیچے پھینک دے، چونکہ مجھ میں اب اتنی سکت ہی نہیں ہے کہ اپنی جان بچا سکوں۔ اور کیا میرے لئے اس حالت میں یہ ممکن ہے؟ تیری ٹانگیں ہیں، تو طاقتور ہے، تو مضبوط ہے۔ تجھے اپنی صحت پر بہت ناز ہے، تجھے اپنی ٹانگوں کی سلامتی پر غرور ہے۔ میں تجھے متکبرانہ انداز میں چلتے پھرتے دیکھتا ہوں گویا تیری نظریں مجھ سے کہتی ہیں "او لنگڑے، اپاہج! میری طرف غور سے دیکھ۔ کیا تجھے میری مضبوط اور سیدھی ٹانگیں نظر نہیں آتیں؟ دیکھ جب میں چلتا ہوں تو میرا سر اونچا ہوتا ہے۔ لیکن! تو جب اپنے ہاتھوں پر گھسٹتا ہے تو تیری نظریں نیچی ہوتی ہیں" جب تو میرے سامنے چلتا ہے تو بالارادہ زور زور سے زمین پر قدم مارتا ہے، تاکہ مجھے ان کی گونجنے والی چاپ سُنا سکے۔ اس وقت گویا وہ ٹانگیں چیخ چیخ کر مجھ سے کہتی ہیں "ہم مضبوط

اور صحیح سلامت ٹانگیں ہیں، ہمیں بہ غور دیکھ! او اپاہج! ہماری چاپ سر جھکائے بخوبی سُن!"

میں اس کی یہ عجیب و غریب گفتگو سُن رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ اور میں مدہوشی کے عالم میں یہی سوچتا رہا کہ کیا جواب دوں؟ میں کبھی اس بکواسی محمد عوض کی طرف دیکھتا تھا جس کا چہرہ غصہ کی وجہ سے ایک دہکتے ہوئے انگارے کی طرح چمک رہا تھا جس سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں اور کبھی غریب عبدالعزیز پر میری نظر پڑتی تھی جو ستون کی طرح ساکت و جامد آگے کی طرف گردن جھکائے کھڑا ہوا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب زمین پر آ رہے گا۔

میں اب چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں استاد سے رخصت طلب کی۔ اور پھر اس ڈراؤنے قید خانہ سے سر پر پاؤں رکھکر بھاگا۔ اور آئندہ کے لئے قسم کھالی کہ کبھی اس سے ملاقات نہ کروں گا۔

میں نے اس ملاقات کے بعد چند ہفتے وہیں گذارے۔ اس دوران میں محمد عوض کی ڈراؤنی شکل ہمیشہ میرے سامنے رہی۔ اُس کی تیلھاونی ڈاڑھی، پر ہیبت نظریں اور دمکتا ہوا چہرہ میری نظروں میں سمایا رہا۔ میں عالم خیال میں اس کو فرش پہ زخمی بیل کی طرح تڑپتے ہوئے دیکھتا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل کی گہرائیوں میں یہی جذبہ پیدا ہوتا رہا کہ کسی طرح اُس سے ملاقات کروں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے اس ارادے سے باز نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ ایک روز بس میں سوار ہو گیا، جس نے مجھے بہت جلد اس دوکان تک پہنچا دیا۔ گویا میں چاہتا تھا کہ کہیں اس ٹریجیڈی کا کوئی سین ضائع نہ ہو جائے۔

عبدالعزیز حسب معمول دوکان میں مصروف کار تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ نحیف ہو گیا ہے، اور اس کا سُتا ہوا چہرہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ زرد پڑ گیا ہے۔ گویا وہ خشک زمین میں بویا ہوا پودا ہے جو پانی کی کمی کی وجہ سے دن بدن سوکھتا جا رہا ہے۔ میں نے اُس سے سوال کرتے ہوئے کہا:۔

"اب کیا حال ہے، استاد کا؟"

اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں جواب دیا:۔

"پہلے سے بھی بدتر ہے"

ہم دونوں میں اس سے زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔ دونوں دوکان سے نکلے اور خاموشی کے ساتھ استاد کے کمرے کی طرف چلے۔ شاید عبدالعزیز میرے آنے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

یہ ملاقات بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ جب میں اس کمرے سے نکلا ہوں تو خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ میں اپنی کمزوری پہ خود نادم تھا۔ مجھے اب اس بکواسی سے شدید قسم کی نفرت ہو گئی تھی، جس کا دل ساری دُنیا کی طرف سے حسد اور دشمنی کے جذبات سے پُر تھا ـــ خاص طور پر عبدالعزیز کی طرف سے۔

اس نے اب کے بھی ہم دونوں کو دیکھکر بے نقط سُنانی شروع کیں۔ گویا وہ گالیوں اور بدکلامیوں کی مشین تھا ـــ یہ سب کچھ صرف اس لئے تھا کہ وہ ٹانگوں سے محروم تھا۔ اور دوسرے اس نعمت سے بہرہ ور تھے۔

میں نے چلتے ہوئے عبدالعزیز کو دیکھا ـــ وہ دروازہ سے کمر لگائے خاموش کھڑا تھا اس کا غمگین چہرہ منجمد جذبات کا حامل تھا، اور اس پر آنسوؤں کی دھاریں بہ رہی تھیں۔

اس کے بعد بھی میں کئی دفعہ استاد سے ملنے گیا۔ حالانکہ میری یہ ملاقات خود میری طبیعت کے خلاف ہوتی تھی، لیکن میں کسی نہ کسی طرح اپنے پہ جبر کر کے وہاں جا پہنچتا تھا اور ہر دفعہ وہاں سے وہی نفرت و ندامت کے جذبات لئے ہوئے آتا تھا۔ گویا میں کسی قبر سے نکل کر آتا تھا جہاں متعفن لاشیں اور عجیب و غریب قسم کے کریہہ واقعات میری نظر سے گذرتے تھے۔

عبدالعزیز کا یہ عالم تھا۔ کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا تھا اس کے جسم کی کمزوری اور چہرہ کی زردی بڑھتی جاتی تھی۔ اس کا جسم خشک ہوتا جاتا تھا اور آنکھیں اس قدر خوفناک ہو گئی تھیں کہ اس پر بھوت پلیکا دھوکہ ہونے لگا تھا۔ جب وہ دوکان میں تنہا کام کرتا نظر آتا تھا تو میرا دل خوف اور دہشت سے زور زور دھڑکنے لگتا تھا۔ چونکہ اس اندھیرے میں وہ مجھے حرکت کرتے ہوئے انسانی ڈھانچہ کی طرح نظر آتا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنی عادت سے مجبور ہو کر اس قابلِ رحم انسان سے پھر ملنے گیا۔ میں نے اس کو دیکھا کہ اپنے بستر پر تڑپ رہا ہے اور حسب معمول دنیا اور اس کے رہنے والوں پر لعنت ملامت کر رہا ہے اس روز پہلی مرتبہ مجھے اس پر غصہ آیا۔ میں اس وقت غصہ کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا کہ وحشی جانور کی طرح اپنے دانتوں تکیوں کو چبا رہا ہے۔ اور اُن کا کپڑا پھاڑ پھاڑ کر روئی کے ٹکڑے فضا میں اُڑا رہا ہے۔ اس دوران میں میں نے کسی کے چیخنے چلّانے کی آواز

سنی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ عبدالعزیز سامنے کھڑا بڑبڑا رہا ہے۔ وہ پھر استاد کی طرف چلا۔ میں نے اس کو روئی کے ٹکڑوں سے پٹے ہوئے کمروں میں پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا اس نے چیختے ہوئے کہا:۔

"اب حد ہوگئی ہے استاد، مجھ سے اب یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔" اس کے بعد وہ زخمی چیتے کی طرح چھلانگیں لگاتا ہوا دروازہ سے نکل گیا۔ میں بھی یہ حالت دیکھکر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نامعلوم جذبہ سے متاثر ہوکر اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ میری ٹانگیں مجھکو کہاں لئے جارہی ہیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ تیر کی طرح باہر کے دروازے سے نکل گیا وہ آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے۔ میں جس وقت سڑک پر گذر رہا تھا وہ دوکان میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے ایک خوفناک چیخ سنی، جس سے میرا جسم کانپنے لگا اور میں دہشت کی وجہ سے سڑک پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس وقت خوف والم کے جذبات بجلی کی لہروں کی طرح میرے جسم میں چکر لگا رہے تھے۔

اس کے بعد چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ اب میرے ہوش و حواس کچھ ٹھکانے آئے اور میں جرأت کرکے دوکان کے قریب پہنچا۔ پھر میں نے دروازہ کی جھریوں سے اندر جھانکا۔ اس وقت کسی چیز میں تمیز نہ کرسکا۔ چونکہ اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ خدا خدا کرکے تھوڑی دیر بعد میں اس قابل ہوا کہ دوکان میں داخل ہوسکوں۔ میں نے چند قدم کے فاصلہ پر ایک منظر دیکھا۔ جسے میں تمام عمر نہیں بھلا سکتا۔ میں نے دیکھا کہ غریب عبدالعزیز زمین پر بغیر ٹانگوں کے پڑا تڑپ رہا ہے اور خون اس کے چاروں طرف بہ رہا ہے۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور تیزی سے دوکان سے نکل بھاگا۔ میں اس وقت چیخ کر بار بار کہہ رہا تھا۔

"عبدالعزیز نے اپنی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ ۔ ۔ ۔ عبدالعزیز نے اپنی ٹانگیں کاٹ ڈالیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

میرے دوست نے رومال سے اپنا منہ پونچھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا:۔

"اس کے بعد کے واقعات سے کیا آپ خوفزدہ ہیں؟"

میں نے کچھ جواب نہ دیا اور خاموش رہا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا:۔

ہر چیز بہتری کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔ عبدالعزیز کو ہسپتال میں داخل کردیا گیا، جہاں سے وہ چند ہفتے بعد صحیح وسلامت چلا آیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ لکڑی کی مصنوعی ٹانگوں پر چلتا تھا۔ وہ حسب سابق دوکان کے کام میں مصروف ہوگیا گویا اسے کوئی حادثہ ہی درپیش نہ ہوا تھا۔ محمد عزت کی حالت بھی اب عجیب غریب ہوگئی تھی۔ اس کا جوش اب ٹھنڈا ہوچکا تھا اور اس واقعہ کے بعد سے کسی ذرا اس سلسلہ میں کوئی شکایت یا کسی قسم کی سخت کلامی کے الفاظ اسکی زبان سے نہ سُنے بلکہ اب تو اس میں انقلاب عظیم پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اب مطمئن اور ایک حد تک خوش تھا۔ اس میں عمل کی قوت پیدا ہوگئی تھی۔ اب اس نے اپنے قہوہ خانے کو چھوڑ دیا تھا۔ اور دُنیا کی فضا میں سانس لینے لگا تھا۔ وہ اب لوگوں سے خوش خلقی اور محبت سے پیش آتا تھا۔ اور لکڑی کی مصنوعی ٹانگوں پر خوش خوش دوڑا پھرتا تھا۔

(ترجمہ)

⁘ ⁘ ⁘

صلاح الدین قریشی

بھیک منگے کی بٹیا

(از شریمتی کملا دیوی چودھری)

"کاہے پربتا بہنی تم پہلی پہل چوری کب کئے رہیو!" ہنستے ہوئے ستیش بابو نے پربتیا سے پوچھا۔

"بھیا، پہلی پہل ہم چوری کئے رہا بابا کے باگ مان" دھیرے دھیرے ستیش کا ماتھا دباتے ہوئے پربتیا نے جواب دیا۔

"تو بہنی بتاؤ تو تم کس اس چوری کیا رہے"

"بھیا۔ جن بابا کے باگ مان ہم رہت رہن، اوئی آنکھی موند کے یہ دھیان لگا دے لاگیں تو ہم ان کی مڑیا مان گھس جائی اور سہج سہج ری طرح کی تنکیو کھٹکا ہوئے نہ پاوے۔ ہنڑین کے ڈھکنا کھولی۔ انجری بھر وار انجری بھر چادر اپنے کو چھاماں ڈار کے ہنیو رہے ہنیو رہے بردن کی آڑی مان جہیت بھی گھس جاتِ رہے۔ پھر بادا کی مڑیا کے دوا رے بیٹھ جائی۔ بابا جب آنکھی کھولیں تو ہمکا بیٹھی پا دیں"

"بھل پربتا بہنی تم پہل چوری کیہو!"

ستیش بابو کے ان الفاظ سے پربتیا کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اُس نے مسرت آمیز لہجے سے کہا "بھیا ابھی سو بو ناہیں تو اور دبترائی"

"ہاں پربتا بہنی بترا ہو۔ ایک انجری دار۔ چادر۔ مان تمہار اور تمہرے دادا کا پیٹ بھر جات رہا۔ کہ تمہرے دادا اور و کہوں سو مانگ لاوت رہیں"

"ناہیں بھیا۔ ہم دادا کا کہوں مانگے جائے نہ دے اِت۔ پہلے پہل جب دادا آندھر بھئے، تو ہمارا انگر پا کر کے گانوں مان مانگ لاوت رہے۔ ملا گاؤں ٹولہ والے سب ہم کا بھیک منگا کی بٹیا کہہ کے چڑھالا گے۔ تو ہم کا بہت نکارہ لاگ اور روائی چھوٹے۔ پھر کبتوں ہم دادا کا بھیک ملنگے ناہیں جائے دیں۔ ہم بابا کا چوکا باسن کرے لاگن۔ اور بابا ہم کا روٹی دے لاگے۔ دادا کے کھاطر ہم چوری کر لائی۔ کبھوں کبھوں راندی۔ کبھوں روٹی سینک لیئی دادا کے کھاطر۔

"بھل پربتا بہنی تم روٹی سینک جنتیو ہو"

"ہاں سیکے کا ہے ناہی جانت ہے۔ ہم کا کو دسکھاوا تھوڑی ہے۔ روج ہم بابا کا بناوت دیکھی تیئ ہے دادا کی کھاطر بنائے

"ایک دائیں روٹی تو بہنی ہم ہو کا بنائے کے کھیا ہو"

"روٹی تو بھیا ہاں مالکن بنا دے نہ دی ہیں۔ بھیا تم کا آم کھیا اُب"

"ہی ان آم کہان پئی ہو بہنی"

"بھیا۔ منڈی سے چرائے لاؤب۔ ہم بہت دائین رائن ہن۔ جہاں کو ڈلے اے آوا۔ اور بیچے والے کا دھیان بٹا کہ ہم چپتے سرکائن"

"ناہیں پربتا بہنی۔ اب تم چوری کرے نہ جایو۔ ہم آم مول لائیکے تم کا کھیا دب"

"تو کلہے بھیا تم پیسہ کاہے کھرچ ہو! ہم ایسنے جو لے آؤب"

بات یہیں پر ختم ہو گئی۔ کیونکہ اسی وقت ستیش کی بیوی جو پاس ہی چارپائی پر سو رہی تھی جاگ پڑی۔ پربتیا دوسرے کے سامنے اپنی چوری کی بات بھیا کو تھوڑے ہی سنائے گی۔ وہ بھی اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ اور اپنے جی میں یہ سوچتے ہوئے کہ بھیا نے آم چرانے کو کیوں منع کیا۔ موقع پاتے ہی وہ ان سے پوچھے گی، ایک چٹائی بچھا کر سو گئی۔

(۲)

ستیش کے والد لکھنؤ کے بڑے زمینداروں میں سے ہیں۔ پربتیا ان کے گاؤں شیو پڑا کے ایک اسامی بھولا اہیر کی لڑکی ہے۔ گیارہ سال کی عمر ہے پربتیا اِس دنیا میں اکیلی ہے۔ بھائی نہیں۔ بہن نہیں۔ ماں دودھ پیتی چھوڑ کر چل بسی۔ اندھا باپ تھا وہ بھی پچھلے سال پربتیا کو بے سروسامان چھوڑ کر فوت ہو گیا۔ تبھی سے پربتیا زمیندار کے خاندان میں رہتی ہے۔

جب بھولا اہیر مرا تو گاؤں والوں کی پنچایت یہ طے کرنے بیٹھی کہ پربتیا کا کیا ہو۔ کسی جاننے والے نے بتایا کہ اسکی ایک موسی ہے جو شیو پڑا سے پندرہ کوس پر رہتی ہے۔ پربتیا کو وہیں پہونچا دیا جائے۔ سبھی کو یہ بات ٹھیک معلوم ہوئی۔ یہاں تک کہ بابا سالک رام نے بھی اسکی تائید میں گردن ہلا دی۔ گاؤں بھر میں پربتیا کے صرف وہی ایک ہمدرد تھے۔ جس روز سے بھولا کی آنکھیں جاتی رہیں انہیں نے تو چھوٹی پربتیا کو برتن مانجھنے پر رکھ لیا تھا۔ برتن مانجھنے کے عوض میں اُسے کھانا اور باپ بیٹی دونوں کے رہنے کے واسطے اپنے آموں کی باغ میں ایک پھوس

کی جھونپڑی دے رکھی تھی۔

باوا جی جب تیرتھ جاترا کو جانے لگے تو انہوں نے پربتیا کو کہیں ٹھکانے سے ہی لگا دینا مناسب سمجھا۔ اسے موسی کے گھر تک پہونچانے میں جو کرایہ لگتا وہ بھی باوا دینے کو تیار تھے۔ لیکن پربتیا تو موسی کے گھر جانیکو راضی ہی نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے مجھے لکھنؤ سرکار کے گھر پہونچا دو۔ پربتیا سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن من میں ٹھان لی کہ کبھی کوئی گاڑی ادہر آتی جاتی مل جائے تو دھوکے سے اُسے موسی کے گھر روانہ کر دیا جائے۔ آخر لڑکی ہی تو ٹہری جاتے ڈرتی ہے۔

چالاک پربتیا نہ جانے کیسے گاؤں والوں کے ارادہ کو تاڑ گئی۔ اس روز سے وہ گاؤں والوں کو دکھائی ہی نہ دی۔ ہاں چوتھے روز گنگو پاسی نے خبر دی کہ جب وہ کنڈوں کی گاڑی لیکر زمیندار کے یہاں پہونچا تو کنڈے اُتارتے وقت اُس نے پربتیا کو بھی اُتارا۔ اور زمیندار کے صاحبزادے ستیش بھیا کی دیا سے زمیندار گھرانے میں جگہ بھی پالی ہے۔ سبھی نے ستیش بھیا کی تعریف کی اور چالاک پربتیا کی کی ہمت پر ملامت کی۔

"بالے پن سے یہ حرافہ۔ اسی لئے تو بھگوان نے اسے اناتھ کر دیا ہے۔ جنم لیتے ہی ماں کو کھا گئی"

کوئی چاہے کچھ ہی کہے۔ پربتیا کا منورتھ تو پورا ہی ہوگیا۔ پربتیا نے اپنے گانوں سے آنے کی کہانی ستیش کو اس طرح سُنائی تھی۔ "بھیا جب ہم جانا۔ بابا ہم کا موسی کے گھرے بھیجت ہیں تو ہم گانوں سے باہر ایک ٹوٹ کھنڈھر رہے رہی ماں دن بھر چھپلے رہی۔ سانجھ کا [illegible] پانی پی اور بغیا سے آم توڑ کر کھائی۔ روز انگو کے دوارے دیکھ لیں سوچی کب گاڑی جاے تو ہم لکھنؤ جائے تو ہم جائی۔ ایک دِنا گاڑی کنڈن سے لدی، ٹھاڑ رہے ہم ہو چھپائے کے بیٹھ رہن۔ رنگو اندھیارے گاڑی ہانک دی ہیں۔ یہ ہی مارے جانے نہیں پایا کہ کو ذرا اور رو بیٹھ ہے۔"

ستیش نے پوچھا۔ "پربتیا بہنی تم موسی کے گھر نہ جا کر یہاں کیوں خوشی سے چلی آئیں؟"

پربتیا نے کہا۔ "بھیا جی اُن تو چمار جو رہے۔ ہمرے دادا سرکار کا پوت جو دیتے رہیں۔ کھلیانے مان ناج بیچ کے ہم کا کنیا لیکے پہلے ہی اَن سرکار کا پوت دیوے دوڑے اوت رہے۔ گھر مان چاہے کھائے کا رہے چاہے نہ رہے"

غریب پربتیا کیا جانے کہ پوت لینا زمیندار کا پیدائشی حق ہے۔ کسان چاہے کھائے چاہے بھوکا مرے۔ سبھی کسان بھوکے رہتے ہیں اور زمیندار مع بیگار کے پورا لگان وصول کرتے ہیں۔ صرف ستیش کو ہی نہیں پربتیا یہ بات گھر والوں کے علاوہ باہر والوں کو بھی زور زور سے سُنا دیتی ہے۔ "ہم کاہو کے آسرے ناہیں ہیں۔ ہمرے دادا چمار جیسے روپیہ سرکار کا دے جات رہیں"

کوئی کہتا بھی تمہارے دادا ہماری زمین بھی تو جوتتے تھے۔ کیا مُفت روپیہ دے جاتے تھے۔ گھر کے چھوٹے لڑکے تو دن میں دس بار یہی بات دُہراتے مگر پربتیا کے خیالات میں کوئی فرق نہ آتا۔ وہ سمجھتی سب اُسے چڑا رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کی ہی بات ٹھیک ہوتی تو اُس کا ستیش بھیا جیسے وہ سُنتی ہے کہ گھر بھر سے زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ پربتیا کو یہ بات کیوں نہیں بتاتا۔ وہ تو ہمیشہ ہی کہتا ہے "پربتا بہنی تمرے دادا بہت روپیہ ہمرے گھر پہونچا چکے ہیں۔ وہی روپے کی گنّی نئی صندوق میں دھری ہیں" اور سچ ہی دھری ہیں۔ ایک روز مالکن نے صندوق کھولا تو پربتا نے دیکھکر ستیش سے کہا تھا "بھیا مالکن کے پاس سونے کے پیسہ ہیں"

ستیش نے کہا۔ "پیسہ نہیں گنیاں ہیں"

پربتیا سوچتی دادا سرکار کو نہ دے کر اپنے پاس روپیہ جوڑتے تو اتنی ہی گنیاں ہوتیں۔ دادا کو بڑھاپے میں بھیک کاہے کو مانگنی پڑتی مگر نہیں دادا یہاں نہ رکھ جاتے تو پربتیا یہاں آتی کیسے۔ اور پھر ستیش جیسے پیار کرنے والے بھیا کہاں سے ملتے۔

اسکے ستیش بھیا نے کہا ہے کہ چوری کرنا بُری بات ہے۔ اسلئے اب پربتیا چوری نہ کریگی۔ جو چیز کھانے کی خواہش ہوگی مانگ لیگی یا اپنے ہاتھ سے لے لیگی۔ اُس کا گھر ہے۔ پربتیا افسوس کرتی ہے کہ کیوں نہ اس نے [illegible] رما کے باغ والی چوری کی بات ستیش بھیا کو سُنا دی۔ جو ستیش پہلے ہی اُسے [illegible] تو وہ اس گھر میں لڈو چُرا کر کیوں بدنام ہوتی۔ اب تو سبھی جانتے ہیں کہ پربتیا [illegible] ہے۔ پر اس سے کیا اب وہ سب کو یقین دلا کر رہے گی کہ اب وہ چوری نہیں کرتی۔ پہلے تو اسے معلوم نہ تھا کہ چوری کرنا بُرے آدمیوں کا کام ہے۔ پربتیا بُری نہیں ہے۔ وہ بُری ہوتی تو ستیش اُسے کیوں پیار کرتا اور پربتیا نہ کہکر پربتا بہنی کیوں کہتا۔ کیوں کہ ساتھ اُس کی ہی زبان میں بات چیت کرتا۔ ستیش جو کہے گا پربتیا وہی کرے گی۔ اس کے لئے وہی سچ ہے اور سب جھوٹ۔ اس کی بات نہ مان کر بھیا کو ناراض تھوڑے ہی کرے گی۔ بھلے ہی اسے سدھا لیتی۔ یہاں تک کہ چھوٹا منو بھی بگلا بھگتن۔ یا نو سو چوہے کھائے بلیا حج کو چلی۔ کہکر چڑالیں وہ سن لیگی اور دعوے کے ساتھ سب سے کہے گی۔

"دیکھو ایہو جواب ہم کبھوں چوری کری"

(۳)

مالکن جب ٹھاکرجی کا بھوگ لگا کر آرتی اتار رہی تھیں اسی وقت بھنڈار گھر سے بھنڈارن کی تلخ آواز ٹھیک ویسے ہی کان کے پردے کو پار کرتی ہوئی دماغ میں جا گھسی جیسے ہارن دیتی ہوئی موٹر بنگلہ میں گھس جاتی ہے۔ ٹھاکرجی کی بھوگ آرتی سب فضول گئی۔ وردان مانگتے وقت دھیان بھنگ ہو گیا۔ پوجا آدھی ہی رہ گئی۔

جھلائی ہوئی مالکن بھنڈارے میں پہونچی۔ سنا بھنڈارن کہہ رہی تھی: "واہ رے! واہ رے! مزاج گھی کی ہنڈیا کی ہنڈیا دال ماں الٹ لیہن۔ جب آئی رہے تو تن پر لتّو نہ رہا۔ ستیش بھیا کی لاکھن برس کی عمر ہوئے جو دیا کر کے رکھ لیہن۔ اور ای سر پر چڑھی آوت ہے۔ ہم بچپن کا رہت برسیں بیت گئیں مدا اس سا ہیں ناہیں جو بنا پوچھے تنکو توڑ سکی۔ اور کل کی آئی پر بتیا کا اس جگرا رام رام! ہر چیز پر ہاتھ ڈال دے! ہمار اب کاہے کا گجر ہوئی بھنڈارن تو وہ پر بتیا نہ بن جائی"

اور وقت ہوتا تو مالکن پر بتیا کا قصور معاف کر دیتیں پر اسوقت تو اسی کے سبب سے پوجا بھنگ ہو گئی۔ تب بھلا مالکن کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ تڑاتڑ چار پانچ طمانچے پربتیا کے گال پر جما دئے۔ پربتیا کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس کے اوپر ہاتھ اٹھایا۔ خوددار کی دیوی پربتیا۔

سامنے سے تھالی ہٹا ایک کونے میں جا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاید اتنا صدمہ اسے اپنے باپ کے مرنے پر بھی نہ ہوا تھا جتنا کہ آج اسکی خودداری پر دھکا لگنے سے معلوم ہوا۔ یہ اس کا رونا گویا پکار پکار کر کہہ رہا تھا یہ بالکوں جیسا رونا نہیں ہے۔

یہ نظارہ دیکھکر رسوئی میں بیٹھی ہوئی مہاراجن کا من بھر آیا وہ اتنا کہے بغیر نہ رہ سکی "مالکن، کھاتے وقت تو کتے کو بھی نہیں مارتے یہ تو پھر بچہ ہے" مالکن بھی اپنے غصے پر پشیمان ہو رہی تھیں! اور بھنڈارن سوچتی تھی کہ ناحق ذراسی بات کا بتنگڑ ہو گیا۔ بیچاری غریب لڑکی ہے۔ میرے آگے بھی تو بال بچے ہیں۔ تھوڑا سا گھی لے ہی لیا تو میرے باپ کا کیا بگڑتا تھا۔ اتنے نوکر چاکر ہیں سبھی تو کھاتے پیتے ہیں۔ یہی نہ کہ اسے مجھ سے مانگنا چاہیئے تھا۔ میں بھنڈارن ہوں۔

دن بھر گزر گیا۔ تمام گھر کھا چکا لیکن پربتیا روٹی لینے نہ آئی۔ تب مسرانی نے پکار مچائی۔ گھر بھر میں تلاش کیا لیکن پربتیا نہ ملی خود مالکن نے بھی ادھر ادھر ڈھونڈا مگر پربتیا دکھلائی نہ دی۔ یہ کون جانتا تھا کہ پربتیا شرم کے مارے کوڑے کباڑے کی کوٹھری میں منہ چھپائے پڑی ہے۔

پربتیا جب تک رو سکی خوب روئی جب جی بھر رو چکی۔ اٹھی اور سب سے اوپر والی کوٹھری میں جا کر لیٹ رہی۔ جیسے بہت رونے کا تھکا راہگیر درخت کے سایہ میں ہی لیٹ کر قناعت حاصل کرتا ہے۔ اور پربتیا کرتی بھی کیا۔ اس کا کون ہے جس کو وہ اپنی داستان سنائے۔ اسے تو اپنی شکل بھی دکھلانے میں شرم کا احساس ہوتا ہے۔ سب کہیں گے ذرا سے گھی کے لئے کیسی پٹی۔ ہائے آج اس کا ستیش بھیا بھی تو نہیں ہے۔ گاؤں گیا ہے۔ وہ ہوتا تو پربتیا پوچھتی کہ بھیا میرا کیا قصور ہے تمہیں نے تو کہا تھا اور مالکن کے سامنے کہا تھا کہ پربتا تمہارا گھر ہے جو چاہے کھاؤ۔ چوری نہ کرنا۔ پھر بغیر جرم اسے اتنی بدنامی کیوں اٹھانی پڑی۔ پیٹ ہی کی وجہ سے تو یہ بے عزتی ہے۔ اسی کے لئے وہ چوری کرتی تھی۔ اسے یاد ہے کہ چوری کرتے وقت اس کا دل کیسا دھک دھک کرتا تھا کتنا ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کہیں بابا جاگ نہ جائیں جو ناراض ہوں۔ سنگھو نے بابا کے آلم توڑ لئے تھے تو بابا نے اسے بہت مارا تھا۔ تمام گاؤں والے تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی دھڑکتے دل سے پربتیا چوری کرتی تھی۔ صرف اسی لئے کہ کوئی بھیک منگے کی بٹیا نہ کہے۔ جاڑے میں ٹھٹھرتے ہوئے بابا کے برتن مانجھنے جاتی۔ چونکہ دیتی تو ہاتھ گلجاتے لیکن پھر بھی جاتی۔ سب کچھ اس لئے کرتی کہ وہ بھیک منگے کی بٹیا کہلانا نہیں برداشت کر سکتی۔ بابا اگر اس کے دادا کو بھی برتن مانجھنے کے عوض کھلا دیتے تو اسے چوری کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

(۴)

گھر کے تمام لوگ سو گئے۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ پربتیا کو مارے بھوک کے نیند نہ آرہی تھی۔

بھوک اور نیند میں آپس میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ نیند کہتی "تمہاری طاقت میرے سامنے کچھ بھی نہیں۔ میں تو پربتیا کی آنکھوں پر اپنا قبضہ کر کے ہی مانونگی" بھوک ہنسکر جواب دیتی "دیکھنا ہے آج کس کی جیت ہوتی ہے۔ دنیا میں ایسی کونسی طاقت ہے جو میرا مقابلہ کر سکے" آخر میں بھوک ہی کی فتح ہوئی۔ ایکانت پا کر بھوک نے خوب اپنے ہاتھ پیر پھیلائے۔

بھوک کے زور کے ساتھ ہی ساتھ صاف ہوا نہ ملنے کی وجہ سے پربتیا کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کوٹھری سے باہر نکلکر میچ جھانکا

دیکھا چاروں طرف سناٹا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے نیچے اتر آئی اور ہاتھ منہ دھو کر پانی پیکر بھوک مٹائی۔ پھر چٹائی بچھا کر ندرا دیوی کو منانے لگی۔ پر وے اس قدر جلد کیسے آتیں۔ "بھوک لگنے لگی۔" مسرانی نے ضرور ہی رسوئی میں پر بتیا کے حصہ کے پراٹھے ڈھاک کر رکھدئے ہونگے۔ اور بھنڈارن بھی کافی ساگ سبزی۔ رائتہ رکھنا نہ بھولی ہوگی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ پر بتیا ستیش بھیا سے بغیر چغلی کئے نہ رہ سکے گی۔" مگر شدھا دیوی کی چالیں بیکار گئیں۔ آخر بھوک کو پر بتیا کی خودداری کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ پھر بھی اُس نے پیٹھ نہ دکھائی۔ لگاتار ڈھٹائی کے ساتھ تیر اندازی کرتی رہی۔

رات تو پر بتیا نے چُپکے سے بتا دی لیکن اب کیا کرے، صبح ہوتے ہی تو اُسے سب لوگ دیکھ لیں گے۔ آج اس میں اتنی ہمت کہاں۔ سب ہی کہیں گے۔ "رات جہاں جا کر مر گئی تھی وہیں جا۔" پھر اُسے تھالی پر سانے بھنڈار گھر میں جانا ہوگا۔ جہاں کھاتے وقت پٹی تھی نہیں نہیں یہ اُس سے نہ برداشت ہوگا۔ پھر کیا ترکیب کرے۔ ستیش بھیا کے کمرے میں قفل لگ رہا ہے۔ نہ بھیا ہیں نہ بھوجی۔ پر بتیا اس کمرہ میں بڑی میز کے نیچے لیٹ کر شرم کو خیرباد کہہ سکتی تھی۔ اس کمرے پر تو اس کا ادھکار ہے۔ جب لڈو چرانے پر مالکن نے پھٹکارا تھا اس مرتبہ بھی وہ اسی کمرے میں دن بھر پڑی رہی تھی۔ اُس کی بھوجی لکھدہ نے اپنے ہاتھ سے تھالی ستیش کی میز پر رکھی تھی اور ایک چھوٹی تھالی اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے سامنے فرش پر۔ بھیا کے بعد کوئی اُسے محبت کرتا ہے تو وہ بھوجی ہی ہیں۔ اور ستیش بھیا کا تو کہنا ہی کیا۔ انہوں نے اس روز کہا تھا۔ "پر بتا بہنی پہلے تم کھالو۔ نا ہیں تو ہم ہو نہ کھاب۔" مانو سارا دُلار اس وقت پر بتیا پر نچھاور ہو گیا۔

"کھا لو بھیا ہم ہو کھاب۔" یہ کہکر اُس نے روز سے دونا کھایا تھا۔ اور اُس کا غم نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ویسے ہی اُٹھکر وہ کھیلنے چلی گئی تھی۔ لیکن آج کوئی چارہ نہ دیکھکر وہ مکان سے باہر نکلی اور ایک طرف چلدی۔

(۵)

پر بتیا آہستہ آہستہ ایک سمت چلی جا رہی تھی۔ اُس کا دل دھڑ دھڑ دھڑک رہا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ لکھنؤ کے راستوں سے ناواقف ہو۔ یا ڈر رہی ہو۔ نہیں وہ تو منڈی چوک، امین آباد کی خاک چھان چکی تھی۔ لیکن آج جائے کہاں پہلا وقت ہوتا تو پر بتیا منڈی جاتی۔ آم چرا کر کھاتی اور گومتی کے کنارے

گھاٹ پر سو کر دو چار روز ستیش بھیا کے آنے کے انتظار میں یونہی گزار دیتی۔ پر چوری تو اب وہ ہرگز نہیں کر سکتی۔ چاہے بھوک سے مر بھلے ہی جائے۔

پھر کہیں نوکری کرنے جائے لیکن ڈر لگتا ہے۔ ستیش بھیا ناراض جو ہونگے۔ یہانتک وہ چلی کیسے آئی ستیش بھیا نے تو اکیلے گھومنے پھرنے کو منع کر دیا تھا۔ اب سڑک پر کھیلنے بھی تو جانے نہیں دیتے۔ باغ میں بھلے ہی کھیل لے اور آج ؟ گھر سے وہ اسقدر دُور چلی آئی ہے۔ بھیا جب سنیں گے تو ضرور ناراض ہونگے۔ بیچاری پر بتیا مایوس ہو کر رونے ہی کو تھی کہ اتنے میں اُس نے دیکھا سامنے سے موٹر پر ستیش بھیا آ رہے ہیں۔ خیالات نے پلٹا کھایا۔ نہ جانے دل میں کس قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ دماغ میں کن وچاروں نے چکر مارا اور وہ بڑی زور سے چلائی "بھیا!" اور دھڑام سے موٹر کے سامنے جا گری۔ ستیش نے بڑی ہوشیاری سے موٹر روکنے کی کوشش کی۔ جب موٹر رکی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی پر بتا بہنی کا سارا جسم خون آلودہ ہو رہا ہے۔ وہ گھر نہ جا کر بیہوش پر بتیا کو لیکر سیدھا اسپتال پہونچا۔ کسی مالدار لڑکی کے علاج کے لئے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا ستیش نے اُس بھیک منگے کی بٹیا کے لئے سب کچھ کیا۔ بڑے بڑے مشہور ڈاکٹروں نے بڑی ہوشیاری سے اس کی مرہم پٹی کی اور ستیش کو امید دلائی کہ جان بچ جائیگی۔ چوٹ ضرور گہری لگی ہے لیکن زیادہ خطرناک نہیں ہے۔

ستیش نے بھی ڈاکٹروں کی رائے سُنکر اطمینان کی سانس لی۔ اور سب کام چھوڑ کر پر بتیا کی تیمارداری میں لگ گیا۔ شام کے وقت پر بتیا کو ہوش آیا۔ ستیش کا دل خوشی سے کھل گیا۔ اُس نے دریافت کیا۔ "پر بتا بہنی اب جی کیسا ہے۔"

پر بتیا نے بولنے کی کوشش کی پر بول نہ سکی۔ ہاں آنکھوں سے دو بوند آنسو ٹپک پڑے۔ ستیش نے اپنے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "بہنی گھبراؤ نا۔ جلدی اچھی ہوئی جئی ہو۔"

تھوڑی دیر بعد پھر پر بتیا نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ اس مرتبہ روئی نہیں مُسکرائی۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھتے ہوئے کہا "اب بہت اچھی ہے آپ چاہیں تو گھر لے جا سکتے ہیں۔" ستیش نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کا ہے پر بتا بہنی تم کا گھر لے چلی۔"

پر بتیا نے ہاتھ کے اشارے سے بتلایا "نہیں۔" ستیش بھی رات بھر گھر نہ جا کر پر بتیا کے سرہانے بیٹھا رہا اور پر بتیا . . . .

سوتی رہی۔ دوسرے روز صبح اُس کی حالت بہت بہتر معلوم ہوتی تھی۔ ستیش کے ہاتھ سے دودھ پیکر بولی۔ "بھیا تم ہو روٹی کھائے آبو۔"

"ہاں بہنی کھاب۔ یہ تو بتابو گھر چلی ہو"

"ناہیں بھیا۔ سانجھے پھر چلب۔ اب ہیں جایا نہ جائی۔"

"اچھا سانجھے کا چلیو۔ اب سوئے رہو۔"

پربتیا سوگئی۔ ستیش نہانے، کھانے گھر چلا گیا۔ دوپہر میں جاگ کر ستیش کے لاکھ منع کرنے پر بھی پربتیا نے شروع سے آخیر تک اپنی ساری رام کہانی سُنا ڈالی۔ اور پھر اُسی طرح چلا کر رو اُٹھی۔ "بھیا!" تھکان سے آنکھیں بند ہوگئیں۔ ستیش اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ چلانے کی آواز سُنکر ڈاکٹر بھی دوڑ آیا۔ اور نبض دیکھکر بولا۔ "افسوس! بابو صاحب اچانک شاک پہونچنے سے ہارٹ فیل ہوگیا۔"

ستیش چلا اُٹھا۔ "ہائے، پربتا بہنی۔"

اپنے آتم گورو کو سمیٹے ہوئے پربتیا اُس گھر میں نہ جاکر دوسرے ہی گھر چلی گئی۔ شاید اس گھر کا مالک اس کے آتم ابھیمان کا آدر کر سکے۔

مُصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کا شہ پارہ

خانم

خانم میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں! اور ان میں سے ہر افسانہ بیحد مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

میری شادی۔ میری شہسواری۔ اندھیرا۔ کھو گیا۔ کستل چنبیلی کی کلی۔ یہ تصویر کس کی ہے۔ میں ایک بدمعاش میاں ہوں۔ ملویلے کی بلا۔ بندر کے سر سنگھنا۔ سانپ نمبر ۱ نمبر ۲ نمبر ۳۔ مٹھو بیٹے۔ ہنسمکھ موہن۔ اللہ جمیل و یحب الجمال۔ ہیرے کے بندے۔ پولٹری فارم۔ مچھلی کا شکار۔ شاطر کی بیوی۔ جن حضرات نے چغتائی صاحب کی شگفتہ تحریریں دیکھی ہیں جانتے ہیں کہ اُنکے ہر مضمون میں تبسم، ہنسی اور قہقہے سب ہی کچھ ہوتے ہیں! اور غمگین سے غمگین طبیعت کا انسان بھی اگر انکا مُطالعہ کرے تو بے اختیار ہو جائیگا۔ اور اپنے رنج و غم کو بھول جائیگا۔ یہ افسانے تفریحی ہونیکے ساتھ اصلاحی بھی ہیں بے تکلف میاں بیوی۔ جیٹھانی دیورانی کی نوک جھونک۔ شوخ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور گھریلو زندگی کی جو دلکش تصویریں آپ کو خانم میں نظر آئینگی کسی اور کتاب میں نظر نہیں آسکتیں۔ قیمت چار روپے (للعہ) علاوہ محصولڈاک۔

صمدانی

جنہوں نے ناکارہ حیدر آبادی کے مضامین "تماشہ پر تماشہ" "بی۔ اے، بی بی" "صمدانی" اور "مشرق و مغرب کی تحر" وغیرہ پڑھے ہیں جانتے ہیں کہ ان مضامین میں کیسے کیسے عجیب واقعات پیش کئے گئے ہیں! اور بعض مواقع تو ایسے ہیں کہ پڑھنے والا اپنا سانس تک روک کر لیتا ہے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ اس کتاب کے کئی باب ہیں اور ہر باب بجائے خود ایک مکمل افسانہ بھی ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو۔ دہلی

ساقی کے خاص نمبر رعایتی قیمت پر

خاص نمبر	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
جاپان نمبر (جنوری ۳۶ء)	ہم/ر	عہ/ر
ظریف نمبر (اپریل ۳۶ء)	۱۰/ر	۸/ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۶ء)	۱۲/ر	۹/ر
راشد الخیری نمبر (ستمبر ۳۶ء)	۸/ر	۶/ر
دانتے کا جہنم (اکتوبر ۳۶ء)	۱۲/ر	۱۰/ر
سالنامہ (جنوری ۳۵ء)	ہم/ر	عہ/ر
ظریف نمبر (اپریل ۳۵ء)	۱۰/ر	۸/ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۵ء)	۱۲/ر	۸/ر
چغتائی نمبر (اکتوبر ۳۵ء)	عہ/ر	۱۲/ر
سالنامہ (جنوری ۳۴ء)	عہ/ر	۱۲/ر
ظریف نمبر (اپریل ۳۴ء)	۱۰/ر	۸/ر
دلی نمبر (اکتوبر ۳۴ء)	۱۰/ر	۸/ر
ظریف نمبر (اپریل ۳۳ء)	۱۰/ر	۸/ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۳ء)	۱۰/ر	۸/ر
ناصر نمبر (ستمبر ۳۳ء)	۱۰/ر	۸/ر
دلی نمبر (اکتوبر ۳۲ء)	۱۲/ر	۸/ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۲ء)	۱۰/ر	۸/ر
سالنامہ (جنوری ۳۱ء)	عہ/ر	۱۲/ر
افسانہ نمبر (جولائی ۳۱ء)	۸/ر	۶/ر

انوکھی مسکراہٹ

ہمارے اکثر کردار جو ظاہرا بے معنی و مہمل معلوم ہوتے ہیں اور جو غیر ارادی طور پر ہم سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ ہمارے عہد طفولیت کے کسی خاص تاثرات کے نتیجے ہیں جو اس وقت کے ماحولی اثرات سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان ماحولی اثرات کی غیر موجودگی میں ان کردار کا ظہور بادی النظر میں بلاشبہ بے علت و سبب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اُن اثرات کی تہ تک پہونچ جاتے ہیں تو پھر اُن کردار کے محرکات پر پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ یہ محرکات چونکہ عموماً ہماری روزمرہ شعوری زندگی کے بنا کردہ آئین و اصول کے متناقض ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ہمارے ذہن لاشعوری میں پناہ گزیں رہتے ہیں اور وہیں سے ہمارے اعمال و کردار پر اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کرشمہ سازیاں قطعاً غیر ارادی و غیر معمولی طور پر ہوا کرتی ہیں۔ ذیل کا افسانہ اسی نفسیاتی حقیقت کی تشریح ہے۔

"محسن"

"کیا کر رہی ہو بیٹیا؟" بڈھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس کے دل کی غمناکی کے اثر سے جیسے ناامیدیوں نے برف کی طرح سرد کر دیا تھا۔

"کرتے میں پیوند لگا رہی ہوں بادا۔ کیا ہے؟" جمنی نے باپ کے قریب آکر کہا۔

"کچھ نہیں شام کے لئے چاول تو نہ ہوں گے۔ دو دن سے کوئی مُردہ نہیں آیا۔ اب صرف یہ اکنی ہمارے پاس رہ گئی ہے۔ بیٹیا جب تو بچہ تھی اُس وقت اسی قبرستان میں روز دو دو تین تین مردے آیا کرتے تھے۔ دُور دُور تک کوئی اور قبرستان نہ تھا۔ مجھے دن دن بھر فرصت نہ رہتی۔ اکیلا آدمی، دفن کا سارا انتظام مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن جو ملتا اُڑا دیتا۔ اس دن کی خبر نہ تھی۔ ایک تو یہاں اب صرف غریبوں ہی کے مُردے آتے ہیں۔ لڑ جھگڑ کر ان سے کہیں دو چار پیسے وصول ہوتے ہیں۔ برس چھ مہینے میں کوئی امیر مسافر مر گیا اور اُس کے عزیز آ گئے تو کچھ رقم مل گئی۔ لیکن آجکل تو ایسا سناٹا ہے کہ دو دو چار چار دن کوئی مُردہ نہیں آتا۔ اب یہ آخری اکنی رہ گئی ہے۔ کوئی کپڑا ہو تو دو رات کے کھانے کے لئے بازار سے کچھ لیتا آؤں۔ کوئی آئے تو میرا انتظار کرانا۔ کہنا بادا ابھی آتے ہیں"

آخری جملے پر بڈھے کے سوکھے ہوئے چہرے پر ایک چمک نمودار ہوئی مستقبل کا تصور لاکھ ناامیدیوں میں گھرا کیوں نہ ہو۔ پھر بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بڈھے نے اپنی لکڑی اٹھائی اور جھونپڑی سے نکل گیا۔

اُس کے بدن پر ایک میلی جا بجا پیوند لگی سیاہ عبا تھی۔ اس کے بال لٹکے ہوئے تھے اور لمبی سفید ڈاڑھی بکھری ہوئی تھی۔ برسوں سے حجام نے انھیں ہاتھ نہ لگایا تھا۔ چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ کمر ضعف سے جھکی ہوئی تھی۔ ناطاقتی سے پیر چلنے میں ہلتے اور قدم مشکل سے جمتا تھا۔

وہ قبرستان کا مجاور تھا۔ قبرستان آبادی سے بہت دور تھا۔ سُنسان میدان میں یا تو جا بجا کچھ پختہ قبروں کے نشان نظر آتے یا بڈھے کا افلاس زدہ جھونپڑا۔ مُردوں کی اس بستی میں صرف یہ دو زندہ جانیں رہتی تھیں۔ جمنی کی ماں اس کے بچپن میں مر چکی تھی۔ بڈھے نے پھر بیاہ نہ کیا۔ وہ جمنی کو بہت چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اِس دنیا میں اس کا سوائے جمنی کے کوئی نہ تھا۔

جمنی باپ کے جاتے ہی پھر پیوند لگانے بیٹھ گئی۔ اُسے بھی تعجب تھا کہ اب لوگ کیوں نہیں مرتے۔ اگر مُردے آنا بند ہو گئے تو پھر اس کا باپ کیا کرے گا؟ دال چاول کہاں سے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کو پکا کر کیا دیا کرے گی؟ وہ دیر تک سوچ نہ سکی۔ اس لئے کہ اس کا ذہن ابھی ان حالات پر غور کرنے کا اہل نہ ہوا تھا۔ وہ تو ابھی تصوّرات کی دُنیا میں رہتی تھی۔ اُس کا سِن ہی کیا تھا۔ ماحول کی ضرورتیں ایک پختہ کار دماغ کو متوجّہ کر سکتی ہیں اس کا دماغ صرف ماضی و مستقبل کی آزاد تصویریں پیش کر سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

پارسال کیا اچھا زمانہ تھا جب سارے شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔

قبرستان میں دن بھر لاشوں کا تانتا لگا رہتا۔ اس کا باپ کتنا خوش نظر آتا تھا، باوجود دن رات کی مصروفیت کے۔ اپنے باپ کو کبھی اُس نے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لئے طرح طرح کی مٹھائیاں لاتا۔ اتنی مٹھائی اس نے کبھی نہ کھائی تھی۔ کسی تہوار میں بھی نہیں۔ اُس کے اچھے کپڑے سب اسی زمانہ کے تھے۔ وہ کُرتہ بھی جس میں دو پیوند لگا رکھے تھے کیسا اچھا کپڑا تھا۔ اتنا پُرانا ہونے پر بھی اُس کی آب و تاب ویسی ہی تھی۔ اور وہ ساڑی جو اُس نے عید پر پہنی تھی اس کا باپ کہتا تھا کہ وہ ساڑی اُسے بہت بھلی لگتی تھی۔ اب کے تہوار پر وہ پھر اسی ساڑی کو پہنے گی۔

"جمنی!" بڈھے نے جھونپڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پکارا۔ اُس کے کاکل اور ڈاڑھی کے بال گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ چہرہ کی شکنوں میں خاک کے ذرّے بھر گئے تھے جن سے چہرے کے نشیب و فراز میں کمی ہو گئی تھی۔ قدرت کا کریمانہ ہاتھ وقت کے تخریبی عمل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڈھے کے کاندھے پر دو چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں۔ ان کا وزن کچھ ایسا نہ ہوگا لیکن بڈھے کی کمر او جھک گئی تھی۔ عمر کا بوجھ اس کی پیٹھ پر کب کم تھا کہ وہ اور زیادہ وزن برداشت کر سکتا۔ زندگی کا بھی وزن ہوتا ہے جو ہر سانس کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آخر عمر میں کمر جھک جایا کرتی ہے۔ جمنی نے گٹھڑیاں باپ کے کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھ دیں۔ بڈھا چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ چہرہ کا پسینہ اَٹی ہوئی خاک کو گوندھ رہا تھا۔ اور سانس کی تیز رفتار سے چہرہ میں جو حرکت پیدا ہو رہی تھی اس سے بھیگی ہوئی خاک کے خوردبینی پُتلے بن رہے تھے۔ فطرت کی تخلیق یہاں بھی جاری تھی۔

"بیٹا کون آیا تھا؟" اس نے جمنی سے سوال کیا۔

"نہیں بابا!" جمنی نے کہا۔ اور باپ کی پھٹی ہوئی کفنی تہ کر کے الگنی پر ڈالنے لگی۔

"کوئی نہیں!" اب ہماری قسمت بگڑ گئی ہے۔ ورنہ اتنی کم موت شہر میں شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ باپ دادا کا پیشہ ہے، چھوڑا نہیں جاتا۔ ورنہ پیالہ لے کر در بدر بھیک مانگتا تو اس سے بہتر ہوتا۔ پھر اپنی غیرت بھی گوارا نہیں کرتی۔ اس وقت لوگ مجھکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص شاہ صاحب شاہ صاحب کہتا ہے۔ بھیک مانگنے نکلوں گا تو جانے کون کس طرح پیش آئے۔ مگر اب اس پیشہ سے روٹی کیونکر چلے گی۔ جوانی تو اس عیش میں گذری اب بڑھاپے میں ایسی مصیبت۔ یا اللہ!" بڈھا یہ کہہ کر رونے لگا۔ آنسو کے دو بڑے بڑے قطرے گرد آلود چہرے پر اپنا نشان چھوڑ کر بڈھے کی ڈاڑھی میں کھو گئے۔ باپ کو روتا دیکھ کر جمنی باپ کے گلے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ دنیا والے کسی کی موت پر روتے ہیں۔ یہ باپ بیٹی دنیا والوں کی زندگی پر آنسو بہا رہے تھے۔

رات کے دو بجے ہیں۔ بڈھا چٹائی پر لیٹا کھانس رہا ہے۔ جمنی بے فکری کی نیند سو رہی ہے۔ رات نہایت تاریک اور بھیانک ہے۔ بڈھے کا دماغ مستقبل پر غور کرنے میں منہمک ہے۔ اس کے بعد دنیا میں جمنی کا کوئی نہیں۔ اس کی زندگی کس طرح گذرے گی؟ اگر وہ اُسے بیاہنے سے پہلے مر گیا تو پھر اُس کا بیاہ کیونکر ہوگا۔ اُسے جمنی کا مستقبل نہایت تاریک نظر آنے لگا۔ رات کی تاریکی میں جھونپڑی کے اندر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ایک لو تھی۔ لیکن اس کے دماغ کی تاریکی میں کہیں روشنی کا نام نہ تھا۔

"شاہ صاحب!" ماحول کی سیاہ خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز اس کے کان میں پہنچی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ جھونپڑی کے باہر ایک شخص اسے پکار رہا تھا۔

"کون ہے؟ مجھکو بلاتے ہو۔ کیا کام ہے؟"

"دلی والے سوداگر کے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ صبح سویرے یہاں آئے گا۔ آپ قبر وغیرہ کا انتظام درست رکھئے۔"

دلی والے سوداگر کا نام سُنکر بڈھے کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ یہ ایک پردیسی بڑے تاجر تھے۔ بڈھے کو روپئے کافی مل جائیں گے۔ غائت مسرت میں اس نے رات کا باقی حصہ آنے والے روپئوں کی چمک اور چھنک کے تصور میں جاگ کر گذار دیا۔ اور صبح سے پہلے قبر کے انتظام میں جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اُس کی سُوکھی ہوئی ٹانگوں میں پھرتی آ گئی تھی اور کمر کی خمیدگی میں کچھ کمی۔ مسرت و انبساط میں ہی قوت و توانائی کا راز مضمر ہے۔ خواہ اس کا لگاؤ مستقبل کے تصوراتی پیکروں ہی سے کیوں نہ ہو۔

جمنی صبح اٹھکر جھونپڑی میں جھاڑو دے رہی تھی۔ باہر سے کچھ لوگوں کے گذرنے کی آواز آئی۔ جمنی دروازے پر آ کر دیکھنے لگی۔ بہت سارے آدمی ایک جنازہ کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، کچھ لوگ آپس میں گفتگو کرتے جا رہے تھے۔

ایک نے کہا "کیسا اکیلا نوجوان تھا!"

دوسرے نے جو قریب ہی سے جنازہ کے ساتھ ہو گیا تھا سوال کیا "آخر اس بیچارے کو ہوا کیا تھا؟"

"کیا بتائیں بھائی" پہلے نے جواب دیا۔ ایک عورت سے اس کا کچھ دنوں سے تعلق تھا۔ اس چڑیل نے اپنے ایک آشنا کے بہکانے سے کل رات اس بیچارے کو زہر دے دیا۔ دن بھر اسکی حالت خراب رہی اور آخر سہ پہر سے پہلے رخصت ہو گیا۔ افسوس میرا بڑا دوست تھا۔"

جمنی ان کی گفتگو بغور سنتی رہی اور جب وہ کچھ آگے نکل گئے تو وہ اپنی نظریں جنازے پر جمائے بے اختیارانہ ہنسنے لگی۔ اور پھر جھونپڑی کے اندر جا کر جانے کب تک ہنستی رہی۔ جھاڑو دینے میں آج اُسے ایک خاص لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اور دن جلد جلد جھاڑو دیکر دوسرے کاموں میں مصروف ہو جایا کرتی لیکن آج اس کا جی چاہتا تھا کہ برابر جھاڑو دیتی رہے اور ساتھ ہی ہنستی جائے۔ آج اس کے جھاڑو دینے کے انداز میں رقص کی کیفیت تھی۔ جھاڑو کی حرکت اور کمر کی جنبش میں ایک انوکھی ہم آہنگی تھی۔ اگر کوئی ماہر رقص اُسے دیکھتا تو اُسے ایک خاص نوع کے رقص کا القا ہوتا۔

بڈھا قبرستان سے جھونپڑی میں آیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ چہرے پر غائت انبساط سے ایک ہلکا گداز پیدا ہو گیا تھا جس سے چہرے کی شکنوں میں ایک پھیلاؤ آ گیا تھا۔ بڈھے کا مُردہ شباب اپنے اعادہ کی کوشش کر رہا تھا۔ مسرت کی برقی رَو نے اس میں جان ڈال دی تھی۔ انسان اگر ہمیشہ مسرور ہی رہتا تو وہ کبھی بوڑھا نہ ہوتا۔ لیکن پھر مسرت بھی تو بے معنی و بے اثر ہو جاتی۔ بڈھے کو روپے کافی مل گئے تھے۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں جمنی کے حوالے کیا۔ جمنی نے ایک سال سے اتنے روپے نہ دیکھے تھے دیر تک ہتیلی پر رکھے انھیں دیکھتی رہی۔ چاندی کے سکوں کی تابانی سی اس کے چہرے پر چمک پیدا ہو رہی تھی۔

"جمنی!" حنیف نے باہر سے آواز دی۔ اس کے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا۔ ہر ہفتہ اُسے پاس کی بستی میں ڈاک لیجانا ہوتا تھا۔ آتے جاتے وہ اکثر بڈھے کے یہاں کچھ دیر بیٹھ جاتا۔ جمنی اپنے باپ کے علاوہ صرف حنیف کو جانتی تھی۔ وہ اس سے بے باکانہ باتیں کرتی۔ اس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں سوسائٹی کی ساری بندشیں اور رسوم و قیود کی متسخرانگیزانہ پامالی ہوتی۔ اور ان کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جاتا۔ پھر وہ سوسائٹی کی ان رکاوٹوں کو کیا جانتی جنھیں شرم و حجاب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حنیف جوان تھا۔ خوبصورت بدن لانبے قد والا۔ بڈھے کو اس سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا کہ اس کا جمنی سے اتنا آزادانہ ملنا اُسے کبھی گوارا نہ ہوتا۔

"کیوں؟ شاہ صاحب کہاں ہیں؟"

"بازار گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ تم اس ہفتہ نہ آئے تھے۔ میں تمھاری راہ دیکھتی رہی۔ باوا بھی پوچھ رہے تھے۔"

اس دن میں چھٹی لیکر گھر چلا گیا تھا۔ تم راہ کیوں دیکھتی رہیں کیا کوئی کام تھا؟

"نہیں تو یوں ہی پوچھ لیا۔ گمان ہوا کہ شاید تم بیمار پڑ گئے نہیں آنا تھا تو پہلے کہہ دیتے۔ ہم لوگوں کو کچھ خیال نہ تھا۔"

"گھر سے بھائی کی ایکا ایکی چٹھی آ گئی۔ وہ بیمار ہو گئے تھے۔ اُسی دن چھٹی کی درخواست منظور کرا کر چلا گیا۔ تمھاری طرف آنے کا وقت نہ ملا۔ کیا تم دن بھر انتظار کرتی رہیں؟"

حنیف کی گفتگو میں محبت کی حلاوت تھی۔ اس کی آنکھیں اسکا راز فاش کر رہی تھیں۔ حنیف کو جمنی سے محبت تھی۔ بے پناہ۔ گو اسکا احساس ان دونوں میں سے کسی کو نہ ہوا تھا۔ محبت اپنا پہلا وار چوری سے کیا کرتی ہے۔ اور اتنا ہلکا کہ محبت کرنیوالے کو اس کی تمیز نہیں ہوتی پھولوں کی مار سے بھی چوٹ لگتی ہے لیکن اس چوٹ کا احساس چوٹ کی طرح نہیں ہوتا۔ اگر محبت کا پہلا ہی وار چوکھا ہو تو پھر کوئی اُسے دل میں گھسنے ہی کیوں دے۔ اس کی قیامت خیزیاں تو اس وقت شروع ہوتی ہیں جب وہ دل میں اپنا گھر بنا چکی ہوتی ہے۔

"کیوں انتظار کرتی رہی؟ کیا کوئی دوسرا کام کرنے کو نہ تھا"

جمنی کے جواب میں شوخی و شرارت کی آمیزش سے ایک دلکش لوچ پیدا ہو گیا تھا۔ حنیف اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اچھا اب جانا ہے۔ بہت سی ڈاک باقی رہ گئی ہے۔ شاہ صاحب آئیں تو میرا سلام کہہ دینا۔"

جمنی نے گردن کی ایک ساحرانہ جنبش سے جس کا حسنِ ادا آنکھوں کی گردش اور لبوں کی ہلکی مسکراہٹ کیساتھ ہر دو عالم سے بے نیاز بنا دینے کو کافی تھا حنیف کو رخصت کیا۔

بڈھا بخار سے ہانپ رہا ہے۔ جمنی سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی ہے۔ بڈھے کو دو دن سے بخار ہے۔ شدت کی کھانسی کیساتھ

اس سنسان آبادی میں کوئی نہیں کہ بڈھے کے لئے کہیں سے دوا لاکر دیتا۔ بڈھے کا بخار بڑھتا گیا یہاں تک کہ دماغ پر اثر ہو گیا۔ جمنی نے آج تک کسی کو بیمار ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن میں مر گئی تھی۔ اور اس کا باپ کبھی اس طرح بیمار نہ ہوا تھا۔ اُسے خبر نہ تھی کہ اس بیماری کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں بڈھے کی تکلیف دیکھ کر اُسے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ باپ کو "بادا، بادا" کہہ کر آواز دیتی اور جب کوئی جواب نہ ملتا تو اُسے ایک غم آلود حیرانی و استعجاب ہو جاتا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ بڈھا دم توڑ رہا تھا۔ اور جس طرح اس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے سو مردوں کو زمین کے نیچے چھپا دیا تھا اسی طرح اس کا نشان بھی خاک کے اندر کھویا جانے والا تھا صبح ہوتے ہوتے بڈھے کی روح پرواز کر گئی۔ جمنی نے مُردے ہزاروں دیکھے تھے لیکن کفن کے اندر ڈھکے ہوئے موت کا منظر اس نے پہلی بار دیکھا۔ اس کے باپ کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، سانس کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ بدن سرد ہو گیا تھا۔ باپ کی حالت دیکھکر اس کے دل میں گداز پیدا ہوا۔ اور وہ بے اختیارانہ رونے لگی۔ وہ اس لئے نہیں رو رہی تھی کہ اس کا باپ اس سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا بلکہ اس لئے کہ اپنے باپ کی اس غیر معمولی حالت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے آنسو اس کے فہم و ادراک کی مجبوری کا اظہار تھے ہم اکثر جب مجبور و بے بس ہو جاتے ہیں تو رونے لگتے ہیں تاکہ دوسروں کو ہماری بے دست و پائی کا احساس ہو۔

صبح کو حسب معمول حنیف ڈاک کا تھیلا لئے جھونپڑی میں داخل ہوا۔ جمنی اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ دیر سے حنیف کی منتظر تھی۔ اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ وہ اُس کے باپ کی اس غیر معمولی کیفیت کا راز اُسے بتا سکے گا۔ حنیف سے اس نے بارہا مختلف باتوں کی بابت سوال کیا۔ اور اس نے برابر اس کی تشفی کر دی تھی۔

"دیکھو تو بادا کو کیا ہو گیا ہے؟"

حنیف نے بڈھے کے قریب جا کر دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ جمنی بھی رونے لگی۔

"شاہ صاحب سدھار گئے اُن کے دفن کا سامان کرنا چاہئے" حنیف نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر میں حنیف چند آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا۔ جنازہ تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جایا جانے لگا۔ جمنی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرانے لگی۔ اور جب تک جنازہ اس کی نظروں کے سامنے رہا مسکراتی رہی۔ جنازہ دفن ہو چکا تو ایک بارگی اس پر افسردگی چھا گئی۔ قبرستان سے لوٹنے والوں میں اس کا باپ نہ تھا۔ یہ اُس کے لئے ایک غیر معمولی مشاہدہ تھا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور مسکراہٹ کی جگہ آنسوؤں کی دو بڑھتی ہوئی دھاروں نے لے لی۔

حنیف جمنی کو اپنے گھر لے گیا اور دونوں کا بیاہ ہو گیا۔ جمنی کیلئے حنیف کا گھر ایک نئی دُنیا تھی۔ وہ پہلے صرف اپنے باپ اور حنیف کو جانتی تھی۔ عورت و مرد کا فرق تک اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا اسلئے کہ اُسے کسی عورت سے سروکار نہ ہوا تھا۔ یہاں اُسے بہتیری عورتوں سے واسطہ تھا۔ قبرستان کے ماحول کے لئے جمنی اپنے باپ کے ساتھ مر چکی تھی اور جس طرح اس کا باپ اس دُنیا سے گذر کر ایک دوسرے عالم میں پہنچا ہوا تھا جمنی بھی ایک عالم سے منتقل ہو کر دوسری دُنیا میں بس رہی تھی۔ ہم اس زندگی میں بھی کتنی بار مر کر جیتے ہیں۔ جوانی کا نمود بچپن کی موت سے ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی آمد جوانی کیلئے پیام مرگ ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں لوگ موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے۔ حنیف جمنی کو پروانہ وار چاہنے لگا۔ وہ اُس سے ایک منٹ کو علیحدہ ہونا گوارا نہ کرتا تھا۔ جمنی بھی حنیف کی عدم موجودگی میں بیقرار سی رہتی۔

ہمسایہ کا لڑکا شب کو مر گیا۔ جمنی کو صبح سویرے خبر ملی۔ وہ جلد جلد گھر کا کام کر کے ہمسایہ کے ہاں جانے لگی۔ وہ آج بہت خوش تھی، اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی دلکشی و جاذبیت کم ہو گئی تھی۔ حنیف اُس کی مسرت کا سبب نہ سمجھ سکا۔ جس وقت وہ ہمسایہ کے یہاں جا رہی تھی حنیف نے اس سے سوال کیا۔

"کیوں آج تم بہت خوش معلوم ہوتی ہو؟"

جمنی نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ حنیف کے دل و دماغ پر جمنی کی محبت اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ وہ جمنی کے سامنے کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔

اس بے معنی تبسم پر اس نے جمنی کے جانے کے بعد کوئی غور نہ کیا۔ جمنی ہمسایہ کے ہاں گئی تو بچہ کی لاش کو اس وقت کفنایا جا رہا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی وہ اس منظر سے لذت حاصل کر رہی تھی۔ برابر کی ایک عورت نے جمنی کی اس کیفیت کو دیکھ لیا۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ جمنی ان بھولی بھالی

ہردلعزیز تھی۔ اس کے خلاف کسی کو کسی طرح کا گمان نہ ہوسکتا تھا۔ محلّہ میں کوئی موت ہوتی تو جمنی وہاں ضرور پہونچتی اور دور سے کھڑی ہوکر مسکراتی رہتی۔ اُس کی اس انوکھی مسرّت کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ اور محلّہ والیاں جمنی کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ حنیف کو بھی اس کی بھنک ملتی رہتی۔ وہ جمنی سے اس کی بابت سوال کرتا تو جمنی مخبوط و سراسیمہ سی ہوجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بیگناہ پر جُرم کا الزام لگایا جارہا ہے۔ حنیف نے جمنی کو منع کردیا کہ وہ آئندہ کسی موت کی خبر سُن کر نہ جایا کرے۔ جمنی نے وعدہ کیا کہ وہ اب نہ جائیگی۔ لیکن جب کبھی اُسے موت کی خبر ملتی اُس کے قدموں میں بجلی کی سی پھُرتی آجاتی اور وہ غیرارادانہ گھر سے نکل جاتی۔ حنیف کو جمنی سے کچھ خوف پیدا ہونے لگا۔ گو اب تک اس کا طلمانی اثر محبّت کی پھیلی ہوئی روشنی کے آگے معدوم تھا۔ ہم ہر اس چیز سے جو ہماری فہم سے بالاتر ہو ڈرنے لگتے ہیں۔ مذہب میں خوف کا عنصر اس کی رمزانہ خصوصیت کے سبب سے ہے۔

جمنی کا بچّہ تین دن سے بیمار ہے جمنی دن رات اُس کی خدمت میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر نے نمونیہ تجویز کیا ہے۔ حنیف نے دوا کی دو شیشیاں جمنی کو لاکر دیں۔ ایک کھانے کی اور دوسری سینہ پر مالش کرنے کی۔ مالش کرنے والی دوا پر پوائزن کی چٹ لگی تھی۔

"اس دوا کو الگ رکھنا اس میں زہر ہے۔" حنیف نے جمنی سے کہا۔ جمنی نے دوا الگ طاق میں رکھ دی۔ بچّہ کی حالت شام تک کچھ سنبھلنے لگی۔ بخار میں کمی اور کھانسی میں تخفیف ہوگئی۔ جمنی تین شب سے نہ سوئی تھی۔ بچّے کے پہلو میں بیٹھی بیٹھی سوگئی۔ آدھی رات کو جمنی ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑی ہے۔ اس کا باپ قبرستان میں ہے۔ سامنے سے کچھ لوگ ایک لاش کاندھے پر اٹھائے قبرستان کو جارہے ہیں۔ اور آپس میں گفتگو کررہے ہیں "ایک عورت نے اس بیچارے کو زہر پلادیا۔" جمنی یکایک بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر موت کا سا پیلا پن تھا۔ آنکھیں باہر کو نکلی آرہی تھیں۔ لبوں پر تھرتھراہٹ کے ساتھ ایک خوفناک مسکراہٹ تھی۔ اس کے اعضا کرّے ہورہے تھے۔ اس کی مُردہ سی سخت ٹانگوں میں یکایک جنبش پیدا ہوئی۔ اس نے طاق کی طرف تیزی سے قدم بڑھایا اور زہر والی شیشی کو جھپٹ کر ہاتھ میں لیا اس کا چہرہ اور بھیانک ہوگیا۔ موت کا فرشتہ اس کے جسم میں حلول کرگیا تھا۔ شیشی مٹھی میں جکڑے وہ نہایت سُرعت سے بچّہ کے قریب آئی اور اس کے نازک جبڑے اپنے دونوں ہاتھوں سے جنمیں آہنی سلاخوں کی سی سختی آگئی تھی کھول کر شیشی کی ساری دوا بچّہ کے منہ میں اُنڈیل دی۔ اور کھلکھلاکر ہنستی ہوئی بستر پر گرگئی۔ وہ جلد ہی سوگئی۔

کچھ دیر بعد بچّہ کے کراہنے سے اس کی نیند ٹوٹی۔ بچّہ کرب و اذیت سے تڑپ رہا تھا۔ آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ سارے جسم میں تشنج تھا۔ بچّہ کی حالت دیکھ کر جمنی نے اُسے کلیجہ سے لگالیا اور ڈاڑھیں مار کر رونے لگی۔ حنیف قریب ہی سویا تھا اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ بچّہ کی حالت اخیر تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بے جان ہوگیا۔ صبح کی روشنی میں حنیف کی نظر زہر کی خالی شیشی پر پڑی جو بچّہ کے سرہانے پڑی تھی۔

"تم نے بچّہ کو دوا رات کس وقت دی تھی؟" حنیف نے غضبناک ہوکر پوچھا۔

"میں تو شام سے سوئی تھی۔ اٹھی تو اس کی یہ حالت تھی" جمنی نے سسکتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ خالی شیشی یہاں کہاں سے آئی؟" حنیف نے شیشی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جمنی کی نظر شیشی پر پڑی۔ اُسے خود حیرت تھی کہ اسے طاق میں سے کون لایا تھا۔ جمنی کا استعجاب دیکھکر حنیف کا سر چکرانے لگا۔ اس کا دماغ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ زہر کی شیشی اس نے طاق میں رکھدی اور بیہوش ہوکر بستر پر گرگیا۔ صبح کو محلہ والیاں بچّہ کی خیریت پوچھنے آئیں تو ایک طرف حنیف بستر پر پڑا تھا دوسری طرف جمنی غم سے چور بچّہ کو دیوانہ وار چھاتی سے لگائے بیٹھی تھی۔ بچّہ کی موت پر کسی کو تعجب نہ تھا۔ بچّہ کی حالت کل دن میں ہی غیر تھی۔ محلّہ والوں نے مل کر بچّہ کی تجہیز وتکفین کا انتظام کیا۔ حنیف کو ہوش نہ تھا۔ سبھوں نے سمجھا کہ پہلی چوٹ لگی ہے غم سے چور ہورہا ہے۔ بچّہ کی لاش جب قبرستان کو لے جانے لگے۔ تو جمنی اکبارگی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کی نظریں جنازے پر لگی اور چہرے پر وہی پُراسرار تبسم تھا۔

حنیف بستر پر گرا تو پھر نہ اُٹھا۔ جمنی اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہیبت ناک دیونی کی صورت ہر وقت گھومتی رہتی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ جمنی اس کا گلا دبا رہی ہے۔ اور وہ یکبارگی چیخ اُٹھتا۔ جمنی کی پُرمعنی مسکراہٹ اس کے دل ودماغ میں چبھ رہی تھی۔ اس کے جسم میں خوف و ہراس سے شدت کا لرزہ رہتا۔ اس کے حواس کسی وقت بجا نہ ہوتے

تھے اس کا بھائی اس کی بیماری کی خبر سُنکر آگیا۔ اُس نے سارے جتن کر ڈالے لیکن حنیف کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ جمنی غم سے گھُل کر آدھی ہوگئی تھی۔ آخر ایک دن رات کے دو بجے حنیف کی حالت بالکل غیر ہوگئی۔ اُس کا بھائی سرھانے بیٹھا رو رہا تھا۔ جمنی الگ مُنہ چھپائے رو رہی تھی۔ حنیف کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے "جمنی ڈائن ہے۔ اس سے مجھ کو بچاؤ۔ یہ مجھکو کھا جائے گی۔ زہر اس نے زہر . . ." اتنا کہنے پر اس کی آواز بند ہوگئی۔ اور اُس کا بدن ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہوگیا۔

حنیف کے بھائی نے اُس کے ہذیان پر اتنی توجہ نہ کی۔ وہ بچوں کی طرح ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ صبح کو حنیف کی لاش تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جانے لگے تو جمنی پر وہی غیر معمولی تبسم کھیل رہا تھا۔ وہی ڈراونی ہنسی۔ موت کی دیوی کو اگر کبھی ہنسی آتی ہوگی تو اس کا تبسم بھی ایسا ہی ہیبت ناک ہوگا۔ حنیف کے بھائی نے جمنی کی مسکراہٹ دیکھ لی۔ اس کا دماغ فوراً حنیف کے آخری الفاظ کی طرف منتقل ہوگیا۔ دفن سے واپس آیا تو اس نے جمنی کو بُلا کر پوچھا "مُردار! شوہر کی موت پر مُسکرائی کیوں تھی؟"

جمنی کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو غم و اندوہ نے اس میں اتنی طاقت کہاں چھوڑی تھی کہ اس کے لب جواب کے لئے ہل سکتے۔ اس نے سکوت اختیار کیا۔ حنیف کے بھائی کو یقین ہوگیا کہ جمنی نے حنیف کو زہر دیدیا۔ خبر اڑتی پڑتی تھانہ تک پہنچ گئی۔ پولس تفتیش کیلئے آگئی۔ حنیف کے بھائی نے حنیف کا موت کے قبل کا بیان اور جنازہ کو دیکھ کر جمنی کا اظہار مسرت، پولیس سے کہہ دیا۔ جمنی حراست میں لے لی گئی۔ مکان کی تلاشی ہوئی۔ طاق میں زہر کی خالی شیشی موجود تھی۔ پولیس کے نزدیک گمان و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

جمنی پر خون کا مقدمہ چلایا گیا۔ واقعاتِ متعلقہ مجرم کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھے۔

جمنی کو قید دوام کی سزا ہوگئی۔

جمنی اب تک قید خانہ میں زندگی کے دن گذار رہی ہے۔ وہ بہت اداس و غمگین رہتی ہے۔ لیکن اب بھی جب اس کی نظر کسی قیدی کی میت پر پڑ جاتی ہے تو وہ کھل کھلا کر ہنس دیتی ہے اور دیر تک دیوانہ وار ہنستی رہتی ہے۔

اُس کی یہ پُر اسرار ہنسی قیدیوں کے لئے بھی ایک عقدہ لاینحل ہے۔

سیّد محمد محسن

مجھے آمادگی ظاہر کردی۔ اور سب بندوبست کر کے ایک روز علی الصبح ہی جبکہ باقی بنات البحر آسودۂ خواب تھیں وہ دونوں مختلف النوع ہستیاں سرزمین یونان کی طرف روانہ ہوگئیں۔ یوفوزین سمندری موجوں کا مقابلہ کرنے میں کافی ماہر ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ خود بھی تیرتا اور تھک جانے پر لیوکوتسیہ کی پُشت پر سوار ہوجاتا۔ کبھی کبھی وہ مذاق کے طور پر اُسے ایسے گرداب میں ڈبو دیتی جہاں اس کے ہوش وحواس گم ہوجاتے اور جلدی ہی کھلی فضا میں لاکر ترنم ریز ہوجاتی۔ وہ ایسے گیت الاپتی جن کی کیفیاتِ وجدان وسُکر میں سرشار ہوکر یوفوزین کو یاد بھی نہ رہتا کہ کچھ دیر پہلے کیا حادثہ ہوا تھا۔ کئی بار ایسے مُہیب جانوروں سے آمنا سامنا ہوا جن کو دیکھتے ہی اس کی روح فنا ہوگئی۔ لیکن جل دیوی کے وقار اور دبدبہ کے سامنے اوّل تو کسی میں حملہ کرنے کی ہمت نہ تھی اور پھر وہ خود ایسی بشک رفتار تھی کہ کوئی آبی جانور اس کے تعاقب میں کامیاب نہ ہوتا۔

بمشکل تمام سات دن کی مُسافت کے بعد وہ دونوں خشکی پر پہنچ گئے۔ اطمینان کا سانس لیا اور پھر دوسرے قسم کے سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ لیوکوتسیہ نے کہا کہ کچھ دیر مجھے اپنے آپ چلنے دو۔ میں دو ہاتھوں کے بل کافی فاصلہ طے کرلوں گی۔ کیونکہ تمھارے ساتھ رہنے کے باعث کسی قدر عادی ہوگئی ہوں۔ لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد ہی اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ چھوٹے چھوٹے کنکر کانٹوں کی طرح اس کے ہاتھوں میں چُبھ رہے تھے۔ اس سے قبل وہ جس زمین پر چلتی تھی وہاں سوائے نرم گھاس یا اُس پر گرے ہوئے پھولوں کے اور کچھ نہ تھا۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں زخمی ہوگئیں۔ ان میں سے بُری طرح خون بہنے لگا۔ علاوہ ازیں دُم بھی زمین پر گھسٹتے گھسٹتے چھل گئی تھی۔ آخر جب اُس سے برداشت نہ ہوسکا تو اپنا حالِ زار یوفوزین سے کہا۔ سابقہ معاہدہ کے مطابق اس نے فوراً اس کو اپنی کمر پر اٹھالیا۔ دونوں ہاتھوں کو اپنے شانوں کے اوپر سے لے کر مضبوط پکڑ لیا تاکہ سنبھلی رہے۔ وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ آبادی تک پہنچنے سے قبل ہی تھک گیا۔ کیونکہ بنت البحر کا وزن اتنا فدا سا نہیں تھا کہ اس کو اٹھا کر آسانی سے چلا جاسکے۔

علاوہ اس ماندگی کے ایک دوسرا احساس بھی اس کے دل میں پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس عجیب الخلقت ہستی کو کمر پر لادے ہوئے آبادی میں سے گذرنا معیوب معلوم ہوگا۔ لوگ مذاق اڑائیں گے کہ ایک اچھا خاصہ معقول انسان اتنا بوجھ لادے چل رہا ہے۔ ہر طرف سے طرح طرح کے سوال کئے جائیں گے جن کا جواب دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ سردست اس کی جیب میں نقدی کے نام پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی کہ کسی گاڑی ہی میں سوار ہوجاتا۔ کیونکہ کرایہ پیشگی دینا پڑتا۔ اس کے علاوہ اس کے وجود کو وہ اپنے لئے قطعی بیکار بھی سمجھنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس ذوقِ وصل کو وہ اپنی آماجگاہ میں رہ کر پورا نہ کرسکی اُسے اب بھی پورا نہ کرسکے گی۔ کیونکہ دوسری دُنیا میں آجانے سے کوئی تغیر نہ ہوا تھا۔

وہ خاموش چلا جا رہا تھا۔ اور اس قسم کے خیالات اُس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس وبال سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اُسے جان سے مار ڈالنا قطعی ناممکن تھا۔ کیونکہ وہ غیر فانی تھی۔ چنانچہ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی سوائے اِس کے کہ اُس کو پھینک کر بھاگ جائے اور پلٹ کر خبر تک نہ لے۔ جوں جوں وہ کنارے سے دُور اور آبادی کے قریب ہوتا گیا اس فیصلہ میں استقامت پیدا ہوتی گئی۔

ایک ایسے مقام پر جہاں کنکروں اور کانٹوں کی بہت اِفراط تھی اس نے جل دیوی کو جس کے سامنے تمام آبی جانور سر جھکاتے تھے لاپرواہی سے پھینک دیا۔ اس کی آنکھوں سے غصہ کے باعث خون سا ٹپک رہا تھا۔ اور چہرے سے نفرت وحقارت کے جذبات ظاہر ہورہے تھے۔ وہ تن کر اس طرح کھڑا ہوگیا کہ اگر ممکن ہوسکتا تو وہ لیوکوتسیہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا۔ وہ کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے باعث انسانی فطرت کو سمجھنے لگی تھی۔ فوراً تاڑ گئی ۔۔۔ کہ یوفوزین حد سے زیادہ بے وفائی کرنے پر آمادہ ہے۔ تاہم بناوٹ سے کام لیتے ہوئے اُس نے مسکرا کر ہاتھ پھیلائے گویا ہم آغوشی کی آرزومند ہے۔

یونانی نوجوان نے جل کر ہاتھ جھٹک دیئے اور تیوری پر بل ڈال کر کہا:۔

"لیوکوتسیہ! ہماری محبت کا آج آخری دن ہے۔ میں اس سے زیادہ ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم کو لے کر اپنے وطن جانا میرے لئے باعثِ ذلت ہے۔ لہٰذا تم کو یہیں چھوڑے جاتا ہوں۔ جنگل کا کوئی درندہ، کوئی زہریلا کیڑا تم کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ ہر قسم کی صعوبت جھیل کر بھی تم زندہ رہ سکتی ہو۔ کیونکہ غیر فانی ہو!"

لیوکوتسیہ نے یہ سب کچھ سُنا اور ہوا کے جھونکے سے لرزہ براندام ہونے والے نرسل کی طرح سر سے دُم تک کانپ اٹھی۔ اسے انسانی فطرت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ لیکن اتنی سخت بیوفائی کی توقع نہیں تھی۔ سمندر کی دُنیا میں وہ دیوی کہلاتی تھی لیکن اس وقت کنارے سے کوسوں دور خشک زمین پہ وہ اس احسان فراموش انسان کے رحم وکرم پر تھی جس کی جان بچانے میں وہ اپنی بہنوں سے کنارہ کش ہوئی اور پھر خشکی تک لانے میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کی۔

اُسے یہ بھی یقین تھا کہ اس ضدی انسان کو فیصلہ میں تبدیلی کرنے کے لئے مجبور نہ کرسکے گی۔ مگر یہ کہے بغیر اُس سے نہ رہا گیا:۔

"میں تمہاری شکرگذار ہوں اس لحاظ سے کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک مخصوص حصہ تمہارے ساتھ عیش و عشرت میں بسر کیا۔ اور تم نے وہ لذت دی جو کسی دوسری طرح ممکن نہ تھی۔ اب ایک آخری آرزو ہے اور وہ یہ کہ تم مجھے واپس ساحل سمندر تک چھوڑ آؤ۔ تاکہ زمین پر رہنے کی صورت میں جو تکلیفیں پہنچ سکتی ہیں وہ نہ پہونچیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم بہت تھک گئے ہو اور میرا بار برداشت نہ کرسکو گے۔ اس لئے میں خود گھسٹ لوں گی۔ تم صرف راستہ بتانے چلنا کیونکہ میں اس سرزمین سے ناواقف ہوں"۔

یوفوزین یوں تو راضی نہ ہوتا مگر جب یہ سُنا کہ اُسے بوجھ لادنا نہیں پڑے گا تو ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ بالکل خاموشی کے عالم میں وہ آگے چلتا رہا۔ اور پیچھے پیچھے بنت البحر اپنے جسم کو بمشکل تمام گھسیٹتی رہی۔ اس کے ہاتھوں میں سے خون بہنے لگا اور زیریں حصہ جسم میں جو نسبتاً زیادہ نازک تھا۔ سنگریزے اس طرح گھس گئے کہ ذرا سی جگہ بھی زخم آلود ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس تکلیف میں بھی یہ احساس اس کے لئے باعث مسرت تھا کہ وہ اپنے محبوب کے ہمراہ چل رہی ہے۔

جب ساحل کے قریب پہونچے تو اچانک سمندر کی سب سے بڑی دیوی تھی ٹس نمودار ہوئی۔ اس نے یوفوزین پر نفرت کی ایک نظر ڈالی اور لیوکوتسیہ سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"بنات البحر میں تو مجھکو سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ ایک بار تو نے میرے بچے کی جان بچائی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تیرے احسان کا کچھ بدلہ دوں۔ اس ظالم انسان نے جو کچھ تیرے ساتھ کیا وہ سب میرے علم میں ہے۔ اگر تو کہے تو ابھی اس کی زندگی کا خاتمہ کردوں۔ اس کے خون سے سمندر کے کچھ پانی کو رنگ دوں۔ اس کے گوشت پوست کو آبی جانوروں کا لقمہ بنادوں۔ بتا تیری کیا مرضی ہے؟"

یوفوزین سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ ظاہر ہے کہ اُسے اپنی زندگی کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ مگر لیوکوتسیہ نے مسکرا کر جواب دیا:۔

"مہادیوی! تیری امداد کی ضرور طالب ہوں لیکن جو کچھ تو نے کہا وہ مجھے منظور نہیں۔ اس انسان نے جو کچھ ظلم مجھ پر کیا وہ اس کی فطرت کا اقتضا تھا۔ مجھے اس سے سچی محبت ہے۔ اور نہیں چاہتی کہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔ لہٰذا اسے چھوڑ کر تو مجھے غیر فانی سے فانی بنا دے۔ میں زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ سابقہ پُر لطف زندگی کا تصور جو میرے حافظہ کی لوح پر مرتسم ہے مجھے ہمیشہ بے چین رکھے گا۔ میں اپنی بہنوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی کیونکہ ایک بار انھیں چھوڑ آئی ہوں۔ لہٰذا تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے کف سمندر میں تبدیل کردے جس سے میری تخلیق ہوئی تھی!"

تھی ٹس چپ رہ گئی۔ اس نے اعتراض نہیں کیا بلکہ فوراً ایک منتر پھونکا جس کے ساتھ ہی بنت البحر کف میں تبدیل ہو کر سمندر کی موجوں پر ہچکولے کھانے لگی۔

رسالہ

ادبِ لطیف

لاہور

کا

عدیمُ النظیر "افسانہ نمبر"

افسانہ نگاری کے نہایت کامیاب اور صحیح نمونوں، فن افسانہ نویسی پر بہترین مضمونوں، جاذب دل و نگاہ مصورانہ نقوش کا مرقع جمیل ہوگا!!

ہر ایک افسانہ :- افسانہ نگار کا شاہکار!

ہر ایک مضمون :- مضمون نگار کی نہایت کامیاب ادبی کوشش!!!

ہر ایک تصویر :- مصور کی حسین ترین مصورانہ سعی!!!

ایسے کامیاب "افسانہ نمبر" کے مطالعہ سے محروم رہنا ادبی ذوق کی بدقسمتی ہوگی۔

ایک عظیم الشان رعایت

ایک روپے میں سال بھر رسالہ مفت ملاحظہ فرمائیں

جو صاحب جون ۳۷ء کے آخر تک چار روپیہ بذریعہ منی آرڈر دفتر کو بھیج دینگے۔ ان کی خدمت میں یہ افسانہ نمبر اور سالنامہ سنہ ۱۹۳۸ء اور سالنامہ سنہ ۱۹۳۷ء جنکی قیمت تین روپے ہے "مفت" بھیجے جائینگے ؂

اس رعایت سے جلد فائدہ اٹھائیں

منیجر ادبِ لطیف لاہور

ہر سال ساقی کے کئی خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں انکی قیمت مستقل
خریداروں سے علیحدہ نہیں لیجاتی۔
نمونہ کا پرچہ مفت

جرعات

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے
اور ششماہی تین روپے ہے
ممالک بیرون ہند سے بارہ شلنگ
قیمت فی پرچہ چھ آنے

جلد ۱۶ | ساقی دہلی - بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ساقی کیلئے جو مضامین موصول ہوتے ہیں اُن میں سے زیادہ سے زیادہ کو ساقی میں جگہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے مضمون نگار حضرات کی تعداد ماشاء اللہ اتنی زیادہ ہے کہ ساقی کے محدود صفحات اُن کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ گنجائش کی اس قلت کی وجہ سے اکثر اچھے خاصے مضامین معذرت کے ساتھ ہمیں واپس کرنے پڑتے ہیں، مگر یہ معذرت بعض دفعہ ہمارے لئے عذرِ گناہ بن جاتی ہے۔ اور پھر جو کچھ اس گناہ کی پاداش میں ہمیں سُننا پڑتا ہے اُس کی تفصیل اگر پیش کی جائے تو یقین جانیئے آپ کانوں میں انگلیاں دے لیں گے۔ حُسنِ اخلاق کے اس مظاہرے پر سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ چنانچہ اب تو طبیعت اس سلوک کی اتنی عادی ہو گئی ہے کہ مذمت سے مکدّر ہونا تو کجا تعریف و توصیف سے خوشی بھی نہیں ہوتی۔

مضمون نگاروں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو گمنام رہنا چاہتی ہے یعنی اپنا اصلی نام چھپانا چاہتی ہے اور کسی فرضی نام سے مضامین شائع کرانا چاہتی ہے۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟ یہ راز صرف مضمون نگار کو معلوم ہے۔ مگر بعض گمنام حضرات تو کمال ہی کرتے ہیں کہ ایڈیٹروں سے بھی اپنی اصلی شخصیت پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی اطلاع کے لئے ہمیں لکھنا پڑتا ہے کہ ایڈیٹر کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے اس لئے اسپر اعتبار کیجئے۔ جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ در اصل آپ ہیں کون مشکل ہے کہ آپ کا مضمون شائع ہو جائے۔ ہر مضمون جو شائع ہوتا ہے اس کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری مضمون نگار کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک ایڈیٹر آپ کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جائے آپ کا مضمون شائع کرنے سے معذور رہیگا۔ اگر صاحبِ مضمون کو اپنا نام بتانا کسی عنوان گوارا ہی نہ ہو تو ساقی میں چھپنے کیلئے مضمون بھیجنے کی زحمت بھی گوارا نہ فرمائیں۔

ہمارے بعض نئے مضمون نگار حضرات کو شکایت ہے کہ باوجود "تاکید" کے اُن کے مضمون یا غزل کی اشاعت یا عدمِ اشاعت کے متعلق اُنہیں "بواپسی ڈاک" اطلاع نہیں دی جاتی۔ اس پر بعض حضرات کو "سخت افسوس" ہوتا ہے اور بعض کو "حیرت" تک ہوتی ہے۔ اور غریب ایڈیٹر کو سکتہ ہو جاتا ہے جب وہ اُس ڈھیر کی طرف دیکھتا ہے جو روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اور اسی عالمِ یاس میں وہ اپنی شومئی قسمت کو کوسنے لگتا ہے کہ آج کوئی دستِ غیب کیوں نہ ہوا۔

ساقی کا سالنامہ:- ساقی کا سالنامہ حسبِ معمول جنوری ۱۹۳۸ء میں شائع ہوگا۔ اس کے لئے چند بہت اچھے مضامین آ چکے ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے سالنامہ میں مولانا عنایت اللہ دہلوی کا بے مثل ترجمہ "ہیملٹ" مکمل شائع ہوا تھا ۱۹۳۸ء کے سالنامہ کے لئے مولانا نے شیکسپیر کے شہرۂ آفاق ڈرامہ "میکبتھ" کا ترجمہ عنایت کیا ہے۔ سالنامہ میں یہ شہ پارہ تمام و کمال شامل ہوگا۔ اُمید ہے کہ بقیہ مضامین ۱۵ اکتوبر تک آ جائیں گے اور نومبر اور دسمبر کے پرچوں میں ہم مفصل اعلان شائع کر سکیں گے۔

شاہد

(سلسلۂ گذشتہ)

سمبلین

جزو رابع

پہلا منظر:- ویلز کا علاقہ۔ بلاریوس کے کہف کے قریب کلوٹن آتا ہے۔

کلوٹن:- اگر پسانیو نے پتہ ٹھیک بتایا ہے تو میں اب اُس جگہ کے نزدیک ہوں جہاں اُن سے ملنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ پوستی مس کے یہ کپڑے تو میرے بہت ٹھیک آئے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اُسکی عورت بھی میرے لئے ٹھیک نہ ہو۔ کیونکہ وہ عورت بھی اُنہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے جس نے درزی کو بنایا تھا۔ اور اس درزی کی کاریگری یہ کپڑے ہیں۔ مجھے معاف کیجئے گا مشہور ہے کہ عورت کبھی کبھی اتفاق سے ٹھیک رہتی ہے غرضکہ اب اُس عورت کو ٹھیک رکھنے میں میری کاریگری درکار ہوگی۔ تنہا آئینہ میں مشورہ کرنا خلاف شان بات نہیں ہے۔ سمجھ لیجئے کہ میرے جسم کے خطوط ایسے ہی اچھے ہیں جیسے کہ پوستی مس کے۔ میں اس سے جوانی میں کم نہیں، کس بل میں اس سے بڑھا ہوا ہوں۔ قیمت میں بھی اس سے ہیٹا نہیں۔ زمانہ کی مساعدت کے لحاظ سے بھی اس سے زیادہ ہوں۔ میں ملکہ کا فرزند ہوں۔ فوجی خدمات میں جو سب کیلئے یکساں ہیں اس سے زیادہ مہارت اور مشق رکھتا ہوں۔ اور تنہا لڑنے میں تو مجھ سے کون بازی لے جاسکتا ہے۔ مگر اس احمق بیوقوف ایموجن کو کیا کروں کہ باوجود میری ان تمام خوبیوں کے وہ پوستی مس سے عشق رکھتی ہے۔ انسان کی فطرت بھی عجیب چیز ہے۔ مگر پوستی مس سمجھ لے کہ تیرا یہ سر جو شانوں پر لگا اکڑتا ہے ایک گھنٹہ کے اندر کٹ کر دور جا پڑیگا اور تیری عورت پر زبردستی ہمارا قبضہ ہوگا اور پھر اُسکی آنکھوں کے سامنے ان کپڑوں کو دھجیاں نہ کر دیا ہو تو نام نہیں۔ اور جب یہ سب کچھ ہو لیگا تو پھر اُس عورت کو گھسیٹتا ہوا بادشاہ کے دربار میں لے جاؤنگا۔ ممکن ہے کہ میری اس سختی سے بادشاہ کے دل پر کچھ میل آئے۔ لیکن میری ماں جسے بادشاہ کے مزاج پر بڑا قابو ہے میری سفارش کر کے سب رفع دفع کر دیگی۔ گھوڑا میرا تو ٹھیک بندھا ہے۔ بس اب میری تلوار تو ذرا باہر نکل۔ آج تجھ سے بڑا سخت کام لینا ہے۔ اور اب اے تقدیر تو ان دونوں کو میرے حوالے کر دے۔ جگہ کے دیکھنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں خیال ہے کہ اُن سے ملاقات ہوگی۔ پسانیو کی اتنی مجال کہاں کہ مجھے دھوکہ دے۔

دوسرا منظر۔ بلاریوس کی کہف کے سامنے
بلاریوس، گدریوس اور ارویریگس اور ایموجن آتے ہیں۔

بلاریوس:- (ایموجن سے مخاطب ہوکر) آپ کا مزاج ناساز معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ شکار کھیلکر ہم سب آپکے پاس آئے جاتے ہیں۔

ارویریگس:- (ایموجن سے کہتا ہے) بھائی! تم یہیں رہو۔ کیا ہم تم بھائی نہیں ہیں۔

ایموجن:- مرد مرد سب آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں، ایک

مٹی کا پُتلا دوسرے خاک کے پُتلے سے درجے میں البتہ فرق رکھتا ہے گو دونوں کی مٹی ایک ہی ہوتی ہے۔ میری طبیعت اس وقت بہت خراب ہے۔

گدریوس ،۔ تم شکار کو جاؤ۔ اروِیرِگس! میں مریض کے پاس ٹھہرتا ہوں۔

ایموجن :۔ نہیں، میں اتنا بیمار نہیں ہوں کہ کوئی میرے پاس رہے۔ جی اچھا نہیں ہے۔ میں ایسے نازونعمت کا پروردہ نہیں ہوں کہ مرض الموت سے پہلے مرجاؤں۔ بس آپ مجھے تنہا چھوڑ جائیں۔ آپ حسب معمول اپنے سب کام کرتے رہیں۔ جب کوئی خلافِ معمول کام پیش آجاتا ہے تو پھر سب کاموں میں خلل پڑتا ہے۔ میں بیمار ہوں۔ آپ کے یہاں رہنے سے اچھا نہیں ہو جاؤنگا۔ جو خود ملنا جُلنا نہ چاہے اس کے لئے کوئی صحبت بھی بھلی نہیں۔ بس التجا ہے کہ آپ مجھے یہیں رہنے دیں۔ میں سوائے اسکے کہ اپنی عزت کا چور ہوں اور کسی کی چوری نہ کرونگا۔ اور میری یہ چوری اتنی کم قیمت کی ہوگی کہ بس مجھے تنہا مرنے دیجئے۔

گُدریوس۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے تم سے بہت محبت معلوم ہوتی ہے اور یہ محبت وزن میں اتنی ہی ہے جتنی کہ مجھے اپنی ذات سے محبت ہے۔

بلاریوس ،۔ بھلا، یہ کیسے ؟

اروِیرِگس ،۔ اگر کوئی قصور نہ سمجھا جائے تو میں اس خیال پر اپنے بھائی کے ساتھ متفق ہوں گو وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی مگر مجھے اس جوان سے بہت ہی محبت معلوم ہوتی ہے اور آپ کو کہتے سنا ہے کہ محبت کی دلیل بلا دلیل ہوتی ہے۔ اگر تابوت رکھنے کے لئے گاڑی دروازے پر کھڑی ہو اور کوئی پوچھے کہ گھر میں کس کا مرنا چاہتے ہو تو میں کہونگا کہ اس جوان کی جگہ میں اپنے باپ کا مرنا گوارا کرونگا۔

بلاریوس ،۔ (علیحدہ کہتا ہے) اے موروثی شرافت، فطرت کی صلاحیت، ذاتی بزرگی کا نسلی احساس! سچ ہے بزدلوں کے باپ بزدل ہوتے ہیں، کمینوں سے کمینے پیدا ہوتے ہیں۔ فطرت میں اناج بھی ہے اور بھوسی بھی یعنی وہ چیزیں بھی جو قابل قدر ہیں اور وہ بھی جو قابل نفرین ہیں۔ میں ان لڑکوں کا باپ نہیں ہوں حیرت یہ ہے کہ یہ لڑکا کون ہے جس سے ان لڑکوں کو مجھ سے بھی زیادہ محبت ہے۔ اب تو صبح کے نو بج چکے ہیں۔

اروِیرِگس ،۔ بھائی! تجھے خُدا کو سونپا۔

ایموجن ،۔ خُدا کرے شکار خوب ملے۔

اروِیرِگس ،۔ خُدا کرے تم اچھے ہو جاؤ اور خوش رہو۔

ایموجن ،۔ (علیحدہ کہتی ہے) یہ کیسے مہربان اور محبت والے لوگ ہیں۔ خُدایا۔ میں نے بھی کیسی کیسی جھوٹی باتیں سنی ہیں۔ ہمارے درباری کہا کرتے ہیں کہ شاہی دربار کے سوا جہاں جاؤگے بجز وحشت اور وحشیوں کے اور کچھ نہ دیکھوگے مگر یہ جو کچھ سنا تجربہ اُسے غلط بتا رہا ہے۔ بڑے بڑے سمندروں پر تو ہیبتناک اور خونخوار جانور پیدا ہوتے ہیں لیکن سمندر کے معاون اور مددگار دریاؤں میں خوش ذائقہ مچھلیاں دستر خوان کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ میری طبیعت ابھی تک درست نہیں ہوئی۔ ہائے اس عشق نے بیمار ڈالا ہے۔ پسانیو نے جو دوا دی تھی اُسے کھاتی ہوں۔ (دوا کھاتی ہے۔)

گدریوس ،۔ میں نے بہت کہا مگر وہ نہ مانا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ شریف ہے مگر بدنصیب ہے۔ کسی نے دغا کر کے اُسے آزار پہونچایا ہے خود وہ باوفا اور ایماندار ہے۔

اروِیرِگس ،۔ یہی بات اُسنے مجھ سے کہی تھی اور اتنا اور کہا تھا کہ اب جو کچھ ہونیوالا ہے وہ آپ کو معلوم ہو جائیگا۔

بلاریوس ،۔ چلو جنگل شکار کیلئے۔ آج تو ہم تمہیں یہاں چھوڑے جاتے ہیں۔ جاؤ گھر میں جا کر آرام کرو۔

ارویرگس:۔ ہم دُور نہیں جائینگے۔ ابھی واپس آجائیں گے۔

بلاریوس:۔ خُدا کے لئے بیمار نہ پڑنا۔ تمہیں تو ہمارے گھر کا انتظام کرنا ہے۔

ایموجن:۔ تندرست ہوں یا بیمار، میں تو ہرحال میں آپکا زیربار احسان ہوں۔

بلاریوس:۔ اور ہم بھی آپ کا احسان مانیں گے۔

(ایموجن گھر میں چلی جاتی ہے۔)

یہ جوان گو اسوقت تکلیف اور مصیبت میں ہے مگر شریف ماں باپ کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔

ارویرگس:۔ گانے میں ایک فرشتہ کی طرح خوش گلو ہے۔

گدریوس:۔ اور کھانا بھی کیسا خوش ذائقہ پکاتا ہے۔ قابوں میں ترکاریاں کاٹ کر اس طرح لگاتا ہے کہ خوش نویس کے لکھے ہوئے ورق معلوم ہوتے ہیں اور شوربے میں کچھ اس انداز سے چاشنی دیتا ہے گویا وہی جو تو بیمار پڑی ہے اور غذا کا انتظام اُس کے سپرد ہے۔ کس شرافت کے ساتھ زبان پر آہیں اور لبوں پر تبسم ہے آہوں کو اس کا افسوس کہ ہمدرد کیوں بنے، تبسم کیوں نہ ہوئے اور تبسم کو آہوں پر یہ اعتراض ہے کہ تم اس بتکدہ حُسن وسعادت سے نکل کر تیز و تُند طوفانی ہواؤں میں جن سے ملاح بھی پناہ مانگتے ہیں کیوں مل جل گئے۔

گدریوس:۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبر اور غم دونوں جڑ پکڑ کر اس میں سے پھوٹ نکلے ہیں اور دونوں نے اپنی شاخیں اُلجھا دی ہیں۔

ارویرگس:۔ خدا کرے کہ شجر صبر کی شاخیں بلند ہو کر غم کی جڑوں کو جو ایک بدبودار درخت ہے اتنا گلائیں کہ اُس کی شاخیں اس نازک درخت رز پر جو پھیل گئی ہیں خشک ہو جائیں۔

بلاریوس:۔ اب تو خاصا دن نکل آیا ہے۔ لڑکو چلو۔ ہائیں یہ کون ہے؟۔

(کلوٹن آتا ہے۔)

کلوٹن:۔ ان فراریوں کا تو کہیں پتہ چلتا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خبیث (پسانیو) نے مجھے دھوکا دیا۔ تھکن کے مارے میں تو غش کھانے کو ہوں۔

بلاریوس:۔ کیا فراریوں سے اس کا مطلب ہم سے تو نہیں ہے۔ یہ شخص کچھ کچھ مجھے یاد آتا ہے۔ یہ تو ملکہ کا بیٹا کلوٹن معلوم ہوتا ہے۔ خوف ہے کہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہونگے اور وہ جنگل میں چھپے بیٹھے ہونگے۔ گو آج برسوں کے بعد اُسے دیکھا ہے۔ پھر بھی جانتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔ سالہا سال ہوئے کہ ہم پر سے قانون کی پناہ اُٹھ چکی ہے۔ لڑکو! یہاں سے چلو!۔

گدریوس:۔ یہ تو اکیلا آدمی ہے میں اور میرا بھائی ابھی تلاش کئے لیتے ہیں کہ اس کے ہمراہ کچھ اور لوگ تو جنگل میں چھپے نہیں بیٹھے ہیں۔ آپ جائیں میں اس سے بھگت لونگا۔

کلوٹن:۔ ٹھیرو۔ تم کون لوگ ہو جو مجھ سے بھاگ رہے ہو۔ کیا تم پہاڑی لٹیرے ہو۔ میں سُن چکا ہوں کہ یہاں رہزن اور قزاق رہتے ہیں۔ خبیثو! تم کس کے غلام ہو۔

گدریوس:۔ تجھ سے بڑھکر تو کوئی غلام میری نظر سے ایسا نہیں گذرا جسے جواب دینے میں اس کا سر نہ توڑ دیا ہو۔

کلوٹن:۔ تو لٹیرا ہی قانون توڑنے والا بدمعاش۔ ارے قزاق اپنے ہتھیار ابھی ہمارے سامنے ڈالدے۔

گدریوس:۔ کس کے سامنے۔ کیا تیرے سامنے۔ تو ہے کون۔ کیا میرا ہاتھ تیرے بازو سے کم ہے اور تو مجھ سے بھی زیادہ بہادر دل رکھتا ہے۔ تیری بکواس البتہ تیرے ہاتھ اور دل سے زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے کیونکہ تیری طرح میری زبان خنجر نہیں ہے۔ بتا تو کون ہے۔ اور کیوں میں تیرے سامنے اپنے ہتھیار

ڈال دوں۔

کلوٹن:۔ اے خبیث کمینے کیا ہمارے لباس سے تجھے نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کون ہیں۔

گدریوس:۔ نہ تیرے کپڑوں سے اور نہ اُس سے جس نے انہیں پہن رکھا ہے۔ بتا کمینے تیرا دادا کون تھا جس نے تیرے یہ کپڑے تیار کئے تھے جن سے تو آدمی معلوم ہو رہا ہے۔

کلوٹن:۔ ارے ذلیل کمینے، میرے درزی کے ہاتھ کے یہ کپڑے نہیں ہیں۔

گدریوس:۔ تو پھر یہاں سے دُور ہو اور اس کا احسان مانتا رہ جس نے تجھے یہ کپڑے دئے ہیں تو تو کہیں کا احمق بیوقوف ہے میں تجھے پیٹ کر یہاں سے نکالنا نہیں چاہتا۔

کلوٹن:۔ ارے بدذات لے میرا نام سُن اور سر سے پاؤں تک لرز جا۔

گدریوس:۔ آخر تیرا نام کیا ہے۔

کلوٹن:۔ میرا نام کلوٹن ہے۔ سُنا تو نے شیطان!

گدریوس:۔ کلوٹن یا اس سے بھی بڑھکر بدمعاش تیرا نام ہو۔ میں اُس سے ڈرتا نہیں۔ بندر۔ سانپ۔ مکڑی تیرا نام ہوتا تو ڈرتا بھی۔

کلوٹن:۔ اچھا اور سُن۔ اب تو تیرا دم نکلے گا۔ سُن میں ملکہ کا فرزند ہوں۔

گدریوس:۔ یہ سُنکر افسوس ہوا کیونکہ تو ہرگز اس نسب کے لائق نہیں۔

کلوٹن:۔ کیا اب بھی تو مجھ سے نہیں ڈرا۔

گدریوس:۔ میں تو صرف اُس سے ڈرتا ہوں جو عقل رکھتے ہیں اور انہی کا میں ادب بھی کرتا ہوں۔ تجھ جیسے احمق پر تو میں ہنستا ہوں۔ ڈرنا کسے کہتے ہیں؟

کلوٹن:۔ اچھا تو ادھر آ۔ میں تجھے موت کے گھاٹ اُتار دوں۔

اور جب یہ کام تمام کرچکونگا تو پھر اُن کو قتل کردوں گا جو مجھے دیکھکر سامنے سے بھاگے ہیں اور پھر اُن کے سر کاٹ کر لندن کی فصیل پر چڑھا دونگا۔ اے گنوار پہاڑ کے قزاق آ، اور میرے سامنے گردن جھکا دے۔

(دونوں لڑتے ہوئے اسٹیج سے باہر ہوجاتے ہیں)

(بلاریوس اور اورویرگس داخل ہوتے ہیں)

بلاریوس:۔ سپاہیوں کی کوئی جماعت ہماری تاک میں بیٹھی نہیں ملی۔

اورویرگس:۔ دُنیا میں کون ہے جو ہمارا مقابلہ کرسکے یقینی آپنے اُسے پہچاننے میں غلطی کی ہے

بلاریوس:۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مدت کے بعد اُسے دیکھا تھا۔ مگر اتنا وقت گذرنے کے بعد بھی صورت نہیں بدلی۔ چہرے کا نقشہ وہی ہے جو پہلے تھا آواز میں جھٹکے اور دفعتاً فوقتاً جلد جلد باتیں کرنے کی عادت پہلے ہی جیسی ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ کلوٹن ہی تھا۔

اورویرگس:۔ یہیں تو ہم نے انہیں چھوڑا تھا۔ اُمید ہے کہ بھائی پولیڈور نے اسکی اچھی طرح خبر لی ہوگی آپ تو فرماتے تھے کہ کلوٹن بڑا زبردست اور ظالم ہے۔

بلاریوس:۔ چونکہ ابھی تک پوری جوانی کو نہیں پہونچا ہے اس لئے خوف و خطرے سے ناآشنا ہے۔ سمجھ کا قصور اکثر خوف دل سے نکال دیتا ہے۔ لیکن دیکھو وہ تمہارا بھائی آرہا ہے۔

(گدریوس، کلوٹن کا سر ہاتھ میں لئے آتا ہے)

گدریوس:۔ یہ کلوٹن تو کوئی بڑا ہی احمق تھا۔ روپیوں کی تھیلی تھا مگر اندر سے خالی۔ رستم بھی ہوتا تو اس کے سر سے بھیجا نہ نکال سکتا۔ کیونکہ یہ چیز اُس کے سر میں تھی ہی نہیں۔ لیکن اگر میں اُسے قتل نہ کر دیتا تو جس طرح اِسوقت اُس کا

سر میرے ہاتھ میں ہے اسی طرح میرا سر اُس کے ہاتھ میں ہوتا۔

بلاریوس:۔ یہ تم نے کیا غضب کیا۔

گدریوس:۔ جو کچھ کیا بالکل بجا اور دُرست کیا۔ ایک آدمی کلوٹن نامی کو مار کر اُس کا سر کاٹ لیا۔ اور یہ کلوٹن بقولِ خود کسی ملکہ کا بیٹا تھا۔ اُس نے مجھے کمینہ، باغی اور پہاڑی رہزن کہا تھا اور قسم کھا کر کہتا تھا کہ وہ ہم تینوں کا سر اُتار کر انہیں لندن کی فصیل پر لٹکائے گا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہمارے سر جہاں تھے وہیں ہیں۔

بلاریوس:۔ بس سمجھ لو کہ اب ہماری خیر نہیں۔

گدریوس:۔ کیوں باباجان؟ کیوں خیر نہیں؟ ہمیں کیا نقصان پہونچ سکتا ہے اُس نے تو قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ تینوں کو مار ڈالے گا۔ جب قانون ہمیں پناہ نہ دے گا تو پھر ہمیں رحمدلی کی کیا ضرورت تھی۔ جب ایک آدمی مغرور اور گستاخ بن کر ہمیں دھمکیاں اور ڈراوے دے، خود ہی میر عدالت اور خود ہی جلاد بنے تو پھر ہمیں ترس کیوں آتا۔ قانون سے تو ہم ہر وقت ڈرتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ معلوم ہوا کوئی اور بھی اِسکے ساتھ ہے۔

بلاریوس:۔ ہمیں تو چڑیا تک نظر نہیں آئی۔ مگر احتیاط شرط تھی۔ خیال یہی ہوتا تھا کہ ضرور کوئی نوکر یا ملازم ساتھ ہوگا۔ گو اُس کی کیفیت یہ تھی کہ ہر دم مزاج بدلتا رہتا تھا اور وہ بھی بد سے بدتر کی طرف اُس کے یہاں تک تنہا چلے آنے کو سوائے جنون یا دیوانگی اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ دربار میں پرچہ دوڑایا جاتا کہ ہم جو اس غار میں رہ کر شکار کھیلا کرتے ہیں قانون کی پناہ سے خارج ہو چکے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے کہ ہم زیادہ زور پکڑ جائیں۔ بادشاہ اتنی خبر سنتے ہی حسب عادت غضبناک ہو جاتا۔ اور حکم دیتا کہ فوراً گرفتار کر کے ہمیں حاضر کیا جائے۔ میرا تو اب تک یہی خیال ہے کہ وہ یہاں تک تنہا نہ آیا ہوگا۔ نہ تو خود اس کی اتنی ہمت ہو سکتی ہے اور نہ اُسے اس کی اجازت ملتی۔ بس میرے خوف کی وجہ معقول تھی اگر شخص کا سر اتنا خوفناک نہ سمجھو جس قدر کہ اس کی دُم خوفناک ہے۔

اروریگس:۔ جو کچھ مشیت میں تھا اُس کا پیش آنا ضروری تھا۔ بھائی پولیدور نے جو کچھ کیا وہ اچھا کیا۔

بلاریوس:۔ میرا تو آج شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لڑکے فیدلی کی علالت نے تو میرا راستہ اتنا طولانی کر دیا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا ہے۔

گدریوس:۔ خود کلوٹن کی تلوار سے جو وہ میرے گلے پر چلانی چاہتا تھا میں نے اس کا سر قلم کر دیا۔ اور اب سر کو چٹان کی پشت پر جو ریخ ہے اس میں ڈال دونگا تاکہ وہ بہتا ہوا سمندر میں پہونچے اور وہاں مچھلیوں کو بتائے کہ ملکہ کے فرزند کلوٹن کا سر ہوں، یہی میرا ارادہ ہے۔

بلاریوس:۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انتقام ہم سے ضرور لیا جائیگا۔ کاش پولیدور تو ایسا نہ کرتا۔ مگر مقتضائے جوانمردی یہی تھا۔

اروریگس:۔ بہتر ہوتا کہ یہ کام میں کرتا اور جو کچھ اس کا بدلہ لیا جاتا مجھ ہی سے لیا جاتا۔ پولیدور میں تجھے بھائیوں کی طرح چاہتا ہوں۔ مگر اس بات کا ضرور رشک ہے کہ تو نے کلوٹن کا سر کاٹنے کا موقع مجھے نہ دیا۔ کاش ہمیں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ہمیں موقع مل جاتا۔ تاکہ ہم اپنی حفاظت کیلئے دشمن کی مدافعت پوری طاقت سے کرتے۔

بلاریوس:۔ خیر جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہم شکار نہ کھیلیں گے اور کوئی ایسا خطرہ جس میں ہمارا نفع نہ ہو۔ خود تلاش نہ کرینگے۔ بس لڑکو آؤ۔ اپنے چٹان کو چلیں۔ تم اور فیدلی کھانا تیار کرو، میں اور پولیدور یہیں ٹھہرے ہیں۔ کھانے کے وقت تک پولیدور

کو ساتھ لے آتا ہوں۔

اروبیرگیس:۔ غریب فیڈلی بیمار ہے میں تو اُس کے پاس بیٹھتا ہوں۔ خدا کرے کہ اُسے اپنا پہلا سا رنگ روپ مل جائے۔ اگر ایسا ہو تو کلوٹن تو ایک تھا، میں کلوٹنوں کے ایک پورے محلّے کا خون کرنے کو بھی یہی سمجھوں کہ میں نے بڑی رحمدلی کا کام لیا ہے۔

بلاریوس:۔ اے دیبی۔ اے پاک فطرت تُو اپنا نور ان شہزادوں پر خوب چمکا۔ یوں تو یہ دونوں ایسے نیک دل اور پاک نفس ہیں جیسے بادِ صبح نرگس کے پھولوں میں چلتی ہو اور پھولوں کے طرّوں کو جنبش تک نہ ہو لیکن جب بادشاہوں کا خون اُن کی رگوں میں جوش مارتا ہے تو وہ ایسے تیز و تند ہو جاتے ہیں جیسے طوفان میں ہوا کے سخت سے سخت جھونکے ہوں۔ جو پہاڑ پر چنار کے اُونچے سے اُونچے درخت کی چوٹی کو گھاٹی کی طرف جھکا دیتے ہیں۔ تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ بغیر اس بات کا علم رکھے کہ وہ ایک بادشاہ کے فرزند ہیں۔ محض عقلِ حیوانی اُن میں یہ شان و عظمت پیدا کرتی ہے جو کسی سے انہوں نے سیکھی نہیں۔ اور وہ اخلاق اُن میں نظر آتا ہے جو کسی نے اُن کے ساتھ ظاہر نہیں کیا ہے۔ فطرت اعلان کرتی ہے کہ وہ نسب شاہی رکھتے ہیں۔ ہمت و شجاعت خودرو درخت کی طرح ان میں پھوٹتی پھلتی ہے اور وہ میوے ان میں پیدا کرتی ہے۔ کہ گویا میووں ہی کے لئے یہ درخت لگائے گئے تھے۔ لیکن مجھے ابھی تک یہی خوف ہے کہ کلوٹن کا یہاں آکر مارا جانا ہمارے حق میں کسی خرابی کی تمہید نہ ہو جائے خدا کو خبر ہے کہ اس کے مارے جانے کا نتیجہ ہمارے لئے کیا نکلے۔

(گدریوس پھر آتا ہے۔)

گدریوس:۔ میرا بھائی کاڈول کہاں ہے، میں نے تو کلوٹن کا سر ایک بہتے دریا میں ڈال دیا ہے کہ ماں کو فرزند کے مارے جانے کی خبر دے۔ اور اس بات کی ضمانت میں اُس کا دھڑ یہاں رکھ لیا ہے۔

(موسیقی کی دردناک آواز کان میں آتی ہے۔)

بلاریوس:۔ میرا یہ باجا بھی عجیب ہے۔ پولیدور سُنو تو وہ بج رہا ہے۔

گدریوس:۔ کیا کاڈول گھر میں ہے؟

بلاریوس:۔ ابھی تو گیا ہے۔

گدریوس:۔ باجا بجانے سے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب سے ہماری ماں دایہ کا انتقال ہوا ہے۔ کسی نے ابتک باجے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ دردناک گتیں تو دردناک موقعوں پر بجائی جاتی ہیں۔ یہ بات کیا ہے۔ بے حقیقت باتوں پر جوش آنا یا ذرا ذرا سی بات پر گریہ و زاری کرنا تو بندروں کی جست و خیز یا بچوں کا رونا ہوتا ہے۔

بلاریوس:۔ لو، وہ کاڈول خود آرہا ہے اور وہ چیز بھی اُٹھائے لا رہا ہے۔ جسکی وجہ سے ہم اُسے الزام دیتے تھے۔

(اروبیرگیس پھر آتا ہے اور امیوجن کو جو مُردہ معلوم ہوتی ہے گود میں اُٹھائے ہے۔)

اروبیرگیس:۔ لیجئے وہ طائر خوش نوا جس کی ہم کبھی کچھ قدر کرتے تھے، آج اُڑ گیا۔ مجھے تو منظور تھا کہ میری عمر بجائے سولہ سال کے ساٹھ برس کی ہو جاتی۔ بجائے جوانی کی چستی و چالاکی کے بڑھاپے کی لٹھیا بغل میں ہوتی مگر یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

گدریوس:۔ اے نازک اور حسین پھول، میرے بھائی کے ہاتھوں میں اُٹھا ہوا تو اتنا حسین نہیں معلوم ہوتا جیسے کہ اپنے پاؤں پر چلتا ہوا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

بلاریوس:۔ اے رنج و محن کون ہے جس نے تمہاری تھاہ پا کر اُس

گیلی مٹی کا پتلا جلایا ہو جہاں تمہارا سست رو سفینہ آسانی سے قیام کر سکے۔ پیاری جان! خدا ہی کو علم ہے کہ تو بڑھکر کیسا خوبرو سجیلا جوان نکلتا مگر رنج و غم نے تو تجھے لڑکپن ہی میں گھلا گھلا کر ختم کر دیا۔ کاڈول جب تم گھر گئے تھے تو اُسے کس حال میں پایا تھا۔

اروِیرگیس:۔ بالکل اکڑا ہوا پڑا تھا۔ جیسے کہ آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی معلوم ہوتا تھا کہ کسی مکھی کے بیٹھنے سے گدگدی ہوئی ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ موت کے تیر سے گھائل ہوا ہے۔ دایاں رخسار تکیے پر ٹِکا ہوا تھا۔

بلاریوس:۔ لیٹا کہاں تھا؟۔

اروِیرگیس:۔ زمین پر لیٹا تھا۔ دونوں ہاتھ اس طرح سینے پر رکھے تھے۔ میں سمجھا کہ سوتا ہے۔ میں نے اپنے بھاری جوتے اس خیال سے اُتار دئے تھے کہ کہیں اُن کی آواز سے جاگ نہ جائے۔

گدریوس:۔ وہ تو ابھی تک سوتا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اگر حقیقت میں گذر گیا ہے تو اُس کی قبر سونے کی سیج ہوگی اور پریاں آسمان سے اس کی قبر پر اترتی ہونگی۔ کیڑے مکوڑے اس کے پاس ہرگز نہ آئیں گے۔

اروِیرگیس:۔ پیارے فیدلی جب تک بہار کا موسم ہے اور میں یہاں رہتا ہوں اور تیری اس پُرحزن و ملال پر حسین سے حسین پھول بچھایا کرونگا۔ ان پھولوں میں زرد گلاب جو تیری جلد سے ہمرنگ ہوگا۔ اور ہلکے نیلگوں پھول جو تیرے لبوں کے رنگ سے مشابہ ہونگے تیری قبر پر بکھیرونگا۔ اور اُن میں برگ نسریں بھی ہونگے جس کی خوشبو کچھ کم نہیں لیکن تیرے شمیم نفس کو وہ کہاں پہونچتی ہے پھر تیری قبر پر وہ سینہ سُرخ طائر خوشرنگ منقار میں کائی کے ٹکڑے لئے آئے گا کہ تیرے چہرے کو ڈھک دے۔ اس کی منقار کی اس خدمت و خبرگیری پر اُن دولت رسیدہ ورثا کو شرمندہ ہونا چاہیئے جو اپنے باپ کی قبر کو بغیر کسی یادگار کے یونہی پڑا رہنے دیتے ہیں۔ جاڑے میں جب پھول نہیں رہینگے تو یہی چیزیں تیری قبر پوش اور تیرے مزار کی زائر ہونگی۔

گدریوس:۔ مہربانی کر کے یہ شاعرانہ گفتگو بند کرو۔ یہ موقع بہت رنج و صدمے کا ہے تعریفوں میں وقت گزار کر اس فرض کو ادا کرنے میں تاخیر نہ کرو۔ جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس وقت جو سب سے پہلا کام کرنے کا ہے وہ اسے دفن کرنا ہے۔ چلو قبر کی تیّاری کریں۔

اروِیرگیس:۔ بتایئے اسے کہاں دفن کریں؟۔

گدریوس:۔ جہاں ہماری امّاں دایہ یوریفلی رکھی ہے۔

اروِیرگیس:۔ بالکل درست ہے۔ اور بھائی پولیدور گو اب ہماری آوازیں اب جوان ہو جانے سے بھاری پڑ گئی ہیں، لیکن جس طرح ہم نے اپنی ماں یوریفلی کو نوحہ گا کر سپرد خاک کیا تھا اُسی طرح اس فیدلی کو بھی دفن کرینگے۔

گدریوس کا دول مجھ سے گایا نہ جائے گا۔ میں صرف روتا رہونگا۔ اور اس گریئے میں تعریف و توصیف کے جملوں میں مَیں تجھ سے بڑھ جاؤنگا کیونکہ نوحہ غم کے الاپنے میں بن سُرا ہو جانا پادریوں کے جھوٹے مرثیوں اور ان جھوٹی عبارتوں سے بدتر ہوتا ہی جو بطور یادگار قبروں پر کندہ کی جاتی ہیں۔

اروِیرگیس:۔ اچھا کچھ گائیں گے نہیں۔ گانے کی جگہ محض اس کی تعریف و توصیف کرینگے۔

بلاریوس:۔ غم جتنا ہی زیادہ ہوا اتنا ہی اُس کا علاج کم ہونا چاہیئے۔ لڑکو تم کلوٹن کو تو بالکل ہی بھول گئے۔ خیال کرو کہ وہ ایک ملکہ کا فرزند تھا۔ گو یہ سچ ہے کہ ہمارا دشمن بنکر یہاں آیا تھا مگر اس دشمنی کی سزا کو وہ پہونچ چکا ہے۔ کمزور ہو یا

زبردست قبر میں دونوں ایک ہی طرح گلتے سڑتے ہیں مٹی ان دونوں کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن احترام اور وقار جو دنیا کے فرشتے ہیں، اعلیٰ وادنیٰ میں فرقِ مراتب کا لحاظ کرتے ہیں۔ ہمارا یہ دشمن ایک شہزادہ تھا۔ اور گو تم نے اُسے اپنا دشمن سمجھکر مار ڈالا مگر اُس کو ایک شہزادے کی حیثیت سے کہیں دفن کرنا ضروری ہے۔

گدریوس:- مہربانی کرکے اس کی لاش ادھر اُٹھالائیے۔ ایک بیوقوف مسخرا بھی ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک بہادر اور جوانمرد جبکہ دونوں مرچکے ہوں۔

اروپرنگس:- اگر یہی مرضی ہے تو اُسے اٹھالائیے اور جبتک وہ آئے ہم نوحہ پڑھتے ہیں۔ بھائی شروع کیجئے۔

گدریوس:- نہیں، پہلے اس کا مُنہ مشرق کی طرف کردو۔ ہمارے باپ اس میں مصلحت سمجھتے ہیں۔

اروپرنگس:- درست ہے۔

گدریوس:- اچھا آؤ ادھر سے اٹھاؤ۔

اروپرنگس:- اب نوحہ شروع کرو۔

نوحہ

اب تجھے نہ سورج کی گرمی کا ڈر ہے اور نہ جاڑے کی تیزی کا۔ دُنیا میں جو کچھ تجھے کرنا تھا وہ ختم ہوا۔ اور جہاں کا تو تھا وہیں چلا گیا۔ اپنی محنت کی مزدوری پاچکا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں چاہے سونے کے بنے ہوں مگر سب کو ایک غریب کوئلے والے کے لڑکے کی طرح ایک دن مرکر خاک ہونا ہے۔

اب تو بڑے لوگوں کے عتاب اور غصے سے خوف نہ کرا اور عالموں وفاضلوں کی زد سے بھی اب تو دور ہے۔ اب تجھے کھانے کا فکر نہ ہوگا اور نہ پینے کا۔

اب تیرے نزدیک ایک کمزور نرسل بھی ایسا ہی ہے جیسے مضبوط بلوط۔

بادشاہ ہو، یا عالم ہو، یا پہلوان سب ہی کو یہی دن دیکھنا ہے اور خاک میں ملکر خاک ہونا ہے۔

اب بجلی کی چمک اور کڑک کا تجھے ڈر نہیں۔ اور نہ مینہہ برستے وقت اولوں کا۔

اب تجھے لوگوں کے اعتراضوں کا خوف اور نہ نکتہ چینیوں کا ڈر ہے۔ تو رنج وخوشی دونوں کو ختم کرچکا۔

تمام چاہنے والے اور نوجوان عشاق تیرے ہی پاس آکر خاک ہونے والے ہیں۔

اب نہ تو کوئی ملا سیانا تجھے نقصان پہونچا سکتا ہے اور نہ کوئی ساحر اپنے سحر سے تجھے ستا سکتا ہے۔

وہ رُوحیں جن پر مرتے وقت دُعائیں نہیں پڑھی گئی ہیں اور جو دُنیا میں آوارہ پھرتی ہیں تجھے پریشان نہ کرینگی۔ کوئی خرابی اب تیرے نزدیک نہ آئیگی چُپ چاپ مٹی میں ملکر مٹی ہوتا رہ۔ خدا تیرے مزار کو شہرت بخشے۔"

(بلاریوس کلوٹن کی لاش کو لئے آتا ہے)

گدریوس:- ہم نے موت کی کل رسمیں ختم کرلیں۔ آؤ، اب اس لاش کو بھی کہیں پر رکھدیں۔

بلاریوس:- پھول تھوڑے رہ گئے ہیں۔ آدھی رات کے قریب اور پھول لائیں گے۔ قبروں پر ڈالنے کیلئے تو وہ پھول اچھے ہوتے ہیں جن پر رات کی ٹھنڈی شبنم پڑچکی ہو۔ لاش کو چت لٹادو۔ تم بھی کبھی پھول تھے۔ مگر اب کمُلا گئے ہو۔ اور یہی حال اُن پھولوں کا ہوگا جو اِس وقت ہم تم پر ڈال رہے ہیں۔ لڑکو ادھر آؤ۔ جُدا جُدا کھڑے ہوکر گھٹنے زمین پر ٹیک دو۔ وہی چیز جو خاک نے ہمیں دی تھی اب خاک واپس لے رہی ہے تمہاری خوشیوں کے ساتھ تمہاری تکلیفیں بھی ختم ہوئیں۔

(بلاریوس، گدریوس، اور اروپرنگس چلے جاتے ہیں)

ایموجن :- (جاگ کر) جی ہاں ملفور دہیون۔ اُس کا راستہ کدھر ہے۔ شکریہ۔ اچھا جھاڑی سے راستہ جاتا ہوگا۔ مہربانی کر کے اتنا اور بتائیے کہ وہ یہاں سے کتنی دُور ہے۔ اے غضب۔ کیا ابھی چھ میل اور چلنا ہے۔ آدھی رات تو چلتے چلتے ہوگئی۔ جو کچھ ہو میں تو اب پڑ کر سو جاتی ہوں۔ کسی ساتھ والے کی ضرورت نہیں۔ اے دیوتا دیبیو۔

(کلوٹن کی لاش دیکھتی ہے۔)

یہ پھول تو دُنیا کی راحتوں کی مثل ہیں۔ اور یہ خون آلودہ لاش اپنی تکلیف خود بیان کر رہی ہے۔ خدا کرے کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ یاد آتا ہے کہ ابھی ابھی ایک غار میں گھر والی بنی چند ایماندار آدمیوں کے لئے کھانا تیار کر رہی تھی۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو جب بخارات دماغ سے اُٹھتے ہیں تو وہ خالی خولی تیر بنکر کسی کو اپنا نشانہ نہیں بناتے۔ ہمارے خیالات اور ہماری تجویزوں ہی کی طرح ہماری یہ آنکھیں بھی اندھی ہوتی ہیں۔ خدایا! میں تو خوف سے اب تک لرز رہی ہوں۔ مگر اے خدا اگر عرش پر ایک قطرہ بھی رحم کا ہو۔ خواہ وہ ایک چھوٹے سے چھوٹے پرندے کی چشم معصوم ہی کے برابر کیوں نہ ہو۔ مگر اس کا تھوڑا سا حصّہ مجھے دے۔ خدا کا خوف میرے دل میں ہے اور وہ خواب ابھی تک آنکھوں میں پھرتا ہے۔ گو جاگ رہی ہوں۔ اس کی باتیں ظاہر میں بھی اتنی ہی سامنے ہیں جیسے کہ باطن میں وہ موجود ہیں۔ صرف خیال ہی میں نہیں بلکہ خارج میں بھی وہ محسوس ہو رہی ہیں۔ ایک سر کٹا آدمی پڑا ہے۔ سر ندارد، کپڑے اسکے تن پر پوستی مس کے ہیں۔ اسکے پاؤں کی قطع مجھے خوب یاد ہے۔ یہ ہاتھ بھی اسی کے ہیں، قدم مرکیوری کی شکل کے ہیں۔ ران خدائے مارس کی ران سے مشابہ ہے اور ہرقل کے مثل بازو مضبوط ہیں۔ لیکن ہائے وہ جوپیٹر کا سا چہرہ اور سر کہاں ہے۔ اے کیا عرش پر خون ہوا ہے کہ سر غائب ہے۔

اے پسانیو! ملکہ ہکوبہ نے غم سے دیوانی ہو کر یونانیوں کو جتنے کوسنے دئے تھے اب میں اپنی طرف سے کوسنے اور شامل کر کے تجھے دیتی ہوں۔ تو نے اس موذی شیطان کلوٹن سے سازش کی اور میرے آقا کا سر کٹوا دیا۔ آج سے سب لکھنا پڑھنا۔ دغا اور فریب سمجھا جائے۔ ارے ملعون پسانیو! تو نے جعلی خط بناکر دُنیا کے سب سے عظیم الشان جہاز کو غارت کیا۔ اُس کے سب سے اُونچے مستول کو توڑ دیا۔ ہائے پوستی مس تیرا سر کہاں ہے؟ پسانیو! چاہے تو اُس کے دل میں تلوار بھونک کر اُسے مارتا۔ مگر اس کا سر چھوڑ دیتا۔ یہ کیا ہوا۔ کیونکر ہوا۔ پسانیو تو ہی بتا۔ پسانیو اور کلوٹن کے سوا کسی دوسرے کا کام نہیں۔ ایک طرف غیظ، بُغض و عداوت دوسری طرف روپے کی طمع، انہوں نے یہ دردناک صورت پیش کی ہے۔ ظاہر ہے۔ کیا کلام ہے۔ جب دوا اُس نے مجھے دی تھی تو کہا تھا کہ یہ بڑی اکسیر ہے۔ کیا میں نے نہیں دیکھا کہ حواس پر اس کا اثر قاتل ہے۔ اس سے پسانیو کی یہ حرکت ثابت ہے۔ یہ کام پسانیو اور کلوٹن کا ہے۔ اے خون اپنے رنگ سے میرے رُخسارے سُرخ کر دے۔ تاکہ جو کوئی ادھر سے گذرے اُس کا خوف اور بڑھ جائے۔ اے خدایا۔ میرے خدا۔

(ایموجن لاش پر گرتی ہے۔)

(رومانی سپہ سالار لیوکوس، ایک کپتان اور
دیگر افسران فوج معہ ایک نجومی کے آتے ہیں۔)

کپتان :- حضور کے حکم کے مطابق گالیا (فرانس) میں جس قدر فوجیں پڑی تھیں ان سب نے سمندر عبور کر لیا ہے، اور اس وقت وہ ملفور دہیون میں اپنے جہازوں سمیت لڑائی کیلئے بالکل تیار ہیں۔

لیوکوس :- لیکن روما سے بھی کوئی فوج آئی؟

کپتان :- ارکان مجلس انتظامی نے اٹلی کے شرفا اور سرحد

اٹلی کے قبائل میں جوش پیدا کیا ہے اور وہ سب بڑے جوش و خروش کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو گئے ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیش قدر خدمات اِس جنگ میں پیش کرینگے۔ یہ کل شُرفا اور سرحدی قومیں جمع ہو گئی ہیں اور ریاچیمو برادرِ سینا کی سرکردگی میں ہیں۔ جو رَوما کا مشہور شریف زادہ ہے۔

لیوکوس :۔ کپتان انکے یہاں پہونچنے کی توقع ہے۔

کپتان :۔ سمندر پر بادِ موافق چلتے ہی اُنہیں یہاں پہونچا سمجھئے۔

لیوکوس :۔ اِس خبر سے ساری اُمیدیں قوی ہوئیں۔ کپتانوں کو حُکم دو کہ جس قدر فوجیں آگئی ہیں اِن سب کو یکجا ہونیکا انتظام کریں۔ اچھا۔ اب اے نجومی بتاؤ کہ تم نے اس لڑائی کا کیا انجام دریافت کیا۔

نجومی :۔ کئی روز تک خداؤں سے مسلسل دُعائیں مانگنے کے بعد کہ کچھ خبر دی جائے۔ کل شب کو اُنہوں نے مجھے ایک رویا دکھایا ہے۔ اُس میں کیا دیکھتا ہوں کہ خُدائے جوپیٹر کا طائر یعنی رَوما کا عقاب سمت جنوب سے اُڑتا ہوا مغرب کے اس حصّہ میں آیا ہے اور یہاں آتے ہی سُورج کی چمکتی کرنوں میں غائب ہو گیا ہے۔ اگر میرے گناہ اِس خبر کو غلط نہ کر دیں تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ رَوما کی فتح ہو گی۔

لیوکوس :۔ خُدا تمہیں ہمیشہ ایسے ہی سچّے خواب دکھائے اور کبھی وہ غلط نہ ہوں۔ ہائیں۔ ٹہرو۔ دیکھو یہ لاش کیسی ہے جس کا سر غائب ہے۔ شکستہ آثار بتا رہے ہیں کہ مسمار ہونے سے پہلے یہ عمارت بڑی شاندار ہو گی۔ اور یہ غلام کیسا ہے جو لاش پر پڑا سوتا ہے۔ غالباً یہ بھی مر گیا ہے کیونکہ فطرت اجازت نہیں دیتی کہ کوئی زندہ مردہ کو اپنا بستر بنائے۔ یا مُردے پر پڑ کر سو رہے۔ ذرا اِس لڑکے کی صورت دیکھنے دو۔

کپتان :۔ حضور لڑکا زندہ ہے۔

لیوکوس :۔ اُس سے پوچھنے سے معلوم ہو گا کہ یہ لاش کس کی ہے۔ لڑکے تو اپنا حال بتا۔ کیونکہ تیرا حال معلوم کرنا ضروری ہے۔ یہ کون ہے جسے تو نے اپنا خُون آلود تکیہ بنایا ہے۔ اور وہ کون تھا جس نے فطرت کی اس تصویر کو اس طرح بگاڑ کر اُس کو بدل دیا۔ اور اس خرابے و ویرانے سے تیرا کیا تعلق ہے۔ یہ واقعہ کیونکر پیش آیا۔ یہ کون تھا اور تم کون ہو۔

ایموجن :۔ میں تو کچھ نہیں ہوں۔ یا جو کچھ ہوں اس سے کچھ نہ ہوتا۔ میرے حق میں بہتر ہوتا۔ یہ میرا آقا تھا۔ یہ بڑا جری و بہادر برطانوی تھا اور بڑا نیک شخص تھا۔ پہاڑ کے وحشیوں نے اُسے مار ڈالا۔ افسوس اب ایسے آقا کہاں ملتے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک بھی نوکری کیلئے کوئی ڈھونڈتا پھرے۔ بہت سے آقاؤں کی آزمائش کرے۔ اچھے بھی ملیں گے۔ خدمت بھی ایمانداری سے کی جائے گی۔ یہ سب کچھ دُرست مگر ایسا آقا اب نصیب نہ ہوگا۔

لیوکوس :۔ افسوس لڑکے تیرا بیان سُنکر دل پر وہ اثر ہوتا ہے کہ اس خُون کو دیکھکر نہیں ہوتا۔ اچھا بتا اسکا نام کیا تھا۔

ایموجن :۔ "رچرد دو کیمپ" (علیحدہ کہتی ہے) میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ مگر اس میں کسی کا نقصان نہیں کرتی۔ مگر خدا سُن رہا ہے اُمید ہے کہ وہ میرا قصور معاف کر دے گا۔ آپنے کیا فرمایا؟

لیوکوس :۔ اور تمہارا نام کیا ہے؟

ایموجن :۔ حضور مجھے فیدلی کہتے ہیں۔

لیوکوس :۔ تو اسم بامسمّٰی ہے۔ تیری وفاداری پر یہ نام خُوب پھبتا ہے۔ تیری وفاداری ہی تیرا نام ہے۔ کیا تو میری مُلازمت قبول کریگا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جیسا تیرا پہلا آقا تھا ویسا ہی آقا میں ثابت ہونگا۔ لیکن یقین رکھ کہ میری محبّت بھی اس سے کم نہ ہو گی۔ اگر روما کے قیصر کے سفارشی

خطوط بھی کسی قنصل کے ذریعے میرے پاس آتے خود تیرا حال جتنا تیرا سفارشی بنتا ہے وہ نہ ہوتے۔ آؤ ہمارے ہمراہ چلو۔

ایموجن:۔ مَیں حضور کے ساتھ ہوں۔ لیکن ہمراہ چلنے سے پہلے اپنے آقا کی لاش کو مکھیوں سے بچانے کیلئے اپنی انگلیوں سے گرڑھا کھودلوں اور اس گڑھے میں اُسے دفن کر کے اُس پر جنگل کے کچھ پھول ڈالدوں اور جو دُعائیں مجھے یاد ہیں وہ اُس پر پڑھ لوں اور جی کھول کر اُس کے لئے رُولوں تو پھر آقا کی اس خدمت سے فارغ ہوکر مَیں حضور کے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں۔ اور پھر حضور مجھے اپنا مُلازم سمجھیں۔

لیوکوس:۔ اے لڑکے! آقا نہیں مَیں تو باپ بنکر تیری پرورش کرونگا۔ دوستو! دیکھو یہ لڑکا ہم کو کیسی مردانہ باتیں سکھاتا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی بہت ہی خوبصورت جگہ جہاں پھول کھِل رہے ہوں تلاش کریں اور وہاں اپنے ہتیاروں سے قبر کھودیں اور اس لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر دفن کریں لڑکے اب تیرا یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے اور یہ لاش ایک سپاہی کی لاش کی طرح جُملہ فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کی جائے گی اب تو خوش ہو۔ آنکھوں سے آنسو پونچھ بعض پستیاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ وہی زیادہ بلندیوں پر پہنچنے کا باعث ہوجاتی ہیں۔

تیسرا منظر:۔ قصر شاہی کا ایک کمرہ۔ بادشاہ سمبلین۔ اُمراء۔ پسانیو اور خدام شاہی داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین:۔ خادم، پھر جاکر خبر لا کہ ملکہ کا مزاج اب کیسا ہے۔ اور وہ کہاں ہیں۔

(ایک خادم جاتا ہے)

ملکہ اپنے فرزند کے کہیں نکل جانے سے بیمار پڑگئی ہے اور حملہ جنون کا سا معلوم ہوتا ہے۔ جان کو خطرہ ہے۔ خُدایا اس حال کو دیکھکر میرا دل کیسا بگڑا جاتا ہے۔ ایموجن جو میرے دل کی چین وراحت کا بڑا ذریعہ تھا کہیں چلی گئی۔ ملکہ بیمار ہوکر بستر پر پڑی ہیں۔ اور تھوڑا ہی زمانہ باقی ہے کہ ایک سخت جنگ پیش آئے گی۔ ملکہ کا فرزند بھی کہیں نکل گیا جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اب چین وآرام مجھے کبھی نصیب نہ ہوگا۔ (پسانیو سے کہتا ہے) مگر تجھے اے شخص ضرور علم ہے کہ ایموجن کہاں گئی ہے۔ تو انجان بنتا ہے مگر یاد رہے کہ تجھے سخت سے سخت اذیتیں پہونچا کر ہم کُل حال معلوم کرلینگے۔

پسانیو:۔ عالی جاہا! یہ جان حضور ہی کی دی ہوئی ہے اور حضور ہی کے لئے حاضر ہے۔ مجھے مطلق علم نہیں کہ شہزادی صاحبہ کہاں تشریف رکھتی ہیں۔ اور کیوں یہاں سے تشریف لے گئی ہیں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ کب تک واپس آئینگی بادشاہ سلامت! میری درخواست ہے کہ حضور مجھے اپنا خادم جانثار سمجھیں۔

پہلا امیر:۔ خداوند نعمت! گذارش ہے کہ جس دن سے شہزادی صاحبہ تشریف لے گئی ہیں، یہ شخص برابر یہیں موجود رہتا ہے۔ مَیں ضمانت لیتا ہوں کہ یہ آدمی سچا ہے۔ حضور جو حکم اسے دینگے وہ سچی نیت اور خیرخواہی سے انجام دے گا۔ رہا ملکہ سلامت کا فرزند کلوٹن تو اُس کی تلاش میں زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں، وہ تو یقینی مل جائے گا۔

سمبلین:۔ وقت بُرا آیا ہے۔ (پسانیو سے کہتا ہے) ہم تمہیں ایک خاص مدّت کیلئے رہا کرتے ہیں۔ ہمارا شبہ ابھی تک تم پر ہے۔

پہلا امیر:۔ اب یہ گذارش اور ہے کہ رومانی فوجیں۔ گالیا (فرانس) سے جمع ہوکر ہمارے ساحل پر اُتر آئی ہیں اور انکے علاوہ روما کی مجلس نے وہاں کے شُرفا کی بڑی بڑی جماعتیں لڑنے کیلئے بکثرت روانہ کی ہیں۔

سمبلین:۔ اب ضرورت تھی کہ ملکہ اور اُس کے فرزند سے مشورہ کرتا۔ ان پیچ در پیچ معاملات نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔

پہلا امیر۔ عالیجاہ۔ دُشمن کے مقابلے کیلئے جیسی کچھ بھی اس کی قوت سُننے میں آئی ہے جنگی تیاریاں حضور کی بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اگر دُشمن فوجیں اور زیادہ بھیجے تو حضور اُن کے مقابلے کے لئے بھی تیار ہیں۔ جو کچھ کمی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی فوجوں کو نقل و حرکت میں کھینچ کر لایا جائے درحالیکہ وہ آگے بڑھنے کیلئے بیقرار ہیں۔

سمبلین:۔ ہم تمہارے شکر گذار ہوئے۔ اب ہم جانا چاہتے ہیں۔ اور اُمید رکھتے ہیں کہ وقت پر حسب ضرورت تمام مشکلات کو رفع کرنے کے لئے ہم آمادہ اور تیار ہونگے۔ ہمیں اس بات کا خوف نہیں ہے کہ اٹلی ہماری پریشانی کیلئے کیا کچھ کریگا۔ لیکن جو اتفاقات پیش آرہے ہیں ان سے البتہ خائف ہیں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

پسانیو:۔ جس خط میں مَیں نے آقا کو اطلاع دی تھی کہ ایموجن قتل کر دی گئی ہے اُس خط کا آج تک کوئی جواب نہیں آیا۔ سخت حیرت میں ہوں۔ اور نہ شہزادی صاحبہ کا کچھ حال معلوم ہوا حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی خیر خبر برابر دیتی رہیں گی۔ اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کلوٹن پر کیا گذری۔ غرض کہ سب طرف سے سوائے فکر و پریشانی کے اور کچھ نہیں جس بات میں مَیں ہی سب سے بڑھکر سچا اور ایماندار ثابت ہونگا۔ اس وقت جو لڑائیاں ہونے والی ہیں اُن سے پتہ چلے گا کہ مجھے اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے اور جب وقت آئے گا تو بادشاہ بھی میرے حب وطن کے قائل ہو جائیں گے۔ میَں ان لڑائیوں میں لڑکر اپنی جان دونگا۔ پھر جو کچھ شکوک میری نسبت ہونگے وہ بھی صاف کر دونگا۔ تقدیر تو وہ چیز ہے جو ایسی کشتیوں کو بھی جن کا کوئی ناخدا نہیں ہوتا امن و عافیت کی جگہ پہونچا دیتی ہے۔

چوتھا منظر:۔ ویلز کا علاقہ۔ بلاریوس کے غار کے سامنے بلاریوس، گدریوس اور ارویریگس داخل ہوتے ہیں:۔

گدریوس:۔ یہ چاروں طرف کیسا شور ہے۔

بلاریوس:۔ ہمیں اب یہاں سے کہیں اور چلا جانا چاہیئے۔

ارویریگس:۔ اگر ہر کام سے یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو بتایئے کہ اس میں زندگی کا کیا خاک لُطف ہوگا۔

گدریوس:۔ واقعی اگر کہیں چھُپ کر بیٹھ گئے تو پھر کیا اُمید ہوسکتی ہے۔ اگر یہی طریقہ رکھا تو ایک طرف سے رومانی اور دوسری طرف سے برطانیہ والے اگر ہمارا کام تمام کر دینگے۔ یا شروع میں وحشی سمجھ کر کچھ دنوں اپنا کام نکالیں گے اور اس کے بعد قتل کر دیں گے۔

بلاریوس:۔ لڑکو! ہم پہاڑوں میں اُوپر چڑھتے ہوئے بلند مقاموں میں پہونچ جائیں گے اور وہاں تمام آفات سے محفوظ رہینگے۔ شاہی فوجوں میں ہماری شرکت کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ کلوٹن کو ہم نے ابھی قتل کر دیا ہے ہمیں کوئی جانتا نہیں اور نہ ہم کسی لڑنے والے فریق میں شریک ہیں۔ یہی وجہ ہماری گرفتاری کی ہو جائے گی۔ جواب طلب کیا جائے گا کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور ہم سے وہ جُرم قبول کرالیا جائے گا جس کے ہم مرتکب ہوئے ہیں۔ پھر ہمارے جُرم کی سزا سوائے اسکے کچھ نہ ہوگی کہ اذیتیں تکلیفیں اُٹھا کر ہم جان سے مارے جائیں۔

گدریوس:۔ آپ کی یہ باتیں نرے وہم ہی وہم ہیں۔ اس سے ہمارا اطمینان نہیں ہوگا کہ ہم اُونچے پہاڑوں پر کہیں جاکر چھپ جائیں اور نہ آپکو ایسا مشورہ دینا زیب دیتا ہے۔

ارویریگس:۔ بھلا غور کیجئے کہ جب رومانی مرکب سواریوں کے گھوڑے ہر طرف ہنہناتے ہونگے۔ لشکروں میں جابجا آگ لگ رہی ہوگی اور سب کے گوش و چشم نہایت اہم اُمور کے خیال میں مصروف ہونگے جیسا کہ اس وقت حال ہو رہا ہے تو اُس وقت ہماری طرف کون متوجہ ہوگا۔ اس امر کی تحقیق میں وقت ضائع کریگا کہ ہم کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔

بلاریوس:- فوج میں بہت لوگ ایسے ہیں جو مجھ سے واقف ہیں برسوں کی بات ہے مگر خیال کر دکہ کلوٹن اس وقت بہت کمسن تھا مگر اس کی صورت اب تک یاد رہی۔ علاوہ اس کے بادشاہ کو میری خدمت پسند نہیں آتی اور تم سے محبت و الفت کرنیکا موقع بھی اسے نہ ملا۔ پھر میری جلاوطنی کی وجہ تم دونوں کی تعلیم و تربیت بھی بخوبی نہ ہو سکی، اس صحرائی زندگی میں طرح طرح کی سختیاں اٹھانی پڑیں۔ اس حالت میں یہ امید عبث ہوگی کہ تمہارے شاہی حسب و نسب کا خیال کرکے تمہارے ساتھ سلوک کیا جائے۔ بلکہ انہی پہاڑوں میں رہنا ہوگا۔ گرمی سے رنگت سیاہ رہے گی اور جاڑے میں سردی سے ہمیشہ کانپتے رہتے رہیں گے۔

گدریوس:- یہ جو کچھ بھی ہو۔ اب اجازت دیجئے کہ ہم لشکر میں جائیں۔ مجھے اور میرے بھائی کو تو کوئی نہیں پہچانتا اور اب تو آپ کو بھی لوگ بھول گئے ہونگے۔ یہاں برسوں سے رہتے رہتے آپ اتنے تبدیل ہو گئے اور آپ کی ڈاڑھی بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی نہ پوچھے گا کہ آپ کون ہیں بھلا خیال تو کیجئے میرے لئے یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ میں نے آج تک کسی آدمی کو مرتے نہیں دیکھا اور نہ سوائے جنگلی بکریوں، بزدل خرگوشوں یا صحرا کے ہرنوں کے کسی کا خون دیکھا۔ جو نہ کبھی گھوڑے پر سوار ہوا ہو سوائے ایک گھوڑے کے جس کا سوار بھی میری طرح تھا کہ جس کے موزے پر مہمیز تک نہ تھی مجھے تو اس پاک چمکتے سورج کی طرف دیکھنے سے بھی شرم آتی ہے کہ اس کی روشنی سے نفع اٹھاؤں اور ایسا گمنام رہوں کہ کوئی نہ جانے کہ کون ہوں۔

گدریوس:- واللہ۔ میں ضرور جاؤں گا۔ اگر چلتے وقت آپ نے دعائیں دیکر رخصت کیا تو میں لڑائی میں اپنی جان کی احتیاط کرکے لڑوں گا اور اگر آپ نے دعا نہ دی تو پھر رومانیوں کے مقابلے میں جو خطرہ پیش آئے گا اس کی مطلق پرواہ نہ کرونگا۔

اردیرگیس:- میں بھی اس پر آمین کہتا ہوں۔

بلاریوس:- جب تم نوجوان ہو کر اپنی جانوں کو اتنا ارزاں سمجھ رہے ہو تو پھر کیا وجہ کہ میں اپنی اس ٹوٹی پھوٹی پرانی پن چوری ناؤ کی یعنی اپنی جان کی حفاظت کروں۔ لڑکو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر اپنے وطن اور ملک کی لڑائیوں میں اتفاق سے تم نے جان دی تو جہاں تم مروگے وہیں موت میں میرا بستر بھی ہوگا۔ چلو آگے بڑھو!

(علیحدہ کہتا ہے:-)

ان کی فطرت عالی اس وقت تک مضطر و بیتاب رہیگی جبتک کہ وہ اپنا نسل شاہی سے ہونا ظاہر نہ کریں گے۔

(سب چلے جاتے ہیں)

جزو خامس

پہلا منظر:- برطانیہ۔ رومانی لشکرگاہ۔ پوستی مس ہاتھ میں ایک خون آلودہ رومال لئے آتا ہے۔

پوستی مس:- اے خون آلودہ کپڑے میں تجھے ہمیشہ اپنے دم کے ساتھ رکھوں گا۔ کیونکہ اس رنگ میں میں نے ہی تجھے رنگوایا ہے۔ وگو! جن کی شادیاں ہو چکی ہیں اگر تم میں سے ہر شخص یہی وطیرہ اختیار کرتے جو میں نے کیا ہے تو تم میں سے کتنے لوگ ہو نگے جو ذرا ذراسی بدگمانی پر اپنی بی بیوں کو ہلاک کرنے پر آمادہ نہو جاتے ہونگے۔ حالانکہ یہ بی بیاں تم سے کہیں بہتر ہونگی۔ اے پیسانیو، ہر نیک ملازم اپنے آقا کے ہر حکم کو بجا نہیں لایا کرتا۔ سوائے اچھے کاموں کے کسی قبیح فعل کے کرنے کی اسے پابندی نہیں ہوا کرتی۔ اے خدا! اگر تو میری سب خطاؤں کی سزا مجھے دیتا تو اب تک اس خطا کیلئے میں کیوں زندہ رہتا جو مجھ سے سرزد

ہوئی ہے۔ پھر ایموجن کی جان بچ جاتی کہ باقی عمر وہ پشیمانی اور ندامت میں گذارتی۔ میں بدبخت تو وہ ہوں کہ تو مجھ سے بدلا نکالتی لیکن افسوس۔ اے خدا! تو تو تھوڑے سے قصور پر دُنیا سے اٹھالیتا ہے۔ یہ بھی تیری محبت اور تیرا ہی احسان ہے تاکہ وہ جسے اٹھالیا جاتا ہے زیادہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو۔ خداوند! بعضوں کو تم موقع دیتے ہو کہ وہ گناہوں میں مبتلا ہوں۔ جب اُن کے گناہوں کا طومار ہوجاتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں اور ڈر کر پشیمان اور نادم رہتے ہیں۔ اور اس سے بھی انہیں نفع بخشتا ہے لیکن ایموجن تو تمہاری ہی چیز تھی۔ اُس کی جان بچا کر تم مجھے سزا دے سکتے تھے۔ میں یہاں اٹلی کے شریفوں کے ہمراہ لایا گیا ہوں تاکہ اپنی محبوبہ کی سلطنت کے مقابلے میں لڑوں۔ اے برطانیہ! کیا یہ کافی نہ تھا کہ میں نے تیری وارثہ کو ہلاک کرا دیا۔ اس سے بڑھ کر زخم میں اب تجھے کیا پہونچا سکتا ہوں۔ اے خدا صبر کے ساتھ اب میری یہ التجا سن لے، اب میں اٹلی کی یہ پوشاک جو میرے تن پر ہے اتار پھینکتا ہوں اور اُس کی جگہ برطانیہ کے ایک غریب کسان کے کپڑے پہنتا ہوں۔ اور بس جس فریق کے ساتھ یہاں تک آیا ہوں اُس کے خلاف لڑونگا۔ اور یوں اپنی ایموجن کے لئے جان دونگا۔ میری زندگی کا ہر نفس اس وقت موت سے لبریز ہو رہا ہے۔ اور اب میں اس طرح مرونگا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔ نہ کسی کو مجھ پر ترس آئے گا۔ اور نہ کوئی مجھے اب دشمن نہ کر سکے گا۔ غرضکہ اب خطروں میں پڑ کر اپنی جان تلف کرونگا۔ اور باور کراؤں گا کہ مجھ میں کتنی ہمت اور دلیری ہے گو یہ باتیں اب تک میری عادت کے خلاف ہوئی ہیں۔

(چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر:۔ رومانی اور برطانوی لشکروں کے درمیان میدانِ جنگ کا ایک موقع۔ ایک طرف سے لیوکوس، یاچیمو اور رومانی فوجیں داخل ہوتی ہیں، دوسری طرف سے برطانوی لشکر آتا ہے۔ لیوناٹس پوستی مس ایک غریب سپاہی کے سے کپڑے پہنے برطانوی فوجوں کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ فوجیں اسٹیج پر سے کوچ کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ اسکے بعد یاچیمو اور پوستی مس لڑتے نظر آتے ہیں۔ پوستی مس یاچیمو پر غالب آتا ہے اور اُس کے ہتھیار رکھوا لیتا ہے۔ یاچیمو اسکے بعد چلا جاتا ہے۔

یاچیمو۔ میرے قلب پر گناہوں کا جو بھاری پتھر رکھا ہے وہ میری جوانمردی کو غارت کئے ڈالتا ہے میں نے ایک معزز خاتون کو دغا دی ہے جو اس مُلک کی شہزادی ہے۔ یہاں کی ہوائیں انتقام کش ہیں وہ جو مجھے کمزور کئے دیتی ہیں ورنہ ممکن تھا کہ یہ ذلیل آدمی جسے فطرت کا دُرد و تلچھٹ سمجھنا چاہیئے لڑائی میں مجھے مغلوب کر لیتا۔ میرے اعزاز و خطابات جس قدر میں رکھتا ہوں وہ سب ذلت و نفرت کے نشان ہیں۔ برطانیہ! اگر تیرے شرفا اس ذلیل کمینے سپاہی سے جو ہمارے سرداروں کو بھی لڑائی میں مات کرتا ہے بڑھکر ہیں تو پھر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ تم لتنے انسان نہیں ہو جس قدر کہ دیوتاؤں کا درجہ رکھتے ہو۔

(چلا جاتا ہے)

(لڑائی شروع ہوتی ہے برطانیہ کی فوجیں فرار ہوتی ہیں۔ بادشاہ سمبلین کو رومانی گرفتار کر لیتے ہیں۔ اس کے چھڑانے کیلئے بلاریوس، گدریوس اور اروبرگس داخل ہوتے ہیں۔

بلاریوس:۔ برطانیو! خوب جم کر لڑو۔ ہمت نہ ہارو۔ لڑنے کیلئے ہمارے پاس زمین اچھی ہے۔ دونوں صفوں کے درمیان جتنی جگہ ہے وہ خوب محفوظ ہے۔ سوائے ہمارے اپنے خوف کے دوسری کوئی چیز نہیں جو لڑائی کے لئے ہمیں مُنہ موڑنے دے۔ ا

گدریوس } ہاں جوانو! جم کر لڑو اور خوب لڑو۔
اردویرنگیس }

پوستی مس پھر آکر برطانوی سپاہ کو مدد پہونچاتا ہے۔ بادشاہ سمبلین کی سپاہ دُشمن کے ہاتھ سے اُسے چھڑا لیتی ہے۔ پھر یہ سپاہ چلی جاتی ہے۔ لیوکوس رومانی سپہ سالار آتا ہے اس کے ہمراہ ایموجن اور یاچیمو ہیں ــــ

لیوکوس: لڑکے لڑکے فوج میں سے بھاگ کر اپنی جان بچا۔ ابتری سخت ہے۔ خُدائے جنگ کی آنکھوں پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پٹی باندھ دی ہے۔ دوست دوست کو قتل کر رہا ہے۔

یاچیمو: برطانیہ والوں کو کمک پہونچ گئی ہے۔ طالع شوم نے آج کا دن ہمارے لئے شکست کا لکھ دیا ہے اب خیر اسی میں ہے کہ یا تو کمک آئے ورنہ میدان سے فرار ہونا ضروری ہوگا۔

تیسرا منظر: میدانِ جنگ کا دوسرا حصہ۔

پوستی مس اور ایک برطانوی امیر آتا ہے۔

امیر: کیا تم وہاں سے آرہے ہو جہاں لڑائی زور کی ہورہی ہے؟

پوستی مس: ہاں! وہیں سے آرہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُن میں سے ہیں جو لڑائی سے بھاگے ہیں۔

امیر: ہاں! واقعہ یہی ہے۔

پوستی مس: اس میں آپ کا کچھ قصور نہیں شکست میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ یہ تو تائیدِ غیبی تھی کہ ہرتی لڑائی جیت گئے۔ بادشاہ گرفتار اور اس کی فوجیں پراگندہ ہوچکی تھیں۔ شاہی فوجیں پُشت دکھا کر بھاگنے کو تھیں بلکہ ایک تنگ مقام ایسا تھا جہاں سے وہ فرار ہوتی نظر آنے لگی تھیں۔ رومانی اُن کے پیچھے تھے اور شاہی فوجوں کو مارتے مارتے کتوں کی طرح انکی زبانیں باہر نکل پڑی تھیں ہلاک کرنے کیلئے اتنے آدمی تھے کہ رومانیوں کے پاس اس کام کیلئے ہتنیار کافی نہ تھے۔ کسی کو مار کر گرایا۔ کسی کا خون کیا۔ کسی کو ہلکا سا زخمی کیا۔ بعض خود خوف سے گرے۔ غرضکہ وہ تنگ درہ برطانیہ کے مُردوں سے پَٹ گیا۔ مُردوں میں سب کی پیٹھ پر زخم آئے تھے اور بُزدل وہ تھے جنہوں نے جان اس طرح بچائی کہ باقی عُمر شرمندگی سے گھُل گھُل کر مریں۔

امیر: یہ تنگ درہ کہاں تھا۔

پوستی مس: جہاں لڑائی ہورہی تھی اُس کے نزدیک ایک بڑا مستحکم مقام تھا، دونوں طرف صف بندی تھی اور پھوس اور نرسل کے پشتے بنا کر اس کے پُشت پر خندقیں کھودی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ ایک بڈھے لڑنے والے کو جو ایماندار آدمی معلوم ہوتا تھا دُشمن کے مقابلے کا اچھا موقع مل گیا۔ یہ بُڈھا اسی لائق تھا کہ مُلک اس کی خدمت اتنے دِن تک کرتا کہ اس کی ڈاڑھی سپید بگلا ہوجاتی۔ وہ اس تنگ درہ پر مع دو جوانوں کے آن ڈٹا۔ یہ دونوں جوان نوعمر لڑکے تھے جن کے دِن کھیل کود میں بھاگنے دوڑنے کے تھے نہ کہ ایسی خونی لڑائی میں کشت و خون میں مصروف ہونے کے۔ وہ بڑے خوشرو جوان تھے بلکہ اُن حسینوں سے بھی اُن کا حُسن و جمال بڑھا ہوا تھا جو مُنہ پر نقاب اس غرض سے ڈالتے ہیں کہ رنگ میلا نہ ہو یا اس لئے کہ کوئی اُنہیں پہچانے نہیں۔ اس درے پر قبضہ کرکے اُنہوں نے بھاگتے ہوئے برطانیوں کو للکارا اور کہا کہ "برطانیہ کے جنگلی ہرنوں کو تو بھاگتے دیکھا ہے لیکن مَردوں کو فرار ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اگر تم پھر لڑائی کی طرف نہ پلٹے تو سمجھ لو ہم بھی رومانیوں کی طرح تمہارے دُشمن ہوجائیں گے اور پھر اُن جانوروں کی طرح تمہیں جان سے ماریں گے جن کے مثل تم اس وقت بھاگ رہے ہو۔ پس تمہاری خیر اسی میں ہے کہ پلٹ کر اپنے مُلک کو دُشمن سے بچانے کی کوشش کرو۔" غرضکہ یہ تینوں جانباز تین ہزار آدمیوں سے ہمت و دلیری میں کم نہ تھے بلکہ

اُتنے ہی آدمیوں کے برابر میدانِ جنگ میں کام کرسکتے تھے۔ باقی فوج کھڑی تھی اس لئے سمجھنا چاہیے کہ کُل فوج سے مُراد یہی تین آدمی تھے۔ کچھ تو لڑائی کے موقع کی عمدگی نے مگر زیادہ تران تینوں کی شرافت و شجاعت تھی جو ایک بُزدل عورت کو بھی بہادر اور جری بنادے کہ خوفزدہ فراریوں میں ہمت و جرأت پیدا ہوئی اور اُن میں بعض تو شرمندگی مٹانے اور بعض واقعی ہمت دلیری کے آجانے سے ایسے عالی ہمت، اور جوانمرد ہوگئے جیسے کہ ابتری اور بھاگڑ سے پیشتر تھے۔ بعض شرمندگی دُور کرنے کو اور بعض جو دوسروں کو بھاگتے دیکھکر بھاگے تھے، اور لڑائی میں اِس قسم کی مثال پیش کرنے کو بدترین گناہ سمجھتے تھے پلٹے اور یہ بھی اِس بڈھے اور دونوں لڑکوں کی طرح قہر و غضب بنکر اس طرح دُشمن کے مقابلے پر آئے جیسے جنگل کے شیر برچھیوں سے زخمی ہوکر شکاریوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اب لڑائی میں ایک آن کو کچھ سکوت سا پیدا ہوا۔ رومانی جو فراریوں کے تعاقب میں تھے کچھ رُکے اور پھر اُن میں ابتری پڑتے ہی بھاگڑ پڑی اور اب یہ حال ہے کہ جو پہلے شاہین اور عقاب کی طرح جھپٹے مارتے تھے اب وہ مُرغی کے بچوں کی طرح جان بچانے کو زمین پر دبکنے لگے اور کچھ دیر پہلے جو فاتح بنکر آگے بڑھے چلے جاتے تھے اب وہ غلاموں کی طرح پسپا ہونے لگے اور سہارے وہی آدمی جو پہلے بزدل ثابت ہوئے تھے اُنہوں نے اس سڑے ایسے کھانے کی طرح جو دُور دراز کے جہازی سفر میں زندگی بخشتا ہے دیکھا کہ دشمن بھاگ رہا ہے یہ دیکھکر انہوں نے بھاگتوں کو بُری طرح زخمی کیا بعض نے اُن پر جو مرے پڑے تھے اور بعض نے اُن زخمیوں پر جو پہلے حملے میں جاں بلب ہوکر زمین پر پڑے تھے ہاتھ صاف کیا اور بعض نے اپنے ہی دوستوں پر انہیں دُشمن سمجھ کر وار کیا۔ ایک ایک نے دس دس کا پیچھا کرکے بیس بیس کو ہلاک کیا۔ اور وہ بھی جو معلوم ہوتا تھا کہ زمین پر مرے پڑے ہیں اور کچھ نہیں کرسکتے اُس وقت میدانِ جنگ کے بھوت اور سُورما بن گئے۔

امیر:۔ یہ بھی کچھ عجیب اتفاق تھا کہ ایک تنگ درہ ملجائے اور ایک بوڑھا اور دو لڑکے یہ یہ عجیب و غریب کام دکھائیں۔

پوستی مس:۔ نہیں تعجب نہ کیجیے۔ گو آپ لوگ تعجب کرنیکے لئے ہیں، کچھ کرنے کے لئے نہیں بنائے گئے۔ بس بہتر ہوگا کہ اب اِن واقعات کو نظم کرکے بطور ایک لطیفہ کے شائع فرمائیے مضمون صرف اِتنا ہو کہ دو لڑکوں اور ایک بڈھے نے، اور بڈھا بھی ایسا جس کے بڑھاپے کو دوسرا لڑکپن کہیے اور ایک اور آدمی نے برطانیہ والوں کی جان بچادی اور رومانیوں کو غارت کردیا۔

امیر:۔ مگر آپ اتنا خفا کیوں ہوتے ہیں۔

پوستی مس:۔ افسوس خفا ہونے سے حاصل ہی کیا۔ جو دشمن کے مقابلے پر نہ ٹھہرے۔ مَیں تو اُسے اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ جب کسی کو بھاگنا ہی مقصود ہو تو کیوں نہ بھاگے مگر اسکے ساتھ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی میری دوستی سے بھی جلد بھاگ نکلے گا۔ آپنے تو واقعی مجھے شاعر بنادیا۔

امیر:۔ آپ تو درحقیقت خفا ہوگئے۔ لیجیے خدا حافظ۔

پوستی مس:۔ کیا آپ ابھی تک بھاگ رہے ہیں (علیحدہ کہتا ہے)۔ آپ دربار کے امیر یا شریفوں میں رذیل ہیں، اس سے بدتر کیا بات ہوسکتی ہے کہ میدانِ جنگ میں یہ نفسِ نفیس موجود ہیں اور مجھ جیسے ادنیٰ آدمی سے دریافت کرتے ہیں کہ لڑائی کا کیا حال ہے۔ آج کتنے ہونگے جنہوں نے جان بچانے کو بھاگے بھی مگر جان نہ بچی۔ رہی میری جان تو وہ تو مصیبت اور ذلت کا ایک طلسم ہے موت کی تلاش میں نکلا۔ مگر موت مجھے وہاں بھی نہ آئی۔ جہاں جان توڑتے سپاہی کرب و تکلیف میں تڑپتے تھے اور

کراہتے تھے اور نہ وہاں اُس نے پوچھا جہاں زور کی لڑائی ہیں موت کا بازار گرم تھا، موت ایک کریہہ منظر بھوت ہے جس کے کارگزاروں میں کچھ ہم ہی نہیں ہیں جو اس کے لئے چھریاں اور خنجر چلاتے ہیں بلکہ وہ تو شراب کے چمکتے پیالوں، نرم بستروں اور شیریں تقریروں میں بھی چھپا بیٹھا ہے کہ اس کے مقاصد خوب پورے ہوتے رہیں۔ یہ جو کچھ بھی ہو بہرکیف مجھے موت سے مُلاقات کرنی ہے۔ گو اُس وقت میں برطانیوں کا دوست بنا ہوا تھا مگر اب پھر رومانی بنا جاتا ہوں، گو دراصل برطانوی ہوں مگر رومانیوں کے ساتھ رومانی بنکر یہاں آیا تھا۔ اب میں کسی سے نہ لڑونگا بلکہ کمینے سے کمینہ آدمی جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے گا اُسکے سامنے گردن پیش کردونگا۔ رومانیوں نے یہاں بہت کُشت و خُون کئے۔ اب اتنا ہی زیادہ کُشت و خُون برطانیوں کو کرنا ہے، رہا میں، تو میرا فدیہ تو صرف موت ہے۔ کسی فریق کا بھی حامی ہوں۔ بہرکیف مجھے تو مرنا ہے نہ اب میں یہاں جیونگا۔ اور نہ اس جان کو اپنے ساتھ کہیں لے جاؤں گا جو کچھ بھی ہو مجھے تو کسی نہ کسی طرح ایموجن کیلئے جان دینی ہے۔

(دو برطانوی کپتان اور سپاہی آتے ہیں)

پہلا کپتان:۔ خُدا کا شکر ہے کہ رومانی سپہ سالار لیوکوس گرفتار ہو گیا۔ لوگوں کا خیال کہ وہ بڈھا اور دونوں لڑکے دراصل فرشتے تھے۔

دوسرا کپتان:۔ ایک چوتھا آدمی بھی ذلیل سے کپڑے پہنے ساتھ تھا۔ وہ بھی اس بڈھے اور دونوں لڑکوں کے ساتھ رومانیوں سے خوب خوب لڑا ہے۔

پہلا کپتان:۔ ہاں بیان تو یہی کیا جاتا ہے مگر ان چاروں میں اب تک کسی کا پتہ نہیں چلا ہے...... کھڑے رہو تم کون ہو۔

پوستی مس:۔ میں ایک رومانی ہوں۔ میرے ساتھی اگر مجھے یوں نہ چھوڑ جاتے تو میں کاہیکو یہاں ہوتا۔

دوسرا کپتان:۔ اس رومانی کتے کو گرفتار کرلو۔ رومانی کی ٹانگ تک یہاں کا قصہ سُنانے کو اپنے ملک کو واپس نہ جانے پائے گی یعنی یہ بتانے کو کہ یہاں چیل کووں نے اُن کی لاشوں کو کیسا کھایا ہے۔ یہ ذلیل رومانی تو اپنے کام ایسے بیان کرتا ہے کہ گویا کوئی بڑا افسر تھا۔ اسے ہم اپنے بادشاہ کے سامنے لے جائیں گے۔

سمبلین۔ بلاریوس۔ گدریوس۔ اروبرگس۔ پسانیو مع چند خدامِ شاہی اور رومانی اسیرانِ جنگ کے آتے ہیں۔ دو کپتان پوستی مس کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ بادشاہ اُسے داروغہ جیل کے سپرد کرتا ہے۔

(باقی آئندہ) — عنایت اللہ دہلوی

بلندیِ نگاہ

نگاہ کی بلندیوں کا نام جانِ پاک ہے
جگر کی ارجمندیوں کا نام جانِ پاک ہے
ملا ہوا ہے مشتِ خاک کو جو وقفِ سوزِ دل
اسی کی دردمندیوں کا نام جانِ پاک ہے

نگاہ کی بلندیاں ہی عرش ہیں شعور کا
نگاہ کی بلندیاں ہی چشمہ ہے ظہور کا
لطیف سی جھلک تھی اک بلندیِ نگاہ کی
کلیم کو گمان ہوا تھا جس پہ شمعِ طور کا

نگاہ کی بلندیاں بلندیِ حیات ہیں
نگاہ کی بلندیاں عبارتِ کائنات ہیں
نگاہ کی بلندیوں کی انتہا نہیں کوئی
نگاہ کی بلندیاں جہانِ بے جہات ہیں

نگاہ کی بلندیوں کی زد میں ماورائے عرش
نگاہ کی بلندیوں کا منتہا خدائے عرش
نگاہ کی بلندیاں ہیں وہ بلندیاں کہ جو
نگاہِ اہلِ فکر میں ہیں اپنے آپ بنائے عرش

امینِ حزیں (سیالکوٹی)

خط

منوّر خاں کارخانے میں ملازم تھا۔ چالیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ ایک بیوی تھی اور ایک لڑکا اکبر۔ لیکن اکبر کچھ آوارہ مزاج تھا۔ گھر سے تو مدرسے آتا۔ لیکن یہاں دو ایک گھنٹے بیٹھکر باقی وقت گھوم گھام کر گذار دیتا۔ عمر کے ساتھ ساتھ آشفتہ مزاجی بھی زور پکڑ رہی تھی۔ ماستا کی ماری ماں منوّر سے کبھی شکایت نہ کرتی۔ اور جو وہ کہیں اِدھر اُدھر سے کچھ سُن بھی پاتا تو چشم پوشی سے کام لیتا۔ کیونکہ زندگی کا حاصل بھی تو یہی ایک بچہ تھا۔

منوّر خاں جو چالیس روپے لاتا اس میں سے پانچ روپے تو مکان کے کرایہ کے ہی اُٹھ جاتے۔ پانی نل سے وہ خود بھر لاتا۔ ایک روپیہ ماہوار مہترانی لے جاتی۔ کوئی روپیہ ڈیڑھ روپیہ دھوبن کا اُٹھتا اور چار روپے ماہوار اکبر کی تعلیم کا خرچ تھا۔ کپڑا لتّا اور کھانا پینا اس کے علاوہ تھا۔ منوّر کی بیوی رضیہ ایک بہت سمجھدار اور دُور اندیش عورت تھی۔ ہر مہینے دو ایک روپے ضرور پس انداز کر لیتی۔ لیکن اس پر بھی اکبر کا جو داؤ لگ جاتا تو کچھ نہ کچھ اُڑا لے جاتا۔ لیکن رضیہ نہ لختِ جگر سے کچھ کہتی نہ شوہر سے شکایت کرتی۔

مُلک کی اقتصادی حالت خراب ہونے سے جب ملازموں پر تخفیف کا کلہاڑا چلنے لگا تو اسکی زد سے منوّر بھی نہ بچا اور لگا لگایا روزگار سرمایہ دار کی ایک جنبشِ قلم سے ہاتھ سے نکل گیا۔

مُلازمت سے برطرف ہونے کی پہلی رات تھی۔ منوّر کھاٹ پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ رضیہ ایک دوسری کھاٹ پر سو رہی تھی۔ اکبر کی چارپائی باہر دالان میں تھی۔ رضیہ کی جو آنکھ کھلی تو شوہر کو بیدار پا کر بولی "تم جاگ رہے ہو؟"

"نیند نہیں آتی" منوّر نے جواب دیا۔

"جانے کیا وقت ہوگا؟" رضیہ نے ایک جمائی لیکر کہا۔

"صبح ہونے کو ہے!" منوّر نے جواب دیا

"مجھے بھی جگا لیا ہوتا!" رضیہ بولی۔

"میں تو پریشان ہوں" منوّر کہنے لگا "تمہیں بھی پریشان کرتا"

دونوں خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد محلّے کی مسجد سے نعرۂ تکبیر بلند ہونے لگا "اللہ اکبر! اللہ اکبر"

کتنی پُر سطوت آواز تھی اور کیسی سکوت آمیز فضا۔ آسمان کی طرف دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ستاروں کا قافلہ بھی رُک گیا ہے۔ جب اذان ہو چکی تو منوّر کہنے لگا "سچ ہے! خُدا مصیبت میں ہی یاد آتا ہے"

"اُٹھو نا پھر!" رضیہ بولی "نماز ہی پڑھ لو"

"ہاں!" منوّر کہنے لگا "اب نمازیں ہی تو پڑھنی ہیں اور کام ہی کیا ہے!"

"تو گویا!" رضیہ بولی "نماز تمہارے لئے شغلِ بیکاری ٹھیرا۔ توبہ کرو توبہ! اُٹھو وضو کرو۔ سُنا نہیں کہ صبح کی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے"

"تمہاری تو کبھی قبول نہ ہوئی" منوّر نے طنزاً کہا "دُعاؤں میں اثر ہوتا تو آج بیکار کیوں بیٹھا ہوتا"

"اسے کہتے ہیں کفرانِ نعمت!" رضیہ نے جواب دیا۔

"جو اچھی اور فائدے کی بات ہوئی اسے اپنی محنت اور کرامت سمجھ لیا اور جو کہیں شامتِ اعمال سے کچھ کھو گیا تو اسے اللہ میاں کے سر تھوپ دیا۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ ہماری روزی کے فکر سے بھی غافل نہیں۔"

"ہاں سچ ہے!" کہتے ہوئے منوّر اٹھا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔

آسودگی اور آرام کے بعد مفلسی اور تنگدستی جیسی کچھ روح فرسا ہوا کرتی ہے ظاہر ہے۔ بیشتر آدمی اس امتحان میں مشکل سے ہی پورے اترتے ہیں۔ اور جو کہیں بال بچوں والا گھر ہو تو بڑے بڑے حوصلے والوں کے بھی چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور زمانہ تو رنگ بدلتا ہی رہتا ہے۔ امروز فردا کی چکی ایک ہی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ اپنی اپنی قسمت ہے کسی کی آرام سے کٹ گئی اور کسی کی ٹھوکریں کھاتے بسر ہو گئی۔ بہرحال قسمت کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔ ہونی کی روک نہ عقل سے ہو سکتی ہے نہ تدبیر سے۔ بس وہی ع:

سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ

منوّر خاں کو بیکار بیٹھے بہت دن ہو چکے تھے۔ صبح سے شام تک تفکّرات کی دنیا میں کھویا رہتا۔ مفلسی اور بیکاری تو تھی لیکن اکبر کی آوارگی سب سے زیادہ سوہانِ روح ہو رہی تھی۔ صبح نکلا تو شام کو آیا اور کبھی دو دو روز غائب!

رات کا وقت تھا ابر گھِرا ہو رہی تھی۔ منوّر کھاٹ پر لیٹا کچھ گنگنا رہا تھا۔ رضیہ چولھے کے پاس بیٹھی اکبر کی راہ دیکھتی تھی۔ کبھی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوتی اور کواڑ کھول کر گلی میں اِدھر اُدھر جھانکنے لگتی۔ کھڑکی کے راستے جب ہوا کا جھونکا آتا تو لالٹین کی بتی جھلملانے لگتی۔

"کیوں بار بار کھڑکی کھولتی ہو؟" منوّر بولا۔ "بارش تو ہو رہی ہے۔"

"ہاں!" رضیہ بولی۔ "بارش تو ہو رہی ہے۔ لیکن میں تو اکبر کی راہ دیکھتی ہوں۔ کہیں بھیگ رہا ہوگا غریب۔ جانے کیا بجا ہے؟"

"گیارہ بج چکے!" منوّر نے جواب دیا۔

"گیارہ؟" رضیہ نے تعجب سے کہا۔ "میرے اکبر نے تو ابھی روٹی بھی نہیں کھائی۔"

پھر ہنڈیا کو ہاتھ سے چھو کر۔ "سالن تو ابھی گرم ہی ہے۔ چپاتیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔"

"یہ سب تمہاری کرامت ہے!" منوّر بولا۔

"میری کرامت؟" رضیہ نے پوچھا۔

"یہی جو اس کمبخت کے لچھن ہیں!" منوّر نے جواب دیا۔ "پکا شُہدا ہو گیا ہے، نہ شرم نہ حیا!"

"توبہ ہے!" رضیہ نے کہا۔ "ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ سیانا ہوگا تو خود ہی سمجھ جائیگا۔"

"سبحان اللہ!" منوّر نے طنزاً کہا۔ "سولہ برس کا تو ہو گیا اور سیانا ہونا ابھی باقی ہے۔ تمہارے اس لاڈ پیار نے تو اسے تباہ کیا ہے۔ کھانے پلانے کا شوق تو تم نے کر لیا لیکن افسوس تربیت کی فکر نہ کی۔ آج اگر کوئی ہنر ہاتھ میں ہوتا تو چار پیسے کی اُمید ہوتی۔ میرے پاس ہی سو پچاس ہوتے تو کوئی چھوٹی موٹی دُکان ہی کر لیتا۔ گذران تو ہو ہی جاتی۔"

"ہاں!" رضیہ نے کہا۔ "کچھ کام کاج تو ضرور کرنا چاہئے۔ بیکار بیٹھے کیسے کٹے گی؟"

"تو نوکری اٹھاؤں؟" منوّر نے جواب دیا۔ "تمہارا بیٹا کما چکا اور ہم کھا چکے۔"

"نوکری کیوں اٹھاؤ!" رضیہ کہنے لگی۔ "دو، پوتے دو

سو کا زیور موجود ہے۔ کوئی دو ڈھائی سو روپے بھی ہیں۔ لو اور دُکان کر لو۔ اللہ کارساز ہے!"

"او ہو!" منوّر خوش ہو کر بولا "یہ روپے کہاں سے آئے؟"

"آئے کہاں سے ہیں" رضیہ بولی "تمہارے ہی تو ہیں! پس انداز کرتے کرتے رقم ہو گئی! میرے خیال میں تو تم آٹے دال کی دوکان کر لو۔ اکبر بھی تمہارے ساتھ ملکر کام کرنے لگے گا"

اکبر کواڑ سے لگا یہ باتیں سُن رہا تھا۔ کچھ دیر میاں بیوی میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر منوّر سو رہا۔ اور رضیہ پھر اُٹھکر کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اور کواڑ کھول کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگی۔ بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کوندتی اور بادل گرجتے تھے۔ کچھ جھکّڑ بھی چل رہا تھا "اللہ میرے بچے کو خیر سے گھر لائے" کہتی ہوئی کھڑکی بند کر کے کھاٹ پر آلیٹی۔ گھر کا دروازہ اکبر کے لئے اکثر رات بھر کھلا رہتا تھا۔ آج بھی کھلا رہا۔ آخر رضیہ کو بھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اب اکبر دبے پاؤں اندر آیا۔ دالان میں لالٹین رکھی تھی۔ ہنڈیا چولھے پر رکھی تھی۔ اکبر چپکے سے اسباب والی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ دیوار کے پاس ٹرنک رکھا تھا۔ ایک کونے میں مٹی کے دو تین گھڑے ایک دوسرے کے اوپر رکھے تھے۔ کسی میں چھان بورا تھا، کسی میں آٹا۔ رضیہ چابیاں بھی اسی چھان بورے میں چھپا کر رکھا کرتی تھی۔ اکبر نے چابیاں نکال کر ٹرنک کھولا اور زیورات اور نقدی لیکر دبے پاؤں گھر سے نکل گیا۔

بارش تھم چکی تھی اور نور سحر کی برکت سے رات کی ظلمت سیماب پا ہو رہی تھی۔ دالان کی چھت میں چڑیا کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ وہ اپنی چہچہوں سے سونے والوں کو پیغام ہنگامہ آرائی دے رہا تھا۔ رضیہ جاگی۔ لالٹین ابھی تک جل رہی تھی۔ ہنڈیا بھی چولھے پر رکھی تھی۔ چپاتیاں بھی جوں کی توں پڑی تھیں۔ دروازہ بھی کھلا تھا اور اکبر کی کھاٹ بھی خالی تھی۔

"خدا خیر کرے! آج میرا لال آیا نہیں" رضیہ نے ایک جمائی لیکر کہا۔ پھر ضروریات سے فارغ ہو کر نماز کیلئے کھڑی ہو گئی۔ منوّر ابھی لمبی تانے مزے سے سوتا تھا۔

رضیہ جب نماز سے فارغ ہوئی تو شوہر کو آواز دی۔

"اب اُٹھو گے بھی!"

منوّر نے کروٹ بدلی اور دو ایک بار "ہوں" "ہاں" "اچھا" کہکر پھر سو گیا۔

رضیہ نے پھر آواز دی "اُٹھو! نماز کا وقت جاتا ہے"

"ہاں اُٹھتا ہوں" منوّر نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"اُٹھو پھر!"

"کہہ تو رہا ہوں!" منوّر نے ایک جمائی لیکر کہا۔ "اُٹھتا ہوں"

رضیہ کسی کام کو اسباب والی کوٹھڑی میں گئی۔ لیکن ٹرنک کھلا دیکھکر یہ حالت ہوئی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ کانپتے کانپتے کپڑے اُٹھا کر دیکھنے لگی وہاں نہ زیور تھا نہ روپیہ۔ غریب سر تھام کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔

"کون آیا؟ کون نکال لے گیا؟ اکبر کے سوا تو چابی کا کسی اور کو علم نہ تھا"

اتنے میں منوّر اُٹھا اور بیٹے کی کھاٹ خالی دیکھکر بولا۔ "کمبخت آج بھی نہیں آیا۔ کیا بنے گا اس کا۔ خدا اولاد دے تو نیک دے"

پھر بیوی سے کہنے لگا "تم اندر بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

پھر دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اور ہمنکر "رُپے گن رہی ہو کیا؟"

لیکن جب کچھ جواب نہ ملا تو اندر چلا گیا۔

"ارے! یہ تم رو کیوں رہی ہو؟"

رضیہ نے شوہر کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز سے کہا "یہاں تو خاک بھی نہیں"

"کیا؟" منوّر نے تعجب سے پوچھا "کیا کہہ رہی ہو؟"

"صندوق کھلا پڑا ہے" رضیہ بولی۔

"روپے لے گیا کوئی؟" بیساختہ منوّر کے منہ سے نکلا "اور زیور؟"

"گیا!" رضیہ نے جواب دیا۔

منوّر ایک آہ بھر کر بیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور ٹرنک میں سے جلدی جلدی کپڑے نکال نکال کر ایک طرف رکھنے لگا۔

"لے کون گیا؟"

"اللہ ہی جانے!"

"چابی کہاں تھی؟"

"چابی تو یہاں چھان والے مٹکے میں رکھی تھی" رضیہ روتے ہوئے بولی۔

"صبر کرو"

"اب ہو گا کیا؟"

"صبر!" منوّر نے جواب دیا "اکبر کے لچھن تو ایک دنیا کو معلوم ہیں کسی سے کچھ کہو سنو گی تو اپنی ہی بدنامی ہو گی"

دونوں کوٹھڑی سے نکلکر دالان میں آ بیٹھے۔

اس واقعہ کو کئی روز ہو چکے تھے۔ اور اکبر اس روز سے گھر نہیں آیا تھا۔ منوّر نے سارا شہر چھان مارا لیکن بیٹے کا کہیں سراغ نہ ملا۔ یہ آخری سہارا بھی جاتے رہنے سے دونوں مکان چھوڑ کر روپے ڈیڑھ روپے ماہوار کی کوٹھڑی میں اُٹھ آئے۔ دس پانچ برتن جو گھر میں تھے وہ بھی بیچ ڈالے۔ لیکن رضیہ پر ایک وصف تھا ہر حال میں راضی برضا رہتی۔ دونوں وقت کھانے کو ملے یا ایک وقت کیا مجال جو حرف شکایت زبان پر آئے۔ منوّر جب دن بھر گھوم گھام کر اور مایوس ہو کر گھر آتا تو وہ اُسے بھی تسلّی دیتی۔

ایک روز اُسے بہت متفکر دیکھکر کہنے لگی "کبھی تو ہمارے دن بھی پھرینگے۔ کیوں پریشان ہو رہے ہو"

"ہاں!" منوّر نے کہا "جب ہم قبر میں ہونگے"

"تم کہو تو میں کسی گھرانے میں نوکری کر لوں" رضیہ کہنے لگی۔

"تم نوکری کرو گی" منوّر بولا "نہیں رضیہ! اب میں محنت مزدوری کر لوں گا"

"وہ کیوں؟" رضیہ نے کہا "سینا پرونا میں جانتی ہوں۔ کھانا میں پکا سکتی ہوں۔ کیا ہرج ہے جو میں کہیں نوکری کر لوں"

"رضیہ!" منوّر بولا "میری تو صلاح ہے کہ کسی اور شہر میں چل رہیں۔ یہاں تو نوکری بھی مجھ سے نہ اُٹھے گی"

"اپنی ہی ہانکے جاؤ گے" رضیہ بولی "یا کسی اور کی بھی سنو گے؟"

"کیا؟"

"جب محنت مزدوری کرنی ہے تو پھر عار کیسی؟"

"ہاں یہ تو سچ ہے!" منوّر نے جواب دیا۔

رضیہ بولی "محلے میں دو ایک عورتیں ماما کا کام کرتی ہیں تم کہو تو میں اُن سے کہوں؟"

"نہیں!" منوّر نے جواب دیا "پہلے مجھے قسمت آزما لینے دو۔ میں کل صبح منڈی جاؤں گا۔ اللہ نے چاہا تو چار پیسے لیکر ہی آؤنگا"

اتنا کہہ کر منوّر خاموش ہو گیا۔

اس کا جواب غریب رضیہ کے آنسو تھے۔

منوّر اب صبح ہوتے ہی منڈی چلا جاتا اور شام تک سات آٹھ آنے کما لاتا۔ کبھی زیادہ بھی مل جاتے۔ ایک زمانہ اسی طرح گذر گیا۔ رضیہ شاکر بھی تھی اور صابر بھی۔ لیکن ایک پھانس تھی جو کلیجے میں لگی تھی۔ یعنی بیٹے کی یاد۔ اکبر جس روز سے گیا تھا آج تک اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ رضیہ اور منوّر دونوں کے بال سپید ہونے لگے تھے۔ اور یہ ایک نیا فکر تھا جو منوّر کو دامنگیر ہو رہا تھا۔

رمضان کی ستائیسویں تھی۔ ڈاکیہ منوّر کا پتہ پوچھتا محلے میں آنکلا۔ اتفاق سے اس وقت منوّر گلی سے گذر رہا تھا۔

"کیا ہے بھائی؟" منوّر نے پوچھا "میرا ہی نام منوّر ہے"

"یہ ایک رجسٹرڈ خط ہے" ڈاکیہ نے تھیلے سے ایک خط نکال کر کہا۔

"اکبر نے بھیجا ہے؟" بیساختہ منوّر کے منہ سے نکلا۔

ڈاکیہ نے لفافہ پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا "ہاں بھیجنے والے کا نام اکبر ہی ہے"

"لاؤ!" منوّر نے ہاتھ بڑھا کر کہا "میرے بیٹے کا خط ہے۔ کہاں سے آیا؟"

"افریقہ سے" ڈاکیہ نے جواب دیا۔

منوّر خط لیکر جلدی جلدی گھر آیا۔ رضیہ نے جو ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھا تو بولی "میرے اکبر کا خط ہے نا۔ سچ کہیو! ہے نا اکبر کا ہی"

"ہاں!" منوّر بولا "ہے تو اکبر کا ہی"

رضیہ نے ہاتھ بڑھا کر کہا "لاؤ مجھے دو۔ اپنے لال کا خط میں آپ کھولوں گی"

"لو تم ہی کھولو" کہتے ہوئے منوّر نے خط بیوی کو دیدیا۔

رضیہ نے خط کو پہلے چوما۔ پھر سینے سے لگایا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ خط کے علاوہ اس میں سو سو روپے کے دو نوٹ بھی ملفوف تھے۔

بیٹے کا خط اور نوٹ دیکھکر دونوں کی آنکھوں سے شبنم کے قطروں کی طرح آنسو گرنے لگے۔

"لو پڑھو ذرا" رضیہ نے خاوند کو خط دیتے ہوئے کہا۔

منوّر خط پڑھنے لگا۔

ایک طویل داستان کے بعد لکھا تھا۔

"..... اب خدا کے فضل سے میں برسر روزگار ہوں۔ اور اماں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ انشاءاللہ فی الحال ہر دوسرے مہینے سو روپے آپ کو اسی طرح بھیجا کروں گا۔ خدا کو منظور ہوا تو اماں کی قدمبوسی کو بھی کسی روز حاضر ہو جاؤنگا۔

آپ کا اکبر

منوّر خط پڑھ رہا تھا۔ رضیہ کے آنسو گر رہے تھے منوّر کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی۔

"کہاں ہے میرا اکبر؟" رضیہ نے پوچھا۔

"افریقہ میں"

"دیکھا میرا لال!" رضیہ نے مسرت کے لہجہ میں کہا۔

"اور میرا اکبر نہیں!" منوّر نے ہنسکر کہا۔

"کیوں نہیں! تمہارا ہی تو ہے!" رضیہ نے شوہر کی طرف دیکھکر کہا۔ پھر نوٹ الٹ پلٹ کر "تو دو سو روپے بھیجے ہیں؟"

"ہاں دو سو!" منوّر نے کہا "اور ہر دوسرے مہینے

سو روپے بھیجنے کو لکھا ہے۔"

"تو بس خدا کا شکر کرو!" رضیہ بولی۔ "اور آج سے منڈی جانا چھوڑ دو۔"

"اور جاؤں بھی تو کیا ہرج ہے۔" منور نے کہا۔

"لیکن فائدہ کیا؟" رضیہ بولی۔ "اب میرا اکبر کمائیگا اور ہم کھائیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" منور نے جواب دیا۔

اب دونوں میاں بیوی آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ڈاکیہ ہر دوسرے مہینے سو روپے دے جاتا۔ ایک مدت اسی طرح گذری۔ رضیہ اب یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اکبر گھر آئے تو وہ اُس کا بیاہ کرے۔ اور اب ہر خط میں اُسے واپس آنے کی تاکید لکھواتی۔ آج پھر وہی رمضان تھا۔ اور عید ہونے میں تین چار روز باقی تھے۔ دونوں میاں بیوی کو بیٹے کے خط اور روپے کا انتظار تھا۔ منور ہر روز ڈاکیہ کی راہ دیکھا کرتا۔ جب وہ آتا تو اُس سے پوچھتا۔ "کوئی خط تو نہیں؟"

"نہیں!"

"افریقہ سے ڈاک آگئی؟"

"ابھی تو نہیں آئی!"

ایک روز وہ اسی طرح ڈاکیہ کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ ایک پڑوسی بھی پاس آبیٹھا۔ باتوں باتوں میں اکبر کا ذکر آگیا۔ پڑوسی نے پوچھا۔ "لڑکے کو گئے کے روز ہوئے؟"

"سال تو یاد نہیں!" منور نے کہا۔ "لیکن میرے بال سفید نہیں ہوئے تھے۔"

"پھر تو کبھی مدت ہوگئی!" پڑوسی بولا۔ "خط تو آتا ہوگا؟"

"ہاں آتا ہے!"

"یہی ایک لڑکا ہے؟"

"بس یہی ایک!"

اتنے میں سامنے سے ڈاکیہ آنکلا۔ منور نے پوچھا۔ "کوئی خط ہے بھائی؟"

"ہے تو سہی!"

منور نے لپک کر اُس سے خط لے لیا۔ رضیہ کواڑ سے لگی کھڑی تھی۔ بولی۔ "خط آیا؟"

"ہاں آگیا!"

دونوں کھاٹ پر بیٹھ گئے۔ منور نے لفافہ چاک کرکے خط نکالا تو بےساختہ اُس کے منہ سے نکلا۔ "یہ اکبر کا لکھا ہوا تو نہیں ہے!"

"کیا؟" رضیہ نے پوچھا۔

منور کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ خط اُسکے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ "ہائے اکبر" کہکر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس خط میں روپے کی بجائے اکبر کی موت کی خبر تھی۔

ایم۔ اسلم۔

ماہِ تمام

مُنہ پہ لیکر گیسوئے شب کا نقاب
مہرِ تاباں سو گیا
حجلۂ مغرب سے نکلا ماہتاب
نُور برساتا ہوا
چرخِ نیلی فام کے آغوش میں
اِک نگارِ فتنہ گر
یا فضائے ساکن و خاموش میں
ماہِ کامل جلوہ گر
روئے پر تنویر پر ڈالے ہوئے
ابر کا ہلکا حجاب
"وعدہ گاہِ نیم شب" کی سمت ہے
گامزن با صد شتاب
کس لئے یہ اضطرابِ مستقل
یہ ہجومِ آرزو
کیا کسی بے مہر کو اے سادہ دل
با وفا سمجھا ہے تُو
چھپ نہیں سکتا حجابِ ابر سے
تیرا فرطِ انبساط
تمتما اُٹھا ہے مُنہ اللہ رے
جوشِ طوفانِ نشاط

تُو نے کھایا ہے مگر رنگیں فریب
اے پرستارِ جمال
خاک ہونے کو ہے دامانِ شکیب
دیکھ اپنے کو سنبھال
"وعدہ گاہِ نیم شب" کو آہ تُو
آج خالی پائیگا
ٹوٹ جائے گا طلسمِ آرزو
دل لہو برسائیگا
اُس وفا بیگانہ کو چشمِ تلاش
جب نہ پائیگی وہاں
زرد ہو جائے گا رُوئے نُور پاش
دل سے اُٹھیگا دھواں
اِک مگر تُو ہی نہیں حرماں نصیب
اے جہانگردِ سما!
ہے وفا ناآشنا میرا حبیب
ساری دُنیا سے سوا
وعدہ ہی، آج اُس سے ملنے جاؤنگی
وہ نہ آئے گا مگر
اپنی آنکھوں سے لہو برساؤنگی
فرطِ غم سے تا سحر

مرگھٹ

مرگھٹ ندی کے کنارے تھا۔ چھوٹا سا میدان جس میں کبھی کچھ نہ اُگتا تھا۔ اور اُس کی مٹّی سیاہ تھی، جمے ہوئے خُون کی طرح سیاہ۔

ندّی کے کنارے کے پیڑوں پر ہمیشہ پت جھڑ رہتی تھی، اور اُن کی شاخیں قحط زدہ انسانوں کی طرح ہمیشہ بادلوں کا مُنہ تاکا کرتی تھیں۔ ان پر گِدوں اور کووں کے علاوہ کوئی پرند نہ بیٹھتا تھا۔ دُور تک ہڈیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور یہاں وہاں ایک آدھ کھوپڑی زندگی کے انجام پر باچھیں چیر کر ہنس پڑتی تھی۔ ندّی کا دھارا ہولے ہولے بہتا چلا جاتا تھا۔ کبھی کوئی موج گھاٹ سے ٹکرا کر سر اُٹھاتی، مرگھٹ کی اُداسی کو دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنی راہ لگ جاتی تھی۔

وہاں اس شام کو شہر والے کسی کی ارتھی لے کر آئے تھے۔ لاش چتا پر رکھ دی گئی۔ ایک بوڑھے نے اس پر گھی چھڑکا ایک کمسن لڑکے نے آگ دکھائی اور چتا کسی غریب کی جھوپڑی کی طرح چشم زدن میں سُلگ اُٹھی۔

مرد ایک طرف سوگوار بیٹھے رہے۔ عورتیں دوسری طرف زار زار روتی رہیں۔

چتا تیزی سے جلنے لگی۔ دو آدمی لمبے لمبے بانسوں سے لاش کو اِدھر اُدھر لوٹانے لگے۔ گوشت کے ادھ جلے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر زمین پر گر پڑتے تھے اور شُعلے کتّوں کی طرح ہڈیوں کو جبڑے میں دبا کر چٹخارہ بھرتے اور بے بصر آنکھوں سے ہر طرف گھورتے تھے ——!

اندھیرا ہو چلا تھا۔ بادلوں کے دو چار گُلابی ٹکڑے اُوپر اُڑ رہے تھے اور ایک دو تارے تیروں کی نوک کی طرح آسمان میں پیوست تھے۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی۔

اجبی لوہار نے انگوچھے کے کونے سے چلم نکالی اور چتا کا ایک انگارہ اس پر رکھ کر مجمع میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنے لگا جو اُس کی طرح بات چیت کرنے کو بیتاب ہو۔ مگر فضا میں بھاری پن سا تھا اور سب لوگ موت کی موجودگی میں کھوسے گئے تھے۔

اجبی لوہار نے دونوں مٹھیوں میں چلم تھام کر اس زور کا کش کھینچا کہ انگارہ دہک اُٹھا اور کئی چنگاریاں اُوپر اُچھل پڑیں۔

پھر اُس نے کسی نامعلوم دوست کو مخاطب کرتے کہنا شروع کیا " ہری بول! رام جانے، گولی اس کی چھاتی ہی میں لگی۔ میں موری میں چھُپ کر سب دیکھ رہا تھا۔ وہ جھنڈا لئے ہوئے آگے آگے تھا۔ جب جلوس چوک کے پاس پہونچا تو گھڑ چڑھی پولیس کے جوان راستہ روکے کھڑے تھے۔ کپتان نے ڈانٹ کر کہا 'آگے جانا منع ہے'! بھیا، اور سب تو بغلیں جھانکنے لگے لیکن ان چھوکروں کا کلیجہ بڑا ہے۔ انہوں نے کہا "ہم آگے جائیں گے راستہ چھوڑ دیجئے۔ . . . . "

چھوٹو بات کاٹ کر بول اُٹھا "کیا کہتے ہو۔ اتنی بات چیت کی مہلت کہاں تھی۔ پولیس آندھی کی طرح ہم پر جھپٹی، بھاگنے کا موقع کب ملا۔ جیسے بے کڑکے بجلی گر پڑے۔ کئی بھاگتے بھاگتے گر کر گھوڑوں کی ٹاپ کے نیچے آ گئے۔ کئی رپٹ کر منہ کے بل گر کوئی نالی میں، کوئی سڑک پر۔ لاٹھیوں سے جن کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے انکی بات ہی الگ ہے!

ابھی ہی" اچھا یہی سہی... جو بھی ہو وہ تھا بہادر۔ جھنڈا لئے ہوئے اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ اتنے میں کوٹھوں سے پتھر برسنے لگے اور ادھر بندوقوں کی گولیاں۔ بھیّا، جیسے آندھی میں آم کا ہرا بھرا پیڑ گر پڑے۔ بس ویسے ہی پل بھر میں ایسا پہاڑ سا جوان چھلنی ہو کر گر پڑا۔" سب خاموشی سے آگ میں کسی نقطہ کو گھور رہے تھے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ چِتا ایسی لگتی تھی جیسے زمین پر بجلی چمک رہی ہو۔

نایک نے زور سے کہا "رام نام ست ہے! اکال سر پر کھڑا ہو تو کس کا بس چلتا ہے۔ اگر یہ ماں کا پوت وہاں سے بھاگ جاتا تو کیا تھا۔ پر وہ تو کہو بھاگ کا بُرا ملتا نہیں"

لکھو مستری نے آنکھیں تریر کر کہا "کیا کہا! بھاگ جاتا؟ ارے میرا بیٹا اور بھاگ جاتا!......" اُس نے بے بس نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا "ایسی بات نہ کہو۔ اُس کی آتما کو دُکھ ہو گا۔ وہ نادان سہی مگر دوسروں کی طرح ہیٹا نہ تھا۔ اُسے اپنے دیس کے جھنڈے کی لاج تھی"

"اُونہہ۔ اجی تین بالشت کپڑے سے کہیں دیس کی لاج آتی جاتی ہے۔ کیا بات کرتے ہو۔ میں تو تمہارا بھلا سوچ کر کہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کے مرنے کا دُکھ نہیں، ارے، میں تو اس لئے کہتا ہوں کہ اس بُڑھاپے میں تمہیں کون پالیگا۔ جوان بیٹا، گھر کا سرتاج۔ اسکے چھوٹے چھوٹے بچے۔ بوڑھے ماں باپ۔ یہ سب کہاں جائیں گے۔ کیا دیس تمہیں روٹیاں دیگا"

لکھو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کا پڑوسی سچ کہتا تھا۔ اب وہ کیا کریگا۔ دیس تو امیروں کے لئے تھا۔ غریبوں کا دیس کہاں ہے۔ زمین کا کرایہ، پانی کا ٹیکس، روشنی کا محصول۔ اور جب مر جاؤ تو مرگھٹ کے چودھری کا نذرانہ۔ ان سب سے زیادہ دیوتا کا بھوگ۔ وہ کانا دیوتا جو اپھرائے ہوئے مینڈک کی طرح شہ نشیں پر بیٹھا اپنی دُم ہلایا کرتا ہے۔ کہاں تھا وہ جوان بیٹے کی موت کے وقت۔

لیکن نہیں۔ اس کا بیٹا کیا ایسا بیوقوف تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر اپنی جان دی تھی ـــــ لکھو کے دماغ میں اسی قسم کے خیالات کا تار سا بندھ گیا۔

شمبھو نے سر ہلا کر کہا "آج صبح تک وہ بھلا چنگا تھا۔ وہ ہتھوڑے کی ایک ایک مار سے لوہے کو پانی کر رہا تھا لیکن اب دیکھو۔ سیسے کی ایک چھوٹی سی گولی ہوا میں سنسناتی ہوئی آئی اور بنا کچھ کہے اس کی چھاتی میں گھس گئی۔ ہڈی کو توڑ کر، گوشت کو چیر کر وہ دل کے اندر بیٹھ گئی۔ اور وہ مر گیا۔ ہائے رام، جینا کتنا کٹھن ہے اور مرنا کتنا آسان"

اچھی لوہار نے دھنوئیں کو مُنہ کے آگے سے ہٹا کر کہا "اور جب آدمی مر جاتا ہے تو کیا چھوڑ جاتا ہے۔ نام تو بڑے آدمیوں کا رہتا ہے۔ غریبوں کا نام دھام کیا۔ وہ تو بھائی بندوں کے لئے اپنی یاد چھوڑ جاتے ہیں اور یہ یاد زندگی بھر کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ دنوں کی دُوری گھاؤ پر مرہم کا کام کرتی ہے، سب اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں اور کبھی سوچو تو ایسا لگتا ہے کہ پچھلے جنم کی کہانی ہے"

لکھو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جن لوگوں نے اُس کے بیٹے کے ہاتھ میں جھنڈا تھمایا تھا، وہ کہاں تھے۔ وہ تو اس مرگھٹ میں نہیں تھے۔ وہ سب بڑے لوگ تھے۔ وہ شودروں کے مرگھٹ میں کیسے آتے۔

لیکن کیا اُس کے بیٹے نے غلطی کی تھی۔ کیا سمجھ کر اُس نے وہ جھنڈا اپنے ہاتھ میں لیا اور وہ گولیوں کے سامنے کیوں سینہ تانے کھڑا رہا۔ کیا اُسے کسی کا دھیان نہیں آیا۔

عورتوں کی فریاد دھیمی پڑ گئی تھی۔ وہ اپنی سوچی ہوئی آنکھوں سے چِتا کو تاک رہی تھیں جس پر اب لاش کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

لکھو کا تن بدن کانپنے لگا۔ دُنیا اتنی احسان فراموش کیوں ہے۔ اُس کے بیٹے نے دوسروں کے لئے جان دی تھی اپنوں کو بھلا کر وہ دوسروں کے لئے مرمٹا تھا۔ اور یہ لوگ یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے تھے۔

نایک نے آہستہ سے کہا "اجی، دیکھو اور کتنی دیر ہے۔ بھوک کے مارے پران مُنہ کو آرہے ہیں۔"

اتنے میں چھوٹو نے آنکھیں پھاڑ کر سب کو اس انداز سے دیکھا جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔

"کریم خاں حولدار کہتا تھا کہ جو لوگ ارتھی کے ساتھ مرگھٹ جائیں گے، سرکار میں اُنکی رپٹ کی جائے گی۔"

"ایں، یہ کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ سرکار کا بیری تھا۔ بھائی، سمجھتے نہیں۔ اُس نے گولی نہیں چلائی تو کیا، گولی کھائی تو۔ پھر وہ بیری ہوا یا نہیں۔"

"ہوں" نایک نے کپڑے جھاڑنا شروع کیا "ٹھیک کہتے ہو۔ وہ کسی ایسے ویسے کی گولی سے نہیں، سرکار کی گولی سے مرا۔ بکٹ معاملہ ہے۔ کیوں جی اجی؟"

اجی اپنی جھولی سنبھالنے لگا "ٹیڑھی بات ہے۔ اور کریم خاں حولدار کوئی معمولی آدمی ہے۔ اجی بڑے بڑے مہاجن اُسکے نام سے کانپتے ہیں۔ جس کے گھر چاہے ڈاکہ ڈلوا دے۔ اور جسے چاہے چوری کے الزام میں بندھوا دے۔ آج شہر میں اُسی کا راج ہے۔"

سب لوگ ڈر کر دائیں بائیں یوں دیکھنے لگے گویا کریم خاں کا بھوت مُنہ پھاڑے ہوئے انہیں نگلنے کو آرہا ہو۔ تاروں کی چھاؤں میں پیڑوں کے ڈنٹھل اپنے نحیف ہاتھ پھیلائے ہوئے اندھیری رات سے کسی چیز کی بھیک مانگ رہے تھے۔

لکھو گھٹنوں پر سر رکھے نیم بیہوشی کی حالت میں بیٹھا رہا۔ بہت سے لوگ ایک ایک کر کے سٹک گئے اور جب آگ مدھم پڑی تو صرف چار پانچ آدمی رہ گئے۔

لکھو کا دل اندر سے رونے لگا۔ دیس اور دیس والے! انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ موت کے آگے تو سب برابر ہیں۔ سب کو ایک دن اسی آگ میں جانا ہے۔ اسی پانی میں سب کی راکھ کو بہہ جانا ہے۔ پھر وہ اسکے بھی متحمل نہیں کہ ایک آن کے لئے آہیں اور مرنے والے کی بیوا کے آنسو پوچھ جائیں۔ اُس کی ماں کے لوٹتے ہوئے دل پر ہمدردی کا ایک پھاہا رکھ جائیں۔

سیٹھ چھجومل، کانگریس کمیٹی کے صدر — کیا وہ جوان بیٹے کی جان لینے کے بعد بھی اس کا قرض معاف نہ کریں گے۔

کنور پرتاپ سنگھ، بڑے دیس سیوک۔ کیا کریم خاں حولدار کے دست برد سے وہ اُسے نہ بچائیں گے"

برسات آرہی ہے، گھر کا چھپر چھانا ہے، دیوار کو تھم لگانا ہے۔ بھٹی کو ٹھیک کرنا ہے۔ مگر اس کے بازوؤں میں وہ پہلے کی سی

سکت کہاں۔ مزدور کا بیٹا، ایک ذراسی گولی سے چھد کر ـــــ وہ بھی کسی لوہار کی بنائی ہوئی ـــــ مرگیا اور آگ اُسے لگ گئی۔

چتا ٹھنڈی پڑنے لگی۔ عورتوں نے اس میں پانی کا چھینٹا دیا۔ مردوں نے اس میں اپنے آنسو جھٹکے "رام نام ست ہے" کی آواز سے میدان گونج اُٹھا۔ دُور سے گیدڑوں نے جواب دیا "ہوا، ہوا، ہوا!"

جب سب چلنے لگے تو لکھو نے دیکھا کہ اس کے پیروں کے پاس ایک کپڑا پڑا ہوا ہے۔ یہ وہی پھٹا ہوا ترنگا جھنڈا تھا۔ جسے کلیجہ سے لگائے ہوئے اس کا بیٹا مرمٹا تھا۔ لیکن یہ جھنڈا دیکھنے میں کتنا کم ہو تھا! گھاس پھوس کی طرح سبز، بڑھاپے کی طرح سفید، بیماری کی طرح زرد۔

لیکن اب خون میں رنگ کر وہ لال ہو گیا تھا۔ لال ـــ زندگی اور موت کا رنگ۔

لکھو نے اُسے اُٹھا لیا۔ اس میں ایسا کونسا جادو تھا جس سے مسحور ہو کر لوگ اسکے لئے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ معمولی کپاس کی کھادی جو ایک ٹوٹے ہوئے کرگھے پر بنی گئی۔ اور ایک رنگریز نے اس پر کچے رنگ کے چھینٹے دے دئے۔ اس میں کیا رکھا تھا۔

جو بھی ہو، اب ایک انسان کے خون میں رنگ چکا تھا اور یہ خون تازہ تھا نو بہار پھول کی طرح، گرم تھا جلتی ہوئی آگ کی طرح۔

یک بیک لکھو کے دل میں یہ خیال اُٹھا کہ اب وہ طاق سے اُس پتھر کے ٹکڑے کو پھینک دیگا اور اُسکی جگہ اس کپڑے کو دیگا جس پر اُسکے بیٹے کے خون کی پپڑی جمی ہوئی ہے ـــ!

عورتیں قطار باندھے، لوٹی ہوئی آوازیں سیاپا گاتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ ہوا ہلکی تھی اور رات کا دامن شبنم میں بھیگا ہوا۔ دُور سے ندی کا دھارا گھائل پرندے کی طرح کراہ رہا تھا۔

زمین کی آگ بجھ چکی تھی لیکن آسمان کے ستارے جگمگا رہے تھے۔

اختر حسین رائے پوری

محبت اور نفرت

ثمراتِ تخیل

واہ فسونِ آب و گل
دہر ہے اِک رنگیں محفل

زمزمہ کناں رہ طوفاں سے
مِل ہی جائے گا ساحل

تیری نگہ سفاک نہیں
اور کِسے کہیے قاتل

عشق کی پایاں بے پایاں
منزل کے آگے منزل

کس کی محفل کو دیکھیں
ہم تم ہیں خود اِک محفل

دورِ فلک کا شکوہ کیا
وہ بھی غلط، یہ بھی باطل

خیر ہو تیرے جلوے کی
دل والے ہیں سب بیدل

جوشِ عمل کی خامی کا
نام جہاں میں ہے مُشکل

پیرِ مغاں کہتے ہیں جسے
ہے وہ انسانِ کامل

یوں بھی سحر ہوتی ہی کہیں
گریۂ شب سے کیا حاصل

دل کی بستی ویران ہے
آ جا اے جانِ محفل

سُرخ نہ ہو کیوں اشکِ غم
خُونِ جگر بھی ہے شامل

یوں نہ فسردہ خاطر رہ
غنچہ و گل کی صورت کھل

دیکھ طلسمِ فکرِ نہالؔ
سحر بیاں شاعر سے مل

نہالؔ سیوہاروی

"دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی"

رسالہ جامعہ (دہلی) بابت جنوری ۳۷ء میں جناب حکیم آزاد انصاری کا ایک مضمون "غزل کی حمایت" میں شایع ہوا جس میں موصوف نے اُن تمام جائز اور بعض ناجائز اعتراضات کا جواب دینے کی ناکام کوشش کی ہے جو صنفِ غزل پر عموماً اور رسمی (conventional) غزل پر خصوصاً ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ حکیم صاحب خود بھی غزلگو ہیں اور بدقسمتی سے "ڈیڑھ سو برس کی بیلیاں" والی غزل کہتے ہیں اسلیئے قدرتی طور پر اُنہیں تمام اعتراضات کا نشانہ خود اپنی ذات نظر آئی۔ ایسی حالت میں اُن کا برہم ہونا اور معترضین پر تبرا کرنا انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

رسالہ کلیم (دہلی) بابت مئی ۳۷ء میں "نقاد" صاحب نے اس مضمون پر "غزل گوئی" کے عنوان سے ایک کامیاب تنقید لکھی، مگر افسوس ہے کہ جہاں تک اندازِ بیان کا تعلق ہے حکیم آزاد صاحب ہی کے رنگ میں لکھی۔ اسکے علاوہ غزل پر بعض اعتراضات ایسے بھی کئے جو کچھ بھی وزن نہیں رکھتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "نقاد" صاحب کے اس تنقیدی مقالہ نے حامیانِ غزل کے کیمپ میں ایک ہلچل ڈالدی جسکا نتیجہ رگھوپتی سہائے صاحب فراق کا ایک طویل مضمون "دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی" کے عنوان سے جولائی ۳۷ء کے رسالہ نگار (لکھنؤ) میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔

فراق صاحب ایک خوشگو شاعر، ایک اچھے ادیب، اور ایک سمجھدار نقاد ہیں۔ لیکن جوان خون کی حرارت جب مشتعل ہوتی ہے تو جادۂ اعتدال اکثر انسان سے چھوٹ جاتا ہے اور اپنے مسلک اور عقیدہ کے خلاف اس کی روش انتہا پسندانہ ہوجاتی ہے۔ فراق صاحب نے اپنے مضمون کے آغاز میں جناب "نقاد" کی تیز زبانی کا شکوہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اُنہوں نے خود جو الفاظ براہِ راست یا بالواسطہ جناب "نقاد" کے لئے استعمال کئے ہیں وہ "نقاد" صاحب کی "جلی کٹی" سے کہیں زیادہ غیر سنجیدہ ہیں۔

اس مقالہ کے سپردِ قلم کرنے سے میرا مقصد نہ "نقاد" صاحب کی حمایت ہے۔ نہ فراق صاحب کی مخالفت۔ کیونکہ دونوں حضرات کی بعض رایوں سے مجھے اتفاق ہے اور بعض سے اختلاف۔ چونکہ مجھے خود اس موضوع سے دلچسپی ہے اور اس کے اکثر پہلوؤں پر میں نے بارہا غور کیا ہے اسلیئے جن نتایج پر میں پہونچا ہوں اُنہیں قارئین ساقی سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ اسکے علاوہ میں نے جنوری ۳۷ء کے ساقی میں اپنے مضمون "ایران کی امرد پرستی کا اثر اُردو شاعری پر" میں عشقیہ شاعری کے نمونے پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا ضمناً آج وہ بھی پورا ہو جائیگا۔

جناب "نقاد" نے غزل پر جو اعتراضات کئے ہیں اُنہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے فراق صاحب نے ایک سوال کیا ہے کہ:-

"صاحبِ مضمون کا مطلب غزل سے کیا ہے؟ کیا اُن کا مطلب صرف حضرتِ آزاد کی غزلوں سے ہے۔ یا اُردو غزلگوئی کی ابتدا سے اب تک ہزاروں بلکہ لاکھوں کمزور اور ناکامیاب غزلگویوں سے ہے، یا کئی سو محض وقتی اور مقامی "اُستادوں" اور کہنہ مشقوں سے ہے۔ یا اُردو کے معدودے چند چوٹی کے متغزلین سے ہے۔ یا سعدی اور حافظ شیرازی وغیرہ کو بھی وہ قابلِ عتاب ٹھہراتے ہیں؟"

سوال اپنی جگہ پر نہایت معقول ہے اور اگر "نقاد" صاحب کے مضمون سے اسکا کوئی جواب نہ مل سکے تو یقیناً ہم یہ کہنے پر مجبور

ہو گئے کہ "نقاد" صاحب نے عجیب خلط مبحث کیا ہے۔ لیکن جب "نقاد" صاحب کے اِن الفاظ پر ہماری نظر پڑتی ہے کہ:۔

(۱) "غزل و تغزل کو مٹا نا یا اس کو حلال و حرام کر ڈالنا کون چاہتا ہے۔ اس کی رُوح و حُسن کو تو متعارف عجیب الخلقت غزلگو شعرا ہی مسخ کر رہے ہیں۔ "ہیروین" کے پیکر سے "جوکر" کا لباس اتروا کر اُسے ایک عروسِ جمیل و لباسِ حریر کی ہیئت میں بدل دینا کیا کوئی ضروری اور اہم اصلاحِ ادب نہیں؟"

(۲) "مروجہ مسخ غزل سے آپ اس وقت تک نفور نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپکی یہ مختل و مضحکہ خیز فطرت آپکے شاملِ حال ہے۔"

(۳) "بلا شبہ مروجہ غزل و تغزل ماتم کرنے کی چیز ہے۔"

(۴) متعارف غزل ہی حقیقتاً ایک "بادہوائی تیراندازی" ہے۔

تو فراقؔ صاحب کا سوال بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ مضمون کے آخری حصّہ میں "نقاد" صاحب نے مفصل طور پر اس سوال کا جواب دیا ہے حکیم آزاد صاحب کے اس بیان کے سلسلہ میں کہ:۔

"ایک اعتراض غزل پر یہ ہے کہ غزل کا وجود فارسی و اُردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا" جناب "نقاد" لکھتے ہیں کہ:۔

"بلا شبہ یہ اعتراض ہے۔ لیکن مطلقاً غزل پر، اپنے وسیع ترین تصوّر میں، نہیں۔ بلکہ متعارف و متداول غزل پر۔ بے ربط و بے آہنگ غزل پر۔ متضاد و باہم متصادم غزل پر۔ موے کمر و کوہ سرین والی غزل پر۔ اپنے ہجرِ دوام اور رقیب روسیہ کے غلبۂ مدام والی غزل پر۔ قاتل شیوہ و قصاب پیشہ محبوب والی غزل پر۔ نہ کہ اس پر جو ہے۔ع افسانۂ آن شبے کہ با یار گزشت"

اس عبارت کا مطلب بالکل صاف ہو مگر افسوس ہے کہ فراقؔ صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اُن کے نزدیک اِنؔ الفاظ سے واضح ہے کہ "نقاد" صاحب ہر غزلگو بلکہ نفسِ "غزل و غزلیت" سب سے بیزار ہیں" اگر یہ ممکن ہو کہ کوئی دن کہے اور آپ رات سمجھیں۔ اور ایک "صوفی" کی لمبی ڈاڑھی آپ کو محبوب کی زلفِ دراز نظر آئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ آپ "نقاد" کو ہر غزلگو اور نفسِ غزل سے بیزار سمجھیں ورنہ "نقاد" نے تو صاف صاف کہا ہے کہ ہم "غزل و تغزل" کے دشمن نہیں، بلکہ ہم مروجہ، مسخ اور متعارف غزل کے مخالف ہیں جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی اس غزل سے ہرگز بیزار نہیں جو ع افسانۂ آن شبے کہ با یار گزشت کی مصداق ہے۔

تھوڑی دیر کیلئے یہ فرض کرتے ہوئے کہ "نقاد" صاحب نے نفسِ غزل کو موردِ طعن نہیں بنایا، فراقؔ صاحب ایک سوال اور پوچھتے ہیں کہ:۔

"نقاد" صاحب نے حکیم آزاد کو اس غلط اور پوچ قسم کی غزلگوئی کا حامی کیونکر مان لیا؟"

اس سوال کا جواب بھی "نقاد" صاحب کے مضمون میں موجود ہے مگر خدا جانے کیوں فراقؔ صاحب کی نظر اس طرف نہیں گئی۔ بات یہ ہے کہ حکیم آزاد نے اپنے مضمون میں عصرِ حاضر کے "بلند فطرت و بلند خیال" شعرا کی جو فہرست پیش کی ہے "نقاد" کے نزدیک وہ سب کے سب پرانی لکیر کے فقیر ہیں اور اُن کے کلام میں وہ تمام عناصر کثرت کے ساتھ موجود ہیں جو "نقاد" کے خیال میں ناظورۂ غزل کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اِن لوگوں کو چوٹی کا غزلگو شاعر سمجھتا ہو اسکے نزدیک غزل کا معیار

کیا ہوگا۔ غالباً اب فراق صاحب کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ "نقاد" نے حکیم آزاد کو غلط اور پوچ قسم کی غزلگوئی کا حامی کیونکر مان لیا"۔

اس پر میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً اردو رسائل میں حکیم آزاد صاحب کا جو کلام شائع ہوا ہے وہ اسی قسم کا ہے جو "نقاد" کے نزدیک سوختنی ہے اسلئے "نقاد" کا یہ سمجھنا کچھ بیجا نہیں کہ حکیم آزاد صاحب "غلط اور پوچ" قسم کی غزلگوئی کے حامی ہیں۔

اِس محل پر یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "نقاد" کا موضوع بحث "غزل" ہے۔ "نظم" کا اگر کہیں ذکر آگیا ہے تو محض ضمنی اور استطرادی طور پر لیکن فراق صاحب نے خواہ مخواہ "نظم" کو بھی اس بحث میں گھسیٹ لیا ہے اور غزل کو نظم کا یا نظم کو غزل کا حریف قرار دیکر اصل موضوع کو غیر ضروری الجھنوں میں ڈالدیا ہے۔ بہرحال "نظم" پر فراق صاحب نے جو اعتراضات کئے ہیں ہم اُسکا جواب اصل بحث ختم کرنے کے بعد دینگے۔

جس طرح ایک چاہنے والے کو اپنا محبوب "مجموعۂ خوبی" نظر آتا ہے اور اُس کے صریح و نمایاں عیوب بھی اُسے دکھائی نہیں دیتے اُسی طرح فراق صاحب بھی جو غزل کے چاہنے والوں میں سے ہیں، غزل کے کسی عیب کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں اُنکے نزدیک اصناف سخن میں غزل کا رتبہ سب سے بلند ہے، اس میں فقط خوبیاں ہی خوبیاں ہیں اور جسے اُن کی اس رائے سے اتفاق نہ ہو وہ یقیناً مذاق سلیم سے یکسر بے بہرہ ہے۔ فراق صاحب کے نزدیک:۔

"یہ سمجھنا سخت گمراہی ہے کہ دورِ حاضر میں اُردو "نظم" نے تو ترقی کی لیکن اُردو غزل محض جھک مار رہی ہے اور تجبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی۔ کی مصداق بن رہی ہے"۔ .... "آج سے نصف صدی پہلے مولانا حالی نے غزل کے خلاف جو آواز بلند کی تھی اور ڈاکٹر نذیر احمد اور دیگر مصلحانِ ادب و قوم نے جو غزل سے اظہارِ نفرت کیا تھا اس میں یہ بزرگ ممکن ہے اپنی حد سے آگے بڑھ گئے ہوں لیکن اس کی وجہ پر ذرا کم غور کیا جاتا ہے۔ بات یہ تھی کہ ان بزرگوں نے اُردو غزلگوئی پر اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ اپنے وقت کی رائج اور مقبولِ عام غزلگوئی سے اظہارِ برہمی کیا ہے اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ امیر و داغ کی عریانی و شوخی میں زندہ دلی ضرور تھی مگر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری غزل گوئی "انجیل" اور "محرم" کے لئے وقف ہوجاتے .... فطری اور حقیقی غزلگوئی کی طرف دو چار کو چھوڑ کر کسی کی نظر ہی نہ تھی۔ یہ باتیں محرک ہوئیں حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کے خلاف اس اعلانِ جہاد کی جس کو آج نصف صدی کے بعد دُہرانا "ہنز ماسٹرس وائس" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا"۔

اِس امر کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے کہ دورِ حاضر میں اُردو غزل واقعی جھک مار رہی ہے یا نہیں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ فراق صاحب کے پیش کئے ہوئے معیار پر دورِ حاضر کی غزل کو جانچا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ حالی نے اپنے وقت کی رائج اور مقبولِ عام غزلگوئی سے جن خصوصیات کی بنا پر اظہار برہمی کیا تھا وہ عصر حاضر کی غزل گوئی میں موجود ہیں یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ آج بھی غزل اُنہیں خیالات کا مجموعہ ہے جن سے حالی نے اظہارِ بیزاری کیا تھا۔ تو مجھے اُمید ہے کہ فراق صاحب بھی اس بات کو تسلیم کرلیں گے کہ اُردو غزل واقعی جھک مار رہی ہے اور اگر یہ ثابت نہ ہوسکے تو پھر ہر شخص کو فراق صاحب کا یہ قول ماننا ہی پڑیگا کہ حالی کے اعتراضات کو آج نصف صدی کے بعد دُہرانا

"ہزماسٹرس وائس" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

جن وجوہ سے حالی نے غزل کو موردِ طعن بنایا وہ فراق صاحب کے مذکورہ بالا بیان کے مطابق "امیر و داغ کی عریانی و شوخی تھی اسلئے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری غزلگوئی "انگیا" اور "محرم" کیلئے وقف ہوجائے"۔ فراق صاحب کا یہ بیان حد درجہ مغالطہ انگیز ہے معلوم نہیں کہ انھوں نے کسی مصلحت کی بناپر غزل سے حالی کی بیزاری کا سبب فقط "امیر و داغ کی عریانی و شوخی" کو ٹھہرایا یا "مقدمہ شعر و شاعری" کا مطالعہ کئے بغیر ہی رائے قایم کرلی۔ اسلئے کہ حالی نے غزلگویوں کی جو "فردِ جرم" پیش کی ہے وہ بہت طویل ہے۔ اور جسکے بعض حصے یہاں نقل کردینا بے محل نہ ہوگا۔ وہو ہذا:-

"زیادہ وہ کلام جس میں نہ سادگی، نہ جوش، نہ اصلیت، تینوں چیزیں نہ پائی جائیں۔ سو ایسے کلام سے ہمارے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ کیونکہ ہماری شاعری زیادہ تر دو قسم کے مضامین میں منحصر ہے۔ عشقیہ یا مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل، مثنوی اور قصائد کی تشبیب میں باندھے جاتے ہیں اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔ سو ان تینوں صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آتے ہیں اور جو بندھتے بندھتے بمنزلۂ اصول مسلمہ کے ہوگئے ہیں، انہیں کو ہمیشہ باد نیٰ تغیر باندھتا رہے اور اُن سے سرمو تجاوز نہ کرے، مثلاً

غزل میں ہمیشہ معشوق کو بے وفا، بے مروت، بے مہر، بے رحم، ظالم، قاتل، صیاد، جلاد، ہرجائی، اپنے سے نفرت کرنے والا، اوروں سے ملنے والا، سچی محبت پر یقین نہ لانے والا، اہل ہوس کو عاشق صادق جاننے والا، بدگمان، بدخو، بدزبان، بدچلن، غرضیکہ ایک حُسن و جمال یا ناز و ادا و دیگر حرکات مہر انگیز کے سوا اور تمام ایسی برائیوں کے ساتھ اسکو موصوف کرنا جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرسکتا ہو اور اپنے تئیں غمزدہ، مصیبت زدہ، فلک زدہ، ضعیف بیمار، بدبخت، آوارہ، بدنام، مردودِ خلائق، آوارگی پسند، بدنامی کا خواہاں، حُسن قبول سے نفور، خوشی اور عافیت سے کنارہ کرنیوالا، میخوار، بدمست، مدہوش، خود فراموش، وفادار، جفاکش، کہیں آزاد طبع اور کہیں گرفتاری کا آرزومند، کہیں صابر اور کہیں بیقرار، کہیں دیوانہ کہیں ہوشیار، کہیں غیور اور کہیں چکنا گھڑا، رشک کا پُتلا۔ رقیبوں کا دشمن، سارے جہاں سے بدگمان، آسمان کا شاکی، زمین سے نالاں، زمانہ کے ہاتھ سے تنگ، غرضکہ ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے تئیں اُن تمام صفات سے متصف کرنا جو عموماً انسان کیلئے قابلِ افسوس خیال کی جاتی ہیں یا مثلاً

آسمان اور زمانہ یا نصیب اور ستارہ کی شکایت کرنا، یا زاہد و واعظ و صوفی کو لتاڑنا اور بادہ کش و بادہ فروش اور ساقی و خمار کی تعریف کرنی اور اُن سے حُسن عقیدت ظاہر کرنا، ایمان و اسلام و زہد و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و معصیت سے رغبت ظاہر کرنی کبھی کبھی مال و جاہ و منصب دنیوی کو حقیر ٹھہرانا اور فقر و عشق و آزادگی وغیرہ کو علم و عقل و سلطنت وغیرہ پر ترجیح دینی۔ اسی طرح کے اور چند مضامین ہیں جو غزل کیلئے بمنزلۂ ارکان و عناصر کے ہیں"۔

یہ "فردِ جرم" طویل ہونے کے باوجود بھی مکمل نہیں۔ کیونکہ مولانا حالی نے یہاں خصوصیت کے ساتھ اُن مضامین کا ذکر کیا ہے جو "عشقیہ" کے تحت میں آتے ہیں۔ ابھی "فلسفہ" اور "تصوف" کا ایک دریائے ناپید اکنار باقی ہے جو ایک "طوفانِ بے تمیزی" کی طرح غزل پر چھایا ہوا ہے۔

غزل پر اعتراضاتِ حالی کے ضمن میں فراق صاحب نے اپنے بیان کی مزید توضیح اس طرح کی ہے کہ :-

" حالی کے وہ اعتراض جو انہوں نے نصف صدی پہلے غزل پر کئے تھے آج اُن کا دہرانا اسلئے غلط نہیں کہ بات پُرانی ہوگئی بلکہ حالی کے اعتراض آج اس لئے غلط ہیں کہ امیر و داغ کے بعد اُردو غزل گوئی کے کئی دور ختم ہو چکے اور اس میں حیرت انگیز انقلابات پیدا ہوگئے ہیں "

فراق صاحب کے بیان کے مطابق ایک دور تو خدنگ نظر" کے مشاعروں کو سمجھنا چاہیئے اور دوسرا جذباتی سکول کا دور ہے " اُس کے بعد وہ دور آتا ہے جس میں اُردو غزل گوئی .... نئی آوازوں سے نغمہ سرا ہوتی ہے .... (اس دور میں) چوٹی کے غزلگو حسرت موہانی - اصغر گونڈوی - یاس عظیم آبادی - جگر مراد آبادی اور فانی بدایونی کہلائے "

امیر و داغ کے بعد سے لیکر آج تک اُردو شاعری کے جتنے دَور آپ کا جی چاہے تسلیم کر لیجئے مگر یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ حالی کے زمانہ سے اس وقت تک ہر "دَور" کے غزلگو شعرا نے اپنے پیشرووں کی اکثر مکروہ سنتوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ قایم رکھا ہے - اس دعوے کے اثبات کی صرف ایک ہی صورت ہے ، وہ یہ کہ اوّل اُن تمام مخصوص مضامین کی ایک فہرست پیش کی جائے جو حالی کے زمانہ تک غزلگو شعرا کا موضوع بحث رہے ہیں اور جسے ہم نقالی، سنتِ شعرا کی پیروی اور "رسم و روایت" کی تقلیدِ محض سے تعبیر کر سکتے ہیں - اور اس کے بعد گذشتہ پچاس سال خصوصاً عصر حاضر کے چوٹی کے غزلگو شعرا کے کلام سے کثیر تعداد میں ایسے نمونے پیش کریں جن میں انہیں خیالات پر طبع آزمائی کی گئی ہے - زیر بحث شعرا کی تعداد اتنی کثیر اور اُن کی غزلیات کا مجموعہ اس قدر زیادہ ہے کہ اس ایک مضمون میں سب پر فرداً فرداً تنقید کرنا قطعاً ناممکن ہے - اسلئے مجبوراً صرف چند شعرا کو منتخب کرنا پڑیگا اور اُن کے متعلق بھی تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں اسلئے کہ مثلاً اگر "کہنہ و فرسودہ خیالات" کم سے کم پندرہ عنوانوں میں تقسیم کئے جائیں اور صرف پانچ شاعروں کے کلام سے ہر عنوان کے ماتحت فقط پانچ شعر نقل کئے جائیں تو ان اشعار کی مجموعی تعداد پونے چار سو ہوگی -

فراق صاحب کی زبانی دَورِ حاضر کے چوٹی کے غزلگو شعرا کے نام آپ سُن چکے یعنی حسرت موہانی ، اصغر ، یاس ، جگر اور فانی - ان پانچوں میں فراق صاحب نے حسرت موہانی کو سب سے افضل مانا ہے اور انہیں "بادشاہِ متغزلین" کا لقب دیا ہے - اب اگر ہم عصر حاضر کے بہترین نمایندوں کے "بادشاہ" کے کلام سے اپنے دعوے کو ثابت کر دیں تو غالباً کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور دوسروں کے متعلق بھی وہی رائے قایم کر لینا اصولاً بیجا نہ ہوگا -

اس محل پر ایک نکتہ اور بھی قابلِ ذکر ہے - وہ یہ کہ فراق صاحب نے ان شعرائے پنجگانہ کے درمیان جو فرقِ مراتب قایم کیا ہے وہ "مستند اہل الرائے" کے نزدیک متعبر نہیں - فراق صاحب کے نزدیک اصغر گونڈوی کا مرتبہ حسرت موہانی سے فروتر ہے لیکن "نشاطِ رُوح" کے مقدمہ نگار جناب سہیل کی سب باتوں کو اگر باور کر لیا جائے تو اصغر گونڈوی کا ہمرتبہ کوئی شاعر نہ اس وقت موجود ہے ، نہ کبھی تھا اور نہ شاید آیندہ ہوگا - سہیل صاحب کے اس خیال کی تایید "نشاطِ رُوح" کے دوسرے مقدمہ نگار احسان احمد صاحب نے بھی کی ہے مگر ذرا کمزور لفظوں میں -

جناب یاس عظیم آبادی نے تو بزعم خود غالب کو بھی پچھاڑ کے چھوڑا - جب اُنکے نزدیک اپنے مقابلہ میں غالب کی کوئی ہستی

نہیں تو بیچارے حسرت موہانی، اصغر، جگر اور فانی کس شمار میں ہیں۔

شعرائے معاصر میں جگر مراد آبادی کا درجہ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو سید سلیمان ندوی صاحب کا مقدمہ پڑھیئے جو انہوں نے جگر کے دیوان "شعلۂ طور" پر لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپکو معلوم ہو جائیگا کہ فراق، سہیل، اور یاس سب کے سب ایک شدید قسم کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ شاعر تو صرف ایک ہی اور وہ جگر مراد آبادی ہے۔

فراق صاحب کی فہرست میں سب سے آخری نمبر فانی بدایونی کا ہے۔ اور اس ترتیب کو انہوں نے برابر قائم رکھا ہی مگر میرے محترم دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی جنہوں نے دیوانِ فانی پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہی۔ علی الاعلان کہتے ہیں کہ "فانی کو غالب کے مقابلہ میں ایک امتیازی حیثیت دی جا سکتی ہے"۔ لیکن غالباً اس مصلحت سے کہ کہیں پرستارانِ غالب بُرا نہ مان جائیں اپنے بیان میں "مگر بہرحال "الفضل للمتقدم" کا دُم چھلّا لگا دیا ہے اور میر و فانی کا موازنہ کرتے ہوئے بھی اسی استادانہ پینترے سے کام لیا ہی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

"حقیقت یہ ہے کہ میر کا سوز و گداز، اُن کی لطافتِ زبان، اور نزاکتِ ادا فانی کی شاعری کا اصلی جوہر ہے البتہ متقدم و متاخر کا فرق ہے"

مقدمہ نگار حضرات کے بیانات کی رُو سے اِن پانچوں شاعروں میں ہر شخص سب سے افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے معنی بات ہی اور حقیقت مقدمہ نگاروں نے اپنے مقدمات میں تنقید کا حق نہیں بلکہ دوستی کا حق ادا کیا ہے اور ساتھ ہی خود اپنی عظمت و بُزرگی کا اظہار و اثبات بھی مدِنظر رکھا ہے۔ اِن شعراء کے مراتبِ نسبی کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار کسی دوسرے وقت کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ ہاں قارئین ساقی اگر کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے کے خواہشمند ہوں تو اُنہیں چاہیئے کہ اِن شعراء کے کلام کا براہِ راست مطالعہ کریں اور ان مقدمات کو ہرگز ہرگز نہ پڑھیں کیونکہ اُن میں "یار فروشی" اور "خود فروشی" کا جذبہ کام کر رہا ہی۔

اب ہم اُن مضامین کی ایک مختصر فہرست پیش کرتے ہیں جو ابتدا سے اس وقت تک ہر دور کے شعراء میں مقبول رہے ہیں اور جن کی بنا پر ہم عصرِ حاضر کے چوٹی کے غزلگو شعرا" کو بھی نقّال اور کہنہ پرست کہنے پر مجبور ہیں:۔

(۱) پیکان و تبر، خنجر و شمشیر، قتل و خون۔

(۲) نزع، مرگ، قبر، حشر۔

(۳) میکشی۔

(۴) زاہد، واعظ، محتسب، ناصح۔

(۵) جفائے محبوب۔

(۶) "تصوف" و "فلسفہ"۔

(۷) اشکِ خونین۔

(۸) جنون۔

(۹) آفتاب و ذرّہ، دریا و قطرہ، دل و جگر، شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں۔

(۱۰) ہوائی محل۔

جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں ان تمام عنوانات کے ماتحت شعرائے پنجگانہ کا کلام کثیر مقدار میں نقل کرنا ممکن نہیں اسلئے ہم اپنی بحث کو زیادہ تر "بادشاہِ متغزلین" یعنی حسرت موہانی تک محدود رکھیں گے اور بقدر گنجائش اصغر، جگر، اور فانی کے اشعار بھی بطور نمونہ پیش کرینگے۔ جناب یاس عظیم آبادی یعنی میرزا یگانہ چنگیزی کا دیوان کوشش کے باوجود اس وقت تک ہمیں دستیاب نہ ہوسکا اسلئے ناچار ان کے کلام کے متعلق اظہارِ خیال سے صرف نظر کرنا پڑا۔ عنوانات بالا کی تشریح اور ہر عنوان کے ماتحت حسرت کے اشعار پیش کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فراق صاحب نے حسرت اور کلامِ حسرت کے متعلق جو بلند بانگ دعوے کئے ہیں انہیں اختصار کے ساتھ یہاں نقل کردیا جائے تاکہ قارئین پر کلامِ حسرت کے مطالعہ کے بعد فراق صاحب کے دعووں کی حقیقت واضح ہوجائے۔ فراق صاحب فرماتے ہیں کہ "نقاد نے محسوس ہی نہیں کیا کہ

(دفعہ ۱) حسرت کے سوانح حیات، طرزِ زندگی اور حسرت کی غزل گوئی میں کس قدر لطیف ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور محسوس کرنا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ

(دفعہ ۲) حسرت کا احساسِ عشق اور نظریہ حسن وعشق ایک "بیمار تخیل" کے بس کی بات نہیں۔

(دفعہ ۳) فراقِ یار میں گھل گھل کر، بسترِ مرگ اور گورِ غریباں کے ذکر سے معشوق کو متاثر کرکے حسرت شعر نہیں کہتا۔

(دفعہ ۴) اس کی غزل گوئی ٹھیٹھ عمل کی زندگی ہے۔

(دفعہ ۵) دنیا میں کارزارِ عمل کے جتنے سورما ہوئے ہیں۔ نپولین، سکندر، تیمور، سیزر، انیٹونی، غزنوی، رام، کرشن، اور ارجن، یہ تمام ہستیاں شعر وشاعری سے لطف اندوز ہونے کیلئے حسرت موہانی کا دیوان منتخب کرینگی۔"

اس بیان کو پانچ دفعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ترتیب بالا سے ظاہر ہے۔ پہلے ہم آخری دو دفعات کو لیتے ہیں۔

نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ سلطان محمود غزنوی ایک مرتبہ جب ہندوستان سے غزنین واپس جارہا تھا تو راستہ میں ایک باغی سردار کے علاقہ میں سے گذر ہوا۔ ایک نہایت مستحکم قلعہ اس سردار کے قبضہ میں تھا۔ دوسرے دن سلطان نے اس قلعہ کے دروازہ پر پڑاؤ کیا اور سردار کے پاس پیغام بھیجا کہ کل صبح ہماری درگاہ میں حاضر ہو، نذرِ عقیدت پیش کرو اور سلطانی خلعت پہن کر واپس جاؤ۔ دوسرے دن سلطان اور خواجۂ بزرگ حسن میمندی گھوڑوں پر سوار ہوکر نکلے۔ دیکھا کہ سامنے سے قاصد چلا آتا ہے۔ سلطان نے خواجہ سے پوچھا کہ بھلا سردار نے کیا جواب دیا ہوگا؟ خواجہ نے فردوسی کا یہ شعر پڑھا ؎

اگر جز بکامِ من آید جواب ؏ من و گرز و میدان و افراسیاب

سلطان نے پوچھا کہ "یہ شعر کس کا ہے۔ اس سے مردانگی کی بو آتی ہے"

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ مردانِ جنگی کو زیادہ تر ایسے اشعار پسند ہونگے جن میں جرأت و مردانگی کا ذکر ہو، جہاں کمانیں کڑکیں، تلواروں کی بجلیاں چمکیں، تیروں کا مینہ برسے اور حریفوں کے خون سے ہولی کھیلی

جائے۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ جن کی سُور ماؤں کو جنکا نام فراق صاحب نے لیا ہی، غالباً حسرت کے وہ اشعار پسند آئیں گے جن میں تیغ و خنجر، اور قتل و خون کا ذکر ہے۔

فرسودہ مضامین کے جو دس عنوان ہم نے قایم کئے ہیں اُن میں

پہلا نمبر، پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، اور قتل و خون کا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہی کہ اس قسم کے مضامین ہمارے یہاں فارسی کے تتبع میں آئے۔ فارسی شاعری میں اس قسم کے خیالات ابتداً شعر کے حالات گرد و پیش کا نتیجہ تھے، رفتہ رفتہ بمنزلہ اصول مسلمہ کے ہوگئے اور بعد میں آنے والوں کے لئے ان کی تقلید ناگزیر ٹھہری۔ اُردو شعرا نے بھی اپنے فارسی پیشرووں کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھا ورنہ ظاہر ہے کہ اُردو کے ہزاروں شعرا میں سے جنہوں نے اِن مضامین پر طبع آزمائی کی ہے دو چار بھی ایسے نہ ملیں گے جنہیں اپنے محبوب کے ہاتھوں اعزازِ "شہادت" نصیب ہوا ہو۔ اور بالفرض ایسی چند مثالیں مل بھی جائیں تو کم از کم اس قدر یقینی ہے کہ حسرت، اصغر، جگر، اور فانی ہرگز اُن خوش نصیبوں میں سے نہیں ہیں جنہیں سفاک محبوب نے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا ہو۔ جب یہ صورت ہے تو ہم کس طرح مان لیں کہ حسرت کا یہ قول ؎

کیا نہیں شوقِ شہادت کو یہ کافی اعزاز ⁂ کہ ھرا سر ہے ترے نوکِ سناں کی رونق

کسی امرِ واقع کا بیان ہی اور سچ مچ قاتل محبوب حسرت صاحب کا سر کاٹ کر نیزہ پر لئے پھرتا تھا، یا اصغر صاحب کا یہ بیان ؎

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں ⁂ بہت کچھ سوچکر ظالم نے تیغِ خونفشاں رکھدی

کسی حقیقت کا حامل ہے۔ یا جگر صاحب کا یہ کوئی ذاتی تجربہ ہی جس کا ذکر اِس شعر میں کیا گیا ہو ؎

صدقے ان ہاتھوں کے مجھکو بھی خبر تک نہ ہوئی ⁂ اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی

یا فانی صاحب نے یہ آپ بیتی بیان کی ہے ؎

لازم ہی احتیاط ندامت نہیں ضرور ⁂ لے اب چھری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

کاش فراق صاحب اسپر غور کریں کہ یہ کس کے قتل کے واقعات ہیں؟ کب پیش آئے اور اُن کی کیا اصلیت ہے؟ قارئین یہ خیال نہ کریں کہ اس موضوع پر ہمارے چوٹی کے شعرا نے صرف یہی چار شعر تصنیف فرماتے ہیں۔ نہیں اس قسم کے لایعنی اَبے بنیاد اور محض رسمی اشعار سے ان بزرگوں کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ جسکا تھوڑا سا نمونہ ابھی ہم پیش کرینگے۔

معشوق کے ہاتھوں قتل کی اِس مفروضہ "واردات" کے مختلف مدارج ہیں۔ پہلے مختلف پیرایوں میں عاشق صاحب کی طرف سے شوق شہادت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد قاتل کی آمادگی دکھلائی جاتی ہے۔ پھر واقعۂ قتل کا بیان ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کبھی اپنی سخت جانی کی شکایت کی جاتی ہے کبھی رقصِ بسمل کا تماشا دکھایا جاتا ہے۔ کبھی قاتل کے دامن بچانے کا ذکر ہوتا ہے۔ قتل ہوجانے کے بعد عاشق صاحب کی طرف سے ہدیۂ تشکر معشوق صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ پھر معشوق، بیگناہ عاشق کے قتل پر نادم ہوتا ہی۔ کبھی اپنے دامن سے خون کے دھبے چھڑانے کی ناکام کوشش کرتا ہی۔ کبھی دیدہ دلیری سے مقتول عاشق کا سر نیزہ پر یا اس کا دل تیر کی نوک میں چبھو کر لئے پھرتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے چند اور

لایعنی مضامین ہیں جن پر ہمارے چوٹی کے شعرانے اپنا عزیز وقت برباد کیا ہے اور اُردو کی عشقیہ شاعری کو ایک اُضحوکہ بنا دیا ہے۔ آیئے "بادشاہِ مُتغزلین" کی زبانی آپ کو یہ خونیں داستان سُنوائیں۔ آپکو اختیار ہے کہ اسے سُنکر قہقہے لگایئے یا سینہ کوبی کیجیے:-

شوقِ شہادت ؎

ہم بھی مُشتاق ہیں شہادت کے ∴ اے تجھے خونِ اہلِ شوق مُباح
اس درجہ نہ بیتاب ہوا ے شوقِ شہادت ∴ ہے میان میں اُس شوخ کے شمشیر ابھی تک
پہلے خدا اُسے کہیں شوقِ شکار دے ∴ پھر یہ کہ وہ ہمیں کو نشانہ اُتار دے
کاٹ لوں اپنا گلا آپ کہ جھگڑا ہو تمام ∴ کاش مل جائے کہیں آپکی شمشیر مجھے
دل خُون ہو چکا ہے جگر ہو چکا ہے خاک ∴ باقی ہوں میں مجھے بھی کرا ے تیغ زن تمام

قاتل کی آمد آمد ؎

بے نقاب آنیکو ہیں مقتل میں وہ بیشک مگر ∴ دیکھنے کا ہے کو دیگی میری حیرانی مجھے

قتل سے پہلے ؎

کیا تامل ہے مرے قتل میں ہر بار و بار ∴ ایک ہی وار پہ سر تن سے جُدا رکھا ہے
دیکھیے شوقِ شہادت میں جُھکی ہے گردن ∴ آپ اِسوقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں
ہم سر جُھکا چکے تھے علم ہو چکی تھی تیغ ∴ پھر کیا کیا خیال جو قاتل ٹھہر گیا

سخت جانی ؎

سخت جانوں پہ اُٹھنے والی ہے ∴ تیری تلوار کا خُدا حافظ
ہمارے شکوہ ہائے سخت جانی پردہ کہتے ہیں ∴ ابھی دیکھی نہیں ہے آپنے تیغِ رواں میری

دامن کشی ؎

اس سلیقہ سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا ∴ خُونِ عشاق سے گُلنار نہ ہونے پایا
دامن کو بچاتا ہے وہ کافر کہ مُبادا ∴ چُھو جائے کہیں پاکی خونِ شہدا سے

اظہارِ تشکر ؎

اک بار تھا سر گردنِ حسرت پہ ہے بہتے ∴ قاتل تیری شمشیر کے احسان ہزاروں

ندامتِ قاتل ؎

خُونِ بیجرمی سے اپنی دیکھکر تلوار سُرخ ∴ ہو گئی مارے ندامت کے جبینِ یار سُرخ
جفائے یار پر چھایا ہے اک عالم ندامت کا ∴ یہی تھا مدعا میری تمنائے شہادت کا
خونِ حسرت جو کیا ہے تو وہ نادم ہیں بہت ∴ کچھ نہ مہندی کی خبر ہے نہ انہیں پان کا ہوش
پہلے تو میرا خُون بہایا خوشی خوشی ∴ پھر کیا وہ خود ہی سوچ کے شرما کے رہ گئے

بہت نادم ہوئے آخر وہ میرے قتلِ ناحق پر ÷ ہوئی قدرِ وفا جب آشکار آہستہ آہستہ

خون کے دھبے ؎

قاتل ترے دامن پہ مرے خون کے دھبے ÷ کچھ اور بھی خنجر سے چھٹانے میں لگے ہیں

قاتل کی دیدہ دلیری ؎

ٹکڑے ہیں یہ کس کے دلِ محروم کے ظالم ÷ ابتک جو ترے تیر کے پیکاں میں لگے ہیں

قتل کرکے مجھکو کہتے ہیں وہ کس کس ناز سے ÷ یہ تو ہم نے صرف چاہت آزمائی آپکی

لگے ہاتھوں تلوار کے دو چار ہاتھ اور بھی دیکھ لیجئے ؎

تم لگاتے جو اپنے ہاتھ سے تیغ ÷ سب مرے زخم دلکشا ہوتے

کون یہ دستِ بشمشیر نظر آتا ہے ÷ مجھکو اک عالمِ تصویر نظر آتا ہے

تری تلوار سے لے شاہِ خوباں ÷ محبت ہو گئی ہے ہر گلو کو

رنجشِ بازوئے نازک کی ضرورت کیا تھی ÷ مجھکو اک جنبشِ ابرو سے مٹا دینا تھا

یہ ہیں وہ اشعارِ آبدار جن کی بنا پر بقولِ فراق کارزارِ عمل کے سُورما سکندر، سیزر، تیمور، نپولین، انیٹونی، غزنوی، رام، کرشن اور ارجن وغیرہ شعر و شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے حسرت موہانی کا دیوان منتخب کرینگے۔ لیکن فراق صاحب کا یہ نظریہ تسلیم کرنے کے لئے ان سُورماؤں کو مسلوب الحواس اور فاتر العقل فرض کرنا بھی ضروری ہوگا کیونکہ ثباتِ عقل و حواس کی حالت میں دُنیا کا کوئی انسان بھی ایسے اشعار سے متاثر اور لطف اندوز نہیں ہوسکتا جنکو اصلیت و حقیقت سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ ہو اور جن کی بنیاد محض چند لایعنی مفروضات پر ہو۔

ہاں یہ بھی ممکن ہو کہ فراق صاحب نے (دفعہ ۴) میں جس "ٹھیٹھ عمل" کا ذکر کیا ہے اس سے اُن کی مُراد وہ "عمل" ہو جسکے مختلف پہلوؤں پر "بادشاہِ متغزلین" نے مندرجہ ذیل اشعار میں روشنی ڈالی ہے۔ سُنیئے ؎

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کسکے دھوکے میں ÷ کہ جب آخر مجھے دیکھا تو شرما کر کہا تم ہو

مزاجِ یار مکدر عدو سے کیوں ہوتا ÷ ضرور کوئی نہ کوئی ہوئی فتور کی بات

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شبکو ہم سے ÷ رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب ÷ اس غم سے ہمکو نیند نہ آئی تمام شب

رشک سے مٹ مٹ گئے ہم دیکھکر گرمِ نظر ÷ غیر نے محفل میں جب اُنگلی دبائی آپکی

ہم حال اُنہیں یوں دل کا سُنانے میں لگے ہیں ÷ کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے کے لئے ÷ وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب ÷ سر سے ڈھلجائے نہ غصّہ میں دوپٹا دیکھو
سب کی خاطر کا ہے خیال تمہیں ÷ کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
ہم نے کسدن ترے کوچے میں گذارا نہ کیا ÷ تُو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

اِس قسم کے پست، سوقیانہ، اور مُبتذل اشعار "بادشاہِ متغزلین" کے یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ہم نے تو صرف نمونہ پیش کیا ہے۔

(دفعہ ۳) میں فراقؔ صاحب فرماتے ہیں کہ "فراقِ یار میں گھُل گھُل کر، بسترِ مرگ اور گورِ غریباں کے ذکر سے معشوق کو متاثر کرکے حسرتؔ شعر نہیں کہتا۔" آیئے ذرا "بادشاہِ متغزلین" کے کلام کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ فراقؔ صاحب کا یہ دعویٰ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے۔

فرسودہ مضامین کی جو فہرست ہم نے پیش کی ہے اُس میں دوسرا نمبر "نزع۔ مرگ۔ قبر۔ حشر" کا ہے۔

جس طرح "قتل کی واردات" کے مختلف مدارج تھے اسی طرح اس موضوع کے بھی کئی درجے ہیں۔ پہلے عاشق صاحب پر فراقِ یار میں نزع کا عالم طاری ہوتا ہے۔ سنگدل محبوب کبھی تو اسی حالت میں آ پہونچتا ہے اور کبھی عاشق صاحب کے راہی عدم ہونے کے بعد آتا ہے۔ کبھی جنازے میں شریک ہوتا ہے اور کبھی صرف قبر پر جاکر فاتحہ پڑھ آتا ہے۔ کبھی مزارِ عاشق پر پھُول بھی چڑھاتا ہے اور کبھی قبر کی زیارت کو بھی نہیں جاتا۔ مرنے کے بعد جب عاشق صاحب خاک میں ملکر خاک ہوجاتے ہیں تو اُن کا غبار دامنِ محبوب سے لپٹ جاتا ہے۔ آخری منزل حشر کی مُلاقات ہے۔ عاشق صاحب اس بھیڑ میں بھی اپنے محبوب کو پہچان لیتے ہیں اور طرح طرح سے اپنی محبّت کا ثبوت دیتے ہیں۔

"بادشاہِ متغزلین" کا عالمِ نزع دیکھیے ؎

ابھی کچھ اور دمِ واپسیں ٹھہر جاتا ÷ کچھ اور بھی جو ترا انتظار ہم کرتے
دمِ آخر مجھے دیکھا تو نادم ہوکے فرمایا ÷ کسے معلوم تھا تیری یہ حالت ہونیوالی ہے
دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق ÷ بس اب جاؤ تم سے خفا ہوگئے ہم

بعدِ مرگ ؎

موت سے پوری ہوئی شرطِ وفا ÷ پر نہ کہا تم نے کہ ہاں ہوگئی
حال مرا تھا جب بتر تب تو ہوئی نہ تم خبر ÷ بعد مرے ہوا اثر، اب میں اثر کو کیا کروں
درمیانِ ہجومِ حسرت و یاس ÷ میں بھی اک گوشۂ مزار میں تھا

بیوفا محبوب تعزیت کو نہیں آتا ؎

مِل گئی خاک میں سب برقِ نازِ وفا ÷ تعزیت کو بھی نہ وہ شوخ جفا جو آیا

نہ صرف اتنا بلکہ عاشق صاحب کے مزار پر بھی نہیں جاتا ؎

ہے جہاں مدفن شہید دفا ؛ واں کبھی آپ کا گذر نہ ہوا

حسرت صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے ؎

فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ ؛ پہلے کس ناز سے رُو رُو کے سنوارے گیسو

قبرِ عاشق پر پھُول چڑھائے جاتے ہیں ؎

مرقدِ عاشقاں پہ آخرکار ؛ گلفشانی تجھے مبارک ہو

خاکِ عاشق ؎

خاک ہو کر ملا یہ فخر کہ ہیں ؛ تیرے توسن کا ہمرکاب ہوا

لپٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جُدا خاکِ ری ؛ کہیں پہونچے بھی تو اُس گوشۂ داماں کے قریب

حسرت صاحب حشر میں پہونچتے ہیں اور وہاں اس جفا کار سے ملاقات ہوتی ہے ؎

ہم عرصۂ حشر میں بھی حسرت ؛ پہچان گئے اُنہیں نہ ہے ہوش

شکوۂ عشق جو ہم سے کسی عنوان نہ ہوا ؛ حشر میں بھی وہ جفا کار پشیماں نہ ہوا

جنّت میں پہونچنے کے بعد یادِ محبوب میں عاشق صاحب حوروں کی طرف ملتفت نہیں ہوتے ؎

یاد میں تیری نہ دُنیا ہی سے بیزار تھا دل ؛ خُلد میں بھی تو مخاطب ہوئے حُور سے ہم

کیا ان اشعار کی موجودگی میں، اور انہیں جیسے دوسرے اشعار کے ہوتے ہوئے جو دیوانِ حسرت میں آپکو ملیں گے فراق صاحب کا وہ دعویٰ جو انہوں نے (دفعہ ۳) میں پیش کیا ہے کسی طرح قابلِ قبول ہے؟

ممکن ہے، بعض حضرات یہ سوال کریں کہ پہلے عنوان کے ماتحت جو اشعار نقل کئے گئے ان سے حسرت صاحب کا قتل ہونا ثابت ہوا اور اب یہ بتایا جاتا ہے، کہ محبوب کی بے اعتنائی اُن کی موت کا باعث ہوئی اور کہیں ان کا مزار بھی ہے ان دو مختلف بیانوں میں سے کونسا بیان سچا ہے۔ اسکے علاوہ واقعاتِ بعد از مرگ کا جن اشعار میں ذکر ہے وہ مرنے کے بعد کس طرح لکھے گئے اور ہم تک کیونکر پہونچے؟ دراصل ان سوالات کا صحیح جواب دینا میری طاقت سے باہر ہے۔ اگر میں کچھ کہونگا بھی تو وہ محض ایک ظنّی اور قیاسی بات ہوگی اس لئے بہتر یہ ہے کہ طالبانِ تحقیق مولانا حسرت کو کانپور کے پتہ پر خط لکھ کر اُن سے حقیقتِ حال دریافت کرلیں یا پھر فراق صاحب سے رجوع کریں ممکن ہے کہ وہ ان مسائل پر کچھ روشنی ڈال سکیں کیونکہ "بادشاہِ متغزلین" کے کلام کے اسرار و رموز کو جیسا وہ سمجھتے ہیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

اپنے بیان کی (دفعہ ۲) میں فراق صاحب نے حسرت کے نظریۂ حُسن و عشق کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ ہماری "فہرست مضامین فرسودہ" میں اس قسم کا کوئی عنوان نہیں ہے لہذا اس موضوع پر ہم تفصیلی بحث نہیں کرینگے۔ البتہ قارئین کی دلچسپی کیلئے اختصار کے ساتھ حسرت صاحب کا "نظریۂ حُسن و عشق" پیش کر دینگے۔

عام طور پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ جب کسی پر دل آتا ہے تو بے اعتبار آتا ہے۔ ارادہ، خواہش، اور کوشش سے انسان کسی پر عاشق نہیں ہوا کرتا۔ لیکن حسرت صاحب اسکے قائل نہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی اور ایک چھوٹے لڑکے

کو جس میں جوان ہو کر معشوق بننے کی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، اپنے لئے انتخاب کر لیتے ہیں اور اس اُمید پر جیتے ہیں کہ جب وقت کا مصوّر حُسن کی تصویر میں شباب کا رنگ بھر یگا تو اس پیکر جمال کی خدمت میں عاشقی کی درخواست پیش کر دینگے اور برسوں کی اُمیدداری" سے حق محبت ثابت کر دیا جائیگا۔ اس خیال کو نہایت "جامعیت" کے ساتھ انہوں نے صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے ؎

عمر ہی کیا ہے وہ کمسن ہیں ابھی نامِ خدا ٭ اُنپہ مرنا ہو تو کچھ دن ہمیں جینا ہی ضرور

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مولانا کی نظرِ دور بیں نے اس "کمسن" کو اپنا معشوق بنانے کے لئے انتخاب کیا تھا، اس وقت وہ خود ماشا اللہ کافی سن رسیدہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت وہ کافر جوان ہوا، یہ بُوڑھے ہو گئے مگر بحمداللہ اس پیکرِ شباب سے حصولِ آرزو کا جوش سرد نہیں ہوا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

پیرانہ سر بھی شوق کی ہمت بلند ہے ٭ خواہانِ کام جاں ہیں جو اس نوجواں سے ہم

سطور بالا میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ "مولانا ایک چھوٹی سی لڑکی اور ایک چھوٹا سا لڑکا جس میں جوان ہو کر معشوق بننے کی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، اپنے لئے انتخاب کر لیتے ہیں"۔ ممکن ہے بعض حضرات یہ اعتراض کریں کہ جس شعر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے اس میں ایک لفظ بھی موجود نہیں جس سے اس "کمسن" کا لڑکی یا لڑکا ہونا ثابت ہو۔ جہاں تک اس شعر کا تعلق ہے، یہ اعتراض یقیناً درست ہو لیکن ہمارے پیشِ نظر مولانا کے دوسرے اشعار بھی ہیں جن سے یہ امر متحقق ہو جاتا ہے۔ اس سے تو غالباً فراق صاحب کو بھی انکار نہ ہو گا کہ دوپٹا لڑکیوں اور عورتوں کیلئے مخصوص ہے اور اس شعر ؎

سامنے سبکے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب ٭ سر سے ڈھل جائے نہ غصّہ میں دوپٹا دیکھو

یہ نتیجہ نکالنا کہ محبوب مخاطب صنفِ نازک کا ایک فرد ہی، غالباً بیجا نہ ہو گا۔ لیکن ساتھ ہی جب ہم اس شعر پر پہونچتے ہیں ؎

سر تا سر اک لطیفۂ خوبی ہے وہ نگار ٭ زلف اُسکی عنبریں ہے تو ہے مشکبار خط

تو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مولانا صاحب کا محبوب کوئی نچکیا، بھانڈ کا لونڈا ہے جسکے داڑھی بھی ہے اور زلفیں بھی۔

یہ ہے "بادشاہِ متغزلین" کا نظریہ حُسن و عشق جس کا سمجھنا بقولِ فراق "نقاد" کے بس کی بات نہیں ہمیں فراق صاحب کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے۔

اب ہم فراق صاحب کے بیان کی (دفعہ اوّل) کو لیتے ہیں جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں اُنہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حسرت کے سوانح حیات، طرزِ زندگی، اور حسرت کی غزلگوئی میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہم نے اپنی "فہرستِ مضامین فرسودہ" کے پہلے اور دوسرے عنوان کے ماتحت جو اشعار نقل کئے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی فراق صاحب کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ان اشعار میں اور حسرت کے سوانح زندگی میں ہم آہنگی تو کجا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا حسرت زید عمرہٗ ماشا اللہ تندرست و توانا کانپور میں براج رہے ہیں پھر کوئی کس طرح تسلیم کرے کہ ان اشعار میں جو واقعات مذکور ہیں مثلاً مولانا کا قتل، یا عالمِ نزع اور وفات وغیرہ، ان کی

کوئی اصلیت ہے۔ رسم پرستی کا بُرا ہو جسکی بدولت ہمارے ادب میں یہ سرمایۂ خرافات ہر روز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

ہماری فہرستِ مضامینِ فرسودہ کا تیسرا عنوان میکشی ہے۔

شراب خواری ہمیشہ ایرانیوں کا نہایت محبوب مشغلہ اور اُن کی سماجی زندگی کا ایک جزوِ لازمی رہی ہے۔ زرتشتی مذہب میں تو شراب جائز ہی تھی لیکن اسلام لانے کے بعد بھی ایران کی میکشی میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا۔ دراصل روایاتِ کہن کا اثر، طبائع کا فطری میلان اور ملک کی آب و ہوا، ان سب چیزوں نے ملکر شراب خواری کو ایک ایرانی کی زندگی کا جزوِ لازمی بنا دیا اور آج بھی جس عمومیت کے ساتھ ایران میں شراب پی جاتی ہے اسکی مثال کسی ایشیائی ملک میں تو کیا یورپ میں بھی مشکل ہی سے ملیگی۔ سنہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ طہران میں، میں اپنے ایک دوست کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ پیاس لگی۔ میں نے پانی مانگا لیکن آبِ سادہ کے بجائے آتشِ سیّال پیش کی گئی۔ جب میں نے اسکے پینے سے انکار کیا تو میرے دوست نے حیران ہو کر پوچھا، کیا آپ نہیں پیتے؟ میں نے کہا نہیں۔ اسپر اُنہوں نے جو الفاظ کہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہینگے اور وہ ایران کے میلاناتِ امروزہ کا ایک سچا نمونہ ہیں۔ اُنہوں نے کہا "برادر! آدم کہ عرق نخورد، چہ طور ممکن است زندگانی بکند" بھائی، آدمی شراب نہ پئے تو کیونکر جئے۔

غرض میخواری کے اس عام رواج کا نتیجہ یہ ہوا کہ شراب ایرانی شاعری کا ایک مخصوص موضوع بن گئی اور ایران کے لاکھوں شعرا میں شاید دس پانچ بھی ایسے نہ ملیں گے جنہوں نے شراب کے متعلق کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ جو پیتے تھے اُنہوں نے بیانِ واقع کے طور پر اور جو نہیں پیتے تھے اُنہوں نے اکثریت کی تقلید میں اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو شاعری تو ایرانی شاعری کا مثنّیٰ ہے۔ جو کچھ وہاں ہے، یہاں بھی ہے۔ اصلیت نہ سہی نقالی ہی سہی۔ میر و سودا کے زمانہ سے لیکر اسوقت تک میخواری (جہاں تک سچ مچ پینے کا تعلق ہے) ہمارے شعرا کی ایک نہایت قلیل جماعت تک محدود رہی ہے لیکن اس کے باوجود شراب کے متعلق قریب قریب ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے اور بعض نے تو اس موضوع کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے حالانکہ ان میں سے بعض کے متعلق تحقیقی طور پر معلوم ہے کہ اُنہوں نے پینا تو کُجا شراب کبھی چھوئی بھی نہیں اور چھونا کیسا کبھی دیکھی بھی نہیں۔ لیکن اُن کے دیوان اُٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے شراب کی بھٹی ہے کہ پڑی بھبک رہی ہے۔ بے معنی نقالی کی اس سے زیادہ افسوسناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ بدنصیب شاعر جس نے پینا تو کُجا شراب کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی اور جس کے اشعار کی بنیاد ذاتی تجربات کے بجائے محض "روایت" پر ہے، اُس کے کلام میں کیا لُطف ہو سکتا ہے۔ وہ کیا جانے کہ حقیقی کیف و مستی کسے کہتے ہیں، زاہد و واعظ کو ہمیشہ یہ کہکر للکارا جاتا ہے کہ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں" لیکن اس قسم کے نقال شاعر کیا زاہد و واعظ سے کم لغو گو سمجھے جانے چاہئیں۔ ان لوگوں کا شراب کے متعلق اشعار لکھنا ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے ایک اچھوتی کنیا کوک شاستر لکھے یا مہاتما گاندھی شعرِ عرب پر تبصرہ فرمائیں۔

مولانا حسرت موہانی کے سوانحِ زندگی کا جہاں تک ہمیں علم ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے دُخترِ رز سے کبھی دل نہیں لگایا۔ ہاں کبھی بھولے بھٹکے اندھیرے اُجالے کوئی بات ہو گئی ہو تو وہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ لیکن اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ماشاءاللہ بڑے دھاڑ شرابی ہیں پیتے ہیں اور روز پیتے ہیں۔ ساغر و مینا پر بس کرنیوالے نہیں بلکہ خُم کے خُم لُنڈھاتے ہیں اور پی پی کر دونوں جہان سے بیخبر ہو جاتے ہیں بلکہ فنا ہو کر بھی خاکِ رہِ میخانہ بنتے ہیں بعض بعض غزلیں تو

مطلع سے لیکر مقطع تک شراب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ آیئے آپ بھی میخواری میں "بادشاہِ متغزلین" کے شریک ہوجایئے اور بیدھڑک ہوکر پیجیئے اس لئے کہ ؎

حسرتِ مے پرست کو، بلکہ ہر ایک مست کو ؛ پیرِ مغاں کے دور میں خوفِ خطا سے کیا غرض

اب دیکھیئے کہ "حسرتِ مے پرست" کس کس انداز سے پیرِ مغاں کی خدمت میں عرضِ نیاز کرتے ہیں ؎

میری طینت میں ہے داخل ہوسِ جامِ شراب ؛ بندۂ پیرِ مغاں ہوں میں خسِ جامِ شراب

مجھے طوفِ حرم کی آرزو کیوں ہو گذر میرا ؛ سرِ کوئے بتاں تک ہے درِ پیرِ مغاں تک ہے

مینوشیو نہیں بجز دو جہان ہے ؛ ہم خوش ہے کہ بندۂ پیرِ مغاں ہے

چلتا ہی روز دورِ مے ارغواں ہنوز ؛ جاری ہے فیض محفلِ پیرِ مغاں ہنوز

پیرو پیرِ مغاں تھا میں یہانتک حسرت ؛ کہ فنا ہوکے بھی خاکِ رہِ میخانہ ہوا

(فرق لائے نہ جگر سوزیٔ صہبا میں گلاب ؛ مغبچو تم کو قسم ہے جو کچھ آمیز کرو)

ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک عرب ہندوستان آیا۔ اتفاق سے "محرم" کے زمانہ میں اُسے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ جدہر جاتا ہے گریہ و ماتم۔ جدھر دیکھتا ہی شیون و شین۔ حیران ہوکر لوگوں سے پوچھا کہ کون مرگیا جس کے لئے سارا شہر عزاخانہ بنا ہوا ہے۔ جواب ملا کہ "ارے نادان، تجھے معلوم نہیں کہ یہ ماتم حسین ہے۔" عرب نے بڑے تعجب سے کہا کہ "اچھا! یہاں اب خبر آئی ہے۔ حسین کی وفات کو تو تیرہ سو برس گذر ے" وہ بیچارا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جس شخص کی وفات کو تیرہ سو برس گذر چکے آج اُسکی مجلس عزا کیوں برپا ہے۔ لہٰذا اُس نے یہی قیاس قایم کیا کہ غالباً ہندوستان کے لوگ واقعۂ کربلا سے اب تک بے خبر تھے۔ اب خبر آئی ہے تو مصروفِ ماتم ہیں۔ اُردو شاعری میں پیرِ مغاں اور مغبچوں کا ذکر بھی ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا اُس عرب کے نزدیک امام حسین کی وفات کے تیرہ سو برس بعد لکھنؤ میں اُن کا ماتم تھا اس لئے کہ قبولِ اسلام کے بعد خود ایران میں بھی پیرِ مغاں اور مغبچوں کا وجود برائے نام رہگیا تھا چہ جائیکہ ہندوستان جہاں یہ گروہ نہ کبھی پہلے تھا نہ آج ہے۔ ہاں کوئی صاحب محض مباحثہ کی خاطر نوساری کے پارسیوں کی مثال پیش کرنے لگیں تو اور بات ہے مگر یاد رہے کہ ہماری اُردو شاعری میں جس پیرِ مغاں اور مغبچہ کا ذکر ہے وہ نوساری سے ہرگز نہیں آیا۔

میخواری کے تمام مدارج پر مولانا نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اشعار ذیل نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں ؎

الٰہی خیر میرے عہدِ ترکِ میگساری کی ؛ ہجومِ شوق میں ہنگامۂ فصلِ بہاراں میں

برسات کے آتے ہی، توبہ نہ رہی باقی ؛ بادل جو نظر آئے بدلی مری نیت بھی[۱]

خُم لگا دے ہم بلانوشوں کے لب سے ساقیا ؛ کام آئیگا نہ ساغر آج نے پیمانہ آج

اسقدر کیں مستیاں ہم بادہ خواروں نے کہ آج ؛ ہوگیا سب رنگ مے سے خانۂ خمار سرخ

---

[۱] میں توبہ کرچکا تھا مگر کیا کروں جلیل ؛ کالی گھٹا کو دیکھ کے نیت بدل گئی۔ دونوں شعروں میں کسقدر "مشابہت" ہے۔

رندوں پہ یہ کیا ستم ہے ساقی ؎ ساغر خالی ہیں پُرسبُو ہیں
اب جو ملتی ہو تو چلو ہی سے پی لیں مے نوش ؎ انتظارِ طلب جام ہے بیجا نہ کریں

دیکھکر غیر کی محفل میں انہیں مستِ شراب ؎ نہ ہوا ضبط ہمارے نکل آئے آنسو
رشک سے مٹ مٹ گئے ہم تشنہ کامانِ وصال ؎ جب ملا لبہائے ساقی سے لبِ پیمانہ آج

اشعارِ بالا سے قارئین کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مولٰنا نے جس سوسائٹی کی تصویر کھینچی ہو وہ کُل کی کُل شرابی ہو۔ رقیب ہے تو وہ شرابی۔ محبوب ہو تو وہ شرابی۔ احباب ہیں تو وہ شرابی۔ اور خود اپنا اور ساقی کا تو پوچھنا ہی کیا کہ یہ تو شراب ہی سے بنے ہیں۔ رندوں کی بدمستیوں کا یہ عالم ہو کہ بیچارے زاہد اور واعظ کو بھی زبردستی پلا دیتے ہیں ؎

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی ؎ واعظ کے نہ چل سکے بہانے

اور پھر اسی پر بس نہیں۔ مولٰنا کا تو یہ ارادہ ہے کہ ہر ولی کو میخوار بنا دیں۔ چُنانچہ ارشاد ہوتا ہو ؎

کردونگا میں ہر ولی کو میخوار ؎ توفیق جو مجھکو دی خدا نے

اس قسم کی "رسمی شاعری" پر اب جو ہر طرف سے لے دے شروع ہوئی ہے تو یاروں نے "تصوف" کے دامن میں پناہ لی ہے۔ اور معترضین کو "حقیقت" و "مجاز" کے فریب میں مُبتلا کرنا چاہا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ شاعری میں استعارات سے کام لیا جاتا ہے اور کبھی کبھی نظر کو تیر اور آنکھ کو ساغر سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اشعارِ بالا میں جس شراب کا ذکر ہے، جو واعظ بیچارے کو پچھاڑ کر پلائی گئی ہے، اُسے "شرابِ معرفت" ٹھہرانا، مذاقِ سلیم کے گلے پر کند چھُری چلانا ہے۔

چونکہ مدت سے راقم السطور کا مسکن کانپور ہے اور مولٰنا حسرت بھی ایک زمانہ سے کانپور ہی میں قیام پذیر ہیں اس لئے موصوف کے ذاتی حالات سے ایک حد تک آگاہی ہے۔ اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ مولٰنا حسرت کسی زمانہ میں بھی بھنگ پیا کرتے تھے یا آجکل پیتے ہیں تو ہم ہر قسم کا تاوان ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن "رسم کی پابندی" اور "قافیہ کی مجبوری" نے مولٰنا کی زبان سے یہ شعر نکلوا دیا ؎

عہدِ مستی کے اب کہاں وہ رنگ ؎ ساغرِ بادہ ہو نہ کاسۂ بنگ

یہی ہے وہ ہم آہنگی جو فراق صاحب کے نزدیک حسرت کے سوانحِ حیات اور حسرت کی غزلگوئی میں پائی جاتی ہو۔ فراق صاحب نے حسرت کے سوانحِ زندگی اور حسرت کی غزلگوئی میں ہم آہنگی کا دعویٰ کرتے وقت غالبًا اس امر پر غور نہیں کیا کہ اگر واقعی یہ دعویٰ ثابت ہو جائے تو بیچارے مولٰنا حسرت کو ایک دھادت شرابی اور ایک "بنگ نوش" ماننا پڑیگا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں مولٰنائے محترم کی ذات پر صریح اتہام اور قطعی بہتان ہیں۔ اُنھوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہو وہ محض نقالی ہے۔ حقیقت سے اُسے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ (باقی آئندہ)

عندلیب شادانی

رباعیاتِ فرحت

بزمِ رنداں کو جگمگا دے ساقی | اپنے شیشوں کی سب لُٹا دے ساقی
بدمستِ شراب کر کے دُنیا بھر کو | تفریقِ من و تو بھی مٹا دے ساقی

دل کو مستِ نگاہ کر دے ساقی | کر دے ہاں ہاں! تباہ کر دے ساقی
میری بخشش کو خود ہی رحمت دوڑے | اتنا غرقِ گناہ کر دے ساقی

آنکھیں محوِ نگار کر دے ساقی | ان میں کیفِ بہار بھر دے ساقی
میرے جذباتِ عشق بے معنی کو | زینت دہِ حُسنِ یار کر دے ساقی

مینا میں ہی پھر شراب رقصاں ساقی | پھر جام سے ہے وداعِ ایماں ساقی
کونین غریقِ جام و صہبا ہو جائے | کر دے مستی کا اتنا ساماں ساقی

ایمان، شراب، جانِ راحت، ساقی | کونین کی ہے یہی حقیقت ساقی
جامِ ہستی لئے کھڑا ہے فرحت | بھر دے! بھر دے! اے محبّت ساقی

فرحت کانپوری

زارینہ کا گلِ بنفشہ

کسی زمانے میں ایک جرمن شہنشاہ کی یہ خواہش ہوئی کہ زارِ روس سے صلح کرے۔ حقیقت میں صلح تو تھی ہی لیکن اس کی خواہش یہ تھی کہ دونوں ممالک میں اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ بوڑھے آدمی فطرتاً صلح پسند ہوا کرتے ہیں۔ صلح اُن کے دُنیاوی تعلقات میں آسانی بہم پہونچاتی ہے اور جب وہ مرجاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں ــــ "آہ! آج دُنیا سے وہ واحد شخص اُٹھ گیا جس نے جنگ کے احمقانہ پہلو کو اچھی طرح سمجھا تھا"

لیکن بدقسمتی سے وہ اتنا ضعیف تھا کہ اُسے خود دارالسلطنت روس تک جانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لئے اُس نے ایک معذرت نامے کے ساتھ اپنے چانسلر کو اس اہم مہم پر روانہ کیا ــــ ہاں وہ چانسلر جرمنی کا مشہور سیاسی "پرنس فلیرنگ" تھا۔ پرنس فلیرنگ، سینٹ پیٹرسبرگ رات کے وقت پہونچا۔ زار بستر پر جا چکا تھا۔ لیکن اس کا لارڈ چانسلر موجود تھا۔ کھانے کے بعد فلیرنگ کو ایک خوبصورت خوابگاہ آرام کیلئے دی گئی جہاں ایک بہت ہی نفیس انگیٹھی روشن تھی۔ روس سرد ملک ہے۔

دوسرے دن جب وہ اُٹھا تو آفتاب نہ نکلا تھا۔ وہ سویرے اُٹھنے کا عادی تھا۔ اسکی نصف شہرت اسی عادت کی مرہونِ منت تھی۔ اُس نے کپڑے بدلے اور ایک ہلکی سی چہل قدمی کیلئے روانہ ہوگیا۔

لیکن زار کے سپاہی شاید فلیرنگ سے بھی زیادہ سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ اس عظیم الشان محل کے ہر کونے پر، ہر دوراہے پر ایک دراز قد سپاہی متعین تھا۔ جیسے وہ گزرتا سپاہی اپنی بندوق اُٹھا کر سلام کرتے جاتے۔ فلیرنگ ان غیر معمولی سلاموں سے تنگ آگیا تھا کیونکہ خوش الحان پرندے بول رہے تھے اور شبنم کے قطرے ابھی تک سبز گھانس پر ہیرے کے مانند چمک رہے تھے۔ وہ اس وقت کچھ سوچنے کیلئے تنہائی چاہ رہا تھا کیونکہ یہ یقینی امر تھا کہ زار چاشت کے بعد فوراً اُسے طلب کریگا اور اُسے اہم صلح نامہ کے چند پیچیدہ نکات طے کرنے ہونگے۔

"یہ محافظ نہایت ہی نامعقول ہیں" فلیرنگ نے دل ہی دل میں کہا۔ "انکی شوخ وردیاں آنکھوں پر کسقدر حبیر معلوم ہوتی ہیں، خدا نے اس ملک کو ذوقِ سلیم سے زیادہ دولت عطا فرمائی ہے"

وہ چلتا ہی گیا یہاں تک کہ اُس نے محسوس کیا کہ محافظوں کا یہ لامحدود سلسلہ ختم ہوا چاہتا ہے کیونکہ درختوں کے اس گھنے جھنڈ میں دور تک کسی محافظ کی شوخ وردی نظر آرہی تھی۔ راستہ سبز گھانس کے ایک بڑے خط پر جاکر ختم ہوتا تھا۔ ویسی نفیس جمی ہوئی گھانس اُسنے کم دیکھی تھی۔

"کیا ہی اچھی جگہ ہے!" اس نے کہا ــــ "لعنت ہو تم پر!" اسکی نظر یک بیک ایک دُور ایستادہ محافظ پر پڑی۔ جو اس سرسبز خطہ کے ٹھیک بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اُسے یہ ایک عجیب بات معلوم ہوئی "ایک محافظ ایسی سُنسان جگہ میں کیوں متعین کیا گیا ہے؟" وہ تنہائی چاہ رہا تھا۔ اُسے کچھ سوچنا تھا۔ زارِ روس سے شرف ملاقات کوئی معمولی سی بات تو تھی نہیں۔ لیکن آج تک اُس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا تھا جسے اُس نے نہ سمجھا ہو ــــ یہ فلیرنگ کی کامیابی کی

دوسری وجہ ہے۔

وہ محافظ کے پاس پہونچ گیا۔ "معاف کرنا بھئی! لیکن تم یہاں کس چیز کی حفاظت کر رہے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"میں کس طرح جان سکتا ہوں" سپاہی نے کہا جو اتفاق سے درباری گفتگو سے قطعاً ناواقف تھا۔

"لیکن یہ عجیب بات ہے!" فلیمنگ نے اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "آخر اِس کھلے ہوئے میدان میں کس چیز کی حفاظت کی جا رہی ہے؟"

"مجھے یہاں کھڑے رہنے کا حکم ملا ہے" سپاہی نے اس تنقید سے عاجز آکر سخت لہجے میں کہا۔

"لیکن تمہیں یہاں کھڑے رہنے کا حکم کس نے دیا ہے" فلیمنگ نے پوچھا۔

"کیوں؟ سرجنٹ! اور کون حکم دے سکتا ہے؟"

پرنس فلیمنگ اس سے زیادہ واقفیت حاصل نہ کر سکا۔ وہ آگے چلا۔ لیکن واپسی میں بھی وہ بلند و بالا سپاہی اسی طرح ایستادہ تھا۔ بجنسہ اسی طرح صابر کسی غیر مرئی چیز کی حفاظت کرتا ہوا۔

چاشت کے بعد فلیمنگ کی دربارِ زار میں طلبی ہوئی اور اسی اہم صلح نامہ کی گفتگو چھیڑی گئی۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد زار سخت متعجب تھا کہ ایسا حواس باختہ شخص جس کا دماغ ہر وقت کسی دوسرے خیال میں محو رہتا ہے کس طرح یورپ میں اتنی شہرت حاصل کر سکا؟

"مجھے افسوس ہے" زار نے ایک طویل تقریر کے بعد کہا "کہ میں آپ کو اپنا نظریہ نہ سمجھا سکا۔ اگر یہ سوال ہو کہ میں اپنے سپاہی کس طرح پولینڈ میں متعین کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔"

"۔۔۔۔۔۔۔ سرسبز خطہ کے بیچ میں!" فلیمنگ یکایک بول اُٹھا۔

زار نے غصہ سے اسکی طرف دیکھا۔

"میں۔۔۔ میں معافی کا خواستگار ہوں" اُس نے گھبراتے ہوئے کہا "اعلیٰ جاہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے آج ایک ایسی بات دیکھی ہے کہ اب تک خبط ہوں اور ابھی تک میرا خیال اسی طرف ہے"

"خوب!" زار نے کہا "کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ وہ کون سی بات ہے؟ ــــ کیونکہ ہم اپنے مہمان کی خاطرداری کے بارے میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں"

فلیمنگ نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

زار کی جبیں پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ وہ سوچ رہا تھا "درختوں کے اس سرے۔۔۔۔۔ تم کہتے ہو؟۔۔۔۔۔ اوہ! چاندماری کا پرانا میدان شاید؟۔۔۔۔۔ میں اب سمجھا۔ ہاں ہاں ٹھیک بیچ میں ایک سپاہی متعین ہے۔ میں سینکڑوں بار اُس کے پاس سے گزرا ہوں۔ لیکن مجھے یہ کبھی خیال نہیں ہوا کہ وہ وہاں کیا کرتا ہے۔ اچھا چلیں ہم اس سے پوچھیں۔ صلح نامہ کی گفتگو کل پر ملتوی رکھی جا سکتی ہے"

وہ چاندماری کے میدان تک ٹہلتے ہوئے پہونچے۔ محافظوں کی تبدیلی عمل میں آچکی تھی۔ لیکن اُسی جگہ ایک دوسرا سپاہی

ایستادہ تھا۔ اُس نے بھی اسی انداز سے سلام کیا۔ "تم یہاں کیوں متعین ہو؟" زار نے نرمی سے پوچھا۔

سپاہی پر لرزہ کا ایک خاصا دورہ پڑ گیا۔ لیکن اُس نے بھی اقرار کیا کہ وہ بھی اس بارے میں قطعاً ناواقف ہے۔ سرجنٹ طلب کیا گیا۔ اسکی معلومات بھی سپاہی سے زیادہ وسیع نہ تھیں۔ اس کے بعد کپتان بھی بس اتنا کہہ سکا کہ کرنل کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ کرنل صاحب طلب کئے جائیں۔

کرنل صاحب بس اتنی صفائی دے سکے کہ محافظوں کے تعین میں وہ گذشتہ کرنل کی پیروی کرتے ہیں اور محافظوں کے قیام کا نقشہ وزارت جنگ اور وزارت اُمور داخلہ کی رضامندی سے تیار ہوا ہے۔

"کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم نے اس میں ذرا بھی ترمیم نہیں کی ہے؟" زار نے پوچھا۔

"اعلیٰ جاہ! میں نے گذشتہ بارہ سال کی خدمت میں نمک حلالی اور وفاداری کو اپنا رہبر بنایا ہے" محافظ دستہ کے کرنل نے غرور سے جواب دیا۔ وہ اپنی خدمت کی طوالت پر خاص زور دے رہا تھا کیونکہ ترقی کی فہرست مدت سے اُسکے لئے باعث تکلیف ثابت ہو رہی تھی اور اب اُسے خود بھی اپنی صلاحیت پر دھوکا ہونے لگا تھا۔

"کوئی شخص بھی نہیں حضور! ایک فٹ بھی نہیں حضور" کرنل صاحب اپنا مطلب صاف کرنا چاہ رہے تھے۔

"ہم دوپہر کے کھانے کے بعد اُس کی تحقیقات کرینگے" زار نے جلدی سے کہا کیونکہ وہ اپنی فوج کو فلیرنگ کی نظر میں نااہل ثابت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ "اس عرصہ میں وزارت جنگ کو اس کی خبر کر دینی چاہیئے۔ مَیں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ شخص یہاں کیوں متعین کیا گیا؟"

اس خبر کے ملتے ہی دفتر وزارت میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ وزیر جنگ خود دو گھنٹہ تک چند بوڑھے فیلڈ مارشلوں کے ساتھ تحقیقات میں مصروف رہے۔ غریب نائبین اور ملازمین دفتر کا کیا کہنا! بکسوں، الماریوں، ردی کی ٹوکریوں کے اُلٹ پھیر میں کتنی بار ایک دوسرے سے ٹکرائے اس کا تذکرہ ہی فضول ہے۔ گرد کو نہ پوچھئے۔ چھینکوں سے گھنٹوں پریشان رہے ہونگے۔ لیکن اس کمبخت عقدہ کو نہ حل ہونا تھا نہ ہوا۔

سلطنتِ روس کے سب سے پُرانے فیلڈ مارشل صاحب کی جانب رجوع کیا گیا۔ وہ بستر چھوڑنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور اس پر قوت سمع جواب دے چکی تھی۔ وزیر جنگ صاحب اُنکے پاس حاضر ہوئے۔

"ہاں۔ ہاں" بوڑھے فیلڈ مارشل نے غلط سمجھتے ہوئے کہا "شہنشاہ جاننا چاہتے ہیں کہ پچپن برس ہوئے میں نے ترکوں کو کس طرح شکست دی تھی؟ خوب یہ اچھی بات ہے کیونکہ کوئی تواریخ بھی اس کا صحیح واقعہ نہیں بیان کرتی"

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بھی کوئی تحقیق شدہ امر نہ تھا کہ کیا فیلڈ مارشل صاحب نے سچ مچ ترکوں کو شکست دی تھی۔ ترک مورخ یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ فیلڈ مارشل صاحب نے نہایت ہی شرمناک شکست حاصل کی تھی لیکن فیلڈ مارشل صاحب نے جنگ کی ایک طویل داستان شروع کی۔ فوجوں کے قیام کا ایک زندہ مرقع ......

"لیکن" وزیر جنگ احتجاجانہ انداز سے چیخے "شہنشاہ ترکوں کے بارے میں جاننا نہیں چاہتے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ سپاہی خاص طور پر کیوں اس جگہ متعین کیا گیا ہے؟"

"آہ" بوڑھے فیلڈ مارشل نے اپنی نااُمیدی کا بیکسانہ اظہار کرتے ہوئے کہا: اب دماغ ویسا کام نہیں کرتا۔ شاید وہ کسی جُرم کی پاداش میں کھڑا کیا گیا تھا۔"

"لیکن سزا کی طوالت پر تو غور کیجئے" وزیر جنگ نے اپنے پھیپھڑے کی ساری قوت صرف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بات تو معقول ہے لیکن ہم لوگ تادیب کے معاملہ میں بہت سخت تھے" جواب ملا۔

"لیکن سپاہی تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں"

"ضرور" بوڑھے فیلڈ مارشل نے زور دیتے ہوئے کہا" یہ ہمارے لئے ایک ورنی وقت ہے۔ چوبیس چوکے!— آٹھ نہیں نہیں چھ بار تین سو اور پینسٹھ ......"

وزیر جنگ مایوسانہ انہیں اس حسابی سرسام میں چھوڑ کر دفتر وزارتِ جنگ کو روانہ ہوگئے۔

دن کے اختتام پر انہوں نے دربار عالی میں آنکھ میں آنسو لاکر اس امر کا اقرار کیا کہ اُنکی ساری محنت قطعی رائیگاں ثابت ہوئی۔ فوج کا کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا اور نہ کوئی ایسا کاغذی ثبوت ہی موجود ہے۔

اس عرصہ میں انجنیروں کے ایک جم غفیر نے اس خطہ کا کونہ کونہ ناپ ڈالا لیکن اُسے نہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا۔

زار کی اس معمہ کے حل کیلئے بیچینی بیان کرنی مشکل ہے۔ صلح نامہ تو تقریبًا بھول ہی گیا تھا۔ دوسرے دن بھی وہی حال رہا۔ خانساماں نے محل کے سارے ملازمین سے باری باری گفتگو کی لیکن سب لاحاصل۔ ملازم سائبان سے گذرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے:

"آخر سپاہی وہاں کیوں تعینات کیا گیا ہے؟"

تیسرے دن زار نے ہر صوبہ میں ایک اعلان بھجوایا کہ ایک ہزار روبل انعام اُس شخص کو دیا جائیگا جو اس معمہ کا صحیح حل بتائے۔

جھروکے کے اوپر ایک بوڑھی عورت شاہی میز پوش کیلئے کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ اس ہنگامہ میں سوائے ایک جوان دائی کے جو اُس کا کھانا پہونچانے پر مقرر تھی، اُسے سب بھول بیٹھے تھے۔ اسکی پیٹھ مسلسل کام کرنے سے کمان ہوگئی تھی۔ اپنی جوانی میں وہ گذشتہ زارینہ یعنی موجودہ زار کے دادی کی دایہ رہ چکی تھی۔

"خدا خیر کرے وہ قاصد کیسا اعلان کررہے ہیں؟" بوڑھی دایہ نے کہا" کوئی جنگ تو نہیں ہونے والی ہے"

"کیوں تم نے نہیں سُنا؟" جوان چھوکری چہک کر بولی" اسی نگوڑے سپاہی کے بارے میں"

"کون سپاہی؟"

"گھانس کے میدان والا"

"کونسا گھانس کا میدان؟"

"وہی جہاں لوگ تیراندازی کی مشق کرتے ہیں۔ اسکے ٹھیک بیچوں بیچ ایک سپاہی تعینات ہے۔ یہ جاننے کیلئے کہ وہ کس چیز کی حفاظت کررہا ہے سب دیوانے ہورہے ہیں"

"اُسے توسبکو جاننا چاہیئے" بوڑھی دایہ نے کہا "تم لوگوں پر خُدا کا رحم! اللہ نے تم لوگوں کو کتنا کمزور دماغ دیا ہے؟"

"لیکن جانتا کوئی نہیں" جوان چھوکری بولی "اس معمّہ کے حل کے لئے ایک ہزار کا انعام مقرر ہوا ہے"

"میری بچی!" بوڑھی دایہ نے مُسکراتے ہوئے کہا "تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ چل میرا ہاتھ پکڑ کر شہنشاہ کے پاس لے چل"

غرض جوان دایہ اُسے نیچے لے گئی اور جب وہ زار کے سامنے پہونچے تو بوڑھی دایہ نے کورنش کے بعد عرض کیا "اگر حضور کا حکم ہو تو میں اس کا حل عرض کروں۔ سالہا سال گزر گئے جب زارینہ یعنی حضور کی دادی صاحبہ دُلہن تھیں اُنہوں نے تیر اندازی کا ایک مقابلہ کروایا تھا کیونکہ دربار کی بیگمات اس زمانہ میں اس فن کی بڑی ماہر ہوا کرتی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ حضور عالیہ کا نشانہ سب سے اچھا تھا۔ تیر اندازی سے بہتر خوبصورت ہاتھوں اور سینہ کی نمائش کا کوئی بھی طریقہ نہیں۔

غرض ساری بیگمات جمع ہوئیں اور پہلی باڑھ کے بعد سب اپنے اپنے تیر کو دیکھنے کے لئے دوڑیں۔ لیکن حضور عالیہ یکایک ٹھیر گئیں اور سب کو ٹھیرنے کو کہا۔ وہ گھٹنے کے بل جھک گئیں اور ساری بیگمات اُنکے گرد جمع ہو گئیں۔ ٹھیک میدان کے بیچ انکی نظر سال کے پہلے گل بنفشہ سے دوچار ہو رہی تھی۔

زار، آپ کے جدِامجد صاحب بھی اس حقیر بنفشہ کے مدّاحوں کے پاس آن پہونچے۔ کسی نے کہا کہ یہ اچھا شگون ہے کیونکہ حضور عالیہ اُمید سے تھیں۔ خُدا کی شان دیکھئے کہ ولادت ہوئی اور آپ کے والد محترم پیدا ہوئے۔ حضور نے فوراً ایک سپاہی طلب کیا اور اُسے اس پھُول کے پاس تعینات کیا کہ اس کو بیگمات کے دستبرد سے بچائے۔ اِس غریب سپاہی کے لئے یہ ذرا بھی آرام وہ جگہ نہ تھی۔ تیر اکثر اس کے قریب سے ہو کر گذرتے۔ تیر اندازی کا مقابلہ ختم ہو گیا لیکن لوگوں کی حفاظت کی غرض سے وہ وہیں تعینات رہا اور اسوقت تک ہے ــــ"

"لیکن بنفشہ کا پھول؟" زار نے پوچھا۔

وہ وہاں گئے اور ڈھونڈھنا شروع کیا۔ بنفشہ کے پھُول کا پتہ بھی نہ تھا۔ مدّت ہوئی کہ وہ ناپید ہو چکا تھا۔

لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ سپاہی وہاں سے ہٹا لیا گیا اور کچھ مُدّت کے بعد لوگ اُس کو اور اُس جگہ کو بھی بھول بیٹھے۔

ایک دن مالی کی پنج سالہ بچی ماں کے پاس دوڑتی ہوئی آئی۔ ایک پھُول اس کے ہاتھ میں تھا جو کھیلتے ہوئے اُسنے تیر اندازی کے میدان میں پایا تھا۔

"دیکھو ماں! سال کا پہلا گُل بنفشہ"

غرض بنفشہ کا پھُول پھر زندہ ہو گیا۔ جب سپاہی کا سخت جوتہ اس کو کچلنے کے لئے موجود نہ تھا۔ داستان کا یہ حصّہ کبھی محل تک نہ پہونچ سکا۔

(کیتو) ــــــــــــ شمسی کاکوی

طفلی کے خواب

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں

دل ہو اسیرِ گیسوئے عنبر سرشت میں
اُلجھے انہی حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں

چھیڑا ہے سازِ حضرتِ سعدیؔ نے جس جگہ
اُس "بوستاں" کے شوخ عنادل میں ہم بھی ہوں

گائیں ترانے دوشِ ثریا پہ رکھ کے سر
تاروں سے چھیڑ ہو، مہِ کامل میں ہم بھی ہوں

آزاد ہو کے کشمکشِ علم سے کبھی
آشفتگانِ عشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگانِ شعلۂ محمل' میں ہم بھی ہوں

دل کو ہو شاہزادیٔ مقصد کی دھن لگی
حیرانِ سُراغِ جادۂ منزل میں ہم بھی ہوں

صحرا ہو خارزار ہو، وادی ہو آگ ہو
اک دن انہی مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

دریائے حشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامنِ ساحل میں ہم بھی ہوں

اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیمِ دہر کے
اُن چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں

اسرار الحق مجازؔ
بی۔اے (علیگ)

باغی لڑکی

(اپنی سنجوگتا کے نام)

نہ پوچھ اے دوست برپا حُسن نے کیسی قیامت کی
خُدا رکھے وہ لڑکی ناز پروردہ ہے فطرت کی

اُسے فطرت نے اب تک دامنِ مریم میں پالا ہے
سحر کی مسکراہٹ کو سُبک سانچے میں ڈھالا ہے

منقش ہو گیا ہے دستِ فطرت کا کمال اُس میں
شفق کا رنگ اُس میں، موجۂ بادِ شمال اُس میں!!

وہ حُسن و عشق کی دُنیا میں رومانوں کی دیوی ہے
وہ ملکہ ہے جوانی کی، وہ طوفانوں کی دیوی ہے

وہی ذی قدر نوشابہ کا پُرتمکیں جمال اُس میں
وہی بلقیس کی سطوت، زبیدہ کا جلال اُس میں

چراغِ محفلِ فطرت وہ شمعِ بزمِ امکاں ہے
وفا اُسکی شریعت ہے محبّت اُس کا ایماں ہے

جبیں میں اُسکی صبحِ عہدِ آزادی جھلکتی ہے
بغاوت حُسن بنکر اُسکی آنکھوں سے ٹپکتی ہے

محبّت کی چمک غلطاں ہے اُسکے نرم سینے میں
سمندر بجلیوں کا موجزن ہے آبگینے میں

ادائے ناز میں مڑتے ہوئے سیلاب کی اک رو
ملائم بازوں میں شہپرِ جبریل کا پر تو

حقیقت سے بدل ڈالا وفاؤں کے فسانے کو
محبّت کیلئے ٹھکرا دیا اُس نے زمانے کو

وفا کا راز کھولا اُسنے دُنیا کی نگاہوں پر
وہ بجلی بن کے ٹوٹی رسم کی قرباں گاہوں پر

جلا ڈالے رواج و رسم کے جھوٹے نقاب اُسنے
نظر سے توڑ ڈالے جگمگاتے آفتاب اُس نے

بہت اُونچے سُروں میں اُسنے دل کے ساز کو چھیڑا
لرز اُٹھی فضا، تھرا گئے دل ہل گئی دُنیا

وہ مشعل لیکے نکلی عشق کی تاریک راہوں پر
چراغِ طور چمکایا "محبّت کے گناہوں" پر

بہت مسموم کانٹے تھے مگر کلیوں کے دامن میں
لگا دی اِس سرے سے اُس سرے تک آگ گلشن میں

وفا نے اسکی واضح کر دیا الفت کے معنوں کو
ہنسی نے اُسکی پھیکا کر دیا دُنیا کے طعنوں کو

نہ چھوڑیں اعتبارِ عشق کی خودداریاں اُس نے
گوارا کیں محبّت کے لئے رسوائیاں اُس نے

کلی بارش کی طغیانی میں جیسے مسکراتی ہو
ہوا کے تند جھونکوں میں کوئی لو جگمگاتی ہو

شگفتہ ہو کنول کا پھول جیسے تیز دھارے پر
بھرے طوفاں میں کشتی آ لگے جیسے کنارے پر

مخالف قوتوں کو دل کی نرمی سے کچل ڈالا
سُبک کشتی نے طوفانی ہوا کا رُخ بدل ڈالا

بدل ڈالی فضا اُس نے، بدل ڈالا جہاں اُس نے
نئے سر سے کہی "سنجوگتا" کی داستاں اُس نے

جاں نثار اختر

ایک لڑکی

(اس کہانی میں کوئی کیرکٹر قطعی فرضی نہیں ہے)

۱

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ۱۹۳۷ء یادگار رہیگا کیونکہ اس سال ہندوستانی مسلمانوں کے واحد دارالعلوم میں سرکاری طور پر مخلوط تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ قصّہ بھی دلچسپ ہے کہ کس طرح یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اس سنسنی خیز تبدیلی کے لئے قانوناً مجبور کئے گئے۔ ننانوے سال پہلے ہندوستان کے مشہور قوم پرست جرنلسٹ اور سماجی کارکن سلیم الزماں صحافی نے مسلم یونیورسٹی کے ممبران کورٹ واگزکٹو کونسل کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا تھا جس میں ان بزرگانِ قوم پر قومی امانت کے ناجائز مصرف کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔

سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جتنا روپیہ جمع کیا گیا تھا وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے تھا نہ کہ فقط مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لئے اور حکومت نے جیسا یونیورسٹی کا چارٹر منظور کیا تھا تو اس میں بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ یونیورسٹی تمام مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ یہ کہیں تخصیص نہ کی گئی تھی کہ مسلمانوں سے مُراد فقط مسلمان مرد ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں سلیم الزماں صحافی نے مشہور زبان دانوں کا فیصلہ پیش کیا تھا کہ لفظ مسلمان "عورتوں اور مردوں" دونوں کے لئے یکساں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس نے مقتدر علمار دین سے بھی ایک فتویٰ حاصل کیا تھا جس میں انہوں نے متفقہ طور پر اعلان کیا تھا کہ گو اکثر مسلمان مردوں پر کسی نہ کسی مولوی نے کبھی نہ کبھی کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ لیکن عورتوں کو ایک جماعت کی حیثیت سے اس وقت تک اسلام سے خارج نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر سلیم الزماں صحافی کا دعویٰ تھا کہ اتنے عرصے تک یونیورسٹی کے دروازے لڑکیوں کے لئے بند رکھکر ممبرانِ کورٹ واگزکٹو کونسل قومی روپے کے ناجائز استعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔

یہ مقدمہ جب یکم اپریل ۱۹۳۸ء کو پہلی بار علی گڈھ کے کلکٹری عدالت میں پیش ہوا تو تمام ملک میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ مسٹر جناح کی مسلم لیگ، ہزہائینس آغاخاں کی مسلم کانفرنس، مولانا شوکت علی کی خلافت کمیٹی، مولوی مظہرالدین کی جمعیۃ العلمار، صدر یار جنگ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر خالص اسلامی انجمنوں نے تیرہ ہزار دو سو ستاون جلسے کئے جن سب میں کُل تعداد حاضرین کی تیرہ ہزار ایک سو پچاس نفوس تھی۔ اس کے علاوہ سلیم الزماں صحافی پر ستائیس مفتیوں نے کفر کے فتوے لگائے اور ستّرہ اخباروں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس سے روپیہ لیکر کھا گیا ہے۔ مسٹر جناح سے درخواست کی گئی وہ اپنے چودہ نکات میں ایک پندرھویں نکتے کو اور شامل کریں کہ ازل سے لیکر ابد تک مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کبھی جاری نہ کی جائیگی۔ سیٹھ اللہ دیا کی صدارت میں مسٹر علی محمد جناح نے بھنڈی بازار بمبئی کے مسلمانوں کو خالص انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "گو میں "ایک علمار" نہیں ہوں مگر سلیم الزماں صحافی کی ہندو پرست حرکت کی سخت مذمت کرتا ہوں"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "مسلمان کی حیثیت سے وہ مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کے اجراء کے سخت خلاف ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنی صاحبزادی کو کبھی علی گڈھ بھیجنے کا خیال بھی نہ کیا اور یورپ کے مخلوط اداروں میں تعلیم دلوائی۔ آخیر میں آپ نے پانچ ہزار روپے روز پر اپنی قانونی خدمات یہ مقدمہ لڑنے کیلئے مسلم یونیورسٹی کو پیش کیں جس پر بھنڈی بازار کے مسلمانوں نے "اللہ اکبر" کے نعرے بلند کئے کیونکہ انگریزی سے ناواقف ہونے کے باعث وہ سمجھے تھے کہ مسٹر حنا نے بیکار ویلے روزگار مسلمانوں کو فاقے سے بچانے کے لئے پانچ ہزار روپے چندے کا اعلان کیا ہے۔ اس جلسہ کے بعد مسٹر حنا نے ایک بیان شائع کیا کہ جب تک کانگریس اپنے گرگوں سے ایسے مقدمے دائر کراتی رہیگی وہ کانگریسی لیڈروں سے فرقہ وارانہ مصالحت کی گفتگو نہ کریں گے۔ اور یہ بھی کہا کہ بھنڈی بازار کے جلسے نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلم عوام بھی اس رائے میں مسٹر حنا کے ہم خیال ہیں۔ اس بیان کی تائید سر ابوالبقا اور سر امین خاں نے کی جنہوں نے کہا کہ نہرو رپورٹ کے بعد یہ مقدمہ مسلمانوں کی قومی زندگی پر کانگریس کا دوسرا حملہ ہے۔

یہ تھی زبردست ابتدا اس مقدمے کی جو ننانوے برس تک مختلف عدالتوں میں چلتا رہا اور اس عرصے میں تیرہ مرتبہ پریوی کونسل میں پیش ہوا۔ سلیم الزماں صحافی کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے رحیم الزماں صحافی نے اس مقدمے کو جاری رکھا۔ اور اس کے بعد اس کے لڑکے کلیم الزماں صحافی نے۔ اس عرصے میں ہندوستان میں کئی انقلابات ہوئے اور حکومتیں تبدیل ہوئیں لیکن مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوا۔ ۲۰۳۲ء میں جب کلیم الزماں صحافی کا انتقال ہوا تو یہ مقدمہ ورثے میں اس کی اکلوتی بیٹی سلمہ صحافی کو ملا۔ اگلے ہی سال جب تیسری سوراج حکومت قائم ہوئی تو اس نے فوراً طے کر دیا کہ مسلم یونیورسٹی کے افسران کو لڑکیوں کا داخلہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر انہوں نے اپنا یہی طرز عمل جاری رکھا تو حکومت یونیورسٹی کی عمارتیں ضبط کر کے وہاں ایک چڑیا گھر قائم کر دے گی۔

اس فیصلہ پر مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی یونین نے مبارکباد کا ریزولیوشن پاس کیا۔ ہارون ناصری کی تجویز اور حامد عباسی کی تائید پر بجٹ میں دو سو روپے خواتین طالب علموں کے بیٹھنے کے لئے مخملی صوفوں کے واسطے منظور کئے لیکن ایک سال تک وہ مخملی صوفے بیکار پڑے رہے کیونکہ کوئی لڑکی داخل نہ ہوئی۔ علماء نے فتویٰ دیدیا تھا کہ مخلوط تعلیم حرام ہے۔ اور مشکل یہ تھی کہ قدامت پسند گھرانوں نے ان فتووں کے ڈر سے اپنی لڑکیاں نہ بھیجیں اور جو آزاد خیال گھرانوں کی لڑکیاں تھیں وہ علی گڈھ جیسی فرقہ پرور اور پرانے خیال کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے خلاف تھیں۔ آخر کار گو وہ بھی اس دقیانوسی تعلیم کے خلاف تھی جو علی گڑھ میں دی جاتی تھی۔ اگلے سال خود سلمہ صحافی کو وردھا کی قومی یونیورسٹی چھوڑ کر علی گڈھ میں داخلہ لینا پڑا۔ تاکہ اپنی صنف کا حق قائم کرے۔

جسوقت سلمہ صحافی کے داخلہ کا فارم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مولوی ابو العلم کے پاس پہونچا تو وہ سخت پریشان ہوئے اور دوڑے وائس چانسلر شیخ رحیم الدین کے پاس گئے۔ وہ دونوں مخلوط تعلیم کے سخت خلاف تھے لیکن سلمہ صحافی کا داخلہ کرنے سے انکار کرنا حکومت کے فرمان کی خلاف ورزی تھی۔" اس کمبخت لڑکی کو داخل تو کرنا ہی پڑیگا" مولوی ابوالعلم بولے "لیکن طالب علم لڑکیوں کے لئے کچھ ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے گھبرا کر وہ یونیورسٹی میں داخلے کا خیال ہی چھوڑ دے۔"

اگلے روز یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل کا جلسہ منعقد ہوا تاکہ صورت حال پر غور کیا جائے۔

نواب طاؤس یار جنگ اچکانی نے تجویز پیش کی کہ طالب علم لڑکیوں کے لئے ایک خاص بورڈنگ ہاؤس تعمیر کیا جائے جسکی دیواریں دوسو بیس گز اونچی ہوں اور اس بورڈنگ سے لیکر لکچر کے کمروں تک ایک سرنگ بنائی جائے جس کے ذریعے سلمہ صحافی لکچر سننے جایا کرے۔ اسکے علاوہ ہر لکچر روم میں چاروں طرف سے بند ایک کوٹھڑی بنائی جائے جس میں سرنگ کا راستہ نکلتا ہو اور اس کوٹھڑی میں بجائے دروازے یا کھڑکی کے چار باریک سوراخ ہوں جن میں سے پروفیسر کی آواز پہونچ سکے۔ اس تجویز کی زبردست موافقت مولانا النعمان نے کی اور بالاتفاق رائے منظور ہوگئی۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالصدیق رشیدی نے تجویز پیش کی کہ جس طرح طالبعلم لڑکوں کے لئے سیاہ بند گلے کا کوٹ اور اٹھارویں صدی ٹرکی کی ٹوپی پہننا لازمی تھا۔ اسی طرح طالب علم لڑکیوں کے لئے برقعہ پہننا لازمی قرار دیا جائے۔ یہ تجویز بھی منظور کرلی گئی۔ اب خداوندانِ یونیورسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اُن کو یقین تھا کہ سلمہ صحافی کبھی یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے گی۔

سلمہ کو جب اِن قوانین کا علم ہوا تو وہ بڑی گھبرائی، لیکن کچھ سوچکر اُس نے محکمۂ تعلیم وحفظانِ صحت کو ایک خط لکھا اور ان قوانین کی طرف توجہ دلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر تعلیم نے ڈانٹ کر وائس چانسلر کو ایک خط لکھا۔ کہ ایسے قوانین بنا کر حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے پر آئندہ سخت سزا دی جائے گی۔ اس کے علاوہ محکمۂ حفظانِ صحت کے ایک انسپکٹر نے یونیورسٹی کا معائنہ کرتے ہوئے لڑکیوں کے بورڈنگ اور سرنگ دونوں کو خلاف قانون قرار دیکر مسمار کرا دیا۔ اگزکٹو کونسل کا ایک جلسہ فوراً صورت حال پر غور کرنے کے لئے منعقد کیا گیا۔ مولوی ابوالعلم نے فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی کا مسلک ہمیشہ حکومت کی اطاعت رہا ہے۔ اس کے لئے اُن کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سلمہ صحافی کو بے پردہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیدیں۔ وائس چانسلر نے بھی کہا کہ بحالتِ مجبوری انکو ایسا ہی کرنا ہوگا۔ باقی آٹھ ممبرانِ کونسل نے کہا "جیسا آپ کا حکم سرکار" اور جلسہ برخاست ہوگیا۔

(۲)

مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں اتنا بڑا انقلاب کبھی نہ ہوا تھا جتنا ایک لڑکی سلمہ صحافی کے داخل ہونے پر ہوا۔ وہ شہر کی مزدور لڑکیوں کے ہوسٹل میں رہتی تھی جو بیسویں صدی کے ایک نواب مضمحل اللہ کے شاندار محل میں قائم کیا گیا تھا۔ جب صبح کو وہ کالج جاتی تو ہر شخص کی نظر اس کی طرف اُٹھتی۔ وہ حسین نہ تھی لیکن نوجوان عورت علی گڑھ میں ہمیشہ سے ایک نایاب شے رہی ہے۔ یہ پہلی بار تھی کہ یونیورسٹی کے چند ہزار طالب علموں نے ایک لڑکی کو طالب علم کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ سلمہ نے بیسویں صدی علی گڈھ کے متعلق عجیب وغریب قصے سُنے تھے کہ اس زمانے میں اگر اسٹیشن پر سے کسی ریل میں کوئی حسین لڑکی گزرتی تھی تو تمام یونیورسٹی میں ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔

پہلے پہل سلمہ کو اس قدر عالمگیر توجہ کا مرکز بننا بُرا معلوم ہوا لیکن کچھ عرصے بعد وہ اس کی عادی ہوگئی۔ سب سے بڑا انقلاب اس کی کلاس یعنی ایل ایل۔ بی ء پر یویس میں ہوا تھا۔ ایک سو اکیاون طالب علموں میں وہ اکیلی لڑکی تھی۔ ان سب کی توجہ کی وہ واحد مرکز تھی۔ جب سے اس نے داخلہ لیا تھا ان تمام لڑکوں میں بیّن تبدیلی نظر آتی تھی۔ جو تیسرے دن ڈاڑھی

مونڈتے تھے وہ اب روز شیو کرنے لگے۔ جو ہمیشہ میلے کپڑے پہن کر آتے تھے، وہ اب صاف کپڑے پہن کر آنے لگے۔ جن کے کوٹوں پر سالوں سے کبھی برش نہ ہوا تھا اُن کے کوٹ اب چمکنے لگے۔ جن کے بالوں میں ہفتوں کبھی کنگھا نہ ہوتا تھا انہوں نے کلاس میں آتے وقت بھی جیب میں شیشہ کنگھا رکھنا شروع کر دیا۔ سب سے بڑا کمال یہ ہوا کہ تقریباً تمام طالب علم اب لکچر کے وقت حاضر رہنے لگے۔ ورنہ ایل، ایل۔ بی۔ پریویس میں کبھی ۲۵ فی صدی سے زیادہ لڑکے حاضر نہ ہوتے تھے۔ باقی سب دوستوں سے پُراکسی بلوا کر کام چلاتے تھے۔ جس دن سے سلمہ صحافی نے داخلہ لیا لکچر روم بھرا رہنے لگا۔ فائنل کلاس کے طلبا بھی کسی نہ کسی بہانے سے آکر بیٹھنے لگے۔ پروفیسر کی زندگی میں بھی سلمہ صحافی کی موجودگی نے کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ بھی اچھے کپڑے پہن کر آنے لگے جن کے کوٹ پر ہمیشہ چاک کی سفیدی پڑی رہتی تھی وہ کلاس میں آنے سے قبل نہایت احتیاط سے کوٹ کو برش کرنے لگے، سٹاف روم میں ایک آئینہ، کنگھا، کپڑوں اور بالوں کے برش رکھے گئے۔

کلاس کے تمام لڑکوں میں سلیم اور انور سلمہ میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دونوں یونیورسٹی کے با اثر اور مشہور طالبعلموں میں شمار ہوتے تھے۔ سلیم ٹینس کلب کا سکریٹری اور بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ سومنگ باتھ میں مچھلی کی طرح تیر تا تھا اور یو۔ ٹی۔ سی۔ کا سارجنٹ تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک قابل رشک صحت اور سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اُس کو اپنے مردانہ حُسن پر کافی ناز بھی تھا اور جب اُس نے سلمہ صحافی میں دلچسپی لینی شروع کی تو سوائے انور کے اُس کی رقابت مول لینے کی کسی نے ہمت نہ کی۔ انور اتنا حسین نہ تھا جتنا سلیم۔ وہ کھلاڑی بھی نہ تھا مگر پڑھنے لکھنے میں وہ سب سے تیز تھا۔ اُس نے اوّل درجے میں انگریزی ادب کا ایم۔ اے کیا تھا۔ یونین کا بہترین مقرر اور میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اُس کے افسانے اور نظمیں ملک کے اکثر قدامت پسند رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ بھی سلمہ صحافی میں دلچسپی لیتا تھا۔ اور کلاس میں جب ممکن ہوتا کوئی ادبی یا قانونی بحث چھیڑ کر اُس سے بات کرنے کا موقع نکال لیتا۔ انور اور سلیم قدامت پسند خاندانوں کے لڑکے تھے۔ ان دونوں کے لئے عورت ایک نامعلوم جنس تھی اسی لئے وہ بیسویں صدی کے شاعر مزاج طالب علموں کی طرح ہر اُس لڑکی میں جس سے کسی طرح انکی ملاقات ہو جائے اسقدر دلچسپی لیتے تھے۔

اُن کی کلاس میں ایک لڑکا احسان اللہ پڑھتا تھا۔ جس کی بدقسمتی سے سات بہنیں تھیں۔ یہ سب لڑکیاں دہلی کی قومی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ لیکن چھٹیوں میں اکثر علی گڑھ اپنے بھائی سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ اس لئے کلاس کے تقریباً تمام لڑکے احسان اللہ سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر موقع پر اُس کی آؤ بھگت ہوتی اور نوجوان پروفیسر بھی اُس کا خیال رکھتے۔ سلیم اور انور نے خاص طور سے احسان میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سلیم اُس کو روز ٹینس کھیلنے بلاتا اور کلب کی فیس اُس کے بجائے خود دیدیتا۔ انور اصرار کرتا کہ احسان اُس کے ساتھ ملکر امتحان کے لئے پڑھے۔ دونوں اُس کی دعوتیں بھی خوب کرتے۔ شروع شروع میں تو احسان ان سب عنایات کو دوستی پر محمول کرتا رہا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ دونوں اس سے زیادہ اُس کی بہنوں میں دلچسپی رکھتے تھے جس دن اس کی بہنیں دہلی سے آتیں سلیم اور انور اُس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے اور اُس کی بہنوں کی خاطر مدارات میں ضرورت سے زیادہ انہماک دکھاتے، حالانکہ وہ سب ملکر ان دونوں کو بیوقوف بناتی تھیں۔ احسان ہمیشہ سے منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ ایک دن جب اُس کو انور اور سلیم کی حرکتوں سے سخت کوفت ہوئی تو اُس نے

اپنی بہنوں کے سامنے ہی ان سے صاف صاف کہہ دیا: "دیکھئے صاحب، اس وقت آپ دونوں بھی موجود ہیں اور میری بہنیں بھی آپکو ان میں سے جس جس سے دلچسپی ہو صاف کہہ دیجئے۔ اُن کی مرضی ہو تو وہ آپ سے دوستی کریں۔ مگر مہربانی کر کے میری جان چھوڑ دیجئے"
اُس دن سے انور اور سلیم اور احسان اللہ کے تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اُن کو کسی نئے شکار کی تلاش ہوئی۔ جب سلمہ صحافی نے داخلہ لیا تو دونوں نے علیحدہ علیحدہ کوشش شروع کی کہ اس سے دوستی بڑھائی جائے۔

ایک صبح خالی گھنٹہ میں سلمہ برآمدے میں اکیلی کھڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر لڑکوں کا ایک گروہ کھڑا اُس کی طرف گھور رہا تھا۔ سلمہ کو اس قسم کی حرکتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور ہنسی بھی۔ غصہ اس لئے کہ خواہ مخواہ اس کو کوئی کیوں اس طرح گھورے اور ہنسی اس بات پر کہ علی گڈھ کے یہ تعلیم یافتہ لڑکے اس قدر دقیانوسی تھے کہ اکیسویں صدی میں بھی ایسی حماقتیں کرتے تھے۔ اُسکو اپنے ڈسک میں اکثر گمنام عاشقانہ خطوط ملتے تھے۔ ایک بار تو ایک نامعلوم عاشق نے ایک قیمتی فاؤنٹین پن اسی طرح پر تحفہ دیا تھا۔ روزانہ ڈسک کے اُوپر گلاب کے پھول رکھے ملتے۔ لیکن ان سب مجنوں صفت حضرات میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کھلم کھلا اس سے بات بھی کر سکے۔ سلمہ کھڑی ان سب باتوں پر غور کر رہی تھی کہ سلیم صاحب اپنا بہترین سوٹ پہنے بالوں میں دھڑیوں لگائے اور فلم اسٹاروں جیسی موچھیں بنائے ہوئے نازل ہوئے۔

"مس سلمہ صحافی" اُس نے بیسویں صدی کے انداز میں اس قدر جھک کر کہا کہ سلمہ کو ہنسی آگئی۔ "آپ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟ ..... ہاں ..... وہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی کھیل کیوں نہیں کھیلتیں؟ دیکھئے آپ کی رنگت زرد ہوئی جا رہی ہے۔ وہ تو آپنے سنا ہی ہوگا کہ۔ All work and no play Makes Jack a dull boy.
اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وردھا میں ٹینس کی بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ تو آپ ہمارے سومنگ باتھ کلب میں آج شام کو ٹینس کھیلنے آئیے نا؟"

وہ سانس لینے کے لئے رکا تو سلمہ نے کہا: "شکریہ۔ میں اب تک تو اس لئے کھیلنے نہ آئی تھی کہ شاید وائس چانسلر صاحب لڑکوں کے اخلاق خراب کرنے کے جرم میں مجھے یونیورسٹی سے نہ نکال دیں۔"

سلیم اپنے آپ کو آزاد خیال اور ترقی پسند سمجھتا تھا: "ارے آپ بھی کیا کہتی ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال دیں۔ ہم سب یونیورسٹی چھوڑ دیں گے۔ آپ شاید مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ پچھلے سال ٹکڑوں میں میٹھا کم ہونے پر میں نے ایک ہفتے تک ڈائننگ ہال کا اسٹرائک کرا دیا تھا۔ آپ بے فکر ہو کر آج ہی سے کھیلنے آئیے"

سلمہ نے اپنی جان چھڑانے کے لئے وعدہ کر لیا اور کہا کہ وہ اسی مقام پر شام کے پانچ بجے ملے گی اور پھر دونوں اکٹھے سومنگ باتھ لان پر ٹینس کھیلنے جائیں گے۔

سلیم اُس سے رخصت ہو کر خوش خوش اپنے کمرے کی طرف چلا۔ راستے میں سوچتا جا رہا تھا کہ mixed doubles میں سلمہ کو اپنے ساتھ کھلائے گا تاکہ "پارٹنر، پارٹنر" پکار کر پہلے ہی دن بے تکلفی بڑھائے۔ ہوسٹل کے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا کہ بغل میں کتابیں دبائے انور آتا ہوا ملا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ گھنٹہ تو خالی ہے۔" اُسنے کہا۔

"اوہ میں تو ایسے ہی جا رہا ہوں۔" انور نے جواب دیا۔ "ذرا لائبریری سے چند کتابیں لانی ہیں۔"

مگر ہوسٹل سے نکلتے ہی بجائے لائبریری کے انور نے لیکچر روم کا رُخ کیا۔ سلمہ اب تک برآمدہ میں کھڑی تھی۔ قدم بڑھاتے ہوئے اس کے پاس پہونچکر اس عاشقِ جانباز نے بھی تنہائی میں گفتگو کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً تقریر شروع کر دی۔

"مس سلمہ صحافی۔ آداب عرض۔ گستاخی معاف کیجئے گا مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کورس کی کتابوں کے علاوہ عام لٹریچر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ آپ کو لائبریری میں بھی کبھی آتے نہیں دیکھا۔ اس طرح لاپرواہی سے تو آپ کی واقفیت عامہ صفر ہو کر رہ جائیگی۔"

سلمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تازہ کتابیں تو میرے پاس برابر آتی رہتی ہیں۔ مگر میرا خیال تھا کہ یونیورسٹی لائبریری میں شاید میرے کام کی کتابیں نہ ملیں۔ میں نے سُنا ہو کہ یہاں اشتراکی لٹریچر کی ممانعت ہے۔"

"اوہو آپ بھی کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں۔" انور نے جلدی سے کہا۔ "اب تو جب سے قومی حکومت قائم ہوئی ہے ہمارے پرووائس چانسلر صاحب نے حکم دیا ہے کہ لائبریری میں انقلابی کتابوں پر سے ممانعت اٹھالی جائے۔ ..... ہاں تو آپ میرے ساتھ لائبریری تشریف لے چلئے۔ گھنٹہ بھی خالی ہے۔"

"معاف کیجئے گا۔ اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے لیکن اگر آپ شام کو پانچ بجے مجھے اسی جگہ ملیں تو ہم اکٹھے لائبریری چلے چلیں گے۔"

انور نے سوچا یہ بھی اچھا رہے گا۔ شام کو جب سب کھیل کے لئے چلے جاتے ہیں لائبریری تقریباً سنسان ہوتی ہے سلمہ صحافی سے اکیلے میں خوب باتیں ہو سکیں گی۔

۳

انور خوش خوش "آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا" گاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سلیم کو "پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں" گاتا ہوا پایا۔ ان کے کمرے کا تیسرا شریک آزاد حسب معمول پلنگ پر لیٹا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ جاسوسی ناول پڑھنا اور سونا یہ آزاد کے محبوب مشغلے تھے۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو کسی شعبۂ حیات میں بھی امتیاز نہیں حاصل کر سکتے۔ نہ وہ پڑھائی میں ہشیار تھا۔ (ہر بار تیسرے درجہ میں پاس ہوتا تھا۔) نہ وہ کھلاڑی ہی اچھا تھا۔ یونین میں کسی نے آج تک اُس کو بولتے نہ سُنا تھا۔ اور نہ اُس نے میگزین میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ ملنا جلنا بھی وہ کم تھا۔ اور اپنے کمرے کے رفیقوں سے بھی وہ بوقت ضرورت ہی بات کرتا تھا۔ وہ خوبصورت بھی نہ تھا۔ چہرے پر موٹر سائیکل سے گرنے کے کئی نشانات موجود تھے۔ سانولا رنگ تھا، معمولی قد، خشک اور سخت بال، جن میں شاید دن میں ایک بار بھی کنگھا نہ ہوتا تھا۔ غرض اس میں کوئی ایسی صفت نہ تھی کہ وہ عام طالب علموں یا صنفِ نازک میں مقبول ہو سکتا۔ اور نہ وہ لڑکیوں میں غیر ضرورت دلچسپی کا اظہار ہی کرتا تھا۔ انور اور سلیم کے رومانی مشغلوں کو وہ غیر متعلق دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ نہ وہ اُسکو اپنے رازوں میں شریک کرتے اور نہ وہ کبھی اسکی کوشش کرتا۔

آج سلیم اور انور کی غیر معمولی بشاشت سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کو پھر رومانی کیڑے نے کاٹا ہے مگر اُسنے اُن سے سوائے علیک سلیک

کے کوئی بات نہ کی اور اپنا جاسوسی ناول پڑھتا رہا۔

"تم اتنے خوش کیوں نظر آتے ہو؟" انور نے سلیم کے گانے سے تنگ آکر کہا۔

"تمہیں کیوں بتاؤں" سلیم نے بگڑ کر جواب دیا۔ "مگر میں کہتا ہوں کہ تمہیں آج کونسا خزانہ پڑا پا گیا ہے کہ خوشی سے پھٹے جا رہے ہو؟"

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ انور اور سلیم دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس میں کپڑے تلاش کر رہے تھے۔

"ارے چھدو۔ ارے چھدو" انور نے نوکر کو پکارا "وہ درزی میرا سوٹ لایا یا نہیں؟"

"اور وہ میرا بلیزر جس کی آستین کھولنے کے لئے دیا تھا وہ آیا یا نہیں؟" انور نے سوال کیا۔

جب معلوم ہوا کہ درزی حسب معمول وعدے کے مطابق کپڑے نہیں لایا تھا تو دونوں نے ملکر اُس کو بُرا بھلا کہا۔ اسکے بعد آزاد کا ٹرنک ٹٹولا گیا کہ شاید اس میں کچھ پہننے کے قابل کپڑے نکلیں۔ مگر وہاں کیا ملتا۔ وہ تو جاڑے کا موسم ایک گہرے پتلون اور گرمی سفید قمیص اور خاکی نیکر پہن کر گذار دیتا تھا۔

کھانا کھا کر سلیم نے سائیکل سنبھالی تو انور نے پوچھا "اس لُو اور گرمی میں کہاں چلے"

"تمہیں کیوں بتاؤں کہ درزی کے یہاں جا رہا ہوں" سلیم نے کہا اور سائیکل پر بیٹھ روانہ ہو گیا۔ اُسکے چند منٹ بعد انور نے آزاد کی سائیکل سنبھالی۔

"میں نے کہا، شاعر صاحب" آزاد نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا "کسی کے تیر نظر سے میری سائیکل میں پنکچر نہ کرا لائیگا"

درزی کے یہاں سے کپڑے لیکر چلے تو انور کو خیال ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ نیا جوتا بھی تو ہونا چاہیے۔ اور سلیم کو یاد آیا کہ اُس کا ٹینس کا جوتا ذرا پُرانا ہو چلا تھا۔ جوتوں والے کے برابر میں ایک جنرل مرچنٹ کی دوکان تھی۔ انور نے ایک نئی ٹائی بھی خرید ڈالی۔ سلیم نے ایک ریشمی مفلر لیا۔ انور نے نئے بلیڈوں کا ایک پیکٹ لیا تو سلیم کو یاد آیا کہ اسکی Face Cream ختم ہو گئی ہے۔ سلیم نے ریشمی رومال خریدا تو انور نے سینٹ کی شیشی۔

غرض تین بجے کے قریب دونوں دوست لدے پھندے واپس کمرے پہونچے۔ آزاد سو رہا تھا۔ مگر دیر تک نہ سو سکا۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ بھونچال آگیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو انور اور سلیم کمرے کے واحد آئینے میں بیک وقت ڈاڑھی مونڈنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اور خوب گالم گلوچ اور چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ اِسی جھگڑے میں انور نے اپنا گال کاٹ لیا۔ اور آزاد نے اُٹھکر خون روکنے کے لئے پھٹکری لگا دی تو اتنے زور سے چلایا کہ آس پاس کے کمرے والے سمجھے کوئی قتل ہو گیا ہے۔

غرض بڑی مشکل سے تقریباً ساڑھے چار بجے دونوں دوست سج دھج کر تیار ہوئے۔ بالوں میں Anzora ڈالا گیا۔ مانگ پٹی کی گئی۔ چہرے پر کولڈ کریم کی مالش ہوئی۔ مگر حالت قابل رحم تھی۔ اتنی سخت گرمی کے باوجود انور نے کلپ دیا ہوا سخت کالر لگایا تھا جس نے اُس کی گردن کو طوق کی طرح جکڑ دیا تھا۔ اس پر غضب یہ کیا کہ نہ صرف کوٹ پہنا بلکہ واسکٹ بھی۔ سلیم نے بھی اپنی شان جمانے کے لئے یونیورسٹی کے رنگوں کا اونی بلیزر پہنا تھا۔ غرض دونوں کا

پسینہ کے مارے برا حال تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" انور نے سلیم سے پوچھا۔

"تم کوئی ٹھیکہ دار ہو؟" سلیم نے کٹ کر جواب دیا۔ "اور دیکھتے نہیں ہو کہ ٹینس کھیلنے جا رہا ہوں۔ مگر تم بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو؟"

سلیم نے میز پر سے دو کتابیں اٹھا کر بغل میں دباتے ہوئے جواب دیا "دیکھتے نہیں ہو لائبریری جا رہا ہوں"

خدا خدا کر کے پونے پانچ بجے یہ دونوں روانہ ہوئے تو آزاد کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس نے تکیہ کے نیچے سے اپنا جاسوسی ناول نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

۴

یونیورسٹی کے کلاک ٹاور نے چھ بجائے تو انور نے سلیم سے کہا "بس بھائی اب چلو۔ انتظار کی حد ہو گئی۔ اس لڑکی نے آج ہم دونوں کو بیوقوف بنا دیا"

دونوں دوست ایک گھنٹے سے ٹہل رہے تھے ایک دوسرے کو ایک ہی مقام پر دیکھ کر تعجب ضرور ہوا تھا اور آپس میں فقرے بازی بھی ہوئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد دونوں نے قبول دیا کہ اصل مقصد ان کے آنے کا کیا تھا۔ جب چھ بج گئے اور سلمہ صحافی نہ آئی تو انہوں نے اس کو برا بھلا کہنے کے بعد طے کیا کہ اب کہیں ٹہلنے چلا جائے۔

سومنگ باتھ رسٹران میں شربت پینے کے بعد انہوں نے باتفاق رائے کھیتوں کا رخ کیا۔ ریلوے لائن کو پار کر کے پگڈنڈی پگڈنڈی باتیں کرتے جا رہے تھے کہ کچھ فاصلے پر دو سائیکلیں پڑی دیکھیں۔ ان دونوں سائیکلوں کو وہ پہچانتے تھے۔ فوراً جھجک گئے اور کھیت کی آڑ لے کر ادھر ادھر ہوشیاری سے نگاہ کی تو برابر کے کنوئیں کی منڈیر پر آزاد اور سلمہ صحافی کو بیٹھا ہوا پایا۔ اس ایک نگاہ میں تعجب، غصہ اور انتقام کی خواہش تمام جذبات موجود تھے۔ غرض صورت حال پر مفصل تبصرہ تھا۔ آزاد اور سلمہ باتیں کر رہے تھے۔ کان لگا کر سنا تو انور اور سلیم دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ کیونکہ ذکر خیر ان کا ہی تھا۔

"کاش تم ان کو دیکھتے۔ انور نے مفلر باندھ کر اس پر گرم کوٹ پہنا۔ اور سلیم نے نہ صرف سخت کالر لگایا بلکہ واسکٹ بھی پہنی۔ پسینہ کا یہ حال تھا کہ خدا کی پناہ" اور دونوں نے اتنے زور سے ہنسنا شروع کیا کہ انور اور سلیم سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور وہ الٹے قدم واپس لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ خاموش چلتے رہے۔ پھر دونوں بیک وقت بولے:۔

"بدلہ لیں گے"

"بدنام کریں گے"

کچھ دور واپس گئے تھے کہ ان کا ایک کلاس فیلو فضل الدین مل گیا۔ یہ بھی یونیورسٹی کے عاشق مزاجوں میں سے تھے۔ مگر حال ہی میں شہر کے اسکول کی اپنے سے عمر میں دس برس بڑی ایک دیسی عیسائی ہیڈ مسٹرس کے عشق میں زک اٹھا چکے تھے اس لئے فی الحال عورتوں کی قوم سے بغض رکھتے تھے۔ انور اور سلیم نے نہایت رازدارانہ طریقے پر فضل الدین کو آزاد اور

سلمہ کے "پکڑے جانے" کا "واقعہ" سُنایا۔ اور ساتھ میں یہ بھی کہا "بھائی کسی سے کہنا مت۔ کسی کو بدنام کرنے سے ہمیں کیا فائدہ؟"

ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ "واقعہ" یونیورسٹی کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔

۵

اور پھر وہ دن آیا جب مسلم یونیورسٹی میں ایک لڑکی بھی نہ رہی۔ "زبانِ خلق" سے تنگ آکر سلمہ اور آزاد دونوں نے نام کٹا لیا۔ سلمہ وردھا واپس چلی گئی اور آزاد اپنے جاسوسی ناولوں کا پلندہ اُٹھا اپنے وطن چلا گیا۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ نے 'بورڈ گاؤں' کے زمیندار کی سالگرہ کی خوشی میں ایک کالم سیاہ کرنے کے بعد چند لائنیں اس واقعہ پر بھی لکھیں اور لکھا کہ "یہ خوشی کی بات ہے کہ مس سلمہ صحافی کے جانے کے بعد یونیورسٹی ایک خطرناک عنصر سے پاک ہو گئی۔"

حامد عباسی کی تجویز اور ناصر ہارونی کی تائید پر یونین نے سلمہ صحافی کی جرأت کو سراہتے ہوئے ریزولیوشن پاس کیا۔ ایک دوسرے ریزولیوشن سے یہ طے پایا کہ جو مخملی صوفے لڑکیوں کے لئے بنوائے گئے تھے اُن کو فروخت کر کے اس روپے سے سلمہ صحافی کا ایک مجسمہ یونین ہال کے سامنے لان میں نصب کیا جائے تاکہ اُس زمانے کی یادگار رہے جب یونیورسٹی میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔

حکومت کے قوانین کی رُو سے طالب علموں کی انجمن خود مختار جماعت تھی۔ اس لئے یونیورسٹی کی ایگزکٹیو کونسل اس ریزولیوشن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی۔ اور بہت جلد مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ اُسی سال یونیورسٹی کے بجٹ میں ایگزکٹو کونسل نے دس روپے کی رقم "طالبعلموں کے اخلاق کی حفاظت کی تدابیر" کے لئے منظور کی۔ اِس رقم سے ایک بُرقع سلوایا گیا اور وہ سلمہ صحافی کے مجسمہ کو اُڑھا دیا گیا۔

اور مدّت تک یہ بُرقعہ سلمہ صحافی کے مجسمہ پر ڈھکا رہا اور ہوا میں پھڑ پھڑا کر قریب سے گذرنے والوں کو عبرت دلاتا رہا۔

مگر ۱۹۴۸ء میں جس سال ہندوستان میں پہلی بار اشتراکی حکومت قائم ہوئی ایک خوفناک زلزلہ آیا جس میں بنارس اور علیگڈھ یونیورسٹیوں کی تمام عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ مگر سلمہ صحافی کا مجسمہ اسی طرح قائم رہا۔ زلزلہ کے ساتھ ہی ایک زبردست آندھی چلی جو اس تاریخی بُرقع کو اُڑا کر لے گئی۔

خواجہ احمد عباس

ادب اور زندگی

ادب اور زندگی کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ اور اِن دونوں میں بڑا مضبوط ارتباط ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ادب زندگی کا شارح اور اس کا ترجمان ہے۔ اور زندگی ادب کا ایک آئینہ ہے جس میں اُس کے تمام خدوخال نظر آتے ہیں۔
زندگی عبارت ہے مختلف عناصر کی ترکیب و اجتماع سے اگر اُن میں انتشار پیدا ہوجائے تو موت واقع ہوجاتی ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب		موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

پھر زندگی میں انسان کو طرح طرح کے حوادث اور واقعات سے گزرنا پڑتا ہے۔ جن کے زیر اثر اُس کی نفسانی زندگی اور اُس کی کیفیات عجیب گوناگوں اور تغیر پذیر ہوتی ہیں کبھی اُس پر خوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ ہنس پڑتا ہے پھر کبھی اُس پر حزن و یاس کی اُداسی طاری ہوتی ہے اور وہ غمگین و ملول ہوجاتا ہے۔ عشق محبت کی شادکامیاں، دشمنوں سے رنجشیں، گردشِ لیل و نہار کی آفتیں، حوادث روزگار کی مصیبتیں، عروج و ترقی، تنزل و انحطاط، مسرت و غم، خندہ و گریہ، الغرض یہ سب کچھ زندگی میں پیش آتا ہے۔ اور انسان کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ادب ان تمام جذبات و کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور ادب کے حُسن و قبح کے مطابق اس ترجمانی میں لطافت و کثافت پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر نہ صرف یہ کہ ادب اس کی ترجمانی کرتا ہے، بلکہ وہ ہم کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہم حوادث کا مقابلہ کس طرح کریں، رنج و غم کا استقبال کیونکر کریں۔ دُنیا کی مسرتوں اور خوشیوں کو کس نظر سے دیکھیں، میدان ترقی میں کس بلند ہمتی و عالی حوصلگی کے ساتھ قدم اُٹھائیں۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمارا کیا معاملہ ہونا چاہیئے۔ یگانوں اور بیگانوں کی پہچان کیا ہے۔ دوست کون ہوتا ہے اور دُشمن کسے کہتے ہیں۔ محبت کیوں ہوتی ہے، اور کس سے ہوتی ہے۔ محبت کے آداب کیا ہیں؟ مناظرِ فطرت سے ہمیں کس قدر دلچسپی لینی چاہیئے۔ وہ ہمیں کیا اسباق سکھاتے ہیں۔ دریا کی روانی، آبشاروں کا شور، طوفانی موجیں، ہوا کا بہنا، غرضکہ یہ سب اپنے اندر ہمارے لئے کیا پیغام رکھتے ہیں۔

الغرض ادب زندگی کی ہر کیفیت میں ہمارے لئے بہترین رہنما ہے۔ وہ مجلس طرب و نشاط میں بہترین جلیس و ندیم ہے۔ اور محفل عزا و ماتم میں مونس و غمخوار، وہ تنہائی میں شریکِ غم ہوتا ہے۔ اور دشوار گذار زندگی کے سفر میں ہمارا رفیق درد نواز۔ ادب ہماری زندگی کو سنوارتا ہے۔ خیالات و احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ قوتِ ارادی کو مستحکم کرتا ہے۔ اخلاقی پاکیزگی و طہارت سکھاتا ہے۔ دُنیا میں رہنا اور زندگی بسر کرنا بتاتا ہے۔ ادب زندگی کے پُرخطر راستوں میں مشعلِ راہ اور چراغِ ہدایت ثابت ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ غم و اندوہ کی فراوانی سے زار و نزار ہو رہے ہیں۔ آپ کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے اور ایک ایک پل برس ہو کر گزر رہا ہے، اس حالت میں اگر آپ کو غالب کا یہ شعر یاد آجائے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں		موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا ذوق کا یہ شعر ورد زبان ہوجائے ؎

اے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اُسے ہنس کر گزار دے

یا اکبر الہ آبادی کا یہ شعر نظر سے گزر جائے ؎

اِن مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر
قیدِ ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

تو اِن اشعار کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ آپ کا غم و الم سکون پذیر ہو جائے گا۔ اور یہ اشعار دل کے زخموں پر مرہم کا کام دے جائیں گے۔

اسی طرح فرض کیجیے ایک شخص دُنیوی افکار و آلام میں گرفتار ہے۔ اُسے کسی طرح کشمکشِ روزگار سے نجات نہیں ملتی۔ زندگی اُس کے لئے وبالِ جان ہو گئی ہے اور بارِ ہستی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ زندگی کی بے ثباتی کا تصور کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ دُنیا میں ہر طرح کے حالات آتے ہیں اور یونہی گزر جاتے ہیں۔ تصوّرات کے اسی سلسلہ میں اُسکو حالی کے یہ شعر یاد آتے ہیں ؎

بُری اور بھلی سب گزر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی

رہیں گے نہ ملّاح یہ دن سدا
کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی

تو یقینی بات ہے ان اشعار کو گنگنانے سے اس ہیجانِ غم و اضطراب کو سکون ہو جائے گا۔ اور پھر وہ ایک ٹھنڈا سانس بھر کے خاموش ہو جائے گا۔

فرض کیجیے ایک شخص کسی کام کیلئے انتھک کوششیں کر رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی اس غریب کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ وہ بار بار اُٹھتا ہے مگر ناکامیابی کا تصور اس کو بٹھا دیتا ہے۔ اب وہ اُمید و خوف کی عجیب کشاکش میں مبتلا ہے۔ کہ اتنے میں اس کو یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

رہروِ راہِ محبت تھک نہ جانا راہ میں
لذّتِ صحرانوردی دوریٔ منزل میں ہے

یا مولانا حالی کا یہ شعر اُس کی زبان پر آجاتا ؎

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تُو نے

تو لازمی طور پر اِن اشعار سے متاثر ہو کر اُس میں پھر ایک بار جوشِ عمل، ولولۂ کار، اور اُمنگ و حوصلہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس میں عمل کرنے کی قوّت و حرارت نمایاں و ہویدا ہو جائیگی۔ غرض کہ ادب زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اور تاریکیوں میں اُجالا کرتا ہے۔ وہ ہمارے جذبات کا ترجمان اور احساسات کا شارح و مفسّر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کا ادب اسکی تمدنی و معاشرتی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور کوئی قوم اُسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس کا ادب ترقی یافتہ نہ ہو۔ بلکہ یوں کہیے کہ ادب ترقی پذیر ہوتا ہے تو قوم خود ترقی حاصل کر لیتی ہے۔ اور قوم ترقی کرتی ہے تو اُسکے سبب سے اس قوم کا ادب خود بخود ترقی پاتا اور عروج و برتری حاصل کرتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ ہم آجکل بہت اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ یورپین اقوام ترقی یافتہ ہیں تو اُنکا لٹریچر بھی اعلیٰ اور برتر ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کا تنزل و انحطاط ہے اسی لئے اسکا ادب بھی اسی حال میں ہے۔ غرض یہ ہے کہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُسکی بقا سے اِسکی بقا اور اُسکے عُروج و زوال سے اسکا عروج و زوال لازم آتا ہے۔

جمشیدہ شمیم

پریم کہانی

ان دنوں ہمارے گاؤں میں ایک اجنبی سادھو آیا ہوا تھا۔ اُس کی عمر قریباً تیس پینتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر شکل و صورت سے وہ کافی معمر معلوم ہوتا تھا۔ زمانے کی دستبرد اُس کے چہرے پر اپنے اثرات چھوڑ چکی تھی۔ برگد کے ایک پرانے درخت کے نیچے اُس نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ تمام دن وہ جھونپڑی میں دروازہ بند کئے پڑا رہتا اور شام کے وقت دروازے کے قریب پیال بچھا کر باہر آ بیٹھتا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہم اُس کے گرد جمع ہو جاتے اور وہ ہمیں ہر روز دُور دراز ممالک کی دلچسپ حکایات سُنایا کرتا۔

آج اُس نے اپنی پریم کتھا سُنانی شروع کی۔

"مَیں موضع بنسی پور میں پیدا ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو میدان کی پُرشور آبادی سے دُور کوہستانی علاقہ میں واقع تھا۔ اردگرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور گاؤں میں داخل ہونے کیلئے پیچ در پیچ گھاٹیوں میں سے گذرنا پڑتا تھا' جو تھوڑی بہت کاشت کے قابل زمین گاؤں والوں کے قبضہ میں تھی وہ نہایت جانفشانی سے اس میں کھیتی باڑی کرتے۔ کیونکہ انکی گذران زیادہ تر اسی زمینداری پر موقوف تھی۔ گاؤں کے قریب ہی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ایک پہاڑی ندی بہتی تھی۔ جس کا شفاف پانی بنسی پور کے لہلہاتے کھیتوں کو شاداب کیا کرتا تھا۔

بنسی پور کے کسانوں کے ہاں غلّہ افراط سے پیدا نہیں ہوتا تھا اور جو کچھ بھی ہوتا وہ نہایت محنت شاقہ کے بعد۔ تاہم اُنکی زندگی خوب مزے میں بسر ہوتی تھی۔ گاؤں کے ماہی گیر اور نوجوان پو پھٹتے ہی اپنے اپنے جال کندھوں پر رکھے دوپہر کا کھانا تھیلوں میں بھر کر ندی کے کنارے پہونچ جاتے اور دن بھر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے۔ عورتیں بچوں کی دیکھ بھال کرتیں۔ گاؤں کی دوسری جانب ایک مقام پر شیریں پانی کا دھارا بہتا تھا جو شاید کسی برفانی چشمہ سے نکل کر آتا تھا۔ اس دھارے کا نام 'بنسی دھارا' تھا۔ شام کے وقت جبکہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طلائی کرنیں پہاڑوں کی سفید پوش چوٹیوں کو شفق آلود بنا دیتی تھیں بنسی پور کی کنواری لڑکیاں اس دھارے کے قریب جمع ہو کر چہل' گانے اور تفریح میں تھوڑا وقت گزارتیں اور جب وہ پانی بھر کر گاؤں کو واپس ہونے لگتیں تو مچھیرے دن بھر کے شکار سے واپس ہوتے ہوئے کھوؤں کے عمق میں گھاٹیوں کے درمیان پیچ در پیچ راستہ طے کرتے ہوئے شام کی تاریکی میں سایہ کی مانند اُوپر چڑھتے ہوئے نظر آنے لگتے۔ اور کوہسار کے سکوت میں انکی سیٹیوں اور بانسریوں کی دلگداز آوازوں سے گونج سی پیدا ہو جاتی۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرا باپ گاؤں کا پدھان یعنی چودھری تھا۔ ابھی مَیں دو برس کا تھا کہ میری ماں مر گئی اور میری پرورش کا سارا بوجھ میرے والد کے سر آن پڑا۔ اس کے حصہ کی تھوڑی سی زمین تھی جسے وہ نہایت جانفشانی سے کاشت کرتے اور غلّہ کی آمدنی پر ہم گذر اوقات کرتے۔ بچپن کا زمانہ میرے لئے نہایت بے فکری و لاپرواہی کا زمانہ تھا۔ سارا سارا دن کھیل

کو دیں مصروف رہتے ہوئے دُنیاوی کاہشوں کا علم ہی نہ ہوتا۔ تمام بچّوں میں سب سے خوبصورت گاؤں کے جوشی پانڈے کی معصوم لڑکی جمنا تھی۔ جمنا کا باپ خاصی ہندی جانتا تھا اور وہ گاؤں کے بچّوں کو ہندی کی ابتدائی تعلیم دیا کرتا۔ جمنا اور مَیں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے باعث ایک دوسرے سے حد درجہ مانوس ہو چکے تھے۔ میں عمر میں جمنا سے کوئی دو برس بڑا تھا ہم دونوں میں بیحد محبت تھی اور ہمارے والدین ہماری معصوم محبت سے باغ باغ تھے۔ ہم اکثر مٹّی کے گھروندے بناکر کھیلتے۔ یا گڑیوں سے دل بہلاتے۔ بعض اوقات ایک بُڑھیا کے پاس جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی جاکر پُرانی کہانیاں سُنتے۔ پہیلیاں بوجھتے یا کوئی اور پُرلطف کھیل کھیلتے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا کہ گاؤں کے سب لڑکے اور لڑکیاں کھیل میں شریک ہوتے۔ جمنا کسی فرضی ملک کی شہزادی بنائی جاتی۔ مَیں خود کسی دوسرے مُلک کا شہزادہ بنتا۔ دیگر لڑکے لڑکیاں ہماری فوج کے سپاہی بنتے۔ ہم دونوں میں جنگ ہوتی۔ جمنا کو شکست ہوتی اور میں اسے اپنی ملکہ بناکر اپنے مُلک کو لے جاتا۔ یہ کھیل نہایت دلچسپ ہوتا۔

ساون کا مہینہ ہمارے لئے سب سے زیادہ خوشگوار ہوتا۔ اُودی اُودی گھٹائیں سربفلک پہاڑوں سے باتیں کرتی مستانہ وار آتیں۔ سارا سارا دن بادل گرجتے۔ بجلیاں کوندتیں۔ اور بوندیاں پڑنے لگتیں۔ نیلگوں آسمان پر جب سارس میدانوں کی طرح پرواز کرتے نظر آتے تو سب بچّے انہیں دیکھکر شور و غل مچانے لگتے۔ ندی کا پانی اُچھل اُچھل کر کناروں سے باہر بہنے لگتا۔ میں اور جمنا دیر تک آم کے درختوں میں پڑے ہوئے جھولے جُھلانے میں محو رہتے۔ غرضکہ ہمارا عہدِ طفلی انہی پُرکیف مصروفیتوں میں بسر ہوتا رہا۔

زندگی کے نشیب و فراز پہاڑی خطہ کی اُونچ نیچ میں گزرتے گئے۔ زمانے کی گردش کے ساتھ دن اور رات بھی گردش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے بچپن سے نکلکر عہدِ شباب میں قدم رکھا۔ اب جمنا کا وہ زمانہ تھا جب ایک لڑکی میں شباب کی رعنائیاں اپنی تمکنت زا اداؤں اور مسحور کُن انداز کے ساتھ جذب ہونے لگتی ہیں اور وہ ریاضِ حُسن کا ایک غنچہ نوشگفتہ نظر آنے لگتی ہے ---- ایک ایسا غنچہ جسے ہر دیکھنے والا فوراً حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اسے توڑنے کی بے ساختہ کوشش کرتا ہے۔ گو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ توڑ لینے کے بعد اس کا حُسن زائل ہو جائے گا ---- واقعی جمنا نہایت حسین و جمیل دوشیزہ بن چکی تھی۔ اس کی مخمور و سیاہ ملکوتی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اُس کے گُلابی رُخساروں میں دلرُبائی اور موتی جیسے دانتوں میں بجلی کی سی چمک دمک تھی۔ اسکے سڈول اور خوبصورت اعضا میں جنگلی ہرنی کا سا تناسب اور مورنی کی سی نزاکت تھی۔ اگرچہ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا تاہم اب وہ بچپن کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ فطرتاً ہمارے درمیان حجاب رونما ہو چکا تھا۔ اب میں زیادہ دیر تک جمنا سے باتیں نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ مَیں دیکھتا کہ اُس کی آنکھوں میں حیا جلوہ فگن ہونے لگتی۔ لہٰذا ہم صرف ایک دوسرے کو دیکھنے پر ہی اکتفا کرتے۔

شام کے وقت مَیں بانسری لئے ہوئے بلنی دھارے کی طرف نکل جاتا اور کسی اُونچی چٹان پر بیٹھکر بانسری بجانے لگتا۔ میرے ارد گرد اکثر سماں نہایت دلآویز ہوتا۔ پہاڑی خودرو پھولوں کی خوشبو میں بسے ہوئے سرد جھونکے اس طرح آتے جیسے کسی شاعر کی خیالی جنت کے دروازے کھول دئے گئے ہوں۔ سیاہ بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان پر سفید بگلوں کی

قطاریں۔قریب کے پہاڑی جنگل سے مست طاؤس کی پکاریں ایک سحر ہوتا جس سے مُردے زندہ ہوسکتے تھے۔ دھانے کی طرف سے جب گاؤں کی پری جمال لڑکیاں سروں اور کولھوں پر پانی سے بھرے ہوئے مٹکے اُٹھائے عشق پیچاں کی بیل کی طرح بل کھاتی اور ہرنیوں کی طرح رقص کرتی، آپس میں ایک دوسری کو چھیڑتی۔ پہاڑی گیت عجیب وغریب ترنم کے ساتھ گاتی گاؤں کی طرف آتی دکھائی دیا کرتیں تو میں جھوم جھوم کر بانسری بجانے لگتا۔ جمنا پانی کا مٹکا سر پر اُٹھائے سب سے پیچھے ہوتی اور خاموشی سے نیچی نظریں کئے چلی جاتی۔ میری بانسری کی آواز پر خجالت سے اُس کے گال سُرخ ہوجاتے اور وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھکر تیز تیز قدم اُٹھانے لگتی۔ یوں تو بنسی پور کے نوجوان لڑکوں کی مشتاقانہ نگاہیں بے اختیار جمنا پر پڑا کرتیں اور ہر دل پھینک نوجوان یہی چاہتا کہ جمنا اسی کی آغوشِ تمنا کی زینت بنے۔ مگر سب سے زیادہ جمنا کا شیدائی ایک ماہی گیر کا لڑکا رتن تھا۔ اسکی انتہائی خواہش تھی کہ کسی طرح جمنا سے اس کا بیاہ ہوجائے۔

چونکہ میرا باپ گاؤں کا پردھان تھا اس لئے میری خواہش معلوم کرکے وہ جمنا کو اپنی بہو بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور ساون کے ایک خوشگوار دن کو میرا اور جمنا کا بیاہ ہوگیا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی اور جمنا سولہ سال کی تھی۔ اب ہمارے دن نہایت شادابی ومسرت میں گزرنے لگے۔ میں والد کے ساتھ کاشت کرتا کیونکہ فصل ہی ہم غریبوں کی زندگی کا سہارا ~~تھا~~ تھی۔

میری شادی کو بمشکل ایک برس گزرا ہوگا کہ ایک عجیب مصیبت ٹوٹ پڑی۔ چند دنوں سے سننے میں آرہا تھا کہ قرب وجوار کے دیہات میں طاعون کی مُہلک بیماری بیدردی سے لوگوں کو شکار کررہی ہے۔ اِن خبروں سے گاؤں کے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور ہر شخص خوفزدہ اور متوحش نظر آنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خوفناک وبا کا دیوتا بنسی پور پر بھی مسلط ہوگیا۔ ایک ہی دن میں کئی کئی موتیں واقع ہونے لگیں۔ گھر گھر صف ماتم بچھ گئی۔ رات کے سکوت میں شور وشین کی آوازیں جنگلی درندوں کی چنگھاڑوں سے بھی زیادہ ہیبتناک معلوم ہوتی تھیں۔ چند روز میں پورے خاندانوں کا صفایا ہوگیا۔ مُردہ جسم کئی کئی روز تک بے کفن پڑے رہے۔ ایک بوڑھے ماہی گیر کے پانچ جوان بیٹے یکے بعد دیگرے ایک ہی دن میں نذرِ اجل ہوگئے۔ بچے یتیم، سہاگنیں بیوہ اور ماں باپ بے سہارا ہوگئے۔ کوہستانی علاقہ کے خانہ بدوش لوگ جو پہاڑی گپھاؤں یا درختوں کے پتوں سے بنائی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اس طرح خوفزدہ ہوئے کہ اپنے اکثر اقربا کو حالتِ نزع ہی میں چوٹی پر سے کسی گہری کھڈ میں لڑھکا دیتے۔ کئی پسماندگان بیماری سے بچ کر بھاگنے کی ناکام کوشش میں راستوں پر بے جان پائے گئے۔ الغرض تمام کوہستانی خطہ میں ایک قیامت برپا تھی۔ جس نے آناً فاناً گاؤں کے گاؤں صاف کردئے۔ میرے والد اور جمنا کے والدین بھی طاعون کے شکار ہوگئے۔ ہم دونوں کو اس صدمہ سے سخت رنج ہوا تاہم جب خدا خدا کرکے وبا فرو ہوئی تو گاؤں کے دیگر بچے کھچے لوگوں کی طرح ہم بھی زندگی کی تگ ودو میں محو ہوگئے۔

میں اب تنہا نہایت محنت سے کھیتی باڑی کرنے لگا کیونکہ اسی پر ہمارا دارومدار تھا۔ مگر بدقسمتی سے اگلے برس ندی میں اسقدر

طغیانی آئی کہ بہت سے پکے ہوئے کھیت تباہ ہو گئے۔ اور غلہ کا سخت قحط ہو گیا۔ ایک ماہ اسی پریشانی و سراسیمگی میں بسر ہوا۔ چند روز بعد میں نے جنگ کی افواہ سنی۔ غریب اور بیکار نوجوان لڑائی میں جانے کیلئے دھڑا دھڑ بھرتی ہو رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کیلئے فوجی ملازمت کا ارادہ کیا۔ اور ایک دوست کی وساطت سے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جب میں جنگ کو جانے کے لئے گاؤں سے رخصت ہوا تو جمنا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اُسے دلاسا دیا اور خدا کے بھروسے پر چل کھڑا ہوا۔ جنگ کی تباہی و بربادی کا خوفناک نقشہ جو میں نے دیکھا اُسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیس کو تیاگ کر متواتر کئی برس تک میں بدیس کی صعوبتیں اُٹھاتا رہا۔ اور پورے دس برس بعد جب ملازمت سے فارغ ہو کر میں وطن کو واپس لوٹا تو میرا دل نہایت مطمئن اور طبیعت از حد مسرور تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ دس برس کی طویل مدت کے بعد جب میں اپنی پیاری بیوی کو شکل دکھاؤنگا تو وہ کسقدر مسرور ہو گی اور ہماری آئندہ زندگی نہایت فارغ البالی سے بسر ہو گی۔

انہی خیالات کو دل میں لئے میں گاؤں میں وارد ہوا۔ سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف سکوتِ شب اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھی۔ گاؤں والے دن بھر کی تھکان کے بعد غافل پڑے تھے۔ چاندنی رات تھی اور چودھویں کا چاند پہاڑیوں پر چمک رہا تھا۔ تنویر ریز فضا میں چکور اُڑ رہے تھے۔ دُور شمال کی طرف برف پوش بلند چوٹیاں چاندنی میں چمکتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سیماب کی ایک پتلی سی نہر بہہ رہی ہو۔ جب میں اپنے مکان کے قریب پہونچا تو دروازے سے اندر داخل ہونے کے بجائے میں پُشت پر سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ تاکہ اپنی بیوی کی بیخبری میں اس کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر سکوں۔ جب میں نے کوٹھے پر سے نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میری بیوی جمنا ایک چارپائی پر رتن ماہی گیر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی مزے سے پیار و محبت کی باتیں کر رہی تھی۔ پاس ہی چارپائی پر دو خورد سال بچے سو رہے تھے۔ یہ منظر دیکھکر میرے دل پر ایک بجلی سی گری۔ جس بیوی کی خاطر دیس تیاگ دیا تھا اُسی نے مجھے چھل دیا۔ میں متحیر ہو کر اُلٹے پاؤں کوٹھے سے نیچے اُترا۔ میرا ضمیر مجھے اپنی بدقسمتی پر ملامت کر رہا تھا۔

گاؤں میں ٹھہرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ ندی کے اُس پار پُرانے وقتوں کا ایک چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بڈھا پجاری رہا کرتا تھا۔ وہ مجھے بچپن سے جانتا تھا لہذا میں نے رات اُسی کے ہاں گزارنی چاہی۔ جب میں ندی کو پار کر کے مندر میں داخل ہوا تو بوڑھا پجاری رات کے وقت میرے خلافِ توقع وارد ہونے پر پہلے تو سخت متعجب ہوا لیکن بعد میں مجھے شناخت کر کے اپنے پاس بٹھالیا۔ میں نے اُسے اپنی داستان سُنائی۔ میری بیوی کی بیوفائی کا ذکر سُن کر اُس نے مجھے اصل حالات سے آگاہ کیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ چونکہ پردیس سے مدت تک میری کوئی خبر نہیں آئی تھی اس لئے تین سال بعد رتن نے کسی طرح گاؤں میں یہ خبر مشہور کر دی کہ میں لڑائی میں مارا گیا ہوں۔ اس خبر سے جمنا بہت روئی مگر بالآخر رتن کے سمجھانے بُجھانے سے اُس نے صبر کیا۔ اور چند ماہ بعد ان دونوں کی باہم شادی ہو گئی۔

میں اپنی بیوی کی سرد مہری کا ماتم کرتے ہوئے اسی مندر میں پڑا رہا مگر نیند مطلق نہ آئی۔ یکلخت آسمان پر سیاہ بادل منڈلانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مطلع ابر آلود ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس زور کی بارش شروع ہوئی کہ الامان۔ طوفان

باد و باراں کا وہ شور تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ بادل کی خوفناک گرج۔ بجلی کی لرزہ خیز چمک۔ بارش کا بھیانک شور و غل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضائے بسیط میں دیوتاؤں کی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اور آنِ واحد میں کائنات کے تمام عناصر ترکیبی آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔ تمام شب اسی زور سے مینہ برستا رہا۔ علی الصبح جب ذرا بارش تھمی تو میں مندر سے باہر نکلا۔ گاؤں کی طرف نظر کی تو عجیب عبرت انگیز سماں نظر آیا۔ ندی میں اس زور کی طغیانی آئی تھی کہ دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ سارا گاؤں سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کبھی کوئی آبادی تھی ہی نہیں۔

میرا دل بیوی کے داغِ مفارقت سے پہلے ہی بھرا پڑا تھا۔ اب گاؤں کی تباہی کا منظر دیکھ کر اور بھی اُچاٹ ہو گیا۔ دُنیا کی لذتوں سے میں بیزار ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے جوگ لے لیا اور اب زندگی کے باقی ایام دیس بدیس پھرنے میں گزار رہا ہوں۔"

اتنا کہکر وہ خاموش ہو گیا۔ اسکی درد بھری کہانی سُنکر ہماری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی جب گاؤں کی عورتیں پانی لینے جا رہی تھیں تو انہوں نے سادھو کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا پایا۔ زمین پر خالی گھڑا پڑا تھا اور ایک کونے میں مٹی کا دیا بجھا دھرا تھا۔ ہم میں سے کوئی نہ جان سکا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کہاں چلا گیا۔

ساغر جعفری

وجدانیات

تِرے آتے ہی سب دُنیا جواں معلوم ہوتی ہے
خزاں رشکِ بہارِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

جنونِ سجدہ ریزی کا یہ عالم ہے، معاذ اللہ
ہر اِک چوکھٹ ترا ہی آستاں معلوم ہوتی ہے

اِسے ہر اہلِ دل پہروں مزے لے لے کے سُنتا ہے
مری بپتا حدیثِ دلبراں معلوم ہوتی ہے

کٹے ہیں دن بلاؤں کے سہارے جن اسیروں کے
اُنھیں بجلی بھی شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

مآلِ زندگانی کی حقیقت کُھل گئی جب سے
کسک دل کی متاعِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

خیالِ عیش کی پرچھائیں سے بھی دل لرزتا ہے
نگاہِ حُسن اب کیوں مہرباں معلوم ہوتی ہے

خُدا شاہد ہے میرے بھولنے والے! بجز تیرے
مجھے تخلیقِ عالم رائیگاں معلوم ہوتی ہے

کسی کی جستجو میں وجدؔ اُس منزل پہ پہنچا ہوں
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

سکندر علی وجد

(ایک مکالمہ)

فلسفی اور موت

مقام:- تنگ وتار کمرہ، ایک بھیگی ہوئی رات کا پچھلا پہر، سنسناہٹ، ایک قنوطیت پسند بوڑھا فلسفی تنہا بسترِ مرگ پر لیٹا زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے، اُسکے پیشِ نظر زندگی کی بے روح کیفیتیں ہیں، یکایک موت سیاہ سائے کی صورت میں سرہانے آن کھڑی ہوتی ہے۔ مریض کو شانہ سے ہلاتی ہے، فلسفی مُنہ اوپر کو اُٹھاتا ہے۔ سیاہ سایہ سرہانے رقصاں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔

فلسفی:- (آنکھیں ملتے ہوئے) سیاہ سایہ! میرے اللہ تم کیا ہو!

(سایہ بدستور ناچتا ہے۔ فلسفی اُٹھنے کی سعی کرتا ہے، سایہ اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیتا ہے۔ فلسفی اس وزنی گرفت کی تاب نہیں لاسکتا۔)

فلسفی:- (باہیں ٹیکتے ہوئے) مجھے تاریکی دھوکا دے رہی ہے۔

(بدحواس ہوجاتا ہے، سایہ اُسکے اُوپر جُھک جاتا ہے۔)

سایہ:- مَیں موت ہوں۔

فلسفی:- موت! کتنا بھیانک رقص ہے۔ (سہم جاتا ہے۔ یکایک اسکی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے۔) موت کا سایہ! میں نے تمام عُمر اسی کے انتظار میں صرف کر دی۔ (پہلو بدل لیتا ہے) اے موت کے گُمنام سائے! پیشتر اس کے کہ تُو مجھ پر چھا جائے میری ایک آخری آرزو ضرور پوری کر دے۔ مجھے بتا کہ زندگی کیا ہے؟

سایہ:- (دونوں ہاتھ پھیلا کر) اے راندۂ حیات! تیرا تارِ نفس اب ٹوٹنے ہی والا ہے۔ تو خود ہی رازِ حیات بن جائے گا۔ اور کیا چاہتا ہے۔

فلسفی:- (کانپتے ہوئے) نہیں، اے موت! موت کے بھیانک سائے! قبل اس کے کہ دامنِ جہاں سے میری ہستی کا داغ دُھل جائے میری یہ بات ضرور پوری ہو جائے۔ بتا، ضرور بتا کہ تُو خود انسانی زندگی کا تعاقب کرتا ہے یا بچّہ پیدا ہوتے ہی فطرتاً تیری طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔

سایہ:- میں زندگی کا پیچھا کیوں کروں جبکہ بچّہ اِس جہاں میں آنکھ کھولتے ہی میری طرف لڑھکنا شروع کر دیتا ہے۔ میں ایک ایسی چٹان ہوں جہاں کشتیِ حیات ضرور آکر ٹکر لے گی۔ نوزائیدہ بچے کا ایک ایک سانس موت کی پکار ہوتی ہے۔ وقتِ معیّنہ پر میں خود ہی اس پر غالب آکر سازِ حیات کا آخری تار توڑ دیتا ہوں۔

فلسفی:- گویا موت میں بھی ایک کشش موجود ہے۔ لیکن کیا تم زندگی کا آخری انجام ہو؟

سایہ:- انجام ہوں، لیکن آخری نہیں۔ میری گود میں زندگی کا دورِ ثانی لوری لے رہا ہے۔ مَیں ایک کُدال ہوں، کدال جو پہلی ہی کوشش میں زمینِ حیات کو کھود کر پانی کی سطح تک پہنچ جائے۔ جانتے ہو کہ پانی کے نیچے بھی زمین ہی ہوتی ہے۔ سمجھ لو کہ زندگی کے بعد موت اور پھر زندگی ہی زندگی ہے۔ حیاتِ انسانی مختصر سا خط ہے جس کے مکمّل ہوتے ہی موت اُس پر بطور ایک مہر کے ثبت ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک خط اپنے پتہ پر پہونچکر دوبارہ کھلتا ہے کہ اس کے نفسِ مضمون کا پتہ چل سکے۔ بعینہٖ منزلِ مقصود پر پہنچکر میری مُہر کو توڑ کر نامۂ زندگی کا مُنہ کھولا جائے گا تاکہ داورِ محشر باطنی اعمال کا جائزہ لے سکے۔ نیکی اور بدی میزانِ انصاف میں تل جائے گی۔ خیر و شر کی صدائیں بلند ہونگی۔ انسان اپنے کئے کا پھل پائے گا۔

فلسفی:- (مدھم آواز میں) لیکن اُسکی رحمت!

سایہ:- اس کا ایک قطرہ دونوں جہاں کی وُسعتوں کو سمیٹ سکتا ہے۔

فلسفی:- اے رقصاں سائے، تری باتیں حقیقت ہیں۔ اُن کے سامنے کوئی بڑے سے بڑا فلسفہ یا دقیق منطق نہیں ٹھہر سکتی، تیری باتوں سے مجھے تسکین ہوتی ہے۔ مجھے یہ تو بتا کہ زندگی خواہ کتنی پُرانی ہو چند روزہ کیوں دکھائی دیتی ہے۔

سایہ:- (بھاری آواز میں) حوادثِ زمانہ اور اپنی کشمکشوں میں اُلجھ کر انسان وقت کی اڑان سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کا دل اگرچہ موت کے مفہوم سے ناآشنا نہیں ہوتا لیکن یہ غفلت اُسے بے بس کر دیتی ہے۔ انہی مخمصوں میں گرتا پڑتا وہ اپنے انجام کی طرف لڑھک آتا ہے۔ اسے گزشتہ زندگی موہوم نظر آتی ہے۔

فلسفی:- بالکل ایک خواب، ایک ندی جس کا منبع معلوم نہ ہو۔

سایہ:- زندگی خواب نہیں بلکہ بذاتِ خود تعبیر ہے اس بیدار خواب کی جو قدرت کے بڑے کارخانہ میں آسمان پر ڈھالا جاتا ہے۔ آخری مرحلے پر پہونچکر یہی خواب موت میں بدل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نقوش ایک بار پھر آسمان پر جاکر اُبھریں گے۔ رُوح ایک غیر فانی شے ہے۔

فلسفی:- رُوح! زندگی بھر میرے لئے یہ ایک معمہ بنی رہی۔ مَیں تو اسے ایک ناطق شے سمجھتا ہوں جس کا تعلق جسم سے عارضی ہوتا ہے۔ دوسرے معنوں میں انسانی جسم کے اندر یعنی طاقتِ گویائی ہے۔ اے سائے تجھے قسم ہے اس بڑے داور کی مجھے اس کی حقیقت سے آگاہ کر دے۔

سایہ:- رُوح! یہ رُوح جسم کی طرح فانی نہیں۔ جب جسم سوتا ہے رُوح بیدار ہوتی ہے۔ مَیں خالق کے حکم سے اسے جسم سے جُدا کر کے ابدی نیند سُلا دیتا ہوں۔ رُوح اور جسم میں جُدائی عارضی ہوتی ہے۔ حیاتِ ثانی ایک خُدائی حُکم ہے اس میں تعویق نہیں ہو سکتی۔

فلسفی:- لیکن کیا انسان اس جہان میں دوبارہ جنم لے سکتا ہے؟

سایہ:- دوبارہ جنم محض ایک خیالی بات ہے۔ جبکہ خُدا خود انسانوں کی تخلیق پر قادر ہے۔ رُوح ایک بار آزاد ہو کر ہمیشہ کے لئے اس دُنیا سے پرواز کر جاتی ہے۔ ہر نئے بچّے کی پیدائش اس بات کا پیغام ہے انسانوں کو کہ اُن کا خالق ابھی کارِ تخلیق سے گھبرایا نہیں۔ وہ نت نئے انسان پیدا کر سکتا ہے۔ رُوح ایک آسمانی شے ہے۔

فلسفی:- اگر رُوح آسمانی ہے تو خاکی جسم سے اس کا ملاپ کیونکر ہوا؟

سایہ:- ان دونوں کی تخلیق سے مدّعا ملاپ تھا۔ اس ملاپ ہی سے تو زندگی کی تخلیق ہوتی ہے۔

فلسفی:- صرف ایک بات اور۔ کیا تم انسان کے پاس اُسکے آخری وقت میں مہمان بنکر آتے ہو یا میزبان؟

سایہ:- مَیں زندگی کا مہمان ہوں۔ رُوح کو زندگی سے کھینچ کر مَیں جسم کو بےحس کر سکتا ہوں۔ مَیں تقدیر کا وہ مُنہ زور گھوڑا ہوں جس کی جھپٹ سے زندگی کبھی بچکر نہیں نکل سکی۔ رقاصہ حیات کی دلآویز ادائیں یا ترنّم انگیز نغمے مجھے کبھی متاثّر نہیں کر سکیں۔ مجھے خود اپنے رقص پر ناز ہے خواہ تم اسے بھیانک ہی کہو۔ (تیزی سے ناچنا شروع کر دیتا ہے)

فلسفی:- (ذرا جوش سے) کیا زندگی کے حقِ میزبانی کا یہی صلہ ہے کہ تم اُسے اپنے میں جذب کر لو!

سایہ:- صلہ! زندگی تو بارِ احسان سے میری طرف جُھک جاتی ہے۔ مَیں زندگی کی تکمیل کرنے آتا ہوں۔ دُنیا میں سوائے اس کے کسی اور چیز کی تکمیل ممکن نہیں۔ موت اپنے میزبان کے ساتھ کبھی بے وفائی نہ کرے گی۔ اگرچہ مہمان لاکھ پلّہ چھڑانے کی کوشش کرے۔

فلسفی:- (نرم لہجے میں) تو کیا تم زندگی کے چاند پر داغ کی طرح پیوست ہو جاتے ہو جبھی تو جسم بے رُوح ہو کر زرد نظر آتا ہے۔

سایہ:۔ میں داغ نہیں۔ مجھے ایک بادل کہہ لو جو آسمانِ حیات پر ایک دم چھا جائے۔ لیکن میرا تسلط عارضی ہوتا ہے۔ میرے اُٹھتے ہی زندگی دوبارہ نیلگوں رنگتوں کے ساتھ چمک اُٹھے گی۔

فلسفی:۔ لیکن کیا یہ بالکل سچ ہے۔

(سایہ رقص کر کے خاموشی سے بڑھ کر فلسفی کے اوپر جھکتا ہے۔)

فلسفی:۔ (گھبرا کر) یہ کیا؟۔

سایہ:۔ تمہارا وقت معینہ آپہونچا۔ داور کی طرف سے مجھے یہ حکم ہوا تھا کہ میں چند منٹ پہلے تیرے پاس آکر تیری زندگی کی آخری آرزو پوری کر دوں۔ اب بس۔

فلسفی:۔ اک ذرا سی مُہلت میں پاک دامن ہو لوں۔

(سایہ بدستور خاموشی سے اوپر کو جُھکا رہتا ہے فلسفی اُٹھنے کیلئے باہیں ٹپکتا ہے لیکن ایک کروٹ لیتے ہی زندگی کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ تاریکی میں اس کی خاموش آنکھیں چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے رازِ حیات کو پالیا۔)

(خواجہ) حسن عباس۔ بی۔ اے

ساقی کی نگاہیں اور شراب

اُن بیت نوا سی آنکھوں سے جب کیف کے چشمے پھوٹتے ہیں
پلکوں پہ لئے میخانہ جب ساون کی گھٹائیں آتی ہیں
جب رات کی دیوی چُپکے سے آنکھوں میں نیند انڈیلتی ہے
جب صحنِ چمن سے وقتِ سحر آلام کا بادل پھٹتا ہے
جب درد کے مرہم سے شاعر زخموں کے دہن کو بھرتا ہے
جب درد کی لہریں سینے کے ساحل پر دم بھر اُلجھتی ہیں
جب لیلیٰ مغرب کے در پر سورج کی نگاہیں جھکتی ہیں
جب صحنِ چمن سے وقتِ سحر آلام کا بادل پھٹتا ہے
جب دل کے ساز کو بلا کی مدہوش نگاہیں چومتی ہیں

اور دیکھنے والے بیداری میں نیند کا جوبن لوٹتے ہیں
ہر سمت سے ظالم توبہ شکن، مخمور صدائیں آتی ہیں
اور شام سے لیکر صبح تلک اک ٹیس جگر سے کھیلتی ہے
غنچوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے تبسّم بٹتا ہے
احساس کی تصویروں کو جب قرطاس کی زینت کرتا ہے
الطاف مرے پہلو میں جب کچھ حُسن کی نظریں ڈھونڈتی ہیں
اور درد کے مارے انسان کی کچھ دیر کو آہیں رُکتی ہیں
غنچوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے تبسّم بٹتا ہے
جب تارِ نفس کے پہلو میں نغموں کی گھٹائیں جھومتی ہیں

اُس وقت ملا کر صہبا میں ساقی کی نگاہیں پیتا ہوں
اور حسن کی بیخود کرنوں سے زخموں کو کچھ کچھ سیتا ہوں

الطاف مشہدی

تصحیحِ خیالِ خام

(۱)

مری نظر سے نہاں کب ہیں وہ ”سخن آرا“ | جو شاعروں پہ کئے جا رہے ہیں ظلم صریح
ہے ان کا علم بس اتنا کہ نقل جب کریں | بلا مبالغہ لکھیں ”کریہ“ کو بھی ”کرنح“

(۲)

نہیں ہیں ان کی تراکیب ہی لطیف لطیف | ہیں ان کے بعض اسالیب بھی صبیح صبیح
مگر جو یاد نہیں ہے محل استعمال | خود اپنے جہل کی کرتے ہیں ہر جگہ تصریح

(۳)

یہی رہا اگر ان کی نمود کا عالم | مجھے یہ ڈر ہے کہ روپوش ہو نہ جائیں فصیح
یقیں کے رنگ میں کہتے غزل — تو کہہ لیتی | مگر — یہ کرتے ہیں غالب کے طرز کی تشریح
وہی لغات وہی ہے اضافتوں کی لپیٹ | وہی نکات وہی فاضلانہ ہے تلمیح

(۴)

سخنوراں گرانمایہ کیوں نہ ہوں حیراں | جب ان کے علم کی ہو انکے جہل سے توضیح
وہ ”شعر ساز“ بھی لکھوائیں شاعروں میں نام | جو نقل ٹھیک اتاریں تو پڑھ سکیں نہ صحیح
بنا نہیں کوئی لفظوں کو جوڑ کر شاعر | کریں یہ لوگ اب اپنے خیال کی تصحیح

تم ان سے کس لئے غافل ہوا ے علی منظور!
ہر اک پہ فرض ہے جن کے کلام کی تنقیح

علی منظور حیدرآبادی

شاہی سکورا پارٹی

صدیوں سے جاپان میں سیرِ گُل کا دستور چلا آتا ہے۔ لوگ پھولوں کی سیر دیکھنے جاتے ہیں۔ احباب کو اپنے باغ میں بُلاتے ہیں اور کھانے پینے کے علاوہ نظارۂ گُل کی دعوت کرتے ہیں۔ یوں سیرِ گُل کا کوئی تہوار مقرر نہیں۔ نہ اس کے لئے کوئی موسم مقرر ہے۔ بلکہ جاپان میں ہر مہینہ کسی نہ کسی پھول کی بہار کے لئے مخصوص ہے۔ لوگ بارہ مہینے سیرِ گُل کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ پھر بھی ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ پھولوں کی سیر دیکھنے لوگ برساتی بیر بہٹیوں کی طرح گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ اپریل میں بہار شباب پر ہوتی ہے۔ زمین ہر طرف سبزہ اُگلتی ہے۔ درختوں پر نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں۔ سکورا کے درخت جوش میں آکر پھٹ پڑتے ہیں۔ دو چار پھول نہیں بادل کے بادل کھل جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے، پہاڑیوں کی ڈھلان پر، باغ کے میدان میں، پیازی اور ہلکے گلابی رنگ کے بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جاپانی اس منظر کو دیکھ کر وجد کریں تو کوئی تعجب نہیں۔ ایک ساحرانہ کیفیت ہوتی ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر کوئی رہ نہیں سکتا۔ خوب جشن منائے جاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں شہنشاہِ جاپان کی جانب سے عمائدینِ ملک کو سکورا پارٹی میں مدعو کیا جاتا ہے۔

شاہی پارٹی میں اراکین خاندانِ شاہی کے علاوہ وزرائے سلطنت، اعلیٰ عہدیداران فوج بری و بحری، عمائدینِ مُلک، سفرائے دول اور ان کے سکرٹری بُلائے جاتے ہیں۔ سفرائے دول اپنی حکومتوں کے نائب کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں اور اہلِ مُلک اُس منصب کی رُو سے جو انہیں جاپانی دربار میں حاصل ہے۔ منصب داروں کے آٹھ مدارج ہیں۔ ان میں سے صرف پہلے تین درجے والوں کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے۔ اوّل درجے میں اراکین خاندانِ شاہی ہیں۔ دوسرے درجے میں وزرائے سلطنت، محکموں اور کالجوں کے ڈائرکٹر اور منتخب عمائدینِ ملک ہیں۔ تیسرے درجے میں اعلیٰ عہدیداران اور دیگر عمائدینِ مُلک ہیں۔

غیر ملکی عہدیداروں کو بھی شاہی پارٹی میں شرکت کا موقع مِل جاتا ہے۔ مگر انہیں کو یہ اعزاز نصیب ہوتا ہے جن کو جاپانی دربار کا منصب مِل جائے۔ ملازمین سرکار کو تین سال کی ملازمت سے پہلے یہ منصب نہیں ملتا۔ غیر ملازمین کو تو مدتیں گزر جاتی ہیں۔ مثلاً غیر زبانوں کے کالجوں میں اب تک پندرہ ہندوستانی پروفیسر رہ چکے ہیں۔ سب اس شرف سے محروم رہے کیونکہ کوئی دو تین سال سے زیادہ یہاں نہیں رہا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں پہلا ہندوستانی ہوں جسے دربارِ جاپان کا منصب عطا ہوا ہے اور مسز برلاس کو ملا کر ہمارا پہلا ہندوستانی جوڑا ہے جسے شہنشاہِ جاپان کی جانب سے شاہی پارٹی میں مدعو کیا گیا ہے۔

جیسی پارٹی ویسی ہی شان۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں سکورا پارٹی ہونے والی تھی۔ اس کی شرکت کی اطلاع ہمیں جنوری ۱۹۳۶ء میں سوا سال پہلے دی گئی تھی بلکہ آئندہ چھ سال تک کا پروگرام بنا دیا گیا تھا۔ سرکار اس قدر کثیر التعداد

ہیں کہ دو گروہ بنا دئے گئے ہیں۔ ایک گروہ کو ایک مرتبہ بلایا جاتا ہے اور دوسرے کو دوسرے سال۔ اپریل کے علاوہ ایک پارٹی نومبر میں بھی ہوتی ہے۔ اُس وقت گل داؤدی کی بہار ہوتی ہے۔ نومبر کی پارٹی میں بھی گروہوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ دونوں پارٹیاں شنجُوکُوگیوئیں نامی شاہی باغ میں کھلے میدان میں ہوتی ہیں۔ بارش ہو تو ملتوی کر دی جاتی ہیں۔ جس گروہ کی باری ہوتی ہے وہ خوب دُعائیں مانگتا ہے کہ اللہ میاں دھوپ نکال دے۔ ہم بھی دست بدعا تھے کیونکہ دو سال سے سکورا پارٹی ملتوی ہو رہی تھی۔

چند روز قبل دعوتی رقعہ وصول ہوا۔ یہ ایک پُلندہ تھا جس میں رقعے کے علاوہ کئی کاغذات ملفوف تھے۔ ان میں باغ کے اندر اور باہر کے دو نقشے تھے۔ ایک موٹر پر لگانے کا نشان تھا۔ ایک داخلے کا کارڈ تھا جس میں لباس کے متعلق ہدایات تھیں۔ مہمانوں کو بارہ۱۲ اور دو۲ بجے کے درمیان پہنچنے کی ہدایت تھی۔ چائے نوشی کے لئے چودہ بڑے بڑے احاطے گھیرے جاتے ہیں۔ سفرائے دول کے لئے علیحدہ احاطہ ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں دوسرے احاطے کے ٹکٹ مل گئے۔ یہ احاطہ شامیانے کے بالکل سامنے اور متصل تھا۔

باغ نہایت وسیع ہے جس کا رقبہ ایک سو ساٹھ۱۶۰ ایکڑ سے زیادہ ہے۔ سابق میں ایک نواب کی ملکیت تھا۔ شاہی اختیارات کی بحالی پر حکومت کے قبضے میں آیا اور عرصہ تک محکمہ زراعت کے ماتحت تجربہ گاہ کا کام دیتا رہا۔ بعدہٗ محکمہ محلات شاہی کے تفویض ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں بڑے دروازے کے متصل باضابطہ باغ لگایا گیا۔ شاہی پارٹیوں کے لئے یہی حصہ کام آتا ہے۔ باقی حصے میں کہیں شیشے کے گرم مکانات ہیں جن میں گرم ممالک کے پھلدار اور نایاب پودے لگائے جاتے ہیں۔ کہیں محلات ہیں جو رہائش کے کام نہیں آتے بلکہ دعوتوں اور پارٹیوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں کہیں گالف کے لئے میدان ہیں جہاں اراکین خاندانِ شاہی مشق کیا کرتے ہیں۔

پارٹی کے لئے جو حصہ کام میں آتا ہے اُسے دو قطعوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بڑے دروازے کے اندر گھستے ہی وسیع میدان ہے۔ یہاں مغربی وضع کا باغ لگا ہوا ہے جس میں جا بجا پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ آگے چل کر چائے نوشی کے احاطے ہیں۔ آخر میں شاہی شامیانہ نصب ہے۔ اس میدان کی بغل میں اور عقب میں جاپانی وضع کا باغ ہے۔ جا بجا جھیلیں بنی ہیں جن کی شکل ایسی ہی بے قاعدہ ہے جیسے کسی پہاڑی میدان کی جھیلوں کی ہوتی ہے۔ جھیلوں کے کنارے ڈھلوان ہیں۔ یہی نشیب و فراز منظر کو دلفریب بناتا ہے۔ ڈھالوں پر اور روشوں کے کنارے پر سکورا کے درخت ہیں جو اس موسم میں پوری بہار پر ہیں۔ اس باغ میں یائے زکورا کے درخت لگے ہوئے ہیں جنہیں ہزارا سکورا کہنا چاہیئے۔ ان کی بہار وسط اپریل کے بعد آتی ہے جب یامازکورا اور یوشینو زکورا کے پھول گر چکتے ہیں سکورا سے بہت وسیع علاقہ گھرا ہوا ہے۔ آدمی پھرتے پھرتے تھک جاتا ہے۔ سیر کرتے کرتے ایک وسیع میدان میں پہنچتے ہیں جہاں گھاس کے مخملی فرش پر کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ لوگ یہاں آرام کرتے ہیں جو دیر میں آتے ہیں وہ گھاس پر دراز ہو جاتے ہیں۔ بحری فوج کا بینڈ سامعہ نوازی کرتا ہے۔

یہ مقام شاہی شامیانے کے عقب میں واقع ہے۔ دور تک قناتیں تنی ہوتی ہیں۔ دو۲ بجے دروازہ کھلتا ہے اور لوگ

اپنے اپنے احاطوں کی طرف بے تحاشا بھاگتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ عام لوگوں کا مجمع نہیں ہے۔ بلکہ عمائدین مُلک کی پارٹی ہے۔ جس میں کرنل سے نیچے درجے کا کوئی فوجی یا بحری عہدیدار شریک نہیں ہوسکتا۔ کرنیلوں اور جرنیلوں کا آگے کی نشست کے لئے بھاگنا کچھ مضحکہ خیز منظر معلوم ہوتا ہے۔ عموماً جاپانی نہایت سنجیدہ اور متین ہوتے ہیں مگر بھیڑ میں ان کی حالت بالکل بدل جاتی ہے۔ سب اپنی متانت کو بالائے طاق رکھ کر بھیڑوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ جب ہلڑ ختم ہوگیا تو پیچھے آنے والے ویسے ہی سنجیدہ اور متین تھے جیسے عموماً نظر آتے ہیں۔

جب سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے تو مکبر الصوت نے اعلان کیا کہ حضور ملک معظم کی تشریف آوری میں ڈیڑھ گھنٹہ ہے حاضرین اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ دوسرا اعلان ایک گھنٹے بعد ہوا اور تیسرا پاؤ گھنٹے بعد۔ آخری اعلان میں بتایا گیا کہ جب حضور ملک معظم تشریف لائیں گے تو قومی ترانے سے اِستقبال کیا جائیگا۔ اُس وقت تمام حضرات مودب کھڑے ہوجائیں اور جب تک جہاں پناہ شاہی شامیانے میں پہنچ کر آرام نہ فرمالیں سب اسی طرح کھڑے رہیں۔

حضور ملک معظم کی سواری باغ کے دروازے پر پہنچی تو سفرائے دول و وزرائے سلطنت نے استقبال کیا۔ جب تمام عمائدین آداب بجا لاچکے تو مس ہیلن کیلر مشہور اندھی اور گونگی خاتون کو جو امریکہ سے جاپان کے اندھوں کی معاونت کے لئے آئی ہوئی تھیں بارگاہِ خسروی میں پیش کیا گیا۔ شہنشاہِ جاپان نے بمراحم خسروانہ مس موصوف کو شرفِ باریابی عطا فرمایا۔ یہاں سے شاہی جلوس مرتب ہوا۔ آگے آگے گرینڈ چیمبرلین ایڈمرل ہیا کوتاکے تھے۔ کوئی پندرہ قدم پیچھے ملک معظم فوجی وردی میں تشریف لائے۔ جہاں پناہ کے چار پانچ قدم پیچھے ملکہ معظمہ تشریف لائیں۔ آنحضور کے پیچھے خواص خاصہ اور شہزادگان و شہزادیانِ والا تبار تھیں۔ سفرائے دول اور دیگر حضرات جو استقبال کے لئے حاضر ہوئے تھے عقب کے راستے سے اپنے اپنے احاطوں میں شہنشاہ کی آمد کے قبل پہنچ گئے تھے۔ جملہ حاضرین پہلے ہی سے سڑک کے دونوں جانب قطار در قطار کھڑے تھے۔ قومی ترانے کے سُروں میں ملک معظم و ملکہ معظمہ خراماں خراماں تشریف لائے۔ جملہ حاضرین ٹوپیاں اُتارے کھڑے تھے۔ سب نے گردن کو خم دے دے کر سلام کیا۔ فوجی اور بحری عہدیدار سیلیوٹ کی حالت میں کھڑے تھے۔ ملک معظم بھی ان کے جواب میں فوجی سلام کرتے تھے۔ ملکہ معظمہ دونوں جانب گردن کو خم کرتی مسکراتی ہوئی گزر گئیں۔ اِس پارٹی میں شہنشاہ و ملکہ معظمہ کو جس طرح دوبدو دیکھا اس سے بیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ سڑکوں پر جب کبھی شاہی سواری گزرتی ہے تو جاپانی سر جُھکا کر کھڑے ہوجاتے ہیں بادشاہ کی طرف دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے۔ یہاں وہ بات نہ تھی۔ لوگ نظر بچا کر دیکھ رہے تھے۔

ملکہ معظمہ انگوری رنگ کا آفٹرنون گون زیب تن فرمائے ہوئے تھیں جو بے انتہا پھب رہا تھا۔ تمام شہزادیاں ضابطہ کے مغربی لباس میں ملبوس تھیں۔ عام جاپانی خواتین ضابطے کا کمونو پہنے ہوئے تھیں جو عموماً سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں فاختائی یا دیگر رنگ کے کمونو بھی نظر آئے مگر خال خال۔ مردوں کا لباس تو سیاہ تھا ہی۔ عورتوں کے لباس پر بھی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ اوبیاں بڑی خوبصورت وضع دار بندھی ہوئی تھیں۔ رنگینی صرف مغربی خواتین کے لباس میں نظر آتی تھی۔ مسز برلاس ساڑھی میں ملبوس تھیں جو جاپانیوں کی نظریں اپنی جانب کھینچ رہی

تھیں۔ مرد درباری لباس یعنی مارننگ سوٹ میں تھے اور سر پر سلک ہیٹ تھی۔

لباس کے بارے میں بعض مغربی خواتین نے بڑی بدتمیزی کا اظہار کیا۔ بجائے سہ پہر کے مقررہ لباس کے معمولی کپڑے پہن آئیں جن میں وہ بازار آتی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض مغربی مردوں نے بڑا گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔ کسی جلسے میں ملک معظم تشریف فرما ہوں تو درباری ضوابط کے بموجب کوئی شخص درباری لباس پر اوورکوٹ نہیں پہن سکتا۔ مگر یہ صاحبان برابر لبادہ پہنے رہے۔ اِنہی مغربی خواتین اور مردوں کی بدتمیزی پر محکمہ محلات شاہی کو اعلان کرنا پڑا ہے کہ آئندہ مغربی حضرات کو رقعات بھیجنے میں احتیاط برتی جائے گی۔

ملک معظم کے شاہی شامیانے میں رونق افروز ہونے پر لوگوں کو کھانے پینے کی سوجھی۔ ہر احاطہ میں میزیں آراستہ تھیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کی تعداد کے مطابق کھانے پینے کا سامان چنا ہوا تھا۔ میزوں پر غلاف پڑے ہوتے تھے جو شہنشاہ کی آمد سے کچھ پہلے ملازمین نے اُتار دئے تھے۔ کھانے کے لئے سینڈوچ، کیک اور بسکٹ تھے۔ پینے کے لئے ساکے، بیئر، پورٹ وائن، لیمونیڈ اور چائے تھی۔ ہر ایک کے آگے ایک بکس میں شاہی تحفہ بندھا رکھا تھا جسے گھر لے جانے کی اجازت تھی۔ اس میں کچھ کیک تھے۔ لوگ اسے بڑے شوق سے لے جاتے ہیں اور اعزا و احباب میں ٹکڑا ٹکڑا سوغات کے طور پر تقسیم کرتے ہیں۔ وہ اسے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

ابھی چار بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ حضور ملک معظم و ملکہ معظمہ درباری امرا کی معیت میں پارٹی سے رخصت ہوکر باغ میں داخل ہوگئے اور دوسرے دروازے سے سواری محل کو روانہ ہوگئی۔ بادشاہ سلامت کی روانگی کے وقت بھی کِمیگایو بجایا گیا اور جملہ حاضرین مودب کھڑے ہوگئے۔ شاہی سواری کے رخصت ہونے پر مہمان بھی اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوئے۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ عمائدین ملک کے اس مجمع میں سے بمشکل پانچ فیصدی ٹیکسیوں میں گئے ہونگے ورنہ باقی سب ریلوں ٹریموں اور بسوں میں چلے گئے۔

آخر میں کیمیگایو کا مختصر حال بے محل نہ ہوگا۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک سلطنت جاپان کا کوئی قومی ترانہ مقرر نہ ہوا تھا۔ اسی زمانے میں مسٹر ایکرٹ ایک جرمن ماہر موسیقی جاپان میں مقیم تھا۔ اس نے یہاں کے بعض مدارس میں اور بعض پلٹنوں میں فوجی بینڈ جاری کیا تھا۔ وزارت محکمہ بحر نے اس سے خواہش کی کہ جاپان کا قومی ترانہ مرتب کردے۔ چنانچہ اس نے پرانی نظموں میں سے ایک نظم انتخاب کی جو کسی شاعر نے ایک ہزار برس پہلے کہی تھی۔ اس کے لئے مغربی موسیقی بنائی یعنی راگ اور سُر تجویز کئے۔ اس طرح جاپان کا قومی ترانہ ظہور میں آیا۔ یہ اُن ترانوں میں شمار ہوتا ہے جو اقوام عالم کے قومی ترانوں میں نہایت موثر مانے جاتے ہیں۔ اس کا لفظی ترجمہ مشکل ہے۔ شاعر بادشاہ سے مخاطب ہوکر یوں دعا کرتا ہے:۔

"تیری سلطنت تا ابد قائم رہے یہاں تک کہ کنکر بڑھ کر چٹان بن جائے، اور اُس پر کائی جم کر پُرانی ہوجائے۔"

نور الحسن برلاس!

مشتے نمونہ از خروارے اس "محترم جنس" کی غلامی کا ایک نفرت انگیز طوق یہ بھی ہے کہ باوجود آزادی نسواں کے سینکڑوں دعووں کے سوسائٹی اس کو یہ حق دینے سے انکار کرتی ہے کہ وہ اپنا نام ظاہر کرے، جبتک وہ لڑکی ہے اس کا وجود باپ کے نام کا حامل ہے اور عورت ہو کر شوہر کے نام کا تابع، گویا اُس کا علیحدہ اور مستقل وجود ہی نہیں، وہ مرد کی موجودگی میں کوئی قابل اعتنا ہستی نہیں تصوّر کی جاتی۔

یورپ عورت کو اُس کے فطری حقوق ابتک نہ دے سکا، اسلام دنیا میں آیا کہ ہر طرح کی ذہنی، خیالی اور جسمانی غلامی کو مٹائے، عورت کی غلامی بھی ایک بہت بڑی غلامی تھی، اس نے عورت کے وجود کو ایک مستقل وجود تسلیم کیا اور مرد و عورت کے حقوق کو بحسن وخوبی واضح کر دیا۔

اسلام نے اس کو حق دیا کہ باپ اور شوہر سے علیحدہ اپنی شخصیت قائم کرے۔ وہ اپنی ملکیت اور جائیداد خالص اپنے نام سے رکھہ سکتی اور اپنے نام سے ہر طرح کا قانونی معاملہ کر سکتی ہے۔ وہ یورپ کی عورت کی طرح نہ تو اپنے باپ کے نام سے موسوم ہوتی ہے اور نہ شوہر کے۔

یورپ نے عورت کو سوسائٹی میں بظاہر جو درجہ دیا ہے وہ اُس سے بہت گرا ہوا ہے جو اسلام نے اُس کو عطا کر رکھا ہے، مغرب نے خوش آئند لفظوں میں خوشامد کر کے اُس کی اصلی آزادی چھین لی ہے، وہ اپنی محترم اور نازک صنف کے ساتھ پیار کی بہت کچھ باتیں کرتا ہے، اُسکو محترم، لطیف اور نازک جنس کہتا ہے، اسکو اپنا "نصف بہتر" قرار دیتا ہے، اُسکی عزت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اسکو اُس نے حقیقی آزادی کس حد تک دی ہے۔ اس آزادی کے متعلق اگر سوال کیا جائے تو وہ کچھ جواب نہیں دے سکتا۔

یورپ کی عورت حقیقت میں اپنے شوہر کی غلام ہے، وہ اپنی ملکیت کا حق کسی چیز پر بھی بہ حیثیت بیوی ہونے کے نہیں رکھتی، شریک زندگی تو کہلاتی ہے مگر زندگی کی ملکیت میں اُسکی کوئی حقیقی شرکت نہیں پائی جاتی، برخلاف اسکے مسلم عورت اپنے والدین، اپنے شوہر، اپنی اولاد اور بعض صورتوں میں اپنے دوسرے اقربا کی جائیداد میں بھی حصہ پاتی ہے، اپنے شوہر سے مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے اس لئے اسکو بہت زیادہ اقتصادی آزادی حاصل ہے۔

دُنیا میں اصلی آزادی اقتصادی آزادی ہے کہ انسان اپنی گزر بسر کا کوئی ذریعہ پیدا کرے، دوسرے جو کچھ حقوق اور مطالبات ہیں وہ اسکے تابع ہیں۔ اگر یہ آزادی انسان سے چھین لی جائے اور دُنیا بھر کے سارے حقوق دیدئے جائیں تو سب ہیچ ہیں، آخر وہ غلام کا غلام ہی رہیگا اسلئے کہ مفلس کا وجود "وجود" ہی نہیں ہو سکتا۔

ہمارے اکثر نئے تعلیم یافتہ حضرات مذہب و معاشرت میں آزادی کے بڑے دلدادہ ہیں اور جد وجہد کر رہے ہیں کہ خود کو آزاد خیال کہلوائیں، عورت کی آزادی اور حقوق کا بھی اس ضمن میں مطالبہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں نے عورت کو غلام بنا رکھا ہے۔ یہ محض یورپ کے بعض سطحی دلچسپ مناظر کی نقالی کا شوق اور اس کی ہر بات کی غلامانہ تقلید کا ولولہ ہے، اس میں نکی عقل وفہم کو مطلق دخل نہیں، یہ لوگ عورت کو نام نہاد آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ آزادیِ نسواں کا راگ یورپ سے سُن لیا ہے اور اس پر سر دُھن رہے ہیں۔ لیکن نہ تو اس کا مطلب سمجھا ہے اور نہ اس کے زیر وبم سے واقف ہوئے ہیں۔ محض تقلید سے قوم نہیں بنتی، سب سے پہلے دماغ کو اندھی تقلید سے آزادی ملنی چاہیئے، پھر رسم ورواج کو، یہ لوگ صرف رسم ورواج کی اتباع سے قوم کو نجات دلانا چاہتے ہیں مگر انہوں نے اپنے دماغ کو یورپ کا غلام بنا رکھا ہے۔

حقوقِ نسواں پر زمانہ دراز سے ایک ہنگامۂ زبان و قلم برپا ہے، اصلاح، ترقّی اور عمل سب کی زبانوں پر ہے، تعلیم کی ضرورت سب پر روشن ہے، تاہم جو جہالت اور غفلت میں گرفتار ہیں اُن کی سرشاری اور مدہوشی بدستور، جو مُبتلائے معصیت ہیں اُنکی جسارت و جُرأت اُسی طرح قائم، جو بدعملیوں اور مکروہاتِ دُنیا میں گھرے ہوئے ہیں اُنکی حالت بدتر سے بدتر، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں اخلاقی قوت نا پید ہے، کوئی قوت یا نظام ایسا نہیں جو ہمیں قول و فعل کی مطابقت پر مجبور کرے۔

اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا نظام پیدا کیا جائے جو ہر حُسنِ عمل کا مظہر ہو اور ہر فعل بد کیلئے اپنے اندر ایک سخت معاشرتی اقتاب رکھتا ہو، جب تک ہماری سماج ایک ایسا اخلاقی نظام پیدا نہ کرے اسوقت تک حقوق نسواں و آزادیٔ نسواں کی چیخ پکار صدائے بے ہنگام ہے۔

ایک شخص جو اپنی نیک کردار، خوش خصال، معصوم رفیق حیات کے لئے خونخوار درندہ ہے، ایک ناعاقبت اندیش جو اپنے ذاتی فوائد اور مصلحت کی بنا پر اپنی بہنوں اور لڑکیوں کو غیر موزوں ازدواج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رہا ہے، ایک نفس پرست جو گھر سے باہر کی زندگی میں حسن و جمال کی نمائشی تصویریں دیکھکر آمادہ ہو گیا ہے کہ اپنی رفیق زندگی کی رفاقت سے کنارہ کش ہو جائے۔ ایک اندھا جُواری جو حصول دولت کے لالچ اور ہوس میں مُبتلا ہو کر اپنی شریکِ زندگی کے تن کا لباس تک جوئے کی نذر کر چکا ہے اور اب تیار ہے کہ اُس کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہدے، اس کے نفسِ بد کو کیا مجبوری ہے کہ ایسا نہ کرے جبکہ سوسائٹی ہر حال میں اُس کی پذیرائی کیلئے آمادہ ہے اور اسکی اس طرح آؤ بھگت کر رہی ہے گویا کہ اُس نے کچھ کیا ہی نہیں۔

یہی حالت اُس عورت کی بھی ہے جو ایسے ہی افعال بے ہودہ اور حرکات ناشائستہ میں مُبتلا ہے مگر کسی احتساب کی غیر موجودگی کی وجہ سے بالکل آزاد ہے کہ نام نہاد سوسائٹی کے سارے خرافات اور عیش پرستیوں میں جی کھول کر حصّہ لے اگر کوئی اسکی نسائیت اور مشرقیت کا واسطہ دے کر اُس میں کچھ احساس پیدا کرانا چاہے تو اپنی پوری قوت سے ٹھکرا دے۔

عام طور پر عورت بیوفا مشہور ہے، حالانکہ اُس کی وفاشعاری کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اُس نے سینکڑوں برس سے ایک وفادار کنیز کی طرح انواع و اقسام کے مظالم سہے — مگر کبھی اُس نے مردوں کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا، اس کو ہم نے چڑیوں کی طرح پنجرے میں بند کر دیا، وہ خوش رہی، اس کو ہم نے تعلیم و تربیت سے بیگانہ اور جاہل رکھا، اُسنے کچھ نہیں کہا۔ اس کو ہم نے اپنے جذبات کی تکمیل کا ذلیل ترین ذریعہ بنایا، وہ خاموش رہی۔ اس کو ہم نے ہر قسم کی سزا دی بلکہ قتل تک کر دیا، اس کی زبان پر مہر خموشی لگی رہی۔ اُس کو ہم نے آگ میں جلنے کا حکم دیا۔ وہ بغیر کسی عذر کے خوشی خوشی اپنے پتی کے ساتھ ستی ہو گئی۔ مگر اس رُوح فرسا فعل کے خلاف اُسنے کبھی آہ تک نہ کی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ باوجود اس وفاشعاری اور اطاعت گزاری کے ہم اُسے بیوفا اور سرکش کہیں؟

انفرادی طور پر اگر عورت کی کچھ بیوفائی کی مثالیں ملیں گی بھی تو ان سے ساری "جنس لطیف" کیوں مطعون کی جائے، ذرا ہم خود اپنے ضمیر کو ٹٹول کر دیکھیں کہ ہم میں کس حد تک وفاداری کی صفت موجود ہے، ہم عورت کی وفاشعاری، جاں نثاری، اطاعت گزاری، فرماں برداری، ایثار اور اُس کی بے پایاں محبت کو صرف ایک قصور میں بھلا دیتے ہیں کہ اُس نے ہم کو اولاد نہیں دی۔ قصور بھی ایسا کہ جس پر کوئی قابو نہیں اور پھر سزا بھی ایسی دی جاتی کہ جس سے زیادہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت سزا عورت

کیلئے ہو نہیں سکتی، ہم فوراً دوسری رفیقۂ حیات سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں اور اس بے قصور غریب کو ٹھکرا دیتے ہیں، لُطف یہ کہ اُس کو طلاق بھی نہیں دیتے۔ اگر دیں بھی تو کس کام کی جبکہ وہ رسم و رواج کے قیود میں پھنسکر مرد کی طرح دوسرے کو اپنا شریکِ زندگی بنانے کے لئے آزاد نہیں!۔

جس طرح، بچّوں کو کھلونے دیکر بہلاتے ہیں اسی طرح مردنے عورت کو زیور دیکر بہلا رکھا ہے، سب سے پہلے عورت کو کانوں میں زیور پہنایا گیا اور یہی زیور غلاموں کو بھی پہنایا جاتا تھا، چنانچہ فارسی میں "حلقہ بگوش شدن" کے معنی ہیں غلام یا کنیز ہونا، بیلوں کی طرح نتھنوں میں سوراخ کر کے ایک بڑا سا حلقہ "نتھ" کے نام سے ڈال دیا گیا، غلاموں کی طرح گلوں میں "طوق" پہنائے گئے، مجرموں کی طرح ہاتھوں میں "ہتکڑیاں" ڈالی گئیں، قیدیوں کی طرح پاؤں میں "بیڑیاں" پہنائی گئیں، اور بھولی بھالی سادہ لوح عورت سے کہا گیا کہ یہ زیور ہیں جو اُس کے حُسن میں چار چاند لگائیں گے، عورت مجسمۂ حُسن ہے اُس کو کسی زیور کی ضرورت نہیں۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی!

اگر تھوڑی دیر کیلئے ہم اس زیور کو عورت کی زیب و زینت مان بھی لیں تو یہ آرائش و زیبائش کس کے لئے تھی؟ یہ بھی مرد کیلئے! ورنہ اس میں عورت کو کیا فائدہ تھا!! ستم ظریفی تو یہ کہ یہ زیور بھی عورت کی ملکیت نہیں سمجھے جاتے، جب تک چاہا پہنایا اور جب چاہا ٹکے لگا دیا، یا چھین کر کسی اور کو دیدیا۔

ہر عورت کی فطرت میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو قدرت کی طرف سے اسکو عطا ہوئی ہیں یا اُس کے اسلاف سے اُس کو ورثہ میں ملی ہیں، لیکن اُسے جاہل رکھنے، اس میں نیک و بد کا امتیاز پیدا نہ کرانے، اُس کی دماغی قوتوں کو صحیح تعلیم و تربیت سے بیگانہ رکھکر اُبھرنے نہ دینے اور اُس کو اُس کے حقوق سے محروم رکھنے کی وجہ سے ہم اُس کی سیرت کو رفتہ رفتہ مسخ کر رہے ہیں، ہم کو چاہیئے کہ ان سینکڑوں معاشرتی مصائب سے جو جدید تعلیم و تہذیب کی برکت سے اس پر مسلط ہو رہے ہیں، اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ مغرب کی اس نام نہاد آزادی کے خلاف ہمکو پُر زور احتجاج کرنا چاہیئے جو عورت کی "نسائیت" کو پارہ پارہ کر رہی ہے، مغربی تہذیب و تمدّن کی اندھی تقلید کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی شدید ضرورت ہے جو مشرقی اقوام کے حق میں تباہی اور بربادی کے سوا اپنے وسیع دامن میں کچھ نہیں رکھتا۔

عورت میں جو نقائص ہیں اُن کا اگر ہم تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان میں فطرت کو بہت کم دخل ہے، عورت کی ہمہ نوع کمزوریوں کا سبب اس کو بیجا طور پر قید و بند میں رکھنا ہے ورنہ ہم کبھی اس کو اس درجہ مریض، نحیف اور فطری فرائض کی صحیح انجام دہی میں اس قدر ناکارہ نہیں پاتے۔

کسی قوم کی ترقی اور اصلاح کی بُنیاد غلط تقلید اور مہمل نقّالی پر نہیں ہے بلکہ صحیح تعلیم اور صحیح عمل پر ہے، ہماری سماج میں اتنی قوّت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر تعلیم صحیح اُصول پر ہو اور اچھی نظیر پیش کرے اور ہر دعویٰ صحیح عمل کے بعد کیا جائے، جبتک کوئی ایسا ذہنی انقلاب نہ ہو اس وقت تک "آزادیِ نسواں" کے عنوان پر دُھنواں دھار تقریروں یا ہنگامہ خیز مباحث سے قابلِ اطمینان نتائج بر آمد نہیں ہو سکتے۔

میرزا سیف علی خان

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

نی خوش تھیں اپنی بہاریں، کتنی خوش تھی اپنی جوانی عیش ہی عیش تھا، طوفان آئے، بادل گرجے، برسے پانی
۔لوں کا مذہب گو کہ جُدا تھا، وہ تھے غریب و رہیں تھی انی پیت کی خاطر سب تھا آساں، مذہب، جان، اور آن گنوانی
ینے بھولے، کتنے حسین تھے، کتنے شریف اور کتنے مانی بات میں جھڑکی، ناک پہ غصہ، جیسے باندی ہیں تھی پُرانی
کتنی نرالی چاہ کسی کی، دل میں موہ، اور بات بنانی وہ بھی عجب تھے دن اور راتیں، وہ بھی عجب تھی اپنی جوانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

دن گئے آئے، خود کو جو کوسا، اُٹھکر ہاتھ کو مُنہ پر رکھا ہنسکر بولے "تُو کیا جانے، کتنا نازک دل ہے میرا"
باپ کا ڈر تھا، ماں کا خطرہ، بھائی کی شرم اور بہن کا ٹوکا خود کی لاج، سماج کا طعنہ، ہم کو بھی تھی کب کس کی پروا
کوئی نہ سنگی، کوئی نہ ساتھی، کوئی نہ اپنا، کوئی پرایا تن، من، دھن کو جس پر وارا، اُسکی مرضی سب سے اعلا
سارے دھبے آپ دُھلیں گے، پیت کی جو ہو بہتی گنگا سب کو تجکر ایک کو پایا، دل نے دُنیا خاک نہ جانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

ایک معمہ جن کی طبیعت، ایک کرشمہ جن کی فطرت غصہ جن کا پیار سے میٹھا، گالی تھی پیغامِ محبت
باطن نرمی، ظاہر گرمی، دل میں مروت، مُنہ پہ شقاوت دل میں ہر دم شوقِ حکومت، جان سے پیاری جنکو عزت
اک دن باپ نے میرے بھیجا، دے کر انکو دُور حکومت میری مسرت! میری حسرت! میرا نصیبہ! میری قسمت!
اُن کو نہ تھی گو اس کی چاہت، میں نے ہی بھیجا کر کے منت کی عزت، میری عزت، مجھ کو تھی رکھنی ان کی بانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

وہ تو گئے دُور، اور منظر یاں آیا نیا ہی گُل سا کھلتا آپ نہ، یہ نام کی عزت، اصل میں تھی اک جان کا دھوکا
ماں کہیا! باپ کیا، اپنا پرایا، سارے جہاں کا نقشہ بدلا کیجئو یادر، کیسے خوش تھے، جیسے ہر اک نے شیر کو مارا!
کتنا چاؤ تھا، کتنی خاطر، بیٹی ہوئی ہیں کیھر سے گ ہاتھ ہو دوست سے دُشمن، دل ہے یہ شاکھ کی دُنیا
جان بھی لیں گے، پیار سے لیں گے، آخر ہی نا لاڈ سے واس ہی ری مرضی ہماری، دل سے واری جھٹے زبانی

سب سے نرالا اپ سب سے انو پنی کہانی

بیاہ کا تھا یاں ڈنکا بجتا، آن کی آن میں ہاتے کر دِر موت ۔ اتنا کر کھتا، واں سے جواب اور آئے نہ پرچا
جل کر آخر خط اک بھیجا "آپ نہ آئیں، مر گئی مر کے بنوں سو سی عزت! کس کی آخر کس کو پروا!
ہاتھ میں خط تھا، مُنہ پر غصہ، پاس کھڑے تھے چاند ہی اپنا ڈ کے، ٹھنڈا اپنا پڑ گیا غصہ
"کوئی مانے، یا کہ نہ مانے، خط ہم نے ہر تیسہ رادھا داسی، سے اُنکے، دل میں پھر بھی چھیڑ کی ٹھانی

سب سے نر سب سے انوکھی اپنی کہانی

"آئیے، آج اک بات سُنائیں، کتنی میٹھی، کتنی کی سوگند، آپ کو بھی جو لگے نہ اچھی!

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

کتنی خوش تھیں اپنی بہاریں، کتنی خوش تھی اپنی جوانی — عیش ہی عیش تھا، طوفان آئے، بادل گرجے، برسے پانی
دونوں کا مذہب گو کہ جدا تھا، وہ تھے غریب اور میں تھی رانی — پیت کی خاطر سب تھا آساں، مذہب، جان، اور آن گنوانی
کتنے بھولے، کتنے حسیں تھے، کتنے شریف اور کتنے مانی — بات میں جھڑکی، ناک پہ غصہ، جیسے باندی میں تھی پرانی
کتنی نرالی چاہ کسی کی، دل میں موہ، اور بات بنانی — وہ بھی عجب تھے دن اور راتیں، وہ بھی عجب تھی اپنی جوانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

دن گئے آئے، خود کو جو کوسا، اُٹھکر ہاتھ کو مُنہ پر رکھا — ہنسکر بولے "تُو کیا جانے، کتنا نازک دل ہے میرا"
باپ کا ڈر تھا، ماں کا خطرہ، بھائی کی شرم اور بہن کا ٹوکا — خود کی لاج، سماج کا طعنہ، ہم کو بھی تھی کب کس کی پروا
کوئی نہ سنگی، کوئی نہ ساتھی، کوئی نہ اپنا، کوئی پرایا — تن، من، دھن کو جس پر وارا، اُسکی مرضی سب سے اعلا
سارے دھبّے آپ دُھلیں گے، پیت کی جو ہو بہتی گنگا — سب کو تجکر ایک کو پایا، دل نے دُنیا خاک نہ جانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

ایک معمّہ جن کی طبیعت، ایک کرشمہ جن کی فطرت — غصّہ جن کا پیار سے میٹھا، گالی تھی پیغامِ محبت
باطن نرمی، ظاہر گرمی، دل میں مروّت، مُنہ پہ شقاوت — دل میں ہر دم شوقِ حکومت، جان سے پیاری جنکو عزّت
اک دن باپ نے میرے بھیجا، دے کر انکو دُور حکومت — میری مسرّت! میری حسرت! میرا نصیبہ! میری قسمت!
اُن کو نہ تھی گو اس کی چاہت، میں نے ہی بھیجا کر کے منّت — کی عزّت، میری عزّت، مجھ کو تھی رکھنی ان کی بانی

سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

وہ تو گئے دُور، اور منظر یاں آیا نیا ہی گُل سا کھلتا — آپ نہ ... یہ نام کی عزّت، اصل میں تھی اِک جان کا دھوکا
ماں کیا، باپ کیا، اپنا پرایا، سارے جہاں کا نقشہ بدلا — سمجھو ... نا ... اور، کیسے خوش تھے، جیسے ہر اک نے شیر کو مارا!
کتنا چاؤ تھا، کتنی خاطر، بیٹھی ہوئی ہیں کیسے ... — ہاتھ ہو ... دوست سے دُشمن، دل ہے یہ شاکھ کی دُنیا
جان بھی لیں گے، پیار سے لیں گے، آخر ہے نا لاڈ ... — واس ہی ... ری مرضی ہماری، دل سے واری ... زبانی

سب سے نرالا اپ... — سب سے انو... ی کہانی

بیاہ کا تھا یاں ڈنکا بجتا، آن کی آن میں ہاتھ کے ... — موت سے ... اتنا گرطھتا، واں سے جواب اور آئے نہ پرچا
جل کر آخر خط اک بھیجا "آپ نہ آئیں، مر گئی — مر کے بنوں ... سی عزت! کس کی آخر کس کو پروا!
ہاتھ میں خط تھا، مُنہ پر غصہ، پاس کھڑے تھے — چاند ہی اپنا ڈوبا ... کے، ٹھنڈا اپنا پڑ گیا۔ غصّا
"کوئی مانے، یا کہ نہ مانے، خط ہم نے ہر تیسہ — رادھا داسی، ... سے اُنکے، دل میں پھر بھی چھیڑ کی ٹھانی

سب سے نر... — ...، سب سے انوکھی اپنی کہانی

"آئیے، آج اک بات سُنائیں، کتنی میٹھی، کتنی — ... کی سوگند، آپ کو بھی جو لگے نہ اچھی!

عشرت ———

سُنتے ہیں ہم اک بیاہ رچا ہے، دھوم ہے سارے گھر میں جس کی ہم بھی مانیں آپ کو تاڑیں، شادی ہے کس کی، یہ جو بتادی!"
"کیا کہا آپنے! آپ کی شادی!۔ کس کی شادی، رادھا میری" رادھا کس کی، رانی کس کی، جاؤ بھی! ہوش کی اپنے دوا کی!
باپ نے سچ مچ راجہ ڈھونڈا، ایسا بَر اور ایسی شادی! رہنے بھی دو بس عشق کی باتیں، ہوگئیں وہ سب اب تو پُرانی
سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

اتنا سُنکر۔۔ ہائے کہوں کیا، مُنہ کو کلیجہ آنے اک دم پھر وہ لوٹے، پاس نہ آئے، غم تھا، ہم تھے، موت کا عالم
بولے پپیہا پیہو، پیہو، مور بھی ناچے بن میں چھم چھم پی بن گئے موج نہ دل میں، لاکھ بدریا برسے پیہم
نین کا ساگر سوکھے سوکھے، آنسو آئیں، آئیں تھم تھم دل کا لاشہ دھوم سے نکلے، اس کو لئے ہم گھر روئیں جم جم
یاد یہ آئی کس کی دل میں، تیر یہ مارے کس نے دمادم ہوگئی دُنیا کیوں سب، ماتم، دل کو ہے شاید موت منانی
سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

ہے ہے، شور یہ کیسا اُٹھا! کس کے مکان سے! خیر خدایا! دل کیوں دھڑکا، ماتھا ٹھنکا، میرے مولا تیرا بھروسا!
ہائے لٹی وہ دل کی دُنیا! اتنے ناز سے جس کو بسایا کس کو خبر تھی اک دن ہوگی، اپنی ہنسی ہی اپنا رونا
ہنس کر بولو تو کیا جانے، کتنا نازک دل ہے میرا" پھر سے ڈراؤ" جان بھی دوں گا، یاد رہے! پرستش کرونگا"
کتنے سچے قول کے اپنے! وہ بھی کیا اور یہ بھی پورا موت سے بڑھکر سوت بھی ہوگی، کوئی جہاں میں دشمن جانی
سب سے نرالا اپنا فسانہ، سب سے انوکھی اپنی کہانی

روٹھ گئے بس! دیکھ لی اُلفت، آؤ پیت کا راگ سُنائیں! آؤ، آؤ من کے راجہ! توبہ، توبہ، اب نہ ستائیں!
نین کی گنگا، من کا مندر، پریم کا پنڈت، آہ برائیں آپ ہوں دیوتا، میں ہوں پجارن، آؤ، آؤ بیاہ رچائیں
حسن حکومت، عشق رعایا، موج کے دن اور عیش کی راتیں دُکھ کی دُنیا سُکھ سے بدلیں، سب سے الگ اک راج بسائیں
آپکے دُشمن دن یہ دیکھیں، کس کی شادی، کیسی برائیں رادھا آپ کی تھی، ہے، ہوگی! خوش ہوئے اب تو بات جو مانی؟
سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی

من کے راجہ، دل کے باسی، اُداس نہ کیجو اپنی داسی ۔ جور و ستم آس ہو کس کی، کس رُخ ڈولے دل کی کشتی
معاف کرو، لو ہاتھ ہیں جوڑے، دیکھو ہنسی سے توبہ کرلی غصّہ جا ہو جتنا، مار بھی ڈالو اُف نہ کروں گی
یاد ہے وہ دن " داس ہوں تیرا، حکم ہے تیرا میری مرضی ۔ں میں، اور تو ہے کنگن، میں ہوں گلا اور تو ہے ہنسلی"
بھول نہ جانا بات وہ میٹھی، "رادھا اچھی" "رادھا میری" ۔کو، لو حکم ہے دیتی، من کی داسی، نام کی رانی
سب سے نرالا اپنا فسانہ، ۔ھی اپنی کہانی

اچھا، آپنے اپنی چلائی، پھر بھی سوت کو بڑھنے نہ دوں گی ۔ سے آپ نہ ہم کو ڈرائیں، جینے کی یاں کس کو خوشی تھی
موت اٹل ہے، عشق امر ہے، موت ہے سوت اور عشق ہوں میں ہی ۔ت۔ آپ کی مرضی، عشق کا نام اور جیت ہو میری
گھر میں ہو شادی یوں ہی رچتی، سب کی تمنا خوب ہو پوری ۔ب گیا جب، جوت کہاں کی، رونق کیسی
اتنے نہ روٹھو، پاس بلالو، کشن کنہیا آئی، آئی ۔ادھا باندی، "رادھا اچھی، رادھا رانی"
سب سے نرالا اپنا فسانہ ۔کہانی

سید علی شاکر۔ ایم۔

ساقی کے خاص نمبر رعایتی قیمت پر

خاص نمبر	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
جاپان نمبر- جنوری سنہ ۱۹۳۶ء	عہ/ ۱۴ر	عہ/
سالنامہ- جنوری سنہ ۱۹۳۵ء	عہ/ ۱۴ر	عہ/
سالنامہ- جنوری سنہ ۱۹۳۴ء	عہ/	۱۲ر
سالنامہ- جنوری سنہ ۱۹۳۱ء	عہ/	۱۲ر
سالنامہ- جنوری سنہ ۱۹۳۷ء	عہ/ ۱۴ر	عہ/
افسانہ نمبر- جولائی سنہ ۱۹۳۶ء	۱۲ر	۹ر
افسانہ نمبر- جولائی سنہ ۱۹۳۵ء	۱۲ر	۸ر
افسانہ نمبر- جولائی سنہ ۱۹۳۰ء	۱۰ر	۸ر
افسانہ نمبر- جولائی سنہ ۱۹۳۱ء	۱۰ر	۸ر
ظریف نمبر- اپریل سنہ ۱۹۳۶ء	۱۰ر	۸ر
ظریف نمبر- اپریل سنہ ۱۹۳۵ء	۱۰ر	۸ر
ظریف نمبر- اپریل سنہ ۱۹۳۴ء	۱۰ر	۸ر
ظریف نمبر- اپریل سنہ ۱۹۳۳ء	۱۰ر	۸ر
دلّی نمبر- اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء	۱۲ر	۸ر
دلّی نمبر- اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء	۱۰ر	۸ر
ڈانٹے کا جہنم- اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء	۱۲ر	۱۲ر
چغتائی نمبر- اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء	عہ/	۱۲ر

ہر سال ساقی کے خاص نمبر شائع ہوتے ہیں ان کی قیمت مستقل خریداروں سے علیحدہ نہیں لی جاتی

نمونہ کا پرچہ مفت

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپے اور ششماہی تین روپے ہے۔ ممالک بیرون ہند سے بارہ شلنگ۔

قیمت فی پرچہ چھ آنے

جرعات

جلد ۱۶ | ساقی دھلی بابت ماہ نومبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۵

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

ساقی ہندوستان کے اکثر تعلیمی محکموں میں منظور شدہ ہے۔ بموجب چٹھی ۲۱۶۶۴ مورخہ ۲۵ اکتوبر پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں بھی برائے مطالعہ منظور ہوگیا ہے۔ اطلاعاً یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

"دورِ حاضرہ اور اردو غزل گوئی" کی پہلی قسط شائع ہونے کے بعد ہی یہ افسوسناک خبر آئی کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی رفیقۂ حیات نے سترہ دن کی مختصر علالت کے بعد انتقال کیا۔ اس اچانک سانحے نے پردیس میں ڈاکٹر صاحب پر قیامت توڑ دی۔ کچا ساتھ۔ ننھے ننھے بلکتے بچّوں کو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح سنبھالا ہوگا۔ ان کے خیال ہی سے دل کٹتا ہے اب سوائے صبر اور دُعائے مغفرت کے کوئی چارہ نہیں۔ موت کے آگے سب عاجز ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر مرحمت فرمائے۔ احساسِ فرض کی ایسی مثال ملنی مشکل ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسے جانکاہ صدمے میں بھی ساقی کو فراموش نہیں کیا اور ایسی شدید پریشانیوں ہی میں اپنے مضمون کی دوسری قسط لکھکر بھیجی۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلے میں ناگوار تکلیف اُٹھانی پڑی ہوگی اس لئے شکرگذاری کے ساتھ ساتھ ہم معذرت خواہ بھی ہیں۔ ہمّت اور استقلال کا اتنا اعلیٰ نمونہ کم نظر آتا ہے۔

مرزا سیف علی خاں صاحب نے عورت کی تعلیم و تربیت اور اس کے حقوق کے سلسلے میں بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں۔ یہ مضامین توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ دسمبر میں ان کا ایک اور مضمون اِسی موضوع پر شائع ہونے والا ہے۔ ناظرین منتظر رہیں۔

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کی علالت ہنوز جاری ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے معالج نے اُنہیں خطوں کے جواب تک لکھنے سے منع کر دیا ہے، اس لئے ساقی کے ذریعے وہ ان سب بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے ازراہِ ہمدردی اُنہیں خطوط لکھے ہیں۔

سالنامۂ ساقی جنوری ۳۸ء میں چند بےمثل مضامین شائع ہونے والے ہیں۔ ان کی مفصّل فہرست آئندہ پرچے میں پیش کی جائیگی۔ دو تین کے نام سُن لیجئے:۔

"میکبتھ" مکمل ترجمہ از مولانا عنایت اللہ دہلوی۔ "فنِ افسانہ نویسی" از جناب ل۔ احمد۔ اکبرآبادی "نعرۂ انقلاب" از قاضی نذرالاسلام۔ مترجمہ اختر حسین رائے پوری۔ "خوابِ گریزپا" از گالزوردی، مترجمہ مسٹر صادق الخیری دہلوی۔ "فردوسِ گم گشتہ" از ملٹن۔ پہلی دو کتابوں کا ترجمہ۔

ہمیں افسوس ہے کہ نقد و تبصرہ کا حصّہ اب کے بھی شامل نہ ہوسکا۔ دسمبر کے پرچہ میں امید ہے کہ مطبوعاتِ موصولہ پر ہم اظہارِ خیال کرسکیں گے۔ اس تاخیر پر پبلشرز سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

شاہد

(بسلسلۂ گذشتہ)

سمبلین

چوتھا منظر:- برطانیہ کا ایک قید خانہ
پوستی مس اور دو جیلر آتے ہیں

پہلا جیلر:- بھلا اب تمہیں یہاں سے کون چوری میں لیجا سکتا ہے۔ تم پہ تو قفل جڑ دیے گئے ہیں۔ جہاں چارہ ملے وہیں چرتے رہو۔

دوسرا جیلر:- بشرطیکہ بھوک ہو۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

پوستی مس:- اے قیدِ زنداں تو میرے لئے مبارک ہو۔ تو ہی آزادی حاصل کرنیکا راستہ ہو۔ اے میرے ایمان اور اے میرے ضمیر تو نے مجھے زنجیروں میں اتنا جکڑا ہو کہ یہ ہاتھوں کی ہتکڑیاں اور پاؤں کی بیڑیاں بھی مجھے اتنا جکڑے نہیں ہیں۔ اے آسمان کے خداؤ تم مجھے توبہ وندامت کا وہ آلہ دو کہ جس سے میں ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوجاؤں، کیا یہی کہنا کافی ہوگا کہ جو کچھ ہوا اُس پر افسوس ہے۔ اور جس طرح دُنیا میں ماں باپ بچّوں کو سمجھاتے ہیں کہ خدا غفور و رحیم ہے' اور وہی ہمارے گناہوں کو بخشنے والا ہے میں بھی صبر کر کے بیٹھ جاؤں۔ یا میں توبہ کروں، ندامت و پشیمانی ظاہر کروں۔ نہیں ان سب باتوں سے تو یہی بہتر ہے کہ زنجیروں میں کسا پڑا رہوں۔ یہ زنجیریں پابند نہیں کرتیں کیونکہ وہ تو میری خواہش کے مطابق ہیں اگر روحانی آزادی کے لئے یہی چیزیں ضروری ہیں تو پھر اے خدا اس سے زیادہ مواخذہ نہ کر کہ جو کچھ میں رکھتا ہوں وہ سب مجھسے لے لے۔ خداؤ! مجھے علم ہے کہ تم بد انسان سے زیادہ رحمدل ہو' انسان اپنے قرضداروں سے قرضہ کا تہائی یا چھٹا یا دسواں حصّہ لیکر باقی اُن پر چھوڑ دیتا ہو کہ وہ پھلتے پھولتے رہیں۔ میرے لئے یہ بھی کافی نہیں۔ ایموجن کی جان کے بدلے میری جان لے لو۔ میری جان اتنی گراں قیمت نہیں ہے جیسے کہ ایموجن کی جان تھی، مگر پھر بھی وہ ایک جان ہے۔ خداؤ! تمہارے ہی ہاتھوں کی وہ ایک چیز تھی۔ جھوٹے سکّے لینے میں کون اُن کو پرکھتا ہے۔ صرف چہرہ شاہی دیکھکر اُنہیں قبول کر لیتے ہیں۔ پھر اس صورت کو قبول کرو۔ وہ میری نہیں تمہاری ہی شبیہ ہے۔ بس اے آسمان کی قوتو! اگر اِس طرح حساب کرنا ہے تو یہ جان لے لو۔ اور ان سرد اور بھاری زنجیروں کو کھول دو۔ ایموجن میں تجھ سے ہمکلام ہوں گا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہونگا۔

(موسیقی کی صدائیں سُنی جاتی ہیں، پوستی مس کے باپ اسکیلیوس لیوتوس کی روح ایک غبار کی شکل میں نظر آتی ہے' یہ رُوح ایک بڑے مرد معمر کی ہے اور ہاتھ میں ہاتھ دئے ایک بُڑھیا عورت اس کے ساتھ ہے' یہ اسکیلیوس کی بیوی اور پوستی مس کی ماں ہے۔ ان کے آگے آگے موسیقی ہے اور ان کے بعد لیونتی یعنی پوستی مس کے دونوں بھائی ہیں اور اُن کے جسموں پر زخم ہیں کیونکہ وہ لڑائی میں کام آئے تھے' پوستی مس قید خانہ میں زمین پر پڑا سوتا ہے' یہ سب روحیں اِس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑی ہوجاتی ہیں)

اسکیلیوس:- اے برق و رعد کے مالک بس کر۔ انسان غریب جان ہو، وہ تیری نظروں میں اتنا ہی کمزور اور بے حقیقت ہے جیسے اُس کی نظروں میں مکھیاں ہوں۔ اِس غریب نے کیا ہو گا۔

مقابلہ کرنا۔ لڑنا ہے تو خدائے جنگ مارس سے لڑ یا شکایت کرنی ہے تو دیبی جونو سے کر جو تیری ریا کاریوں پر تجھے ملامت کرتی ہے اور تجھ سے انتقام کے درپے رہتی ہے میرے اس غریب فرزند نے سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں کیا اور یہ فرزند وہ ہے جس کی صورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی تھی جس وقت یہ رحمِ مادر میں فطرت کے وقت موعود کا منتظر تھا تو میں مرچکا تھا اور جس وقت دُنیا میں وہ آیا اُس وقت تُو ہی اُس کا باپ تھا، دُنیا کہتی ہے کہ یتیموں کا باپ تیرے سوا دوسرا نہیں۔ پس باپ بن کر تو نے اُسے دُنیا کی آفات سے بچایا ہوتا۔

ماں :۔ لوکینا دیبی جو بچّوں کو پیدا کرکے دُنیا کی روشنی اُنہیں دکھاتی ہے تو نے میری مدد نہ کی اور دردِ زہ کی حالت میں مجھے دُنیا سے اُٹھا لیا اُس حال میں پوستی مس نے میرے بطن سے نکل کر رو رو کر دُنیا کے دشمنوں میں قدم رکھا۔ یہ بچّہ اس وقت واجب الرحم تھا۔

اسکیلیوس :۔ فطرت نے اِس بچّے کی صورت و شکل اِس کے کے بڑوں کی طرح ایسی اچھی اور پاکیزہ بنائی تھی کہ دُنیا اُس کی تعریف کرتی تھی اور اُسے لیونتی کی نسل سے کہہ کر پُکارتی تھی اور اِسے شیریں میوہ سمجھ کر اِس کے حاصل کرنے کے درپے رہتی تھی۔ ایموجن کی نظر میں اِس کی قدر و قیمت بہت تھی۔

پہلا بھائی :۔ جب وہ جوان ہوا تو برطانیہ میں جہاں وہ رہتا تھا دوسرا اِس کے مثل نہ تھا اور ایموجن کا جس سے بڑھ کر کوئی اِس کی قدر و قیمت نہ جانتا تھا وہ منظورِ نظر ہوگیا۔

ماں :۔ تو پھر شادی کرنے پر کیوں لوگ اُس کے دشمن ہوگئے اور اُسے جلاوطن کردیا گیا اور لیونتی کے درجے سے گرادیا گیا۔ اور کیوں اسکو اس چیز سے جو اُسکو سب سے زیادہ عزیز تھی حسین ایموجن سے جُدا کردیا۔

اسکیلیوس :۔ اور تو اٹلی کے کمینے اور ذلیل آدمی یاچیمو کیا وجہ تھی کہ تُو نے پوستی مس کے شریف دل و دماغ میں ایموجن کی طرف سے بدگمانی پیدا کی جس سے کوئی فائدہ نہ نکلا۔ تو نے اپنی خباثت کا اُسے نشانہ بنایا اور بس۔

دوسرا بھائی :۔ اور اسی لئے ہم یعنی اس کے والدین اور دونوں بھائی اپنے امن و عافیت کا مسکن چھوڑ کر یہاں آئے ہیں اور ہم دونوں بھائی وہ ہیں۔ جو اپنے ملک کی محبّت میں دشمن سے جان توڑ کر لڑے تھے اور اسی میں مارے گئے تھے۔ ہم بادشاہ لی نانشوس کے حقوق کے حامی اور اُسکی عزّت کے ہمیشہ خواہاں رہے تھے۔

پہلا بھائی :۔ اور اسی طرح ہمارے بھائی پوستی مس نے بادشاہ سمبلین کے لئے سختیاں اُٹھائیں تو پھر اے خداؤں کے خدا جوپیٹر تو نے کیوں اُس کے نیک کاموں اور حقوق کیطرف سے اپنی نظرِ مہر ہٹالی اور اس کی نیکیوں کی جزا میں التوا کررہا ہے۔

اسکیلیوس :۔ بس اے جوپیٹر اپنے قصرِ بلوریں کا دریچہ کھول اور باہر دیکھ اور اتنا سخت نقصان اپنی ایک بہادر قوم کو نہ پہونچا۔

ماں :۔ جوپیٹر! ہمارا فرزند نیک ہے۔ اس کی مصیبتوں کو دُور کردے۔

اسکیلیوس :۔ جوپیٹر! اپنے قصرِ مرمریں سے جھانک ہماری مدد کر، ورنہ پھر ہم روحیں رُو رُو کر جملہ اربابِ فلک کی انجمن میں تیری خدائی کے خلاف فریاد کریں گے۔

دونوں بھائی :۔ جوپیٹر! ہماری مدد کر۔ ورنہ ہم تیرے انصاف سے بھاگ کر کسی بڑی عدالت میں تیرے فیصلے کا مرافعہ کرینگے۔

(جوپیٹر ایک عقاب پر بیٹھا آسمان پر ظاہر ہوتا ہے۔ کڑک بجلیوں میں سے ایک خدنگِ آتشیں کو نشانہ بنا کر زمین پر لگاتا ہے۔ روحیں سب دو زانو ہو کر اُسے تعظیم دیتی ہیں)

جوپیٹر:۔ بس خاموش۔ اے طبقۂ اسفل کی رُوحو! چُپ رہو۔ تم کیونکر مجھ کڑکنے گرجنے والے پر الزام رکھتی ہو میں وہ ہوں جس کا خدنگِ آتشیں آسمان سے چھوٹ کر تمام باغی ساحلوں کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ اے عرش کی پرچھائیوں تم پھولوں کے تختوں کو جہاں پھول کبھی نہیں کملاتے واپس جاؤ۔ اور دُنیا کے مکرُوہات سے اپنے تئیں پریشان نہ کرو۔ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ تمکو معلوم رہے کہ یہ سب کام ہمارے ہیں جن سے ہمیں زیادہ محبت ہوتی ہے اونپر ہم تکلیفیں ڈالتے ہیں اور اُنکو اُن کے نیک کاموں کا اجر دیتے ہیں تاخیر کرتے ہیں کہ لینے والے کو یہ اجر اور گراں بہا معلوم ہو۔ تمہارا فرزند جو اسوقت مصیبت میں ہے اسکو ہم پھر سرافراز کرینگے۔ راحت و آرام پھر اسکو دیا جائیگا۔ اس کی آزمائش پوری ہوچکی ہے۔ ولادت کے وقت وہ ہمارے ستارے کے عمل میں تھا۔ اور ہمارے ہی ہیکل میں اُس کی شادی رچی تھی۔ بس اُٹھو اور غائب ہو جاؤ۔ تمہارا فرزند خاتون اِنوجن کا مالک اور شوہر ہوگا اور اس وقت کی مصیبتیں اسکے زیادہ عیش و آرام کا موجب ہونگی۔ یہ تختی ہم تمہیں دیتے ہیں۔ اسے پوسٹی مس کے سینہ پر رکھدو۔ اس تختی پر ہم نے اپنے رحم و کرم سے اس کی اچھی تقدیر لکھدی ہے۔ بس اب جاؤ۔ شکوہ و شکایت کے شور سے اپنی بیخبری ظاہر نہ کرو۔ کیونکہ اس بات سے ہمیں غصہ آتا ہے۔ اے عقاب اب اُونچا اُڑ اور ہمیں ہمارے قصرِ بلوریں میں پہنچا دے۔

اسکیلیوس:۔ وہ کڑک بجلی کے ساتھ نمودار ہوا اُس کے آسمانی نفس میں گندھک کی بُو تھی اور عقاب اس طرح ہماری طرف دیکھتا تھا۔ گویا اپنے پنجوں میں ہمیں پکڑ لیگا عقاب کا اُونچا اُڑ کر وہاں جانا جہاں جوپیٹر رہتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جو ہمارے مبارک مسکن سے بھی زیادہ حسین اور برکت والا ہے۔ یہ کُل باتیں ہمارے حق میں مُفید ہوئی ہیں اور یہ شاہی پرندہ جب منقار سے اپنے لازوال پروں کو صاف کرتا ہے تو یہ وقت وہ ہوتا ہے جب اُسکا مالک اُس سے خوش ہوتا ہے۔

سب ملکر کہتے ہیں:۔ جوپیٹر! ہم سب تیرے شکر گذار ہوئے۔

اسکیلیوس:۔ عرش کا فرشِ مرمریں جہاں سے شق ہوا تھا وہیں جڑ گیا یعنی جوپیٹر اپنے نورانی قصر میں پہنچ گیا ہمیں اب یہ تختی اُس کے حکم کے مطابق پوسٹی مس کے سینہ پر رکھدینی چاہیئے۔

(روحیں غائب ہو جاتی ہیں)

پوسٹی مس:۔ (جاگ اُٹھتا ہے) یہ نیند تو میرے حق میں میرا داتا بن گئی۔ تو ہی نے میرے باپ کو مجھ پر ظاہر کیا اور تو ہی نے میری ماں اور دونوں بھائیوں کو زندہ کر دکھایا۔ مگر وائے بدقسمتی۔ صورتیں دکھا کر وہ چلے گئے۔ پیدا ہوتے ہی فنا بھی ہو گئے۔ وہ قسمت کے مارے جو بڑے لوگوں کی خوشنودی پر جیتے ہیں اُن کو ایسے ہی خواب نظر آیا کرتے ہیں جیسے کہ مجھے اس وقت نظر آیا تھا۔ یعنی بیدار ہوتے ہی کچھ نہیں رہتا۔ گو یہ مصیبت زدہ کسی لائق نہیں ہوتے پھر بھی اُن پر نوازشات عنایات بکثرت ہوتی ہیں۔ اور یہی حال میرا ہے کہ ایسا زریں اتفاق میرے لئے پیدا ہوا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کیوں ایسا ہوا۔ کہیں پریوں کا گذر تو یہاں نہیں ہے۔ ہائیں۔ یہ تختی

کیسی ہے کیسی نادر و نایاب شے معلوم ہو رہی ہے لیکن اس خیالی دُنیا میں تو کوئی ایسا لباس نہ ثابت ہو جو پہننے والے سے بہتر ہو، نیز مضمون اور اُس کے اثرات ہمارے درباریوں کی خصلت سے مختلف ہوں اور جن باتوں کا وعدہ اس میں ہو وہ وعدہ ایفا ہو جائے ....

(تختی کا مضمون پڑھتا ہے) "جب کوئی شیر ببر کا بچّہ، جسے نہیں معلوم کہ فی الواقع وہ بچّہ شیر ہے بلا جستجو و تلاش معلوم کریگا کہ ہاں وہ ایسا ہی ہے اور وہ امن سلامتی کی فضا میں اپنے تئیں پا ئیگا۔ اور جبکہ ایک رفیع الشان شجر صنوبر کی شاخیں جو کاٹ دی گئی تھیں اور سالہا سال سے مُردہ پڑی تھیں پھر سر سبز ہو کر اپنے اصل درخت میں پھوٹ کر بڑھینگی۔ اُس وقت پوستی مس کی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی اور برطانیہ پھر خوش قسمت بنکر امن اور نعمتہائے فراواں میں پھولے پھلے گا۔" یہ مضمون تو وہ ہے جسے کوئی مجنوں بھی زبان پر لانیکو دماغ سے نہیں نکالیگا۔ یا یہ محض خواب ہے یا کسی دیوانے کی بڑ ہے۔ یا دونوں چیزیں ملی جلی ہیں۔ یا پھر یہ ایک مہمل تقریر ہے۔ یا کوئی ایسی بات ہے جس کی شرح عقل نہیں کر سکتی۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو۔ میری زندگی کے اکثر کام اُس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اِس لئے محض ہمدردی کے خیال سے اُسے اپنے پاس رکھتا ہوں۔

(دونوں جیلر پھر اندر آتے ہیں)

پہلا جیلر:۔ اے جناب والا، موت کیلئے تیار ہو جایئے۔

پوستی مس:۔ تیار ہونا کیسا، میں تو انتظار میں بُھنا جاتا ہوں۔ موت کیلئے تیار تو میں مدّت سے ہو چکا ہوں۔

پہلا جیلر:۔ حکم پھانسی پر چڑھنے کا آیا ہے۔ اگر آپ اسکے لئے تیار ہیں تو خاصے بُھنے بُھنائے ہیں گوشت وہی اچھا پکتا ہے جو پہلے لٹکا دیا گیا ہو۔

پوستی مس:۔ اگر تماشائیوں کے لئے عمدہ غذا ثابت ہوا تو پھر کھانے کے دام پورے وصول ہو جائیں گے۔

پہلا جیلر:۔ مگر آپ کو تو بڑا بھاری حساب چُکانا ہوگا۔ مگر اس میں سہولیت یہی ہوگی کہ آپ کو کچھ دینا نہ پڑیگا۔ اب شراب خانہ کے بلوں کا آپ کو کیا ڈر ہے۔ شراب کے دام دیتے وقت اتنا ہی افسوس ہوتا ہے جتنا کہ اسکے مہیّا کرنے کے وقت مسرت ہوتی ہے۔ پہلے تو آپ فاقوں کے مارے غش پر غش کھاتے آتے ہیں مگر جب واپس جاتے ہیں تو خوشیوں میں جھومتے ہوئے جاتے ہیں افسوس ہے تو اس کا ہے کہ آپکو بہت کچھ دینا پڑا اور بہت کچھ لینا بھی پڑا۔ دماغ بھی اندر سے کھوکلا ہوا اور جیب بھی خالی ہوئی۔ سر تو بوجھل اس وجہ سے ہوا کہ عقل ہلکی پڑ گئی تھی اور جیب یوں ہلکی ہوئی کہ سر بوجھل ہو گیا تھا۔ اب ایسی متضاد باتوں سے آپ فارغ ہوئے مگر کیا بات اس دمڑی کی رسّی کے ٹکڑے کی کہ آناً فاناً میں ہزاروں کا حساب بیباق کر دیا۔ اس رسّی کے ٹکڑے کے برابر کوئی بہی کھاتہ نہیں، قرضہ جو کچھ تھا یا اب ہے یا آیندہ ہوگا اس میں دام دام وصول ہو گئے اور جب یہی حساب کتاب آپ کی گردن کے لئے تختہ بنا تو پوری رسید بھی آپکو مل گئی۔

پوستی مس:۔ میں مرنے سے اتنا خوش ہوں کہ تو زندہ رہنے سے نہیں ہو سکتا۔

پہلا جیلر:۔ واقعہ بھی یہی ہے۔ انسان جو سوتا ہوتا ہے اُسے سونے میں ڈاڑھ کا درد کب معلوم ہوتا ہو مگر جو شخص آپکی نیند سوئے گا اور ملازمت میں ایک جلاد بھی ہوگا تاکہ آپکو آپکے بستر تک پہونچائے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ آپ جلاد سے اور جلاد آپ سے اپنی جگہ بدلنی چاہینگے کیونکہ آپکو

یہ معلوم نہ ہوگا کہ آپ کو کس طرف جانا ہے ۔

پوستی مس :۔ نہیں مجھے سب معلوم ہے ۔

پہلا جیلر :۔ تو پھر سمجھنا چاہیئے کہ آپکی موت کے سر میں آنکھیں ہیں۔ میری نظر سے موت کی کوئی تصویر ایسی نہیں گذری۔ تو پھر کوئی ایسا شخص آپکو راستہ بتائیگا جو رستہ معلوم کرنا اپنے ذمہ لیگا یا پھر آپ اپنے ذمہ وہ چیز لیں گے جس کا علم آپکو نہیں ہے یا پھر اس تحقیقات کو آیندہ پر چھوڑ دینگے۔ اور جو خطرہ پیش آئے اُسے برداشت کریں گے۔ رہی یہ بات کہ آپ منزل تک کیونکر پہونچے تو ظاہر کہ منزل تک پہونچنے کا حال آپ کب بتانے آتے ہیں۔

پوستی مس :۔ جیلر سُن۔ کوئی ایسا نہیں ہے جس کے پاس اِس رستے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ہوں جس رستے اب میں جانے والا ہوں سوائے اُن کے جو آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دیکھتے نہیں۔

پہلا جیلر :۔ بھلا اِس سے بڑھکر اور کیا تمسخر ہوگا کہ مُنہ پر آنکھیں ہوں مگر وہ صرف ظلمت کا راستہ دیکھنے کے لئے ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ پھانسی پانا ہی آنکھیں بند کرکے راستہ ڈھونڈھنا ہے ۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے)

قاصد :۔ جیلر! قیدی کی ہتکڑیاں فوراً کاٹ دو اور اُسے بادشاہ کے سامنے حاضر کرو۔

پوستی مس :۔ قاصد تم خبر اچھی لائے ہیں آزاد کئے جانے کے لئے طلب کیا گیا ہونگا۔

پہلا جیلر :۔ تو پھر کیا پھانسی پر میں چڑھایا جاؤنگا۔

پوستی مس :۔ تو پھر تم بھی جیل کی خدمتوں سے آزاد ہو جاؤگے۔ مُردوں کو کہاں دروازے بند کرنے قفل لگانے پڑتے ہیں۔

(سب چلے جاتے ہیں صرف پہلا جیلر رہ جاتا ہے)

پہلا جیلر :۔ یہ بات تو اور ہے کہ کوئی پھانسی سے بیاہ کرکے چھوٹی چھوٹی پھانسیاں پیدا کرے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی مجرم کو مرنے پر اسدرجہ آمادہ نہیں دیکھا تھا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ اس سے بڑھکر بدمعاش ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ ان میں چاہے کوئی رومانی ہی کیوں نہ ہو مگر اُن میں چند ایسے ہی ہوتے ہیں جنہیں اپنی مرضی کے خلاف مرنا پڑتا ہے اور یہی حال میرا ہو کہ اگر مجھے پھانسی کا حُکم ملے۔ کاش سب کی طبیعت ایک سی ہوتی اور طبیعت بھی اچھی ہوتی تو پھر پھانسیوں کی ضرورت ہوتی نہ پھانسی دینے والوں کی۔ یہ بات میں اپنے پیشے کے خلاف کہہ رہا ہوں مگر دل یہی چاہتا ہے کہ پھانسیاں موقوف ہو جائیں۔

پانچواں منظر :۔ سمبلین کا شاہی خیمہ۔

سمبلین، بلاریوس، اگدریوس۔ اروبرگس۔
پیسانیو۔ اور امراء دربار یعہ حکام سرکاری اور ملازمین کے داخل ہوتے ہیں۔

سمبلین :۔ آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔ خداؤں کو یہی منظور تھا کہ تم ہماری جان بچانے والے ثابت ہو مگر اس وقت افسوس ہے کہ وہ غریب مفلس سپاہی جو لڑنے میں جان کھوئے ڈالتا تھا اور جس کے غصّے کے سامنے بڑے بڑے چمکتے ہتیار رکھنے والے شرمندہ اور خجل ہوئے جاتے تھے اور جو اپنا برہنہ سینہ بڑھائے اُن لوگوں کے مقابل آتا تھا جو لاسکے فریق کے آدمی تھے اور جن کے پاس ایسی مضبوط ڈھالیں تھیں کہ کوئی ہتیار اُن پر اثر نہ کرسکتا تھا وہ کہیں نہیں ملتا۔ تلاش کرنے پر بھی اُس کا پتہ نہیں چلتا۔ جو شخص اُسے ڈھونڈھکر

لائیگا وہ ہمارے انعام و اکرام کا مستحق ہوگا۔
بلاریوس:- ایسے ادنیٰ آدمی میں ایسا شریفانہ غصّہ میری نظر سے کبھی نہ گذرا تھا ایک ایسے ادنیٰ آدمی سے جس سے سوائے اس کے یہ توقع نہ تھی کہ وہ سوال کرے ہاتھ پھیلائے یا افسردہ نظروں سے خالی بیٹھا ہے۔ ایسے شجاعت کے کام ہونے پر حیرت ہوتی ہے۔
سمبلین:- اس کی کچھ خبر نہ آئی؟
پسانیو:- حضور! اُسے مُردوں اور زندوں دونوں میں تلاش کیا جارہا ہی مگر ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔
سمبلین:- تو پھر جس انعام کا وہ مستحق ہے اس کا وارث میں خود ہی رہا (بلاریوس اور اروپرگس سے مخاطب ہوتا ہے) اور تم جو برطانیہ کا دل و دماغ، قلب و جگر ہو میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ تمہاری ہی وجہ سے اس وقت برطانیہ زندہ بچا اور اب وقت ہی کہ میں دریافت کروں کہ آپ کہاں سے آتے ہیں۔ ضرور اتنا مجھے بتائیے۔
بلاریوس:- شاہا! علاقہ کمبریا ہمارا مولد ہے گھرانے کے ہم شریف ہیں اس کے سوا کسی بات پر فخر کرنا نہ تو درست ہوگا اور نہ شرم و حیا اس کی اجازت دیتی ہی اتنا البتہ کہتا ہوں کہ ہم سب ایمان رکھنے والے لوگ ہیں۔
سمبلین:- زمین پر گھٹنے ٹیکئے اور لڑائی کے نائٹ بن کر اُٹھیئے۔ میں آپکو آج سے اپنی جان اور ذات کا محافظ و نگراں مقرر کرتا ہوں اور آپ سبکو حسب حیثیت انعام و اکرام سے مالامال کرونگا۔

(کورنیلیوس طبیب اور چند خواصیں آتی ہیں)

کورنیلیوس:- زندہ بادشاہ عالیجاہ! حضور کی خوشی کو تلخ کرنے کے لئے یہ عرض کرتا ہی کہ ملکہ گذر گئیں۔
سمبلین:- جب طبیب ایسی خبر دے تو پھر اس سے بدتر خبر کیا ہوسکتی ہے؟ میں سمجھتا تھا کہ علاج اور دوا سے ابھی ملکہ کچھ اور زندہ رہیں گی۔ مگر موت تو وہ ہے جو ایک دن طبیب کی جان بھی قبض کریگی۔ انتقال کس طرح ہوا۔
کورنیلیوس:- حالت جنون میں سخت درد و عذاب کے ساتھ جان دی۔ اور وہ زندگی جو دوسروں کے حق میں جور و ظلم کی تھی اب مرنے والی کے حق میں ایسی ہی موذی ثابت ہوئی۔ مرتے وقت جن باتوں کا اُنہوں نے اقرار کیا اگر حکم اور اجازت ہو تو عرض کروں؟ ملکہ کی یہ خواصیں حاضر ہیں اگر میرے بیان میں کوئی غلطی ہوگی تو یہ اس کی صحت کردینگی۔ یہ خواصیں رخساروں کو آنسوؤں میں تر کئے اُس وقت موجود تھیں جبکہ ملکہ کا دم نکلا ہے۔
سمبلین:- ہاں مہربانی کرکے ضرور بیان کرو۔
کورنیلیوس:- پہلی بات جس کا ملکہ نے مرتے وقت اقرار کیا یہ تھی کہ اُنہیں آپ سے مطلق محبّت نہ تھی جو کچھ محبّت تھی وہ اُس شان اور بزرگی کی تھی جو حضور کی وجہ سے اُنہیں حاصل تھی۔ آپکی ذات سے اُنہیں مطلق الفت نہ تھی شادی اُنہوں نے آپ سے نہیں بلکہ حضور کی بادشاہی سے کی تھی اور وہ بیوی دراصل آپکی نہ تھیں بلکہ آپ کے منصب اور درجے کی تھیں خود حضور کی ذات سے اُنہیں نفرت تھی۔
سمبلین:- اگر یہ باتیں وہ اپنے دل ہی میں رکھتی اور مرتے وقت زبان پر نہ لاتی تو اس کے کہنے پر بھی مجھے یقین نہ آتا۔ اور کیا کہا؟
کورنیلیوس:- آپ کی بیٹی جس سے جھوٹی محبّت ظاہر کرکے ہمیشہ بڑی ہوشیاری سے اُسے دھوکے دیتی رہی تھیں اُسکے بارے میں اپنی زبان سے کہا کہ وہ اُنکی نظر میں عقرب سے کم نہ تھی اتفاق سے وہ چلی گئی تھی ورنہ زہر دیکر اسے ہلاک کردیتیں۔

سمبلین:۔ اے نازنین و نازک ترین ڈائن۔ عورت کے دل کا حال کسے معلوم ہوسکتا ہے۔ کچھ اور بھی کہا۔؟

کورنیلیوس:۔ حضور اور یہی کہا اور جو کچھ کہا وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ مرتے وقت بیان کیا کہ اس کے پاس ایک ایسا زہر تھا جس کے کھانے سے کھانے والے کی زندگی ہر آن اور ہر لحظہ کم ہوتی جاتی ہے۔ موت رفتہ رفتہ آتی ہے اور اس زمانے میں کہ زہر بتدریج حضور پر اثر کرے۔ اسکا مقصد تھا کہ رو رو کر آپ کی تیمارداری میں مصروف رہے کبھی آپکے ہاتھ چومے اور کبھی پاؤں تاکہ آپکا دل اس کے مصنوعی اور جھوٹی ہمدردی سے متاثر رہے۔ اور جب آپکے مرنے کا وقت آئے۔ تو اپنے بیٹے کو آپکا متبنےٰ قرار دے کر تاج برطانیہ کا وارث بنادے لیکن اپنے بیٹے کے یہاں سے غائب ہوجانے پر اس کا رنج و غصہ اتنا بڑھا کہ شرم و حیا بالکل جاتی رہی، نہ دل میں خدا کا خوف رہا نہ انسان کا، اور اپنے یہ سب منصوبے زبان پر لے آئی اور جو جو خرابیاں اُس نے سوچ رکھی تھیں جب وہ پوری نہ ہوئیں تو خجل اور مایوس ہوکر مرگئی۔

سمبلین:۔ خواصوں! کیا تم نے بھی یہ سب کچھ سُنا۔

سبھی خواص:۔ حضور! ہم نے اپنے کانوں سے یہ سب کچھ سُنا۔

سمبلین:۔ میری آنکھوں کا قصور نہ تھا کیونکہ وہ واقعی حسین تھی۔ اور نہ میرے کانوں کا قصور ہے کہ اس کی خوشامد اور چاپلوسی کی باتیں سُنتا رہا جو فی الحقیقت نہایت دلکش اور پُراثر تھیں اور نہ دل کی خطا تھی کہ اس کے ظاہر کو اچھا دیکھکر اس کے باطن کو بھی اچھا سمجھا کیونکہ اس حالت میں اس کا اعتبار نہ کرنا ایک قسم کا گناہ ہوتا۔ لیکن اے میری پیاری بیٹی! تو اپنے دل میں یہی کہتی ہوگی کہ یہ سب میری حماقتیں تھیں جسکا حماقت ہونا تو اپنے تجربہ سے ثابت کرسکتی ہے۔ خدا سے اُمید رکھنی چاہیئے کہ وہ یہ سب باتیں درست کردیگا۔

(لیوکوس رومانی سپہ سالار، نجومی اور رومانی اسیرانِ جنگ جنکے گرد پہرا لگا ہے اندر آتے ہیں، انکے پیچھے پیچھے پوستی مس اور ایموجن ہیں۔)

کاسیس لیوکوس:۔ اس وقت تو تم ہم سے خراج طلب کرنے نہیں آئے ہو جسے اب برطانیہ والوں نے یکقلم منسوخ کردیا ہے گو اس میں ان کے بڑے بڑے بہادروں کی جانیں تلف ہوئی ہیں جو بہادر اس معرکہ میں کام آئے ہیں انکے عزیزوں اور رشتہ داروں نے درخواست دی ہے کہ اُنکے مُردوں کی رُوحوں کو آرام دینے کے لئے ہم تمکو جواب اُنکے اسیر ہو قتل کردیں۔ ہم نے اُنکی درخواست منظور کرلی ہے۔ اب تم اپنی حالت پر غور کرو۔

لیوکوس:۔ آپ خود غور فرمائیں یہ تو لڑائی کے اتفاقات ہیں یہ اتفاق تھا کہ فتح آپکو ہوگئی اگر ہم فتحیاب ہوتے تو غصہ ٹھنڈا ہونے پر اپنے قیدیوں پر تلوار ہرگز نہ چلاتے لیکن جب خداؤں کی یہی مرضی ہے کہ بجُز ہماری جانوں کے اور کوئی چیز فدیہ میں نہ لیجائے تو پھر جو مرضی ہے وہی ہونے دیجئے۔ ایک رومانی کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ایک رومانی کی طرح صبر و استقلال سے جان دے۔ قیصر اغسطس زندہ ہے اور وہی اسباب پر غور کریگا کہ ہم پر کیا گذری۔ یہانتک تو مجھے اپنی ذات کے بارے میں کہنا تھا اب صرف ایک امر میں حضور سے خاص طور پر عرض کرتا ہوں، یہ لڑکا جو میرا ملازم ہے برطانوی ہے، وہ اسی ملک کی پیدائش ہے اس کے لئے زر فدیہ لیکر اُسے رہا کردیا جائے۔ دُنیا میں کبھی کسی آقا کو ایسی محبت کا آدمی جسے اپنے فرائض منصبی

اِسدرجہ خیال ہو، اتنا محنتی اتنا جفاکش اور اپنے آقا کی راحت و آرام کا خیال کرنے والا سچّا وفادار، ہمہ وقت خدمت کو حاضر آرام پہنچانے میں مثل بچّے کی دایہ کے، ہرگز کسی کو نہ ملا ہوگا اُس کی ان خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ میری التجا کو بھی شامل سمجھا جائے جو اس وقت میں نے حضور کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہے اور اُمید کرتا ہوں میری یہ درخواست نامنظور نہ فرمائی جائیگی۔ اُس نے کسی برطانوی کو نقصان نہیں پہنچایا درحالیکہ وہ ایک رومی کا ملازم تھا۔ حضور اِس لڑکے کی جان بخشی فرمائیں، اور چاہے کسی کا خون معاف نہ کریں۔

سمبلین:۔ میں نے اِسے کہیں دیکھا ہے اُس کی صورت سے آشنا معلوم ہوتا ہوں۔ لڑکے ہم تجھ پر مہربان ہوئے۔ اور آج سے تو ہمارا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا بات ہے، بیساختہ مُنہ سے نکلتا ہے کہ اے لڑکے تو زندہ رہ اور جو جان بخشی تیری کرتا ہوں اُسکا احسان ماننے کی تو مجھے ضرورت نہیں۔ جو کچھ تو مانگے گا ہماری فیاضی اور اپنی حیثیت کا خیال کرکے وہی تجھے ہم دینگے حتیٰ کہ اگر تو کسی رومانی قیدی کی جان بخشی بھی چاہے گا تو ہم منظور کرینگے۔

ایموجن:۔ میں حضور والا کا نہایت عجز و انکسار اور ادب کے ساتھ شکر گذار ہوا۔

لیوکوس:۔ لڑکے میں نہیں چاہتا کہ تو میری جان بخشی چاہے مگر دل یہی کہتا ہے کہ تو ایسا ہی کریگا۔

ایموجن:۔ نہیں، ابھی مجھے کچھ اور کام کرنا ہے۔ اسوقت میں ایک ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جسکی تلخی موت کی تلخی سے بھی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ میرے آقا آپکی جان بچے یا جائے یہ بات بعد کو دیکھنے کی ہے۔

لیوکوس:۔ افسوس۔ یہ لڑکا اب مجھ سے بے اعتنائی کرنے لگا۔ علیحدہ ہوتے ہی مجھ سے نفرت ظاہر کرنے لگا۔ سچ ہے اُن کی مسرتیں بالکل عارضی ہوتی ہیں جو لڑکوں یا لڑکیوں کی محبت پر بھروسہ کریں، مگر معلوم نہیں یہ لڑکا اس وقت کیوں اتنا پریشان ہے۔

سمبلین:۔ اے لڑکے بتا تو کیا چاہتا ہے۔ مجھے تو تجھ سے ہر لحظہ محبت بڑھتی جاتی ہے، تیرا خیال بار بار آتا ہے۔ جو کچھ تیرے دل میں اس وقت ہے اُسے خوب سوچ سمجھ لے۔ جدھر تو دیکھ رہا ہے کیا وہاں کوئی چیز درکار ہے۔ کیا اس آدمی کی جان بچانا چاہتا ہے کیا وہ تیرا کوئی عزیز یا خیر طلب ہے۔

ایموجن:۔ حضور جس کی طرف میں دیکھ رہا ہوں وہ ایک رومانی ہے اُس سے مجھ سے کوئی قرابت نہیں ہے اور اگر ہے تو اتنی ہی ہے جسقدر کہ مجھ میں اور حضور میں ہے چونکہ میں حضور کی رعیت ہوں اس وجہ سے میں بہ نسبت اسکے حضور سے زیادہ قرابت رکھتا ہوں۔

سمبلین:۔ تو کیوں اُدھر غور سے دیکھے جاتا ہے؟

ایموجن:۔ اگر حکم ہو تو حضور سے کچھ علیحدہ عرض کرنے کی اجازت ہو۔

سمبلین:۔ بڑی خوشی سے جو کچھ تو کہے گا ہم اُسے بغور سُنیں گے۔ تیرا نام کیا ہے۔

ایموجن:۔ حضور! مجھے فیڈلی کہتے ہیں۔

سمبلین:۔ اے نیک لڑکے تو ہمارا غلام ہے اور ہم تیرے آقا ہیں۔ آ۔ ہمارے ساتھ چل اور جو کچھ تجھے کہنا ہے وہ کہہ۔

(سمبلین اور ایموجن علیحدہ کچھ بات چیت کرتے ہیں)

بلاریوس:۔ کیا یہ لڑکا مر کر پھر زندہ ہوا ہے۔

اروبرگس:۔ ریت کا ایک ذرّہ دوسرے ذرّہ سے اتنا مُشابہ

نہیں جسقدر کہ یہ لڑکا اُس حسین لڑکے سے جسکا نام فیدلی تھا ہمشکل ہی۔ کیوں بھائی گدریوس؟ تمہارا کیا خیال ہی۔

گدریوس:۔ یہ تو وہی مُردہ پھر جی اُٹھا ہی۔

بلاریوس:۔ اچھا ذرا اور غور سے دیکھ لو۔ اسوقت وہ ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہی کہ دو آدمی ہمشکل ہوتے ہیں اگر یہ فیدلی ہوتا تو ہمیں دیکھکر ضرور بات چیت کرتا۔

گدریوس:۔ مگر ہم تو اُسے مُردہ دیکھ چکے ہیں۔

بلاریوس:۔ چُپ رہو۔ اب ذرا غور سے دیکھ لو۔

پسانیو:۔ (علیحدہ کہتا ہی) یہ تو میری آقا ہی۔ وہ اپنی جان سے جیتی ہے اب جو کچھ ہی گذرے گذر جانے دو۔

(سمبلین اور امبوجن کچھ بات کر کے پھر آتے ہیں)

سمبلین:۔ لڑکے ادھر آ۔ ہمارے پاس کھڑا ہو اور جو کچھ مانگتا ہے بآواز بلند مانگ۔ یاچیمو تم آگے بڑھو اور جو کچھ یہ لڑکا پوچھے اس کا جواب دو۔ جواب بالکل صحیح اور صاف ہو۔ ورنہ ہم اپنے دبدبہ شاہی سے جسنے ہمیں عزت دشان بخشی ہے واقعات کی چھان بین کر کے سچ کو جھوٹ سے نکال لیں گے۔ لڑکے تجھے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ؟

امبوجن:۔ میرا سوال صرف اتنا ہی کہ یہ انگوٹھی جو اُنکے ہاتھ میں ہے انہیں کہاں سے ملی۔

پوستی مس:۔ اِس لڑکے کو انگوٹھی سے کیا واسطہ ہوسکتا ہی۔

سمبلین:۔ یاچیمو! بتاؤ یہ ہیرے کی انگوٹھی تمہاری اُنگلی میں کیسے آئی۔

یاچیمو:۔ میں اِسبات کے بتانے سے عذاب میں مُبتلا ہونگا اور پھر یہ عذاب آپکے درد و الم کا موجب ہوگا۔

سمبلین:۔ میرے درد و الم کا باعث کیوں ہوگا۔

یاچیمو:۔ میں خوش ہوں کہ اسوقت مجھ سے وہ بات کہلوائی جاتی ہے۔ جسے مخفی رکھنے سے میں سخت حالتِ عذاب میں ہوں۔ سُنیئے! یہ انگوٹھی دغا اور فریب سے حاصل کی ہے اور یہ ہیرا دراصل لیونتوس کا ہے جسے حضور نے اپنی ملکیت سے خارج کیا ہے اور آپکو سُنکر افسوس ہوگا جیسا کہ مجھے افسوس ہے کہ اُس سے زیادہ شریف و نجیب آسمان کے نیچے اِس دُنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ حضور بادشاہ سلامت اگر واقعات سُننا چاہیں تو عرض کروں۔

سمبلین:۔ جو کچھ اِس خاص امر کے متعلق کہو گے ہم سُنیں گے۔

یاچیمو:۔ آپکی وہ عدیم المثال دختر جس کے لئے میرا دل خون روتا ہے اور میری گنہگار رُوح واقعات کو یاد کر کے لرز اُٹھتی ہی اگر اُنکی اجازت ہو تو عرض کروں۔ مجھے غش آرہا ہی۔

سمبلین:۔ "میری دختر" یہ کیا بات ہوئی۔ یاچیمو! میں چاہتا ہوں کہ جب تک تمہاری زندگی ہے تم زندہ رہو اور اس معاملے میں جو کچھ مجھے سُننا ہی اِس سے پہلے تم نہ مروت ہمت نہ ہارو۔ حواس درست کرو۔ اور جو کچھ کہنا ہی کہو۔

یاچیمو:۔ ایک زمانہ ہوتا ہی اور نحس تھی وہ گھڑی جو سر پر آئی کہ شہر روما میں ایک گھر میں جسپر خدا کی نعمت ہو ایک ضیافت میں ہم شریک تھے۔ کاش اِس ضیافت کے کھانوں میں زہر ملا ہوتا! بالخصوص اُس کھانے میں جو میرے سامنے رکھا تھا۔ پوستی مس وہاں افسردہ خاطر بیٹھا تھا۔ اچھا ہوتا کہ ایسے بُرے لوگوں کی صحبت میں نہ ہوتا۔ شریفوں اور نیک بختوں میں وہ بہترین شخص تھا۔ ہوتے ہوتے حسینانِ اٹلی کی تعریفیں ہم کرنے لگے۔ یہ تعریفیں وہ سُنتا رہا۔ ہم اُن کے حُسن و جمال کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے تھے اور مبالغہ بھی اتنا کرتے تھے کہ جس کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ ہم اُن کی خوش قدی اور تناسب اعضاء کی

مدح سرائی میں اتنا غلو کرتے تھے کہ گویا وینس دیبی اور منیروا کے قدیم مجسمے بھی اُن کے بے دھجے کے سامنے گرد ہیں گویا وہ متاع حسن و زیبائی کی ایک دکان ہیں جسے دیکھکر ہر مرد کو انکا عشق ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ ان میں وہ عشوہ و ناز بھی ہے جو مرد کو عورت کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

سمبلین:۔ میں تو انتظار میں تھکا جا رہا ہوں۔ جو بات سننے کی ہے وہ جلد بیان کیجائے۔

یا چیمو:۔ اگر حضور جلد اذیت اُٹھانی چاہتے ہیں تو میں بھی یہ قصہ جلد بیان کرتا ہوں۔ پوستی مس ایک شریف امیرزادے کی مثل ایک خاتون سے عشق رکھتا تھا۔ یہ خاتون شاہی خاندان سے تھی۔ اِس وجہ سے وہ ہماری باتوں کی طرف متوجہ ہوا اور جن کی ہم تعریف کرتے تھے اُن کی تعریف میں کسی قسم کی کمی کئے بغیر (اور اس میں واقعی اُس نے اپنی شرافت کا پورا ثبوت دیا) اُس نے اپنی بیوی کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچا جس میں نہ صرف حسنِ صورت کا ذکر تھا بلکہ حسن سیرت بھی شامل تھا تو ہم سبکو ایسا معلوم ہونے لگا کہ جن عورتوں کی ہم تعریف کرتے تھے وہ اُس کی بیوی کے مقابلہ میں باورچی خانے کی میلی کچیلی مامائیں ہیں۔ زبان کی لطافت اور شیرینی اور پھر دل کا خلوص اِس بیان میں کچھ ایسے آمیز تھے کہ ہم سب اس کے سامنے احمق معلوم ہونے لگے۔

سمبلین:۔ مطلب کی بات کہو۔

یا چیمو:۔ سنیں حضور! مطلب یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اثنائے گفتگو میں آپکی دختر کی عصمت و عفت کے متعلق بحث ہونے لگی۔ پوستی مس کہنے لگا کہ وانیا دیبی کی نسبت آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں بشریت نفس تھی مگر میری بیوی کی طبیعت پاک صاف اور سرد ہے۔ اس پر مجھ بدبخت نے اسکی تعریف میں شبہ ظاہر کیا اور میں نے کہا کہ لیجئے یہ اشرفیاں موجود ہیں۔ اگر میں آپکی بیوی کے ساتھ ہم بستر نہ ہوا تو یہ اشرفیاں آپکی ہیں ورنہ آپ کی انگوٹھی میری ہو جائیگی۔ مگر پوستی مس بڑا سچا آدمی تھا اور اسکو اپنی بیوی کی پاکدامنی پر پورا اعتبار تھا اور اُس کی بیوی کی پاکدامنی وہ تھی جسے آزمائش کے بعد میں نے سچا پایا۔ غرض پوستی مس نے اپنی انگوٹھی شرط میں لگادی۔ انگوٹھی میں ہیرا تھا۔ یہ ہیرا تو کیا چیز ہے اگر یہ ایسا یاقوت ہی ہوتا جو سورج دیوتا کے رتھ میں لگانے کے قابل ہوتا اور اس کی قیمت پورے رتھ کی قیمت کے برابر ہوتی تو بھی پوستی مس کو اُسے شرط میں لگا دینے میں دریغ نہ ہوتا۔ اِس شرط کے بعد میں فوراً برطانیہ میں اسی قصد اور ارادے سے آیا۔ حضور کو میرا دربار میں حاضر ہونا یاد ہوگا۔ جب شہزادی صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو اچھی طرح سبق ملا۔ کہ سچے عشق اور پاپ میں کیا فرق ہے۔ جب نا اُمید ہوا تو اب میرے دماغ نے خبث و شیطنت کے ساتھ عمل شروع کیا۔ برطانیہ میں موسم کی سختی کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کے دماغ سست و ناکارہ ہوتے ہیں۔ میں اٹلی کا رہنے والا تھا یہاں میرے دماغ نے خوب کام دیا۔ غرضیکہ مختصر عرض ہے کہ اب جو تدبیر میں نے سوچی اس میں بے حد کامیابی ہوئی اور جب میں اٹلی واپس گیا تو جو کچھ میں نے اپنی کامیابی کے ثبوت میں بیان کیا اُس نے شریف لیونتوس کو دیوانہ کر دیا۔ چند نشانیاں اور علامتیں بھی میں نے اُسے بتائیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے اُس کی بیوی سے اُسے بدگمان کر دیا۔ شہزادی کی خوابگاہ میں جو تصویریں دیواروں پر لٹکی تھیں اُن کا حال بیان کیا اور یہ جوشن اُسے دکھایا جسے فی الواقع دھوکے سے میں نے حاصل کیا تھا بلکہ اس کے جسم کے چند خفیہ نشانات بھی بتائے غرضیکہ لیونتوس کو یقین ہوگیا کہ

اُس کی بیوی کی عصمت میں مَیں واقعی خلل انداز ہوا ہوں۔ اور اس طرح جو شرط بدی گئی تھی وہ مَیں جیت گیا میں سمجھتا ہوں لیوناتوس یہاں موجود ہے۔

پوستی مس :۔ (آگے بڑھ کر)۔ ہاں او بے ایمان، اٹلی کے شیطان تو نے یہی کیا اور افسوس مجھ بدنصیب زود اعتقاد احمق، بے درد قاتل اور سارق پر۔ یا جو لقب دُنیا کے اُن خبیثوں پہ جو گزر گئے ہیں یا اب موجود ہیں یا آیندہ ہوں موزوں ہو، مجھے دو، اور افسوس کرو۔ اے کوئی رسّی کا ٹکڑا یا چاقو یا چھُری مجھے دو۔ یا کوئی ایسی چیز دو کہ میں اپنے کئے کو پہنچوں۔ اے بادشاہ جسقدر عذاب دینے کے آلے اور شکنجے تیرے پاس ہوں اُنہیں طلب کر، میں وہ ہوں۔ جو دُنیا کی بدترین مخلوق ہوں بلکہ اُس سے بھی بدتر اپنے کو شمار کرتا ہوں۔ میں پوستی مس ہوں، جس نے حضور کی بیٹی کو قتل کروا دیا۔ ایک مردود شیطان اور خبیث کی طرح اس وقت حضور کے سامنے حاضر ہوں۔ جس نے ایک کم درجہ کے شیطان اور سارق کو ایسا کرنے کا اشارہ کیا۔ آپکی بیٹی خوبیوں اور نیکیوں کا ایک مجسمہ تھی بلکہ وہ مجسّم نیکی تھی۔ لوگو! مجھ پر تھوکو، پتھر اور کیچڑ برساؤ گلی کوچوں کے کتوں کو مجھ پر اُشتسکار دو۔ دُنیا کے ہر بدمعاش کا نام لیوناتوس پوستی مس رکھدو جو شیطنیت اور خباثت ہو چکی ہے پھر اُس کے برابر نہ ہوگی۔ ہائے ایموجن میری ملکہ۔ میری زندگی، میری بیوی، ہائے ایموجن۔ ایموجن۔ ایموجن۔

ایموجن :۔ خاموش۔ اے میرے مالک اور آقا۔

پوستی مس :۔ اے شریر لڑکے کیا تو میری ہنسی اُڑاتا ہے۔ کیا میرا کوئی تماشا بنا کر دکھائیگا (ایموجن کو مارتا ہے وہ گر پڑتی ہے)

پسانیو :۔ شریفو! مدد کرو۔ یہ لڑکا نہیں ہے ہماری آقا اور بیگم ہے، اے آقا پوستی مس آپنے ایموجن کو اب قتل کیا ہے، اب تک آپ اُس کے قاتل نہ تھے۔ لوگو۔ مدد کرو۔ یہ معزز خاتون ہے۔

سمبلین :۔ کیا دُنیا واقعی چکر میں آ گئی ہے۔

پوستی مس :۔ یہ واقعات کیسے پیش آ رہے ہیں جن سے غش پر غش آتا ہے۔

پسانیو :۔ میری بیگم، میرے آقا آپ اُٹھیں۔ جاگیں، بیدار ہوں۔

سمبلین :۔ اگر یہی حال ہے تو پھر خداؤں کا قصد یہی ہے کہ مجھے ہدف بنائیں اور خوشی سے میں ہلاک ہو جاؤں۔

پسانیو :۔ میری بیگم، حضور کا مزاج کیسا ہے۔

ایموجن :۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دُور رہو۔ تونے مجھے زہر دیا تھا۔ تو خطرناک آدمی ہے، یہاں سے دفع ہو۔

سمبلین :۔ آواز تو ایموجن کی سی ہے۔

پسانیو :۔ میری آقا۔ میری بیگم، خدا مجھ پر آسمان سے جلتی گندھک کے ٹکڑے برسائے، وہ صندوقچی آپ کو کسی اور خیال سے دی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اُس میں اکسیر ہے۔ صندوقچی مجھے ملکہ نے دی تھی۔

سمبلین :۔ کیسی نئی نئی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔

ایموجن :۔ اس صندوقچی میں زہر تھا اور اُس کا اثر مجھ پر ہوا۔

کورنیلیوس طبیب :۔ خدایا! ملکہ نے مرتے وقت جن باتوں کا اقرار کیا تھا اُن میں ایک بات کہنے کو میں بھول گیا تھا، یہ بات ایسی ہے جو پسانیو کو بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ ملکہ نے کہا تھا کہ اگر پسانیو نے اپنی بیگم کو وہ معجون جسے میں نے اکسیر بنا کر ملکہ کو دیا تھا دیدی تو پھر ایموجن کے ساتھ میرا

سلوک وہی ہوگا جو ایک چوہے کو زہر دیکر ہوتا ہے۔
سمبلین:۔ کورنیلیوس! یہ کیا بات ہوئی۔
کورنیلیوس طبیب:۔ حضور والا، ملکہ اکثر فرمائش کیا کرتی تھیں کہ میں طرح طرح کے زہر تیار کرکے پیش کیا کروں تاکہ وہ ان زہروں سے زہریلے جانوروں، کتوں اور بلیوں کو مارا کریں۔ یا ایسی چیز کو ہلاک کریں جن کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو۔ میں یہ سنکر ڈرا اور مجھے شبہ گذرا کہ کہیں ملکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں استعمال نہ کریں، چنانچہ میں نے ایک ایسی دوا تیار کرکے دی تھی جس کے استعمال سے انسان کے حواسوں کا فعل معطل ہوجاتے مگر تھوڑی دیر میں فطرت کی تمام قوتیں بیدار ہوکر اپنا عمل کرنے لگیں۔ ایموجن سے دریافت کیا جائے کیا آپ نے اسے کھایا تھا۔
ایموجن:۔ ہاں غالبًا وہی دوا میں نے کھائی تھی۔ کیونکہ میں اس کے کھاتے ہی مرگئی تھی۔
بلاریوس:۔ لڑکو! دیکھا ہماری غلطی تھی۔
گدریوس:۔ یہ تو یقینًا فیدلی ہے۔
ایموجن:۔ (پوستی مس سے کہتی ہے) تم نے کیوں اپنی بیاہتا بیوی کو اپنے سے جدا کردیا۔ جو عقد ہم میں تم میں ہوچکا تھا وہی قایم ہے۔ کیا پھر مجھے جدا کردو گے۔
(پوستی مس کے گلے سے لگ جاتی ہے)
پوستی مس:۔ جیسے شاخ پر پھل ہوتا ہے اس طرح گلے لگی رہو۔ یہاں تک کہ درخت خشک ہوجائے۔ اے میری جان! اے میری روح۔
سمبلین:۔ میری بیٹی۔ میری جگر پارہ، مجھ سے تو کیوں الگ تھلگ ہے۔ کیا میں بات کرنیکے قابل نہیں رہا۔
ایموجن:۔ (دوزانو ہوکر کہتی ہے) میرے حق میں دعا فرمائیں۔

بلاریوس:۔ (گدریوس اور ارویرگس سے کہتا ہے) گو اس نوجوان لڑکے سے مجھے محبت تھی مگر اس میں میرا قصور نہ تھا البتہ تمہاری محبت کی خاص وجہ تھی۔
سمبلین:۔ (بیٹی سے کہتا ہے) میری آنکھوں سے جو آنسو گرتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ تیرے حق میں آب مقدس ثابت ہوں۔ ایموجن تمہاری ماں کا انتقال ہوگیا۔
ایموجن:۔ حضور! مجھے اس کا افسوس ہے۔
سمبلین:۔ وہ مفسد اور شریر تھی، یہ اسی کی شرارت تھی کہ آج اتنی مدت کے بعد ہم دونوں ملتے ہیں، اس کا بیٹا بھی غائب ہے۔ نہیں معلوم کہ وہ کیونکر چلا گیا اور اب کہاں ہے۔
پسانیو:۔ حضور! اب مجھے کسی بات کا خوف نہیں، جو کچھ عرض کرونگا۔ سچ عرض کرونگا۔ جب میری آقا یعنی شہزادی صاحبہ کہیں چلی گئیں تو ملکہ کے فرزند میرے پاس آئے۔ منہ میں غصہ سے جھاگ بھرے تھے اور قسم کھا کر مجھ سے کہنے لگے کہ اگر تو نے نہ بتایا کہ شہزادی صاحبہ کہاں گئیں تو میں فورًا تیری گردن اڑا دونگا۔ اتفاق سے میری جیب میں ایک خط اپنے آقا کا پڑا تھا، اس خط میں لکھا تھا کہ میں پوستی مس تجھ سے ملفوردسون کے پہاڑوں کے قریب ملونگا۔ اسے پڑھتے ہی کلوٹن کے سر پر غضب سوار ہوا اور انھوں نے میرے آقا کے کپڑے مجھ سے جبرًا طلب کئے انہیں پہنتے ہی وہ اپنے ناپاک مقصد اور ارادے کو پورا کرنے کے لئے فورًا روانہ ہوگئے اور قسم کھاکر کہا کہ میں تیری آقا کی عصمت شکنی کرونگا۔ اس کے بعد کلوٹن پر کیا گذری مجھے اسکا علم نہیں۔
گدریوس:۔ اجازت ہو کہ میں اس قصہ کو ختم کردوں۔ میں نے کلوٹن کو وہاں قتل کردیا۔
سمبلین:۔ خداؤں سے پناہ مانگتا ہوں، تم نے آج ایسے ایسے

بہادری اور شجاعت کے کام کئے ہیں کہ دل نہیں چاہتا کہ کوئی سخت حکم تمہارے بارے میں زبان سے نکلے۔ اے بہادر نوجوان جو کچھ تم کہتے ہو اُس سے انکار کردو۔

گدریوس:- میں تو کہہ چکا کہ میں نے اُسے قتل کردیا۔

سمبلین:- کلوٹن شہزادہ تھا؟

گدریوس:- مگر گستاخ۔ بیہودہ اور ناشائستہ جو جو بدسلوکیاں اُس نے میرے ساتھ کیں وہ ہرگز ایک شہزادے کو زیب نہ دیتی تھیں، نہایت سخت ناشائستہ الفاظ اتنا شور مچا مچا کر میری نسبت کہے کہ اگر سمندر میں بھی وہ جوش وخروش ہوتا تو میں اُس کی بھی پروا نہ کرتا۔ میں نے اُس کا سر قلم کردیا اور میں خوش ہوں کہ آج وہ یہاں کھڑا یہ قصہ بیان نہیں کرتا۔

سمبلین:- مجھے تمہارے حال پر افسوس ہوتا ہے تم خود اپنی زبان سے اپنے جرم کا اقبال کررہے ہو۔ ہمارے ملک کے قانون کے مطابق تم سزائے قتل کے مستوجب ہو اور تم قتل کئے جاؤگے۔

ایموجن:- اس بن سر کی لاش کو تو میں اپنے شوہر کی لاش سمجھی تھی۔

سمبلین:- قاتل کی مشکیں کس لی جائیں اور اُسے ہمارے سامنے سے ہٹالیا جائے۔

بلاریوس:- عالیجاہ! ذرا توقف فرمائیں۔ یہ شخص جس نے کلوٹن کو مارا ہے کلوٹن سے بہتر آدمی ہے اور ایسے والدین کا فرزند ہے جیسے والدین کے فرزند آپ ہیں اور آپ سے ایسے انعام کا مستحق ہے جو کلوٹن کا ایک پورا طبقہ بھی مستحق نہیں ہوسکتا (سپاہیوں سے کہتا ہے) بازوؤں کو ہاتھ نہ لگاؤ یہ ہاتھ مشکیں کسنے کیلئے نہیں ہیں۔

سمبلین:- اے بڈھے سپاہی! کیا تو اپنے اوپر ہمارا غضب نازل کرکے اپنی اُن خدمتوں کو جو تو نے کی ہیں غارت کرنا چاہتا ہے؟ ابھی تو تجھے تیرے کارناموں کا صلہ بھی نہیں ملا ہے۔ تم نے کیسے کہا کہ یہ شخص ایسے ہی باپ کی اولاد ہے جیسے کہ میں ہوں۔

اروریگس:- اس میں اُس نے حقیقت سے بھی بڑھکر بات کہی ہے۔

سمبلین:- اور ایسی بات کہنے پر وہ قتل کیا جائیگا۔

بلاریوس:- ہم تینوں ساتھ قتل ہونگے لیکن ہم تینوں میں دو ایسے اچھے ہیں جیسے کہ ان میں سے ایک کی نسبت کہہ چکا ہوں۔ میرے پیارے بچو! جب تک میرا تعلق تم سے ہے میں اس وقت ایک ایسی خطرناک تقریر کرنیوالا ہوں جس میں تمہارا فائدہ ہے۔

اروریگس:- آپ کو اگر خطرہ ہے تو ہمکو بھی وہی خطرہ ہے۔

بلاریوس:- جو بات دراصل ہے اجازت ہو تو عرض کروں۔ اے بادشاہ! آپکی رعایا میں ایک شخص تھا جسے بلاریوس کہتے تھے۔

سمبلین:- اس کا یہاں کیا ذکر ہے وہ تو ایک سرکش باغی تھا جو یہاں سے جلاوطن کردیا گیا۔

بلاریوس:- وہی شخص اتنا بوڑھا ہوکر آج حضور کے سامنے حاضر ہے۔ وہ جلاوطن ضرور ہوا تھا مگر مجھے اس کا علم نہیں کہ وہ سرکش و باغی بھی تھا۔

سمبلین:- اسے یہاں سے لیجاؤ۔ اگر تمام دنیا اس کی سفارش کرے تب بھی اُس کی جان سلامت نہیں رہ سکتی۔

بلاریوس:- حضور اتنا غصہ نہ کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے ان دونوں فرزندوں کی پرورش میں جو کچھ میرا صرف ہوا ہے وہ ادا کریں اور جو رقم اس طرح آپ ادا کریں وہ ادا کرتے ہی ضبط کرلیں۔

سمبلین:- یہ تم نے کیا کہا کہ میرے دو فرزندوں کو تم نے

بلاریوس:- میں صاف گو اور دریدہ دہن ہوں۔ اور کسی قدر غصّے میں بھی ہوں۔ میں حضور کے سامنے دوزانو ہوتا ہوں لیکن اُٹھنے سے پہلے اپنے دو بیٹے پیش کرتا ہوں تاکہ آپکے بُڈھے باپ کی جان بخشی ہو۔ اے شاہ ذی جاہ! یہ دونوں شریف جو مجھے باپ کہتے ہیں میرے بچے نہیں ہیں یہ آپکے فرزند ہیں اور آپکے خون سے پیدا ہوئے ہیں۔

سمبلین:- میرے بچے کیسے۔

بلاریوس:- اِس بات کا یقین ایسا کیجئے جیسے کہ آپکو اپنے باپ کا بچہ ہونے کا یقین ہے۔ سُنیئے میں جواب مورگن کا نام رکھتا ہوں وہی بلاریوس ہوں جس کو مدّت ہوئی کہ آپ نے جلا وطن کیا تھا۔ میرا جُرم محض آپ کی خوشی اور ایک خیال تھا۔ میری سزا اور میری شجاعت جس میں میں نے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائیں وہی نقصان تھا جو میں نے آپکا کیا تھا۔ یہ شریف شہزادے، جو شریف ہی ہیں اور شہزادے بھی آج بیس۲۰ برس سے میں اُن کی پرورش کرتا رہا ہوں اور اِس کُل زمانے میں ان کی تعلیم و تربیت کرتا رہا جو علم میں جانتا تھا وہ سب انکو سکھائے۔ میری تعلیم و تربیت جیسی کچھ تھی حضور اس سے واقف ہیں۔ ان کی دایہ یوریفلی تھی جس سے میں نے ان شہزادوں کو چُرانے کے لئے عقد کر لیا تھا۔ جو کچھ میرا قصور قرار دیا گیا تھا جب کہ اس کی سزا مجھے مِل چکی ہے تو میں نے اُس دایہ سے شہزادوں کے چُرانے کی تحریک کی جب خیر خواہی اور وفاداری کے بدلے مجھے جلاوطنی کی سزا ملی تو پھر واقعی میں حضور سے باغی ہو گیا۔ جس قدر زیادہ اِن بچّوں کے چوری جانے سے حضور کی تکلیف بڑھتی تھی اُسی قدر میری غرض چُرانے کی پوری ہوتی تھی لیکن شاہا! آپکے دونوں فرزند پھر حضور کے سامنے موجود ہیں اور اب میں ان دونوں سے جو دُنیا میں میرے بڑے پیارے ساتھی تھے جُدا ہوتا ہوں۔ اس سر پر چھائے ہوئے آسمان کی برکتیں ان پر ہمیشہ نازل رہیں اور مثل شبنم کے وہ ان پر برستی رہیں کیونکہ وہ اِس قابل ہیں کہ آسمان پر ستارے بن کر اُس کی زیب و زینت ہوں۔

سمبلین:- تم رُو رُو کر اپنا بیان دے رہے ہو۔ گویا تمہارے آنسو جو کچھ تم کہتے ہو اُسپر گواہی دے رہے ہیں لیکن تم تینوں نے جو خدمت آج کی ہے اُس کا ثبوت باور کرنا اتنا دشوار نہ تھا جس قدر اِس قصّے کا باور کرنا جو اِس وقت کہہ رہے ہو۔ میرے بچّے کھوئے ضرور گئے تھے۔ اگر یہ وہی ہیں تو میں نہیں جانتا کہ ان سے بہتر فرزندوں کی تمنّا کوئی باپ کیسے کر سکتا ہے۔

بلاریوس:- تھوڑی دیر اور توقّف فرمائیں، یہ نوجوان جسے میں پولیدور کہتا ہوں یہ حضور کا گدریوس ہے اور یہ دوسرا نوجوان جس کا نام میں نے کاڈول رکھا تھا وہ آپکا ارویرگس ہے۔ یہ آپ کا چھوٹا فرزند ہے جس وقت سے چُرایا تھا تو وہ ایک عجیب و غریب شال میں لپٹا تھا۔ جو خود اُس کی ماں ملکہ نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا اور اس کے ثبوت میں وہ شال پیش کر سکتا ہوں۔

سمبلین:- گدریوس کی گردن پر ایک تل تھا جس کی شکل ستارے کی سی تھی اور وہ عجیب قدرتی نشان تھا۔

بلاریوس:- گدریوس موجود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ گردن پر قدرت کا وہ نشان اب تک موجود ہے فطرت کی گویا غرض ہی یہی تھی کہ اس وقت وہ اس کی شناخت کی مکمل شہادت ہو جائے۔

سمبلین:- واہ! اِس وقت میری کیفیت کیا عجیب ہے میں ایک ماں ہوں جس کے تین بچّے ہیں کوئی ماں بھی اپنے بطن سے اتنے بچّے ہونے پر اتنی خوش نہ ہو گی جیسا کہ میں ہوں۔

تم پہ خُدا کی برکتیں رہیں۔ تم وہ ستارے ہو جو اپنے فلک سے
جُدا ہو کر پھر اُسی میں گردش کرنے چلے آئے۔ ایموجن۔ بیٹی تجھے
اس واقعہ نے سلطنت سے محروم کر دیا۔

ایموجن:۔ نہیں حضور۔ مجھے تو دونوں عالموں کی سلطنت
مل گئی۔ پیارے بھائی! دیکھو خدا نے ہمیں پھر کس طرح ملایا۔
تم نے مجھے بھائی اس وقت کہا تھا جبکہ حقیقت میں میں
تمہاری بہن تھی اور جب میں نے تمکو بھائی کہا تھا۔ تو
فی الحقیقت تم میرے بھائی تھے۔

سمبلین:۔ کیا تم پہلے بھی مل چکے ہو۔

اردیرگس:۔ حضور! ہم پہلے مل چکے ہیں۔

گدریوس:۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ہم میں محبت پیدا
ہو گئی تھی اور ہماری محبت اس وقت تک قائم رہی جب
تک کہ ہم جسے بھائی سمجھ رہے تھے مر نہ گیا۔

کورنیلیوس طبیب:۔ اُسی ملکہ والی دوا کے کھانے سے۔

سمبلین:۔ اے عقل حیوانی، تو بھی عجیب قوت ہے۔ اِس
مختصر بیان میں واقعات کی اور شاخیں بھی ہیں جنکا حال
عجیب و غریب سانحات سے پُر ہے جس کا تفصیلی بیان
حقیقت کو واضح کریگا۔ مثلاً یہ کہ تم شہزادے کہاں اور
کس طرح رہتے تھے۔ اور ایموجن تم کس طرح ہمارے اس رومانی
قیدی کی ملازم ہوئیں۔ بھائیوں سے کیونکر مفارقت
ہوئی اُن سے پہلے کس طرح ملنا ہوا۔ اور ایموجن تمہیں یہ حال
بھی کہنا ہے کہ گھر سے کیوں نکلیں، اور جب نکلیں تو کس طرف
گئیں اور تم تینوں یعنی بلاریوس اور شہزادے لڑائی میں
تمہارے شامل ہونیکی کیا وجہ ہے اور ان کے علاوہ اور امور جو
اتفاق سے پیش ہوتے رہے سب معلوم کرنے ہیں لیکن
یہ وقت اور موقع نہیں ہے کہ ہم ان طولانی سوالات کے
جوابات دریافت کریں۔ دیکھو پوستیمس کس طرح ایموجن کا
سہارا لئے کھڑا ہے اور ایموجن کیسی ایک بے ضرر بجلی کی طرح کبھی
اپنے شوہر پر کبھی بھائیوں پر اور کبھی باپ پر نگاہ ڈالتی ہے۔
ہر چیز کو مسرت و شادمانی سے متاثر کرتی ہے اور یہی حال
خوشی سے اُن کا ہے جو متاثر ہو کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں۔
اب یہاں سے چلنا چاہیئے۔ اور سب جائیں میں جا کر بتوں
پر قربانیاں چڑھا کر خوشبودار دھونیوں سے انہیں بھر
دیتا ہوں (بلاریوس سے کہتا ہے) بلاریوس! تم میرے بھائی
ہو اور میں ہمیشہ تمہیں بھائی کہونگا۔

ایموجن:۔ (بلاریوس سے کہتی ہے) آپ بھی میرے باپ ہیں
کیونکہ آپ کے یہاں آرام پانے سے مجھے یہ مبارک دن
دیکھنا نصیب ہوا۔

سمبلین:۔ اِس وقت سوائے اسیرانِ جنگ کے سب خوش
ہیں، اِن اسیروں کو بھی خوش کر دیا جائے کہ وہ بھی ہمارے
لطف و کرم سے محظوظ ہوں۔

ایموجن:۔ اب مجھے اپنے رومانی آقا سے کہنا ہے کہ میں اب
آپکی خدمت کے لئے بھی تیار ہوں۔

لیوکوس:۔ تم خوش رہو۔

سمبلین:۔ وہ غریب سپاہی جو ہمارے لئے اپنی شرافت اور
جوانمردی سے لڑا تھا اُسکو بھی اِس مبارک وقت میں یہاں
آنا چاہیئے تھا اور جس وقت ہم خدا کا شکر ادا کریں تو اُسے
بھی یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔

پوستیمس:۔ حضور۔ میں وہی سپاہی ہوں جو ان تینوں
لڑنے والوں کے ساتھ تھا اور نہایت زردہ حالت میں حضور
کے لئے لڑا تھا۔ میری شکستہ حالی اس وقت اور مقصد کے
لئے مناسب تھی۔ یاچیمو۔ بتاؤ کیا میں نے ہی تمہیں مار کر
گرا دیا تھا اور جیسے تم کرتے تھے اگر چاہتا تو وہیں تمہیں ختم
بھی کر دیتا۔

پاچیمو:- (زمین پر گھٹنے ٹیک کر کہتا ہے) اس وقت میرے گناہوں کا بوجھ مجھ پر اس طرح گرا ہے جیسے کہ اس وقت زور و قوت نے مجھے گرایا تھا۔ یہ جان حاضر ہے۔ اسے آپ لے لیں اور یہی میری التجا ہے۔ یہ جان بطور فرض کے میرے پاس ہے۔ لیکن جان سے پہلے یہ انگوٹھی لیجئے اور یہ جوشن بھی حاضر ہے جو دنیا کی شہزادیوں میں سب سے پاک نفس شہزادی کا زیور ہے۔ جس نے مہر و وفا کی قسم کھائی تھی اور اس قسم میں وہ سچی رہی۔

پوستی مس:- میرے سامنے مت جھکو۔ جو کچھ زور طاقت مجھ میں ہے اس کا یہی حکم ہے کہ تیری جان بچا دوں اور جو کچھ اذیت و تکلیف تجھ سے پہنچی تھی وہ یہی کہتی ہے کہ تجھے معاف کر دوں۔ زندہ رہ اور آیندہ لوگوں کے ساتھ اپنا برتاؤ بہتر طریقہ کا رکھ۔

سمبلین:- خطا معاف کرنی طبیعت کی فیاضی ہے۔ ہم بھی اس بات کا سبق اپنے داماد سے لیتے ہیں اور اب ہمارا حکم یہی ہے کہ ہم نے سب کو معاف کیا۔

اروبریگس:- آپ نے اس معرکہ میں ہماری اتنی مدد کی تھی کہ ہمیں بھائی معلوم ہونے لگے تھے مگر اب یہ معلوم کر کے دل خوش ہوتا ہے کہ واقعی آپ ہمارے بھائی ہیں۔

پوستی مس:- شہزادگان عالی وقار۔ میں تو آپکا خادم ہوں اور اے روما کے سردار آپ اپنے نجومی کو طلب فرمائیں کیونکہ میں نے ابھی ایک خواب دیکھا تھا اور وہ یہ کہ خدائے جوپیٹر ایک عقاب پر سوار سامنے آیا ہے اور اسکے ہمراہ چند اور پاک مقدس روحیں ہیں جو میری ہی کنبہ اور خاندان کی معلوم ہو رہی ہیں جب میں بیدار ہوا تو یہ تختی میں نے اپنے سینہ پر رکھی پائی جو کچھ اس میں تحریر ہے وہ اتنا مشکل ہے کہ میں اس کے معنی نہ سمجھ سکا۔ اب اسکا مطلب بیان کرنے کے واسطے اس نجومی کو حکم دیں۔

لیوکوس:- فیلارمونس۔

نجومی:- حاضر ہوں۔ خداوند!

لیوکوس:- اس تختی میں جو کچھ لکھا ہے اس کے معنی بیان کرو۔

نجومی:- (تختی کی عبارت پڑھتا ہے) "جبکہ ایک بچہ شیر کو جو اپنے تئیں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے بادِ بہاری کا ایک ہلکا سا جھونکا اپنے گلے لگائے گا اور جبکہ ایک شاندار درخت صنوبر کی شاخیں جو برسوں ہوئے درخت سے کٹ گئیں تھیں اور مردہ و خشک ہو گئیں تھیں پھر سرسبز ہو کر اپنے اصلی درخت پر نمودار ہونگی اُس وقت پوستی مس کی مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ برطانیہ خوش قسمت رہے گا۔ امن اور نعمتوں کی فراوانی میں پھولتا پھلتا رہے گا۔"

لیونٹوس آپ وہ بچہ شیر ہیں اور یہی مفہوم آپکے نام کا ہے یعنی لیونٹس (شیر کا بچہ) (سمبلین سے مخاطب ہو کر) بادِ بہاری کے نرم جھونکے سے مراد آپکی نیک بخت بیٹی ہے ...... اور وہ اپنے شوہر کی نہایت وفادار بیوی ہے اور جو اس وقت ہی تختی کے مضمون کے مطابق بلا آپکے علم و تلاش کے اپنے شوہر کو نہایت مہر و وفا کے ساتھ لپٹی کھڑی ہے۔

سمبلین:- یہ بات تم نے قرینے کی کہی۔

نجومی:- شاندار درخت صنوبر سے مُراد خود بادشاہ سلامت ہیں اور اس شجر کی بُریدہ شاخوں سے مطلب آپکے یہ دونوں فرزند ہیں جنہیں بلاریوس چُرا لے گیا تھا اور جن کی نسبت برسوں سے خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں ہیں اب وہی شاخیں سرسبز ہو کر اس عالیشان درخت پر نمودار ہوئی ہیں جنکی اولاد سے اُمید کیجاتی ہے کہ برطانیہ

امن وسلامتی میں قایم رہ کر وہ ہر طرح نعمتوں سے مالامال رہیگا۔

سمبلین:۔ اچھا اپنی طرف سے امن وسلامتی کا دَور ہم ابھی سے شروع کرتے ہیں اور کاسیس لیوکوس سُنو کو ہم فاتح ہیں لیکن ہم قیصر اور رومانی سلطنت کی اطاعت قبول کرتے ہیں اور بقایا خراج کے ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں جسے ادا کرنا اپنی شریر ملکہ کے کہنے میں آکر ہم نے بند کر دیا تھا۔ اس شریر ملکہ اور اُس کی اولاد دونوں کو خدا نے انصاف کرکے غارت کر دیا ہے۔

نجومی:۔ خُدا خود آسمان پر بیٹھا اِس امن وسلامتی کے سازِ خوشنوا کے سُروں کو ہم آہنگ کرتا ہے اور جو خواب میں نے لیوکوس سے اِس لڑائی کے شروع میں جس کی آگ ابھی تک پوری ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے کہا تھا اسوقت اسکی تعبیر پوری ہوتی ہے "اِس خواب میں بیان کیا تھا کہ روما کا عقاب سمت جنوب سے مغرب کی طرف اُونچا اُڑتا ہوا آیا ہے اور سُورج کی کرنوں میں آکر نظر سے غائب ہو گیا ہے" اس سے خبر نکلتی تھی کہ ہمارا شاہی عقاب یعنی قیصر اپنے لُطف وکرم اور نوازشات کو مثل آفتاب کے درخشاں کرکے اسکا نور سمبلین پر برسائیگا اور سمبلین وہ ہے جسکا نور اسوقت مغرب میں چمک رہا ہے۔

سمبلین:۔ آؤ سب ملکر خدا کی تعریف کریں اور اپنے بُت خانوں کی مقدس قربان گاہوں سے دُھونیوں کے دل بادل اتنے اُٹھائیں کہ آسمان پر خُداؤں کے مشام تک وہ پہونچیں۔ ہم اپنی کُل رعایا میں امن کا اشتہار دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ رومانی اور برطانوی نشان دوستانہ طریقے پر ساتھ ساتھ اُڑاتے ہوئے بڑے بڑے جلوس بازاروں میں نکلیں اور جوپیٹر اکبر کے ہیکل میں اس امن وسلامتی کی تصدیق کی جاتے اور وہاں ضیافت عام کا سامان ہو۔ آج تک کوئی لڑائی اِس لڑائی کی مثل نہیں ہوئی ہوگی جس میں ابھی ہاتھوں سے خُون کے داغ دھوئے بھی نہیں گئے تھے کہ اِس طرح فریقین میں مصالحت اور امن قایم ہوگیا۔

ختم شُد

عنایت اللہ دہلوی:

"قوانینِ حیات"

(۱)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ نظروں سے گرایا جائیگا
نقش جو کہ شایاں نہیں دوبارہ اُبھرنے کیلئے
آپ مٹ جائیگا یا اُسکو مٹایا جائیگا

(۲)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ بے بس کر کے ستایا جائیگا
گر ذرا بھی جرأت کی گر جاں گسل آ گئی
خون پانی کی طرح اُس کا بہایا جائیگا

(۳)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ ٹھکرا کے گرایا جائیگا
جس کسی سے کھینچ نہیں سکتی ہے تصویرِ حیات
نقشِ باطل کی طرح اُسکو مٹایا جائیگا

(۴)

جھک گیا جو اور بھی اُسکو جھکایا جائیگا
دیدہ و دانستہ خاطر میں نہ لایا جائیگا
جس نے سیکھے ہی نہیں آدابِ محفل کے ابھی
وہ تو بیٹھا ناز سے اُس کو اُٹھایا جائیگا

امین حزیں (سیالکوٹی)

"ثمرات"

گذرتی ہے جو دل پر اے اسیرِ غم بیاں کرلے
خموشی پر گمانِ بے حسی کیوں ہو فغاں کرلے

اگر اپنے کو فطرت کا یہ انساں رازداں کرلے
ہر اک ذرّے سے پیدا بے تکلّف سو جہاں کرلے

غنیمت ہے جوانی پھر کہاں یہ عہدِ سرمستی
جہاں تک ہو سکے سیرِ خراباتِ مغاں کرلے

امیدِ دو جہاں بن جا اسیرِ خار و خس کب تک
نئی صورت سے ترتیبِ بنائے آشیاں کرلے

اسی پردے میں ہے رازِ طلسمِ کُن فکاں مضمر
جو تجھ سے ہو سکے تو اپنی ہستی کو عیاں کرلے

جہانِ ظلم جس سے لرزہ براندام ہو جائے
فغاں ہی تجھ کو کرنی ہے، تو پھر ایسی فغاں کرلے

میں جب قائل ہوں تیری ہمتِ ایذا پسندی کا
غمِ کون و مکاں کو اپنے دل میں میہماں کرلے

بہارِ جاوداں بنکر رہے جو لوحِ ہستی پر
تو اپنے گریۂ خوں کو وہ رنگیں داستاں کرلے

بشر کیواسطے عشقِ تمنّا ہے شہنشاہی
یہ وہ نقشِ گرامی ہے جو تسخیرِ جہاں کرلے

خطیبِ گلستاں ہے ہمنوائے گلستاں ہو جا
سمجھ لیں لالہ و گل جس کو پیدا وہ زباں کرلے

محبت بجلیوں سے کھیلنا خود سکھا جائیگی
نجاتِ آشیاں چاہے تو قدرِ آشیاں کرلے

سلیقہ کسکو مے نوشی کا ہے، کسکو نہیں ساقی
ہر اک کی جانچ فرمالے ہر اک کا امتحاں کرلے

فنا ہو کر جہانِ عشق میں، ہوجا بقا ساماں
اسی عمرِ دو روزہ کو حیاتِ جاوداں کرلے

شکستہ خاطروں کی تا بمنزل دستگیری کر
جو واماندہ ہیں اُنکو بھی شریکِ کارواں کرلے

ہے روحِ زندگی آزادیٔ افکار سے قائم
جو اس کو رائیگاں کرلے، وہ سب کچھ رائیگاں کرلے

ہر اک ذرّے کو کردے آشنا بامِ ثریا سے
زمیں کی جس قدر پستی ہے اوجِ آسماں کرلے

مرے ہر سانس میں ہیں جلوہ پیرا صد حیاتِ نو
غرض میری بلا کو ماتمِ عمرِ رواں کرلے

نہاںؔ زارِ تکلیفِ جہاں گردی سے میں چھوٹوں
مجھے جذبِ گلستاں، کاشِ خاکِ گلستاں کرلے

نہاں سیوہاروی

دُنیا کی ساتویں تعلیمی کانفرنس

دو برس سے اہلِ جاپان تعلیمی کانفرنس کی تیاری میں مُنہمک تھے۔ ۱۹۳۷ء کے شروع ہوتے ہی اس کا انتظامی دفتر علیحدہ قائم ہو گیا۔ جو کام اب تک جاپان کی تعلیمی انجمن انجام دے رہی تھی وہ اس کے سُپرد کر دیا گیا۔ ماہ مئی سے دُنیا کے مختلف حصص سے نمایندے آنے شروع ہوتے۔ آخر جولائی تک ان کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ ۲ اگست سے کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا اور ایک ہفتے تک جاری رہا۔ جاپانیوں نے کانفرنس کے انتظامات جس خوبی سے انجام دئے اُس کا نقش تمام نمایندوں کے دلوں پر ثبت ہے۔ اس سے بڑھ کر جن باتوں نے سب کے دلوں کو موہ لیا ہے وہ نمایندوں کا شاندار استقبال اور شاہی پیمانے پر مہمانداری ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد چند نیک نفس مُدرسین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مختلف ممالک کے تعلیمی اداروں کو متحد کر کے قیامِ امن کی تایئد میں اس اتحاد سے مدد لی جائے۔ چنانچہ پندرہ برس ہوئے امریکہ میں ایک انجمن نے جنم لیا جس کا نام ورلڈ فیڈریشن آف ایجوکیشن ایسوسیئیشنز ہے۔ اس کا مقصدِ اعظم یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے مختلف اقوام میں دوستی پیدا کی جائے۔ اس ورلڈ فیڈریشن کی کانفرنس ایک سال بیچ ہوتی ہے۔ اب تک اس کی چھ کانفرنسیں امریکہ اور یورپ میں ہو چکی ہیں۔ امسال ساتویں کانفرنس منعقد ہوئی ہے۔ فیڈریشن کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کی کانفرنس ایشیا کے ایک شہر میں ہوئی ہے۔ توکیو نے تمام ایشیا کی لاج رکھ لی۔

دو سال قبل جاپانی تعلیمی انجمن نے ساتویں کانفرنس کو توکیو میں مدعو کر کے اس کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اہلِ جاپان نہایت اعلیٰ درجے کی انتظامی قابلیت رکھتے ہیں۔ یہ جزئیات سے بے اعتنائی نہیں برتتے۔ بال کی کھال نکالنے کا ان میں خاص ملکہ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے انتظامات مکمل ہوتے ہیں۔ تعلیمی انجمن نے کام ہاتھ میں لیتے ہی اسے مختلف صیغوں میں بانٹ دیا۔ جن کے لعد میں بہت سے شعبے بن گئے۔ کام کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اوائل ۱۹۳۶ء میں سب کمیٹیوں کا عام اجلاس ہوا تو اس میں آٹھ سو اراکین موجود تھے۔

تمام دُنیا سے نمایندے آرہے تھے، لہذا ان کا استقبال اور مہمانداری ایک قومی فریضہ قرار دی گئی۔ حکومت نے ڈیڑھ لاکھ ین کا عطیہ دیا۔ ڈھائی لاکھ ین پبلک سے وصول ہوتے۔ اس چندے میں جاپان کا ایک ایک مدرس شریک ہوا ہے۔ مالی امداد کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی تعلیمی اور تمدنی انجمنوں اور اداروں نے بڑی فراخ دلی سے جاپانی تعلیمی انجمن کی امداد کی۔ کسی نے اپنے مقاصد اور کام کی رپورٹ کے پمفلٹ انگریزی میں طبع کرا کے مفت تقسیم کئے۔ کسی نے تحائف پیش کئے۔ کسی نے مختلف نمائشوں کا بار اپنے سر لیا۔ کسی نے نمایندوں کی تفریح کا مفت انتظام کیا۔ کسی نے پارٹیاں دیں۔ جہاز راں کمپنیوں نے اور جاپانی حکومت کی ریلوں نے کرائے میں تخفیف کر دی۔ ہوٹل والوں نے اپنے نرخ میں رعایت کر دی۔ میونسپلٹی نے اپنی ٹرمیوں کے مفت پاس دیدئے۔

سب سے زیادہ مہمان نوازی خود کانفرنس نے انجام دی۔ نمائندوں کی روزانہ آمد و رفت کا صرفہ بالکل بچا دیا۔ ہوٹلوں اور کانفرنس ہال کے درمیان بسیں جاری کردیں۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ روزانہ صبح کو ٹوکیو کی سیر کرانے کے لئے مفت بسیں چلتی تھیں۔ سہ پہر کو تعلیمی اور دیگر ادارے دکھانے لے جاتی تھیں اور شام کو گھر پہنچاتی تھیں۔ رات کو کوئی تقریب ہوتی تھی تو وہاں بھی بسیں موجود تھیں۔ ایک ہفتے تک نمائندوں کی جیب سے آمد و رفت اور سیر تفریح میں ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیا۔ بلکہ جس ادارے میں دیکھنے جاتے تھے وہاں چائے اور فواکہات سے بھی خاطر کی جاتی تھی۔ کانفرنس کے ڈائرکٹر صاحبان کو مزید مراعات حاصل تھیں مثلاً جاپانی ریلوں پر سفر کرنے کے لئے مفت پاس ملا ہوا تھا۔

جاپان میں غیر ملکیوں کو زبان کی اجنبیت کی وجہ سے سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے سیاح کم ہوتے ہیں جو دس بارہ ین روزانہ دے کر گائڈ ساتھ رکھ سکیں۔ کانفرنس نے ان دقتوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ نمائندوں کی امداد کے لئے یونیورسٹیوں اور کالجوں سے چار سو رضا کار حاصل کر لئے تھے جو انگریزی اچھی طرح بول سکتے تھے اور سب شریف خاندان تھے۔ ان میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو اپنی مُسکراہٹ سے دلوں کی کوفت دُور کرنے کا ملکہ رکھتی تھیں۔ یہ رضا کار ہوٹل اور کانفرنس ہال میں متعین تھے اور نمائندوں کی امداد کرنے کے علاوہ قابلِ دید مقامات و ادارے دکھانے کے لئے ساتھ جاتے تھے۔

خاطر تواضع کی حد ہے کہ نمائندوں کو ایسے ایسے مواقع دکھائے جاتے ہیں جو معمولی سیاحوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ عرصے کے رہنے والے یا اکابر رجال ہی ان سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ اہلِ جاپان اپنے مہمانوں کی تفریح کا بہت معقول انتظام کرتے ہیں۔ معلومات میں اضافے کا انتظام اس سے بھی زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں اس قدر معلومات فراہم کر دیتے ہیں کہ ہضم کرنا مُشکل ہوجاتا ہے۔

نمائندوں میں سب سے زیادہ خود جاپانی تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔ ان کو غیر ملکی نمائندوں کی سی مراعات حاصل نہ تھیں کیونکہ یہ خود میزبان تھے۔ ان کے مقابلے میں غیر ملکی نمائندے ایک ہزار تھے جن میں سے پانسو ممالک متحدہ امریکہ سے آئے تھے۔ دوسری جماعت کناڈا والوں کی تھی جو اسیٔ افراد پر مشتمل تھی۔ تیسرے نمبر پر ہندوستانی نمائندے تھے جن کی تعداد ستر تھی۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک بین الاقوامی انجمن کے اجلاس میں اہلِ ہند کی اتنی بڑی جماعت شریک ہوئی۔ اہلِ ہنود کے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ ساٹھ سے اُوپر اراکین انہی کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے جن میں ایک درجن سے اُوپر خواتین تھیں۔ اہلِ اسلام کے لئے یہ بات باعثِ شرم ہے کہ کوئی مرد ہندوستان سے نہیں آیا۔ ایک صاحب دُنیا کا دورہ کرتے ہوئے بیشک آپہنچے۔ دو عورتوں نے مسلمانوں کی لاج رکھی ہے۔ ان میں سے ایک یعنی مسز جمال الدین ہندوستانی نمائندوں میں سب سے پہلے جاپان پہنچیں۔ اور دوسری یعنی مس قمر جہاں جعفر علی عین وقت پر جاپان آئیں۔ ان کے علاوہ چار مسلمان نمائندے جاپان میں بنے جن میں سے تین عورتیں تھیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ بیرونی نمائندوں میں عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں۔

ہندوستانی نمائندوں میں دو اصحاب کو ورلڈ فیڈریشن کے ڈائرکٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اوّل مسٹر سیشادری

پرنسپل گورنمنٹ کالج اجمیر۔ دویم مسٹر انعام دار ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ریاست اندر راجپوتانہ۔ نمائندگان ہند کے انتخاب صدر کا مسئلہ بڑا پُرلطف رہا مسٹر سبشادری نے چائے کی پارٹی پر تمام نمائندوں کو بلایا اور چائے نوشی کے دوران میں صدارت کے لئے اپنا نام خود پیش کیا۔ بعض نمائندے مسکرائے مگر ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور وہی صدر منتخب ہوئے۔ دیگر قابل اصحاب میں کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر کالیداس ناگ، بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر گوڈبولے اور بھاؤنگر کے مسٹر ترویدی تھے۔ موخرالذکر لڑکے لڑکیوں کی باہمی تعلیم کے پُرزور حامی ہیں۔

کانفرنس کے اجلاسوں کے لئے امپیریل یونیورسٹی نے اپنی کئی عمارتیں وقف کردی تھیں۔ آڈیٹوریم میں عام اجلاس ہوتے تھے۔ دوسرے ہالوں اور کمروں میں شعبوں کے جلسے کئے جاتے تھے۔ کانفرنس کے دفاتر، دفتر معلومات، ڈاکخانہ وغیرہ کے لئے بہت سے کمرے مخصوص تھے۔ یونیورسٹی میں طبی کالج بھی ہے۔ اس کا شفاخانہ نمائندگان کانفرنس کے لئے کھلا ہوا تھا۔ وہاں ہر وقت فرسٹ ایڈ کا برگیڈ موجود رہتا تھا۔ ایک انجمن کی جانب سے عارضی کتب خانہ قائم کردیا گیا تھا۔ جاپانی اور غیر ملکی کھانوں کے دو رسٹارنٹ کھلے ہوئے تھے۔ چند دُکانیں بھی تھیں۔ جاپان ٹورسٹ بیورو کا دفتر بھی موجود تھا جس میں ہر مقام کے سفر کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور غیر ملکی سکوں کا تبادلہ بھی ہوسکتا تھا۔ غرضیکہ ہر ضرورت کا لحاظ کرکے اس کا انتظام کردیا گیا تھا۔

اسی سلسلے میں یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ نمائش گاہوں اور دیگر مقامات پر جہاں نمائندوں کی اکثر آمد و رفت ہوتی تھی سفری ڈاکخانہ کی بس بھی جا پہنچتی تھی۔

۳ راگست کی صبح کو ایک ٹھیٹھ جاپانی رسم ادا کی گئی۔ ملکی و بیرونی نمائندگان و عہدیداران کانفرنس شہنشاہ ہیجی کے سفیرے پر آٹھ بجے جمع ہوئے اور درگاہ پر آداب بجائے۔ آنجہانی کے عہد حکومت میں ہی موجودہ نظام تعلیم جاری ہوا تھا۔ شام کو آٹھ بجے یونیورسٹی میں کانفرنس کا رسمی افتتاح ہوا۔ آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد تین ہزار کے اُوپر ہوگی۔ اوّل طلبائے یونیورسٹی کے بینڈ نے قومی ترانہ بجایا۔ جملہ حاضرین مودب کھڑے ہوگئے۔ بہت سے جاپانی اصحاب نے بینڈ کے ساتھ آواز ملاکے گایا۔ پھر مسٹر کوماسو صدر مجلس استقبالیہ نے انگریزی میں مختصر تقریر کرکے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اب مسٹر نگاتا صدر جاپانی انجمن تعلیمی کھڑے ہوئے۔ یہ صاحب سابق میں وزیر محکمہ ماورائے بحر رہ چکے ہیں اور جاپانی انجمن کے روح رواں ہیں۔ آجکل بیمار ہیں اور شفاخانہ میں مقیم ہیں۔ اس جلسے کی خاطر ڈاکٹر سے خاص طور سے اجازت لے کر آئے تھے۔ آپ نے ایک طویل تقریر میں اپنی انجمن کی تعلیمی سرگرمیوں، اہلِ جاپان کی تعلیمی الوالعزمیوں، اور کانفرنس کے اجلاس کی تیاریوں کا ذکر کرکے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان سے انتظامی نقائص پر چشم پوشی کی درخواست کی۔ بعد ازاں ہزایکسیلنسی مسٹر ایچی یاسوئی وزیر محکمہ تعلیم نے مختصر تقریر میں مہمانوں کا استقبال کیا اور کانفرنس کے مقاصد سے ہمدردی ظاہر کرکے کامیابی کی اُمید کا اظہار کیا۔ آپ کے بعد سلسلے وار نائب وزیر محکمہ خارجہ، صدر ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی، گورنر ضلع ٹوکیو، میئر شہر ٹوکیو نے اپنے اپنے محکموں کی جانب سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ تمام اصحاب کی تقریریں جاپانی

زبان میں ہوئیں اور ان کا ترجمہ انگریزی میں سُنایا گیا۔ ایک امریکہ کے اور ایک انگلستان کے نمائندے نے مہمانوں کی جانب سے پُرتپاک استقبال کا شکریہ ادا کیا۔ سب کے آخیر میں ڈاکٹر منرو صدر ورلڈ کانفرنس کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ اگرچہ مجھے خطبۂ صدارت پڑھنے کا حق حاصل ہے مگر دیر بہت ہو گئی ہے۔ میں اپنا حق کام میں لانا نہیں چاہتا۔ اس دوران میں مسٹر نگانا علالت طبع کے باعث اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ ان کی جانب سے صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کر کے جلسہ ختم کیا۔

جلسہ افتتاحی کے بعد دو عام اجلاس اور ہوئے۔ پہلا دو روز کے بعد ہوا جس میں صدر کانفرنس ڈاکٹر منرو نے فیڈریشن کے مقصدِ اعظم پر یعنی تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے دُنیا میں امن قائم کرنے کے موضوع پر تقریر کی۔ آپ کی تائید میں چند ممالک کے نمائندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسے میں ہندوستانی نمائندے کو بھی اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا۔ آخری عام اجلاس ۷ اگست کی شب کو ہوا۔ یہ الوداعی جلسہ تھا۔ ڈاکٹر منرو کے بعد مختلف ممالک کے نمائندوں نے اہلِ جاپان کے پُرجوش استقبال اور شاہانہ مہماں نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر بھی ایک ہندوستانی نمائندے کو تقریر کرنے کا موقع ملا۔ جلسہ قومی ترانے پر ختم ہوا جو یونیورسٹی کے بینڈ نے بجایا تھا۔

تینوں عام اجلاس رات کے وقت ہوئے۔ ان کے علاوہ روز صبح کے نو بجے سے بارہ بجے تک مخصوص مضامین پر مباحث ہوتے تھے۔ کانفرنس کا کام اٹھارہ شعبوں میں منقسم تھا۔

(۱) تعلیم بالغان۔
(۲) کالج اور یونیورسٹی۔
(۳) براڈکاسٹنگ۔
(۴) تجارتی تعلیم۔
(۵) تعلیمی دستکاری۔
(۶) ابتدائی تعلیم۔
(۷) جغرافیہ۔
(۸) صحت
(۹) ہرمن جارڈن کمیٹی۔
(۱۰) گھر اور مدرسہ۔
(۱۱) مدرسین تیار کرنا۔
(۱۲) ماقبل مدرسہ اور کنڈر گارٹن۔
(۱۳) دیہاتی زندگی اور دیہاتی تعلیم۔
(۱۴) سائنس اور تعلیم سائنس۔
(۱۵) ثانوی تعلیم۔
(۱۶) سوسائٹی کی تنظیم۔
(۱۷) مدرسین کی انجمنیں۔
(۱۸) بصارتی تعلیم۔

تمام شعبوں میں اتنے مقالے وصول ہو چکے تھے کہ ہر شعبے کا اجلاس دو دو تین تین روز تک ہوتا رہا۔ روزانہ آٹھ دس شعبوں کے جلسے ہوتے تھے۔ عام طور سے مقالے انگریزی میں پڑھے جاتے تھے۔ جاپانی حاضرین کی خاطر ان کا ترجمہ جاپانی میں کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کوئی تقریر جاپانی زبان میں ہوتی تو اُس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا جاتا تھا۔ ہر مقالے پر مباحثہ ہوتا تھا۔ حاضرین کو سوال کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اور مقرر کو جواب دینا پڑتا تھا۔ جاپانی نمائندوں کے مقالے انگریزی زبان میں مطبوعہ پمفلٹ کی صورت میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ بیرونی نمائندوں کے مقالے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جو پہنچ گئے وہ

طبع کرا کے تقسیم کر دئے گئے۔ بعض شعبوں میں اس قدر مقالے وصول ہو چکے تھے کہ ان کے پڑھنے کے لئے وقت کافی نہ تھا۔ پڑھنے والوں کو قطع برید سے کام لینا پڑا۔

کانفرنس کے جلسوں کے علاوہ اس قدر مشاغل فراہم کر دئے گئے تھے کہ کسی نمائندے کے بس میں نہ تھا کہ تمام مشاغل پورے کر سکے۔ پہلا شغل ٹوکیو کی سیر تھا۔ اس کے لئے صبح کا وقت مقرر تھا۔ جن اصحاب کو شعبہ جات کے جلسوں سے فرصت ملے وہ سیر کو جا سکتے تھے۔ کانفرنس کی بسیں تین گھنٹے میں مشہور مقامات دکھلاتی تھیں۔

دوسرا شغل۔ مدارس کا معائنہ۔ ماہ اگست میں تمام مدارس تعطیلات گرما کی وجہ سے بند رہتے ہیں بلکہ اوائل جولائی سے بند ہونے لگتے ہیں۔ تاہم ٹوکیو میں چند ابتدائی اور ثانوی مدارس معائنے کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں طلبا تو حاضر نہ تھے مگر چند مدرّس مامور تھے کہ نمائندوں کو پھرا کر مدرسہ دکھا دیں۔ بعض کنڈر گارٹنوں میں بچّوں کو خاص طور سے بلا کر انہیں کھیلتے ہوئے دکھایا گیا۔ نمائندوں کے گروہ روزانہ امپیریل یونیورسٹی کا معائنہ کرتے تھے۔

تیسرا شغل تعلیمی نمائش۔ اس نمائش میں موجودہ تعلیمی نظام کنڈر گارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک دکھایا گیا تھا۔ نیز زمانہ قبل تاریخ سے اب تک کا نظام تعلیم کتابوں اور آلات تعلیم کے ذریعہ سے دکھایا گیا تھا۔ یہ نمائش عورتوں کے نارمل کالج میں تین دو منزلہ عمارتوں میں منعقد ہوئی تھی۔ اس پر بڑی محنت صرف کی گئی تھی۔ اب تک جاپان میں اتنے وسیع پیمانے پر تعلیمی نمائش نہیں ہوئی تھی۔

اسی ذیل میں ایک اور نمائش تھی جس میں لڑکیوں کے ایک ثانوی مدرسے کی طالبات کی دستکاری دکھائی گئی تھی۔ اس نمائش میں صرف پرانی بیکار اشیا سے بنایا ہوا سامان رکھا تھا۔ جو چیزیں ہر گھر میں ردی سمجھ کر پھینک دی جاتی ہیں انہیں سے کار آمد اشیا بنائی گئی تھیں۔

چوتھا شغل۔ جاپان آرٹ اور تمدّن کی نمائشیں۔ تین نمائشیں قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل ضلع ٹوکیو کی آرٹ گیلری میں موجودہ آرٹ کی نمائش۔ یہاں جدید مصوّری کے شاہکار اکٹھے کئے گئے تھے جو سابقہ نمائشوں میں دکھائے جا چکے تھے۔ اور اب شوقین اصحاب کی ملکیت ہیں۔ دوئم شاہی عجائب خانے میں قدیم آرٹ کی نمائش۔ اس میں محکمہ محلات شاہی کی جانب سے قدیم آرٹ کے نادر نمونے پیش کئے گئے تھے۔

سوئم شِروکیا ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں جاپانی لباس کی نمائش۔ اس میں ابتدائے تاریخ سے اب تک کے مختلف زمانوں کے لباس دکھائے گئے تھے۔

پانچواں شغل۔ فنون اور ہنروں کی نمائشیں۔ ان میں سب سے اہم آرائش گُل کی نمائش تھی کیونکہ مختلف طرزوں کے استاد اس میں شریک تھے۔ اس قسم کی نمائش اب تک جاپان میں نہیں ہوئی تھی۔ اس آرٹ میں جاپان تمام دنیا سے بلند پایہ رکھتا ہے۔ استادانِ فن کے نزدیک آرائش گل کے بہت سے طرز ہیں۔ ہر ایک اپنا ہی طرز سکھاتا ہے۔ یہاں مشہور طرزوں کے استاد جمع تھے اور حاضرین کے روبرو اپنے اپنے طرز پر پھول سجا کر کمالِ فن کی داد دے رہے تھے۔ یہ نمائش تین روز رہی۔

دوئم - خواتین کی دو انجمنوں کی جانب سے نسوانی ہنروں کی نمائش - اس میں دو انجمنیں شریک تھیں - پہلی جاپانی خواتین کی انجمن ماورائے بحر - اور دوسری کلب خواتین جاپان - ایک طویل پروگرام میں بہت سی باتیں شامل تھیں - اوّل تو ڈرامہ جو سات اراکین نے کرکے دکھایا - دوئم عہد ہیان (۸۹۴ء تا ۱۱۹۲ء) کا لباس پہن کر اسی زمانے کا ماحول پیش کرنا - سوئم تقریب چائے نوشی - چہارم عہدِ توکوگاوا کے لباس میں ناچ - پنجم قدیم جاپانی ناچ - ششم آرائشِ گل کرکے دکھانا - ہفتم بونکیی یعنی کشتی میں ریت اور پتھر کے ذریعہ سے مناظرِ قدرت کا چربہ اُتارنا - ہشتم عہدِ کماکُورا کا لکڑی کا کام بنانا - نہم جاپانی کشیدہ کاری - دہم جاپانی گڑیا سازی - یازدہم جاپانی برش سے لکھنا اور تصویر کھینچنا - تمام باتیں اراکین انجمن نے خود کرکے دکھائیں - یہ پروگرام صرف ایک روز پیش کیا گیا اور آخر میں چائے سے تواضع کی گئی -

سوئم - انجمن خواتین قوم پرست کی جانب سے ایک شب کو شادی کا پروگرام پیش کیا گیا - اوّل ناکتخدا لڑکی اور شادی شدہ عورت کے بال مارو ماگے اور شماداطرز پر بنا کر دکھائے گئے - دوئم جاپانی آداب کے تین نمونے پیش کئے گئے :- زمانۂ حال میں شاہی فرمانِ تعلیم کے پڑھنے کا طریقہ - زمانۂ قدیم میں عورت کے نیزے یا لمبے دستے والی تلوار کے استعمال کرنے کا طریقہ - زمانۂ قدیم میں مرد کی جانب سے کسی سردار کی خدمت میں تیر و کمان پیش کرنے کا طریقہ - آخر میں شادی کی پوری رسم ادا کرکے دکھائی گئی -

چہارم - واسیدا یونیورسٹی میں فوجی کرتبوں کی نمائش - مختلف مدارس کے طلبا نے ایک روز جُودو (جیو جتسو) کودو (کھپری کنکا) تیر اندازی، اور لمبے دستے والی تلوار کے فوجی فنون کی نمائش کی - لمبے دستے والی تلوار کے کرتب لڑکیوں نے دکھائے تھے -

چھٹا شغل - انجمن مادرانِ جاپان کی جانب سے جملہ نمائندگان کو ایک روز ایک ٹھیٹھ جاپانی مکان میں چائے پر مدعو کرکے مکان دکھایا گیا اور گھر اور مدرسے کے تعلیمی تعلقات پر گفتگو کرنے کا موقع دیا گیا -

ساتواں شغل - جاپان کی میوزیکل اکاڈمی کی جانب سے ایک شب قدیم و جدید جاپانی موسیقی کے نمونے سُنائے گئے - نیز مغربی موسیقی کے نمونے پیش کئے گئے -

آٹھواں شغل - ایک روز رقص کے ایک ماہر اُستاد کی جانب سے اسی کے مدرسے میں طلبہ و طالبات نے جاپانی رقص ناچ کر دکھائے

نواں شغل - نواب وزیر تعلیم کی جانب سے ایک شب کابُکی تھیٹر میں کابُکی ڈرامہ دکھایا گیا -

دسواں شغل - اخبار نچی نچی کی جانب سے ایک روز نکا راز کا تھیٹر میں زمانۂ جدید کا ڈرامہ یعنی آپیرا دکھایا گیا -

گیارھواں شغل - بین الاقوامی تمدنی تعلقات کی سوسائٹی کی جانب سے ایک شب کلبِ نوایان کے نو تھیٹر میں نو ڈرامہ دکھایا گیا -

بارہواں شغل۔ سوسائٹی مذکورالصدر کی جانب سے کانفرنس کے چند روز قبل جاپانی تمدن پر لکچروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ موسم گرما کے لحاظ سے موقع بہت موزوں تجویز کیا گیا تھا یعنی دامنِ کوہ فُجی میں جھیل یمانکا کے کنارے تین روز تک اُستادانِ فن نے جاپانی تمدن کے مختلف موضوعوں پر تقریریں کیں۔

تیرہواں شغل۔ ایک ریشم کے کارخانے میں ریشم کی کاشت کا طریقہ یعنی انڈوں میں سے ننھے کیڑے نکلنے کے وقت سے لے کر ریشم کے تاگے کے بنڈل بنانے تک جملہ اعمال دکھائے گئے۔

اِسی سلسلے میں گورمنٹ کی ریلوے ورکشاپ بھی دکھائی گئی۔

چودہواں شغل۔ گارڈن پارٹیاں۔ ایک گارڈن پارٹی صدر توکیو امپیریل یونیورسٹی کی جانب سے یونیورسٹی کے جاپانی وضع کے باغ میں دی گئی۔

دوسری گارڈن پارٹی گورنر ضلع توکیو اور میئر شہر توکیو کی جانب سے مشترکہ طور پر ایک مشہور جاپانی وضع کے باغ میں دی گئی۔ ان دونوں پارٹیوں میں ناچ وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔

تیسری گارڈن پارٹی ہزاکسیلنسی مسٹر ہروتا وزیر محکمہ خارجہ کی جانب سے ایک محل میں دی گئی تھی جو شاہی مہمانوں کو ٹھیرانے کے کام آتا ہے۔ اس محل میں قدیم جاپانی آرٹ کے نادر نمونے بھی معائنہ کے لئے موجود تھے۔ یہاں ایک یورپین خاتون نے جاپانی مصوری کے ایک شاہکار کے معائنہ کا بالکل انوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ اسے ناخن سے کھُرچ کر جانچا اور نقادی کی خوب داد دی۔ نواب وزیر خارجہ کی پارٹی سب سے شاندار اور پُرتکلف تھی۔

اس قدر مُشاغل سے عہدہ برآ ہونا ما فوق الفطرت انسان ہی کے بس کی بات ہے۔ اہلِ جاپان نے اپنی طرف سے مُشاغلِ تفریح و تعلیم فراہم کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ان سے مستفید ہونا نمائندگان کا فعل تھا۔ لوگوں نے اپنے مذاق کے مطابق بعض کو پسند کیا اور بعض کو قربان کیا۔ ان میں تنوع اس قدر تھا کہ کسی کو ترک کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا ذائقہ تو ہر ایک کا چکھ ہی لیا ہوگا۔

کانفرنس کی کامیابی پر کئی پہلوؤں سے تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ بحیثیت ایک بین الاقوامی اجتماع کے نہایت کامیاب رہی۔ آج تک جاپان میں اس پیمانے کی بین الاقوامی کانفرنس نہیں ہوئی تھی۔ چالیس اقوام کے تین ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہونا اور ہفتے دو ہفتے تک مُسلسل ملتے جُلتے رہنا ایک معنی رکھتا ہے۔ جو قومیں اپنے مدرسین کی عزت کرتی ہیں وہی اقبال مند ہوتی ہیں کیونکہ مدرسین کے ہاتھ میں قوم کا بنانا بگاڑنا ہوتا ہے۔ ایسی قوت کے مالک اصحاب بین الاقوامی دوستی کا بیڑا اُٹھا کر تبادلۂ خیالات کریں تو اُمید قوی ہوتی ہے کہ امن عام کا عہد دُور نہیں ہے۔ کتنی نئی دوستیاں قائم ہوگئی ہونگی جو آئندہ حصول امن میں ممد ہونگی۔

فنی حیثیت سے کانفرنس کی کامیابی میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ توکیو کے اجلاس نے پچھلے چھ اجلاسوں کے بہت سے ریکارڈ مات کردئے۔ شعبہ جات کے جلسے یا تو ماہرین کے لئے ہوتے ہیں یا ان کی محنت کی داد دینے والوں کے لئے۔ ان میں بھی مخصوص مذاق اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کارکنان کانفرنس کے سابقہ تجربے کی بنا پر شعبوں

کے جلسوں کے لئے کافی وسیع کمروں اور ہالوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مگر اکثر جلسے ایسے ہوئے کہ کمرے کھچا کھچ بھر گئے۔ بعض ایسے ہوئے کہ شائقین سمانہ سکے اور اجلاس دوسرے بڑے ہال میں منتقل کرنا پڑا۔ شعبۂ ابتدائی تعلیم کے اجلاس میں چھ سو سے اُوپر حاضرین موجود تھے۔ مسٹر نپلینگٹن جو دس سال سے اس شعبے کی صدارت کر رہے ہیں چلّا اُٹھے کہ میرے خواب و خیال میں بھی اتنا اجتماع نہیں تھا۔ شعبہ جات کے جلسوں میں حاضرین کا اتنا اژدہام جاپانیوں کے علمی عشق پر دلالت کرتا ہے۔

شرکائے کانفرنس کو جاپان اور جاپانیوں کے مطالعہ کرنے کے جو مواقع مہیّا کئے گئے وہ عام سیاحوں کو ہرگز میسّر نہیں آتے۔ اس سے جاپان کے تمدّن کی خوب تبلیغ ہوئی۔ جاپان کو اس قلیل عرصے میں بہت سے ثنا خواں دستیاب ہوگئے۔ جاپان اور دیگر ممالک کے درمیان دوستی کے تعلقات پختہ کرنیوالے ذرائع میں معقول اضافہ ہوگیا۔ یہ بھی کانفرنس کی بڑی کامیابی ہے۔

کانفرنس کو کامیاب بنانے کے ساتھ اس کی ہر یادداشت کو محفوظ رکھنے کا بہت معقول انتظام کیا گیا تھا۔ عام اجلاسوں اور شعبہ جات کے جلسوں کی کارروائی سکرٹریوں نے تو لکھی ہوگی اخبارات کے نمائندے ہر جگہ موجود رہتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات کی خبر اخبارات میں آجاتی تھی۔ تصاویر کی کوئی انتہا نہیں۔ ہزاروں فوٹو لئے گئے۔ خوبی یہ کہ دوسرے روز سے احاطۂ کانفرنس میں بکنے بھی لگے۔ روزانہ ہر ہال اور ہر کمرے میں دو دو کارکن آوازوں کو رکارڈ کرنے کے آلات لئے موجود رہتے تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے ختم ہونے تک جو کارروائی ہوتی تھی ریکارڈ کر لی جاتی تھی۔ اس طرح آیندہ نسلوں کے لئے کانفرنس کی پوری کارروائی محفوظ کر لی گئی۔

ہندوستانی نمائندے کانفرنس کی ظاہر و باطنی خوبیوں سے نہایت متمتع ہوئے۔ افسوس ہے کہ بعض ہندوستانی عجیب ذہنیت لے کر جاپان میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ بڑی حقارت سے بیان کرتے ہیں کہ جاپان نے جو کچھ کر دکھایا ہے وہ مغرب سے سیکھا ہے۔ گویا سیکھنے کا عمل بڑا ذلیل کام ہے یا مغرب سے سیکھنا مذموم فعل ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کے دماغ میں ایسے جذبات کی موجودگی کیسی حسرتناک ہے۔ اہلِ ہند کو اہلِ مغرب سے تعلقات قایم کئے ہوئے دو ڈھائی سو برس ہوگئے۔ اس طویل عرصے میں جدید علوم و فنون پر قادر نہ ہونا قومی انتشار ہی ظاہر کرتا ہے۔ اہلِ جاپان کا اسّی برس پہلے مغرب سے ٹکر کھاتے ہی مغربی علوم و فنون کے حصول میں مُنہمک ہو جانا قومی تنظیم اور جاپانیوں کی اولوالعزمی کی دلیل ہے۔

یہ امر قابلِ مسرت ہے کہ چند تجارت پیشہ اصحاب نے معلّمی کے پیشے کو ایسا معزز سمجھا کہ خود کسی نہ کسی تعلیمی ادارے سے تعلق ظاہر کرکے نمائندگی کا شرف حاصل کر لیا۔ اس فعل میں انسانی کمزوری کو خواہ کتنا ہی دخل ہو یہ ضرور ہے کہ ضابطے میں ہندوستان کا ڈیلیگیشن اس سے ملوث نہ ہوا اور ہندوستان کی ویسی بدنامی نہ ہوئی جیسی تین برس پہلے مس نور اہلِ سکرٹری ریڈکراس سوسائٹی ہند کے طرزِ عمل سے ہوئی تھی کہ اُنھوں نے ریڈکراس سوسائٹی میں کارکردہ اصحاب کو تو اپنی ڈیلیگیشن میں شریک کرنے سے انکار کر دیا مگر ایک ایسے شخص کو جو اس سوسائٹی سے بالکل نابلد تھا محض اس بناء پر شریک کر لیا کہ مس موصوف کے اسسٹنٹ کا رشتہ دار تھا۔

نمائندگان میں مردوں کا لباس تو یکساں تھا مگر عورتیں اپنے اپنے قومی لباس میں ملبوس تھیں۔ جلسوں اور پارٹیوں میں انہی کے لباس سے رنگینی پیدا ہوتی تھی۔ ہندوستانی ساڑھی بہت پسند کی گئی۔ اس کا گھیرا در لٹکتے ہوئے آنچل عجیب کیفیت پیدا کرتے تھے۔ ماتھے پر لال بندی لطف دوبالا کر دیتی تھی۔ اہلِ جاپان اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ اہلِ ہند کرسی کی نشست میں گھٹنے پر پاؤں رکھ کر اسے کیوں سہلایا کرتے ہیں۔ مسٹر سیشادری کو ڈائس پر بیٹھے ہوئے اس شغل میں منہمک دیکھ کر لوگ بہت محظوظ ہوئے۔

نورالحسن برلاس

نالۂ دل

(نذرِ دوست)

ہلا کے آہ! مری زندگی کی بنیادیں!
دو چند ہو گئی پابندگیِ کوئے دوست!!

پگھل گیا ہے تپش سے وجودِ معنی بھی
فشارِ کشمکشِ عقل و دل خدا کی پناہ!
فضائے قلب پہ مایوسیاں مسلط ہیں
نہ سرد مہر ہے وہ، اور نہ سخت دل، ہمراز
وہ خود ہے گردشِ دوراں سے دل بریدہ آہ
ہیں گرچہ تشنہ و ناکام ظاہری آنکھیں
جو دل کہ مرجعِ صد انبساط تھا، ہمراز
مسافرت کا ہو احساس کس طرح اسکو

ہے شعلہ بار کچھ اس درجہ آرزوئے دوست
نہ لے اڑے کہیں جوشِ جنوں بسوئے دوست
سنبھال بہرِ خدا! مجھ کو آرزوئے دوست
عجیب دلکش و وجد آفریں ہے خوئے دوست
اسے بھی خون رلاتی ہے آرزوئے دوست ق
نفس نفس میں سمائی ہوئی ہے بوئے دوست
بنا گئی اسے ناسور آرزوئے دوست
ہر آن جس کے ہو پیشِ نگاہ روئے دوست

تمام صفحۂ ہستی کی وسعتیں ہو جائیں
لکھے ہی جائے قلم لفظِ آرزوئے دوست

دلفگار

(بسلسلۂ ماسبق)

"دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی"

مضامین فرسودہ کے پہلے تین عنوانوں کے ماتحت اب تک ہم نے صرف کلامِ حسرت سے بحث کی ہو اور اسکی وجہ بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ آیئے اب اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ اصغر، جگر، اور فانی کے کلام کا بھی جائزہ لے لیں۔

"میکشی" کے متعلق اصغر و فانی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی مقدار نہایت قلیل ہو اس لئے چنداں قابل لحاظ نہیں اور تقلیدِ بے معنی سے باز رہنے کی یہ کوشش چاہے ارادی ہو چاہے غیر ارادی بہر حال پسندیدہ ہو۔ جگر نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس لئے قابلِ اعتراض نہیں کہ اکثر "حال" ہے۔ محض "قال" نہیں۔ اگرچہ اندازِ بیان میں نقالی کا رنگ نمایاں ہے۔ اب رہ گئے تیغ و خنجر و قتل و خون اور نزع و قبر و حشر کے مضامین تو یہ بھی اصغر کے یہاں بہت کم ہیں۔ نمونے کے طور پر ہم یہاں "نشاطِ رُوح" سے صرف چند شعر نقل کرتے ہیں ؎

تصویر ہو کھنچی ہوئی نازو نیاز کی ✤ میں سر جھکائے اور وہ خنجر لئے ہوئے

قاتل نگاہِ یاس کی زد سے نہ بچ سکا ✤ خنجر تھے ہم بھی اک نہ خنجر لئے ہوئے

کاش اصغر مرحوم زندہ ہوتے تو ہم فراق صاحب کی معرفت اُن سے پوچھتے کہ "مولانا سچ بتایئے، کیا واقعی آپکی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ بھی آیا تھا جب ناز و نیاز کی یہ نرالی تصویر کھنچی تھی کہ آپ سر جھکائے ہوتے ہیں اور وہ خنجر لئے آپ کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہے اور اس کے بعد روہیلہ سردار کی طرح جب وہ آپ کو پچھاڑ کر قتل کی نیت سے آپکی چھاتی پر سوار ہوا اور چھُری گلے پر رکھدی تو آپ نے کچھ ایسی یاس بھری نظروں سے اُسے دیکھا کہ اس کا "ہارٹ فیل ہو گیا"۔ تو مولانا ایک راستباز انسان کی طرح یقیناً یہی جواب دیتے کہ "نہیں میاں یہ تو محض "شاعری" ہے۔ حقیقت سے اِسے کیا واسطہ"۔ اللہ اللہ! اب ہماری شاعری تقلیدِ بے معنی کے ہاتھوں اس درجہ پر پہونچی ہے کہ ہر بے سرو پا بات، ہر دور از کار مبالغہ، ہر دروغ بے فروغ، "شاعری" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

وہ دستِ ناز جو معجز نمائیاں نہ کرے ✤ لحد کا پھُول چراغ سرِ مزار نہ ہو

نقشِ قدم ہیں یہ اُسی جانِ بہار کے ✤ اک پنکھڑی پڑی ہو لحد پر گلاب کی

یہ بات مُسلّم ہے کہ ہر شاعر کا بیدرد محبوب غمِ فراق میں گھُلا گھُلا کے اُسے تمام کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ اصغر مرحوم کے ساتھ بھی پیش آیا مگر اِسے مولانا کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ اُس آدم کُش نے مولانا کے مزار پر آنے اور پھُول چڑھانے کی تکلیف گوارا کی۔ بہت سے بدقسمتوں کو تو یہ اعزاز بھی نصیب نہیں ہوتا۔

ہمارے اس بیان سے کہ اصغر و فانی نے "میکشی" کے متعلق بہت کم اشعار لکھے ہیں اور اصغر کے یہاں تیغ و خنجر اور قتل و خون نیز مرگ و لحد کے مضامین بھی محض خانہ پُری کے لئے ہیں، قارئین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کی شاعری

میمونانہ نقالی سے خالی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ نقالی کا میدان ماشا اللہ بہت وسیع ہی۔ جیساکہ ہماری فہرستِ مضامین فرسودہ سے ظاہر ہے۔ اب اپنی اپنی پسند ہے۔ کسی کو کوئی موضوع مرغوب ہی کسی کو کوئی۔ غلطی سے اسی کو بعض حضرات شاعر کے "انفرادی رنگ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر یوں ہی سہی۔ ہے بہرحال نقالی۔ الغرض۔ اصغر نے اگر "میکشی" میں کمی کی ہے تو "فلسفہ بافی" سے اس کا بدل کر دیا ہے۔ اور فانی نے اس کے عوض میں نزع و مرگ و قبر و ماتم کا سوانگ بھرا ہے جس کی تفصیل جلد پیش کی جائے گی۔

اصغر کے بعد جگر کا نمبر ہے لیکن قبل اس کے کہ "شعلۂ طور" سے جگر کی بے کیف نقالی کے نمونے پیش کئے جائیں۔ "شعلۂ طور" کے مقدمہ نگار سید سلیمان ندوی صاحب کے بعض بیانات کا یہاں نقل کر دینا مناسب ہے تاکہ مقدمہ نگار اور شاعر کے قول کا مقابلہ کرنے کے بعد قارئین کو معلوم ہو جائے کہ مولنا صاحب نے بیچارے جگر پر کیسے کیسے "بہتان" باندھے ہیں۔ "بہتان" کے معنی لغت اور اصطلاحِ عام میں چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ میں اپنے نزدیک اسے بھی بہتان ہی سمجھتا ہوں کہ ایک "رندِ شاہد باز" کو "ملائے پارسا" بتایا جائے یا بالفاظِ دیگر کسی شخص کو ایسے صفات سے موصوف کیا جائے جن سے وہ حقیقتاً بیگانہ ہے یا کسی کے متعلق ایسی باتوں سے انکار کیا جائے جو یقینی طور پر اس میں پائی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب "اتہام" و "بہتان" کی مختلف صورتیں ہیں۔ سید سلیمان ندوی صاحب جگر کے دیوان "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

(۱) "نہ اُس کے کاشانۂ خیال میں چشمہائے بسمل کی آئینہ بندی ہے نہ اُس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھُری ہے نہ اُس کے کوچے میں شہداکے دل و جگر کی گلکاری ہے۔"

(۲) "تاثر اور دلفگاری اس کے ہر مصرع کی جان ہی...... وہ...... آجکل کے بعض طالبِ اثر شاعروں کی طرح نہیں جولاش و مدفن و سورۂ یٰسین و نوحہ و بین و میت و نزع کا ایک تیر کمند صفت پھینک کر بالقصد مُرغِ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں۔"

(۳) جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے.........."

(۴) جگر کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ........"

مُندرجِ بالا سطور میں سید صاحب نے چار دعوے کئے ہیں مگر کلامِ جگر کے مطالعہ کے بعد انسان یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہی کہ جگر کے متعلق اس سے زیادہ معصومانہ غلط بیانی آج تک کسی نے نہیں کی۔

پہلے چشمہائے بسمل کی آئینہ بندی دیکھئے ؎

دمِ بسمل[1] اگر تم چھیڑ دیتے دل کے زخموں کو ٭ لہو کا قطرہ قطرہ دردِ دل کی داستاں ہوتا

پھر "بسمل" کی یہی ایک تنہا مثال نہیں۔ آئندہ اشعار میں اور بھی متعدد "بسمل" آپکو ملیں گے۔ سید صاحب کا دعویٰ

---

[1] "دمِ بسمل" محلِ نظر ہے۔ شادانی۔

ہے کہ جگر کے محبوب کے ہاتھوں میں قصّاب کی چھری نہیں۔ خدا جانے جگر کا یہ شعر سیّد صاحب کی نظر سے گذرا ہی یا نہیں ؎

مژدہ اے شوقِ شہادت اوج پر تقدیر ہے ٭ آج دستِ ناز میں نازک سی اک شمشیر ہے

شاید بلحاظِ نزاکت مولانا نے اس شمشیر کو قصّاب کی چھری کہنا مذاقِ سلیم کے خلاف سمجھا۔ اچھا اور سنیئے ؎

صدقے ان ہاتھوں کے مجھکو بھی خبر تک نہ ہوئی ٭ اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی

یہاں خود شمشیر تو نازک نہیں لیکن نزاکت سے چلائی گئی ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اسے بھی قصّاب کی چھری کہنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بہتر۔ اور سُنیئے ؎

کیا کہیں خونِ دو عالم سے بھی اب بجھتی ہی پیاس ٭ خونِ بسمل کی حرارت خنجرِ قاتل میں ہے

کیا یہ بھی قصّاب کی چھری نہیں؟ اس میں تو ماشاء اللہ دو عالم کو ذبح کر ڈالنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اے جناب محبوبِ جگر کے ہاتھ میں تو قصّاب کی چھری ہی نہیں۔ پیکانِ جگر دوز بھی موجود ہے۔ آپ نہ دیکھیں یا نہ دیکھنا چاہیں تو اسکا کیا علاج۔ ہائے کسی نے سچ کہا ہے کہ قبر کا حال مُردہ ہی جانتا ہے۔ سید صاحب کو کیا معلوم کہ بیچارے جگر پر کیا گذری۔ کس بلا کا پیکان تھا کہ سینہ توڑ کر دل میں در آیا اور پار نکل گیا۔ دیکھیئے تو جگر کس طرح تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا ہے ؎

توڑ کر سینہ و دل پار کا پیکاں نکلا ٭ جان نکلی مرے اللہ کہ ارمان نکلا[1]

جگر صاحب تو اس دُنیائے فانی سے رُخصت ہو گئے، اب حسبِ دستور قاتل کو اپنی اس حرکت پر ندامت و تاسف ہے اور جگر صاحب اس تاسف کی وجہ جاننا چاہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ؎

اب مری لاش پہ کیوں سوگ لئے بیٹھے ہو ٭ تم نے شمشیر چلائی تھی تو شمشیر چلی

جگر صاحب کے قتل ہو جانے کے بعد مقتل میں ایک عجب ہنگامہ برپا ہو گیا ؎

ہر سمت سے مقتل میں کیوں ٹوٹ پڑیں نظریں ٭ کیا صورتِ بسمل میں قاتل نظر آتا ہے

مشتاقانِ شہادت ہر طرف سے اُمنڈ آئے کہ اے "تیغِ تیز" والے۔ لگے ہاتھوں ہمیں بھی قتل کرتا جا۔ اور سچ بھی تو ہے کہ بقولِ جگر ؎

سر دادگانِ عشق و محبت کی کیا کمی ٭ قاتل کی تیغ تیز خدا کی زمین رہے

قاتل کے سر پر تو خون سوار ہی تھا لبس جو سامنے آیا، ایک ہی ہاتھ میں صفایا۔ اس "رنگین" واقعہ کو جگر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے دو مصرعوں میں بیان کیا ہے ؎

قتل گہ میں آج ہولی ہے جگر ٭ چل رہی ہیں خون کی پچکاریاں

اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے۔ جگر کو خدا جانے کیوں یہ خیال آ گیا کہ محبوب کو قاتل و قصّاب بنانا ٹھیک نہیں۔ چنانچہ یہ شعر نظم فرمایا جس میں دوسرے شعرا کو ملامت کی گئی ہے ؎

---

[1] جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارمان نکلا۔ فانی بدایونی۔

اِن شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار ÷ اِک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

دیوانِ جگرؔ کے شروع میں "چار بالکل تازہ غزلیں" درج ہیں۔ انہیں میں سے دوسری غزل کا یہ شعر ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ غالباً جگرؔ صاحب نے اپنی پرانی رائے میں کچھ ترمیم کر لی ہوگی لیکن فوراً اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ جب ان "چار بالکل "تازہ غزلوں" میں سے تیسری غزل کا یہ مطلع سامنے آتا ہے ؎

اُف یہ تیغ آزمائیاں توبہ ÷ تیری نازک کلائیاں توبہ

معلوم ہوتا ہے کہ "قاتل بنا دیا" والا شعر کسی تبدیلی رائے کی بنا پر نہیں کہا گیا۔ بلکہ قافیہ "قاتل" تھا۔ اس کی مناسبت سے جو مضمون بھی اس وقت خیال میں آیا باندھ دیا۔

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد قارئین کو اختیار ہے کہ وہ سید صاحب کے دعووں کو صحیح مانیں یا جگرؔ صاحب کے بیان کو معتبر جانیں۔ خود ہمارے نزدیک تو جگرؔ ہی کا بیان مرجع و مستند ہے۔

اب ہم سید صاحب کے دوسرے دعوے کو لیتے ہیں یعنی جگرؔ صاحب "آجکل کے بعض طالب اثر شاعروں کی طرح نہیں ج لاش و مدفن و سورۂ یٰسین و نوحہ و بین و میت و نزع کا ایک تیر کند صفت پھینک کر بالقصد مرغ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہیں"۔ جس طرح مولانا کا پہلا دعویٰ کلامِ جگرؔ کی روشنی میں غلط ثابت ہوا اسی طرح یہ دوسرا دعویٰ بھی پا در ہوا نظر آتا ہے ہم صرف اشعار پیش کئے دیتے ہیں۔ فیصلہ قارئین خود کر لیں۔ اس باب کا آغاز عالمِ نزع سے ہوتا ہے جیسا کہ ہم کلامِ حسرتؔ کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں۔

اب جگرؔ صاحب کا عالمِ نزع ملاحظہ کیجئے ؎

نزع میں ڈھونڈھ رہی ہیں آنکھیں ÷ کاش اُنہیں ایک نظر دیکھوں میں
کیا پوچھتے ہو حالت بیمارِ محبت کی ÷ کچھ اور ابھی گھڑیاں باقی ہیں محبت[1] کی

مسرور وقتِ نزع جو بیمار ہو گئے ÷ کیا جانے کیا اشاروں میں اقرار ہو گئے
دل میں تم ہو نزع کا ہنگام ہے ÷ کچھ سحر کا وقت ہے کچھ شام ہے

دمِ آخیر بھی ان کا یہ احترام ہوا ÷ اُٹھے نہ ہاتھ تو آنکھوں ہی سے سلام ہوا
جواب بھی نہ تکلیف فرمایئے گا ÷ تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جایئے گا!

عالمِ نزع کی مختلف کیفیتیں آپ دیکھ چکے۔ اب دیکھئے کہ شاعر کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد کیا ہوا ؎

برسنے لگی ہر طرف بیکسی ÷ مری موت میری خبر ہو گئی

---

[1] مطبوعہ دیوان میں اسی طرح تحریر ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ شاید "محبت" کی جگہ "مصیبت" ہو۔ ورنہ پھر قافیہ کیا ہوگا؟

مری موت سُنکر کیا اُس نے ضبط ۞ مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا

نہ جانے دل میں وہ کیا سوچتے رہے پیہم ۞ مرے جنازے پہ تادیر سر جھکائے ہوئے

فطرت کا عام قانون تو یہ ہے کہ جب رُوح و جسم میں جدائی ہو جاتی ہے تو احساس بھی مِٹ جاتا ہی لیکن ہمارا شاعر اس کلیّہ سے مُستثنیٰ ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی بیقرار رہ سکتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی اُسے سُکون بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کلامِ جگرؔ سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہی۔ سُنیئے ؎

بعد مرنے کے بھی قرار نہیں ۞ مرگِ ناکام اسکو کہتے ہیں

بن رہی تھی میرے اُنکے درمیان کیا کیا حجاب ۞ موت نے سب مُشکلوں کو آخر آسان کر دیا

نزع و مرگ کا قصّہ تمام ہوا اب تُربت و مزار و لحد کی باری ہی۔ حسرتؔ صاحب کی وفات کے سلسلہ میں ان واقعات کی تفصیل آپ سُن چُکے ہیں جو ایسے موقع پر پیش آتے ہیں۔ اب جگرؔ صاحب کی زبانی سُنیئے کہ اُنپر کیا گذری ؎

وہ عاشق ہوں کہ میری لاش جب زیرِ مزار آئی ۞ محبت نوحہ گر پہونچی تمنّا سوگوار آئی

جس پر برس گئی کبھی برقِ جمالِ یار ۞ ہر ذرّہ آفتاب ہے اُس کے مزار کا

سنگدل معشوق کی یہ ابلہ فریبیاں تو دیکھئے کہ پہلے تو بیچارے عاشق کو کُڑھا کُڑھا کے مار ڈالا۔ اب قبر پر آنسوے بہانے آیا ہے ؎

برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے ۞ کیا اُٹھ کے کہدیا مری خاکِ مزار نے

کچھ دنوں کے بعد دوبارہ جگرؔ صاحب کی قبر پر اس کا جانا ہوا تو کچھ اور ہی عالم تھا ؎

کپکپی سا ہے بدن میں، زرد چہرہ، دل اُداس ۞ چُپ کھڑے ہیں دُور میری خاکِ تُربت دیکھکر

تیسری مرتبہ جب ادھر سے گذر ہوا تو بیدرد تُربتِ عاشق پر ٹھوکریں لگاتا ہوا چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس بیوفا کے اس عمل سے شاعر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی اور قبر کے اندر بے اختیار یہ شعر زبان سے نکل گیا ہوگا ؎

یہ تُربتِ عاشق ہی ٹھکرا کے نہ چل غافل ۞ اس خاک کا ہر ذرّہ خورشید بداماں ہی

عاشق صاحب جب خاک میں مِل کے خاک ہو گئے اور پھر وہ خاک اُڑکر محبوب کے دامن پر بیٹھ گئی تو عاشق صاحب نے بڑی حسرت سے کہا کہ ہائے ہمیں تو جیتے جی پا بوسی بھی نصیب نہ ہوئی اسی آرزو میں مِٹ گئے۔ اب ہماری خاک دامنِ محبوب تک پہونچی بھی تو کیا۔

قبر کے بعد دوسری منزل حشر کی ہی۔ وہاں جو واقعات حضراتِ شعرا کو پیش آتے ہیں اُنکی تفصیل حسرتؔ کے ذکر میں بیان کی جا چُکی۔ اب دیکھئے کہ جگرؔ صاحب کیا فرماتے ہیں، داستان وہی ہے، صرف طرزِ بیان کا تھوڑا سا فرق ہے۔ ؎

مجھے اے شورِ محشر تو نے کیوں چونکا دیا اُٹھکر ۞ بلا ئیں لے رہا تھا بیخودی میں اپنے قاتل کی

نگاہِ شوق نے محشر میں صاف تاڑ لیا ۞ کہاں وہ چھپتے کہ آنکھوں میں تھے سمائے ہوئے

محشر میں بات بھی نہ زبان سے نکل سکی ٭ کیا جھک کے اُس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے[1]

کہتا ہے سرِ حشر یہ دیوانہ کسی کا ٭ جنّت سے الگ چاہیئے ویرانہ کسی کا
چشمِ دیوانگیِ شوق یہاں بھی نہ کھلی ٭ عرصۂ حشر ہے اور مست و غزل خواں کوئی
یہ مانا بھیجدیگا ہم کو محشر سے جہنم میں ٭ مگر جو دل پہ گذرے گی وہ دل ہی جانتا ہوگا

اِس آخری شعر میں واقعی جگر صاحب نے کچھ ایسے حقائق کا انکشاف کیا ہے جو آجتک نہ کسی صوفی کی سمجھ میں آئے تھے نہ کسی فلسفی کی اِنپر نظر گئی تھی۔ قدرتاً سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جگر صاحب کو محشر سے جہنم میں کون بھیجدیگا ؟ خدا یا محبوب؟ اگر مقصود ذاتِ الٰہی ہے تو یقیناً جگر صاحب کی یہ جدّت قابلِ داد ہے کہ خدا بھی انسانوں کی طرح جذبات کا پتلا ہے اور تغیّرِ حال بھی اُسے لاحق ہوتا ہے۔ ورنہ پھر "مگر جو دل پہ گذرے گی وہ دل ہی جانتا ہوگا" کے کوئی معنی نہیں۔ اور اگر جہنم میں بھیجدینے کا اختیار جگر صاحب کے محبوبِ مجازی کو حاصل ہے تو یہ خود ایک نئی تحقیق ہے اس لئے کہ اب تک جہنم اور جنّت میں بھیجنے کا اختیار خدا ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا رہا ہے۔

زلف و شانہ کے مضامین کے متعلق ہماری ذاتی رائے خواہ کچھ بھی ہو لیکن سید سلیمان صاحب کا یہ دعویٰ کہ جگر کی شاعری میں نہ زلف ہے نہ شانہ، قطعاً غلط ہے۔ مثال کیلئے یہ دو شعر کافی ہیں ؎

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں ٭ جہانِ آرزو تھرّا رہا ہے

خود حسن و شباب اُنکا کیا کم ہے رقیب اپنا ٭ جب دیکھئے اب وہ ہیں، آئینہ ہے شانہ ہے

اب تک جگر کے جو اشعار پیش کئے گئے اور جن کی مثل اور بھی بہت سے شعر شعلۂ طور میں موجود ہیں۔ کیا ان کے باوجود سید سلیمان ندوی صاحب کا یہ دعویٰ قابلِ تسلیم ہے کہ "جگر کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ ہے"؟

کہنہ و فرسودہ مضامین پر طبع آزمائی کے شوق کو اگر ایک عالمگیر وبا سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اُردو شاعری (غزلگوئی) کی پوری دُنیا اس سے متاثر ہوئی ہے۔ ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک جسے دیکھو اس بلا میں مُبتلا نظر آتا ہے۔ پوچ گویوں کا تو ذکر ہی کیا، "چوٹی کے غزلگو" بھی اسی گرداب میں غوطے کھا رہے ہیں۔ حسرت، اصغر اور جگر کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب ذرا جنابِ فانی کی جولانیٔ طبع ملاحظہ فرمائیے۔ آئیے مضامینِ فرسودہ کی پہلی سرخی یعنی "پیکان و تیر، خنجر و شمشیر، اور قتل و خون" سے ابتدا کریں۔

شوقِ شہادت ؎

---

[1] محشر میں مسکرا کے گلے سے لگا لیا ٭ کشتوں سے اپنے چال قیامت کی چل گئے۔ عالیجا[illegible]ضا لکھنوی۔

تیغِ قاتل تری دُہائی ہے ؛ میری موت اور یہ دستبردِ درنگ

سراب مجھے بھاری ہو صدقہ ترے خنجر کے ؛ یہ بار اُتر جاتا، جو وار تھے چل جلتے

آمدِ قاتل ؎

فانی کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی ؛ لے خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا ؛ نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

اداسے آڑ میں خنجر کی مُنہ چھپائے ہوئے ؛ مری قضا کو وہ لائے دُلہن بنائے ہوئے

اپنی سخت جانی اور قاتل کی نزاکت کا شکوہ ؎

مُشکل مرے مرنے کی مشکل ہو کہ آسان ہو ؛ کچھ نازکیِ قاتل کچھ میری گرانجانی

قتل کرنے سے پہلے قاتل اپنا خنجر دیکھتا ہو جس طرح قصاب گائے وغیرہ ذبح کرنے سے بیشتر اپنی چھری کی دھار دیکھا کرتا ہے، فانی صاحب اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں قتل کرنے کے بعد دیکھنا اور اس کی ایک نہایت معقول وجہ بھی بیان کر دیتے ہیں ؎

دیدنی ہو رنگ دل میں ڈوب کر کھنچنے کے بعد ؛ تم ابھی کیا دیکھتے ہو تم کے خنجر دیکھنا

فانی صاحب ذبح ہوتے ہیں ؎

اُدھر مُنہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو ؛ مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

اور ذبح ہونے کے بعد احتیاط کی صلاح دیتے ہیں ؎

لازم ہو احتیاط، ندامت نہیں ضرور ؛ لے اب چھُری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

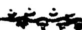
معلوم ہوتا ہو کہ چھُری سے قتل کرنے سے بیشتر قصّاب محبوب نے ایک تیر بھی فانی صاحب کے دل میں بھونک دیا تھا جسکا پیکان اُنہوں نے بالقصد دل ہی میں رہنے دیا تاکہ قبر میں ساتھ جائے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ رسم ہو کہ بعض خوش عقیدہ لوگ "عہدنامہ" کفن میں رکھ دیتے ہیں۔ اس لئے کفن میں کوئی چیز رکھدینے کا خیال تو نیا نہیں تاہم پیکانِ تیر کی جدّت ضرور قابلِ داد ہے ؎

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے ؛ سینہ میں دھواں خیر سے اُٹھتا ہو کہاں سے

ساتھ جائیگا مری میّت کے سامانِ خلش ؛ دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں میں نے تیرے تیر کے[1]

خُون کے دھبّے ؎

مٹکر بھی داغ شاہدِ خونِ شہید ہے ؛ دھویا ہوا ہو دامنِ قاتل جگہ جگہ



[1] اس شعر سے یہ امر بھی متحقق ہو گیا کہ ایک تیر کے متعدد پیکان ہوتے ہیں۔ فانی صاحب کی یہ ریسرچ بھی قابلِ تحسین ہو۔

حسرت تو "بادشاہِ متغزلین" ہی ٹھہرے۔ وہ تو تغزّل کے ہر رنگ میں اُستاد ہیں لیکن دوسرے "اساتذہ" نے بھی کسی نہ کسی رنگ میں اپنا کمال ضرور دکھایا ہے مثلاً حضرتِ اصغر نے "فلسفہ بافی" میں، جناب جگر نے استخواں بندی میں اور فانی صاحب نے نزع و مرگ، لاش و کفن، میّت و جنازہ، ماتم و شیون، تُربت و گورِ غریباں، قبر کے پھول اور چراغِ مزار وغیرہ کے بیان میں بقولِ شخصے قلم توڑ دیا ہے۔ اعتراض اس پر نہیں کہ فانی نے المیہ مضامین پر طبع آزمائی کیوں کی۔ آخر یہ چیزیں بھی ہماری زندگی کے متعلقات سے ہیں۔ نغمۂ شادی ہو یا نوحۂ غم، ہر ایک بجائے خود ایک اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس اس پر ہے کہ ایک جوہرِ قابل نے اپنا زورِ طبع محض بے بنیاد خیالات کے نظم کرنے میں کیوں ضائع کیا۔ ہر زمانہ، ہر قوم، اور ہر زبان کے شعرانے اس قسم کے مضامین کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ کسی نے قوم کی موجودہ بدحالی پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ کسی نے اپنی عظمتِ رفتہ پر سینہ کوبی کی ہے۔ کسی نے شہر آشوب لکھا۔ کسی نے اپنے محبوب یا دوست یا کسی عزیز کی موت پر جگر کاوی کی۔ اور یہ سب حالتیں فطری ہیں۔

خاقانی کا وہ قصیدہ دیکھئے جس میں اُس نے "ایوانِ مدائن" کو آئینۂ عبرت بنایا ہے[۵۱]۔ سعدی کا وہ قصیدہ پڑھیئے جسے خلافتِ بغداد کی تباہی کا نوحہ کہنا چاہیئے[۵۲]۔ ظفر، غالب، آزردہ، داغ، حالی، سالک، افسردہ، شیفتہ، ماہر، ظہیر، عیش، مجروح وغیرہم کی اُن نظموں کا مطالعہ کیجئے جو دہلی کی بربادی پر لکھی گئیں۔ مومن کا وہ ترکیب بند ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے "معشوقۂ حور طلعت" کی وفات پر سپردِ قلم کیا ہے۔ مگر فانی کے گریہ و ماتم کو ان لوگوں کے نوحہ و شیون سے کیا نسبت ہے؟ فانی کے اِس قسم کے کلام کو زیادہ سے زیادہ ایک نہایت رکیک قسم کا مسخرا پن کہہ سکتے ہیں۔ اُن کا درجہ اس میدان میں ایک بہروپئے سے زیادہ نہیں۔ بھلا ایک ہٹّا کٹّا انسان اگر درجنوں اشعار اپنی جانکنی، موت اور قبر وغیرہ کے اُن حالات میں لکھ ڈالے جنہیں حقیقت سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں تو اُسے ایک بہروپئے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

"نقاد" نے فانی کو "مرگھٹ کا رونے والا شاعر" بتایا ہے۔ فراق صاحب فانی کی اس "تعریف" سے برہم ہو کر فرماتے ہیں کہ "معلوم نہیں" نقاد" صاحب اگر T.S.Eliot اور Shropshire Lad کا Housman اور Waste Land کے Hardy اور Wessex Poems دیکھیں تو کیا کہیں گے؟ بجائے مرگھٹ کے ان شعرا کو تو پورے نظامِ شمسی کا رونے والا بتائیں گے"۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِن شعرا اور فانی کے کلام میں کیا مناسبت ہے جو مثال کے طور پر فراق صاحب نے ان کا حوالہ دیا۔ قیاس مع الفارق کی اس سے بہتر مثال مشکل سے ملے گی۔ فراق صاحب کو اگر "انمل بے جوڑ" کا ایسا ہی شوق تھا تو اُس کے لئے شعرائے فرنگ کی مثالیں پیش کرنے کی ناحق زحمت گوارا کی۔ انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ گویوں کا ذکر

---

۵۱ ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں ۞ ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں۔

۵۲ آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمیں ۞ بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین۔

کیوں نہ کر دیا۔ اس لئے کہ گریہ و بکا اور شیون و ماتم کے مضامین تو اُن کے یہاں بھی بکثرت موجود ہیں۔ ہاں یورپین شعرا کی مثال پیش کرنے کا ایک فائدہ ضرور ہے کہ عوام پر پروفیسر صاحب کی "ہمہ دانی" کا رعب جم جائیگا اور بات پردے کی پردے ہی میں رہے گی کیونکہ جو لوگ براہِ راست ہاؤس مین، ایلیٹ، اور ہارڈی کے کلام کا مطالعہ نہیں کر سکتے اُنہیں ناچار پروفیسر صاحب ہی کا قول تسلیم کرنا پڑیگا۔

نمونے کے طور پر ہم اِن شعرا کی چند مختصر نظموں کے ترجمے ذیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ اُن کے اور فانی کے کلام میں کس حد تک مماثلت ہے۔ ہمنے خصوصیت کے ساتھ ایسی ہی نظمیں منتخب کی ہیں جو اختصار کے ساتھ ساتھ کسی غم انگیز موضوع پر لکھی گئی ہیں:۔

A Shropshire Lad by A. E. Howsman No. 14

جب ہوا چلتی ہے تو بچھو کا پودا ہلتا ہے، جھکتا ہے اور سیدھا ہو جاتا ہے۔
وہی بچھو کا پودا جوان عشاق کی قبر پر اُگا ہوا ہے جنہوں نے محبت کی خاطر جان دیدی۔
بچھو کا پودا ہلتا ہے اور ہوا اُس پر سے گذرتی ہے۔
لیکن مرنے والا ذرا بھی حرکت نہیں کرتا۔ وہ قبر کا شیدائی جس نے محبت کی خاطر جان دیدی۔

L IV.

میرا دل حسرتوں سے معمور ہے۔ اپنے گرانبہا دوستوں کے لئے۔
جنمیں کتنے ہی جوانانِ سُبک گام تھے اور کتنی ہی دوشیزگانِ یاقوت لب
وہ جوانانِ سُبک گام فراخ چشمہ کے کنارے۔
اور وہ دوشیزگانِ یاقوت لب اُن میدانوں میں۔
سُو رہی ہیں جہاں گلاب کے پھول مُرجھا جاتے ہیں۔

Waste Land by T.S. Eliot No. IV.

مرگ بغرق:۔
فلیبس فنیقی کو مرے ہوئے دو ہفتے گذر چکے۔
بحری مُرغابیوں کی قائیں قائیں، گہرے سمندر کی موج خیزی۔
اور سود و زیاں سب کچھ اُسے فراموش ہو گیا۔
ایک تحت البحر موج نے سرگوشیوں کے ساتھ اُس کی ہڈیوں کو چُن لیا۔
جسوقت وہ اُچھلا اور ڈوبا، گرداب میں داخل ہوتے ہوئے۔

وہ اپنے شباب اور کہولت کے ادوار سے گذرا۔
اے مخاطب! تو چاہے یہودی ہو یا غیر یہودی۔
جس وقت تو جہاز کا (اسٹیرنگ وھیل) پہیا گھمائے اور ہوا کا رُخ دیکھے تو
فلیبس کو یاد کر لینا کہ وہ بھی کبھی تیری طرح خوبرو اور کشیدہ قامت تھا۔

Wessex Poems by Thomas Hardy "She".

عاشق کے جنازے پر

وہ اُسے اُس کی ابدی آرام گاہ کو لئے جا رہے ہیں۔
جلوس آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔
میں بھی بیگانوں کی طرح پیچھے پیچھے جا رہی ہوں۔
وہ اُس کے اعزّہ ہیں اور میں اُس کی محبوبہ۔
میں اپنا وہی شوخ رنگ گون پہنے ہوئے ہوں۔
حالانکہ وہ سب سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس ہیں۔
لیکن اُن کی آنکھوں میں غم کا نشان تک نہیں۔
اور میرا اندوہ مجھے آگ کی طرح بھسم کئے دے رہا ہے۔

محبوبہ کا امضائے مختصر

ایک شاعر کے دیوان کے ایک صفحہ پر، مدّت ہوئی میں نے۔
اس کے نام کے دو حرف لکھ دئے تھے۔
(اس وقت) وہ اُس نورانی خیال کا ایک جُزو معلوم ہوتی تھی۔
جو شاعر بلند فکر کے وجد و سرور کا سرچشمہ تھا۔
اب جب میں وہ صفحہ کھولتا ہوں تو وہی لافانی نور۔
اُن اشعار میں جلوہ گر دیکھتا ہوں لیکن اُس (محبوبہ)
کے نام کے حروف سے وہ درخشانی معدوم ہو چکی ہے۔

اگر آپ کا جی چاہے تو آپ بقولِ فراقؔ اِن شعرا کو "پُورے نظامِ شمسی کا رونے والا" قرار دیجئے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہو وہ بالکل نیچرل ہے۔ کہیں شہیدانِ محبت کا ماتم ہے۔ کہیں جوانمرگ دوستوں کی مرگِ

بے ہنگام کا رونا ہے۔ کہیں کسی حسرت نصیب کی غرقابی پر بے اختیار آہیں مُنہ سے نکل رہی ہیں۔ کہیں عاشق کے جنازے پر بے مثال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ کہیں کسی مرنے والی کی یاد میں کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہے۔

خُدارا انصاف۔ ان اشکہائے خونیں کو فانی کے گریۂ دروغین سے کیا نسبت؟ فانی صاحب ماشا اللہ زندہ اور تندرست ہیں۔ مگر خواہ مخواہ بیمار بنتے ہیں۔ جھوٹ موٹ اپنے اوپر عالم نزع طاری کرتے ہیں۔ مرجاتے ہیں۔ دفن ہوتے ہیں۔ قبر میں تڑپتے ہیں۔ کفن پھاڑ کر بولتے ہیں۔ خاک میں ملکر خاک ہو جاتے ہیں۔ مگر دل کی بیتابی نہیں جاتی۔ بیدرد محبوب سے شکوہ و شکایت کا سلسلہ برابر باقی رہتا ہے۔ پھر حشر میں اپنے قاتل سے جا ملتے ہیں۔ غرض خرافات کا ایک سمندر ہے کہ اُمنڈ رہا ہے۔ کاش فراق صاحب سوچتے کہ فانی کی شاعری کوئی حقیقت کی آواز ہے یا ایک واہی بہروپئے کا شور و غوغا؟

"نقاد" نے اگر فانی کو مرگھٹ کا رونے والا شاعر" کہا تو یہ نقاد کی بیجا طرفداری ہے۔ اس لئے کہ مرگھٹ کے رونے والے کا رونا بھی ایک معنی رکھتا ہے مگر فانی کا رونا محض لایعنی بلکہ اسے رونا کہنا رونے کی توہین کرنا ہے۔ رستم ہند گاما پہلوان کو اسٹیج پر میاں مجنوں کا پارٹ کرتے دیکھکر اگر تماشائیوں پر اندوہ و ملال کی کیفیت طاری ہو سکتی ہے تو یقیناً فانی کے وہ اشعار سُنکر بھی ہوگی جن میں اُنھوں نے اپنے عالمِ نزع، وفاتِ حسرت آیات اور کفن و دفن وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

جن حضرات کو کلامِ فانی کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا ممکن ہے اُنہیں ہمارے اس قول کے تسلیم کرنے میں کچھ پس و پیش ہو۔ لہذا ہم مثال کے طور پر فانی صاحب کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو "مقدمہ نگار" کے نزدیک یاسیت کے مرقعے اور ہمارے نزدیک بے بنیاد اور واہی خیالات کی لوٹ ہیں۔

حضرتِ فانی پر عالمِ نزع طاری ہوتا ہے۔ قارئین ذرا اپنا اپنا دل سنبھال لیں مبادا کوئی اندوہناک حادثہ پیش آ جائے۔

دکھا نہ اب انتظار اپنا لحد کو ہے انتظار میرا ؎ قدم نکال اب تو گھر سے باہر جو دم بھی سینہ سے پہل نکلے

زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا ؎ موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے

"اُصولِ شاعرانہ" کے مطابق حضرتِ فانی نے عین عالمِ جانکنی میں اُس "بانی بیداد" کو طلب کیا کیونکہ اُس کے آئے بغیر جان نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ آیا۔ اور اب کس طرح حضرتِ فانی کی روح قفسِ عنصری کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتی۔ اللہ اکبر! کس قیامت کی کشمکش ہے۔ خدا دوست دشمن سب کو اس بلا سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ لیکن ہمارے پاس اس امر کا کافی ثبوت موجود ہے کہ وہ "بانی بیداد" ہرگز ہرگز آخر وقت تک فانی صاحب کو دیکھنے نہیں آیا۔ اگرچہ ایک ضعیف روایت یوں بھی ہے کہ جس وقت فانی صاحب کا دم نکل رہا تھا وہ "بے وفا" کہیں اُدھر سے گذر رہا تھا مگر غرورِ حُسن نے اُسے اتنی اجازت نہ دی کہ مرنے والے کی آخری حسرت پوری کر دیتا۔ ہر چند فانی صاحب پکارتے رہے کہ ؎

کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ ؎ غرورِ حُسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دُنیا سے

لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی بیان کیا یہ روایت ضعیف ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ فانی صاحب جب

اس دُنیائے فانی سے رُخصت ہو چکے تب کہیں وہ "رقیب نواز" آیا- جب اس کی آمد آمد کی خبر گرم ہوئی تو فانی صاحب سخت بے چین ہو گئے- مستقبل کی اذیتوں کا احساس کرکے بلبلا اُٹھے اور بیساختہ یہ شعر فرمایا ؎

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم ✧ کہ جنازے پہ وہ غارت گرِ خواب آتا ہے

بہر حال وہ آیا مگر ابھی دس پانچ قدم کے فاصلے ہی پر تھا کہ حضرتِ فانی نے فی البدیہہ یہ شعر کہا اور نہایت دردناک لہجہ میں بلند آواز سے پڑھا ؎

وہ مرے جنازے پر بعدِ مرگ آئے ہیں ✧ مدعا ہوا حاصل ترکِ مدعا کرکے

یہ وہ وقت تھا کہ حضرتِ فانی کو نہلا دھلا کر، کفن پہنا کر جنازہ گورستان کو لیجایا جانے والا تھا- جیسے ہی وہ قریب آیا حضرتِ فانی اس سے مخاطب ہو کر کفن کے اندر سے چلّا کر بولے ؎

سُنتے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے ✧ کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

چنانچہ اُس نے فانی صاحب کے مُنہ سے کفن سرکایا- فانی صاحب گو مر چکے تھے مگر ماشاءاللہ طبیعت اس وقت بھی حاضر تھی چنانچہ اُدھر اُس نے اِن کے مُنہ سے کفن ہٹایا اِدھر انہوں نے یہ شعر فرمایا جس میں ایک نہایت دردناک پیرایہ میں آخری دیدار سے محروم رہنے کی شکایت کی گئی ہے ؎

پتھرا گئی تھی آنکھ مگر بند تو نہ تھی ✧ اب یہ بھی انتظار کی صورت نہیں رہی

یہ شعر پڑھکر حضرتِ فانی پھر خاموش ہو گئے- اسوقت آپ کے چہرہ پر ایک غیر معمولی رونق آگئی تھی- "وہ ظالم" یہ کیفیت دیکھکر حیران رہ گیا- حضرتِ فانی نے پھر شکوہ سنجی شروع کی ؎

آگئی ہو ترے بیمار کے مُنہ پر رونق ✧ جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارمان نکلا

یہ واقعات ایسے ہیں کہ پتھر کا کلیجہ پانی ہو جائے- کوئی کہاں تک متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے آخر وہ "بیدرد" بھی تڑپ اُٹھا اور موت کو کوسنے لگا- حضرتِ فانی اُس کی اِس سادگی پر مُسکرا کر بولے ؎

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں ✧ آپ کو یہ بھی ہوش ہو کس نے کسے مٹا دیا-

یہ شعر سُنکر اس کا دل اور بھی متاثر ہوا اور نہایت محبت بھری نظروں سے فانی صاحب کی لاش کو دیکھنے لگا- اب فانی صاحب کے لئے ضبط دشوار تھا- مگر بیچارے کمزور آدمی تھے پھر مر کر اور بھی نڈھال ہو گئے تھے اسپر طرّہ مسلسل شعر خوانی- اب ان میں اتنی طاقت بھی باقی نہ تھی کہ شکایت کے چند کلمے زبان سے ادا کر سکتے- بہر حال بڑی کوشش اور ہمت کرکے یہ دو مصرعے ارشاد فرمائے ؎

پھیرے میّت کی جانب سے نگاہِ التفات ✧ سینکڑوں شکووں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے

انسان کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو آخر انسان ہے مٹی کا بیجان پتلا نہیں- دل کیسا ہی بے احساس کیوں نہ ہو آخر دل ہے پتھر کا ٹکڑا نہیں- یہ سچ ہے کہ اُسی "تغافل کیش" نے حضرتِ فانی کی جان لی تھی مگر اب یہ حالت دیکھکر اس کا دل بھی خون ہو گیا- بے اختیار فانی صاحب کی لاش کو لپٹ گیا اور دیوانہ وار فریاد کرنے لگا کہ "فانی! فانی! ہائے بولتے

نہیں ہم سے خفا ہو گئے۔ للّٰلہ کچھ کہو تو۔کیوں خفا ہو گئے۔ تم جو کچھ کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ خدا را مُنہ سے تو بولو۔ کچھ کہو تو! آخر کیا چاہتے ہو؟" وہ اس طرح فریاد و زاری میں مصروف تھا اور فانی صاحب بیچارے "ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم" کے مصداق خاموش پڑے یہ رُوح فرسا منظر دیکھ رہے تھے ؎

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے ؛ وہ جنازے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

مری میّت پہ اُن کا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے ؛ دل بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے

فانی صاحب کے اقارب و احباب سب آخری دیدار کر چکے تھے۔ جنازہ اُٹھنے والا تھا۔ گریہ و بُکا کا شور آسمان تک پہونچ رہا تھا۔ "وہ" بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا۔ فانی صاحب نے آخری کوشش کی اور کسی حیلہ سے اُسے چند لمحوں کے لئے اور روک لینا چاہا۔ ایسے شاعر دُنیا میں اب شاید ہی پیدا ہوں جو اپنا جنازہ اُٹھتے وقت شعر کہنے کی قدرت رکھتے ہوں۔ آفریں بر رُوح فانی آفریں۔ جب اُس نے پیٹھ پھیری، فانی صاحب نے کفن کے اندر سے چلّا کر کہا ؎

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میّت پر ؛ اب اُٹھا چاہتی ہے نعش فانی دیکھتے جاؤ

مگر تاثر کے لمحات گذر چکے تھے، فانی صاحب نے لاکھ پکارا مگر اس "وفا نا آشنا" نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور رقیب کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر تیزی سے روانہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں فانی صاحب کے دل کی جو کیفیت ہوئی ہو گی اہلِ دل خود اِس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ع۔ قیامت کی تڑپ تھی، انتہا کی بیقراری تھی۔ شاعر کا اضطراب شعر گوئی ہی سے تسکین پاتا ہے۔ چنانچہ فانی صاحب جس وقت چار آدمیوں کے کاندھے پر سوار اپنی ابدی آرام گاہ کیطرف تشریف لئے جا رہے تھے اُنھوں نے آہستہ آہستہ یہ شعر گنگنانا شروع کیا ؎

سکونِ موت مری لاش کو نصیب نہیں ؛ رہے ہے مگر کوئی اتنا نہ بیقرار رہے

کبھی اس شعر کی تکرار فرماتے تھے ؎

ہماری لاش مُرقع ہے بیقراری کا ؛ اک اضطراب کی صورت بھی اس قرار میں ہے

مگر بعض معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ یہ شعر حضرتِ فانی نے اپنے مرنے کے فوراً ہی بعد کہا تھا گورستان لیجائے جانے وقت نہیں پڑھا تھا۔ ان جزئی واقعات کا اختلاف چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ قابلِ لحاظ کوئی اختلاف اگر ہے تو یہ ہے کہ فانی صاحب کے بعض رفیقانِ خاص نے فانی صاحب کے ارتحال کے بعد خود فانی صاحب کی زبان سے یہ شعر سُنا تھا۔ ؎

سکونِ قلب میسّر ہے موت ہی سے سہی ؛ غرض کہ خاتمۂ رنجِ اضطراب ہوا

مرنے کے بعد انسان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے چونکہ عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے اس لئے یہ مسئلہ از حد دلچسپ ہے کہ بعدِ مرگ انسان کو "سکونِ قلب" حاصل ہو جاتا ہے یا زندوں کی طرح اس وقت بھی اضطراب دامنگیر رہتا ہے۔ لیکن مذکور بالا دو متضاد بیانوں کی موجودگی میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور افسوس ہے کہ فانی صاحب کے کلامِ بعد از مرگ کی روشنی میں بھی یہ مسئلہ اُلجھا کا اُلجھا ہی رہا۔

جن لوگوں کو حضرتِ فانی کے مزارِ پُرانوار پر جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کا بیان ہے کہ اکثر قبرِ فانی سے یہ آوازیں آتی ہیں ؎

قبر میں جب کسی طرح دل کی تڑپ نہ کم ہوئی ٭ یادِ خرامِ ناز نے حشر کا آسرا دیا
تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی ٭ ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے تری جلائے ہوئے

اور فانی بڑھ گئی بیتابیٔ دل بعدِ مرگ ٭ کیا کہیں مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

اِن اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہو کہ مرنے کے بعد عاشق بیقرار رہتا ہو۔ نہ صرف اتنا بلکہ مرنے کے بعد بیقراری اور بھی بڑھ جاتی ہو لیکن اب بھی مسئلہ زیرِ بحث حل نہیں ہوا کیونکہ اشعار بالا کے ساتھ ساتھ یہ شعر بھی تربتِ فانی پر گونجتے ہوئے سُنے گئے ہیں ؎

مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں ٭ ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں
کب سے آغوشِ لحد میں ہم ہیں سرتاپا قرار ٭ وہ ستم پرور رہا اب تک بدگمانِ اضطراب

یہ ہے فانی کا نغمۂ غم جس کے مفکرانہ انداز کی اہمیت کو "دلقبولِ فراق" "نقاد" نے نظر انداز کر دیا۔ یہی ہیں وہ اشعار جو فراق صاحب کو "فلسفیانہ احساس" سے مملو نظر آتے ہیں۔ اللہ اللہ، کیا فلسفیانہ یاس و غم ہے۔ ہزار آفریں بر شاعر و صد ہزار آفریں بر ناقدش۔ یہ چند شعر صرف نمونے کے طور پر ہم نے نقل کئے ہیں ورنہ فانی صاحب کا مختصر دیوان اس قسم کے خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ اپنی مرگ و تربت اور واقعاتِ بعد از مرگ کے متعلق مرحوم نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ سب ماشاءاللہ اسی رنگ میں ہے جس کا تھوڑا سا نمونہ قارئین نے سطورِ بالا میں ملاحظہ فرمایا۔

اِن لایعنی اشعار کو سُنتے سُنتے قارئین تنگ آ گئے ہونگے لہٰذا ہم صرف ایک شعر سُنا کر اس باب کو ختم کئے دیتے ہیں۔ فانی صاحب جہاں شاعر ہیں وہاں مُصوّر بھی ہیں مُصوّر اسی معنی میں جس میں "اُونچے درجہ کے مقدمہ نگار" شاعر کو مُصوّر کہا کرتے ہیں۔ فانی صاحب نے ایک لاجواب تصویر کھینچی ہے۔ تصویر کا حُسن صرف یہی نہیں کہ اُسے دیکھکر انسان کے دل میں جذبۂ انبساط پیدا ہو۔ نہیں۔ غم، خوف، نفرت، کراہت، وحشت جو کیفیت بھی طاری ہو صنّاع کے کمال کو ظاہر کرتی ہو۔ فانی صاحب شعرا کے قاعدۂ کُلّیہ کے مطابق عاشق ہونے کے بعد دیوانے ہو گئے تھے۔ دیوانے کا علاج زنجیر چنانچہ آپ کو بھی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ فراقِ یار کی اذیّت، العظمۃ للہ! پڑے گھلتے رہے۔ آخر میاں مجنوں کی طرح صرف پوست و استخواں کا مجموعہ رہ گئے۔ یہاں تک کہ جسم کی کھال بھی گل گل کے گر گئی اور صرف مٹھی بھر ہڈیاں زنجیروں میں لپٹی ہوئی رہ گئیں۔ یہ تھی آپ کی آخری حالت جب آپ نے وفات پائی۔ زنجیروں میں لپٹی ہوئی یہی چند ہڈیاں تھیں جنہیں حضرتِ فانی کا جنازہ کہہ سکتے ہیں۔ انہیں کو لوگ گورستان لے گئے ؎

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں ٭ لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

اور سپردِ خاک کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہائے اب ایسے "چوٹی کے غزلگو" کہاں پیدا ہوں گے۔

عندلیب شادانی

(باقی آئندہ)

قاضی نذرالاسلام

"ایک رند خراب حال" ـــ سوسائٹی کی لعنت ملامت اور عوام کی نکتہ چینیوں اور طنز و تشنیع کے باوجود بھی عرفانی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے ۔ لوگ اس کی طرف معنی خیز کنکھیوں سے دیکھتے ہیں ـــــ یہ دزدیدہ نگاہیں کبھی کبھی قدر دانی اور جذبات تحسین کی حامل ہوتی ہے، مگر زیادہ تر اس سے نفرت وحقارت کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔

اور "نذرل" بھی ایسا ہی ہے ـــــ

مرد اسے صنفِ نازک کا پرستار سمجھتے ہیں ۔ عورتوں کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ اُن سے متنفر اور بیزار ہے ۔ مولوی اسے "ہندو" سمجھ کر اس سے ناامید ہو چکے ہیں اور ہندو اس کو "برہمو" بتاتے ہیں ۔ کچھ لوگوں کی آرزو ہے کہ وہ پھر جیلخانہ بھیج دیا جائے ـــ SATURDAY LETTERS ہر ہفتہ اس کا کلام خراب کرکے خوش ہوتا ہے ۔ اس کی "بلبلی" کو "ٹکٹکی" سے بدلا جاتا ہے اور اسے ایک ایسے ہوس پرست اور بے دھڑک نوجوانوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس نے اب تھک کر حب الوطنی اور اصلاح عوام کے مشاغل میں آخری پناہ لی ہے !

ایسے حالات میں یہ امر ایک گونہ تسکین بخش ہی کہ ٹیگور اسے اپنے سایہ عاطفت میں لیتے ہیں ۔ اور اپنے ڈرامہ "بسنت" کا انتساب اس کے نام پر کرتے ہیں ۔ اور اسے "بنگال کا نوخیز شاعر" کہہ کر اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں ۔

یہ مضحکہ خیز نقلیں (Parodies) بھی جو اس کا کلام خراب کرتی ہیں اور اس کا مذاق اڑاتی ہیں، حد درجہ دلچسپ ہیں ۔ اس کے کمالات اور شخصیت کو نقصان پہونچانے کے بجائے یہ ان پر روشنی ڈالتی ہیں اور اس کی الجھی ہوئی شخصیت کو واضح کرتی ہیں . . . .

اس کی کیفیت کا کچھ اندازہ اس کی "فریاد" سے ہوسکتا ہے ۔ وہ کہتا ہے :-

"میں دورِ حاضر کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیشین گو یا پیغمبر نہیں ۔ روبی ٹھاکر اپنے ابدی نغمے سنایا کریں، مگر مجھے تو صرف صبح کی بھیرویں سے سروکار ہے ۔ اگر روبی ٹھاکر (دہر زمانہ کے شاعر) ہیں تو میں بھی کم سے کم اپنی پسندیدہ جھک اور اپنے خبط ہی کو شعر کا جامہ پہنا دیتا ہوں ۔"

مگر ایک شاعر سے ہمیشہ یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی شخصیت کو تمام و کمال سمجھائے، خصوصاً ایسے وقت جب وہ معذرت کررہا ہو جس شے کو نذرل کسر نفسی سے "ہوجوگ" کہتا ہے ۔ وہ محض "بیکاری کا مشغلہ" نہیں بلکہ ایک آتش خیز جذبہ ہے جو صرف اسی کے لئے مخصوص ہے اور اس کی رومانی طبیعت کا پتہ دیتا ہے ـــــ یہ اس کا ہمیشہ آزاد رہنے کا آہنی عزم ہے ۔ موجودہ حالات کے خلاف بغاوت کا ارادہ ہے، اور حقیقی آزادی اور محبت کی خواہش بے پایاں ہے ـــــ

کیا یہی چیزیں نہ تھیں جو اُسے جیلخانہ لے گئیں؟

اس کا یہ "بیکاری کا مشغلہ" ـــــ یہ شوقِ فضول ـــــ ہی اس کی شخصیت کا غماز ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ "خود" ہے ۔

کیا آپ کسی ایسے شخص کا تصور کرسکتے ہیں جس کا کوئی

مشغلہ نہ ہو؟ ——— اُف! کتنا بھیانک تصور ہوگا!

اس کی مشہور نظم "باغی" جس نے بنگال میں ایک طوفان بپا کر دیا تھا، ان جوشیلے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

"کہہ، اے جوانمرد غازی
کہہ، میرا سر بلند ہے
جس کو دیکھ کر وہ ہمالیہ کی چوٹی
اپنا سر شرم سے جھکا لیتی ہے!"

جیسے جیسے ہم اس کو پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ہمیں ایک بڑھتی ہوئی روحانی شدت اور بلندی کا احساس ہوتا ہے، ہمارے ارادے مضبوط اور تمام بندشوں کو توڑنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری روح اپنی حدود اور قیود سے آزاد ہوتی جاتی ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ پُر اسرار طاقت وہی ہے، اور اتنی ہی طاقتور ہے جتنی کائنات کی جوشش نمو اور اس کا اصل اصول۔ یہ طوفانِ بلا کے گرداب میں بھی اسی طرح جلوہ نما ہے جیسے نسیم سحر کے ہلکے اور خنک جھونکوں میں۔ سمندر کے مدّ و جزر میں بھی وہی ہے اور دھڑکتے ہوئے سینہ میں بھی اسکی کارفرمائی ہے۔ یہ بجلی کی کڑک اور چمک میں اسی حد تک نمایاں ہے جتنی آنکھ کی ضیا باریوں، نغمہ کی تھرتھراہٹ، آلام کی شدّت اور درد محبّت کے مارے ہوئے دل کی آخری ضربوں میں ——— یہی ثوابت میں ہے، یہی سیّاروں میں ہے اور یہی "نگاہِ ناز" کے کرشموں اور عارض سیمیں کی حیا پروردہ سُرخی میں!

ہم میں بھی یہی رواں دواں ہے۔ ہم بھی وہی ہیں جو یہ زندۂ جاوید طاقت ہے، اس لئے ہم بھی ہر وہ تبدیلی اور حرکت پیدا کر سکتے ہیں جو ہم چاہیں۔ لیکن یہ طاقت جہاں ہر تحریک تخریب کی بانی ہے۔ وہاں کائنات کو سکون اور ہم آہنگی کی لوری دیکر سُلا بھی سکتی ہے ——— اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب تمام طاقتیں متوازن ہو جائیں، جب ظلم اور ناانصافی کا وجود نہ رہے .... اس وقت جاکر کہیں یہ باغی آرام لیگا!

مگر اس وقت بغاوت کے اسباب کیا ہیں؟ ایک عدم آسودگی، ایک نہ پوری ہونے والی تمنا، ایک کبھی ہار نہ ماننے والی، کبھی نہ تھکنے والی اور ہمیشہ جدوجہد کرتے رہنے کی طاقت۔

اس کا ناول "گم کردۂ اسیری"، جو خطوط کا مجموعہ ہے اس حقیقت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ نور الہدیٰ اپنی بھابی کو اپنی بغاوت پسند طبیعت کا حال لکھ رہا ہے، اور ان الفاظ میں سب کچھ کہہ ڈالتا ہے۔

"میری یہ رحم ناآشنا، بہائم صفت بغاوت ——— انسان کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے پیدا کرنے والے کے خلاف ہے!"

دیگر مقامات پر بھی ہم کچھ ایسے ہی خیالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ مثلاً

"اس مصیبت زدہ کائنات کے سینہ پر
خدا ڈر کر آنسو بہاتا ہے
کہ کہیں یہ اپنے پیدا کرنیوالے سے بھی نہ بڑھ جائے
اور خود اسی کو لقمہ نہ بنالے!"

یا پھر:-

"مجھے خدا کی ضرورت نہیں
مجھے انسان کی تلاش ہے"!

پس یہ "باغی" مردم بیزار نہیں بلکہ اپنی نوع کا سچّا ہمدرد رہی۔ اس کی بغاوت کا سبب وہ غلامی، وہ مصائب اور وہ مظالم ہیں جن کو وہ ——— اس محبت سے خالی دنیا میں۔ اپنے اندر اور چاروں طرف محسوس کرتا ہے۔

یہ باغی آخر چاہتا کیا ہے؟ ایک کامل آزادی کی حالت' محبّت اور سرور و نشاط۔

وہ اپنے "آہنگِ فردوس" میں اس کا تذکرہ کرتا ہے:۔

"خواہ جنت میں میرا ہم نشیں کوئی بھی ہو ——

مگر کیا میرا یہ نصب العین حاصل ہو جائیگا؟"

یا:۔

"—— ممکن ہے میں تم سے مل سکوں —— وہاں

—— جہاں آسمان جھک کر جنگل کے سبز کنارے کو بوسہ دیتاہے"

یہ وہی تلاش اور جستجو ہے جو یولیسیز (Ulysses.) کو دامنگیر تھی، جس نے پرومی تھیوس (Promitheus) کے قلب میں آگ لگائی تھی، جس نے فاسٹ (FAUST) کو ستایا تھا —— ناممکن الحصول کی تلاش، ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی خواہش، انسان کے مفاد کے لئے شعلہ آسمانی کی جستجو ......!

نصب العین ہمیشہ حصول کی دسترس سے آگے ہی رہیگا اُفق تک ہم کبھی اپنا ہاتھ نہ پہونچا سکیں گے، مگر پھر بھی ہم کو اس تحصیل لاحاصل کی کوشش کو چھوڑنا نہ چاہئے" ہجوم ناامیدی" کے باوجود بھی یہ "سعی باطل"، ہم کو جاری رکھنی چاہئے۔

اسے کیا چیز ستاتی ہے، اس آوارہ و مجنوں باغی کو؟ وہ اپنے آپ کو "گم کردۂ اسیری" کہتا ہے، "آزاد اسیری" نہیں کہتا۔ درد آزادی کیسا ہوتا ہے؟ آزادی اس کا شعار ہے۔

وہ بالکل آزاد ہے —— بلا روک ٹوک ——

ایسا آزاد جس کا سنبھالنا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی ایک پوشیدہ درد اس کے اندر رہ کر ٹیس لیتا ہے۔ اس کا حلق خشک کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں وحشت اور حسرت پیدا کر دیتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح کا یہ جذبہ آزادی ہی —— آزادی سے سیر ہو کر —— اب پھولوں سے گندھی ہوئی زنجیر غلامی کیلئے بے چین ہے، مگر اسکو کوئی ہستی ایسی نازک اور سریع الحس نہیں ملتی جو اسے اس زنجیر میں مقید کر سکے۔ آزادی اس کا منہ چڑاتی ہے:۔

"دیکھ تیری آوارہ گردی اور آزادروی ہی تیرے لئے جنجال ہے ... ایک زندانِ بلا ہے .... کیونکہ یہ تجھ کو سب سے علیحدہ —— بالکل تنہا —— رکھتی ہے!"

آزادی اپنی بقا کیلئے محبت کی طالب ہوتی ہے اور مکمل آزادی تو پھر تکمیل محبت کا خواب دیکھتی ہے —— ایک "رقص سرمدی" کی آرزو کرتی ہے (اس کھینچا تانی کی نہیں، جو محبت کو "ایک رسا کشی کا مقابلہ" بنا دیتی ہے۔ اور نہ اس کاروباری محبت کی جو ہمارے اس نیم گرم کُرہ پر نظر آتی ہے)۔

اس کی "شریک رقص" کہاں ہے؟

اس کی رس بھری، روح کو نڑپانے والی آواز دور سے سُنائی دیتی ہے، شاید مرمریں فرش پر اس کے قدموں کی جھنکار بھی "فردوس گوش" ہوتی ہے، شاید اس کے ملبوس کی سرسراہٹ بھی دل کی حرکت تیز کر دیتی ہے، مگر ——

وہ خود کہاں ہے؟

یہ ہے وہ ازلی درد جو آزادوں کے حصہ میں آیا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ "باغی" "اکیلا" اپنے خیالات کی دُنیا میں اِدھر اُدھر گھوما کرتا ہے ....

نذرؔل کی شاعری اس کی شخصیت کے ان دو متضاد عناصر کی آئینہ بردار ہے —— ایک تو اُس کا جذبۂ آزادی اس کا کبھی شکست نہ ہونیوالا جذبہ آزادی۔ اور دوسری اسکی روحانی تشنگی، اس کی خواہش غلامی —— قید محبت کی آرزو اور یہ ایک دوسری بحث کا پیش خیمہ ہے۔ "محبت کا اتنا زیادہ بھوکا ہونے کے باوجود وہ اپنے عقائد اور نظریات میں اتنا بوالہوس اور بندۂ نفس کیوں نظر آتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں۔

"ارے وہ تو پکا اوباش ہے!"

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہ ہو؟

تصور کیجئے، موسم بہار کے اخیر کی ——— غنودگی طاری کر دینے والی ایک دوپہر میں ایک باغ کا، نرم و گرم ہوا کے خوابناک جھونکوں کا، اور ایک پھول سے دوسرے پھول تک بھٹکتی ہوئی ایک تتلی کا . . . . یہ ہے تصویر نوجوانوں کی دلچسپی کے اس مرکز کی . . . . . ایک سچے "رند خراب حال" کی!

صنفِ نازک کی طرف سے اسے "بیوفا" اور "بیگانہ خیال" کا خطاب دیا جاتا ہے۔ مگر اسے بیوفا کیوں کہا جائے؟ وہ تو کوئی وعدہ ہی نہیں کرتا!

وہ ضدی، ہٹ کا پورا، عاشق ——— بھونرا ——— دن دہاڑے موسیقی کے ایک طومار کے ساتھ آتا ہے، شہد چوس لیتا ہے اور صرف "لذتِ نیش" چھوڑ دیتا ہے۔ مگر ہمارا یہ بھولا بھالا رندِ اوباش آپ سے کسی چیز کا طالب نہیں۔ وہ اپنے "مخصوص انداز بے پروائی" کے ساتھ آتا ہے۔ کسی پھول کے گرد تھوڑی دیر طواف کرتا ہے، صرف اس خوشبو سے لطف اندوز ہوتا ہے جو فضا میں پھیلی ہوتی ہے اور اس کے بعد چلا جاتا ہے ——— پھول جاتا ہے مُسکراتا ہے! اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ آپ کے سامنے سرِ عقیدت خم کرتا ہے اور پھر اپنا راستہ لیتا ہے ——— یہ شخص مٹرلنک (Maeterlink) کی کسی ٹریجیڈی کا ہیرو بن سکتا ہے۔

وہ خوب جانتا ہے کہ زندگی اتنی زیادہ "سنجیدہ" ہے کہ وہ خود سنجیدہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اسے بخوبی معلوم ہے کہ اس کے دل کی کلی کا ملنا ناممکن ہے۔

پھر بھی وہ زندگی کو عذابِ جان نہیں سمجھتا۔ وہ اپنی حرماں نصیبی کے گہرے احساس اور کبھی نہ پوری ہونیوالی آرزو کو، یاوہ گوئی اور مسخرگی کے بھیس میں، خود اپنے سے بھی چھپاتا ہے ——— وہ جانتا ہے کہ اپنا وقت سڑک کے کنارے کیسے گذارے۔

اس "حسین کلی" کے لئے وہ دن یقیناً یادگار ہوگا جب وہ مایۂ تسکین بن سکے گی اور اس بے چین اور سکون ناآشنا آوارہ گرد کو ہمیشہ کے لئے اپنا اسیر بنائے گی۔ یہ تتلی اس وقت اپنی پرواز چھوڑ دے گی اور اس کے ساتھ شاخ گل پر رقص کرے گی اور صبا کے نرم و نازک جھونکے یہ گیت گائیں گے۔

"کلی اور تتلی ——— تتلی اور کلی

اب ایک ہو جاتے ہیں، ہمیشہ کیلئے ایک!"

اس وقت تک ہمارے "رندل" کو مسکرانے دیجئے تاکہ وہ اپنے آنسوؤں کی یاد کو بہلا سکے۔ یہ اس کی آوارگی، اور بوالہوسی نہیں۔ یہ تو اس کی ملاعبت اور وارفتگی ہے اور اس کی تہ میں ایک شاندار ٹریجیڈی کا مواد ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:—

"یہاں کوئی چیز باقی نہ رہے گی
سوائے میرے تمہارے اور درد کے!"

"ماضی" دہلی

موہنی

بمبئی سکول آف آرٹس میں، جو مشرقی فنون لطیفہ کا سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا ہے، ایک حسین دوشیزہ آرٹ گیلری میں ایک قد آدم تصویر کے سامنے مبہوت کھڑی تھی۔ اس نے نہایت سادہ کپڑے پہن رکھے تھے جن سے اس کی خوش مذاقی مترشح تھی۔ بہ ظاہر وہ مضطرب اور نڈھال معلوم ہوتی تھی۔ حسن، عنفوان شباب اور اس پر تفکرات و تکان نے اس کے رخساروں کو سرخ اور آنکھوں کو دلکش بنا رکھا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ حسن زیبائش سے میرا ہونے پر زیادہ دل فریب ہوتا ہے۔ اور جب یہ غریبوں کے حصہ میں آجاتا ہے تو اور بھی نکھر جاتا ہے۔

وہ تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اس میں ایک کم سن دہقان لڑکا ایک چٹان کے سرے پر منہ سے بانسری لگائے کھڑا تھا۔ چٹان کے نیچے سرسبز وادی ایک ایسے مخملیں فرش کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کی دھانی زمین پر رنگ برنگے پھول نہایت احتیاط سے کاڑھے گئے ہوں۔ دامن کوہسار میں تناور درختوں کے جھنڈ بھیڑوں کے ریوڑ کے مانند بکھرے ہوئے نظر آتے تھے، دور پس منظر پہ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری کرنیں عقیق کے نیزوں کی طرح اودے بادلوں میں پیوست تھیں۔ اور مندر کے طلائی کلس کے حاشئے ہفت رنگی شعاعوں سے جگمگا رہے تھے۔ فضا میں بگلوں کا ایک قافلہ اپنے بسیرے کی جانب واپس لوٹ رہا تھا۔ تصویر کے حاشیہ پہ اس کی سُرخی "سرودِ شام" اور مصور کا نام جگدیش لکھا ہوا تھا۔ جو نہایت مضبوط چوبی چوکھٹے میں جکڑی ہوئی آہنی زنجیروں سے دیوار پر آویزاں تھی۔

دوشیزہ تصویر کے آگے تصویر بنی کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے خیالات میں اس قدر کھوئی ہوئی ہے کہ اُسے تصویر میں کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ دماغ جب خیالات کے ہجوم میں گھر جاتا ہے تو دیگر حواس پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتا۔ وہ اسی عالم میں کھڑی تھی کہ جگدیش ہاتھ میں رنگوں کی پیالیاں اور مُوقلم لئے ہوئے ایک دروازہ سے آرٹ گیلری میں داخل ہوا۔ لمحہ بھر کیلئے اس کو بغور دیکھا اور پیشانی پر بل ڈالے ہوئے دوسرے دروازہ سے باہر نکل گیا۔ خوابوں کی دُنیا میں بسنے والے یہ تخیل پرست مصوّر بھی کیسی عجیب و غریب طبیعت کے مالک ہوتے ہیں! کون جانتا ہے کہ اس وقت جگدیش کے خیالات کیا تھے؟

"ڈائرکٹر صاحب ہیں؟" دوشیزہ نے کافی دیر کے بعد ایک چپراسی کو اپنی طرف آتے دیکھکر دریافت کیا۔

"صاحب کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے"، چپراسی نے غیر ارادی طور پر ایکبار انھیں الفاظ کو دُہرایا جنھیں وہ برسوں سے دُہراتا چلا آیا تھا اور اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"لیکن میں صرف......"

"صاحب کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے"، اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیٹی درست کرتے ہوئے پھر وہی جملہ دُہرایا۔

"تم مجھے صرف اندر جانے دو، صاحب تمھیں کچھ نہیں کہیں گے"، دوشیزہ نے منت آگیں لہجہ میں کہا۔

چپراسی نے ایک بار نظر بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ شاید اُسے رحم آگیا۔ کیونکہ اس نے اس مرتبہ جیب سے ایک ملاقاتی پرزہ نکالکر

پیش کیا جس نے اس کی خانہ پُری کر دی۔

نام :۔ مس موہنی ...... پیشہ ...... ملاقات کا باعث :۔ ......

• چپراسی پُرزہ لیکر اندر چلا گیا اور دو منٹ کے بعد لوٹ کر کہا "صاحب کہتے ہیں کہ سہ پہر کو ملو"۔

جواب سُن کر موہنی نے ایک معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ گویا وہ کہنا چاہتی ہے کہ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی یاس انگیز باتوں کو کسی شمار میں نہیں لاتی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سہ پہر کریگی۔ شاید غربت و عسرت میں خودداری کا احساس لازماً زائل ہو جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد دوپہر کے وقفے کا گھنٹہ بجا۔ ڈائرکٹر صاحب اپنی ہیٹ لئے ہوئے آفس روم سے باہر نکلے۔ بنچ پر بیٹھی ہوئی موہنی کو دیکھکر ایک لمحہ کیلئے رُکے اور واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ حالات خلافِ معمول دیکھکر چپراسی بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔

"ہم سے کوئی ملاقات کا منتظر ہے ؟"

"نہیں حضور، وہ تو وہی لڑکی ہے جسے آپنے سہ پہر کو بلایا ہے"۔

"اچھا، اسے اسی وقت بھیجدو"۔

(۲)

دوسرے دن آرٹ سکول کے پینٹنگ ہال میں موہنی ایک بلند اسٹیج پر ماڈل بنی بیٹھی تھی۔ ہال کے طول و عرض میں طلبا مختلف زاویوں سے اس کی تصویر کھینچ رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کمرے میں ٹہل ٹہل کر ضروری ہدایات دے رہے تھے۔ ٹہلتے ہوئے وہ ہال کے دوسرے سرے پر جگدیش کے قریب آکر رُک گئے۔

"تمھاری آنکھیں نم ہیں جگدیش، کیسی طبیعت ہے تمھاری ؟

"کچھ نہیں ماسٹر صاحب، زکام ہو گیا ہے اس لئے آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں"۔

"خوب! تم نے اس کے بھی آنسو بہا دیئے ہیں !!" ماسٹر صاحب نے جگدیش کی بنائی ہوئی تصویر کو بغور دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"یوں تو یہ بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن اصولاً ......"

"وہ سچ مچ رو رہی ہے ماسٹر صاحب !!"

"ہوگا۔ اچھا جگدیش آج تمھاری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔ اب تم جاؤ اور اپنے کمرے میں آرام کرو۔ شام کو جب میں بورڈنگ ہاؤس کے قریب سے گذروں تو مجھے اطلاع دو کہ تمھاری طبیعت کیسی ہے"۔

جگدیش تمام دن خیالات میں کھویا رہا۔ موہنی کی یہ حالت کسی طرح اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ چند سال پہلے دونوں ہمسبق رہ چکے تھے۔ اور ساتھ ہی ولسن کالج کلکتہ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ اسے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جگدیش بھی چونکہ گھر سے آسودہ تھا اس لئے بی۔ اے کرنے کے بعد بمبئی آکر محض بہ طور شغل سکول آف آرٹ میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد کبھی اُسے موہنی کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ بلکہ موہنی کی نظریں تو آج صبح بھی پینٹنگ ہال میں اس پر نہیں پڑیں۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے

سے دیکھ بھی لیا تو پہچان نہ سکے گی۔ جبکہ اس کا خود یہ حال تھا کہ وہ اپنے کالج کے بیشتر ساتھیوں کو فراموش کر چکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اپنے آپ کو کس طرح اس پر ظاہر کرے۔ وہ کسی طرح موہنی کو ایسی ناگفتہ بہ حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

(۳)

شام کو جگدیش بورڈنگ ہاؤس سے نکل کر لب سڑک کھڑا تھا تاکہ ماسٹر صاحب جب وہاں سے گذریں تو وہ انھیں اپنی صحت سے آگاہ کردے۔ چوراہے پر سے مڑکر آتی ہوئی کولتار کی ہموار سڑک افق کے اس پار تک چلی گئی تھی۔ راستہ کے دونوں جانب مدّ نظر تک ٹیلیفون کے اونچے اونچے آہنی ستون برقی تاروں کے جال کو فضا میں تھامے کھڑے تھے۔ جگدیش ایک ستون کا سہارا لئے معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔ وہ خیالات میں اس قدر محو تھا کہ آرٹ سکول کے گھنٹے کی آواز بھی اسے سنائی نہ دی۔ دفعتہً اس کی نظر موہنی پر پڑی جو موٹروں اور گاڑیوں کی آمدورفت کے درمیان سڑک کو عبور کرنیکی کوشش کررہی تھی۔

"موہنی! موہنی!!" کہہ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔

"جگدیش؟!" موہنی پلٹ کر اس کے آگے کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک موٹر فرّاٹے بھرتا ہوا اس سے ٹکرا کر گذر گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے چوراہے پر آرٹ سکول کے طلبہ اور عوام کا مجمع ہوگیا۔ درمیان میں جگدیش موہنی کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے اپنے گرد دوستوں کو دیکھکر کہا:۔

"ٹیکسی بلواؤ شمسی! دینو بھائی دیکھ کیا رہے ہو، برف منگواؤ برف، چوٹ زیادہ ہے۔ لوگوں کو ہٹانا ذرا بھائی اختر! — موہنی! موہنی!! ہوش میں آؤ!!!"

جگدیش کے ساتھی حیران تھے کہ اُسے اس لڑکی کا نام کیونکر معلوم ہوا۔

ٹیکسی آنے پر جگدیش نے فوراً موہنی کو اپنے دوست ڈاکٹر کیلتانی کے ہسپتال پہنچایا۔

(۴)

دو روز کی بیہوشی کے بعد موہنی نے آنکھیں کھولیں اور جگدیش کو اپنے سرہانے پاکر نہایت خفیف آواز میں کہا "میں آپکا احسان کبھی نہ بھولوں گی، جگدیش بابو، لیکن اگر میں اسی حادثہ میں مرگئی ہوتی تو بہت اچھا ہوتا"۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو موہنی! تم جلد اچھی ہوجاؤ گی، ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی کہہ رہے تھے۔ وہ آتے ہی ہوں گے زیادہ گفتگو سے نقاہت بڑھ جائیگی"۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں جگدیش بابو۔ میرے لئے مرنا ہی بہتر تھا۔ آپ کو میرے متعلق تشویش سی ہو رہی ہوگی میں چاہتی ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتلادوں۔ شاید اس کے بعد موقع نہ ملے۔۔"

جگدیش گو یہ نہیں چاہتا تھا کہ موہنی اپنے آپ کو ہلکان کرے۔ لیکن حالات کو جاننے کے لئے وہ سچ مچ بے چین تھا۔ اسواسطے خاموش ہو رہا۔

"دو سال ہوئے پتاجی کا انتقال ہوگیا"۔ موہنی نے کہنا شروع کیا "اس کے بعد میں اکیلی رہ گئی، بالکل تنہا۔ رشتہ داروں نے میرے گھر کا صفایا کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ میرے ایک ماموں ہیں۔ میں انھیں کے پاس رہا کرتی تھی۔ لیکن جب پتاجی کی چھوڑی

ہوئی تمام رقم ختم ہوگئی تو انھوں نے بھی مجھے دق کرنا شروع کیا۔ آخر ایک دن مجھ سے چھٹکارا حاصل ہی کر لیا اور مجھے بمبئی کے ایک فرضی مقام کا نام بتلا کر ٹرین پر سوار کر دیا کہ اس جگہ مجھے استانی کی حیثیت سے طلب کیا گیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں کسی نہ کسی طرح دنیا میں اپنی جگہ پیدا کر لوں گی۔ کیونکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ کالج کی تعلیمیافتہ لڑکیاں بڑی حرّافہ اور زمانہ ساز ہوتی ہیں۔ اور اگر میں ایسی نہ بھی ثابت ہوئی تو ان سے بازپرس کرنیوالا میرا کون تھا؟ اس کے علاوہ بمبئی میں میرے منگیتر رہتے ہیں۔ شاید انھوں نے یہ سوچا ہو کہ ٹھوکریں کھاتی ہوئی میں سہارے کی امید میں اُن کے دروازہ تک پہونچ جاؤں گی اور انھیں موقع ہاتھ لگ جائیگا کہ میری فراری کی افواہیں پھیلا کر سماج کے آگے اپنی صفائی پیش کر سکیں۔"

موہنی نے ایک گہرا سانس لیکر سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔ "بمبئی پہونچنے پر مجھے اپنے ماحول کی نزاکت کا احساس ہوا۔ یہ صرف تعلیم کا فیض تھا جو میں ایسی حالت میں بھی اپنے حواس قائم رکھ سکی اور چند روز اسی طرح گذار لئے۔ لیکن بہت جلد زمین مجھ پر تنگ ہوگئی۔ دن تو جیسے تیسے بیت جاتے تھے لیکن راتیں زندگی اور موت کی کش مکش میں کٹنے لگیں۔ یہاں کے کنیا آشرم اور دھرم شالے شریف عورتوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہیں۔ ان میں مصیبت کی ماری اور دنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو دو روز سے زیادہ مفت رہنے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اکثر صورتوں میں پہلے ہی دن آشرم والوں کے عجیب و غریب مطالبات شروع ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں شہر کے شریف کہلانیوالے امیروں کی شرافت یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ چند روز کے لئے کسی غیر عورت کو مفت کی روٹیاں توڑنے دیں۔" موہنی ایک لمحہ کیلئے رک گئی

جگدیش مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

"میں نے دنیا اور دنیا والوں سے مایوس ہو کر خودکشی کی ٹھان لی۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا "لیکن میں نے سوچا کہ مرنے سے پہلے مجھے اپنے مردہ جسم کی آخری رسومات کا انتظام کر جانا چاہیئے۔ شاید کسی کو مرنے کے بعد مجھ پر رحم آجائے۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی میری لاش کو جو سب سے پہلے ٹٹولے گا وہ اس مال غنیمت کو ہتھیا کر مجھے سڑنے کے لئے وہیں چھوڑ جائیگا اور اس وقت تک میری لاش نہیں اٹھائی جائیگی جب تک کہ اس کی عفونت سے راہگیروں کو سانس لینا دشوار نہ ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد اس بوسیدہ لاش کو ہسپتال سے ڈاکٹری کے کسی طالب علم کے ہاتھ فروخت کر دیا جائیگا۔ آہ غریبوں کو مرنے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ روپئے کے عوض غریبوں کی لاش خرید سکنے والے امیر اُن کے مردہ جسم کی بوٹیاں اڑا دیتے ہیں اور ان کے دل و دماغ کو چیر کر اپنی علمی تشنگی کو دور کرنیکا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اُف! مہذب کہلانیوالی دنیا کی بربریت!! بہر حال میں نے تسکینِ قلب کیلئے اس دن اس سکول آف آرٹس میں ماڈل بننا پسند کر لیا جس کے سامنے آپنے مجھے دیکھکر آواز دی تھی......"

"آپ زیادہ گفتگو نہ کیجئے۔ آپ کو آرام لینا چاہیئے۔" ڈاکٹر کیشا آئی یہ کہتے ہوئے دوا کی بوتلیں لئے کمرے میں داخل ہوئے۔

جگدیش پر ایک سکتہ کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے آنسو رومال میں خشک کر لیا کرتا تھا۔ موہنی نے ڈاکٹر کیشا آئی کی طرف نظریں اٹھا کر پھر کہنا شروع کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپنے میرے لئے بڑی تکلیف اٹھائی۔ مجھے مرجانے دیا ہوتا۔ پھر بھی میں آپکے خلوص کی ممنون ہوں مگر آپنے میری لاش میں زندگی کی روح پھونک کر مجھے اور بھی مار ڈالا ہے۔ لوگوں کیلئے ڈاکٹر فرشتۂ رحمت ہوتا ہے لیکن میرے لئے

ڈاکٹروں کا وجود کس قدر خوفناک ہے۔ معاف فرمائیے میں ہوش میں ہوتے ہوئے بھی ذرا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہوں۔ آپنے اس قسم کی گفتگو کاہے کو سُنی ہوگی۔ لیکن اگر آپ کان رکھتے ہیں تو سنئے۔ یہ ساز کے ٹوٹنے والے تاروں کی جھنکار ہے۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ساز صرف ایک بار پیش کرسکتا ہے۔ آہ ڈاکٹر صاحب! ایک ڈاکٹر آپ ہیں جنھوں نے مجھے جِلا کر موت کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ میری زندگی ایک طویل موت بن کر رہ گئی ہے۔ اور ایک ڈاکٹر میرے ہونیوالے پتی ہیں جن کے پاس سماج نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ میں جیتے جی جاسکوں! سنتی ہوں کہ وہ بمبئی کے بہت بڑے اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔ لیکن آپ کو میرے سر کی قسم آپ ان سے ہرگز نہ کہئے گا کہ آپنے ان کی موہنی کو ایسی حالت میں دیکھا ہے ... کیا آپ ڈاکٹر کیشانی کو نہیں جانتے؟ .....!"

"موہنی! موہنی!! موہنی!!!" ڈاکٹر کیشانی کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

"آپ اس قدر پریشان کیوں ہوگئے ڈاکٹر صاحب؟ خفا نہ ہوجئے۔ میں خاموش ہوجاتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے آپ کتنے رحمدل ہیں! ......"

"میں، میں ہی ڈاکٹر کیشانی ہوں موہنی! میں ہی کیشانی ہوں!!"

ڈاکٹر کیشانی نے دونوں ہاتھ موہنی کی جانب بڑھا دیئے۔

جگدیش جس کی آنکھیں اب تک نم آلود تھیں مسکرا دیا۔

(طبعزاد)

غلام عبّاس (ساحر)

میرے حبیب!

مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر
جگر کو سوزشِ پیہم سے ہمکنار نہ کر
مرے شباب کی راتوں کو سوگوار نہ کر
مرے حبیب مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

ترس رہی ہے تری دید کو نظر میری
شبوں کو خون رُلاتی ہے آرزو تیری
مری بہار خدارا خزاں شکار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

ہوئی ہے عمر مسرت کی بھیک پا نہ سکا
ہزار چاہا بھی میں نے تو مسکرا نہ سکا
خرابِ زیست کو اتنا تو بیقرار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

نظر کو حوصلۂ عرضِ غم دیا میں نے
برستی آنکھ کو وقفِ بیاں کیا میں نے
مگر جواب کہ "یہ ذکر بار بار نہ کر"
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

وطن میں جا کے جو غربت زدہ کو بھولنا تھا
خمارِ قرب میں حسرت زدہ کو بھولنا تھا
تو کیوں یہ کہہ نہ دیا پہلے، ہم سے پیار نہ کر
مرے حبیب! مجھے وقفِ اضطرار نہ کر

الطاف مشہدی

عورت کے حقوق

عورت کے حقوق کے متعلق دُنیا کے مختلف حصوں میں ہزاروں قانون بنے۔ مگر جب تک اسلام دُنیا میں نہ آیا "صِنفِ نازک" نے اپنے اصلی اور فطری حقوق حاصل نہیں کئے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے "عورت"، جس کو فطرت کے حسین ترین شاہکار ہونیکا فخر حاصل ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ اور ایشیا کے ممالک میں بھی ایک ناقابلِ اعتنا ہستی سمجھی جاتی تھی، وہ مرد کی غلام اور ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم ایک ذلیل و خوار اور حقیر ترین شے خیال کی جاتی تھی، جائداد کی طرح ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام منتقل ہوسکتی تھی، قمار بازی میں اس کی بازی لگائی جاتی تھی اور اس کا ہار دینا یا جیت لینا تہذیب و اخلاق کے عین شایانِ شرافت سمجھا جاتا تھا۔

دُنیا کے مختلف ممالک کو فطرت نے انفرادی خصوصیتیں عطا کی تھیں، اُن میں سے روما کو قانون سے خاص مناسبت تھی، رومن قانون تمام دُنیا میں اعلیٰ اور افضل تسلیم کیا جاتا تھا، سارا یورپ اس قانون کو مُستند سمجھتا تھا، رومن قوانین آج بھی تمام یورپ کے قوانین کا سنگِ بُنیاد ہیں۔ اس مُستند ترین قانون میں عورت کے حقوق یہ تھے کہ وہ کسی کے عقدِ نکاح میں آنے کے بعد اپنے شوہر کی زرخرید جائداد ہو جاتی تھی، اس کا تمام ذاتی مال و متاع خود بخود اس کے شوہر کی مِلک بن جاتا تھا۔ اور وہ جس طرح مناسب سمجھتا اس کو صرف کرتا تھا۔ وہ جو کچھ دولت اور روپیہ اپنے زورِ بازو اور محنت سے پیدا کرتی تھی سب شوہر کا مملوکہ سمجھا جاتا تھا، وہ کوئی خدمت حاصل نہیں کرسکتی تھی اور نہ کسی کی ضامن ہوسکتی تھی۔ وہ ادائے شہادت کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ کسی سے کوئی معاہدہ کرسکتی تھی، یہانتک کہ وہ وصیت کرنیکی بھی مجاز نہیں تھی۔

حکومت روما نے جب عیسائی مذہب اختیار کیا تو کچھ کچھ اصلاحیں ہوئیں، لیکن یہ اصلاحیں برائے نام اور وقتیہ ہوتی تھیں، کچھ زیادہ وقت گزرنے نہیں پاتا تھا کہ پھر وہی قدیم اصول اور قدیم قوانین اسی آن بان سے لوٹ آتے تھے۔

چھٹی صدی عیسوی میں ایک جلسۂ عظیم اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے منعقد کیا گیا کہ عورت کا جسم "روح" کا حامل ہے یا نہیں، اس اجتماعِ عظیم نے بڑی فیاضی اور دریا دلی سے اس قدر تسلیم کیا کہ "عورت" نوعِ آدم میں داخل ہے اس لئے وہ "ذی روح" سمجھی جاسکتی ہے مگر اس کی تخلیق کی غرض و غایت صرف مرد کی خدمت کرنا اور اس کے ہر حکم کی بلا عذر و حیلہ تعمیل کرنا ہے۔

یورپ میں ایک عرصہ تک اس قسم کے قوانین جاری رہے، تقریباً ساٹھ سال گذرے کہ "قانونِ نسواں" بنا، جس کے بعد ان قوانین اور اصول میں کچھ اصلاح ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت سی خامیاں اب بھی باقی ہیں، مثلاً عورت اپنی ملکیت کا حق کسی چیز پر بھی بہ حیثیت بیوی ہونے کے نہیں رکھتی، شریکِ زندگی تو کہلاتی ہے مگر ملکیت میں اس کی حقیقی شرکت نہیں پائی جاتی، باپ یا شوہر سے ہٹ کر وہ کوئی شخصیت نہیں قائم کرسکتی، اپنی ملکیت اور جائداد خالص اپنے نام سے نہیں رکھ سکتی۔ اور نہ کسی قسم کا قانونی معاملہ کرسکتی ہے۔

اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مغربی اور دوسری اقوام نے عورت کے معاملہ میں ہمیشہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے، یہی سبب ہے

کہ غریب عورت ہر دور اور ہر تمدن میں مختلف سلوک اور برتاؤ کی آماجگاہ بنی رہی۔ قدیم تاریخی غاروں اور مندروں کے مجسموں اور نقوش سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کبھی اس کی پرستش بھی کی جاتی تھی۔ کسی زمانہ میں اس کی تصویریں عبادت گاہوں کی زیب و زینت بھی بن چکی ہیں۔ بعض دور اس پر ایسے بھی گذرے ہیں کہ اس کو بے حد ذلیل و خوار سمجھکر اس کے ساتھ نہایت ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ کسی زمانہ میں بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک اور شریفانہ برتاؤ نہیں کیا گیا۔

دوسری سابقہ اور موجودہ تہذیب پر غور کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غریب عورت کو ایک مقبوضہ جائداد سمجھا گیا ہے جس طرح جائداد منقولہ و غیر منقولہ کو کوئی انسان اپنی ملک سمجھکر اس پر قابض رہتا ہے اور اسمیں من مانے تصرف کرسکتا ہے۔ اسی طرح عورت کو بھی تصور کیا جاتا تھا مثل جائداد منقولہ کے وہ اپنے ورثا میں تقسیم ہوسکتی تھی۔ یا اپنے شوہر کی زندگی ہی میں اس کی نظروں سے گر جانیکے بعد سر بازار فروخت کی جاسکتی تھی، گویا کہ وہ مرد کی ایک جائداد منقولہ ہے جس سے ہر قسم کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

عورت کیلئے جب کبھی قوانین مرتب ہوئے اور اصول قائم کئے گئے ان کا منشاء صرف یہ ہوتا تھا کہ اس کی حیثیت کو کم کیا جائے۔ اور اس کو وہی اپنی قدیم پست اور ذلیل حالت میں رکھا جائے تاکہ مرد کی ہمسری اور برابری نہ کرنے پائے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرنیکی اسمیں قابلیت اور صلاحیت نہ پیدا ہو۔

بدھ مت میں عورت کا جو تصور تھا وہ اس سے ہویدا ہے کہ اس سے کنارہ کشی اور علیحدگی کا حکم دیا گیا تھا گویا کہ وہ ایک ناپاک اور ذلیل ہستی ہے۔

ہندوستان میں عورت کو عالم شیرخواری ہی میں قتل کردیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی عورت کا مرد کے نکاح میں آنا ایسا تھا کہ ہمیشہ کیلئے اس کی ملک بن جاتی تھی، شوہر کے بعد یا تو وہ ہمیشہ کیلئے بیوہ بنی بیٹھی رہے یا اس کی ارتھی کے ساتھ "ستی" ہوجائے، کہیں کہیں یہ بھی دستور تھا کہ ایک بیوہ دوسرے بھائی کی موروثی جائداد سمجھی جاتی تھی اور زندہ بھائی کو مردہ بھائی کی بیوی پر بغیر اس کی رضامندی کے اپنی بیوی بنانے کا حق حاصل تھا، بعض دفعہ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک بھائی اپنی زندگی ہی میں دوسرے بھائیوں کو اپنی ملکیت میں تصرف کا حق دیدیا کرتا تھا، شوہر کی عبادت اور پرستش عورت کی زندگی کا ایک اہم جز سمجھا جاتا تھا، شوہر کے پیر دھو کر پانی پینا عورت کی اطاعت اور فرمانبرداری کا بہترین اصول سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ گھر کے سارے مرد اور لڑکے کھانا نہ کھالیں عورت کو خورد نوش کی اجازت نہ تھی۔

ہندوستانی تہذیب پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں عورت کا وہی درجہ ہے جو نیچ اقوام کو عطا کیا گیا ہے' عورت کے ساتھ ہندوستان نے جس قسم کی بدسلوکی کی ہے ویسی شاید ہی کسی ملک میں کی گئی ہو، جب تک شوہر زندہ ہے اس کی کچھ آؤ بھگت ہوتی ہے، لیکن شوہر کے بعد جو سلوک اس کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ اتنا روح فرسا اور دلخراش ہے کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

عرب میں عورت کو وراثت کا مطلق کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، باپ کے بعد اس کی بیویاں بیٹے کو ورثہ میں ملتی تھیں اور وہ ان کو بغیر کسی احساس کے اپنی بیویاں بنا لیتا تھا، کثرت ازدواج کی کوئی حد و انتہا نہیں تھی۔ اکثر قبائل میں شیرخوار لڑکیوں کے ہلاک کرنیکی ظالمانہ اور وحشیانہ رسم جاری تھی۔ لڑکیوں کو بیاہ دینا نہایت مذموم اور ذلیل سمجھا جاتا تھا خسر یا سالا بننا باعث تذلیل تھا۔ لڑکیاں ترکہ پدری سے محروم رہتی تھیں۔ بعد باپ کے بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو بیوی بنا لیتا تھا، دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ عقد کرنا جائز تھا، باپ کے بعد اس کی بیویاں

بیٹے کی نظر میں اموالِ لاوارث سمجھی جاتی تھیں، مرد کی نظر میں عورت کی مطلق کوئی عزت اور وقعت نہیں تھی۔ دورانِ گفتگو میں بھی اس کا کوئی احترام یا پاس نہیں کیا جاتا تھا، جو یتیم و بے سہارا لڑکیاں بیاہ کے قابل ہوتی تھیں، اُن کے ولی اور سرپرست اُن میں سے کئی کئی کو اپنے عقد میں لاتے تھے تاکہ ان کا مال و متاع اپنے تصرف میں لائیں۔ ان سے اور ان کے اموال سے مستفید ہونے کے بعد ان کو بے یار و مددگار در بدر کی ٹھوکریں کھانے یا بازارِ حُسن کی جنس بنکر عصمت و عفت کا سودا کرنے چھوڑ دیتے تھے۔

عرب کی منتشر اور غیر متحد سماج میں طلاق کی سہولت غیر محدود تھی۔ مرد عورت کو کسی وہم یا کسی خیال کی بنا پر جب چاہتا بغیر کسی وجہ اور سبب کے فوراً طلاق دے سکتا تھا۔ بعض اشخاص اس خیال کے تحت کہ اگر ان کی وہ بیویاں جن کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے دوسروں سے عقد کرلیں گی تو اُن کی ذلت ہوگی۔ ان سے دست بردار ہونے کے بعد بھی اپنے ہاں نہایت خراب خستہ حالت میں رہنے پر مجبور کرتے تھے، اپنی بے خطا اور بے قصور بیویوں کے احساسات اور جذبات کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔

چین میں عام طور پر عورت کو تُند خو، ضدی، ہٹ دھرم اور سرکش سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ اصول قائم کرلیا گیا تھا کہ اس کو اپنی حد سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے۔ کیونکہ وہ آگے بڑھکر پیچھے ہٹنا نہیں جانتی۔

یونان میں یہ دستور تھا کہ عورت بالکل پردے میں رہے، بچپن ہی میں اس کا بیاہ ہوجاتا تھا۔ چرخہ کاتنا، کپڑے بُننا، کشیدہ کاڑھنا اور خانہ داری کا انتظام کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا، وہ مکان کے ایک علیحدہ حصہ میں رکھی جاتی تھی، باہر نکلنے کی اس کو سخت ممانعت تھی۔ شوہر کی غیر موجودگی میں وہ کسی مرد سے نہیں مل سکتی تھی۔ اور کبھی دعوت ہو تو مہمانوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

رومن تہذیب میں عورت کا لقب بد تہذیب اور تلوّن مزاج تھا۔ اس میں کوئی خوبی ایسی نہیں سمجھی جاتی تھی کہ اس کو مُنہ لگایا جائے اور حُسن سلوک کا مستحق سمجھا جائے۔ یونان کے فلاسفروں کی یہ رائے تھی کہ عورت کو کسی صورت اور کسی حیثیت سے مرد کے برابر نہونے دیا جائے، اگر اس کو مساوی حقوق دیدیئے جائیں تو وہ قابو سے باہر ہوجائیگی اور مرد پر حکومت کرنا شروع کردیگی۔ وہ بیاہی جانیکے بعد اپنے شوہر کی کنیز بن جاتی تھی۔ اس کی ذاتی ملک اور جائداد بھی از خود اس کے شوہر کی ملک ہوجاتی تھی۔ غرضکہ ہر طرح وہ شوہر کی دست نگر اور محتاج ہوکر حالتِ غلامی اور قید میں زندگی بسر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی مقبوضہ شے سمجھی جاتی تھی جو ضرورت کے وقت فروخت بھی ہوسکتی اور رہن بھی کی جاسکتی ہے، اس کا تبادلہ بھی ہوسکتا اور کبھی ایک جامِ شراب پر نثار بھی کردی جاتی ہے، جب عورت مملوک ہوجائے تو اس کی اپنی ذاتی مالکانہ حیثیت معرضِ بحث میں آہی نہیں سکتی۔

یہودیوں کے ہاں نکاح درحقیقت عورت کی خرید و فروخت ہے، اس کی قیمت عورت کے باپ کو ملتی ہے، مولوی پیشوا اپنی مقدس کتابوں کی شریعت کی رو سے عورت کے ذلیل، حقیر اور کم رتبہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ دُنیا میں "گناہ" عورت کی بدولت وجود میں آیا۔ اور اس گناہ کا سارا وبال اس کی گردن پر ہے، عورت تمام انسانی گناہوں کا سرچشمہ قرار دی گئی۔ ایک یہودی مصنف لکھتا ہے "مرد کی بُرائیاں عورت کی نیکیوں سے کہیں بہتر ہیں" اکثر یہودی تصانیف میں مرقوم ہے کہ "عورت دوزخ کا دروازہ اور جملہ انسانی گناہوں کا سرچشمہ ہے، اس کو محض اس خیال ہی سے شرم کرنا چاہئے کہ وہ "عورت" ہے، اس کو ہمیشہ نفس کشی کرنی چاہئے اور اعتکاف میں مشغول رہنا چاہئے، اس کو اپنے حسن سے شرمندہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ شیطان کا سب سے قوی اور مضبوط حربہ ہے"

سنہ مسیحی سے کچھ قبل مسئلہ ازدواج کے متعلق ایک بڑا تغیر رونما ہوا، اس کی وجہ انسانی فطرت کے دماغی اور روحانی حصہ پر خاص اثر پڑا۔ اس زمانہ میں رہبانیت کی سموم ہوا شروع ہو چکی تھی، ایک فرقہ نے سب سے پہلے جواز نکاح کے متعلق شبہات ظاہر کئے اس کے بعد ایک اور فرقہ کے خیالات اسی قسم کے ہو گئے۔ ان ہی خیالات کی بنا پر رہبانیت کی صورت قائم ہوئی، رہبانیت سے ایک مضر نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ عورت کی حیثیت اور فطرت کو حد سے زیادہ حقیر و ذلیل خیال کیا جانے لگا، کثرتِ ازدواج کو جائز قرار دیا گیا۔ اور پیشوایانِ دین و ہادیانِ مذہب نے اس رسم کی پابندی شروع کر دی۔

یورپ کے بعض متعصب اور شریر النفس اشخاص نے عورت کے حقوق کے مسئلہ میں اسلام کو بدنام کرنے کی سعی لاحاصل کی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کے حقوق دینے میں بہت تنگ نظری اور بخل سے کام لیا ہے، نوع انسانی کی سب سے پچھلی صف میں اس کو جگہ دی ہے، وہ اس کو بہت حقیر اور ذلیل و خوار خیال کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ عورت کے جسم میں وہ روح ہی نہیں ہے جو مرد کے اندر ہے، اس نے عورت کی کوئی قیمت ہی مقرر نہیں کی ہے، عورت کی حیثیت اسلام کی نظروں میں غلاموں سے بھی بدتر ہے، اس قسم کی لغو اور از سر تا پا غلط فتنہ انگیز افترا پردازیوں اور شر انگیز بیانوں کا جو اثر صنفِ نازک پر ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے، یہی وجہ تھی کہ سولہویں اور سترھویں صدی میں ان دروغ بیانیوں کی وجہ سے اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اس درجہ ہجوم ہوا کہ ہر قسم کے صحیح خیالات اور احساسات کیلئے راہیں مسدود ہو گئیں، مغرب کی تمام سوسائٹیاں اس شور و غل سے اتنی متاثر ہوئیں کہ اسلام کو ایک حیوانیت کا مجسمہ سمجھنے لگیں اور صنفِ نازک تو اسلام کے نام سے اتنی خوف زدہ ہو گئی کہ اگر کبھی خواب میں بھی اسلام کا نام سن لے تو چونک پڑے۔ مگر آخر کار جھوٹ کی شکست اور سچ کی فتح ہو کر رہی۔ ایک دن ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ اسلام نے عورت کے حقوق دینے میں کتنی ہمدردی، فیاضی اور دریا دلی سے کام لیا ہے۔

عورت کا مسئلہ ابتدائے انسانیت سے لیکر آج سے کوئی چودہ سو برس قبل تک دنیا کی تمام اقوام کے لئے ایک عقدہ لاینحل تھا۔ مگر اسلام نے کس آسانی سے یہ کہہ کر حل کر دیا کہ "تم عورتوں کا لباس ہو اور عورتیں تمہارا لباس"۔ عورت کو حقوق دلانے میں اسلام نے بڑی ہمدردی اور سمجھداری سے کام لیا ہے۔ مرد اور عورت کے حقوق کا اس طرح تعین ہوا کہ یہ دونوں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں۔ سب سے پہلے یہ واضح کیا گیا کہ عورت و مرد میں کس قسم کا فطری تعلق ہے اور یہ کہ عورت انسانی معاشرت کی جزو اعظم ہے۔ مختلف پیرایوں میں یہ ظاہر کیا گیا کہ مرد اور عورت ایسے رفیق ہیں کہ جن کو ایک دوسرے کی شدید ضرورت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا نصف بہتر ہیں اور ان دونوں کے تعلقات قریب قریب برابری کے ہیں۔

بہت سی دوسری اصلاحات کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورت کی بخوبی اصلاح کی اور اس کو قعرِ مذلت سے باہر نکالا۔ سب سے پہلے کثرتِ ازدواج کا قلع قمع کیا گیا۔ جہاں بیحد و حساب بیویاں ہوا کرتی تھیں ان کو چار تک محدود کیا گیا، یہ اجازت بھی اس شرط سے ملی کہ چاروں کے ساتھ یکساں سلوک ہو۔ عورت کی غلامی کے انسداد کے بعد شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدید احکام نافذ ہوئے۔ قانونِ وراثت بنایا گیا۔ باپ کے بعد سوتیلی ماؤں اور بہ وقت واحد حقیقی بہنوں سے عقد کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی، مرد کو تاکید کی گئی کہ عورت کیساتھ عزت سے پیش آئے، اسکے احساسات و جذبات کا کافی احترام کرے۔ جو شریر النفس اشخاص عورتوں پر اتہام لگائیں ان کیلئے جسمانی سزا مقرر کی گئی۔ ان اصلاحات نے عورت کو آئے دن کی ذلت و خواری سے نجات دلائی۔

مرزا اسیف علی خاں (حیدر آبادی)

روٹیری مشین پر

کیتو باکی آنکھوں کے سامنے تقریباً دو گز چوڑی کاغذ کی پٹی نہایت سرعت سے دوڑ رہی تھی۔ دیکھنے والے کے لئے یکایک اس کی رفتار کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ ایک موٹے اور وزنی ـــ اتنا وزنی کہ اس کو گھمانے کے لئے دو مزدوروں کی ضرورت پڑتی۔ بیلن پر کئی ہزار گز لمبی کاغذ کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ مشین کے چلنے پر وہ پٹی خود بخود کھل کر چھاپنے کی مشین میں چلی جاتی تھی۔ یہ مشین فرش پر بہت مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔ اس میں دو بیلن لگے ہوئے تھے۔ ایک میں حروف ڈھلے ہوئے تھے اور دوسرے میں کچھ نہیں۔ وہ بالکل صاف تھا۔ ان دونوں بیلنوں کی داب سے کاغذ پر حروف اتر آتے تھے۔ لیکن بیلنوں کی داب میں آنے سے پہلے کاغذ کی پٹی کو نمی کھانے کے لئے بھاپ کی ایک ٹنکی میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد بیلنوں کے ایک ہی گھماؤ سے اخبار کے آٹھ صفحے کاغذ کے ایک طرف چھپ جاتے تھے۔ دوسری طرف کے صفحوں کے چھپنے کے لئے کاغذ کو اگلے دو بیلنوں کی داب برداشت کرنی پڑتی تھی۔ پہلی داب میں حروف نیچے والے بیلن میں ہوتے تھے اور دوسری داب میں اوپر والے بیلن میں۔ اس طرح سے اخبار کے دو شیٹ چھپ جاتے تھے۔ کاغذ کا پٹہ کھلتا چلا جاتا۔ ایک کے بعد دوسرے بیلن کی داب کھاتا جاتا اور اس طرح سے اخبار کے شیٹ چھپتے چلے جاتے۔ راستہ میں کاغذ کو چھوٹے چھوٹے پھلوں سے پالا پڑتا جو اخبار کے ورقوں کو کاٹ دیتے تھے۔ آگے چل کر لئی بھی آپ ہی لگ جاتی اور تہ بھی آپ ہی ہو جاتی تھی۔ ان ہی مرحلوں سے گذرتی ہوئی کاغذ کی ایک پٹی اور آتی تھی جو ضمیمہ کی شکل میں اخبار کے ساتھ مل جاتی تھی۔ حیرت انگیز طریقے سے اخبار کٹ کر، چپک کر، تہ ہو کر، غرض یہ کہ ہر طرح سے مکمل ہو کر ایک سکنڈ میں پانچ پرچوں کے حساب سے مشین سے نکلتا جاتا تھا۔ اخبار کو اٹھانے والے لڑکے اخبار کو یہاں سے اٹھا کر برابر والے کمرے میں لے جاتے تھے۔

یہ سب کچھ ایک غیر منقطع گھڑگھڑ کے درمیان ہوتا تھا۔ یہ گھڑگھڑ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی بہت بڑے اور بگڑے ہوئے باجے کے سارے سُر ایک ساتھ اپنی بھونڈی آواز کے ساتھ بج رہے ہوں۔ یا اس اخبار کے سارے پڑھنے والے مطبع کی عمارت میں جمع ہو کر ایک ساتھ بغیر سانس لئے جلدی جلدی اخبار کے کالم پر کالم پڑھے جا رہے ہوں۔ کان پڑے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ پریس کی گھڑگھڑ میں سارے الفاظ گم ہو جاتے تھے۔ باتیں اشاروں سے یا منہ کو کان سے ملا کر زور سے گلا پھاڑ کر کرنی پڑتی تھیں۔ ضروری گپ شپ لڑانے کیلئے وہاں وقت ہی کس کے پاس تھا!

اتوار کے اخبار کے آج دو ایڈیشن نکلیں گے۔ ایک ایک سکنڈ بہت قیمتی ہو رہا ہے۔ ایک سکنڈ کے خراب ہونیکے معنی ہیں پانچ پرچوں کا خراب ہو جانا۔ اوورسیر کے انڈیکیٹر سے بیل ہٹاتے ہی پریس کے تمام کارندے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک آدمی کو ایک مقررہ وقت کیلئے ایک مقررہ کام کرنا۔ مشین کا ایک پرزہ سا ہی بن جانا پڑتا ہے۔ رات کے گیارہ بجے سے صبح کے ۹ بجے تک مشین چلتی ہے۔ بے انتہا پریشانی اور پہاڑ ایسی گرمیوں کے دن پانچ گھنٹوں میں نڈر اور بھوت کے مانند لوہے کے غلاموں پریس کے کارندوں میں سے کسی کو بھی اپنی شدھ بدھ نہیں رہتی۔ زیادہ نمی کھا جانے کی وجہ سے کاغذ پھٹ نہ جائے، یا نہ معلوم کب کیا ہو جائے، اس ڈر سے ان کی آنکھیں تیزی سے دوڑتے ہوئے چکنے کاغذ پر اور ہاتھ بوقت ضرورت مشین کو بند کرنے کیلئے

لیور پر لگے رہتے ہیں۔

مشین ٹھیک وقت پر بند ہو جائے اور کاغذ کا نیا پٹہ بغیر کسی گڑبڑاہٹ کے مشین پر چڑھ جائے۔ ان دو باتوں پر پریس کے قیمتی اوقات کی بچت بہت کچھ منحصر ہے۔

جب تک کاغذ کا ایک پٹہ جو کئی ہزار گز لمبا ہوتا ہے ختم نہ ہو جائے تب تک مشین بند کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ کاغذ ختم ہونے کے بعد دوسرا پٹہ چڑھایا جاتا ہے۔

کاغذ کی پٹی کے گول پنڈے ترتیب وار رکھے ہوئے صحن والے دروازے میں سے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ سب آج ہی کام آئیں گے۔

کاغذ چڑھانے کے لئے یا کسی دوسری وجہ سے مشین کو کوئی کارندہ بھی روک سکتا ہے۔ لیکن چلانے کا کام اعلیٰ انجنیر کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کاغذ چڑھانے یا پھٹے ہوئے کاغذ کو ٹھیک کرنے کے لئے مشین میں گھسنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشین جس آسانی سے اخبار چھاپتی ہے اسی آسانی سے آدمیوں کی ہڈی کا سُرمہ بھی بنا سکتی ہے۔

ایک ایک تو بیلن پر اور ایک اس جگہ پر جہاں سے اخبار چھپ کر نکلتا ہے مشین کو روکنے کے لئے لیور لگے ہیں۔ کیوبا کی تعیناتی انہی میں سے ایک لیور پر ہے۔ کاغذ کے پھٹ جانے یا خراب ہو جانے کی ساری ذمّہ داری اسی پر ہے۔ ضرورت کے وقت مشین کو روک دینے کا حق اسی کا ہے۔

اس وقت کیوبا برف جیسے سفید کاغذ پر آنکھیں گڑائے بیٹھا ہے۔ کاغذ کہیں زیادہ ڈھیلا یا کھنچاؤ تو نہیں کھا رہا ہے، اس طرف اس کا خاص خیال ہے۔ کبھی اس کا ہاتھ بریک کے ہینڈل کے دستہ پر پہنچتا ہے۔ تو کبھی لیور پر۔ اس کے ذمّہ والے بیلنوں کے دُھروں میں "گریز" (تیل) ٹھیک طریقہ پر پہونچ رہا ہے یا نہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے وہ تیل لانیوالی کانچ کی نلیوں کی طرف بھی دیکھتا جاتا ہے۔ تیل کے اچھی طرح نہ پہنچنے سے اور گرمی بڑھ جانے سے آگ لگ جانے یا کسی دوسرے حادثہ کے ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور اگر کہیں اس دن اخبار نہ نکل سکا تو نہ معلوم دنیا کے کتنے واقعات یا یوں کہئے کہ ایک طرح دُنیا ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

مطبع سے بادلوں کی گڑبڑاہٹ کی سی آواز آ رہی ہے۔ بے شمار بیلنوں میں سے "چوں چوں" کر تیل ٹپک رہا ہے۔ رگڑ کے پیدا کردہ کاغذ کے باریک باریک ذرّے بجلی کی روشنی میں تیر رہے ہیں۔ اور کیوبا کی آنکھیں کاغذ، دُھرے اور کانچ کی نلیوں پر ہی چکّر لگا رہی ہیں۔

وہ اسی میں مگن ہے، اس کا لمبا چوڑا بدن نیلی قمیص سے جسے اس نے پاجامے کے اندر کر لیا ہے، ڈھکا ہوا ہے۔ مشین کی جھپٹ میں اس کے کپڑے نہ آجائیں، اسی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہے۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح سیدھا کھڑا ہے۔ صرف اس کے پتلے لیکن مضبوط ہاتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ اس کا داہنا ہاتھ لیور پر ہے۔ ہاتھ سیاہی اور تیل میں بھرا ہوا ہے۔ پسینہ اس کی پیشانی سے ندی کی طرح بہہ رہا ہے۔ سُرخی مائل ڈاڑھی سے گھرے ہوئے چہرہ سے پسینہ کی بوندیں ٹپک ٹپک کر زمین پر گول گول نشان بنا رہی ہیں۔

ظاہرا طور پر وہ اپنے کام میں مشغول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دماغ میں خیالات بہت تیزی سے۔ لیکن سامنے والی پٹی

سے زیادہ تیزی سے نہیں ۔ چکر لگا رہے ہیں ۔ تقریباً دو گھنٹے سے ، جب سے وہ یہاں کھڑا ہے ، وہ اپنے خیالات ایک ایک کر کے جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ ان تمام خیالات کا جو نتیجہ اس نے نکالا ہے وہ اتنا خوفناک ہے کہ وہ کانپ اٹھے لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے خوفناک خیالات کو چھپائے ہوئے ہے ۔

آج رات کو وہ کسی کا خاتمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے ۔

یہی اس کے تمام خیالات کا خلاصہ ہے ۔ سر اٹھانے پر وہ اپنے شکار کو سامنے ہی دیکھ سکتا ہے ۔ ریشمی چست ٹوپی سے ڈھکا ہوا سر بیلن اور مشین کے ڈھانچے کے درمیان سے دکھائی دے رہا ہے ۔ کبھی وہ انڈیکیٹر پر جھکتا ہے تو کبھی مطبوعہ تعداد کو درج کرنے کے لئے ٹیبلٹ (نقشہ) پر ۔ وہ اوورسیر ہے ۔ آج رات کو کیوتا اس کا خاتمہ کر دیگا ۔ یہ بالکل طے شدہ ہے ۔ روزمرہ کے ضروری اور اہم کاموں کی طرح وہ اسے بھی کریگا ۔ ایسا اٹل فیصلہ اس نے کر لیا ہے ۔

یہی تو وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنے خون میں تر ہوگا ۔ یہیں وہ مشین میں کچلا جائیگا ۔ بیلنوں کے نیچے ایک آدمی کیلئے کافی جگہ ہے کاغذ چڑھانے کے لئے انھیں بیلنوں کے نیچے تو جانا پڑتا ہے ۔

روئی کے پیچ میں کام کرتے ہوئے کیوتا نے دیکھا تھا کہ ان بیلنوں کی کیا طاقت ہوتی ہے ۔ اسے بہت پہلے روئی کی گانٹھیں بھی اسی طرح باندھی جاتی تھیں ، اس وقت کون جانتا تھا کہ چھاپنے میں بھی اسی قسم کی مشین کام آئیگی ۔ اس روئی کے کارخانہ کے اوورسیر پر ایک کارندے نے بیلن چلا دیا تھا ۔ وہ اوورسیر بہت کمینہ تھا ۔ اسے بہت تنگ کرتا تھا ۔ اوورسیر بھی روئی کی طرح دب کر چپٹا ہو گیا تھا ۔

کیوتا تو جب چاہے ایسا کر سکتا ہے ۔ ذرا سے اشارہ کا ہی تو کام ہے ۔ صبح کے چار بجے تک جب کبھی کاغذ کا نیا پٹہ چڑھایا جائے وہ ظالم کا خاتمہ کر سکتا ہے ۔

صرف ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر ایسا ہونیوالا ہے ۔ کاغذ کے تین پنڈے ختم ہونے پر چوتھے پر اس کی موت سوار ہو کر آ رہی ہے ۔ تینوں پنڈے سامنے ہی تو رکھے ہیں ۔ باری باری سے تینوں ختم ...... ہاں ، ضرور ہی ختم ہو جائیں گے ۔ اور پھر چوتھے کی باری اس کی موت لیکر آئیگی ۔

کاغذ کو نم کرنے کے لئے بھاپ کے بھپکارے مطبع کی گرمی کو اور بھی بڑھا رہے ہیں ۔ وہ پسینہ میں تر ہو رہا ہے ۔ سامنے کی کھڑکی سے اکتوبر مہینے کی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے ۔ سر اوپر اٹھاتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی کنپٹی میں گھس جاتے ہیں ۔ اس کے جبڑے میں ٹیس ۔۔ درد ہو رہا ہے ۔ درد کے مارے اس کا سر چکرانے لگا ۔ وہ یکایک جھنجھلا سا اٹھا ۔ اس کا تمام بدن غصے سے کانپ اٹھا ۔ اس کمبخت درد ہی کی بدولت تو سب کچھ ہوا ہے ۔ ہر رات کو میں ڈیوٹی پر آ کر کھڑا ہوا نہیں کہ ٹھنڈی ہوا لگتے ہی کسی آفت کی طرح کنپٹی اور جبڑے میں درد ہونے لگا ۔

آج سے پندرہ دن پہلے کسی نے کیوتا کو بتایا تھا کہ برانڈی پیا کرو ۔ اس کے پینے سے فوراً درد دور ہو جائیگا ۔ اب تک کیوتا نے اپنی زندگی میں شراب نہیں پی تھی ۔ لیکن اس بار اس نے پی ۔ اس کا درد واقعی دور ہو گیا ۔ مگر 'راؤنڈ' لگاتے وقت اوورسیر اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور کیوتا کے سانس روک لینے کے باوجود اس نے بھانپ لیا اور کہا "کیا تم نے برانڈی پی ہے ۔ اب ہم تمہیں

نہیں رکھ سکتے۔ پندرہ دن کے بعد پیشی پر حاضر ہونا۔"

اوورسیر نے سب کچھ مختصراً اور جلدی سے کہہ دیا۔ کیوبا کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس پر جلدی جلدی ہنٹر برسا رہا ہو کیوبا جانتا تھا کہ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے پندرہ دن تک کسی سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اندر ہی اندر اس کا غصہ بڑھتا جاتا تھا وہ کام کی تلاش میں چاروں طرف دوڑتا رہا۔

"تم ہو بھی بہت مضبوط، جو تمھیں کام پر لگائے وہ بیماری کا گھر مول لے۔ کیوں؟ ہے نا ٹھیک......" کیوبا جہاں کہیں جاتا اس کو ایسے ہی جواب ملتے۔

کل ہی ایک کمپنی کے مینیجر نے کیوبا کو 'صفائی کرنیوالے کی اسامی' کیلئے درخواست بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔ ۴۸ برس کی عمر میں ایسا کام! اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے مُنہ پر طمانچہ مارا ہو۔ کیرولن کی گھاٹی میں دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد 'لیون' گاؤں کے پاس اُسے اس کمپنی کا پتہ لگا تھا۔ گھر پہنچنے پر اُسے معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں دو زندگیوں کا اور اضافہ ہوا ہے۔ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اسی کے دو جُڑواں بچے پیدا ہوئے ہیں۔ چھ سے آٹھ کیوبا کیلئے معمولی بات نہ تھی۔

کیوبا بہت پریشان ہو رہا تھا۔ آج اس کی پریشانی کسی قدر کم ہوئی۔ ممکن ہے خدا نے اس کی مدد کیلئے ہی ان دو فرشتوں کو بھیجا ہو۔ شاید اوورسیر کو ان پر کچھ رحم آجائے۔ ضرور رحم آئیگا۔ خواہ اس کا دل پتھر ہی کا کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ ضرور پگھل جائیگا ان دو بچوں کی خاطر اُسے درخواست کرنی پڑے گی۔ نہیں تو وہ کچھ نہیں کہتا۔ ان! ان بچوں..... کے لئے...... اسے ...... اچھا ہوتا اگر اس کی زبان کٹ کر گرجاتی۔

دیکھنے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیوبا کی دردبھری کہانی اوورسیر کے دل پر کچھ اثر کر رہی ہے۔ لیکن آخر میں اوورسیر نے شانے ہلا کر کہا "تمھارے دو کیا تین بچے بھی ہو جائیں تو مجھ کو اس سے کیا؟ میں شرابی آدمی کو نہیں رکھ سکتا۔ اگر کچھ نقصان ہو گیا یا کسی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تو؟ ۔ نہیں میں شرابی کو نہیں رکھ سکتا۔"

آج کیوبا کی ملازمت کا آخری دن ہے۔ پندرہ دن سے اس کے دماغ میں ہل چل مچی ہے۔ اس وقت وہ مشین صاف کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مشین کے پُرزے ایسے صاف نظر آنے لگیں جیسے آتشیں شیشہ سے دیکھنے سے گھڑی کے پُرزے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بس 'آج آخری بار' اب تک وہ تنہا ہی اپنے فرض کو پورا کرتا آیا ہے، لیکن اب نہیں..... آج آخری ...... وہ خیالات کے دریا میں ڈوب گیا۔

مشین چلنے لگی۔ پھر ویسے ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ کاغذ کی پٹی پھر اسی طرح اس کے سامنے دوڑنے لگی۔ کاغذ کی پٹی پر بجلی کی ترچھی روشنی پڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی چمک رہی تھی۔ اس وقت اس کی اُداسی مشین کی گھڑگھڑاہٹ میں جیسے گم ہو گئی تھی۔ لیکن کاغذ کی پٹی پر تاکتے رہنے سے اس کا دماغ پھر چکرانے لگا۔ پیشانی پسینہ کے قطروں سے ڈھک گئی۔ سامنے کی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ آ کر اس کی کنپٹی سے ٹکرانے لگے۔ پہلے کی طرح درد نے پھر زور پکڑا۔ اس کے بدن کی ساری طاقت کھنچ سی گئی۔ اس کا دماغ غصہ سے چکرانے لگا۔ اگر یہ میری آخری ڈیوٹی ہے تو اس کی بھی آج آخری رات ہے۔ جنون اس کے دماغ پر پوری طرح سوار ہو گیا۔

ابتدا میں تو اس نے اپنے ان خیالات کو بحث سے دُور کرنیکی کوشش کی۔ لیکن —" اس کی یہی سزا ہے۔ وہ اسی کے قابل ہے" ایسے خیالات نے بار بار آکر اس کے سر پر بھوت کی طرح سوار ہو کر قبضہ کر لیا۔ یہ خیال کسی طرح بھی اس کے دماغ سے نہیں نکلتا تھا۔ جبڑے میں ہونیوالی ہر ٹیس کے ساتھ اس کا ارادہ اور بھی پختہ ہو جاتا تھا۔

مشین کی گھڑگھڑاہٹ پہلے ہی کی طرح جاری ہے۔ طرح طرح کی آوازیں آرہی ہیں۔ مشین کے اس شور و غل میں سے کیوبا کو دو ننھے ننھے بچوں کے رونے کی دل شگاف آواز سنائی پڑنے لگی۔ رونے کی آواز برابر آرہی ہے۔ مشین بند ہونے پر نہیں آتی۔ اس کا دل بیتاب ہو گیا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ سامنے ہی کاغذ کی سفید پٹی دوڑ رہی ہے۔ وہ اسی پر نگاہ جما کر دیکھنے لگا۔ اسے سفید تکیہ کا سہارا لئے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے سر نظر آئے۔ اِن کے کھُلے ہوئے چھوٹے چھوٹے منہ اور پھڑکتے ہوئے نتھنے دیکھکر وہ گھبرا گیا۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔ سامنے کواڑوں کے پیچھے اس کو دو آنکھیں نظر آنے لگیں۔ پندرہ دن سے وہ ان آنکھوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ یہ آنکھیں اس کی بیوی کی تھیں۔ گھر سے چلنے سے پہلے اس نے اسے بتلایا تھا —" تمھاری ملازمت ختم ہو گئی ..... تم اب کیا کرو گے ؟" اس نے اس سے پوچھا تھا "خدا کے لئے، اے خدا ....." اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ چیخ مار کر رونے لگی۔

لیکن تعجب یہ تھا کہ موقع آتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ مشین کے بند ہونے ہی اس کی ہمت بھی ختم ہو جاتی۔ کرنے دھرنے کا موقع آتے ہی اس کا ارادہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اور وہ بحث کرنے لگتا۔ اتنے میں " ہاں! ٹھیک .... گھمائے چلو ..... آہستہ" پکارنے کے بعد اوورسیر کاغذ لگانے لگتا۔ اوورسیر کے ان حکموں کا ذرا سے اشارہ سے ہی خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کیوبا کو نہ معلوم کیا ہو گیا۔ وہ بُت کی طرح کھڑا رہا۔ اس کے ہاتھ جیسے بدن سے چپک گئے ہوں۔ وہ اوورسیر کی طرف دیکھ بھی نہ سکا۔ اوورسیر ایک کھلاڑی کی طرح جو شیر کے مُنہ میں ہاتھ ڈال ڈال کر اس کو کھلا رہا ہو مشین میں سر ڈال کر کام کر رہا تھا۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ ابھی تک سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ مشین پر کاغذ چڑھنے کی 'کھر رکھر' کی آواز ہونے لگی۔ "ٹھہرو" یہ کہہ کر اوورسیر مشین کے باہر نکل آیا۔ "کلک" کر کے لیور اُٹھا۔ اور اعلیٰ انجنیر کے حکم " تیار رہو" کے بعد مشین چلنے لگی۔ پہلے تو ایک لمحے تک دگھوں گھوں، ہوتی رہی۔ پھر پانی کے جھرنے کی سی آواز آنے لگی۔ مشین کے چلتے ہی کیوبا کے دل میں شیطنت نئے سر سے جلوہ گر ہونے لگی۔ وہ کیوبا کی بُزدلی پر ہنسنے لگا۔ کیوبا کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے اس کے دماغ میں چنگاریاں بھر دی ہیں۔ اُسے پھر اپنے گھر کا خیال آ گیا۔ بچوں کے رونیکی آواز پھر آنے لگی۔ اسے اپنے آپ کو روکنا مشکل ہو گیا۔ اوورسیر کا خاتمہ کرنے کیلئے وہ بے چین ہو گیا۔ لیکن موقع آتے ہی اسے نہ معلوم کیا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔

اسی طرح کاغذ کا چوتھا پنڈا — جس کے ساتھ اوورسیر کی موت آرہی تھی — بیلن پر چڑھ گیا۔ لیکن اوورسیر کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اس کے بعد سات پنڈے تک اور بھی ختم ہو گئے۔ اور اب صرف دو رہ گئے ہیں۔

"ہوشیار —"

کاغذ کا آٹھواں پنڈا بھی بیلن پر چڑھ گیا۔ مشین میں پھر پہلے تو گھوں گھوں اور پھر پانی کے جھرنے کی سی آواز آنے لگی۔

"بس اب آخری موقع ہے۔ اگر اب چُوک گئے تو چُوک ہی گئے۔ پھر موقع نہیں ملے گا۔" کیوبا کا دماغ ایسے خیالات سے پھر گرم ہو گیا۔

اس کے جبڑے میں پھر وہی ناقابلِ برداشت درد ہونے لگا۔ اس نے دانت پیسنا شروع کیا تاکہ درد کم محسوس ہو۔ لیکن اس کے دانت کڑکڑانے لگے۔ اسے سانس لینے میں بھی بہت کش مکش سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے جیسے اسے بخار آ گیا ہو۔ "بریک" کے پاس ہاتھ لیجانے ہی اس کی انگلیاں بُری طرح کانپنے لگیں۔

ایسا تو اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی ہل چل تو اس کے دل میں پہلی بار ہوئی تھی۔ حالانکہ وقت بہت تیزی سے گذر رہا تھا لیکن اس کے لئے تیز ہونے کے باوجود بھی ایک ایک لمحہ بہت آہستہ آہستہ گذرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

آخر کار ۔۔۔!

کاغذ کا آخری پڑہ چڑھایا جا رہا تھا۔ کیوبا کا تمام بدن تھرا رہا تھا۔ اگر وہ کسی چیز کا سہارا لیکر کھڑا نہ ہوتا تو شاید وہ کھڑا نہ رہ سکتا زمین پر گر پڑتا۔ اگر اس وقت اسے وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دیا جاتا، تو شاید ہی وہ وہاں سے ہٹنے میں کامیاب ہوتا۔ سامنے ہی اس کا شکار تھا۔ اس کا خاتمہ کرنے کیلئے مشین کو چلانے کا کونسا موقع ٹھیک ہو گا۔ یہ سب جاننے کے لئے وہ اپنے شکار کی طرف دیکھ بھی نہیں سکا۔

"آہستہ سے ۔۔۔۔ ہاں، ٹھیک ۔۔۔۔"

اوورسیر کے یہ الفاظ اس کے کان میں پڑے۔ کیوبا چونک اٹھا اس کا دماغ پھر گرم ہونے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کی گردن مروڑ رہا ہے۔ ابھی کچھ لمحہ پہلے وہ جس طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا اس طرف اس کی نظر پھر گئی، گھونگھر والے بالوں کا سر اور کاغذ کو بیلنوں کے درمیان سرکاتی ہوئی انگلیاں اسے نظر آئیں۔ بس یہی ٹھیک موقع ہے۔

اس کا ہاتھ آپ ہی آپ لیور کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اس کے ہاتھ کو کسی نے اس کے جسم سے علیحدہ کر کے لیور پر پہنچا دیا ہو۔ اتنے ہی میں بجلی کی روشنی یکایک لال ہو گئی۔ بلب کے تار پہلے سے ہو چلے اور پھر بجھ گئے۔ یہ سب کچھ نصف سکنڈ ہی میں ہو گیا۔ سارے مطبع میں اندھیرا چھا گیا۔ کارندوں کی بھنبھناہٹ اور گالی گلوج صاف سنائی دینے لگی۔

کیوبا کے دماغ میں ایک خوفناک خیال دوڑ گیا۔ خدا نے اس کی مدد کیلئے ہی یہ تاریکی بھیجی ہے۔ تاریکی میں کسی کو کیا خبر ہو گی کہ کس نے کیا کیا۔ چٹ پٹ اب موقع ہے۔ وہ بھی مشین کے اندر ہی ہو گا۔

اس کا ہاتھ دستہ سے جا لگا۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ آگ کی چنگاریوں کا ایک بڑا ہالہ اس کی آنکھوں کے سامنے چکرانے لگا۔ اسے اپنے ہاتھ میں ناقابلِ بیان درد محسوس ہوا۔

لیکن کیوبا خوش تھا۔ وہ انتقام لینے میں کامیاب ہو سکا۔ مشین زور شور کے ساتھ پانی کے جھرنے کی سی آواز کرتی ہوئی چلنی شروع ہو گئی تھی۔ اس شور و غل میں کیوبا کو اپنے شکار کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ اسے کچھ الفاظ بھی سُنائی دیئے۔

لیکن یکایک "سائیں سائیں" کے سوا سب "گھڑ گھڑ" بند ہو گئی۔ کیوبا کو معلوم ہوا کہ وہ تو اسی کے کان گونج رہے تھے۔ مشین کا انجن بالکل ہی چپ تھا۔ اوورسیر بول رہا تھا۔ لیکن اس کی آواز میں تکلیف یا کراہنے کا شائبہ بھی نہ تھا۔

"ارے ...... ڈیم ...... یہ سب کیا ہے؟ کیا روشنی والا مر گیا۔ کمبخت! ریزرو لائٹ بھی نہیں رکھتا۔ ارے! کیا کسی کے پاس دیا سلائی کی ایک تیلی بھی نہیں ہے؟"

ایک جلتی ہوئی دیا سلائی گیس لیمپ کے پاس لائی گئی۔ بھک سے لیمپ جل اٹھا۔ لیمپ کی روشنی میں کیو با نے اوورسیر کا چہرہ دیکھا۔ اسی نے لیمپ کو جلایا تھا۔ اسی طرح تین لیمپ اور جلائے گئے اور مطبع روشن ہوگیا۔

انجن اب تک نہ چلتا تھا۔ حکم کے انتظار میں دو کارندے اپنے اپنے بیوروں پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف خاموشی کی حکومت تھی۔ سب کی آنکھیں جو گیس لیمپ پر لگی ہوئی تھیں پھر اپنے اپنے کام کی طرف آ گئیں۔ اخبار اٹھانے والے لڑکے اخباروں کی گڈی بنا رہے تھے۔ ہر طرف سے پہلے کی طرح مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔

اوورسیر نے جو روشنی کے بجھتے ہی باہر نکل آیا تھا۔ بیلنوں کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں کیو با کی ڈری ہوئی آنکھوں سے لڑ گئیں۔

اس کی آنکھوں نے جیسے بڑی بڑی اور گڑی ہوئی آنکھوں سے کیو با کو پکڑ لیا۔ وہ اپنی نگاہ نہ پھرا سکا۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے سینہ کو چیر کر باہر نکل جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اوورسیر کی آنکھیں یکایک سرور تبسم سے چمک اٹھیں۔ ان آنکھوں میں محبت اور مسرت کا ایسا انداز تھا کہ کیو با بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اوورسیر نے اپنی گردن کو اس انداز سے جھٹکا دیا، جیسے وہ اب بھی کیو با پر اعتماد کرتا ہے اور آئندہ کیلئے اسے ہوشیار کر رہا ہے۔ پھر اس نے دوسرے دو کارندوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "ہوشیار"

بیلن کا بریک کلک کر کے ہٹ گیا۔

انجنیر نے پکارا "ہوشیار!" مشین پھر چلنے لگی۔ پہلے وہی 'گھوں گھوں' اور پھر وہی پانی کے جھرنے کی آواز ہونے لگی۔ ابھی دس ہزار کاپیاں اور چھپنی تھیں۔ کاغذ کو دوڑتے ابھی دیر نہ ہوئی تھی کہ کیو با کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں کی کھال غائب ہے۔ تاریکی اور دماغی بے چینی کے سبب اسے کچھ خیال نہ رہا۔ دستہ پر پہنچنے کی بجائے کسی دوسری چیز سے جا ٹکرایا تھا۔ جس کی رگڑ سے اس کے ہاتھ کی کھال اڑ گئی۔ اور اب خون نکل رہا تھا۔ اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں تھے۔ خیالات کا خوفناک طوفان اٹھ رہا تھا۔ خون کی گرمی بڑھ جانے کی وجہ سے اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ ان ہی سب وجوہات سے اس کے دماغی توازن میں بہت تزلزل ہوگیا تھا۔ اور اس کے کانوں میں مشین چلنے کی سی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

اخبار چھپ گیا۔ آخری پانچو کاپیاں دفتر میں پہونچ گئیں۔ پاس والے کمرے سے ڈاک میں بھیجے جانیوالے اخباروں پر مہر لگنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک دو آدمی بقیہ رات مطبع ہی میں کاٹنے کے لئے کاغذ کے ڈھیر پر سونیکا انتظام کر رہے تھے۔ پریس چپ چاپ کھڑا تھا۔ چاروں طرف کاغذ کا برادہ، تیل اور سیاہی کے داغ پھیلے ہوئے تھے۔ مطبع کے کارندوں کی طرح گویا پریس بھی آرام لے رہا تھا۔ لیکن کیو با پہلے کی طرح ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہ بیٹھا بیٹھا سامنے کی طرف تاک رہا تھا۔

اوورسیر کوٹ کی آستینوں میں ہاتھ ڈالتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"اچھا کیوبا! اگر تمھیں کہیں ملازمت نہیں ملی ہے تو ہم تمھیں رکھ لیں گے .... ارے یہ تمھارے ہاتھ میں ہو کیا گیا؟ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ جب تک تم چوٹ نہیں کھاؤ گے اتنے ہوشیاری سے رہنا نہیں سیکھو گے۔ اور اگر تمھاری جبڑے میں درد ہوتا ہے تو تم اپنی جگہ بدل لینا" او ور سیر مسکراتا ہوا دروازہ کی جانب جانے لگا۔

"سرا" شرم میں ڈوبے ہوئے کیوبا نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے کہا" سرا خدا آپ کا بھلا کرے".... اسکی آنکھوں میں آنسو اُمڈ سے آرہے تھے۔

"پاگل مت بنو! ہمیں سختی کرنی ہی پڑتی ہے۔ میں نے مینجر سے تمھاری سفارش کردی ہے۔ آہ! تمھارے دونوں بچے! خبر نہیں کس حال میں ہونگے؟" یہ کہہ کر دروازہ سے گذرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کیوبا چھاپہ کے حروف کے ایک خالی پیپے پر بیٹھ گیا۔ تیل اور سیاہی سے ملوث ہاتھ اس کے منہ کو ڈھکے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر آنسو نیچے گر رہے تھے۔

مترجمہ محمد شمیم جامعی

تجلّیات

سزاوارِ کرم کیا خاک ہم کو باغباں سمجھے؟ — کہ ہم ہر شاخ گُل کو اپنی شاخ آشیاں سمجھے!

نہ رکھا امتیازِ ناز فرطِ عجز نے باقی — کہ ہم نقشِ جبیں کو تیرا سنگ آستاں سمجھے!

نشیمن کی ہوس نے خانماں برباد ہی رکھا — وہ بجلی تھی جسے ہم اپنی شاخِ آشیاں سمجھے!

ابھی واقف نہیں اہلِ چمن رنجِ اسیری سے — گلستاں میں کوئی کیا خاک پھر میری فغاں سمجھے!

نہ رکھا سادگی نے لذتِ بیداد سے محرم — کسی نامہرباں کو ہم ہمیشہ مہرباں سمجھے!

معاذ اللہ کیا کیا اعتمادِ موسمِ گل ہے؟ — اسیرانِ قفس کُنجِ قفس کو آشیاں سمجھے!

نہ رکھا فرقِ مرگ و زیست قائم رنجِ ہستی نے — ہم اپنے ہر نفس کو اپنی مرگ ناگہاں سمجھے!

کہیں تابشؔ شریکِ لذتِ پنہاں نہ ہو جائے — مرا رازِ غمِ اُلفت نہ میرا رازداں سمجھے!

تابش دہلوی

کوکن کے بونبل

ہندوستان کے مغربی ساحل پر مغربی گھاٹ اور سمندر کے درمیان "کوکن کا علاقہ ہے۔ جس کے باشندے "کوکنیوں" کے نام سے موسوم ہیں۔ یہاں کے مسلمان ان عربوں کی اولاد سے ہیں جو قرونِ وسطیٰ میں سمندر کے مالک تھے۔ اب بھی یہ اپنی ذہانت، خوبصورتی اور آزاد فطری کیلئے مشہور ہیں۔ ان کے مخصوص پیشے، جہازرانی جنگلوں کے ٹھیکے اور نمک سازی ہیں۔ بونبل مچھلی کھانیکی وجہ سے کثیر العیال ہیں۔ انکی مادری زبان کوکنی ہے۔ لیکن بڑے حیرت انگیز طریقہ سے اُردو اس کی جگہ لے رہی ہے۔

ابوطاھر

ایک بالشت بھر کا لمبوترا گوشت کا لوتھڑا جس کے مُنہ اور دُم میں کوئی تمیز نہیں کی جاسکتی۔ رنگ سفیدی مائل جس کے اندر سے رگوں میں خون دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ چھونے میں بڑی ملائم اور لجلجی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس پر سفنے نہیں ہوتے۔ یہ ہے بونبل مچھلی کی شکل وصورت جس کو آپنے ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔ اس کی تخلیق کے متعلق ایک داستان بھی ہے۔ جب تمام جانوروں کا خمیر تیار ہورہا تھا اس وقت برہماجی کے دربار میں بونبل کی وجہ سے تھوڑی بے لطفی پیدا ہوگئی تھی۔ دراصل یہ میاں بیوی کی لڑائی تھی۔ کیونکہ برہماجی اس کو زہری سانپ بنانا چاہتے تھے۔ اور ان کی بیوی اس کو مچھلی بنانے پر مُصر تھیں۔ ان دونوں کی ہمدردی میں درباریوں میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا تھا اور ممکن تھا کہ یہ بات طول پکڑ جاتی لیکن بونبل نے اس معاملہ کو اس طرح ختم کردیا کہ وہ موقع پاکر مغربی ساحل کے سمندر میں غوطہ مار کر غائب ہوگیا۔ اور جبسے اب تک اسی نامکمل حالت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کو مچھلی کہتے ہوئے ہچکچاتا ہوں لیکن عام طور سے یہ مچھلی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ عورتوں کی بات کا مان زیادہ ہوتا ہے۔ گو مچھلی کا روپ نہیں لیکن چونکہ سمندر میں رہتا ہے اس لئے یہ نام رکھنے میں حرج ہی کیا ہے حالانکہ ہم سمندر کے تمام جانوروں کو مچھلی کے نام سے موسوم نہیں کرسکتے۔

(۲) انگریزوں نے بھی اس کو مچھلی تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ بلکہ وہ اسے "بمبئی کا مُرغاب" (Bombay Duck) کہتے ہیں۔ گویا اُن کی نظر میں یہ ایک پرندہ ہے جس کے پر نہیں ہوتے۔ اس مغالطہ کی وجہ دراصل حضرت ڈاروِن صاحب ہیں جن کے مشہور نظریۂ ارتقاء سے کہ تمام جاندار نیچے درجہ سے ترقی کرتے کرتے اونچے درجہ پر پہنچے ہیں۔ آپ بخوبی واقف ہیں۔ اسی اصول پر انسان پہلے بندر تھا، بندر شتر مُرغ تھا، شتر مُرغ مرغابی تھا اور مُرغابی مچھلی تھی۔ لیکن بونبل ایسی مچھلی ہے جو ارادہ تو مُرغابی بننے کا رکھتی تھی اور اس نے اس تیاری میں اپنے سفنوں کی کینچلی اُتار کر مُرغابی کے پروں کے لئے جگہ بھی پیدا کرلی تھی لیکن اسی اثنا میں کوکنیوں کی زبان کو اس کے گوشت کا چسکہ لگ گیا۔

اور انھوں نے اس خیال سے کہ کہیں یہ مرغابیاں شمالی ہند کی طرف نہ اُڑجائیں ان کو مچھلی ہی کی شکل میں رہنے پر مجبور کردیا۔ اس نظریہ سے اس کے گوشت کے ذائقہ کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے۔ اس کے متعلق بھی ایک حکایت سُن لیجئے۔

(۳) ایک خدمت گار ہندوستان کے کسی بادشاہ کے ہاتھ دُھلا رہا تھا کہ اسی اثنا میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جب بادشاہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بیان کیا کہ وہ بھی کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا رئیس تھا۔ اور جس طرح وہ بادشاہ کے ہاتھ دُھلا رہا تھا اسی طرح خدمت گار اس کے ہاتھ دُھلایا کرتے تھے۔ بادشاہ نے یہ سُن کر اس سے سوال کیا کہ بتاؤ سب سے لذیذ گوشت کس جانور کا ہوتا ہے؟

اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "مُرغ کا"۔ بادشاہ کو اس کے جواب سے اطمینان ہو گیا۔ اور اس نے اس کو انعام و اکرام دیکر آزاد کر دیا۔ لیکن کوکنی مورخین کا بیان اس سے تھوڑا مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس خدمت گار نے مُرغ کے گوشت کی تعریف نہیں کی بلکہ "بونبل" کے گوشت کی تعریف کی تھی۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ حکایت صحیح ہے۔ اور جہاں تک ذائقہ کا سوال ہے اس میں بھی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ مرغ اور بونبل دراصل ذات واحد ہیں۔ لیکن ظاہرا طور سے ایک بانگ دیتا ہے۔ پَر پھٹ پھٹاتا ہے اور ٹھونگیں مارتا ہے۔ لیکن دوسرا اپنی نازک جلد کو بچانے کے لئے پانی میں تیرتا پھرتا ہے۔

(۴) بونبل کوکنیوں کی مشہور ترین غذا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرچشمۂ حیات کی تمامتر لطافتیں یکجا ہو کر اُسکے رگ و پٹھوں میں سرایت کر گئی ہیں۔ اس لئے وہ دسترخوان جس پر اس کی پلیٹ نہ ہو کوکنیوں کی نظروں میں بالکل ریگستان ہے۔ مقامی طور پر ایک سودیشی شعر بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ "اگر کوکنی را بونبل نہ ملد تو بوم بوم میشود"۔

تازے بونبلوں کی بہ نسبت سوکھے بونبل زیادہ لذیذ خیال کئے جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے ڈوریوں پر لٹکتے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے دھوبیوں نے کپڑوں کی چندیاں لٹکا دی ہوں۔

(۵) ہندوستانیوں کیلئے سوکھا بونبل بڑی زحمت کا باعث ہے۔ اس کے بازار میں گذرتے ہوئے ناک کو دونوں ہاتھوں سے ہوا بند کرتے وقت وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو سمندر میں ڈوبتے وقت ہوتی ہے۔ یقیناً اس میں کوئی ایسا جزو ضرور معلوم ہوتا ہے جو کلوروفارم سے ملتا جلتا ہے۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو بنگال کیمیکل ورکس بہت آسانی سے ہندوستانی کلوروفارم تیار کر سکتے ہیں۔ جو سستا بھی پڑیگا اور زود اثر بھی لیکن دقت یہ ہوگی کہ اس کو سونگھنے کے بعد ایک ہندوستانی مریض بیہوش ہونیکے بعد پھر کبھی ہوش میں نہ آسکے گا۔

(۶) "جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے"۔ اسٹیشن پر بونبلوں کی بوریوں کی قطاریں۔ ریل کے ڈبوں میں پھلوں کی ٹوکریوں کی ساتھ بونبل کے پلندے۔ مسافروں کے اسباب کے ساتھ بونبل کی گٹھڑیاں۔ دکانوں پر بونبل کے اسٹاک، اور دوستوں اور ملاقاتیوں کے ہاتھ میں بونبل کے دونے۔ ایسی حالت میں ڈر معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی لوٹ پوٹ کر ایک بونبل نہ بن جاؤں۔ ان صورت حالات کے ماتحت کوکن کے سیاح کیلئے بہترین علاج یہ ہے کہ وہ قوت شامہ کو سُن کرنے کا ایک انجکشن لے لے۔

(۷) سوکھا بونبل کوکنیوں کو اس قدر کیوں پسند ہے؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ مچھلی اس تیزی سے انڈے دیتی ہے کہ ریاضی داں اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ اگر ان کو اسی تیزی سے نہ کھایا جائے تو شاید مغربی ساحل پر کسی جاندار کے رہنے کے لئے جگہ ہی نہ رہے گی۔ دوسری وجہ سیاسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ ہندوستان میں ہندو مسلم آبادی

کے تناسب نے بڑی مشکلات پیدا کردی ہیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کی اقلیت کا سوال فوری توجہ کا محتاج ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ سوائے اس کے کہ تمام مسلمان، کوکنی مسلمانوں کی تقلید میں سوکھے بونبل کھانا شروع کردیں۔ دس سال کے اندر تمام مسلم آبادی "کن فیکون" نہ ہو جائے تو ہمارا ذمہ۔ ثبوت میں اس علاقہ کی مردم شماری کی رپورٹ ملاحظہ ہو۔ اسی سلسلہ میں ہمدرد دواخانہ دہلی کے مینجر صاحب بھی "معجون بونبل" کی تیاری پر غور فرمائیں۔

(۸) سوکھا بونبل اقتصادی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کوکنیوں کی روزی بحیرۂ عرب کی موجوں اور مغربی گھاٹ کے جنگلوں سے وابستہ ہے جہاں تازہ گوشت شکار کی زحمت کے سوا میسر ہی نہیں آسکتا۔ کئی گھنٹوں کی مسلسل محنت کے بعد جس وقت چاول کی روٹی میں بھنے ہوئے بونبل ملفوف ہو کر سامنے آتے ہیں تو تمام جسم "آنا پیٹ" (میں پیٹ ہوں) کا نعرہ لگا کر مصروفِ جہاد ہو جاتا ہے۔ اور وہ لطف آتا ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔

(۹) میں نے بھی بونبل کھائے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ یہ میری "چڑ" ہو گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کا پروپاگنڈا مجھ پر اثر کر گیا تھا۔ میرے پاس بونبل کے پارسل آتے تھے۔ میرے نوکر کو رشوت دیکر بونبل میرے دسترخوان پر رکھوا دیا جاتا تھا۔ میرے دوست اس کی تعریف میں اس قدر قصیدے پڑھتے تھے کہ غالب اور اکبر الہ آبادی نے آم کیلئے بھی اتنی فصیح البیانی سے کام نہ لیا ہوگا۔ جب مجھ پر یہ تمام باتیں بھی کارگر نہ ہوئیں تو دعوتیں شروع ہو گئیں اور دسترخوان پر بونبل طرح طرح کے روپ میں پیش کیا جانے لگا۔ لیکن میں الف لیلہ کے اُس دیو کی طرح جو انسان کی بُو کو سات پردوں میں بھی محسوس کرلیتا تھا بونبل کو پہچان لیتا تھا۔ لیکن کہاں تک۔ آخر ایک روز بے تکلف دوستوں کی محفل میں مجھے بونبل کھلانے کی رسم بڑے شاندار طریقہ سے ادا کی گئی اور میں نے ؎

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے جبر سے بونبل کو کھا گیا

کہہ کر پہلا لقمہ اُٹھایا۔ آخر میں تمام شرکائے طعام نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اور اب مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ واقعی بونبل بڑی لذیذ شے ہے۔ میں عمر خیام کی طرح دعا کرتا ہوں کہ مجھے تین چیزیں بخشدے۔ سمندر کا کنارہ۔ بھنے ہوئے بونبل۔ اور چاول کی روٹی۔

سید ابو طاہر

تاراچند جی سے ہندی کی چندی

ٹھیٹ اردو میں

بابو جی! میں نے جو آپ سے باتیں کیں وہ آپ کی سمجھ میں نہ آئیں۔ اچھا مہاتما جی سے جو بات چیت ہوئی کیا اُسے بھی آپ نہ سمجھ سکے۔ اس میں تو کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی تھی اور سب باتوں کو ایسے ڈھنگ سے ایک جگہ اکٹھا کر دیا تھا جسے ہندی کی چندی کرنا کہتے ہیں۔

مہاتما گاندھی سے باتیں کر کے اُٹھا ہی تھا جو آپ کی لکھت ملی۔ اس پر بھی کچھ لکھ لکھا کے بھیج دینا چاہتا تھا پر یہ دھیان آیا پہلے جو لکھا جا چکا اس کا کیا ہوا جو اب پھر کہی ہوئی باتوں کو دُہرایا جائے۔ اور کہی ہوئی باتوں کا دُہرانا ایسا ہی ہے، جیسے چبائے ہوئے نوالوں کا پھر سے چبانا۔

پھر، گاندھی جی سے بات چیت والی لکھت کی ایک کاپی آپ کے "ہندستانی" کے لئے بھیجی ہی جائیگی۔ جسے جی لگا کے دیکھنے پر نہ سمجھی ہوئی باتیں آپ چاہیں گے تو سمجھ سکیں گے اور جو اس پر بھی کوئی گتھی نہ سُلجھ سکی تو اسے پوچھا گچھی سے سُلجھا دیا جائیگا۔ پر اس سب کچھ ہونے پر بھی آپ تو ایسے ہو گئے جیسے کوئی انجان بن جاتا ہے۔

اپنے "رہنما ہی ہندستانی" میں اسے آپ نے چھاپا تو۔ پر اسکا چھاپنا نہ چھاپنا ایک سا ہو کے رہ گیا۔ اچھا، بُرا، بڑا، چھوٹا کوئی فٹ نوٹ لکھنا کیسا آپ اس پر دو ڈھائی بول بھی نہ لکھ سکے۔ اسے پڑھ کے آپ نے کیا کہا، اس کی کتنی باتیں اچھی لگیں، اپنے جی میں آپ نے کیا سمجھو تا کیا۔ یہ سب باتیں جاننا چاہتا تھا۔ پر آپ کے چُپ سادھنے سے کچھ بھی نہ جان سکا۔

جب تک اپریل کا "ہندستانی" نہیں چھپا تھا یہ سمجھے ہوئے تھا۔ مہاتما سے بات چیت والی لکھت کے چھپنے کی جب گھڑی آئیگی تو آپ اس پر کچھ نہ کچھ لکھیں گے۔ پر جب وہ چھپ چھپا کے سامنے آئی تو یہ دیکھ کر اچمبا ہوا کہ آپ نے تو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور چھوا تک نہیں۔ ساتھ ہی یہ دھیان بھی آیا کہیں ایسا تو نہیں آپ کسی ایسے جھمیلے میں پھنس گئے ہوں جس سے دو بول بھی نہ لکھے جاسکے اور اس سے چھٹکارا ملنے پر لکھنا لکھانا اُٹھا رکھا ہو۔ پر اپریل کے "ہندستانی" کو چھپ کے پانچ چھ مہینے ہو چکے۔ اس پر کچھ لکھنا ہوتا تو لکھ لکھا کے آپ کب کا بھیج چکے ہوتے۔ جب دیکھا آپکی چُپ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو نہ رہا گیا اور یہ چٹھی لکھنا پڑی۔ میں یہ نہیں کہتا جو میں کہہ رہا ہوں بے سوچے سمجھے آپ اُسے مان ہی لیں نہیں پہلے اسے سمجھ کی کسوٹی پر کسئے۔ ٹھیک اُترے تو مانئے۔ ٹھیک نہ دکھائی دے تو مجھے جھٹلائیے کیسے؟ کیوں؟ اور کس لئے کو ساتھ لے کر۔

ربڑ کو جتنا کھینچئے کھنچے گا اور چھوڑ دیئے تو سُکڑ سُکڑا کے رہ جائیگا۔ ایسا ہی کھنچنا، سُکڑنا، سمٹنا بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بات کو جتنا بڑھائیے بڑھے گی اور جتنا گھٹائیے گھٹ گھٹا کے رہ جائیگی۔ اکڑ مکڑ اور جیں پٹاخ کرنے سے بات بڑھتی ہے اور ہلنا ملنا ہنس برتنے سے بڑھتی ہوئی بات دب دبا جاتی ہے۔

اسے دیکھ کے آپ کہہ سکتے ہیں:۔ میرا کہنا بھی تو یہی ہے پر میرے اور آپ کے کہنے میں بہت بل ہے۔ میں جو کہتا ہوں "کیوں" اور "کس لئے" کا پورا دھیان رکھکر اور آپ اُسے چھوڑ کر۔

کہیں کہیں سے اپنی لکھت کے کچھ ٹکڑے بھی دیکھ لیجئے۔ ایک جگہ آپ یہ لکھتے ہیں:۔

> "کیا ہندی بھاشا مری ہوئی ہے اور کیا اس کے شبدوں کے ہونے سے اُردو ادھ موئی ہوجائے گی"

دیکھئے ہندی اتنی ہی جیتی جاگتی کہی جاسکتی ہے جتنی یہ اُردو میں گھُل مل کے اس کی ہوگئی۔ ہندی کے جتنے بول اُردو میں پوری سما چکے اور اپنی اپنی جگہ نکال کے جم چکے وہ سب جیتے جاگتے ہیں۔ انھیں کوئی مرا ہوا نہیں کہہ سکتا۔ ان کو چھوڑ کر ہندی کے اور جتنے

بول ہیں اپنی جگہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اُردو ہیں تو انھیں کڈھب اور بھولا بسرا ہی کہا جائیگا۔ گھلے ملے بول چٹکتی ہوئی کلیاں اور مہکتے ہوئے پھول ہیں۔ ان کا سا رَدپنے بولوں میں کہاں آسکتا ہے۔ پُرانے چانول جتنا گھی اٹھاتے ہیں نئے چانول اس کا آدھا بھی نہیں اٹھا سکتے۔ تو جو ہندی کے بول اردو میں پورے سما چکے وہ سب اب اُردو ہی کے ہو چکے اور کسی جتن سے بھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب رہا ہندی کے نئے نئے بولوں کا اُردو میں ٹھونسنا تو یہ وہی جھگڑا ہے جس پر میرے آپ کے لکھا پڑھی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

میں نئے ٹھونسے ہوئے بولوں کو مرا ہوا کہہ رہا ہوں۔ اور آپ جیتا جاگتا۔ کیوں اور کس لئے سے میں ان کا مرا ہوا ہونا دکھا رہا ہوں۔ اور آپ کیوں اور کس لئے کو چھوڑ کر انھیں جیتا جاگتا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔

عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہ ملواں بول جن سے اُردو کا نکھار اور اُبھار ہے۔ ان بولوں سے ہٹ کر اُردو کے ملے جُلے بولوں کو اُن کی جگہ سے ہٹا کر کسی بھاشا کے نئے بول اس میں بڑھانا اُردو کو اَدھ موا بنانا نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

اپنی لکھت کا یہ ٹکڑا ابھی دیکھئے:۔

"انیکتا، کولاہل، رکشا، سمبندھ اور دُرشا ایسے جن
لفظوں کا میں نے استعمال کیا ہے انھیں کون
مرا ہوا کہہ سکتا ہے۔ ہماری طرف تو آپ کسی شہر
یا گاؤں میں چلے جائیں ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ
چاہے ہندو ہو یا مُسلمان انھیں سمجھ لے گا۔"

کیا اچھا ہوتا جو اسی کے ساتھ ساتھ ان پڑھے لکھے مُسلمانوں اور ہندوؤں کی لکھتوں کے دو ایک ٹکڑے ہی اپنی بات منوانے کے لئے آپ لکھ دیتے جو ان بولوں کو لکھتے اور بولتے ہیں۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں" لکھنے کا یہ ڈھب بنا رہا ہے کہ اپنے جی میں آپ نے مجھے یہیں کا سمجھ لیا اور آپ کے دھیان میں جب میں یہیں کا ٹھہرا تو پھر وہاں کی باتیں کیسے جان سکتا ہوں۔

سُنئے:۔ دلّی کب کی لُٹ لُٹا چکی۔ ایسے ہی لکھنؤ بھی کب کا اُجڑ چکا۔ اب دکھن ہی ایک ایسی جگہ رہ گئی ہے۔ جہاں ہند سے باہر اور پورے دیس کی چوٹی کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں بڑی سی بڑی راجدھانی میں جو جو باتیں ہونا چاہئیں وہ سب آپ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا آپس میں مل جُل کے رہنا، ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بول چال، بات چیت، پہناوا ایسا ایک سا ہے جو کوئی انھیں دیکھے تو نہ پہچان سکے اور سب کو ایک ہی سمجھے۔ پھر، جہاں بھی جائیے کیل کا کھٹکا تک نہیں۔ سات آٹھ برس کا لڑکا سڑکوں پر سونا اُچھالتا چلا جاتا ہے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی اُدھر نہیں دیکھتا۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا سب کو راج ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہاں کی چہل پہل، گھما گھمی یا تما کی دیا سے دن دونی رات چوگنی ہے۔ جدھر منہ کیجئے راج کی دیا کی بہتی ہوئی گنگا دیکھ لیجئے۔ اور جدھر آنکھ اٹھا کے دیکھئے دُھن برستا ہوا دکھائی دیگا۔ ایشور اُسے سنسار کی ٹھوکس اور اس کی اونچ نیچ سے بچائے اور دکھن کے راج میں اور چار چاند لگائے۔

سترہ، اٹھارہ برس سے میں بھی اسی سُکھ چین کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہنس بول رہا ہوں۔ چوتھے پانچویں برس اُدھر کا بھی پھیرا ہو جاتا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا چھوڑا ہوا کچھ کھیتی باڑی کا دھندا ابھی ہے جس کی دیکھ بھال کیلئے کبھی کبھی گاؤں میں بھی آنا جانا ہوتا ہے اور وہاں کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایسی نہیں جو ان آنکھوں سے چھپی ہوئی ہو تو پھر آپ کا یہ "ہماری طرف" کہنا کیسا اور آپکے اس کہنے کو میں کیسے مان لوں۔ میں نے آجتک مسلمان تو مسلمان وہاں کے کسی ہندو کو بھی ایسے بول بولتے نہیں سُنا۔

یہاں کے رجسٹرار آفس میں اپنی جان پہچان کے کچھ لوگ الہ آباد کے بھی ہیں۔ آپ کی لکھت انھیں بھی دکھائی سبنے بڑے اچنبے سے اسے دیکھا اور یہی کہا۔ برس کے برس اُدھر جانا آنا رہتا ہی ہے۔ ہم نے تو ایسے بول کسی ہندو سے بھی نہیں سُنے۔ اب کچھ دنوں سے یہ سُن رہے ہیں:۔ اُدھر ایک بڑا جتھا ایسا اُٹھا ہے جو اُردو میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس اور اُن کے پرچار کے جتن کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے جو ڈھائی دن میں بھاشا کی ایسی کایا پلٹ ہو گئی ہو۔

آپ نے سُن لیا الہ آباد والوں نے کیا کہا تو اب بھی اپنی لکھت کے اس ٹکڑے کو:۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے

جائیں ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ ہندو ہو یا مسلمان
انھیں سمجھ لے گا۔"

کیا آپ دُہرائیں گے۔ ابکتا، کولاہل، شکشا، سمبندھ، ہتوں، آشا، دشا، ابھیاس، نشچے اور ایسے بہت سے اور بھولے بسرے بول۔ یو۔پی، اودھ اور ان جگھوں کے آس پاس کے رہنے والے لوگ آپ کے دھیان میں سب کے سب بولتے اور سمجھتے ہیں اور دوسروں سے بھی آپ یہی منوانا چاہتے ہیں۔ پر جن کے سامنے وہاں کا پورا سماں ہو وہ اسے کیسے ٹھیک مان لیں۔ اور آپ کے دھیان کا ساتھ دینے کی کیسے ہامی بھریں۔

آج کل کے ہندی پرچار والوں کو چھوڑ کر نئے اور پرانے اردو لکھنے والے ہندوؤں ہی کی لکھتوں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے تھوڑے سے بہت بول آپ کو دکھانا چاہئیں تھے پر آپ ایسا نہ کر سکے۔

یہ بھی ایک نئی بات دیکھی۔ آپ ایک جگہ جو لکھتے ہیں آگے بڑھکر وہ بات بھول میں پڑ جاتی ہے اور اس کا دھیان نہ رہنے سے آپ ایسی دوسری بات چھیڑ دیتے ہیں جس سے پہلی کہی ہوئی بات کچھ سے کچھ ہو کے رہ جاتی ہے۔ دیکھئے پہلے تو آپ نے یہ لکھا:—

"میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ فارسی، عربی کے وہ
بول جو اب ہماری بولی میں گھل مل گئے ہیں
نکال ڈالے جائیں۔ انھیں رکھیے اور ضرور رکھئے۔"

اس لکھت کو پورا کرتے کرتے دھیان بھٹک کے نہ جانے کدھر سے کدھر چلا گیا جو آپ یہ لکھنے لگے۔

"اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا
آپ کیا نام رکھیں گے۔ میں تو اسے اُردو۔
ہندی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے پکارنے کو
تیار ہوں۔ یہی وہ بولی ہے جس کا جوکھا رنگ
مولوی سید ابو القاسم نے اپنی چٹھی میں دکھایا
ہے۔"

اپنی لکھت کے ان دونوں ٹکڑوں کو سامنے رکھکر دیکھئے اور بتائیے کہ ان میں کوئی گھٹ بڑھ اور اُل بل نہیں کہیں آپ عربی، فارسی کے ملے جلے بول اُردو میں سے نکالنا نہیں چاہتے۔ اور ان کے نکالنے کی ہامی نہیں بھرتے اور کہیں آپ لکھنے کے ایسے ڈھب کو جسمیں عربی، فارسی کے بول تو بول، اگر، مگر، کہ، چونکہ، بلکہ، چنانچہ، حالانکہ، یا، وگرنہ، لیکن کا بھی کہیں پتہ نہیں) "جوکھا رنگ" کہہ کے سراہتے ہیں۔ سوجھ بوجھ والوں کو تو ایسا نہ چاہیئے۔ اُردو میں سے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول نکالنا چاہئیں کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ پر کیا دھی جو جی میں تھا تو پھر اُسے دکھاوا نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبا جوڑا۔ اس کہاوت کو سچ کرنے کے لئے کہاں کہاں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے کڈھب بول کے بول اُردو میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ دھیان اور رات دن کی بول چال سے جو بول کالے کوسوں پر پڑے ہوئے ہوں چن چنا کے انھیں ایک جگہ اکٹھا کرنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔

اوروں کو آپ کیوں دیکھیں اپنے ہی کو دیکھ لیجئے۔ کیا پہلے سے آپ اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ کیا آپ کے لکھنے کا پہلے یہی ڈھنگ تھا۔ "ہندستانی" کا پورا فائل سامنے نہیں۔ نہیں تو آپکی ایک ایک لکھت کا پورا پورا پتہ دیتا۔ اب اس کے جو دو تین نمبر سامنے ہیں انھیں کو دیکھ لیجئے۔ ان میں آپکی تین لکھتیں ہیں جن میں سے کسی میں بھی آشا، شکشا، ویاکرن، ابھیاس، کلیور، جیون، ہردے اور ایسے اور دوسرے بولوں کو آپ کی لکھت نے کہیں مُنہ بھی نہیں لگایا۔

"مسلمانوں کا ہندستان میں آنا" (ہندستانی، جولائی ۱۹۳۱ء)
"تبصرے" (ہندستانی، جولائی ۱۹۳۲ء)
"کرۂ زمین" (ہندستانی، جولائی ۱۹۳۵ء)

یہ تینوں لکھتیں آپ ہی کی ہیں اور جن بولوں کو جیتا جاگتا آپ کہہ رہے ہیں اُن کا ان میں کہیں پتہ بھی نہیں۔ تو اب آپ ہی کہیئے ان بولوں کو مرا ہوا نہیں تو جیتا جاگتا کون کہہ سکتا ہے۔ انھیں جیتا جاگتا کہنے میں آپ سے یونہی سی کچھ چوک ہو گئی۔ آپ کو یہ کہنا چاہیئے تھا:۔ یہ بول ہیں تو مرے ہوئے پر اب یہ جِلائے جا رہے ہیں۔

آپ کی جن لکھتوں کا ابھی اتا پتہ دیا اب کہیں کہیں سے اُن کے لکھنے کا ڈھنگ بھی دیکھ لیجئے اور ہو سکے تو اسی اپنی آجکل کی لکھت سے بھڑا کے جانچئے۔ جولائی ۱۹۳۱ء کے ہندستانی میں آپکے لکھنے کا یہ ڈھنگ ہے:۔

"ان بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندُستان کی مغربی کنارے پر مسلمان اپنے مذہب کے قائم ہونیکے کچھ ہی دن بعد آکر بسے اور ان کی تعداد، دولت اور طاقت بڑی تیزی سے بڑھی۔ ہندُستان کے مشرقی کناروں پر بھی عربوں کی پُرانے زمانے میں بہت قدر و عزت ہوئی۔ جب دارا نے پانچویں صدی قبل مسیح میں دجلہ اور فرات کے دہانوں کو رکوا دیا اور مصر کی تجارت کو فنا کر دیا تو یہ تجارت یمن کے عربوں کے ہاتھ لگی۔ عربوں اور یہودیوں کی نوآبادیاں لنکا اور جنوبی ہند میں قائم ہوئیں۔"

جولائی ۳۴ء کے ہندُستانی میں بھی اپنے لکھنے کا ڈھچر دیکھ لیجئے۔

"غرض کہ مثنوی چونکہ ادب و حکمت اور حقائق و معارف کا ایک گنجینہ ہے۔ اس لئے ہر زمانے میں لوگوں کو اس سے استفادہ کا شوق رہا ہے۔ اور مختلف طریقوں سے اس کے افادہ کو عام بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ طرح طرح کے ایڈیشنوں کے علاوہ صرف اس کی شرحوں کا نام گنایا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ عام مواعظ میں مثنوی کے قصص و حکایات اور اس کے نکات و لطائف کا مختلف عنوانوں اور تقریبوں سے ذکر ہوتا رہا ہے، بہر صورت اس سے فیضیاب و متمتع ہونیکا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ بایں ہمہ عام حلقوں میں اکتساب و مطالعہ کا جو صحیح حق ہے وہ خاطر خواہ ادا نہ ہو سکا۔"

جولائی ۳۵ء کے ہندُستانی میں آپ کی لکھت کا یہ ڈھب ہے:۔

"ایک زمانہ تھا جب انسان کے تصور میں آسمان ایک لامحدود کرہ تھا جو ایک لازوال قوت کا مسکن تھا۔ جہاں نورِ ازلی ضوفگن تھا، عقلِ کُل جلوہ افروز تھی، عشق و محبت، سرمستی و مسرت کا دور دورہ تھا۔ یہ وہ آسمان تھا جو اس عالم کے نو افلاک پر محیط تھا، ان سب سے الگ اور اوپر تھا۔ دائمی سکون اور امن کا مقام تھا، تبدیلی اور حرکت سے ماورا تھا۔ عالم کون و فساد نو کروں پر مشتمل تھا۔ کرۂ ارض عین مرکز میں واقع تھا اور اس کی فلک پر چاند حکومت کرتا تھا۔"

اچھا ہوتا ہے جو ایسا لکھ سکتا ہو اور جس کی اُڑان اتنی اونچی ہو وہ اتنا نیچے اُتر آئے اور یہ لکھنے لگے:۔

"اردو کے کلیور کو پسار رہیں گے"، "میرا ابھی یہی نویدن ہے"، "اس کا بیورا لیجئے"، "جو کچھ آپس میں تھوڑا سا بھید ہے"، "انتر دو باتوں میں ہے"، "مولوی صاحب کو ہندی کے لفظ کڈھبے جان پڑتے ہیں"

اچھا یہ تو بتائیے یہ کیا بات ہے:۔ میرے لکھنے کے ڈھنگ کو آپ نے "چوکھا رنگ" کہا تھا تو اُسے برتا بھی ہوتا اور اسی ڈگر پر آپ بھی چلے ہوتے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ منہ سے تو "چوکھا رنگ" کہہ دیا پر اپنی لکھت میں اسے نہ برت سکے۔

عربی، فارسی کے بولوں سے آجکل کے ہندوؤں کی چڑ اور اُنکی جگہ اُردو میں کڈھب بول ٹھونستے دیکھکر میں نے اس ڈھب کے کواڑ کھول دیتے تھے اور سمجھا تھا عربی، فارسی بولوں کے نہ ہونے سے آپ لوگ ادھر ہی آجائیں گے۔ اور ادھر آنے سے ہوگا کیا۔ آئے دن کی تو تو میں میں اور نئی بھاشا بنانے کی دوڑ دھوپ سے چھٹکارا بھی مل جائیگا اور نئے بولوں کی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کیلئے گھڑی گھڑی سنسکرت کی ڈکشنری بھی نہیں اٹھانا پڑے گی۔ بنی بنائی بھاشا بیٹھے بٹھائے مل جائے گی۔ اور نئی بھاشا بنانیکی اُدھیڑ بُن میں جو گھڑیاں کٹ رہی ہیں وہ دیس کے کٹھن دھندوں میں کٹنے لگیں گی۔

ہمارے سامنے ہندوؤں کے دو جتھے ہیں۔ ایک وہ جو عربی فارسی نہیں جانتا اُس کو تیرا میرا کرنا نہیں آتا۔ اُردو میں جونسے اور جتنے بول بھی ہیں سب کو یہ اپنے ہی یہاں کا سمجھتا ہے۔ رہا دوسرا جتھا جو کچھ نہ کچھ عربی، فارسی جانتا ہے وہ بات بات میں تیرا میرا کرنے کا راگ الاپتا رہتا ہے اور جب کچھ لکھنے لکھانے کیلئے بیٹھتا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول اردو میں سے نکالنا اور کاٹ چھانٹ کے ان کی جگہ نئے نئے کڈھب

بولوں کو دیتا ہے۔ دھیان نہ رہنے سے بدیسی بولیوں کے بول لکھت کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ لکھ چکنے پر اس کی جانچ پرتال کی جاتی ہے اور جانچنے میں جو بدیسی بول ملتے جاتے ہیں انھیں نکال ڈالا جاتا ہے۔ جیسے کسی نے لکھنے کی دُھن میں یہ لکھدیا :۔ "اُن کا کیا حال ہے "۔ "آپ سے امید ہے "۔ جانچ کی کسوٹی پر کسنے میں "حال"، لکھا ہوا دیکھ کر دھیان آیا "حال"، "احوال"، "حالت"، یہ بول تو عربی ہیں۔ یہ دھیان آتے ہی اُسے کاٹ کر "دشا"، کا کڈھب بول اس کی جگہ جڑ دیا"۔ امید کو پرکھا تو یہ بول فارسی دکھائی دیا۔ اس پر بھی ناک بھوں چڑھائی اور جھٹ سے اس چینے بول کو بھی کاٹ کوٹ کے اس کی جگہ مرا ہوا بول "آشا"، رکھدیا۔ آجکل یہی ڈھنگ چل پڑا ہے اور بہت سے ہندو اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں :۔ "میرا نویدن بھی یہی ہے "۔ نویدن کی جگہ "مقصد، مدعا" لکھا جا سکتا تھا۔ اور کونسے اچنبے کی بات ہے جو پہلے یہی لکھا ہوا اور پھر نویدن بنایا ہو۔ مقصد، مدعا یہ وہ بول ہیں جنھیں اَن پڑھ سے اَن پڑھ بھی سمجھتا ہے اور جو ان بولوں کو عربی ہونے سے آپ نہیں لکھنا چاہتے تھے تو ٹھیٹ اُردو کا بول "کہنا"، نویدن کی جگہ لکھا جا سکتا تھا"۔ اور میرا ابھی یہی کہنا ہے"۔ آپ کی لکھت کا یہ ٹکڑا یوں ٹھیک ہو سکتا تھا۔ پر آپ کو تو "نویدن"، کیلئے جگہ نکالنا تھی۔ اور جیسے بھی بنا وہ آپنے نکال ہی لی۔ ایسے ہی عربی، فارسی کے گھلے ملے بولوں کو اُردو میں سے نکال کر اشبد، کلیور، جیون، بیورا، ویاکرن، جیسے نئے نئے بولوں کو جگہ دی گئی ہے۔

مہاراج! ڈر کا تھا جس کو پھر وہی بات آ دبد اکے کی۔

دیکھئے اُردو لکھنے کے دو ہی ڈھب ہو سکتے ہیں :۔ پہلا یہ ہے۔ عربی، فارسی، ہندی کے وہ بول جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں ان سب کو ملا جُلا کے جو لکھنا لکھا نا ہو وہ لکھا جائے۔ دوسرا ڈھنگ وہ ہے جسے "ٹھیٹ اُردو" کہتے ہیں۔ اور اسی ٹھیٹ اُردو میں پہلے آپ کو پھر مہاتما جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا جا چکا اور اسی ڈھچر پر پھر آپ کو لکھا جا رہا ہے۔ آپنے ان دونوں کو چھوڑ کے لکھنے کا ایک نیا ڈھب یہ نکالنا چاہا ہے جسمیں جگہ جگہ بھولے بسرے بولوں کی بھرمار ہو اور گھلے ملے بولوں کی جان بوجھ کے کاٹ کوٹ کی گئی ہو۔

کیا آپ نہیں جانتے کسی بھاشا میں نئے نئے بول کب اور کس لئے بنا لئے جاتے ہیں۔ دیکھئے۔ جب رات دن کی بول چال، بات چیت، سامنے کے بول کسی بات کو جوں کا توں نہ دکھا سکیں۔ جیسے کسی دوسری بھاشا کی کوئی لکھت آپ اپنی اُردو میں لانا چاہیں اور اس دوسری بھاشا کی وہ لکھت جسے اُردو کے کپڑے پہنائے جا رہے ہوں اس میں کچھ ایسی جگہیں آجائیں جو اُردو کیلئے بھول بھلیاں ہوں اور اس کی بول چال کے گنے چنے بول اس لکھت کے بھید کو نہ کھول سکیں تو جب اس بھید کو کھولنے اور چھپی ہوئی باتوں کو ایسا دکھانے کے لئے جیسے ہاتھوں کی لکیریں دکھائی دیتی ہیں سوچ ساچ کے نئے نئے بول بنانا اور بڑھانا پڑیں گے۔ اس سے ہٹ کر نئے بولوں کے گھڑنے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔ جو نئے اور جتنے ملواں بول چلے آرہے ہیں، انھیں یوں ہی رکھا جاتا ہے اور ان میں کچھ بھی گھٹ بڑھ نہیں کی جاتی۔ نہ جانے بیٹھے بٹھائے یہ کیا سُوجھی ہے جو سامنے کے بولوں کو چھوڑ چھاڑ کے کڈھب بولوں پر لوگ ریجھے ہوئے ہیں۔

اُردو ہی ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے نہ آپ کی یہ ا لی اور انوکھی بولی۔ میری پہلی چٹھی کے اس ٹکڑے کو لکھ کر آپ یہ لکھتے ہیں :۔

"اُردو کی جگہ ہندی کا شبد رکھ دیجئے تو
ہندی والوں کا بھی یہی کہنا ہے "۔

رکھنے کو کیا ہے جو جی چاہے اُردو کی جگہ رکھدیجئے۔ پر سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھئے تو اُردو کا بول اٹل دکھائی دیگا جو اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ اور کوئی دوسرا بول اس کی جگہ لے نہیں سکتا۔ دیس کی چھوٹی بڑی بولیاں جتنی بھی ہیں اُن سب کو الگ الگ دیکھ چکنے پر جب آپ اُردو کو پرتالیں گے تو یہ بل کھلاڈلا دکھائی دیگا۔

کسی بھاشا کے پھیلاؤ کو کیسے جانچتے ہیں۔ اَن پڑھ گاؤں والوں اور گنواروں کی بات چیت کا کیا ڈھنگ ہے۔ عربی، فارسی کے بگڑے بگڑائے بولوں کو یہ کس فرّاٹے سے بولتے چالتے ہیں۔ دیس کی بولیوں میں سے مرہٹی میں عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے بولوں کی کیسی ریل پیل ہے۔ گاندھی جی کی چٹھی میں یہ سب باتیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس چٹھی کو نہ دیکھا ہو تو دیکھئے اور جو دیکھ لیا ہو تو پھر دیکھئے۔

اپنی اسی لکھت میں ایک جگہ آپ نے یہ بھی لکھا ہے :۔

"جس طرح مولوی صاحب ہندی کے لفظوں کو سُن کر کان میں اُنگلی ڈالتے ہیں۔ اُسی طرح پنڈت جی اُردو کے چٹ پٹے شبد سُن کر آپ کا مُنہ تکتے ہیں"۔

آپ سے یہ کس نے کہہ دیا۔ بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بھی ٹھیک نہیں۔ نہ مولوی صاحب ہندی بولوں کو سُن کر کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور نہ پنڈت جی اُردو کے چٹ پٹے بول سُن کر کسی کا مُنہ تکتے ہیں۔ ہندی کے وہ بول جنھیں نہ کبھی اُردو نے سُنا اور نہ کبھی دیکھا ایسے ہی بھولے بسرے بولوں کو سُن کر "مولوی صاحب" کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں اور وہ بول جو اُردو میں گھُل مل چکے انھیں سُن کر کون ناک بھوں چڑھا سکتا ہے۔

رہا پنڈت جی کا مُنہ تکنا اس کیلئے میری پہلی چٹھیوں کو دیکھئے جن میں بہت سے پنڈتوں کی لکھتوں کا آنا پتا دیا جاچکا ہے۔ ان پنڈتوں کی لکھتوں کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کے لکھنے کا۔ پنڈت جی کترا کے کہیں سے الگ نہیں ہوتے اور اسی ڈھرّے پر چلے جا رہے ہیں جس پر مسلمان۔ تو پنڈت جی کا منہ تکنا تب آپ کہہ سکتے تھے جب پنڈت جی اپنی لکھت کا ڈھچر مسلمانوں سے بچ بچا کے الگ رکھتے اور لکھت کی پگڈنڈی پر مسلمانوں کے ساتھ کبھی نہ چلتے۔

دیس کی کسی بات کا ٹھیک ٹھور ہو نہ ہو جو بھی ہو آپ بھاشا کی دیکھ بھال، جانچ پرتال کیجئے۔ اس کا آگا تاگا لیجئے۔ آپ کو کوئی روکتا نہیں۔ پر یہ تو بتا دیجئے کہ یہ سب کھڑاگ کس لئے۔ ہندی پرچار کو بُدھ بُدھ آٹھ دن بھی تو ابھی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے کیا ہو رہا تھا۔ دیس کونسی بولی بول رہا تھا۔ لکھت پڑھت کیسے کی جا رہی تھی۔ دیس والے کسے برت رہے تھے۔ تو جو ہو رہا تھا ابھی اُسے ہی رہنے دینے میں کونسا گھاٹا اور ٹوٹا تھا۔ پُرانی ڈگر چھوڑنا کیوں اور نئی بنانا کس لئے۔ کیا پُرانا ہونا کوئی بُری بات ہے اور جو کسی بات سے بچنا اس کے پُرانے پن ہی سے مان لیا جائے تو اور سیکڑوں ایسی باتیں ہیں جنھیں اُن کے پُرانے پن سے چھوڑ دینا چاہئے۔ پر کیا وہ چھوڑی جا سکتی ہیں۔

مہاراج! دیس کے دو ہاتھ ہیں۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ انھیں دونوں ہاتھوں نے مل کر اُردو کی ایسی موہنی مورت بنائی جسے آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ بھاشا کسی ایک کی بنائی ہوئی نہیں۔ تو ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے اُردو بنی، پنپی، بڑھی اور پھیلی۔ یہ آگے بڑھ ہی رہی تھی جو اس کا ساتھ دینے کیلئے دکھن کی عثمانیہ یونیورسٹی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا ساتھ دینا اُردو کے لئے ایسا ہوا جیسے سونے پہ سُہاگا۔ یہاں کے راج نے کروروں کی لاگت سے اُردو یونیورسٹی اور لاکھوں کی پچھادر سے اس یونیورسٹی کے لئے ایک بڑی "اکیڈمی" بنوائی جس میں یورپ کی کٹھن سے کٹھن لکھتوں پہ لکھتیں اُردو کے اچھے اچھے کپڑے پہنتی چلی جا رہی ہیں۔ اور یہاں کی راجدھانی نے سہارا دے کر اُردو کو ایسی اونچی جگہ پہنچا دیا جہاں بڑی بڑی بھاشاؤں کی سبھا جمی ہوئی ہے۔ تو ایسی اُردو جو سارے دیس پر چھا جانا چاہتی ہے اسے چھوڑ چھاڑ کے ایک نئی بھاشا بنانے میں آپ لگے ہوئے ہیں۔

اچھا اب اُردو کو ایک اور ڈھب سے جانچ کے دیکھئے :۔ بنگال، گجرات، مدراس اُن تینوں جگہوں کی بولیاں دیس کی بڑی بولیوں میں گنی جاتی ہیں۔ کوئی بنگال کا رہنے والا مدراس پہونچ کر اپنی بنگلا بھاشا میں وہاں والوں سے بات چیت کرنے لگے تو کیا اس کا ایک بول بھی مدراس والے سمجھ سکیں گے۔ ایسے ہی مدراس اور گجرات والوں کی بولیاں کیا بنگال کے رہنے والوں کی سمجھ میں آسکیں گی؟ ہند کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجئے وہ پہلے سے جس جگہ بولی جا رہی ہے وہیں سمجھی جائیگی۔ اس ٹکڑے سے آگے بڑھنے پر اس کا بولنا تو بڑی بات ہے کوئی اس بولی کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہاں کی پوری بولیوں میں سے اکیلی اُردو ہی ایسی ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اُردو بولنے والا دیس کے کسی ایسے ٹکڑے میں بھی چلا جائے جہاں یہ بھاشا نہ بولی جاتی ہو۔ پھر بھی وہاں والے کچھ نہ کچھ اُردو بات چیت سمجھ ہی لیں گے۔

جونسی بھاشا بھی ہو پہلے اس کا پھیلاؤ ہی دیکھا جاتا ہے۔ اور اسی پھیلاؤ سے اس کے بڑے پن کا پتہ لگتا ہے۔ آپ نے دیکھا جو پھیلاؤ اُردو کا ہے وہ یہاں کی کسی اور بولی کا نہیں۔ تو پھر اُردو ہی دیس کی بھاشا ٹھہر سکتی ہے۔ اس پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں :۔ ہندی بھاشا بھی تو ایسی ہی ہے۔ پر آپ کا یہ کہنا تب ٹھیک

سمجھا جائے گا جب آپ کسی ایسی جگہ کا پتہ دے سکیں جہاں ٹھیٹ ہندی بولی جاتی ہو اور جس میں عربی، فارسی کے بولوں میں سے ایک بول بھی نہ ہو اور وہاں کے لوگ فرّاٹے سے ٹھیٹ ہندی ہی بولتے ہوں۔ گاؤں والے اپنی بات چیت میں عربی، فارسی کے جو سیکڑوں بگڑے ہوئے بول اُٹھتے بیٹھتے بولتے ہیں ان کی یہ بول چال ہندی نہیں کہی جاسکتی، اسے بگڑی ہوئی اُردو کہا جائیگا۔

آپ سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی چھپی ہوئی لکھت پہونچی۔ اسے اِدھر اُدھر سے اور اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ یوں تو یہ لکھت اچھی اور بہت اچھی ہے۔ پر کہیں کہیں اس میں کچھ باتیں ادھوری رہ گئیں اور کہیں کچھ لکھنے سے چھوٹ گئیں۔ پھر، پنڈت جی جو نفیوری بنانا چاہتے ہیں وہ کٹھن ہے۔ اُردو، ہندی جھگڑا چکانے کیلئے میرے دھیان میں دو باتیں ہیں جو کچھ کٹھن نہیں۔ سب کا ایکا ہو جائے تو پھر اس جھگڑے ٹنٹے کا کہیں پتا بھی نہ لگے۔ عربی، فارسی کے مَن مَن بھر کے بول ہندوؤں کو اچھے نہیں لگتے۔ اور اسی پر وہ اینٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی ہندی کے کڈھب بولوں کو مسلمان ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اور اسی پر ان کی تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ تو جھگڑا اتنا ہی ہے۔ آپس کی اس تن پھن اور اکڑ تکڑ کو الگ کر کے آپس میں میل ملاپ کے پینگ یوں بڑھا سکتے ہیں :۔

پہلی بات

ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے ایسے لوگوں کو چُن لیا جائے جو بَت بنے اور جھگڑالو نہ ہوں، بات کی پَچ کرنے کو بُرا نہ جانتے ہوں، دیس کا پریم اُن کی گھٹی میں پڑا ہو۔ میل ملاپ کے رسیا ہوں اور سب سے بڑھکر وہ لٹریچر اور بھاشا کا اُتار چڑھاؤ اور اس کی اونچ نیچ دیکھنے کی پوری سمجھ رکھتے ہوں اور ایسی باتوں کو پورا پورا جانچ پرتال سکتے ہوں۔ سب کے سب دُھن کے پکّے اور بات کے پورے ہوں۔ دونوں جتھوں میں سے ایسے سوجھ بوجھ والوں کو الگ کر کے اور انھیں ملا کے اُن کی ایک پوری کمیٹی بنالی جائے۔ جس میں یہ بھاشا کی نیّا پار لگانے والے ایک جگہ مل کے بیٹھیں۔ جو ایک کہے دوسرے اُسے کان دھر کے سُنیں، جو سچی بات ہوتی ہے وہ آپ دل میں گھر کر لیتی ہے۔ ٹھیک بات کے ماننے میں کبھی ہٹ دھرمی نہ چاہیئے۔ اس کا کہنے والا چاہے کوئی کیوں نہ ہو اور جو ٹھیک نہ ہو تو جب بھی جو کچھ کہنا ہو وہ ایسے ڈھب سے کہا جائے جس کا سننا دوسروں کے لئے دوبھر نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے اُردو کی جو جو لکھتیں اچھی سے اچھی مانی جارہی ہیں (جیسے سرسیّد، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد کی لکھتیں) انھیں دے کر ہندوؤں سے کہا جائے :۔ ان لکھتوں میں سے عربی، فارسی کے جو نسے اور جتنے بول آپ لوگوں کو بھونڈے بسرے دکھائی دیں ان سب کی ایک لِسٹ بنالی جائے اور ساتھ ہی عربی، فارسی کے کڈھب بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے اپنی ہندی میں سے ایسے گھلے ملے بول چھانٹ کے کمیٹی کو بتائے جائیں جنھیں مانا جاسکے۔ ایسے ہی ہندی کے جن کڈھب بولوں پر مسلمان ناک بھوں چڑھاتے ہیں ان سب کو ایک جگہ لکھ کے ان کی پوری لِسٹ بنالیں۔ اور اسی کے ساتھ بھونڈے بسرے ہندی بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول لکھ کر کمیٹی کو دکھائیں۔

تو ہندو اپنی جگہ عربی، فارسی کے بھونڈے بسرے بولوں کی پوری لِسٹ بنانے کے ساتھ اِن بولوں کی جگہ رکھنے کے لئے ہندی کے ملے جُلے بول لکھ لیں گے اور مسلمان اپنی جگہ ہندی کے کڈھب بولوں کی لِسٹ بنا چکنے پر ان بولوں کی جگہ برتنے کے لئے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول لکھ لکھا کے کمیٹی کے سامنے رکھدیں گے، اس ڈھنگ سے پھیلا ہوا جھگڑا اسمٹ سمٹا کے تھوڑی سی جگہ میں آجائیگا اور اب اتنی ہی بات رہجائیگی جو کمیٹی پورے سوچ بچار سے ایک ایک بات کی پوری چھان بین کر کے یہ جھگڑا ایسا چکادے جس کو ٹھنڈے جی سے دونوں جتھے والے مان لیں اور اس مانی ہوئی بات میں پھر کوئی کنز بیونت اور رگھٹ بڑھ نہ ہو سکے۔ ہندو، مسلمان اپنی اپنی جگہ سچائی کے ساتھ پورا پورا سوچ بچار کر چکنے پر آمنے سامنے جب کمیٹی میں بیٹھیں گے تو پھر آپس میں ایک کو دوسرے کی کہی ہوئی سچی اور اچھی بات مان لینے میں کوئی جھجک اور کچھ ڈر نہ رہے گا۔

یہ جھگڑا دو تین کمیٹیوں میں نہیں نبٹ سکتا۔ اس کیلئے کمیٹیوں کا جال بچھانا پڑے گا۔ جب تک ہندو اور مسلمان دونوں مل کے کسی بات کے ماننے کی حامی نہ بھریں تب تک بیچ میں کچھ کچھ دن چھوڑ کے یہ کمیٹیاں یونہی ہوتی رہیں۔ ایک کمیٹی سے

دوسری کمیٹی تک پورے سوچ بچار کے لئے بیچ میں پندرہ دن، مہینہ، سوا مہینہ جو بھی کمیٹی کہے وہی رکھا جائے۔ اس ڈھب سے اُردو، ہندی جھگڑا امٹ مٹا کے رہجائیگا۔ اور اس ڈھنگ سے اس کی بڑھتی ہوئی لے دب دبا جائیگی۔

دُوسری بات

اب تک جو بھی ہو رہا تھا یہ دھیان کر کے اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"۔ آج کی باتوں پر سنسار کا چُپ سادھنا آج ہی کے لئے ہے۔ یہی اسکی چُپ کوئی نہ کوئی سمجھوتا کل سامنے لے ہی آئیگی۔ یہ باتیں بہت پھیلاؤ چاہتی ہیں۔

اب تک ٹھیٹ اُردو لکھتا رہا۔ اس ڈھب کے کواڑ میں نے ہی کھولے تھے اور اب میں ہی انھیں بھیڑے دیتا ہوں۔ انھیں کیوں کھولا تھا اور کس لئے بھیڑا جا رہا ہے یہ کوئی بھید نہیں جو آپ سے چھپا ہوا ہو۔ تو اب جو لکھنا لکھانا ہوگا عربی، فارسی، ہندی اب سب بولوں کو ملا جُلا کے لکھوں گا، جیسے اس سے پہلے لکھا کرتا تھا۔

سیّد ابُوالقاسم

کیفِ محبّت

نگاہ مست، دل آسودۂ محبت ہے
عذاب زیست ہم آغوشِ خوابِ راحت ہے

نہ پوچھئے غم الفت میں کتنی لذت ہے
مری نگاہ میں یہ "خارزار" جنت ہے

کسی کی یاد نے اک حشر کر دیا برپا
دلِ تباہ میں طغیانِ رنگ و نکہت ہے

خیالِ یار کو اندوہ دو جہاں سے غرض
خیال یار تو اک عالمِ مسرت ہے

یہ امتیاز کہاں شورشِ تمنا میں
وہ روبرو ہیں کہ آئینۂ محبت ہے

یہ سوچتا ہوں کہ وہ کیوں نظر نہیں آتے
حجابِ قرب ہے یا پردۂ لطافت ہے

مجھے ہو ناز نہ کیوں ان کی بے نیازی پر
وہ جانتے ہیں، مرا دل رہینِ الفت ہے

یہی بہت ہے کہ اک ربط ہی انھیں مجھ سے
شریک تو ہیں محبت ہے یا عداوت ہے

وہ جور و ظلم سہی! یہ تو ہو گیا معلوم
کہ اُن کے دل میں بھی کچھ میری قدر و قیمت ہے

شکوہ رنگیں

دلِ فسردہ و مایوس کیا قیامت ہے
فضا اُداس ہے، عالم غریقِ حسرت ہے

سناؤ خوب سناؤ کسے شکایت ہے
دلِ اسیر سزاوارِ ہر اذیت ہے

گناہگار ہوں، کرتا ہوں اعترافِ گناہ
قصوروارِ محبت ہوں، ہاں، محبت ہے

رہی نوازشِ برہم بھی نامکمل سی
یہ دل فگار حزیں بسملِ نزاکت ہے

کبھی نہ پائی شکایت نے فرصتِ اظہار
نگاہِ زود پشیماں بھی کیا قیامت ہے

مآلِ جانِ حزیں سوچنے سے کام کسے
تمھیں ہے شوقِ ستم، دل حریصِ لذت ہے

مجھے کیا ہے مگر روشناسِ غم کس نے
یہ مانتا ہوں! غم ایجادِ طبیعت ہے

تمھیں کہو یہی شیوہ ہے دل نوازوں کا
یہ جاں کنی یہ عقوبت جوابِ الفت ہے

زمانہ دیکھ رہا ہے تباہیاں میری
تمھارے جور و ستم کی مجھے ندامت ہے

کوکب شاہجہانپوری

ہمارِی تعلیم میں مادرِی زبان کا درجہ

دنیا کے جتنے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک ہیں آپ دیکھیں گے کہ ان کے نصاب تعلیم میں ان کی مادری زبان کو خاص امتیاز و اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہاں جس طرح ان کو تمام دیگر علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح خود ان کی زبان بھی اچھی طرح سکھائی پڑھائی جاتی ہے۔

ایک انگریز گریجویٹ کو آپ دیکھیں گے کہ بہترین انگریزی بولنا اور لکھنا ہے۔ ایک جرمن گریجویٹ بہترین جرمنی زبان جانتا ہے۔ اور ایک فرانسیسی گریجویٹ خوب اچھی طرح فرانسیسی بولنا اور لکھنا جانتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ خود زندہ قومیں ہیں۔ ان کو اپنی ہر چیز محبوب ہے۔ اور اس کو بھی وہ زندہ رکھنا چاہتی ہیں اسی لئے وہ اپنی زبان کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک انسان کی تعلیم کا مقصد اولیں یہ ہونا چاہئے کہ تعلیم حاصل کرکے وہ منجملہ دیگر علوم کے اپنی زبان بھی عمدہ طریقہ پر بول سکتا ہو اور اس میں اتنی دستگاہ رکھتا ہو کہ اپنے خیالات کا خوش اسلوبی سے اظہار کرسکے۔

ایک تعلیمیافتہ انسان کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنی پرانی روایتوں کو زندہ کرے۔ اپنی مادری زبان کو زندہ رکھے اور اس کی ترقی وترویج کے وسائل وذرائع سوچے اور ان کو اختیار کرے۔ ہر قوم کی بقا اس کی اپنی زبان کی بقا کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اگر زبان مُردہ ہوگئی تو خود وہ قوم بھی مُردہ ہو جائیگی۔ یہ وہ خیالات واحساسات ہیں جن کے ماتحت یورپین ممالک کے لوگ اپنی اپنی مادری زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس کی بقا کیلئے تدابیر سوچتے اور ان پر عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ ہمارے ہندوستان کی حالت ان ممالک کے بالکل برعکس وبرخلاف ہے۔ یہاں تو بچے کو ابتدا ہی سے جبکہ وہ پانچویں یا چھٹی جماعت میں ہوتا ہے اپنی زبان کے ساتھ نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں بچہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے کے قابل ہوا۔ پھر وہ اُردو میں کلام کرنا باعثِ شرم وعار سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ سنِ تمیز کو پہنچنے پر بھی اس کی وہی حالت رہتی ہے۔ بالعموم حال یہ ہے کہ اگر ایک بی۔ اے پاس سے انگریزی میں کچھ لکھوائیں تو وہ بخوشی لکھدیں گے اور اپنی استعداد کے مطابق خاصہ لکھدیں گے۔ لیکن اگر ان سے اُردو میں ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کیجئے تو اول تو وہ سو طرح کے حیلے حوالے کرینگے۔ اور اُردو میں مضمون نہیں لکھیں گے۔ اگر آپنے سر ہو کر اور پیچھے پڑ کر زبردستی اُن کو مجبور کرکے مضمون لکھوا ہی لیا تو پھر اس میں پچاس غلطیاں ہونگی۔ نہ املا درست نہ خط درست "ق" کی جگہ "ک" لکھ رہے ہیں۔ اور "م" کی جگہ "ن"۔ نہ تذکیر کی تمیز نہ تانیث کی۔ رومال کو مؤنث اور بندوق کو مذکر لکھ رہے ہیں۔ نہ عبارت شستہ نہ مضمون صحیح نہ ترکیب چست نہ بندش بے عیب اور تو اور ان ہندوستانی صاحب بہادروں میں سے بہتر فی صدی ایسے ملیں گے جن کو صحیح طور پر خط لکھنے کا بھی ڈھنگ نہیں آتا

بیگم (شریک حیات۔ نصف بہتر) کو خط لکھ رہے ہیں تو "عزیزہ" یا "محترمہ مکرمہ" سے تخاطب کیا جارہا ہے۔ اور والدہ ماجدہ کو عریضہ لکھا ہے تو میری جان اماں، میری پیاری اماں" سے شروع کیا ہے۔ یہ عام شکایت ہے جو کالج کے لڑکوں کے متعلق بیان کی جاتی ہے اور عام مشاہدہ اس کا شاہد ہے لیکن غور کیا جائے تو اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور؟ بلکہ اصل قصور تو "نصاب تعلیم" کا اور "طرز تعلیم" کا اور تعلیم کے ماحول اور گرد و پیش کے حالات کا۔

انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں یہ نہیں کہ اُردو پڑھائی نہیں جاتی۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح پڑھائی جاتی ہے وہ نہ پڑھائے جانے کے برابر ہے۔ اور تعلیم میں ہماری مادری زبان کو جو درجہ ملنا چاہیئے اس سے وہ سراسر محروم ہے۔ بچہ کو اسکول کی شروع زندگی ہی سے جو ذہنیت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اُردو بولنا بُری بات ہے۔ اور انگریزی بولنا فخر کی چیز ہے۔ اور لیاقت وقابلیت کی نشانی ہے۔ اس کے استاد وغیرہ اس کو انگریزی بولنے کی تلقین کرتے ہیں اور اگر وہ اچھا انگریزی بولنے اور لکھنے والا بھی ہے تو انعام وغیرہ سے اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ پھر وہ بچہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اسکول کی اونچی جماعتوں میں جو تعلیم ہوتی ہے تمامتر انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اردو میں نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ انگریزی زبان کا حاصل کرنا اور اس میں کمال پیدا کرنا زیادہ فخر و نمود کی بات ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیکھتا ہے کہ اسکول میں جتنے ماسٹر ہیں اُن میں سب سے کم تنخواہ پانے والے وہ مولوی صاحب ہیں جو اُردو پڑھاتے ہیں۔ اس سے بچوں کے دل میں ان مولوی صاحب کی کوئی قدر نہیں رہتی۔ اور اسی بنا پر خود اپنی زبان کی ان کے دل میں ذرہ برابر وقعت نہیں رہتی۔ پھر یہ بھی سبب ہو کہ اسکولوں اور کالجوں میں مختلف سوسائیٹیاں اور انجمنیں ہوتی ہیں۔ بحث و مباحثہ کے لئے کلب ہوتے ہیں اور ان سب کی کارروائیاں تحریریں اور تقریریں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اُردو کا کہیں نام نہیں آتا۔ انعامات جو دیئے جاتے ہیں وہ انگریزی عمدہ بولنے والے اور لکھنے والے کو دیئے جاتے ہیں نہ کہ اُردو پر! پھر یہ کہ حکومت کی زبان انگریزی ہے اس لئے جس کی انگریزی تعلیم پختہ اور عمدہ ہوگی اس کے لئے اچھی ملازمت کے زیادہ مواقع ہیں۔ مگر اُردو میں کافی دستگاہ و مہارت رکھنے والے کے لئے اس قسم کا کوئی موقع نہیں۔

سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو کو نصاب تعلیم میں بحیثیت ایک ضروری اور لابدی مضمون کے داخل نہیں کیا گیا۔ اور بلکہ بعض یونیورسٹی کے امتحان میں تو اُردو پرچوں کی حیثیت محض اختیاری مضمون کی سی ہوتی ہے۔ مگر انگریزی کو حکماً ضروری لازمی قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان چند اسباب و وجوہ کی بنا پر ہماری مادری زبان کو تعلیم میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ ہماری تعلیم کا ابتدائی مقصد یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہم اپنی مادری زبان میں واقفیت بہم پہنچاتے۔ کتنے شرم کی بات ہے، کہ اگر ایک گوبجویٹ سے دریافت کیجئے کہ شکسپیر کون تھا؟ ملٹن کس صدی کا شاعر ہے؟ ورڈس ورتھ کو انگریزی شاعری میں کیا مرتبہ حاصل ہے؟ تو وہ آپ کو ان سوالات کے جوابات صحیح صحیح دیگا۔ لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ غالب کے کلام کی خصوصیات کیا کیا ہیں؟ میر تقی کو غزل گوئی میں کیا درجہ حاصل ہے۔ ذوق کس دور کے شاعر ہیں؟ تو ان سوالات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص اعلیٰ تعلیمیافتہ کہلاتا ہے مگر وہ دوسرو نکی زبان میں تو بے تکلف تحریر و تقریر

کرسکتا ہے اور خود اپنی مادری زبان میں ایسا کرنے سے عاجز و قاصر رہتا ہے۔
پس سخت ضرورت ہے کہ ہماری مادری زبان نصاب تعلیم میں جس درجہ کی مستحق ہے وہ اس کو دیا جائے۔
اور یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ اسمیں سے مذکورہ بالا خامیوں کو رفع کیا جائے۔

جمشیدہ شمیم

آرام کہاں!

"اپنے پھوپھیرے بھائی "محمد دلدار خاں" کی المناک موت پر خون کے آنسو!"

اے بھائی! تجھے کچھ اسکی خبر ہے غم بن ترے کیا حال ہے یاں
کیا بیت رہی ہے ماں پہ تری، کیا گھر کا ہے تیرے آج سماں
اُفتادہ ہے کیا بیوہ پہ تری، آنکھوں سے ہیں پیہم اشک رواں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اے بھائی سناؤں کیا میں تجھے کس حال میں تیرا بھائی ہے
کس حال میں تیرا ماموں ہے، دل ٹکڑے آنکھ حنائی ہے
ہر سانس گراں ہے دنیا کی، گھر بھر پہ قیامت چھائی ہے
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

ہر آنکھ میں آنسو خون کے ہیں، غمگیں ہے فضا، افسردہ چمن!
ہر ذرۂ ہستی مضطر ہے، ہر سانس ہے وردِ ضبط شکن
ہر دل ہے رہین بیتابی، سینوں میں ہے آتشِ غم سے جلن
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اُف! اب بھی ہوائیں چلتی ہیں، پیغامِ مسرت دینے کو
اُف! اب بھی وہی دن رات کے جلوہ رخشاں ہیں دل لینے کو
کیوں چھوڑ گیا ہے ہمکو یہاں تو آگ میں کشتی کھینے کو
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

ہاں اب بھی فضا میں سورج، چاند، ستارے کھیلنے آتے ہیں
ہاں! اب بھی پھول چٹکتے ہیں، طوفان طرب چونکاتے ہیں
اشکوں سے میں دامن بھرتا ہوں، آہوں کے کنول کھل جاتے ہیں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

انگاروں پہ لوٹ رہا ہو نمیں، سرگرم فغاں ہے سوز نہاں
ہر دل میں نہاں بیتابی ہے، ہر روح میں جوش برق تپاں
ہر نالہ ہے نشتر زخم جگر، ہر زخم جگر ہے شعلہ فشاں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اک ہوک سی دلمیں اٹھتی ہے، جب دھیان ترا آجاتا ہے
سر پیٹ کے رہجاتا ہو نمیں، ہر رونگٹا تھرا جاتا ہے
سینے کی فضا میں درد کا بادل جھوم کے لہرا جاتا ہے
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

ہر چند، جو پیدا ہوتے ہیں دنیا میں وہ مرتے ہی نہیں
اجزائے حیاتِ انسانی، تعمیر فنا کرتے ہی نہیں
پھر بھی تو حجابِ ظاہر کے ناسور کبھی بھرتے ہی نہیں
اُٹھ دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

اے خوابِ ابد کے متوالے! اللہ کی رحمت ہو تجھپر
ہر گوشۂ مرقد جنت ہو، یوں بارش راحت ہو تجھپر
انعام و سعود، گراں، پرسش کی نہ ساعت ہو تجھپر
اُٹھ، دیکھ!! قیامت برپا ہے، اب چین کسے، آرام کہاں!

کاوش حیدرآبادی

میں اور بچّہ

یہاں شہر اور اس کے شور و شغب سے دور، اس راستہ میں جو شاہی محل کو جاتا ہے، اس شاہی محل کو جو کل تک خدیو اسمٰعیل کے لئے تھا اور پھر اس کا نہ ہو سکا، مصری دیوتاؤں کی سرزمین پر، ابزلیس کی وادیوں میں، گرم سیر دریائے نیل کی کناری جس کی گہرائیوں میں دوشیزگان حسن کی بوسیدہ ہڈیاں دفن ہیں —— یہاں ایک نغمہ آگیں چمنستان ہے جو ہر آنیوالے کیلئے کھلا ہوا ہے۔ اور اس کی فضاؤں میں غمگین تماشائیوں کے خواب اب تک محفوظ ہیں۔

میں ایک منوّر و روشن دن کی صبح کو وہاں جا نکلی۔ میں نے شہری آداب کو خیرباد کہا اور زمین پر لیٹ گئی جس طرح خانہ بدوش صحرا کے ریت پر لیٹ جاتے ہیں۔ ایک درخت کے سایہ میں سرسبز گھاس پر میں دراز ہوگئی۔ میرے قدموں کے پاس ایک مجسمہ نصب تھا۔

اس وقت مجھے سوائے دو انگریز خواتین کے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ ان میں سے ایک کے ساتھ تین بچے تھے۔ چند منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ ان میں سے ایک بچہ میرے پاس آنکلا، اس کی عمر کوئی چار سال کے لگ بھگ ہوگی۔ میں نے اس کو آواز دی "یہاں میرے پاس آؤ ننھے!" وہ خوش خوش مسکراتا ہوا میرے قریب آگیا، میں نے اس سے کہا: "کیا میری گود میں نہیں آؤ گے؟" وہ خاموشی سے میرے گھٹنے پر بیٹھ گیا۔

جب میں نے اس کے ننھے جسم کا بوجھ محسوس کیا، تو مجھے اپنا مرحوم اکلوتا بھائی یاد آگیا۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا اور آنسو میری آنکھوں میں ڈبڈبانے لگے۔ میں اس بچّے کے شیریں رخسارے جلد جلد چومنے لگی۔ اور ان بوسوں سے اپنے اس غم کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی جو میرے دل کی گہرائیوں سے اس طرح نکل کر چھا گیا تھا، جیسے کہ کالی گھٹائیں سمندر کے ساحلوں سے اٹھتی ہیں۔

بچّوں کے معصوم بوسے کس قدر شیریں ہوتے ہیں!، اور اُن کی مُسکراہٹ کتنی عطر بیز ہوتی ہے!

میں نے اس بچّے سے سوال کیا۔ "تمہارا کیا نام ہے، بچّے!"

اس نے کہا۔ "روبرٹ"

اس وقت میں نے اس کے چہرے کو بہ نظر غور دیکھا، جس پر انگریزی حسن و جمال کی چمک تھی۔ صاف شفاف چہرہ گویا، وہ گلاب اور یاسمین سے گندھا ہوا ایک منجمد مادّہ تھا جس کو تراش کر ایک انسانی چہرہ بنایا گیا تھا۔ اور گلاب کی پتیوں کا سا نازک دہانہ نزاکت و لطافت کا ننھا گلدستہ تھا۔ اونچی چوڑی پیشانی جس پر سنہری بال سایہ کئے ہوئے تھے اور آنکھیں، جن میں گہری نیلاہٹ اسی طرح کروٹیں لے رہی تھی جس طرح کہ وہ غروب آفتاب سے پہلے سمندری سطح پر چھائی ہوتی ہے۔ وہ ان بعض انگریزی آنکھوں سے بہت مشابہ تھیں، جو بیک وقت ظاہری انجماد اور باطنی حرارت نیز حلاوت و ملاعبت کی پردہ دار ہوتی ہیں۔ میں نے ان سب علامات کو بہ غور دیکھا، پھر اس بچّے سے کہا: "روبرٹ! یہ آنکھیں تم کہاں سے لائے ہو؟، اور ان کی نیلاہٹ تم کو کس نے

دی ہے ؟" میرے الفاظ میں سے وہ صرف "دینے" کا لفظ سمجھا۔ جس کو سنکر اس نے جواب دیا "امی نے"
میرے منہ سے بیساختہ نکلا: "خدا تمھاری ماں کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے! تمھارے ابا کیا کرتے ہیں ؟"
اس نے تکلنت آمیز لہجہ میں بڑی مشکل سے جواب دیا "اباجان فوجی ہیں، میں بھی ان کی طرح فوجی ہوں"
میں نے کہا "تم بہت خوبصورت ہو روبرٹ! اور مجھے تم پر بہت پیار آتا ہے۔ لاؤ ذرا اپنا ہاتھ تو دو مجھے!"
بچوں کے ہاتھ بھی اُن کے تبسم کی طرح شیریں و دلفریب ہوتے ہیں۔ میں نے روبرٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، ورد ستِ قضا و قدر نے خطوط کی صورت میں جو کچھ تحریر کر دیا تھا اسے پڑھنے لگی۔ وہ ایک مربع بڑی بڑی انگلیوں والا ہاتھ تھا اور اس میں زندگی، عقل اور دل کی لکیریں ظاہر و واضح تھیں۔ مرّیخ کا اُبھار خطرناک حد تک اس ننھے ہاتھ میں نمایاں تھا...
میں نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا:-
"یہ وہ ہاتھ ہے جس کے خطوط آج فرشتوں کے پوشیدہ اشاروں کا پتہ دے رہے ہیں، یہ وہ ہاتھ ہے جو ہمیشہ صرف خوشبوؤں اور پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کیلئے بڑھیں گے۔ یہ ننھا سا خوبصورت ہاتھ عنقریب ایک فوجی کا ہاتھ ہوگا، عنقریب اس ہاتھ میں تلوار اور جنگی ہتھیار ہوں گے اور آتشیں گولے توپوں کے دہانے سے فضا میں پھینکے گا، عنقریب یہ انسانی زندگیوں کو فنا کریگا، خواہ وہ شریر ہوں یا نیک ...."
روبرٹ نے سبز گھاس کو اپنے پاؤں سے رگڑتے ہوئے پھر کہا ـــــ "میں بھی آبا کی طرح فوجی ہوں!"
میں نے کہا: "ہاں، روبرٹ! جب تم اس عمر کو پہونچو گے تو یقیناً فوج میں ہو جاؤ گے۔ تم عنقریب اپنے فوجی لباس میں خوبصورت معلوم ہو گے ـــ بہت ہی خوبصورت، لیکن اتنے نہیں جتنے کہ تم آج لباسِ طفلی میں حسین معلوم ہو رہے ہو۔ عنقریب عورتیں تم کو دیکھکر مسکرا دیا کریں گی، چونکہ وہ سپاہیوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ اور آستینوں اور سینہ کے زریں نشانات ان کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ یہ ننھے ننھے کمزور ہاتھ بڑے مضبوط ہو جائیں گے جو ایذا پہنچائیں گے، تکلیف دیں گے اور موت کے گھاٹ اتاریں گے، یہ ہاتھ عنقریب تخریب و بربادی کے آلات کو پورے پورے عزم و استقلال سے دبوچ لیں گے۔ تمھاری یہ خوبصورت آنکھیں اس جلّاد کی آنکھیں ہو جائیں گی جو خون اور آنسوؤں کے دریا بہتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کے دل میں رحم یا ترس کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور تمھارا دل! تم دیکھو گے کہ اُس دل کی کیا حالت ہو جائیگی، جو آج ادراک و شعور سے کتنا کم بہرہ مند ہے: ......!
"تم ان لوگوں میں سے ہو گے، جو زندگی میں جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، جو عیش کرتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں، ڈراتے ہیں، رنج و غم سے دوچار ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ متضاد کیفیتیں ان پر کوئی اثر نہیں چھوڑتیں، بلکہ مسرتیں اور مصائب ان پر سے اس طرح گذر جاتے ہیں جیسے بادل کے قطرے کسی شیشہ کی سطح پر گرتے ہیں اور اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑتے ....؟
ان انسانوں میں سے جن کا شعور و احساس تیز ہوتا ہے اور اس کے برعکس وہ کبر و خجالت کی وجہ سے پشت گردانی کرتے ہیں۔
...... کسی عورت کے ہاتھ کا لمس کبھی تمھاری آنکھوں میں محبت کے آنسو پیدا، یا تمھارے دل میں ناامیدی کا خنجر پیوست کر سکے گا!"

"سنو، روبرٹ! عنقریب تمھارے جسم اور روح میں بالیدگی پیدا ہو جائے گی، عنقریب تم انسانی کیفیات سے دوچار ہو گے اور اپنے کو زندگی کے میدان میں اکیلا پاؤ گے، عنقریب تمہیں احتیاج مبتلائے آلام اور جدوجہد مجبور کریگی، افکار کے شعلے تمھیں ایذا پہنچائیں گے اور رنج وغم کی آگ تمھیں پگھلا کر رکھدیگی۔ عنقریب تمھیں معلوم ہوگا کہ روح کی پیاس کیا چیز ہے؟ عنقریب تم ایک مکمل انسان ہو جاؤ گے اُف! کتنا ہولناک لفظ ہے! ...... عنقریب تم انسان ہو جاؤ گے یعنی حیوان بھی اور خدا بھی ...."

میں بہت دیر تک خاموش رہی۔

اور اس پُرسکون لمحے میں جو فطرت کی گود میں گذر رہا تھا ایک شیریں نغمہ یکایک باغ کے قریب سے بلند ہوا اور اسکا ترنّم پھولوں کی خوشبو پر چھا گیا۔ یہ مؤذن کی آواز تھی جو ظہر کی اذان دے رہا تھا، یہ وہی الفاظ تھے جو اس نے صبح ہوتے ادا کئے تھے۔ اور غروبِ آفتاب کے وقت پھر دُہرائیگا۔

میں نے پوچھا "تم نے کچھ سُنا روبرٹ!"

اس نے جواب دیا "جی ہاں"

میں نے کہا "عنقریب تمھیں معلوم ہوگا کہ مذہب کیا چیز ہے، عیسائیت کیا ہے، اسلام کسے کہتے ہیں۔ عنقریب تم سمجھ سکو گے کہ مذہبی، جنسی، ملکی، خاندانی اور انفرادی تعصب کیا ہے۔ عنقریب تمہیں معلوم ہوگا کہ جس کپڑے سے لباسِ عروسی تیار ہوتا ہے اسی سے شہیدوں کے کفن بنتے ہیں۔ عنقریب تم قوموں کو دیکھو گے کہ وہ دوسری اقوام کی جان ومال کے درپے ہیں صرف اس لئے کہ وہ اس کپڑے کے ٹکڑے کے گرد جمع ہیں جس کا رنگ اُن کے رنگ سے مختلف ہے عنقریب تم یہ سب کچھ دیکھو گے، روبرٹ! اور بذاتِ خود اس میں حصّہ بھی لوگے چونکہ تم اپنے باپ کی طرح فوجی ہو!"

بغیر پیار کئے اور بغیر رسمی الفاظ ادا کئے میں روبرٹ سے جُدا ہو گئی۔

میں نے اس لئے اُسے پیار نہیں کیا کہ مستقبل کے انسان کیلئے میں دہشت زدہ سی ہو گئی تھی اور اس نے مجھے اس لئے بوسہ نہیں دیا کہ میں نے اُسے بسکٹ یا مٹھائی نہیں دی تھی ....۔

(آنسہ می) ——— صلاح الدین قریشی

چندہ سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے۔ فی پرچہ ۶ر،

جرعات

ممالک غیر سے بارہ شلنگ، نمونہ کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے،

جلد ۱۶ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خدا کا شکر ہے کہ اس پرچے کے ساتھ ساقی اپنی عمر کا آٹھواں سال پورا کر رہا ہے۔ ۳۷ء میں خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ جنوری میں سالنامہ اور جولائی میں افسانہ نمبر شائع ہو سکا اور ان دونوں کی مجموعی ضخامت پانسو صفحے سے زیادہ تھی۔ معمولی پرچے چھیانوے چھیانوے صفحے کے شائع ہوئے۔ اس طرح ۳۷ء میں ساقی نے تقریباً پندرہ سو صفحے پیش کئے۔ مضامین کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اُردو کے بہترین انشا پردازوں نے ساقی کو نوازا۔ سب سے پہلے مولانا عنایت اللہ دہلوی شکریہ کے مستحق ہیں کہ ۳۷ء میں شیکسپیر کے دو ڈرامے ہیملٹ اور سمبلین اور ڈاکٹر جانسن کا فلسفیانہ ناول راسیلاس اُردو میں منتقل فرمایا اور انہیں پیش کرنیکا فخر ساقی کو حاصل ہوا۔ ان کے بعد حضرت ایم۔ اسلم، مسٹر صادق الخیری، مسٹر اختر حسین رائے پوری، اور پریم پجاری کا میں شکر گذار ہوں کہ ساقی کیلئے بہت اچھے اچھے افسانے ان حضرات نے لکھے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اُردو شاعری اور غزلگوئی پر نہایت بصیرت افروز مضامین تحریر فرمائے۔ ساغر جعفری صاحب نے پریم کہانیوں کا دلکش سلسلہ ساقی میں شروع کیا اور ابھی جاری رہیگا۔ فرخندہ اختر بیگم نے لیمب کی کہانیوں کے کئی عمدہ تراجم پیش کئے۔ حجاب امتیاز علی صاحبہ کے افسانے اور ادب پارے بہت پسند کئے گئے۔

ساقی کے بعض اُن خریداروں کو جو سنہ ۳۰ء سے ساقی کے خریدار ہیں یہ شکایت ہے کہ ساقی اب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ اس کا مجھے بھی اعتراف ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور ہمیں اگر زندہ رہنا ہے تو زمانے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی چلنا پڑے گا۔ جمود و سکون کو موت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ زندہ اور پائدار ادب پیش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ترقی پسند ہوں۔ آٹھ سال کے عرصے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ساقی کوئی ترقی بھی نہ کرتا اور زندہ بھی رہتا؟ ہماری ضروریات بدل گئیں۔ ہمارے نظریے بدل گئے۔ پہلے عشقیہ کہانیاں اور غزلیں ہمیں بہت پسند تھیں۔ مگر اب بھوک اور افلاس، غلامی اور آزادی، سماج اور تہذیب، اور اسی نوع کے ضروری مسائل نے ہماری تمام تر توجہ جذب کرلی ہے۔ ادب تو زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ پیشِ نظر مسائل کا عکس ہمارے ادب پر نظر آنا ضروری ہے۔ بس اسی قسم کی چند وجوہ ہیں جن کی وجہ سے ساقی اب وہ نہیں رہا جو سنہ ۳۰ء میں تھا۔ تصاویر کی اشاعت پر بھی زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ ان کی بجائے ساقی کی ضخامت میں سولہ صفحے کا اضافہ کر دیا گیا۔ ادبی حلقوں میں اس تجویز کو پسند کیا گیا۔

ساقی کے مستقل خریداروں کو انکا چندہ ختم ہونے سے ایک مہینہ پہلے اطلاع دیدی جاتی ہے تاکہ وہ آئندہ کیلئے خریداری یا عدم خریداری کے متعلق دفتر کو مطلع کر دیں مگر بہت کم حضرات اس ضروری امر کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ سہولت اور کفایت تو اسی میں ہے کہ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیا جائے۔ کیونکہ وی۔ پی۔ کی صورت میں چار آنے کی مزید زیر باری خریدار کو ہوتی ہے۔ جو حضرات ساقی آئندہ اپنے نام جاری رکھنا نہیں چاہتے اگر اطلاع نامہ پاتے ہی دفتر کو ایک ایک کارڈ لکھدیں تو ساقی ایک کثیر رقم کے نقصان سے بچ جائیگا۔ اُمید ہے کہ خریدار حضرات توجہ فرمائیں گے۔

شاہد

اُردو کی مثلیں اور اُنکی کہانیاں

اُردو کی بہت سی مثلیں دوسری زبانوں کی مثلوں کی طرح قصے کہانیوں یا واقعات سے نکلی ہیں۔ کچھ ان میں سے ایسی ہیں کہ اُن کا قصہ کم و بیش ان کے الفاظ ہی سے سمجھ میں آجاتا ہے جیسے من کر ساس بُرائی۔ آگے تیرے بھی جائی۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں، دھوبی کا کُتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ مگر کچھ مثلیں ایسی بھی ہیں کہ اُن کا قصہ اُن کے الفاظ سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسی مثلوں کے قصے روز بروز بھولتے بسرتے ہیں۔ اور یہ ایک ادبی نقصان ہے۔ بولنے کو یہ مثلیں لوگ کم و بیش بولتے ہیں۔ اور سُننے والے اُن کا مدّعا بھی سمجھ لیتے ہیں۔ مگر عمُوماً دونوں نہیں جانتے کہ مثل بنی کیسے تھی۔ آج ہم ایک ایسی مثل اور اس کا قصہ بیان کرتے ہیں۔

کہتے ہیں "بس آنکھوں کی سوئیاں اور رہ گئیں ہیں" یہ مثل ایسے موقعہ پر بولتے ہیں کہ کوئی کام تھوڑا سا رہ گیا ہو اور اور اسے لگے ہاتھوں کر ہی لینا چاہیئے ورنہ اندیشہ ہے کہ ساری محنت بیکار جائے اور پچھتانا پڑے۔ دیکھئے کہاں یہ الفاظ کہاں یہ معنی مگر وہ کہانی سُنیئے جس سے یہ مثل نکلی ہے۔ الفاظ و معنے کا ربط سمجھ میں آجائیگا۔

کہانی یوں ہے۔ کسی مُلک میں تھا کوئی بادشاہ، ہمارا تمہارا خُدا بادشاہ۔ ایک دفعہ وہ شہر سے شکار کو نکلا، بادشاہ بیگم اور اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی ساتھ لیا۔ امیر، وزیر، فوج فرّہ، نوکر چاکر۔ خدام حشم ہمرکاب ہوئے۔ ابھی جھٹپٹا ہی تھا کہ شکارگاہ میں جا پہنچے۔ یہاں ہر قسم کے شکار کی کثرت تھی۔ شکار کا اذن عام دے کر بادشاہ۔ بادشاہ بیگم اور شاہزادی نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں۔ چند امیر نامدار اور خاصہ بادشاہی کے سوار پیچھے پیچھے چلے۔ یہ سب شکار کھیلتے ہوئے ایک طرف کو بڑھے چلے جارہے تھے کہ بادشاہ کی نظر ایک ہرن پر پڑی۔ اس کے سینگ سُنہری تھے۔ بادشاہ بیگم اور شہزادی نے بھی اسے دیکھا۔ تینوں نے اپنے گھوڑے اس کے پیچھے ڈالے کہ تین طرف سے دبا کر اس کو کمند سے پکڑ لیں۔ گھوڑے ان کے ہوا ہو کر اُڑے۔ ساتھی سارے پیچھے رہے۔ اور یہ تینوں کہیں سے کہیں نکل گئے۔ ہرن بار بار کمند کی زد پر آکر تیر پرتاب سے بھی دُور نکل جاتا تھا۔ مگر نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ تینوں شکاری اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر بہت دور نکل گئے۔ اور ایک کف دست بیاباں میں جا پڑے۔ اب جو دیکھا تو ہرن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بہت گھبرائے۔ باگیں موڑیں تو راستہ نہ ملا۔ جتنے چلے اپنی شکارگاہ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ راستہ کی تلاش میں یونہی مارا مارا چلے جاتے تھے۔ کہ دور سے ایک سیاہی سی نظر آئی۔ سمجھے کوئی آبادی ہے۔ وہاں سے رستے کا پتہ ملے گا چلا چل وہاں پہونچے تو دیکھتے کیا ہیں ایک قلعہ کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اندر باغ لگا ہے اور پھاٹک اُس کا کھلا ہے۔ سامنے ہی آبدارخانہ ہے۔ کورے کورے گھڑے پانی سے بھرے سُرخ سُرخ بستنوں سے لپٹے سُنہری کٹوروں سے ڈھکے رکھے ہیں۔ شکاریوں کا جی چاہا دندناتے ہوئے باغ میں گھس جائیں۔ گھڑوں پر جا پڑیں اور ڈگڈگا کر خوب پانی پئیں۔ مگر پھر کچھ سوچکر بادشاہ نے اپنی باگ روکی، بادشاہ بیگم جھجکی شہزادی ان کے دل کے خطرے کو سمجھکر خود اپنے گھوڑے

سے اُتری اور بولی :-

"حضور، یہیں ٹھیریں میں اندر جاکر پانی اور قلعہ کی خبر لاتی ہوں بادشاہ اور بادشاہ بیگم "ہائیں ہائیں" کرتے ہی رہے کہ شہزادی قلعہ کے دروازے کے اندر تھی۔ مگر وہ دروازہ کے اندر پہونچی تھی۔ کہ ایک دہماکہ ہوا اور پھاٹک قلعہ کا بند ہوگیا۔ اب تینوں کے حواس گم عقل غائب۔ ہرچند اندر باہر سے تدبیریں کیں اِدھر اُدھر پھرے کہ کہیں کوئی جگہ چڑہنے اُترنے کی بلجائے مگر بیکار۔ پھاٹک سے لگے تینوں اندر باہر کھڑے روتے تھے اور کچھ نہ کرسکتے تھے۔ سُورج سر پر آنے لگا تو شہزادی نے ہمت کرکے بادشاہ اور بادشاہ بیگم سے کہا کہ "حضور اب خیر سے سدھاریں۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑیں۔ حضور کے اب یہاں ٹھیرنے میں سراسر نقصان بلکہ جانوں کا زیان ہے۔ کوئی دم جاتا ہے کہ آسمان یہاں آگ برسائے گا۔ اور زمین شعلے اُگلے گی۔ ابھی وقت ہے۔ اور اُمید بھی کہ اللہ آپکو خیر سے اپنی ولایت میں پہونچا دے۔ وہاں سے آپ میرے لئے بھی بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ میں یہاں بہرحال ایک مکان میں ہوں۔ باغ میں کھانے پینے کو کچھ مل ہی جائے گا" ماں باپ کا جی نہ چاہتا تھا۔ کہ لختِ جگر بیٹی کو یوں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر کرتے کیا۔ اپنی مجبوری اور بیٹی کے اصرار سے وہ روتے دھوتے وہاں سے چلے کہ شاید کوئی راستہ مل جائے اور وہ اپنے شہر میں پہونچ جائیں تو بیٹی کی رہائی کی کوئی تدبیر کریں۔

ماں باپ کے رُخصت ہونے پر شہزادی پہلے تو بہت روئی پیٹی۔ پھر سوچی جو پڑی ہے بُھگتنی ہی پڑیگی چلو دیکھیں تو یہ باغ کیسا ہے۔ اور حال اس کا کیا ہے۔ چل پھر دیکھا۔ تو سمجھی یہ کوئی شاہی قلعہ اور شاہی باغ ہے۔ اندر اس کے بڑی سی محل سرا ہے۔ دونوں پہلوؤں میں اس کے تمام شاہی کارخانے موجود ہیں۔ جو ہر قسم کے ساز و سامان اور ضروریات زندگی سے بھرپور ہیں۔ اور پھر ہر چیز نئی اور تازہ ہے۔ مگر میر سامان و سربراہ کار بلکہ جاندار وہاں کوئی نہیں ہے۔ یا سب تھے اور پتھر کے ہوگئے ہیں۔ یہ دیکھ دیکھ کر وہ حیران تھی کہ الہٰی یہ ماجرا کیا ہے میں جاگ رہی ہوں یا خواب دیکھ رہی ہوں یا دیوانی ہوگئی ہوں۔ یونہی پھرتی پھراتی وہ ایوان خوابگاہ میں پہونچی اور سہم کر رہ گئی۔ دیکھتی کیا ہے۔ ایک نوجوان شاہانہ شکل و صورت کا ایک زرنگار مسہری پر لیٹا ہے اور بدن اُس کا سارا سوئیوں سے بندھا ہے۔ بہت دیر تک سہمی ہوئی اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ڈرتی ڈرتی آگے بڑھی۔ آپ ہی آپ زور زور سے باتیں کرنے لگی۔ پاؤں سے دھم دھم کیا۔ کہ سونے والا جاگ اُٹھے مگر بیداری کی کوئی علامت نہ پائی۔ سمجھی مر چکا ہے۔ کان دل سے لگا کر سُنا۔ تو معلوم ہوا زندہ ہے مگر سکتہ ہے۔ اللہ نے اُس کے دل میں رحم ڈالا۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ آؤ اس غریب کی سوئیاں نکالیں شاید زندہ ہو جائے۔ اجر نہ سہی نیکی تو کہیں نہیں گئی ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے سوئیاں نکالنی شروع کیں۔ لیکن یہ کوئی دو چار پہر کا کام نہ تھا۔ اس لئے وہ روز سوئیاں نکالتی تھک جاتی تو باغ کی سیر کرتی۔ کھاتی پیتی اور آرام کرتی۔ ایکدن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ محلسرا کی چھت پر کھڑی ہوا کھا رہی تھی۔ دیکھتی کیا ہے۔ کہ ایک قافلہ بردہ فروشوں کا زیرِ دیوار قلعہ ٹھیرا ہوا ہے۔ اس نے ایک بردہ فروش سے بات چیت کرکے ایک ملوک سی لونڈی خرید لی۔ یوں تنہائی کا بھی غم غلط ہوگیا۔ مگر سونے والے کی سوئیاں خود ہی نکالتی تھی۔ کیونکہ رفتہ رفتہ رحم کی جگہ اب اس کے دل میں محبت نے لے لی تھی۔ آخر شدہ شدہ وہ دن آیا۔ کہ سونے والے کی صرف آنکھوں کی

سوئیاں رہ گئیں۔ شاہزادی نے دل میں کہا اب بات ہی کیا ہے۔ آؤ پہلے ذرا نہالیں پھر یہ سوئیاں نکالیں گے۔ لونڈی کو خوابگاہ میں چھوڑا اور خود حمام میں چلی گئی۔ بیٹھے بیٹھے لونڈی کے جی میں آئی۔ یہ سوئیاں میں ہی کیوں نہ نکال دوں۔ ابھی شہزادی نہا دھو کر آنے نہ پائی تھی۔ کہ لونڈی نے سونے والے کی آنکھوں کی سوئیاں نکالدیں۔ سوئیوں کا نکالنا تھا کہ سونے والا کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اور اُس نے لونڈی سے پوچھا تم کون ؟ کہا حضور کی خدمتگار لونڈی۔ اُس نے کہا اب تم خدمتگار نہیں ہو تمہارا خدمتگار ہوں۔ تم نے مجھے مُردہ سے زندہ کیا ہے۔ دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ شہزادی بھی نہا دھو کر آ گئی۔ نوجوان نے لونڈی سے پوچھا یہ کون ہیں ؟ لونڈی نے جواب بیگم۔ بنا چاہتی تھی ناک مُنہ چڑھا کر جواب دیا۔ میری بندور ہے۔ شہزادی کے دل میں ایک برچھی سی لگی اور کلیجہ سے پار ہو گئی۔ وہیں سے وہ اُلٹے پاؤں پھری۔ اور پھر اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ یہ جوان جس کا حال تم نے سُنا ایک شہزادہ اور اپنے باپ کا ولی عہد تھا۔ اور یہ باغ و قلعہ دارالسلطنت تھے اور اس کا خاص رمنہ تھا۔ کبھی کبھی وہاں جاتا اور تنہائی کا لُطف اُٹھاتا۔ ماں اس کی سوتیلی تھی۔ اس کو دیکھ دیکھ کر جلتی اور اُس کا ولی عہد سلطنت ہونا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اِس پہ اُس نے جادو کے زور سے شہزادے اور اس کے رفقا کا یہ حال بنا دیا تھا۔ اب جو شہزادہ اچھا ہوا تو اس کے سارے دوست اور نوکر چاکر بھی جو پتھر کے ہو گئے تھے زندہ ہو گئے۔ اور سارے کارخانوں کی سربراہی ہونے لگی۔ اور لونڈی بیگم بن بیٹھی اور نابکار نے شہزادی کو حکم دیا کہ صبح و شام کو کوّے باغ میں آ کر کائیں کائیں کرتے شور مچا کر ہمارے آرام میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ تم ان کو دن کو اُڑایا کرو۔ خبردار غفلت نہ ہو۔ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ اب تم کچھ دنوں شہزادی کو کوّے اُڑانے اور اپنی غلطی کا خمیازہ اُٹھانے دو اور یہ دیکھو کہ لونڈی اب اپنے کئے کی کیا سزا پاتی ہے۔ خُدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

شہزادہ سوئیوں سے نکلا تو اُس کے دل میں یہ ترنگ آئی کہ باپ کی خدمت میں حاضر ہونیسے پہلے اِدھر اُدھر کا ایک سفر کرے۔ ارادے کی دیر تھی سب تیاریاں ہو گئیں چلتے چلتے شہزادے نے بیگم اور قلعہ والوں سے پوچھا کہ اُن کیلئے سفر سے کیا کیا لائے۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ کگ مار لونڈی کی نوبت آئی تو اُس نے کہا کہ میرے لئے سُن گُڑیوں کا صندوق لائیے گا۔ شہزادہ اچھا کہتا ہوا سوار ہو گیا۔ اب خُدا کا کرنا دیکھو کہ وہ پھرتا پھرتا اُسی شہر میں کیوں نہ جا نکلے جہاں شہزادی کا باپ تھا۔ وہاں سے چلنے کا وقت آیا تو شاہزادہ مع اپنے رفیقوں کے جہاز میں آ کر سوار ہوا۔ ملاحوں نے جہاز کے بادبان کھولے اور لنگر اُٹھایا مگر جہاز کسی طرح نہ چلا۔ جہاز کا کپتان چلّایا۔ جہاز میں کوئی گنہگار جھوٹا آدمی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا ہے۔ آج تم سب جہاز سے اُتر جاؤ۔ جہاز چار دن میں چلے گا۔ جو خطاوار ہے وہ ہمارے جہاز پر نہ آئے۔ اب شہزادے کو یاد آیا کہ کگ مارنی سے ہم نے سن گڑیوں کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اب تک نہیں لی ہیں۔ جہاز سے اُترتے ہی اُس نے شہر کو آدمی دوڑائے شہر میں کسی نے سن گڑیوں کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ قضارا یہ بات کہیں ایک بڑھیا کے کان میں پڑ گئی۔ یہ شاہزادی کی دو دائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سن گڑیوں کا صندوقچہ اس کی شہزادی کے لئے بنا تھا۔ جو گم ہو گیا ہے۔ وہ دوڑی ہوئی بادشاہ بیگم کے پاس پہونچی اور سارا ماجرا بیان کیا۔ بادشاہ بیگم نے سُن گُڑیوں کا صندوقچہ دو دا کے ہاتھ شہزادے کے آدمیوں کو بھجوا دیا اور جاسوس انکے پیچھے لگا دئے۔

شہزادہ سُن گڑیوں کا صندوقچہ لے کر پھر جہاز پر سوار ہوا۔ جہاز اس دفعہ لنگر اُٹھاتے ہی چل پڑا اور شہزادہ چند روز میں اپنے قلعہ میں جا پہونچا، سب کو اُن کی سوغاتیں دیں اور سن گڑیوں کا صندوقچہ گُگ مارنی کے حوالے کیا۔ یہ صندوقچہ طلسمات کا صندوقچہ تھا۔ بادشاہ زادی جب رات کو تنہا ہوتی اپنا صندوقچہ کھولتی اس کے کھُلتے ہی ایک باغ سراپا بہار نمودار ہوتا۔ جاروب کش آکر جھاڑو دیتے۔ سقّے چھڑکاؤ کرتے۔ فراش فرش فروش بچھاتے قنات شامیانے لگاتے بارگاہ نصب کرتے۔ تخت بچھتا، مسندیں لگتیں۔ نقیب ہرکارے گرزبردار چوبدار آ آکر قرینے سے کھڑے ہوتے۔ پیادے۔ سوار۔ سپہ سالار، علما، حکما، فضلا، اطبا، امیروں، امیرزادے۔ وزیر، وزیرزادے اور شہزادے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوتے بادشاہ کی سواری آتی یہ سب کورنش آداب بجا لاتے۔ دربار شروع ہوتا، پریوں کے تخت اُترتے۔ اور ناچ رنگ ہونے لگتا۔ شہزادی یہ تماشہ دیکھتی خوش ہوتی اور اپنا غم بھول جاتی۔ قلعہ میں روز طلسمات کا یہ تماشہ ہونے لگا تو لوگوں کو اس کا پتہ چل گیا خبر شدہ شدہ شہزادے تک پہونچی اس نے لونڈی بیگم سے چرچا کیا۔ لونڈی نے شہزادے کو توجُل دیا۔ اور شاہزادی کو قلعہ سے نکالنے کی تدبیریں کرنے لگی۔ اتنے میں شہزادے نے کہیں سے چھُپ کر یہ تماشا خود جا دیکھا۔ دن ہوا تو اُس نے گُگ مارنی کو اپنے پاس بُلا کر اُس کا سن گڑیوں کا حال پوچھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ وہ شہزادی ہے کیسے وہاں پہونچی۔ اس کی سوئیاں نکالنے میں کتنی مصیبت اُٹھائی۔ اور کس طرح اس کی ایک زرخرید لونڈی آنکھوں کی چار سوئیاں نکال کر بیگم بن بیٹھی ہے۔ اس پر شہزادے کو بڑا غصّہ آیا۔ اُس نے حکم دیا کہ اس نابکار لونڈی کو نھوتے تیروں سے اُڑا دیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور نیکی نیک را بدی بدرا جو ایک مثل ہے پوری ہو کر رہی۔ اتنے میں جاسوسوں نے شہزادی کا حال اُس کے باپ کو جا سُنایا۔ شہزادے کی سوتیلی ماں بھی مرگئی۔ دونوں بادشاہ بیٹی اور بیٹے کی تلاش میں وہاں پہونچے۔ شہزادے اور شہزادی کی شادی ہوئی اور وہ دونوں مُلکوں کے تخت و تاج کے وارث قرار پائے۔

یہ کہانی ظاہر ہے کہ سراسر خرافات ہے۔ لیکن یہ مثل کہ آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں ہیں۔ اسی کہانی سے نکلی ہے۔

(باجازت ڈائریکٹر صاحب دِ تی ریڈیو اسٹیشن) **عبدالرحمٰن**

کسی کی یاد

سوچتا ہوں۔ ریل کا میل جول ہی کتنا؟ آئے۔ بیٹھے۔ ملے جلے۔ چل دئے۔ کوئی کس کس کو یاد رکھے۔ پھر بھی ایک ماجرا چیتے سے نہیں اُترتا۔ بھلائے نہیں بھولتا!

ایک دفعہ آتی گرمی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ میں طوفان میل میں سوار ہوا۔ سیکنڈ کلاس میں میں اور ایک صاحبزادے اور تھے۔ بیس بائیس برس کی عمر۔ تندرست۔ عصری نونہال جن سے مل کر بر ملا کسی کا کہا یاد آیا کہ انسان بھی قدرت کی کیسی کاریگری ہے۔ سونچ بچار میں کتنا اچھا۔ دل کی باتوں میں کتنا اتھاہ۔ چہرے مہرے میں کیسا بھلا۔ چال ڈھال میں کتنا دیدارو۔ کام کاج میں ایسا جیسے کوئی فرشتہ ہو۔ سوجھ بوجھ میں ایسا جیسے کوئی دیوتا ہو۔ دُنیا کا حسن! کائنات کی خوبی!!

ایک سیٹ پر وہ تھے۔ ایک پر میں تھا۔ ریل فرّاٹے بھر رہی تھی۔ پہیّوں سے طبلہ سا بجا رہی تھی۔ جس کی تال میل پر وہ صاحبزادے کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں بھی اخبار دیکھنے لگا۔ نظریں ان حروف پر تھیں:۔

"یہ راجاؤں کی راج نگری۔ یہ بادشاہوں کا تختِ شاہی۔ یہ بیج دھج کی بھولی۔ بہار کی دُنیا۔ یہ علم کا گھر حسن کاری کا گھرانا۔ یہ دولت کا خزانہ۔ انسانیت کا پالنا۔ یہ خطۂ پاک۔ یہ سُکھ کی سیج۔ یہ پیارا وطن۔ یہ ہریالا ہندوستان۔ آہ! آج اگر کچھ ہے تو........"

اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا۔ جس سیٹ پر میں تھا اُس کے اُوپر والے جھولے سے ایک سیمل کی روئی کا رنگین تکیہ گرا۔ اور مجھ سے اخبار چھینتا ہوا نیچے آرہا۔ میں نے حیران ہو کر اُن صاحبزادے کو دیکھا۔ اُنہوں نے مجھے دیکھا۔ پھر وہ جھولے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بھی جھک کے اُوپر جھولے کو دیکھا۔ اس طرح تکا ہوں کا خاصا مثلث بن گیا! کیا دیکھتا ہوں۔ سر پر ایک گلستانِ حیات کھلا ہوا ہے۔ یعنی ایک نوعمر بی صاحبہ پھولوں کا باسی گجرا حمائل کئے ہیں۔ دونوں کہنیاں ٹکی ہوئی ہیں۔ اور ہتھیلیوں پر ٹھوڑی اس طرح رکھ لی ہے جیسے گلدان میں گلاب۔ ان کی آسی مگر مسکراتی آنکھوں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ دیکھ کیا رہی ہیں۔ یوں کہو کہ آنکھوں سے شعر کہہ رہی ہیں! میں نے دیکھا تو اُن کے لبوں پر پھول سی ہنسی کھیل گئی۔ پھر کچھ رک رک کر لجا کر فرمایا۔ معاف کیجئے! مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔ جانے کیوں نہ کہہ سکا۔ اور گھبرا کے اُن صاحبزادے کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ جونہی میں نے اُنہیں دیکھا وہ اُوپر لڑکی کو دیکھنے لگے۔ پہلے مسکرائے پھر باآواز ہنسے۔ لڑکی بھی ہنسنے لگی۔ اور سارے ڈبے میں نقرئی گھنٹیوں کی سی آواز گونج گئی۔ ان دونوں کے ہنسنے سے میں بھی اپنے آپ ہنسنے لگا۔ سچ ہے۔ ہنستوں کے ساتھ دُنیا ہنستی ہے روتے تو کوئی کسی کا ساجھی نہیں!

میں نے اخبار اُٹھایا اور پھر پڑھنے لگا۔ آنکھیں کہیں تھیں، دل کہیں تھا۔ سامنے سے حروف اس طرح غائب ہو ہو

جاتے تھے۔ جیسے سلیٹ پر سے پانی! ادھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔

لڑکا:۔ ہائیں؟! پھر سونے لگیں؟؟!!

لڑکی:۔ جی ہاں! بس آپ کو تو میرے سونے سے دشمنی ہے!!

لڑکا:۔ نہیں جی۔ اب نہ سو۔ دونوں وقت ملنے کو ہیں۔!

یہ کہتا ہوا لڑکا جھولے کے پاس آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور لڑکی کو سونے نہیں دیتا۔ دونوں ہنس رہے ہیں۔ مگر میرے روبرو اخبار ہے۔ ہاں آوازیں سُن رہا ہوں۔ بارے کچھ دیر میں لڑکی کی ہنسی نے ایک جھونٹا سا لیا۔ اور اس کی آواز نچلی سیٹ پر آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ لڑکے نے لڑکی کو جھولے سے اُتار لیا۔ اب کیا تھا۔ ہنسی دل لگی اور بڑھی یہاں تک کہ دونوں کی آوازوں میں وہ بات سُنائی دینے لگی۔ جو بیحد گُدگُدی کے سے اثر سے پیدا ہوتی ہے میں نے اخبار طے کیا۔ چاہا کہ جنگل کی سیر کروں۔ تو ان پر بھی نظر پڑی۔ مجھے اخبار طے کرتا دیکھ کر لڑکا تو انجان ہو گیا۔ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی نیچی نظروں ہو بیٹھی۔ خیال آیا ہو گا۔ دیر سے اودھم مچا رکھی ہے۔ شاید میں ان سے کچھ کہونگا۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا۔

لڑکی کا سولہ سترہ کا سن ہے۔ اور اس میں اک آن ہے جو بیان نہیں ہو سکتی۔ اس پیکرِ حُسن کو دیکھ کر بیک نظر مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ صحت و جوانی کا سنجوگ ہو رہا ہے! لباس ہلکے رنگ کا سیدھا سادہ ہے۔ بُشرے پر رنگِ شفق کھیلتا ہے۔ دونوں ہونٹ دانتوں میں دبائے ہیں کہ ہنسی نہ آئے۔ کانوں میں یاقوت کا ایک ایک آویزہ ہے' ہاتھوں میں ہیرے کی ایک ایک جڑاؤ چوڑی ہے۔ بال سُنہرے ہیں لانبے ہیں۔ روکھے ہیں اور کمر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ جنہیں گردن کے پاس ایک کاسنی ربن نے شیرازہ کیا ہے۔ گویا دُم دار تارا زمین پر نکلا ہے! چھوٹی چھوٹی زلفیں ہوا سے مُنہ پر آ جاتی ہیں۔ انہیں بڑے اَنیلے پن سے ہٹایا جاتا ہے۔ اُس وقت ترچھی نظروں مجھے بھی دیکھ لیا جاتا ہے! مگر میں کھڑکی میں سے جنگل کا تماشا دیکھنے لگا۔ میرا مُنہ پھرنا تھا کہ ان دونوں نے مل کر ہنسی کا پھر ایک بمب سر کیا۔ جو دیر تک گونجتا رہا۔ ہنسی مُتعدی شے ہے۔ ایک کے ہنسنے سے دوسرے کو بھی ہنسنے کی چھیڑ ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہنستے تو مجھ پر بھی انبساط کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اب کے بھی یہی ہوا۔ اور اپنے آپ سارا جنگل سرور میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا۔

معلوم ہوا کہ ہرے بھرے جھاڑ۔۔۔ اُونچے نیچے پہاڑ۔ پھُولتی شفق۔ نکلتا چاند بھی ان دونوں کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔ اور ان کی خوشیوں کو دیکھنے ساتھ ساتھ ہیں۔ ریل فراٹے بھرتی چلی جا رہی ہے۔ جنگل بیابان میں کبھی جانور دکھائی دیتے۔ یہ چیکارے ہیں۔ یہ نیل گائیں ہیں۔ وہ ہرن چوکڑیاں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ڈار کی ڈار ابھی ابھی سرپٹ بھاگ رہی تھی کہ ابھی رُک گئی۔ مڑ کر ریل کو دیکھنے لگی۔ پھر یکایک بھاگنے لگی۔ کہیں دامنِ کوہ میں جھونپڑیاں ہیں جن سے بھورا بھورا دھواں اُونچا ہو رہا ہے۔ کہیں سُہانے کھیت ہیں۔ جن کے پاس گاؤں کی معصوم گُجریاں سروں پر ٹوکرے۔ گودوں میں بچے لئے کھڑی ہیں۔ چہروں پر ہنسی ہے۔ آنکھوں میں حیرت۔ اہیں دیکھتی ہیں کہیں

کسان کاندھے پر ہل رکھے جاتا ہے۔ آگے آگے بیل ہیں پیچھے پیچھے گھر والی لکڑیوں کا گٹھر اُٹھائے ہے۔ لوگ انہیں جو چاہے کہیں۔ یہ قدرت کا دہنا ہاتھ ہیں جن کی بدولت دُنیا پلتی ہے! یہ اور ایسے بیسیوں سین آتے جاتے تھے۔ ایک سینما سا ہو رہا تھا کہ اتنے میں انجن سے دھوئیں کے کالے کالے بادل اُٹھے۔ اور آن کی آن میں پھیل گئے۔ پھر یہ دُھواں ایک سمت میں سمٹ گیا۔ اور دور اُفق پر سیاہ پٹی بن کر ہچکولے کھانے لگا!

چلتے چلتے ریل نے ایکا ایکی سیٹی دی۔ پھر ایسا دھماکہ ہوا جیسے کسی نے دو چار توپیں ملا کر داغ دیں۔ تھا یہ کہ ایک دوسرا میل گزر رہا تھا۔ کچھ دیر چل کر ریل نے پھر سیٹی دی۔ لڑکی نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں کہ پھر کوئی میل نہ گزرتا ہو! مگر اب کے میل کی جگہ اسٹیشن کی روشنیاں نظر آئیں جو دُور سے لال سبز تارے معلوم ہوتی تھیں۔ کچھ دیر سے یہ دونوں میری طرف والی ایک کھڑکی میں آکر سیر دیکھ رہے تھے۔ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ ان میں علم کی بُردباری بھی ہے۔ ذوق کی چاشنی بھی ہو۔ خیر شدہ شدہ اسٹیشن قریب ہوا ریل کی دوڑ بھی کم ہوئی۔ پھر اس کے پہیوں سے ایسی آواز آئی۔ جیسے طبلہ کا بندھا ہوا ٹھیکہ بج رہا تھا کہ دفعتہً ٹکڑے بجنے لگے! آخر گاڑی اسٹیشن پہنچ گئی۔ قلی قلی کی آوازیں سُنائی دیں۔ اور مسافروں کی ایک ہلڑ مچ گئی۔ مگر یہاں گاڑی زیادہ نہیں ٹھیری۔ کوئی دم میں چلنے کو ہی تھی۔ ایک بڑی بی ہانپتی کانپتی ڈبہ کی طرف آتی دکھائی دیں۔ نو دس برس کا ایک ممولا لڑکا اُن کا ہاتھ تھامے تھا۔ گویا زندگی موت کو سہارا دئے تھی!

لڑکی نے بڑی بی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کے ساتھ جو اچھا برتاؤ کیا۔ سچ پوچھو تو وہ وہی بہو بیٹیاں کر سکتی ہیں جن کی تعلیم بھی اچھی ہو۔ تربیت بھی اچھی ہو۔ ورنہ ایک بے تربیت کی تعلیم کے تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ مرد ہو تو مرغے کی طرح اکڑا اکڑا پھرے۔ عورت ہو تو ناک چوٹی گرفتار ہو جائے! اچھا ایسے بداطوار کو اتفاق سے کبھی ولایت کی بھی ہوا زدگی ہو جاتی ہے تو سمجھو اس پر پوری ساڑھ ستی آجاتی ہے!!

غریب پھر نہ آدمی کو آدمی سمجھتا ہے۔ نہ باپ کو باپ کہتا ہے! ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ لڑکی نے بڑی بی کو اپنا ہی بڑا سمجھا۔ ذرا غیریت نہیں برتی۔ حالانکہ بڑی بی یورپین تھیں۔ جن سے یہ دونوں انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکا لڑکی میاں اور بیوی ہیں۔ لڑکی سُسرال سے میکے جا رہی ہے۔ اس بات سے اور جی خوش ہوا۔ اور ان کی ہنسی دل لگی مجھے بڑی پُر معنی نظر آنے لگی۔ کیونکہ اچھی لڑکی سے کہیں زیادہ میری دانست میں وہ اب اچھی بیوی تھی۔ اور اچھی بیوی شوہر کا سُکھ چین اور سماج کی ایسی برکت ہوتی ہے جو خوشیاں بڑھاتی ہے۔ تو رنجوریاں چھانٹ دیتی ہے! اس لئے ان دونوں کی زندگی مجھے سر تا سر اک تبسّم حیات معلوم ہوئی۔ اب جتنا سوچتا تھا مجھ پر روشن ہوتا جاتا تھا کہ ان کی باتیں ان کے معصوم دماغوں کا کام ہیں تو ان کے کام ان پیارے دلوں کی باتیں ہیں!

شام سے رات ہوئی۔ جنگل جنگل چاندنی چٹکی۔ ریل بے تحاشا بھاگ رہی ہے۔ اس وقت دودھ سی چاندنی میں تارے ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے سفید سفید چونے میں پانی کی ٹکیاں ہوں! یہی حال زمین پر جگنوؤں کا ہو۔ یہ سب کچھ ہے مگر

مجھے جمائیاں آنے لگیں - وجہ یہ ہے کہ میں ایک دوست کی شادی سے واپس ہو رہا ہوں - دو راتوں سے بالکل نہیں سویا۔ بہتیرا چاہتا ہوں کہ نہ سوؤں - انہیں کی باتیں سُنتے جاؤں - انہیں کی خوشیاں دیکھے جاؤں - مگر یہ بس کی بات نہ تھی - آخر دل نے کہا لیٹ جا - لیٹ کے بھی تو باتیں سُن سکتا ہے! مگر یہ دل کا کہنا نہ تھا - ظلمِ نیند نے پھسلایا تھا - نیند! ماما والی قدرت کی ٹھنڈی کوک - میٹھی گود! جس کے سُکھ کی سیج قطبین میں پھیلی ہوئی ہے!! ہائے! میں دل کے کہنے میں آگیا - اِدھر لیٹا، اُدھر سوگیا - مگر کیا معلوم تھا کہ سوتے میں انسان جاگتے سے بھی بڑا چڑھا بن جاتا ہے - تن کی نیند من کو جگا دیتی ہے اسی لئے شاید سچ مچ کی باتوں سے خواب کی باتیں پیاری ہوتی ہیں!

خیر میں سوگیا - گو دو روز سے نیند نہ تھی - چاہیئے تھا - بے خبر سو جاتا - مگر ریل کا یہ ماجرا روح کو بھی کچھ ایسا بھاگیا کہ وہ بھی نت نئی نظروں اسے دیکھنے لگی - اس کی آنکھوں دیکھی بھی ایک بات سُناتا ہوں - سوتے سوتے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دن دئے جو جنگل دیکھے تھے - ان میں کا ایک جنگل ہے - جس میں بڑی ساری جھیل ہے - جہاں کہیں کہیں کنول کھلے ہوتے ہیں - رات کا پچھلا پہر ہے - آسمان پر کچھ کچھ چاند کی مُسکراہٹ بھی کھیل رہی ہے - چوطرف سنّاٹے کا عالم ہے - جسکو دیکھنے والیاں یا تو وہ روپہلی مچھلیاں ہیں جو کبھی کبھی پانی پر تڑپ جاتی ہیں - یا وہ اکیلا راج ہنس ہے - جو لب آب گردن جھکائے ایک ٹانگ پر چُپ چاپ کھڑا ہے! اس وقت جھیل میں آسمان کا ایسا عکس پڑ رہا ہے - گویا زمین پر آسمان اُتر آیا ہے - یہیں جھیل میں چھوٹے بڑے دو روشن "تارے" پاس پاس نظر آ رہے ہیں - جنہیں دکھا کر کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ دیکھو! یہ پاک روحیں اُنہیں ریل والے میاں بیوی کی ہیں۔

رُوح کی دو باتوں میں اپنے کئی گھنٹے لگ گئے - خدا جانے میں ابھی کتنا اور سوتا کہ معلوم ہوا مجھ پر تکیوں کی بارش ہونے لگی - مگر ابھی ایک ہی تکیہ برسا تھا کہ میں چونک پڑا - جاگا تو دیکھا - سارا ڈبہ خالی پڑا ہے - سخت حیرانی ہوئی ریل زنّاٹے سے چلی جا رہی تھی - اور ڈبے میں اس وقت دھیمی دھیمی سبز روشنی تھی - کیونکہ برقی کنول پر دھانی ریشم کا حجاب تھا - میں اُٹھا - حجاب کو دُور کیا تو سارا ڈبہ جگمگا گیا - بڑی بی نہیں - جانے کہاں اُتر گئیں - ہاں جیون کے وہ دونوں "تارے" البتہ ایک کونے میں مُنہ چھپائے بیٹھے ہنس رہے تھے - ان کی اس معصوم حرکت نے بڑا مزا دیا - میں نے پھر حجاب کھینچ دیا - ان کے تکیئے کو بیچ والی سیٹ پر رکھ دیا - اور اپنے بستر پر آلیٹا - کچھ دیر میں میری پھر آنکھ لگ گئی - اور اب کے جاگا تو صبح ہو رہی تھی - اس وقت وہ دونوں میاں بیوی سارس کے جوڑے کی طرح پاس پاس بیٹھے تھے - اور حُجت یہ ہو رہی تھی کہ سامنے پہاڑیوں میں جو چاند ڈوب رہا ہے - وہ اچھا ہے - یا مشرق میں دن کی جو نوید نور ہے - وہ بھلی ہے - لڑکی کہہ رہی ہے - آپ میری جگہ ہوتے - تو اس ڈوبتے چاند کا مزا جانتے - اس وقت یہ چاند مجھے چاند تھوڑی معلوم ہو رہا ہے - مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں میکے ہوں - آپ اپنے ہاں ہیں اور آپ کے دھیان میں میں اُداس ٹہل رہی ہوں! لڑکے نے یہ سُنا تو ہنس کر کہا - معاف کیجئے! میں آپ کی جگہ کیوں ہوں؟ خدا نے مجھے مرد بنایا ہے! عورت بن جاؤں!! یا نو! میں ہرگز آپ نہیں بننا چاہتا - میں تو میں ہی رہونگا - اور مشرق کے اس بڑھتے نور کو اپنی اُبھرتی اُمنگوں کا پرچم بناؤنگا! یہ پیاری پیاری حُجت ہو رہی تھی کہ ریل نے

ادب اور زندگی

یہ ایک ایسا عنوان ہے جس پر لکھنے کیلئے اگر قدرت عمر خضری بھی عطا کردے تو ناکافی ہے۔ زندگی ایک ایسی چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ میں ہوتا نہ علیگڈھ ہوتا۔ نہ ہندوستان ہوتا اور نہ یورپ ہوتا اور نہ "کفن دزدان چند" کا مرکز۔ نہ زمین ہوتی نہ آسمان۔ تو پھر کیا ہوتا؟ کوئی کچھ سمجھے مگر بقول غالب اپنا تو اعتقاد یہ ہے کہ "..... کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا" اب غور کیجئے اس زندگی کی طوفان زائیوں اور قیامت آفرینیوں پر۔ دیکھنے میں پانچ مختصر حرف اور عربی اور انگریزی میں محض چار ہی مگر جب تک یہ چاروں حروف علیحدہ علیحدہ تھے تو کچھ بھی نہ تھا۔ تو پھر کیا تھا؟ غالب کہتا ہے "نہ تھا کچھ تو خدا تھا....." آپ بھی کہیئے خدا تھا، بس خدا، ایک خدا۔

اب اس ایک خدا کو ایک دن (اگر ہم اسے دن کہہ سکیں) کچھ خیال آیا۔ اس طرح نہیں جس طرح ہمارے سرور صاحب کو ہم سے ادب اور زندگی پر مضمون لکھوانے کے متعلق آیا۔ خیر تو اسے ایک خیال آیا۔ خیال کے ساتھ ہی ذوق آفرینش نے انگڑائی لی۔ ایسی انگڑائی نہیں جیسی ہماری اس دنیا میں کوئی "جلوہ گر سے آفتِ نظارہ" لیتی ہے۔ ہاں تو اس نے انگڑائی لی، آنکھیں ملیں اور پھر ایک نظر "حیات" کے چاروں حرفوں پر ڈالی جو علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے دُور، کوسوں دور، بے انتہا دور چار سمتوں میں معلق آویزاں تھے۔ نظر کے ساتھ چاروں حرفوں میں قوت انجذاب پیدا ہو گئی۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف کھچنے لگا۔ خود بخود، بالکل بلا ارادہ۔ وہ کھچتے رہے، ایک دوسرے کی طرف یونہی آہستہ آہستہ کھچتے رہے۔ جتنا قریب ہوتے گئے اتنی ہی ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شکل بھی تبدیل ہوتی رہی۔ آخر ایک ایسے پر زور جھٹکے کیساتھ ایک دوسرے سے مل گئے کہ اگر دنیا اسوقت ہوتی تو اس صدمہ سے کانپ کانپ کر منتشر ہو جاتی۔ خیر وہ مل گئے، ایک دوسرے سے متحد ہو گئے اور اب قدرت کی نظروں کے سامنے آدم کھڑا تھا اور ملائکہ اس کے قدموں پر سجود تھے۔

قدرت اپنا نصف کام ختم کر چکی تھی اب اسے مکمل کرنے کے لئے اس نے شعر و موسیقی اور رنگ و بو کے امتزاج سے ایک اور مجسمہ تیار کر کے آدم کے سپرد کر دیا۔ پھر فرشتوں سے فرمایا "اِذہَبُو عبدی"۔ ایک آن کی آن میں آدم و حوا ہماری وسیع زمین پر ناپید اکنار آسمان کی نیلگوں چھت کے نیچے تنہا کھڑے تھے۔ یہاں ہر چیز ویران تھی، مردہ تھی۔ دونوں نے ملکر اس میں زندگی کا رنگ بھرنا شروع کیا۔ اور ایکدن وہ آیا جب یہی بیکس و مجبور آدم خدا سے کہہ رہا تھا کہ "تو کہسار و میدان و راغ آفریدی..... خیابان و گلزار و باغ آفریدم....... تو شب آفریدی چراغ آفریدم"۔

جب تک آدم و حوا محبت و سرمستی کے دور میں رہے انہیں زبان ہلانے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ پیغامات محبت کیلئے الفاظ کی ضرورت نہیں جب کہ محبت بھری نگاہیں اظہار محبت کا بہترین ذریعہ ہیں مگر جب انہیں محبت کی باتوں کے علاوہ کچھ اور باتیں کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے بجائے زبان کے اعضائے جسمانی سے کام لینا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے ان کے ماحول میں مختلف نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا ویسے ہی ویسے انہیں اظہار مطلب میں دقت محسوس ہونے لگی۔ آخر انہوں نے ہر چیز کے نام رکھے۔ جسم کی مختلف حرکات کیلئے لفظ بنائے اور بے تکلف انہیں استعمال کرنے لگے۔ یہاں سے زبان کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان کی اولاد بڑھی اور بڑھ بڑھ کر تمام روئے زمین پر پھیل گئی۔ کچھ آب و ہوا کا اثر، کچھ ماحول کا مقتضیٰ۔ نئے الفاظ بنے، پرانے الفاظ میں تغیر ہوا اور رفتہ رفتہ ایک خطہ کی زبان دوسرے خطہ سے مختلف ہو گئی۔

ابتدا میں ہر شخص انفرادی زندگی کا عادی تھا لیکن رفتہ رفتہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ تمدن کی نشوونما سے وہ ایک دوسرے سے متعلق ہوتے گئے۔ باپ تمام اولاد کا سردار ہوتا تھا اور اولاد اسکا احترام کرتی تھی۔ ایک باپ کی اولاد بڑھتے بڑھتے قبیلہ بن گئی اور اب پورے قبیلہ کا ایک سردار ہونے لگا۔ جب تمدن یہاں تک پہونچ گیا تو وہی زبان جو صرف گفتگو کے کام آتی تھی۔ اسی کو تھوڑا سا آراستہ کر کے لکھنے کے کام میں بھی لانے لگے۔ یہاں سے ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔ جیسے جیسے زندگی کے مشاغر بڑھتے گئے ادب بھی ترقی کرتا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ ہر قوم اور ہر ملک کا جداگانہ ادب بنگیا۔

اس مختصر خاکہ سے ہم آسانی سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ادب بطور زندگی کے نتیجہ کے پیدا ہوا۔ ادب اور زندگی کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور رہیگا۔ اور اب ادب نے وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے کہ زندگی و ادب لازم و ملزوم چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہونچنے کیلئے مجبور ہونگے کہ جس قوم نے ترقی کی اس کے ادب نے بھی ترقی کی اور جس قوم کے ادب کو انحطاط ہوا وہ قوم بھی زوال و پستی کے گڑھے میں جا پڑی۔

اس طرح ہمارے مضمون کے دو خاص حصے ہوتے ہیں۔ (۱) زندگی کا اثر ادب پر اور (۲) ادب کا اثر زندگی پر۔ اور آخر میں دونوں کو مجموعی طور پر لیتے ہوئے ایک حصہ اور بھی ہوتا ہے یعنی ادب میں زندگی کی حقیقت۔ میتھیو آرنلڈ کے نزدیک ادب زندگی کی تنقید و تشریح کا ہی نام ہے۔ اور دنیا کے ہر شاعر نے ہر ادیب نے کسی نہ کسی طرح زندگی کی تشریح کی ہے بعض نے زندگی کو "خواب" کہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہماری یہ دنیاوی زندگی ایک وقفہ ہے سکون و آرام کا منزل کی طرف بڑھنے کیلئے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ زندگی ایک حقیقت ہے خواب نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں۔ یہی دنیا ہماری منزل مقصود ہے۔ موت کے بعد زندگی ختم لیکن کچھ لوگوں کا خیال اس کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ زندگی ہر دم جواں اور ہر وقت رواں ہے۔ یعنی "جوہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں۔ آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں"۔ ان کے نزدیک "موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے"۔ الغرض دنیا کے ادب میں اسی قسم کے مختلف نظریئے پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق زندگی کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اور قطع نظر حیات بعد الممات کے زندگی کی مکمل اور صحیح تشریح میرے نزدیک چکبست کے اس شعر میں ہے کہ "زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب۔ موت کیا ہے؟ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا"۔

اگر دنیا کے ہر ادب میں سے زندگی کے مختلف فلسفوں کے متعلق مثالیں چھانٹی جائیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے۔ لہٰذا اس بحث کو چھوڑ کر آیئے ہم اپنے مضمون کے پہلے دو خاص حصص پر علیحدہ علیحدہ طائرانہ نظر ڈالیں اور محض طائرانہ اس لئے کہ بدقسمتی سمجھیئے یا خوش قسمتی کہ سکندر کی طرح ہم نے بھی آب حیواں کا ایک قطرہ نہیں چکھا ہے۔ سکندر کی تو لوگ کہتے ہیں حضرت خضرؑ سے ملاقات بھی ہو گئی تھی مگر اینجانب تو اس سے بھی محروم ہیں۔ ہاں اقبالؔ کی طرح کبھی کبھی جب بجائے "ساحل دریا" کے ہم چارپائی پر پڑے "پٹی سے حقہ رکھے اور "گوشہ دل میں چھپائے اک جہاں اضطراب" کسی افسانے کا پلاٹ سوچتے یا کوئی شعر موزوں کرتے ہوتے ہیں تو اکثر حضرت خضرؑ معہ اپنی نورانی داڑھی کے تصور کی آنکھ کے سامنے تیزی سے گذرتے نظر آتے ہیں۔ خیر خواہ کچھ ہو ہم صرف طائرانہ ہی نظر ڈالیں گے۔ کیونکہ ہمیں فرصت ہی اتنی دی گئی ہے لہٰذا قبل اس کے کہ میں اصل چیز پیش کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرے پاس صرف "جام سفال" ہے آپ اسے "جام جم" سمجھ کر کہیں اس میں تمام دنیا کا نقشہ نہ دیکھنے لگیں ورنہ آپ کی مایوسی کا میں ذمہ دار نہیں۔

زندگی کا اثر ادب پر:-

ادب پر زندگی کے اثر کا صحیح اندازہ لگانے کیلئے دنیا کی تمام و کمال تاریخ کا جاننا بھی ضروری ہے اور پھر دنیا کی ہر زبان کا تھوڑا بہت علم لازمی ہے لیکن میں بدقسمتی سے ان دونوں سے کورا ہوں۔ ہاں جو کچھ سنا سنایا ہے وہ کچھ یاد ہے۔ سب سے پہلے بلا کسی لحاظ تفوق کے میں انگریزی ادب کو لیتا ہوں۔ ابتدا میں جب اہالیان انگلستان اول درجہ کے وحشی اور غیر مہذب تھے وہاں کا ادب بھی اسی قسم کا تھا جب ان میں صحیح معنوں میں ادب کی ابتدا ہوئی تو اپنی ادبی زبان بجائے مادری زبان کے لاطینی و فرانسیسی مقرر کی۔ روزمرہ کی گفتگو میں وہ اپنی مادری زبان استعمال کرتے تھے لیکن جب کوئی ادیب یا شاعر کوئی مضمون یا شعر لکھتا تو بیرونی زبان استعمال کرتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ روم کی تہذیب اُسوقت جملہ ممالک یورپ پر غالب تھی دوسرے ممالک کسی اچھی بات کیلئے روم کی طرف دیکھتے تھے۔ اور اس کی تقلید کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ لیکن جوں جوں انگریزی قوم میں جذبۂ خودداری پیدا ہوتا گیا وہ اپنی زبان کو لاطینی کے اثر سے پاک کرتے گئے۔ اور آج انکا ادب خالص انہیں کی زبان میں موجود ہے اور روز بروز ترقی کر رہا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ان کی زندگی کا اثر ان کے ادب پر کیا ہوا۔ شروع شروع میں جب مذہب عیسائیت کی ابتدا تھی وہ زیادہ مذہبی قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ اور انکا اسوقت کا ادب بھی زیادہ تر مذہبی ہے۔ وہ یا تو چند مذہبی نظمیں ہیں یا حضرت عیسیٰ اور مختلف ولیوں سے متعلق چند تمثیلیں جو مختلف اوقات میں بقدرے تبدیلی مختلف ناموں سے پکاری جاتی تھیں۔ مثلاً Miracles (معجزات) —— Mysteries اسرار غیب and Moralities واخلاقی تمثیلیں) یہ ڈرامے کلیساؤں میں خود حضرات پادری وغیرہ ادا کرتے تھے۔ اور اسطرح انجیل مقدس جو لاطینی زبان میں تھی اور عوام نہ سمجھتے تھے۔ اسے اپنے حرکات و سکنات سے عوام کو سمجھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگ مذہبی سے دنیادار بنتے گئے اور اسی کے ساتھ ان کے ادب میں دنیاداری کا عنصر شامل ہونے لگا۔ اب وہ مذہب و تاریخ کے ساتھ ساتھ تفریح بھی چاہتے تھے تو ڈراموں میں ان کی تفریح کیلئے بھی سامان مہیا کئے جانے لگے۔ جیسے جیسے ان کی معاشرت، ان کے رجحانات بدلتے رہے ویسے ہی ویسے انکا ادب بھی تبدیل ہوتا رہا۔ اور آخر ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ میں جب انگلستان کی سیاسی طاقت سب سے بڑھ گئی ان میں جذبۂ غرور و خودداری بھی اسیقدر بڑھ گیا۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کی نقل و تقلید بھی انہیں اپنی توہین معلوم ہونے لگی۔ اور شیکسپیئر نے ڈرامہ کو تمام بیرونی اثرات سے پاک و صاف کر کے بالکل وطنی و قومی بنا دیا۔ اب

اس زمانہ میں جب شیکسپیئر عرفانی نام حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہاں کے باشندے جس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے اس کے ڈراموں سے ظاہر ہے وہ لوگ خوں ریزی، تلوار بازی، جنگ و جدل، شور و غل کے عادی تھے اور انکی اس طرز زندگی کا اثر ڈراموں پر یہ پڑا کہ شیکسپیئر نے ان کے مذاق کے مطابق کافی سامان مہیا کر دیا۔ "سیزر"، "انطونی و کلیوپٹرا"، "ہیملٹ"، "اوتھیلو"، "کنگ لیئر" اور "کوریولانس" وغیرہ ڈراموں میں جن خونریزیوں اور ہولناکیوں کو دیکھکر ہم آج لرز جاتے ہیں وہ اسوقت کے لوگوں کیلئے بالکل معمولی شے تھیں۔ اور بغیر اس کے انہیں لطف ہی نہ آسکتا تھا۔ دوسری طرف لوگ ظرافت و مزاح کو پسند کرتے تھے تو اس کے لئے ابتدا کے ڈراموں میں اور بعد کے ڈراموں میں مسخرہ ڈرامہ کا ایک جز و بنگیا تھا۔ اس زمانے کے عوام اکثر و بیشتر گندے، متعفن اور شور پسند ہوتے تھے شیکسپیئر کے ڈراموں میں جا بجا اسکا تذکرہ ملے گا۔ بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں میں صرف شیکسپیئر ہی ایک ایسا شخص ہے کہ خود جس کی زندگی کا اثر اس کے ادب پر نمایاں نہیں ہے۔ ورنہ ہر ایک کی زندگی کا اثر کچھ نہ کچھ اس کے ادب پر ضرور پایا جاتا ہے۔

شیکسپیئر کے بعد دوسرا مشہور شاعر ملٹن ہے۔ ملٹن کی زندگی عموماً ایک تنہا کمرہ میں کتابوں کے درمیان گزری۔ اور اسی کی وجہ سے وہ آنکھوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی اس تنہائی پسندی اور کتابوں کا کیڑا بنے رہنے کا اثر اس کے ادب میں صاف نمایاں ہے۔ جب وہ کمرے سے باہر کی چیزوں کا حال لکھتا ہے تو اکثر نفسیاتی اور بعض اوقات واقعات کی غلطی کر جاتا ہے۔ دوسرے اس کی خانگی زندگی کبھی کامیاب اور خوشگوار نہیں گزری۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے تمام کلام میں صحیح اور سچی محبت کا کہیں تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ تیسرے اس کی زندگی تنہائی پسندی کیوجہ سے خشک اور بکیف تھی اسی طرح اس کے کلام میں بھی متشائم کیفیت پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد ورڈسورتھ آتا ہے۔ یہ عجیب و غریب قسم کا شخص تھا۔ ہر وقت مرغزاروں اور آبشاروں کی سیر اور شاہد فطرت سے حقیقی عشق۔ اسکا دماغ فلسفیانہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کی زیادہ تر شاعری محض فلسفیانہ بحث بنگئی ہے اور حقیقی شاعری سے کوسوں دور جا پڑی ہے۔ لیکن جہاں اسکا شعر حقیقی شعر ہے وہ ہمیں بھی اپنی طرح حسن فطرت میں گم کر دیتا ہے۔ کھو دیتا ہے اور پھر ہر طرف حسن فطرت ہی فطرت رہجاتا ہے۔ اس نے انقلاب فرانس کا خوشگوار آغاز اور خوں ریز انجام اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لہذا اسکا دل مایوسی کیوجہ سے غمگین تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں اس الم ناکی کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس کے بعد شیلے ہے۔ یہ قسمت کا ستایا ہوا مظلوم، زمانہ کا جلایا ہوا ستم کش۔ اور اپنے وطن کا ٹھکرایا ہوا بیکس و مجبور شاعر ایک عجیب و غریب دل و دماغ لیکر آیا تھا۔ اور اگر اس پر زمانہ مصائب نہ توڑتا تو وہ دور انبساط و نہضت کا ایک بلند نظر پیغمبر ہوتا۔ پھر بھی اس کا وہ کلام جو خود اس کی ذات سے تعلق نہیں رکھتا امید افزا اور مسرت آمیز ہے۔ ہاں جب اس نے خود کے متعلق کچھ لکھا ہے تو ہر حرف سے غمگینی اور الم ناکی ٹپکتی ہے۔ I fall upon the thorns of life, I bleed. (میں زندگی کے خارستان میں الجھ گیا ہوں اور میری رگ رگ خونچکاں ہے) میں نے اپنی زندگی کی تمام اندوہناکیاں اور رنج و غم کی وہ تمام اذیتیں جو اس نے گذاری تھیں پیش کر دی ہیں۔ دوسری طرف انقلاب فرانس اس وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ اور جو تین پسندیدہ اور خوشگوار اصول اس کے محرک تھے اب صرف وہی شیلے کے کانوں نے سنے اور محض ان اصولوں کو دیکھکر انقلاب کی طرف سے کسی کو بدگماں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شیلے نے اس طوفان خون اور سیلاب و زندگی کو نہیں دیکھا تھا اس لئے برخلاف ورڈسورتھ کے اس کے کلام میں غمگینی اور مایوسی کی جھلک نہیں پائی جاتی۔ وہ حقیقی حسن کا متلاشی تھا۔ محدود حسن سے اس کی تسلی نہ ہو سکتی تھی۔ وہ جس حسین عورت کو دیکھتا اس طرف راغب ہو جاتا۔ وہ ایک ایسا حسن چاہتا تھا جس سے افلاطونی یعنی بالکل بے غرض محبت کی جاسکے۔ اس نے ایک مجسمہ حقیقی حسن کا اپنے تصور میں بنا لیا تھا اور ہمیشہ اسی کا متلاشی رہا۔ اس کی جستجو ایک ایسی ناممکن الحصول شے کیلئے تھی جسکا علاج سوا موت کے کوئی نہ کر سکتا تھا۔ اور آخر بروقت موت نے اس کی چارہ گری کی۔ اور ان مصائب سے اسکا پیچھا چھڑا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری تخئیلی اور آسمانی ہے۔ اس نے اپنی دنیا زمین سے دور اور زہرہ و مشتری کے قریب بنائی تھی۔ تخئیلی کے پرو پر وہ ہمیشہ فضا میں پرواز کرتا رہتا ہے اور یہ اثرات اس کے تمام کلام میں پائے جاتے ہیں۔

کیٹس کی زندگی یونانی علم الاصنام سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی اور اس کے اثرات اس کے کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ناکام محبت تھا اسلئے محض حسن و عشق کے نغمے گاتا ہے۔ حسن اس کے نزدیک ایک "دوامی مسرت" ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے Beauty is truth, truth beauty, that is all ye know on earth... and ye need to know (حسن ہی صداقت ہے اور صداقت حسن۔ صرف یہی تم دنیا میں جانتے ہو اور اتنا ہی جاننے کی ضرورت ہے) یہ صرف اسکا خیال ہی خیال نہیں تھا بلکہ عملی زندگی میں اس کا اعتقاد بھی یہی تھا۔

ٹینی سن، تنظیم و سادگی کا دلدادہ۔ ماضی و مستقبل سے بے نیاز صرف حال کا گرویدہ۔ یہ اس کی زندگی کی چند نمایاں خصوصیات تھیں۔ لہذا اس کی شاعری

بھی ان تمام خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ اس کی زبان سادہ ہے۔ اشعار میں نغم و موسیقی سب سے زیادہ ہے۔ نظموں کے موضوع ہمیشہ عام اور معمولی اختیار کرتا ہے۔ اسلئے کہ اب تمدن و معاشرت میں۔ تہذیب و سماج میں عوام امرا کے مقابلہ میں طاقت اور اثر حاصل کر چکے تھے۔ اور اسوقت کی تہذیب و معاشرت کا اثر نہ محض ٹینی سن کے کلام بلکہ اس کے دور کے ہر قسم کے ادب پر نمایاں ہے۔

براؤننگ ان تمام شعرا میں سب سے زیادہ با امید او مسرور رہنے کا عادی تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ ہر بدی کا خاتمہ نیکی پر ہوتا ہے۔ عارضی تکالیف کی وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ مدت تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن وہ تمام تنقیدوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام کئے گیا اور آخر اس کو آج دنیا مشاہیر شعرا میں شمار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس کی یہی عادت ہے جس نے اس سے لکھوایا کہ

(کوشش کرو اور محنت کو عارضی او معمولی سمجھو۔ Strive, and hold cheap the strain
بڑھو اور مصیبت کا خیال نکرو۔ جھپٹو Learn, nor account the pang; dare
غم والم کی بغیر پرواکئے ہوئے) Never grudge the throe!

اس کی دلیری اور جوان ہمتی موت کے وقت بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ خاموشی سے بلا چون و چرا خود کو موت کے قبضہ میں نہیں دینا چاہتا۔

میں ہمیشہ ایک جنگجو رہا ہوں۔ لہذا ایک جنگ I was ever a fighter, so— one fight more,
(سب سے آخری اور بہترین جنگ اور سہی) The best and the last.

الغرض ان تمام شعرا کے کلام میں ان کی زندگی کے علاوہ اسی طرح ہم انکی ہم عصر زندگی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اٹھارویں صدی میں امرا و سرمایہ داروں کا زور تھا۔ نئے نئے زیور قیمتی سامان آرائش مروج تھے۔ اسٹورٹ باز آمد کے وقت سے جو آزادیاں، عریانیاں اور عیاشیاں شروع ہو گئی تھیں انکا ردعمل ہو رہا تھا۔ اس کا اثر اس صدی کے ادب پر بھی ہوا۔ یعنی نظموں کا موضوع عام نہیں ہوتا تھا۔ شاعری میں صنائع و بدائع کی کثرت سے آرائش کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس پر نئے نئے قیود لگائے گئے تھے۔ روزمرہ کے الفاظ شعرا میں استعمال کرنا ممنوع تھا۔ اس قسم کے اثرات تھے جو اسوقت کے ادب پر آجتک نمایاں ہیں۔ اس کے بعد فوراً اسکا ردعمل شروع ہوا۔ عوام کی طاقت و عزت کچھ بڑھ گئی۔ قیود سے لوگ گھبرا اٹھے اور گولڈ اسمتھ جو اٹھارویں صدی ہی کا شاعر ہے وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے درمیان ایک پل ہے اس کا شروع کا کلام بالکل پوپ کے تتبع میں ہے لیکن آخری کلام میں اس انقلاب کا اثر جو انگلستان میں ہو رہا تھا کافی جھلکتا ہے۔ اس کی نظم "ویراں گاؤں" اس کی شاہد ہے۔ اسوقت اون کی تجارت بڑھ رہی تھی۔ کاشت کی زمین چراگاہوں میں تبدیل ہو رہی تھی اور غریب کاشتکاروں کو ان کے گھروں سے کان پکڑ کر نکالا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ آپ کو "ویراں شدہ گاؤں" میں ملیگا۔ اس کے بعد ورڈسورتھ اس ردعمل کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور قیود سے آزادی کے سلسلہ میں وہ اس انتہائی نقطہ تک پہونچ گیا کہ اس کی بہت سی شاعری محض مقفیٰ نثر رہ گئی اور شعریت کھو بیٹھی۔ تھوڑے دن ادب اسی انداز پر چلتا رہا کہ آخر براؤننگ نے بالکل نیا انداز اختیار کیا جو باعتبار ماحول تھوڑے دن بالکل غیر دلچسپ بنا رہا لیکن رفتہ رفتہ لوگ اس کے عادی بنگئے۔

میں نے زیادہ تر انگریزی شعرا سے بحث کی ہے بالکل یہی حال انگریزی نثر کا بھی ہے۔ تہذیب و معاشرت اور تاریخ و تمدن نے بالکل اسی طرح نثر کو بھی متاثر کیا۔ جس دور میں جو ناول، افسانے اور مضامین لکھے گئے ان میں اپنے مخصوص دور کے اثرات اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہاں پر ضروری تھا کہ میں ہر مصنف کی تصانیف لیکر بحث کرتا بخوف طوالت احتراز کرتا ہوں کیونکہ ابھی لکھنا بہت ہے اور وقت کم۔

المختصر الیزبتھ کا دور اور اس کے بعد اٹھارویں صدی کے ادب کو اگر ہم بغور دیکھیں تو اس زمانہ کی زندگی کا اثر اس میں نمایاں پائیں گے۔ یہ دور دولت و آرام عیش و سرمستی کا دور تھا۔ بے فکری تھی خوشیاں تھیں دولت تھی اور عیش تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ کہ اس زندگی میں ہر طرف دلچسپی ہی دلچسپی تھی۔ مسرت ہی مسرت تھی۔ اسلئے اس زمانہ کا ادب تمام کا تمام "رجائی" ہے اس کے بعد جب سائنس کی ابتدا ہوئی تو مذہبی اعتقادات کمزور ہو گئے اور لوگ مذہب و سائنس کے درمیان بھٹکنے لگے۔ مذہب پر یقین کمزور ہو چکا تھا اور سائنس پر پختہ نہیں ہوا تھا۔ ٹینی سن اور میتھو آرنلڈ کے ادب میں یہ شک و شبہ صاف جھلکتا ہے اس کے بعد جب سائنس کی فتح مکمل ہو گئی۔ مذہب کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ خدا کے وجود میں بھی شک کیا جانے لگا ورنہ کم از کم اسکا تصور بجائے ایک رحیم و کریم طاقت کے ایک قہار و جبار طاقت سے ہونے لگا۔ جو تفریحاً انسانی زندگی کو دست بگریباں دیکھتی۔ تالیاں بجاتی اور خوش ہوتی ہے۔ اس کا اثر ہارڈی کے تمام ناولوں میں نمایاں ہے وہ پکا دہریہ ہے اور زندگی کے متعلق اس کا نظریہ متشائم ہے۔ موجودہ دور کا تمام ادب حال کی طرز زندگی کا صحیح مرقع ہے۔

یہ تو رہا انگریزی ادب۔ اب آیئے دیکھیں کہ فارسی ادب پر زندگی کا کیا اثر ہوا۔ جب مسلمان عرب کے ریگستان سے اٹھکر ایک طوفان کی طرح تمام ایشیا پر چھا گئے۔ ہر جگہ ان کی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ ہر جگہ ان کی تہذیب پھیل گئی۔ ہر ملک کا پرانا مذہب اسلام سے تبدیل ہو گیا۔ تاہم آبائی تمدن اور مذہبی قدیم اعتقادات بالکل فنا نہیں ہوئے اور ایک دن وہ آیا کہ پرانے اعتقادات نیا لباس پہنکر تصوف کی صورت میں دنیائے اسلام پر چھا گئے ہر ملک میں تصوف کی لہر شروع ہوئی۔ ہر طرف صوفی و خانقاہ کا آوازہ بلند

ہوا۔ وہ لوگ بھی جو خود صوفی نہیں تھے ان خیالات سے متاثر ہوئے اور ارادی یا غیر ارادی طور پر وہ خیالات ان کی زبان سے نکل گئے۔ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی کا قریب قریب تمام ادب تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مولانائے رومؒ تو خود صوفی تھے ان کی تمام مثنوی مسائل تصوف سے مملو ہے۔ حافظؒ کا کلام بھی صوفیانہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اعلان کرتے ہیں کہ

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

غرض اُسوقت کے تمام ادب میں آپ یہی پائینگے کہ "خود کوزہ و خود کوزہ گر خود گل کوزہ"۔ حافظ ہمیشہ ساقی حقیقی سے بادۂ عرفاں مانگتا ہے۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا   کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اور پھر اس بادۂ عرفاں سے مدہوش ہو کر وہ سرور آمیز نغمے گاتا ہے کہ سننے والوں کو بھی بیخود کر دیں۔ خیامؔ تو ہر وقت میکدۂ عرفاں میں کسی خم کے سہارے بیٹھا جام کے جام خالی کرتا رہتا ہے لیکن اس کی سیری نہیں ہوتی۔ اسکا خالی جام ہر وقت ساقی کیطرف بڑھا رہتا ہے اور اس آتش سیال کے خم کے خم خالی کرکے اپنی مخمور زبان سے ایسے شعلے برساتا ہے کہ ہر سننے والے کے دل میں آگ لگا دیں۔

اگر ایک طرف یہ تحریک تصوف تھی تو دوسری طرف شاہانہ عیش و سرمستی بیفکری کا زمانہ تھا۔ حکومت اپنی تھی۔ روٹی پیٹ بھر کے ملتی تھی لہذا "خمار گندم" کا ہونا لازمی۔ اور اسکا نتیجہ تھا مجازی عشق۔ دنیاوی محبت یہانتک تھی کہ سعدیؒ جیسے درویش عش سیاح نے بھی مفلسی اور تمول کے مکالمہ میں تمول کو فتح دلوائی ہے۔ بڑے بڑے شاعر شاندار قصائد پڑھتے اور بادشاہوں سے انعام واکرام حاصل کرتے۔ اس دولت و تعیش کی فراوانی کا تاریک نتیجہ برآمد ہوا۔ بجائے عورتوں کے حسین و خوبصورت لڑکے عشق و محبت کا مرکز بننے لگے اور بڑے بڑے بلند پایہ شعرا نے اس عشق کا اظہار کیا ہے۔ سیکڑوں غزلوں کے دیوان تیار ہو گئے اور اگر آپ ان میں سے ان کے معشوق کا حلیہ چھانٹیں تو آپ کو وہ بہت جگہ میں بھیگتا ہوا "سبز خط" کا مالک ملیگا۔

تیسرا خاص اثر جو ان کے ادب پر نمایاں ہے وہ تشبیہات و استعارات کا زیور ہے۔ دولت کی زیادتی کے ساتھ ان کی زندگی بھی پر تکلف بنگئی تھی وہ آرایش پسند ہو گئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں آپ دور از کار تشبیہات و استعارات کی بھرمار پائینگے۔ ان کے مضامین نظم و نثر لفظی و معنوی صنائع و بدائع سے مملو نظر آئینگے۔ اس کے بعد جیسے جیسے ان کی حکومت کمزور ہوتی گئی ان کے ادب میں بھی انحطاط آتا گیا۔ اب اس میں ابتدا کی سی بلندی اور علو تخئیل نہیں رہا اور آخر جب ان کی طاقت برائے نام رہگئی تو حساس دل اور دور اندیش نظر نے اسے دیکھا اور کرب و اذیت سے ایک دم چلا اٹھی کہ "درد ایراں بے دوا ست"۔ اب ان کا ادب گل و بلبل سے ہٹکر سیاسیات پر آگیا۔ اب شخصی حکومتیں رفتہ رفتہ غائب ہوتی جارہی ہیں اور رعایا کے جذبۂ بیداری کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و منزلت اور ان کی بے باکی و جسارت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ زمانۂ ماضی کے خاقانی انوری اور عرفی وغیرہ کے قصائد پڑھیئے اور اس کے بعد صرف یہ شعر کہ "ملکا! خود سری و جور تو ایران سوز است۔ بمکافات تو امروز وطن فیروز است" تو اچھی طرح اندازہ ہو جائیگا کہ موجودہ زندگی نے فارسی ادب کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ دوسرے سیاحت آسان ہونے اور مغربی علم و ادب کی ترقی کیوجہ سے ان کی زندگی جس طرح مغربی تہذیب سے متاثر ہوئی اسی طرح ان کا ادب بھی مغربی ادب سے متاثر نظر آتا ہے یہانتک کہ ان کی لغت تک میں سیکڑوں مغربی الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ یہ ہے ایران کی موجودہ زندگی تمدن اور معاشرت کا ادنیٰ کرشمہ کہ موجودہ ادب، دور ماضی کے ادب سے سرتاسر مختلف ہو کر رہگیا ہے۔ نہ اب اس میں وہ نازک تشبیہات اور بلند استعارات ہیں نہ وہ زور تخئیل۔ یہ سب نتیجہ ہے موجودہ افکار و حوادث اور اضطراب و پریشانی کا۔ اب وہ دن گئے جب ایران میں نازک کمر ساقیہ کا دور دورہ تھا وہ زمانہ گذر گیا جب قومی تفوق، سیاسی برتری تھی اور ساتھ ہی ساتھ عیش تھے، بے فکری تھی اور اس بے فکری کے دور میں دنیا جنت سے بھی عزیز معلوم ہوتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش یہی تھی کہ ماضی و مستقبل کو حال میں گم کرکے جسقدر مسرتیں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں کرلے "بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است"۔ ان کی زندگی جس سرمستی میں گذر رہی تھی اس میں سوا شراب و شباب کے کسی اور چیز کا خیال کفر تھا۔ اسوقت کا ایران ایک ایسا گلزار تھا جس میں ہر طرف رنگین پھول دعوت نظارہ دیتے تھے۔ گلوں کے سایہ دار کنجوں میں اسرار محبت پنہاں تھے۔ کالی گھٹائیں اور مخمور ہوائیں ذوق بادہ خواری کیلئے ایک تازیانہ تھیں۔ جب ایسا گلستاں ہو تو ہر سیر کرنے والا کیوں نہ چلا اُٹھے کہ

چہ خواہم دریں گلستاں گر نخواہم   شرابے، کبابے، ربابے، نگارے

اور جب ایسا چمنستان ہو تو پھر جنت کی کون پروا کرتا ہے اور وہاں کی شراب کوثر کا کسے خیال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ میخانہ میں بیٹھا جھوم جھوم کر ساقی سے برابر یہی کہہ رہا ہے کہ

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

اب تو تہذیب بدل گئی۔ دماغ بدل گیا۔ خیالات بدل گئے۔ اب وہاں کے شاعر کو بجائے انگور کے قوم کی رگوں سے خون ٹپکتا نظر آتا ہے

ساقی کے تغافل کی بجائے اب قوم کی غفلت شاعر کے جذبات کو حرکت دیتی ہے، جھنجوڑتی ہے اور وہ قوم کی حماقتوں، جہالتوں اور بداعمالیوں کو دیکھکر چیخ اٹھتا ہے کہ "خدا لیش یار گر کارش چنیں ست"!

اب آیئے دیکھیں کہ عربی زندگی نے وہاں کے ادب پر کیا اثر کیا۔ قبل اسلام عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح کسی چشمے یا سرسبز و شاداب چراگاہ کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے نہ ان کا کہیں گھر ہوتا نہ ٹھکانا۔ خیمے اور مختلف سامان اونٹوں اور گھوڑوں پر لدے ہوئے ہیں۔ جہاں ڈیرہ ڈالدیا وہیں گھر ہوگیا۔ چند روز رہے جب دیکھا کہ چشمہ کا پانی ختم ہونے لگا تو ہرکارہ گھوڑے پر سوار ہوکر دور دراز ریگستان میں نکل گیا۔ تاکہ کسی اور چشمہ کا پتہ لگائے۔ اس کی اطلاع پر یہ چھوٹی سی دنیا معہ اپنے تمام ساز و سامان کے وہاں جا ٹھیری۔ جب وہاں سے بھی دل بھر گیا تو کسی دوسری جگہ جا پہونچے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ہی جگہ پر دو قبیلوں کا اجتماع ہوجاتا۔ ان میں نہ تو پردے کا رواج تھا اور نہ عمرانی زندگی کے موجودہ معاشرتی قوانین جو ایک دوسرے سے کھچنا اور تکلف کرنا سکھاتے ہیں۔ دونوں قبیلوں کی لڑکیاں اور لڑکے بے تکلف آپس میں ملتے تھے۔ ابلتا ہوا چشمہ کھجوروں کے جھنڈ اور ان کے سایہ میں شاداب سبزہ پھر ایسی جگہ جوان آنکھیں ملیں۔ جوان چہرے ایک دوسرے کے سامنے بے نقاب ہوں تو کیوں نہ ان آنکھوں میں سے محبت جھانکنے لگے۔ انکی زندگی محدود ہوتی تھی۔ ان کی دنیا صرف وہی تھی جس کو وہ دیکھتے اور جس میں گھومتے تھے کسی اور دنیا سے وہ بیخبر تھے۔ لہذا وہ اپنی اسی مختصر دنیا میں رہکر تمام زمینی مسرت سے لطف اندوز ہو لینا چاہتے تھے۔ ان کی تمام عمر صحرانوردی کیلئے وقف تھی۔ دن کے وقت آفتاب اور رات میں جھلملاتے ہوئے تارے ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وقت کا تعین ثریا، بنات النعش، اور کیوان و عطارد سے کیا گیا ہے۔ ان کے عقائد و توہمات میں شاعر کا ایک بلند مرتبہ ہے۔ ان کا ایمان تھا کہ شاعر غیب دان ہوتا ہے۔ جب کوئی شاعر کسی قبیلہ میں پہونچتا تو لوگ اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے۔ دعوتیں ہوتیں اور تمام عورتیں اس طرح گاتی بجاتی تھیں گویا کسی شادی وغیرہ کی خوشیاں منا رہی ہیں۔ چھوٹے بڑے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے پھرتے تھے۔ کیونکہ ان کا یقین تھا کہ ایک شاعر ان کی عزت کا نگہبان، ان کی شہرت کو برقرار رکھنے کا ایک آلۂ کار۔ ان کے ناموس کو بلند کرنے والا اور ان کے کارناموں کو بقائے دوام بخشنے کا ذریعہ ہے۔ مشہور نقاد ابن رشیق کا قول ہے کہ وہ صرف تین موقعوں پر اظہار مسرت کیا کرتے تھے پہلے جب کوئی لڑکا پیدا ہوا۔ دوسرے جب کوئی شاعر پہونچ جائے۔ تیسرے جب کوئی گھوڑی بچھیرا جنے۔ چونکہ ان کے یہاں شاعر کو یہ مرتبہ حاصل تھا اسلئے ہر ہر مصرعہ کو الہامی رتبہ حاصل تھا۔ اور اس کی آواز قبیلوں کی تکمیل و تخریب کا باعث بن جایا کرتی تھی۔

یہ تھی ان کی تہذیب اور ان کی زندگی۔ اب ذرا غور کیجئے کہ انکا ادب کہاں تک اس زندگی کا آئینہ دار ہے۔ جیسا اوپر بیان کیا گیا کہ بعض اوقات اتفاقیہ دو قبیلوں کا اجتماع حسن و عشق کیلئے اور وہ بھی صحرائے عرب کا تابناک اور آتش ناک حسن و عشق ہاں تو خیر اسی حسن و عشق کیلئے ایک مست و رنگین دنیا پیدا کردیتا تھا۔ عربی محبت ہماری محبت کی طرح عارضی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی عربی رگوں میں محبت کی لہر ہمیشہ کیلئے دوڑ جاتی تھی۔ پھر جب ایک قبیلہ رخت سفر باندھتا تو عجب صورت پیدا ہوجاتی۔ ادھر تو یہ حال کہ دل میں غم و الم کا ایک شدید طوفان برپا۔ پلکوں پر آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرات لرزاں اور یاس آگیں نظریں خاموشی اور حسرت سے بزبان حال گویا کہ

مت کہو یہ کہ یار جاتا ہے   دل سے صبر و قرار جاتا ہے

ادھر محمل چل پڑتا۔ منقش اور رنگین چادر میں جنبش ہوتی۔ محمل کے پردے اٹھ جاتے اور آخری بار عاشق کو پُر حسرت ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں نظر آتیں آخری بار مایوس نظریں محبت کا پیغام دیتیں۔ نرم و نازک حنا آلود ہاتھ الوداعی سلام کیلئے آہستہ سے اٹھتا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دلمیں ایک یاد اور دماغ میں ایک تصور رہجاتا اور بس۔ اب سوچیئے ایک عاشق کیلئے اس سے زیادہ جاں گداز اور صبر آزما حادثہ اور کون سا ہوسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے جو ابن قتیبہ اپنی کتاب "کتاب الشعر والشعراء"، میں لکھتا ہے کہ "عرب کے قصیدہ گو شعراء اپنی نظموں کا آغاز اجڑی ہوئی بستیوں کے آثار و علائم سے کرتے ہیں۔ پھر گریہ و زاری کے بعد اس ویرانے سے تخاطب کرتے اور اپنے ہم سفر کو کچھ دیر توقف کیلئے مجبور کرتے تاکہ وہ ان لوگوں کا تذکرہ کرسکے جو وہاں عارضی طور پر مقیم تھے ان مقامات سے وہ اپنی محبوبہ کی یاد کو وابستہ کرتے اور درد انگیز طریقہ پر اپنی محبوبہ کی جدائی کا منظر کھینچتے۔ اور اس طرح سننے والوں کے دلوں میں ایک ہلچل پیدا کردیتے کیونکہ محبت کا گیت انسانی روح کو متحرک کردیتا ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں عورتوں سے ایک موانست پیدا کردی ہے اور اسکا مشاہدہ ہم کسی نہ کسی رنگ میں کرتے ہیں خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔ اس طرح جب شاعر لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرلیتا ہے۔ تو سفر کی تھکن۔ جگار د۔ دوپہر کی تمازت اور اونٹ کی گری ہوئی حالت کا ذکر کرتا ہے اور جب اسے اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ اسکا مخاطب اس کی تکالیف کو دور کرنے کیلئے آمادہ ہے تو اس کی مدح الاپتا اور کافی مبالغہ سے کام لیتا ہے کہ کوئی صلہ حاصل کرسکے"!

چونکہ ان لوگوں نے اپنے ملک کے سوا دوسری چیزیں نہ دیکھی تھیں

لہٰذا ان میں تکلف نام کو نہیں تہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسوقت کے عربی ادب میں جو سامان زیبائش استعمال ہوا وہ اُسی ملک سے لیا گیا ہے۔ ان کے تمام ادب میں مقامی رنگ اور ملکی تشبیہات ملیں گی۔ اس کی محبوبہ کی زلفیں نہ سنبل کی رہین منت ہیں اور نہ مارہائے سیاہ کی وہ بلا جھجک انہیں کوئلے کی طرح سیاہ کہدیتا ہے۔ لیکن اسلام کے بعد جب عرب بحر روم سے ساحل چین تک پھیل گئے تو ان میں یہ سادگی نہ رہی۔ کیونکہ ان کی زندگی ہی بدل گئی۔ گو انہوں نے سلطنتیں قائم کیں ان میں۔ متنبی۔ ابو نواس اور ابن عبدربہ جیسے نغز گو شعرا پیدا ہوئے مگر وہ سادگی اور بے تکلفی کہاں جو اس آزاد معاشقہ میں تہی۔

اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو جا بجا ان کے طرز زندگی کی جہلک ملیگی۔ مثلاً اس زمانہ میں عیسائیت کی ابتدا تہی۔ عورتیں اور مرد دونوں راہب ہوتے تھے ان لوگوں نے انہیں دیکھا تہا لہٰذا وہ بلا ارادہ اپنے اشعار میں ان کا تذکرہ کرجاتے ہیں۔ امراء القیس لکھتا ہے "میری محبوبہ رات کے وقت تاریکی کو منور کردیتی ہے گویا وہ راہب نصاریٰ کی تارک الدنیا کا چراغ ہے" ذرا اس زمانہ کے لباس کو ملاحظہ کیجئے اور محبت کا کرشمہ بہی دیکھیے "میں وہاں سے نکل پڑا۔ میں آگے آگے تہا اور وہ میرے پیچھے پیچھے اور وہ اپنی منقش چادر سے جس سفر کے مناظر کشیدہ تھے ہم لوگوں کے نقش پا کو مٹاتی جاتی تہی" اور واقعی نقش پا کو مٹانا ضروری بہی تہا۔ وہاں کولتار یا سیمنٹ کی سڑکیں تو تہیں نہیں۔ ریگستان تہا اور سراسر ریگ ہی ریگ اگر نقش پا نہ مٹائے جاتے تو پکڑے جانے کے بعد کا حال سب پہ ظاہر ہے۔

عورتیں اسوقت بہی گھر کا کام کاج کیا کرتی تہیں اور مرد باہر کا مگر جو امیر ہوتے تھے ان کی عورتیں آزاد رہتیں اور دن چڑہے تک بستروں پر پڑی اینڈا کرتی تہیں اس شعر سے اسکا اندازہ لگا لیجئے۔ "جب وہ چاشت کے وقت سو کر اٹھتی ہے تو مشک کے ریزے پلنگ کی چادر پر بکھرے ہوتے ہیں۔ وہ بہت دن چڑہے سو کر اٹھنے والی ہے اور گھر کے کاموں کیلئے پیٹی نہیں باندہتی ہے"

ان کی سادگی کی یہ حد تہی کہ وہ صرف وہی تشبیہات استعمال کرتے تھے جو خالص مقامی ہوتیں۔ اور جن سے انہیں روزمرہ واسطہ پڑتا تہا۔ برسات میں بجلی چمکتی ہے تو کتنی نازک اور پر کیف تشبیہہ دیجاتی ہے کہ "اے میرے رفیق تو نے وہ بجلی دیکھی جو میں تجھے دکھا رہا ہوں جیسے محل میں سے کسی کے دو ہاتہ چمک جائیں" یونانیوں کی طرح اسوقت عرب بہی توہم پرست تھے ان کا عقیدہ تہا کہ عاشق و معشوق کی جدائی سے تہوڑی دیر پہلے اس کے علامات ظاہر ہو جاتے ہیں یا تو کوئی کوا مکان کے سامنے آکر بولے گا یا اسی قسم کی کوئی اور بات ظاہر ہوگی۔ آجکل ہندوستان میں بہی گاؤں کی بڑی بوڑہیاں کوتے کے بولنے کو کسی مہمان کے آنے کی علامت سمجہتی ہیں۔ تو خیر عربوں میں اسی لئے جدائی کے کوتے (غراب البین) کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً "یہ بدشگون طائر سمجھتے ہیں کہ کل صبح ہم لوگ جدا ہونے والے ہیں اور اس کی خبر اس کالے کوتے نے دی ہے"

عرب میں دوار نامی ایک ہیکل نما بت تہا جس کے گرد مختلف قبیلوں کی دوشیزہ لڑکیاں جوش عقیدت میں طواف کیا کرتی تہیں۔ قبیلۂ نعاج کی لڑکیاں اس رقص میں زیادہ حصہ لیتی تہیں چنانچہ نابغہ ذبیانی ایک جگہہ لکھتا ہے کہ "یہ سیاہ چشم نیل گائیں (دوشیزہ لڑکیاں) پہچانتی ہی نہیں گویا وہ قبیلۂ نعاج کی ہیں جو دوار کے گرد ناچ رہی ہیں"

اس زمانہ میں اکثر قبائل بر سرپیکار رہا کرتے تھے لہٰذا ان کے یہاں حسن و عشق کے علاوہ رزمیہ شاعری کا بہی کافی حصہ پایا جاتا ہے۔ وہ شعرا جسوقت میدان کارزار کا نقشہ کھینچتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گہوڑوں کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ تلواروں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اسی ضمن میں جہاں کہیں گھوڑوں کا ذکر آجاتا ہے تو بس پھر کچھہ نہ پوچھئے۔ امراء القیس کا یہ شعر پڑہیے اور اپنے ادب میں اس کی مثال ڈہونڈہنے میں تمام عمر گذار دیجئے۔ "میرا گھوڑا حملہ آور ہوتا ہے۔ پھر ذرا پیچھے کو ہٹ جاتا ہے۔ دوبارہ آگے بڑہتا ہے اور پھر پیچھے ہٹتا ہے جیسے کسی پہاڑ کی چوٹی سے کسی بڑی چٹان کو نیچے لڑھکا دے"

اس کے بعد اسلام پہیلا۔ عرب تمام دنیا پر چھا گئے۔ انکا ماحول بدل گیا۔ عام خیالات اور زندگی دوسری فضا سے متاثر ہوگئی۔ کچھہ تو عرب پہلے ہی سے جنگجو قوم تہی اب اسے اپنے جنگی کارنامے دکھلانے کا اور موقع ملا۔ عشقیہ ادب میں کمی آگئی اب شاعری زیادہ تر رزمیہ ہونے لگی یا مذہبی یہانتک کہ حضرت علی کے دیوان میں بہی مذہب کے دوش بدوش رجزیہ اشعار کافی ہیں۔ یونانی ادب بہت کچھہ عربی میں منتقل ہوگیا اور اس طرح اب عربی ادب میں علم و حکمت بہی بہت زیادہ شامل ہوگئی۔ چند صدیوں کے بعد مسلمان کمزور ہوتے گئے۔ اور آخر ان کی سلطنت چھن گئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ جب وہ قوم ہی قریب قریب مٹ گئی تو اب انکا ادب کہاں حتیٰ کہ مصر کے علاوہ خود عرب میں بہی عربی ادب مفقود ہے۔ ہاں موجودہ بیداری کے ساتھہ ساتھہ اب عربی ادب بہی دوبارہ زندہ ہو رہا ہے۔ اور ہمیں تعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کرنے کا سہرا عرب کے نہیں بلکہ مصر کے سر ہے۔

انگریزی۔ فارسی اور عربی ادب پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب آئیے ہم اپنے قومی ادب کو دیکھیں کہ وہ کہانتک ہماری زندگی کا مرہون منت ہے۔ ہمارا اردو ادب گو اُردو کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی ہے خدا کا فضل ہے کہ اس تھوڑی سی ہی عمر میں ادب بنگیا ہے اور قابل قدر ادب۔ سب سے پہلے تو ہماری زبان ہی زندگی کے مختلف واقعات و واردات کا نتیجہ ہے۔ چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے زمانہ میں مغلیہ بادشاہوں اور شہزادوں کی فرودگاہوں اور لشکرگاہوں کو "اردو" کہا کرتے تھے یہانتک کہ انکا دارالحکومت بھی اردو کہلاتا تھا۔ اردو کا لفظ مغلوں کی تاخت کے دوران میں باہر کے ساتھ ہندوستان میں آیا۔ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو وہ اپنا تمدن اور اپنی زبان بھی ساتھ لائے تھے لیکن ہندوستانی تمدن کو نہ وہ اپنے آپ میں دم کر سکے اور نہ ہندوستان کے تمدن میں خود ذم ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فاتحین ہندوستان میں نہ اپنی زبان کو عام کر سکے نہ خود ہندوستان کی زبان عام بن سکی۔ بلکہ ان اقوام کے اختلاط سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ جو مختلف مدارج سے گذرتی ہوئی اردو کہلائی۔ اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف آرا میں سے صرف ایک رائے جو زیادہ قابل قیاس ہے لکھدینا کافی ہے۔ عبدالغفور نساخ نے رسالہ تحقیق زبان ریختہ (۱۲۷۵ھ) میں لکھا ہے کہ "زبان اُردو روزمرہ شہر دہلی کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں قدیم الایام سے برابر زبان ہندی مروج تھی۔ ہر شخص اسی زبان میں کلام کرتا تھا جب ۵۸۸ھ میں سلطان معزالدین مشہور بہ شہاب الدین غوری نے ملک ہند پر چڑھائی کی اور اہل ہند کو شکست دی۔ رائے پتھورا کا کام تمام کیا۔ تمام ہند سلاطین غور کے قبضہ میں آیا۔ رفتہ رفتہ زبان قدیم میں لفظ ترکی اور فارسی ملتا گیا۔ جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو باشندگان دہلی پر ایک نیا ظلم کیا کہ ان کو شہر میں رہنے نہ دیا۔ دیوگیر معروف بہ دولت آباد بھیجدیا اور قبل اپنی سلطنت کے زوال کے ان لوگوں کو دہلی بلا لیا۔ اس نقل و حرکت کے باعث بہت سے الفاظ دکھنی بھی زبان دہلی میں مل گئے۔ یہی انداز گفتگو عہد جہانگیر بادشاہ تک رہا۔ جب شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۴۸ھ میں شہر شاہجہاں آباد آباد کیا تو شاہجہاں آباد میں اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ مجتمع ہوئے۔ قدیم ہندی متروک ہونے لگی۔ محاورہ میں فرق ہونے لگا۔ زبان اردو کی ترقی شروع ہوئی۔"

الغرض ابتدا میں اردو میں جو لکھا گیا اس پر ہندوستان کی زندگی کا بہت کم اثر پڑا۔ صرف زبان تو ضرور یہاں کے اثر سے ایک نئی پیدا ہو گئی مگر شاعری بالکل فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی ہاں امیر خسرو کے چند گیت اور پہیلیاں اور مکرنیاں تو ضرور ہندوستانی زندگی کا مرقع ہیں مگر ان کے بعد جوں جوں زبان میں ترقی ہوتی گئی ہندی الفاظ و تراکیب کم اور فارسی زیادہ بڑھتی گئی اور ہر صنف سخن فارسی ہی کی دوسری نقل ہے تشبیہات و استعارات صنائع و بدائع اور جملہ قسم کی آرائش و زیبائش فارسی سے لیگئی۔ یہانتک کہ سوّدا کے یہاں بہت سے فارسی اشعار کا لفظ بلفظ ترجمہ تک موجود ہے۔ جب مغلیہ سلطنت کمزور ہوتے ہوتے برائے نام رہگئی۔ مختلف ریاستوں اور حکومتوں میں اس کے ٹکڑے ہو گئے اور ذی علم اور صاحب استعداد لوگ دہلی سے لکھنؤ میں جمع ہو گئے۔ اور غدر کے بعد تو بجائے دہلی کے لکھنؤ ہی ادبی لوگوں کا مرکز بنگیا۔ اب ان پر یہاں کی زندگی کا اثر شروع ہوا۔ لکھنؤ کے نواب ہروقت شراب میں مدہوش اور سیکڑوں بیویوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں گھرے رہتے تھے اور اس طرح ان میں زنانہ پن بدرجۂ اتم موجود تھا۔ عورتوں کی اس بے جا قدر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر کی حسین پیشہ ور عورتیں لکھنؤ میں آکر بھر گئیں۔ ان کی موجودگی سے وہاں کے لوگوں کا مذاق سخن بھی نہایت رکیک اور پست ہو گیا۔ عورتوں کے اس غلبہ سے وہاں کی زبان بھی کچھ زنانی ہو گئی۔ نسوانی تراکیب و محاورات زیادہ استعمال ہونے لگے۔ اور عریاں تغزل بڑے زوروں پر ہونے لگا۔ "حسن لب بام" کے عریاں اور ارزاں ہونے نے لکھنؤ کے ہر من چلے کو شاعر بنا دیا لیکن صرف گل و بلبل والا شاعر۔ ہر ایک کی زبان پر اس قسم کے مبتذل اور بیہودہ اشعار رہنے لگے کہ

آئے ہو شب وعدہ تو کھل کے ہنسو بولو   کون آج کے دن مانیگا عذر حیا کرنا۔ یا

کل جو ٹوٹی تھی وصل میں چوڑی   دل میں چبھتی ہے وہ نشانی آج

اس آزاد عیاشی کا وہ زور ہوا کہ شریفوں کو پناہ ملنی مشکل ہو گئی۔ اگر کوئی لفنگا کسی شریف عورت سے جھگڑتا اور وہ غریب خود کو بچانے کیلئے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاتی تو اس زمانہ کے بیہودہ گو شاعر اپنے مطلب کے مطابق اس کی بھی اس طرح توجیہہ کر لیتے کہ

یہی تھا یہی ہاتھا پائی کا حاصل   کوئی چوم لے منہ کلائی پکڑ کر

جب کوئی شریف عورت برقع میں لپٹی ہوئی گذرتی تو یہ عیاش شاعر اس پر طرح طرح کے آوازے کستے۔ کوئی کہتا

ادھر بھی اک نگاہ ناز اپنے حسن کا صدقہ   ترے قربان جانبازی کا ارماں ہم بھی رکھتے ہیں

دوسرا چیختا ہے۔

مشتاق دید سے تجھے پردہ نہ چاہئے   ایسا نہ چاہئے ارے ایسا نہ چاہئے

تیسرا چنگھاڑتا ہے۔

اسطرف بھی اک نگاہ اے بندہ پرور دیکھنا   نیچی نظروں کا تصدق آنکھ اٹھا کر دیکھنا

جب وہ گرتی پڑتی۔ بچتی بچاتی گھر پہونچ جاتی تو من چلے وہاں بھی

اسکا پیچھا نہ چھوڑتے۔ پیچھے پیچھے دوڑتے جاتے ہیں اور چلاتے جاتے ہیں کہ

انتہا کچھ نظر چرانے کی ایک دعاگو سے عار یہ کبتک

وہ جلدی سے اندر داخل ہو گئی تو اب کھڑکی کے پاس کھڑے صدا لگا رہے ہیں کہ

کبھی تو جھروکے سے تم جھانک لو ہزاروں کھڑے زیر دیوار ہیں

غرض یہ تھی اس زمانہ کی زندگی اور یہ تھی اسوقت کی شاعری۔ جہاں کوئی حسینہ نظر آئی۔ بس اس کے سر ہو گئے اور جھوم جھوم کر فرمانے لگے۔

کیا کسی دن بھی نہ مانی جائے گی کیا یونہی اٹھتی جوانی جائے گی

ایام جاہلیت کی عربی شاعری عموماً بہت زیادہ عریاں اور حیا سوز ہوا کرتی تھی لیکن میں کہوں گا کہ ہماری اردو شاعری اس سے بھی زیادہ غیر مہذب اور عریاں ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے اور سر ندامت سے جھکا کر خاموش ہو جایئے۔

وصل کی شب پلنگ کے اوپر مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں یا

دیکھی شب وصل ناف اس کی روشن ہوئی چشم آرزو کی

لیکن ہر چیز کی حد ہوا کرتی ہے۔ مانا کہ عشق خواہ حقیقی ہو یا مجازی یکساں طور پر متاثر کرنے اور روح کو حرکت دینے والا ہے مگر آخر کبتک؟ جب یہ عشق بڑھتے بڑھتے عیاشی کی حد تک پہونچ گیا اور ایک مدت تک لوگ ہجر کے نالے اور وصل کے شادیانے سنتے سنتے تھک گئے تو وہ اس گل و بلبل کی داستان سے گھبرا کر چیخ اٹھے ادہر مسلمانی سلطنت کے بعد مغربی حکومت قائم ہوئی۔ حکومت کے ساتھ مغربی ادب اور مغربی تہذیب بھی آئی اور اس تہذیب نے یہاں کی زندگی کو متاثر کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے خیالات پر بھی اس کا اثر پڑا اور خیالات کے ساتھ ادب پر بھی۔ حالی۔ محمد اسمٰعیل میرٹھی محمد حسین آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ سر سید اور شرر وغیرہ قسم کے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی متفقہ کوشش سے اردو ادب کا رخ پھیر دیا۔ بجائے غزلوں کے مختلف مضامین پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ باغ و بہار۔ فسانۂ عجائب اور داستان امیر حمزہ قسم کی داستانوں کے بجائے نذیر احمد کے اصلاحی افسانے۔ سر سید کے فلسفیانہ مضامین۔ اور شرر کے تاریخی و ادبی ناول لکھے گئے۔ مغربی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ان کی مساوات اور ان کے حقوق کا مسئلہ بھی بروئے کار آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں نے بہت کچھ آزادی حاصل کرلی۔ اور اب وہ بھی اردو ادب میں حصہ لینے لگیں۔ ہمدرد اور احساس دل رکھنے والے مردوں نے بھی عورتوں کی مظلومیت کا احساس کیا۔ اگر ایک طرف محترمہ ز۔ خ شروانیہ (علیگ) قسم کی عورتوں نے "آئینہ حرم" لکھکر مردوں سے اپیل کرتے ہوئے اپنی بیکسی و اسیری کی داد چاہی تو دوسری طرف مردوں نے بھی ان کی ہمت افزائی کی اور اپنے مختلف مضامین افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ سے ان کی بیچارگی و کس مپرسی کی حالت لوگوں کے سامنے پیش کر کے ان کی اپیل کی تائید کی۔ سیاسی پستی نے اقبال جیسے شاعروں کو قوم کا رہنما بنایا جس نے اپنے فلسفہ کی چٹان پر کھڑے ہو کر صور بیداری پھونکا اور سوئی ہوئی قوم کو بار بار۔ پے در پے یہ کہکر انگڑائی لینے پر مجبور کر دیا کہ

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز از خواب گراں۔ خواب گراں۔ خواب گراں خیز

اس نے حکومت کی ساحری کو بے نقاب کر دیا اور صاف الفاظ میں بتا دیا کہ

ساحر الموط نے تجھکو دیا برگ حشیش اور اے ناداں اسے سمجھا ہے تو شاخ نبات

دوسری طرف مغربیت کی بڑھتی ہوئی دبا نے راشد الخیری مرحوم جیسی ہستیوں کو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ عورتیں جو مغربی طوفان میں بھی جا رہی تھیں اس سے بچانے کیلئے انہوں نے اپنے زور قلم سے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنائیں جنہوں نے خوشی سے ان کی کشتی پر آنا منظور کیا ان کو وہ دریائے مواج کی ہلاکت آفرینیوں سے بچا کر ساحل سلامتی پر لے آئے۔

سلطان العلوم تاجدار دولت آصفیہ کی متبرک اور مفید کوششوں سے مغربی علوم و حکمت بھی اردو ادب میں تبدیل ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا ادب صحیح معنوں میں ایک مفید اور قابل قدر ادب بنگیا۔ یہاں تک کہ اس کا اثر پرانی غزل بازی پر بھی کافی حد تک پڑا۔ دور از کار تشبیہات و استعارات کے گورکھ دہندے سے نکلکر اردو ادب میں بہت کچھ سادگی آگئی۔ غزلیات میں وہ قدیم عریانی و بے حیائی نہیں رہی بلکہ ایک جدید رنگ میں غزلیں لکھی جانے لگیں۔ واجبات عاشقی بھی بدل گئے۔ پہلے شب و روز رونا۔ محبوب کا نام لے کر چلانا اور ہمیشہ وصل وصل کی رٹ لگانا عاشقی کے لوازمات تھے مگر اب . . . . . .

غسل کرنا خون سے پھر خاک پر پڑھنا نماز اے اسیر شرع یہ ہیں واجبات عاشقی

پہلے دن رات رقیبوں سے چلا کرتی۔ دربانوں سے جھگڑا ہوا کرتا اور خواہ رقیب سگے بھائی ہی کیوں نہ ہوں ایک دوسرے کا جانی دشمن ہوتا تھا مگر اب رواداری کا یہ عالم ہے کہ

نزاع کفر و ایماں کیا برہمن کیا مسلماں کیا بہت آگے ہوں اب میں کار زار حق و باطل سے

پہلے محبوب کے در پر جبیں فرسائی اور دہیں جبہہ سائی کرتے کرتے ختم ہو جانا پست ہمت لوگوں کا کام تھا لیکن اب بلندی عزم اور علو ہمت یہ کہلوا رہی ہے کہ

عقیدت کی بلندی پر نئی دنیا بناؤں گا میں سجدوں میں اٹھا لایا ہوں خاک ان آستانوں کی

پہلے عاشق کی آرزوئیں نفس پرستی اور بوالہوسی کی سرمایہ دار ہوا کرتی تھیں وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ "

کیا بات ہے گر بوسۂ لب کر کے عنایت تم مجھسے کہو بس میں کہوں تم سے نہیں اور

کسی کی آرزو ہوتی تھی کہ

مزا جب ہے کہ اس انداز سے ہوں پیار کی باتیں ہمارا ہاتھ سینہ پر تمہارا ہاتھ گردن میں

اور کوئی کہتا تھا کہ "

مدت سے آرزو ہے کہ صبح شبِ وصال — یہ ہنسکے پوچھتا کوئی ارمان اور ہے

یہانتک کہ غالب نے بھی ناکامیٔ وصل سے تھک کر ایک روز کہہ ہی دیا کہ

ان پری زادیوں سے ہم جنت میں لینگے انتقام — قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

مگر اب حور و قصور کچھ بھی نہیں چاہئے۔ بس

میں تیرے قدموں کے صدقے کہاں کے حور و قصور — جھکا ہوا یونہی فرقِ نیاز رہنے دے

اب نہ وصل کی آرزو ہے نہ گردن میں ہاتھ ڈالنے کی خواہش اور نہ "بوسۂ لب" کی تمنا۔ نہ دنیا چاہئے نہ عقبیٰ۔ غرض تمام دولت کونین، تمام لذائذ دنیا اور نعائم عقبیٰ میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں بس اب تو یہی درخواست ہے کہ"

لٹا دے دولت کونین اور میرے لئے — بس اک تبسم عاجز نواز رہنے دے

پہلے کی محبت جس قسم کی ہوتی تھی اس کی نہایت صحت کے ساتھ ہم یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ

جوانی کا پر جوش طوفاں محبت — حرارت بھرے دل کا ہیجان محبت

یہ ہے نفس کے دیو سے زیر ہونا — جواں آدمی کا شکم سیر ہونا

مگر اب کی محبت کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ

محبت ہے ایک آسمانی لطافت — کثافت کی سب بندشوں سے فراغت

وہ جوہر ہے بے لوث جذبات دل کا — وہ مرکز ہے پر نور ذرات دل کا

وہ فطرت کا ایک لمعانِ کرم ہے — وہ اک جاودانی بہارِ ارم ہے

پہلے کا نسوانیت سے متاثر اور بزدل شاعر محبوب سے بھی شکر و شکایت کرتے ہوئے ڈرتا تھا مگر موجودہ بلند ہمت اور دلیر شاعر خدا سے بھی "شکوہ" کرنے میں نہیں جھجکتا۔ یہ ہے گذشتہ اور موجودہ زندگی کا فرق اور اسی مناسبت سے ماضی و حال کے ادب کا فرق۔ القصہ یہ ہے مختصر سا خاکہ ہمارے مضمون کے صرف ایک رخ کا یعنی ہم نے سرسری طریقہ سے دیکھ لیا کہ کہاں تک تاریخ و تمدن۔ تہذیب و معاشرت کسی قوم کے ادب پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہوئی۔ اب تک ہم نے صرف اس سے بحث کی ہے کہ مختلف قوموں کی اجتماعی یا کسی ادیب اور شاعر کی انفرادی زندگی نے اس کے ادب کو کہاں تک متاثر کیا۔ اب آیئے دیکھیں کہ کسی قوم کی زندگی پر اس کے ادب کا کیا اثر ہوتا ہے اور کیا اثر ہوا ہے۔ یہ دیکھنے کے بعد زندگی اور ادب میں جو گہرا اور ناقابل سقوط تعلق ہے اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا۔

ادب کا اثر زندگی پر

ادب نے جب کبھی زندگی کو متاثر کیا ہے تو اسوقت جب وہ عین اپنے شباب پر ہوا ہے اور صرف یہی نہیں کہ جس ملک یا قوم کا ادب ہے وہ صرف اسی ملک یا قوم کی زندگی کو متاثر کرے۔ بلکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک ملک کے ادب نے تمام دنیا کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ مثلاً پندرہویں صدی عیسوی میں اٹلی کا ایک مصنف میکاولی The Prince لکھتا ہے جس میں بادشاہوں کے متعلق جائز و ناجائز طریقہ سے طاقت حاصل کرنے کی تبلیغ کی گئی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سترہویں صدی تک قریب قریب تمام یورپ کے بادشاہ اس کے فلسفہ پر عمل کرتے رہے اور اس عمل کے نتیجہ میں مذہب سماج اور معاشرت میں بہت سے غیر معمولی انقلاب رونما ہوئے۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد جب یونانی حکیم و ادیب معہ اپنی حکمت و ادب کے وہاں سے بھاگ کر تمام یورپ میں پھیل گئے تو ان کے ادب نے یورپ بھر کے ادب کو متاثر کیا اور اس طرح بالواسطہ یورپ میں دورِ نہضت شروع ہو گیا جس نے تمام یورپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغربی ادب نے وہ زور حاصل نہ کیا تھا جو زندگی پر خاص اثر کر سکے بلکہ وہ خود زندگی سے متاثر تھا اور مذکورہ دونوں صدیوں کا ادب اپنے مختلف عہدوں کا آئینہ دار ہے۔ انیسویں صدی میں انگلستان میں گاڈون پیدا ہوا جس نے Political Justice لکھکر انگلینڈ کی طرز زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر کے رکھدیا۔ شیلے اور ٹینی سن وغیرہ بھی اسی کے مرید تھے۔ ادھر گاڈون کی بیوی نے عورتوں کے حقوق اور آزادی کی تبلیغ کی اس طرح سب نے مل کر انگریز مرد اور عورت کی رگوں میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی اور ہر طرف سے انقلاب انقلاب کی صدا بلند ہونے لگی۔

فرانس میں روسو اور والٹیر نے انقلابی رسالے تصنیف کئے۔ ٹامس پین Pain نے "انسانی حقوق" Rights of men ——— لکھی اس سرتاسر انقلابی ادب کا یہ اثر ہوا کہ تمام رعایا بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہر طرف موت کا بازار گرم ہو گیا۔ ہوا "انقلاب زندہ باد" کے بلند و پر جوش نعروں سے گونج اٹھی۔ نپولین تلوار لیکر اٹھا اور باد کا طوفان بنکر تمام یورپ پر چھا گیا اور روس سے لیکر مصر تک تمام ملکوں کو روند ڈالا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ بلا ٹلی لیکن آزادی و مساوات کا خیال لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر نقش کالحجر بنگیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دنیا کے تمام ملکوں کا طرز حکومت بدل گیا ——— The Prince کے فلسفہ کو شکست ہو گئی۔ طرز حکومت کی تبدیلی کے ساتھ رعایا کی معاشی اور عمرانی زندگی میں بہت کچھ انقلاب آگیا۔

اب اس کے بعد وہ ادبی دور آیا جو تاریخ میں عہد وکٹوریہ کے نام سے مشہور ہے۔ صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد لوگوں کی عمرانی زندگی میں جو خرابیاں اور کمزوریاں آگئی تھیں انہیں ڈکنس نے اپنے ناولوں میں

پیش کر کے ان کی اصلاح چاہی۔ پے در پے اس نے با اختیار لوگوں کو ان برائیوں کی طرف توجہ دلائی اور اس کے نتیجہ میں ـــــ Poor Laws وغیرہ قسم کے قوانین بننے لگے "صنعتی انقلاب" کے بعد سے غریب کاریگروں اور صناعوں کے ہاتھ سے روزگار چھنکر سرمایہ داروں کے قبضہ میں پہونچ گیا تھا اور اس کی وجہ سے غریب مزدوروں کی زندگی وبال جان بنی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ حکومت میں بھی ان کی آواز نہ تھی۔ اس مظلومیت سے متاثر ہو کر کارلائل اور رسکن جیسے آتش قلم اور آتش زبان اپنا شعلہ بار ادب لیکر اٹھے۔ اور سرمایہ داری کے خلاف ایک عام جہاد شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریبوں اور مزدوروں کی زندگی بہت کچھ سدھر گئی۔ ان کے آرام و فائدے کیلئے حکومت نے قوانین بنائے اور رفتہ رفتہ حکومت میں ان کی آواز بھی شامل ہو گئی ...... عہد وکٹوریہ کے آخری اور بیسوی صدی کے اوائل میں ایک اور مصنف بھی اسٹیج پر چمکا اور وہ ہارڈی تھا اس کا تمام کا تمام ادب متشائم کیفیت کا حامل ہے۔ اس نے اپنے ناولوں میں قسمت و تقدیر کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ نیچری تھا اور اسکا تمام ادب بھی اسی دہریت کا سرمایہ دار ہے۔ اس کے ادب کا اثر زندگی پر یہ ہوا کہ دہریت کا ایک علیحدہ اسکول ہی قائم ہو گیا۔

ادہر روس میں میکسم گورکی۔ چیخوف اور دستووسکی جیسے اشتراکی ادیب پیدا ہوئے اور ان کے ادب نے تمام ملک میں اشتراکیت کی لہر دوڑا دی۔ مذہب ان کی تہذیب میں کوئی چیز نہیں۔ صرف اشتراکیت ہے خواہ اسی کو مذہب کہو یا اخلاقیات کے نام سے تعبیر کرو۔ یہ تینوں مذکورہ ادیب غضب کے حقیقت نگار (ــــ Realist) ہیں۔ ان کے ادب کا اثر محض روس ہی پر نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اگر تمام دنیا بالشوزم کو دبانے کی اسقدر متفقہ کوشش نہ کرتی تو اب تک تمام ملک اسی رنگ میں اچھی طرح رنگ چکے ہوتے۔ اور اگر جواہر لال نہرو اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے تو ہندوستان بھی شاید چند سال میں اشتراکی بنجائیگا۔ الغرض یہ رہا مغربی ادب کا اثر زندگی پر۔ اب آیئے عربی ادب کو دیکھیں کہ اس نے زندگی پر کیا اثر کیا۔

عرب میں عموماً دو قسم کا اور اسلام کے بعد تیسری قسم کا بھی ادب عرب کی تاریخ میں ظاہر ہوا۔ یعنی رزمیہ۔ بزمیہ اور مذہبی۔ وہاں شاعر قبیلے کا دیوتا ہوتا تھا۔ حسین عورتیں اس کی پرستش کرتی تھیں اس لئے کہ وہ انکے حسن و جمال کے راگ گاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نازک و جمیل جنس کا مشہور مداح عمرو ابن ابی ربیعہ کا انتقال ہوا تو حسین لڑکیوں میں ایک کہرام مچگیا۔ وہ نالہ و شیون کرتیں اور کہتی جاتی تھیں کہ "اب کون ہے جو ہماری صنف کے حسن و جمال کا راگ گائے گا اب کون ہے جو ہماری صنف کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کریگا" .... مرد شاعر کو پوجتے تھے اسلئے کہ وہ ان کے قبیلے کا نام روشن کرنیوالا تھا۔ کسی ایک قبیلہ کی مدح یا ہجو میں اس کا ایک شعر قیامت کا کام کرتا تھا۔ مثلاً عرب میں قبیلہ نمیر نہایت ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب کسی شاعر نے اس کی ہجو میں یہ شعر کہا کہ "

فَغُضَّ الطَّرْفَ اِنَّكَ مِنْ نُمَيْرٍ ۔۔۔ فَلَا كَعْبًا بَلَغْتَ وَلَا كِلَابًا

تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اس کا نام پوچھتے تو نمیر کا نام چھوڑ کر اوپر کی پشتوں کے نام بتاتا حتیٰ کہ آخر اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہو گیا۔ الغرض عربی شعراء کے ایک ایک شعر نے زندگی اور لوازمات زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے بعض اوقات تو یہاں تک ہوا ہے کہ ایک شعر نے ایک عظیم انقلاب پیدا کر کے رکھدیا ہے رسالۂ نگار سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں دیکھئے اور پھر اس بے پناہ اثر کا اندازہ لگایئے

ابتدائے اسلام میں عورت و مرد دونوں باہم ملتے جلتے تھے یہاں تک کہ کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے اور طواف میں ایک کا شانہ دوسرے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا سلیمان ابن عبد الملک اموی کے عہد خلافت میں خالد بن عبد اللہ القسری مکہ کا سردار تھا اس کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچے کہ "کیسا پیارا ہے یہ موسم۔ کیسی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کیسی پیاری ہیں وہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت ہم کو گھیر لیتی ہیں"۔ خالد نے یہ شعر سنکر کہا کہ خیر آیندہ سے وہ تم کو نہیں گھیریں گی۔ اور حکم دیا کہ مرد و عورت میں تفریق کر دیجائے۔ چنانچہ یہ جدائی جو اس وقت قائم ہوئی تھی اب تک باقی ہے۔

ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ نہ تھیں ان کے لئے شوہر نہ ملتے تھے مجبوراً ان کے والدین مشہور شاعر اعشیٰ کے پاس گئے اور اپنی داستان غم سنائی وہ فوراً اٹھا اور سوق عکاظ میں جا کر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سنایا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر نے ابھی قصیدہ ختم نہیں کیا تھا کہ تینوں لڑکیوں کو شوہر مل گئے۔

عراق کا ایک تاجر مدینہ آیا۔ اس کے تمام نقاب فروخت ہو گئے لیکن سیاہ نقابوں کو کسی نے نہیں پوچھا وہ مسکین الدارمی شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کیوجہ سے بہت مشہور تھا لیکن اب تائب ہو کر مسجد میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ تاجر کا حال سنکر وہ مسجد سے باہر آیا۔ اپنا لباس زہد و تقویٰ اتار کر وہی رندانہ وضع اختیار کی۔ اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر سنا کر کہا کہ شہر کے مغنیوں کو جا کر سنا دو۔

"اس معشوقہ ملیح رنگت سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہدو کہ تو نے

ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کیلئے ایک گوشۂ مسجد میں بیٹھ گیا تھا کہ دفعتاً سامنے آگئی اور نماز و روزہ سب غارت کرکے رکھدیا۔ پھر اے حسینہ! تجھے واسطہ ہے دین محمد کا کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اسے قتل کر دے۔"

جسوقت یہ اشعار مدینہ کی گلیوں میں پہونچے تو سب کو یقین ہو گیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہو کر مسجد سے باہر آگیا ہے اور تمام مدینہ میں کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہگئی جس نے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔ اس کے بعد سے سیاہ نقاب فیشن میں داخل ہو گیا۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم تھا۔ اسوقت عام دستور تھا کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے اور ان پر کھڑے ہو کر مؤذن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاقاً خالد نے کسی شاعر کے یہ شعر سن لئے کہ ... "کاش میں بھی ان موذنوں میں سے ہوتا جو اونچے میناروں پر کھڑے ہو کر آس پاس کی چھتوں پر نظر ڈالتے اور وہیں سے عشوہ طراز ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں۔" فوراً خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کر دئے جائیں۔

امیر معاویہ معروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن ٹھیک اسوقت ابن الاطنابہ انصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہونچتا ہے۔

ابت لی عفتی و ابی بلائی   و اخذی الحمد بالثمن الربیح

اور وہ نئے جوش کیساتھ حملہ کرکے دشمن کو شکست دیدیتے ہیں۔

خلیفہ سفاح ستر امراء بنی امیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا کھانے کا انتظار کر رہا ہے کہ دفعتاً ایک شاعر اندر آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کرکے یہ شعر پڑھتا ہے

اذکروا مصرع الحسین و زیدا   و قتیلا بجانب المہراس

سفاح یہ سنتے ہی اتنا برہم ہو جاتا ہے کہ تمام امراء بنی امیہ کو ایکدم قتل کرا دیتا ہے۔

رشید، مالک بن طوق کے قتل کا حکم دیتا ہے اور جسوقت جلاد اسے قتل کے لئے سامنے لاتا ہے وہ گردن جھکا کر یہ شعر پڑھتا ہے۔

اری الموت بین النطع والسیف کامنا   یلاحظنی من حیثما اتلفت
وما بی من خوف اموت وانني   لاعلم ان الموت شیء موقت
ولکن خوفی صبیۃ قد ترکتہم   واکبادہم من حسرۃ تتفتت

رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہے "میں نے تیری لڑکی کا صدقہ تجھے معاف کر دیا۔ جا اور اب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا۔"

عرب کی تاریخ ادب میں بہت سے اس قسم کے واقعات ہیں لیکن ہمارے مطلب کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں ان سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ عربوں کی تہذیب و تمدن۔ رسم و رواج۔ عمرانیت و معاشرت پر کتنا گہرا اور بے پناہ اثر ڈالا۔ اسلام کے ساتھ عربی ادب میں ایک بے بہا چیز کا اور اضافہ ہوا اور وہ قرآن مجید ہے۔ عربی زبان میں جتنی بھی فصاحت و بلاغت ہے یا ہو سکتی ہے۔ جتنے صنائع و بدائع ممکن ہیں وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔ اور دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا صحیح مفہوم فی الحقیقت اسی متبرک صحیفہ کو دیکھنے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگرچہ اور عربی ادب کی طرح اسے شعر و شاعری سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ وہ کسی انسانی دماغ کی پیداوار ہے۔ تاہم عربی ادب میں ضرور شامل کی جا سکتی ہے۔ اور اس مقدس کتاب نے محض عرب قوم ہی کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی زندگی کو مجموعی طور پر جس طرح اور جتنا متاثر کیا ہے کر رہی ہے اور آئندہ کرے گی اسے اگر بیان کیا جائے تو سیکڑوں ضخیم جلدیں بھی ناکافی ہونگی۔ اور دوسرے وہ عالمگیر اثر اہل نظر سے پوشیدہ بھی نہیں۔ بے تعصب اور وسیع نظر دل اس کے اثر کا اعتراف کریگا۔ عرب کے وحشیوں اور درندوں کو تمدن کا سبق کس نے دیا؟ جانوروں کو انسان اور انسانوں کو فرشتہ کس نے بنایا؟ دنیائے انسانیت کو پستی کے اسفل السافلین سے نکال کر عرش عروج پر کس نے پہونچا دیا؟ مغرب کے ظلمتکدہ کو اپنی صرف ایک شعاع غلط انداز سے کس نے جگمگا دیا؟ آج غریبوں کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں اور سود خوار مہاجنوں کے خلاف دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک آواز بلند ہو رہی ہے۔ مگر کیا یہ کوئی نئی چیز ہے۔ سود لینے کے ساتھ دینا بھی حرام ٹھہرانے میں کیا مصلحت تھی؟ اخوت و مساوات جس کے لئے دنیا آج اس زور و شور سے چلا رہی ہے۔ تیرہ سو برس ہوئے دنیا میں سب سے پہلے اسی کتاب نے پیش کی تھی۔ اشتراکیت کی تمام اسکیمیں اور تحریکیں زمانہ ماضی سے لیکر آجتک ناکام رہیں اور رہینگی لیکن اس کتاب کے اصولوں پر مساوات ہمیشہ کامیاب ہوئی اور ہوگی جینوا کی بین الاقوامی لیگ ریگستان عرب کے شہر مکہ کی اس بین الاقوامی لیگ کی بھونڈی اور بیکار نقل ہے جس کا سالانہ منعقد ہونا اس کتاب نے فرض قرار دیا ہے۔ آج مغرب کا دعوٰی ہے کہ سب سے پہلے یہ نظریہ ہم نے بنایا کہ "مرد و عورت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور جس طرح علم حاصل کرنیکا حق مردوں کو ہے اسی طرح عورتوں کو بھی ہے"۔ تیرہ سو برس پہلے کی لکھی ہوئی کتاب اٹھا کر ان مغرور مدعیوں کو دکھلا دیجئے کہ یہ کیا لکھا ہے "ھن لباس لکم و انتم لباس لھن" (تم انکا لباس ہو اور وہ تمہارا لباس) اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ "

طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلمٍ و مسلمۃ (طلب علم ہر مسلمان مرد و زن پر فرض ہے)۔ الغرض اس کتاب نے دنیا کی تہذیب و تمدن میں جو حصہ لیا وہ ظاہر ہے اور گذشتہ سے اندازہ لگا کر ہم نہایت یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آیندہ دنیا کی زندگی کو پہلے سے بھی زیادہ متاثر کریگی یہ رہا عربی ادب کا اثر زندگی پر۔ اب آیئے سرسری طور سے فارسی گزرتے ہوئے اردو ادب کو دیکھیں۔

فارسی قدیم ادب جیسا کہ بیان ہوا زیادہ تر مذہب اور تصوف سے تعلق رکھتا ہے یا اس میں عشقیہ غزلیں اور مدحیہ قصائد ہیں۔ پھر یہ سب چیزیں بھی ایسی نہیں جن کا زندگی پر کچھ نمایاں اثر پڑا ہو۔ ہاں صوفیانہ ادب کا یہ اثر ضرور ہوا کہ لوگوں کے خیالات زیادہ صوفیانہ ہو گئے اور بہت روز تمام ایران پر تصوف چھایا رہا۔ جب ایران میں صفوی خاندان کی حکومت شروع ہوئی تو اس کے ساتھ تصوف میں کچھ کمی آنا شروع ہوئی۔ لیکن اس کمی کا اوسط عشقیہ شاعری نے پورا کر دیا۔ الغرض فارسی ادب شروع سے لیکر موجودہ دور تک قریب قریب یکساں رہا۔ ایک طرف تصوف سلاطین کے قرب کو ممنوع قرار دے رہا تھا دوسری طرف بلند پایہ شعرا بادشاہوں کے درباروں میں مستقل طریقہ سے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف سعدیؒ نے سلاطین کی طرف سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر پند و نصائح شروع کئے۔ ان کا کچھ اثر ہوتا لیکن دوسری طرف قصائد و غزلیات کے شور نے کچھ سننے نہ دیا دو مخالف طاقتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں اور اس طرح ایک بھی اپنا اثر زندگی پر نہ چھوڑ سکی۔ جب اس طرح ادب روز بروز کمزور ہوتا گیا تو اسی کے ساتھ ساتھ قوم بھی پستی کی طرف گرتی گئی۔ آخر مغربی ادب کا اثر کہئے یا خوش قسمتی سمجھئے کہ موجودہ دور میں چند شاعر و ادیب ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اس قومی پستی کا احساس کیا۔ اس کے اسباب معلوم کئے اور ایک انقلابی ادب قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ اب پہلے کی سی رنگینی اور حسن آفرینی تو نہیں تاہم جو کچھ انہوں نے محسوس کیا اسے صاف و سادہ الفاظ میں بالکل اسی طرح بیان کر دیا۔ حقیقت ہمیشہ اثر کرتی ہے۔ اور حقیقت کیلئے کسی مبالغہ یا بیکار زیبائش کی ضرورت نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند لے نہیں ہے

تو پھر ان کی دکھ بھری آواز کیوں "پابند لے" ہوتی۔ محض تخئیلی نہیں بلکہ حقیقی کرب و اضطراب اس نالہ و فریاد کا محرک تھا۔ لہذا اس نے سننے والوں پر اثر کیا اور کرنا چاہئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ایران میں بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ہمارے بدقسمت ہندوستان سے کئی گنا زیادہ وہ پہلے زینے پر کھڑے بام ترقی پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور اگر یہ ہمت برقرار رہی تو بہت جلد ہم انہیں وہیں دیکھیں گے جہاں سنتے ہیں کہ ہمارے آبا و اجداد کا مسکن تھا۔ اور وہ "میراثِ خلیل" جو "تثلیث کے فرزند لے گئے" پھر اس کے صحیح وارثوں کو ملجائیگی۔

غرض پہلے جب بادشاہوں اور رئیسوں کی مدح میں ایسے ایسے قصائد پڑھے جاتے تھے کہ ممدوح کو اگر خدا نہیں تو کم از کم خدا کے قریب تو ضرور پہونچا دیا جاتا تھا۔ تو بادشاہ خود کو سب سے بلند اور قوی طاقت سمجھنے لگتے تھے۔ بیجا تعریف سے ہر شخص مغرور بھی ہو جایا کرتا ہے اگر بادشاہ خود کو خدا سمجھنے لگے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس وقت اس کا ہر لفظ قانون ہوتا تھا۔ وہ جو چاہتا کرتا۔ رعایا میں سے کسی کو زبان ہلانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اگر وہ ظالم ہوتا تو رعایا کو خاموشی سے اس کے تمام مظالم برداشت کرنا پڑتے تھے۔ وہ اُف بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب رنگ بدل گیا۔ اب جسارت و دلیری بڑھ گئی ہے۔ اب اگر بادشاہ ظلم کرے تو شاعر بیساختہ اور بے خطر یہ لکھدیتا ہے کہ

کشتِ ملت را کردی از ستم پاک درو — شد کہن قصۂ چنگیز ز بیدادِ تو نو

یا وہ بادشاہ کے سامنے بے تکلف کہہ اٹھتا ہے کہ

بادشاہا! ز استبداد چہ داری مقصود — کہ ازیں کار حیز ادبار نگردد مشہود

تو اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس شعور آزادی کی وجہ سے شخصی حکومتیں جیسی پہلے تھیں اب قریب قریب مفقود ہیں۔ اگر پارلیمنٹ کی سی صورت نہیں ہے تو کم از کم ایک مجلس وزرا تو ضرور قائم ہے۔ پہلے وزرا کی رائے کو بادشاہ ٹھکرا بھی دیتا تھا لیکن اب یہ خطرناک ہے۔ اس آزاد ادب نے رعایا کے ہر فرد کے دل میں آزادی کی لہر دوڑا دی ہے۔

آخر میں میں یہ ضرور کہونگا کہ صوفیانہ ادب نے اگر زندگی پر کچھ اثر کیا تو صرف یہ کہ قوم کو کمزور کر دیا۔ کیونکہ ان کے فلسفہ میں دنیا اور دنیاوی دولت کوئی چیز نہیں۔ دنیا سے اس عام نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے سلطنت چھن گئی۔ بادشاہ رنگ رلیوں میں مست۔ رعایا تصوف میں گم سلطنت کی حفاظت کون کرتا۔ اور جو تھوڑی بہت رہ گئی وہ کمزور ہو گئی جب "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والا مضمون ہو تو کمزوروں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں انہیں طاقتوروں کی لذت کام و دہن بنجانا پڑیگا۔ اور یہی ہوا۔ جب "تنازع البقا" دنیا کا ایک فطری قانون اور بقائے اصلح — Survival of the fittest — ایک اٹل اصول ہے تو پھر دنیا میں رہکر دنیا سے بے نیازی کا خیال کرنا کسقدر لغو اور مہمل بات ہے۔ جنہیں دنیا سے نفرت ہے انہیں دنیا کو قطعی چھوڑ دینا

چاہیئے اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ مسلمانوں کے دماغوں میں جب اس طرح کا لغو خیال سمایا وہ کمزور ہو گئے اور اس کے بعد بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ خدا بھلا کرے اس تصوف کا جس نے مذہب کو بھی مسخ کیا اور دنیا بھی کھوئی۔ مگر خیر اب حالات امید افزا ہیں اور اگر موجودہ ادب میں یہی جوش و ولولہ اور یہی انقلاب انگیزیاں رہیں تو انشاءاللہ تلافی مافات ہو جائے گی۔ القصہ فارسی ادب کے یہی دو مخصوص کارنامے ہیں کہ قدیم ادب نے انہیں لوریاں دے دے کر سلا لیا تھا لیکن موجودہ ادب نے پھر انہیں چھینٹے دے دیکر اٹھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور اب ہمیں گذشتہ نقصان کو بھول جانا چاہیئے کیونکہ

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے

یا یوں سمجھ لیجئے۔

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اب آیئے دیکھیں کہ ہمارے اردو ادب نے زندگی پر کہانتک اثر کیا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں ہمارا ادب سب سے زیادہ بدقسمت ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ادب چند سال پہلے تک بالکل فارسی کی نقل تھا۔ جو جذبات' دل و روح سے برآمد نہ ہوئے ہوں وہ کسی دوسرے کے دل و روح پر کیا اور کس طرح اثر کر سکتے ہیں۔ شاعروں نے شاعری کی' سننے والوں نے تعریف کر دی۔ بس انکا مقصد حاصل۔ اور اگر کسی نے خاطر خواہ داد نہ دی تو پھر اس سے لڑائی اور ہمیشہ کیلئے رنجش اور کیوں نہ ہو۔ جب وہ محض داد ہی کیلئے اتنی محنت کریں اور پھر انہیں وہ بھی نہ ملے جو انکا منتہٰی شاعری ہے تو پھر کیوں انہیں صدمہ نہ ہو۔ نثاروں نے چند ناممکن الوقوع واقعات جمع کر دیئے۔ بس ناول بنگیا۔ لوگوں نے پڑھا۔ تفریح ہو گئی۔ چلوان کا بھی مقصد پورا ہو گیا۔ تو بتایئے اس ادب کا کیا اثر زندگی پر پڑ سکتا ہے۔ اگر اس کا کچھ اثر زندگی پر ہوا تو صرف یہ کہ ہر تعلیم یافتہ و غیر تعلیمیافتہ شاعر بنگیا اور بازاری مذاق کی شاعری کر کے دیوان کے دیوان سیاہ کر دئے۔

وہ قوم جو تلوار لے کر ہندوستان میں آئی تھی اس کے ہاتھ میں اب ٹوٹا ہوا قلم رہگیا۔ جن کی کمروں میں ہر وقت ایک خونخوار خنجر چمکا کرتا تھا ان کے کانوں پر ایک بیہودہ رقم قلم رہ کیا ہے۔ جس قوم کے جنگی نعروں نے زمین و آسمان میں ہلچل ڈالدی تھی اب اسکا نالہ و شیون آسمان سے ٹکراتا ہے۔ ہوا میں گونجتا ہے اور فضا کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ جو قوم میدان جنگ میں رجز پڑھنے کی عادی تھی۔ اب وہ ادنیٰ مخلوق خدا کی مدح میں نغمات بندگی گاتی ہے۔ جس قوم کی گردنیں دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت کے سامنے کبھی نہیں جھکی تھیں اب وہ اپنے تصور سے بنائے ہوئے بتوں کے قدموں پر سجدہ ریز ہے۔ یہ سب ہمارے اس گندہ اور بزدلانہ ادب کا نتیجہ ہے۔ جب تلوار تھی اس نے اپنا کام کیا مگر جب انہوں نے تلوار کو ٹوٹے ہوئے بیہودہ رقم قلم سے تبدیل کر لیا تو اب جو اس قسم کے قلم کا کام ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا۔ رجز کا جو اثر ہوتا ہے وہ ہوا۔ اب نغمات بندگی غلامی کی تکمیل کر رہے ہیں۔ جب خودداری اور دلیری تھی دنیا خود بخود کانپ کانپ کر ہمارے سامنے سے جگہ چھوڑ دیتی تھی۔ اب ایک کمزور اور بیحیا معشوق بھی ایک خدا ہے تو پھر ہماری شدت غلامی کا کیا ٹھکانا۔

آخر یہ دور نکبت و فلاکت کبتک رہتا۔ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جن کی دور بین نظروں نے اس مہمل ادب کے خطرے کو محسوس کیا۔ اُدھر کچھ مغربی ادب نے اپنا اثر دکھلایا اور آخر اردو ادب میں رفتہ رفتہ ایک انقلاب رونما ہوا۔ اور جو اقبال کی ہستی میں انتہا کو پہونچ گیا۔ وہ بلند نظر فلسفی اپنے فلسفہ کا تیشہ لیکر اردو شاعری کے کوہستان پر چمکا اور اپنے تیشہ کی چند ضربوں سے اس نے اس پہاڑ کو قریب قریب ڈھا دیا۔ اب اس میں سے ایک نہر نکلی' صاف و شفاف اور مترنم۔ جس نے ادب کے خشک چمنستان کو بہار کی بوقلموں رنگینیوں سے ہم آغوش کر دیا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے صور بیداری پھونکا جس کے اثر سے کچھ تو ایکدم چونک کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ اس کے ہم آہنگ ہو کر بیداری کے نغمے گانے لگے اور باقی کم از کم کروٹیں لینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بیداری' یہ جوش عمل' یہ آرزوئے ترقی جو ہماری موجودہ نسل میں پائی جاتی ہے سب اسی کی "صدائے دردناک" کی رہین منت ہے۔ اب جو اس قافلے میں ایک اضطراب و بے چینی نظر آتی ہے یہ اسی کی "بانگ درا" کا نتیجہ ہے۔ آج ہندوستان کے مزدوروں کی بیداری اس "پیام خضر" کا اثر ہے جو اس نے اپنی زبان سے سرمایہ داروں کی "حیلہ گری" کو ظاہر کرتے ہوئے "بندۂ مزدور" کو دیا۔ غرض اقبال اسی دور ظلمت و نکبت میں اپنے پیغام عمل کی منور شمع لیکر ایک پیغمبر کی حیثیت سے آیا۔ اُس نے جب پیغام عمل دیا تو پیغمبری کی اور جب عشق و محبت کے نغمے گائے تو ساحری کی۔ رفتہ رفتہ اس کے مشن کو دوسرے اور شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمہ لے لیا اور جوش' سیماب اور ساغر وغیرہ نے عشقیہ مضامین کیساتھ ساتھ قومی اور ملکی نظمیں بھی کثرت سے لکھیں۔ اُدھر قاضی نذرالاسلام نے بنگالی زبان میں وہ وہ شعلے برسائے کہ بنگالیوں کے خرمن غفلت کو پھونک کر رکھدیا۔ اور جو "ستارۂ تخریب" جیسی ہلچل ڈالدینے والی طوفانی نظم لکھ سکتا ہے وہ زندگی میں کون سا انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

یہ تو ہوا منظوم ادب۔ ادھر سائنس و فلسفہ اردو ادب میں آیا اور کچھ مولویوں کی سخت گیریوں اور شدت کا اثر کہ پرانے خلاف عقل اعتقادات کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ رسالہ نگار ایک مدت سے مولویوں کے خلاف

ایک کامیاب جہاد کر رہا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ کہ اب اسلام کا مفہوم پہلے سے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پہلے اگر اسلام نام تھا لانبی داڑہی، نیچی عبا۔ عمامہ اور تسبیح کا تو اب جوش عمل اور مکمل انسانیت کا نام اسلام ہے۔ اہل ہنود میں بھی چھوت چھات غائب ہو رہی ہے اور اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ محض اردو ادب ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اس میں بہت کچھ مغربی تہذیب و ادب کا بھی ہاتھ ہے تاہم اردو ادب نے بھی مذہب میں نمایاں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

اب کچھ لوگ آئے اور عورتوں کے وکیل بنکر آئے انہوں نے اصلاحی افسانے اور ناول لکھے جن میں عورتوں کی تعلیم کیطرف توجہ دلائی، ان کی مظلومیت کا اظہار کیا۔ اس پر مغربی تہذیب نے تازیانہ کا کام کیا۔ اور چند سال کے اندر ہندوستان کی عورت کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ کیا پچاس سال پہلے کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان کی عورت گول میز کانفرنس میں حصہ لے سکے گی۔ یا میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ اور کونسلوں کی ممبر بن سکیگی۔ ڈاکٹر یا وکیل ہو سکیگی اور جب ابھی ہندوستان کے بہت سے مرد ہوائی جہاز یا خود ان کی اصطلاح میں "چیل گاڑی" کے قریب جاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں تو عورت اس میں بے جھجک سفر کر سکے گی۔ یا تو وہ زمانہ تھا جب بقول ز۔ خ۔ شروانیہ مرحومہ ریل کے نام سے دل میں دھواں اٹھتا" تھا یا اب جب کبھی آپ اسٹیشن پر پہونچ جائیں تو آپ کو نقاب اُلٹے ہوئے چہروں اور رنگین ساریوں کے ہجوم میں اپنی نظر کو ایک جگہ قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

سیاسی ادب میں اخبارات نے زیادہ حصہ لیا۔ اور آزادی کی عام رو تمام ہندوستان میں دوڑ گئی۔ جو کبھی تحریک خلافت اور کبھی کانگریس کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ غریبوں اور مزدوروں کی دردناک حالت دکھلا کر حکومت کی توجہ اسطرف مبذول کرائی گئی اور خود ان مظلوموں کو اپنی مظلومیت کا احساس کرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بھی ایک اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اور آخر حکومت کو دیہات سدھار کی اسکیم کے ساتھ ساتھ قرضہ بل وغیرہ قسم کے قوانین پاس کرنا ہی پڑے۔ اس آزادی کی عام خواہش کا اثر یہ ہوا کہ بنئے اور کمزور غلاموں نے مسلح اور قوی آقا کے دل میں اپنی طرف سے اندیشہ اور خطرہ پیدا کر دیا۔ اگر اس اندیشہ اور خطرہ نے ایک طرف بہت کچھ اصلاح بھی کر دی۔ تو دوسری طرف پریس ایکٹ کو سخت بھی کر دیا۔ اور اگر آج پریس پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں۔ تو ہندوستان میں بھی بہت سے روسو اور والٹیر جن کی زبانیں اس ایکٹ نے بند کر رکھی ہیں شعلے برساتے ہوئے منظر عام پر نظر آنے لگیں۔ اور انقلاب فرانس سے بھی زیادہ خوفناک انقلاب یہاں برپا ہو جائے۔ پھر یا تو تمام ہندوستان معہ اپنی غلامی کے صفحۂ دنیا سے غائب ہو جائے یا وہ پھر پہلے کی طرح "سونے کی چڑیا"

اور "جنت نشان" بنجائے۔

الغرض ایک زمانہ وہ تھا جب ہر طرف افلاس و نکبت تھی۔ ہر سمت پستی و ظلمت تھی۔ غلامانہ ذہنیت کارفرما تھی۔ ہر طرف غلام ہی غلام نظر آتے تھے، بارِ غم سے جھکے ہوئے، درد سے کراہتے ہوئے، اور کرب و اذیت سے روتے ہوئے، مزدور تھے "سرمایہ دار حیلہ گر" کے خونیں پنجہ میں گرفتار کمزور دہقاں تھے امیروں کے ہاتھوں لٹے اور پٹے ہوئے۔ زیر دست تھے زبردستوں کے ہاتھوں برباد کئے اور ستائے ہوئے۔ شاعر کی دردمند نظر اور حساس دل نے اسے دیکھا اور بیساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا　　مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے　　تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

کم فہموں کو اپنی حقیقت کا احساس کرا کے اس نے غلاموں کی مظلومیت کو دیکھا اور یہ کہہ کر انہیں غیرت دلائی کہ

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھکو　　کوئی دستار میں رکھلے کوئی زیب گلو کر لے

انہیں غیرت دلا کر پھر اس طرح پیغام عمل دیا کہ

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر　　شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
تو در زیر درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی　　بہ پرواز آ کہ صید مہر و ماہے می تواں کردن

اور ابھی ہندوستان میں یہ پیغام گونجے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ سوئی ہوئی آنکھوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ میٹھی نیند سونے والے کروٹیں لینے لگے "عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا" اور آج خود شاعر تسلی آمیز لہجے میں یہ کہ رہا ہے کہ

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز　　بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اور اگر یہی آتش نوائی اور شعلہ باری رہی، ایک دردمند کی آواز اسی طرح اثر کرتی رہی تو چند روز میں یہ عہد فلاکت و نکبت، دور نہضت سے بدل جائیگا۔ یہ ظلمت نور و تجلی سے تبدیل ہو جائیگی۔ نالہ و فریاد قہقہے بنجائینگے اور آنسوؤں کے بجائے تبسم ہی تبسم نظر آیا کریگا۔ خود شاعر ہی کی زبان سے سن لیجئے کہ چند روز کے بعد یہ دنیا کیا ہو جائیگی۔ کہتا ہے اور باعلان کہتا ہے کہ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
آملینگے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک　　لیعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی
شبنم افشانی مری پیدا کریگی سوز و ساز　　اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائیگی
دیکھ لوگے سطوتِ رفتار دریا کا مآل　　موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں　　محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

لہ یہ ہم آج بھی یورپ میں اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

المختصر ہم نے اپنے مضمون کے دونوں رخ دیکھ لئے زندگی نے ادب پر جو اثر کیا وہ بھی اور ادب نے زندگی کو جس طرح متاثر کیا وہ بھی۔ اور اگر ادب اور ادب ہی کیا دنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیاں۔ رنگینیاں اور رعنائیاں اسی زندگی کا نتیجہ ہیں تو ادب بھی کوئی معمولی اور کم اہم چیز نہیں۔ بہرحال اس تمام مضمون کے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اگر ایک طرف ہم زندگی کیلئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ہوتی اگر یہ زندگی علم نہ ہو، ادب نہ ہو　　چرخ نہ ہو، زمیں نہ ہو، روز نہ ہو، یہ شب نہ ہو

تو دوسری طرف ادب کے لئے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ

گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو　　پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

حفیظ نعیمی

نالۂ دل

(نذر دوست)

پھر خون جگر سے سینے کے میں آباد اجڑا بستان کروں
بیتابی دل کا اے ہمدم اور تجھ سے حال بیان کروں
للہ نہ کر اصرار، نہ آئیگا لطف اس کے سننے میں
کیوں تیرے سکوں میں مخل ہو کر اب میں تجھکو حیراں کروں

گلزار امید و مسرت پر بے طرح اداسی چھائی ہے　　محسوس ہے گو آبادی میں لیکن یہ دل صحرائی ہے

تالیف و طمانیت کا نشاں ملتا ہی نہیں انسانوں میں
اک شور بپا رہتا ہے ہر دم ان فانی دیوانوں میں
دکھیوں کی درد بھری آہیں بے معنی! اے اللہ یہ کیا؟!
ہے محو مگر ساری دنیا فرضی و غلط افسانوں میں

صادق کا حال زبوں! انصاف کا خوں! باطل کی پذیرائی　　شوریدہ سری مختاروں کی! مجبوروں کی بے دست و پائی

پامالی حسرت سہنے کی اب دل میں نہیں طاقت ہمدم!
انصاف تو کر للہ ذرا! کب تک میں اٹھاؤں بار الم!!
دل ڈوب گیا ناکامی کی موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر
اف! برق محبت نے کر ڈالا صبر و سکوں درہم برہم

ہے میرے لب خاموش میں اک پر درد حکایت پوشیدہ　　رکھتی ہوں تبسم کے پردے میں قلب حزیں رنجیدہ!!

رگ رگ میں بہرنگ تار نفس ہر وقت سما تا رہتا ہے
وہ جس نے شراب عشق پلا کر مجھکو کیا ہے دیوانہ!
یہ یاس انگیز فضائیں ہیں پر کیف اسی کے تصور سے!
آباد ہے اس تنگ میگوں کی یاد سے دل کا ویرانہ!!

کچھ اور بجز اس دھن کے نہیں، اللہ! تمنا اس دل کو　　سودا ہے یہی وحشت ہے یہی ملجائے مرا یوسف مجھکو

"دلفگار"

بُجھوَن ایک پہیلی

قصہ مختصر انٹرنس میں نہایت عمدہ نمبروں سے فیل ہوئے۔ آپ کہیں گے "کند ذہن تھے"۔ میں کہتا ہوں کہ بیوی سے لڑکر یا علی طبیعت سے پرچے دیکھئے تو فیل کرنے کے سوا آپ کو اور توفیق ہی کیا ہوگی؟ فیل ہونے کے بعد اسکول کے ساتھ گھر بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ ابا صاحب دوسری شادی رچا بیٹھے۔ بھلا سوتیلی ماں یہ کیوں پسند کرتی کہ سوت کی اولاد اُسکے سامنے پروان چڑھے، چنانچہ جب گھر سے نکال دیئے گئے تو روٹی کا فکر ہوا، مگر روٹی ملتی کہاں سے؟

چار پانچ روز تک یونہی ادھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا رہا مگر نوکری کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جو چند پیسے بچ رہے تھے وہ بھی ایک ایک کرکے خرچ ہو گئے۔ تین وقت سے کھیل کا دانہ تک اُڑ کر منہ میں نہیں گیا اور شکل پر بارہ بجنے لگے۔

بھیک مانگتے ہوئے شرم آتی تھی اسلئے یہ سوچ کر کہ اپنے دیس سے دور کسی دوسری طرف کچھ نہ کچھ مل ہی جائیگا ایک طرف چل کھڑا ہوا، شہر چھوڑے کئی گھنٹے ہو گئے، اور پیٹ پیٹھ سے آلگا، مگر میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے ہی بڑھتا رہا۔ چند اور گھنٹے گذر گئے، یہاں تک کہ شام کے جھٹ پٹے میں دانہ دُنکا چگ چگاکر چڑیاں اور کوے رین بسیرا کرنے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگے لیکن مجھے پیٹ بھرنے کی اب بھی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کبھی کبھی زندگی کی آس ٹوٹ جاتی تو سوچتا "موت کو یونہی آنا ہے تو آچکے، کم از کم بھوک سے تو چھوٹ جائینگے....."

آکاش پر چندرماں براجمان ہو چکے تھے اور ہلکی ہلکی چاندنی میں چاروں طرف کی چیزیں مدہم سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ چند گز کے فاصلے پر مٹی کی اونچی مینڈھ سے گھرا ہوا ایک کھیت تھا اور مکئی اور باجرے کی فصل تیار کھڑی تھی۔ طبیعت ہری ہوگئی۔

لپک کر میں مینڈھ پر چڑھا مگر دھوتی کانٹوں میں اُلجھ گئی، بڑی مشکل سے اس سے چھٹکارا پاکر چپکے چپکے دو چار بھٹے توڑے، ادھر اُدھر سے کچھ کھپچیاں جمع کرکے آگ جلائی۔

تھوڑی دیر ہوئی ہوگی کہ آواز آئی "کون ہے رے؟ کیا کرت ہے؟"

رُوح فنا ہو گئی "مسافر ہوں بھیا"۔ میں نے بے چارگی سے کہا "بھٹے بھون رہا ہوں"۔

"خریدے ہیں کیا" ایک تگڑے سے جوان نے میرے قریب آکر پوچھا۔

"خریدتا کہاں سے"؟ میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا "بھوکا ہوں بھائی۔ کئی وقتوں کا فاقہ ہے"۔

"تو چوری کی ہے؟ سرم نہ آئی؟" وہ مجھے ذرا حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا کروں" میں نے عاجزی سے کہا "بھوک کے ارے مرا جا رہا ہوں۔ ورنہ چوری کبھی نہیں کرتا"۔

"بڑے اپسوس کی بات ہے" کہکر وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھے غور سے دیکھ کر کہنے لگا "سکل سے تو سریف معلوم ہوتے ہو! بھوکے کاہیکو ہو؟"

"اس زمانے میں تو شریف ہی بھوکے رہتے ہیں"۔ میں نے کہا "تو کیا میں تمہارے بھٹے کھالوں؟"

وہ میری بات نہ سمجھ سکا اور نرم لہجہ میں بولا "یہ اپنے ناہیں ہیں، میں تو ادھر سے جا رہا تھا۔ پر تم کہاں رہت ہو؟"

میں نے اپنی کہانی سُنائی تو وہ بڑا ملول ہوا اور دھیرے سے کہنے لگا "تم میرے ساتھ چلو۔ یہاں سے تھوڑی دور میری جھونپڑی ہے، جہاں میری عورت اور بالک رہتے ہیں۔ تم کو وہاں باجرے کی روٹی اور گڑ مل جائیگا، بھیے، چوری سے منش خراب ہو جاتا ہے"۔

اسکی ہمدردی سے میرا دل بھر آیا۔ کیا یہ دیہات والے جنہیں ہم حقیر سمجھتے ہیں، دوسروں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتے؟ میں اسکے ساتھ چل دیا، اور اُسکے گھر پہنچ کر مجھے اتنا بھی احساس نہ رہا کہ یہ بیچارا اپنا پیٹ کاٹ کر میرے تن میں جان ڈال رہا ہے۔ رات گئے تک ہماری باتیں ہوتی رہیں۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کہنے لگا "بڑا کھراب جمانا ہے گردھاری! پر کیا کریں جندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ تم صبح میرے ساتھ چلنا۔ میں اپنے مالک سے کہہ کر تمہیں کارکھانے میں ملاجم رکھا دونگا۔ وہ بہت دیالو ہے اور مجوروں کی اسے جرورت پڑتی ہی رہتی ہے، چار آنہ روج ملیں گے۔ تم کو بہوت ہیں...... اور یوں تو بڑے بڑے بابو بالسٹری پاس کرکے بھی بھوکے مرتے ہیں۔"

"میں مزدوری کرونگا؟" میں نے دلمیں کہا "سات آٹھ روپلی سے میرا کیا کام چل سکتا ہے۔" مگر پھر مجھے اپنے فاقوں کا خیال آیا اور میرے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا "ہاں ہاں گوری شنکر! تم مجھے نوکر کرادو، میں محنت مزدوری کرونگا۔"

کارخانے کا مالک رتن لال بڑا بدمزاج اور مغرور شخص تھا اسکے چہرے سے شرارت ٹپکتی تھی، اور تمام مزدور اس سے بیحد ڈرتے تھے۔ گوری شنکر کی منت سن کر ایک دفعہ اور اس نے مجھے سر سے پیر تک حقارت آمیز نظروں سے دیکھا ــــ "تو تم نوکری کروگے؟ ہوں!! پتھر تم سے کاہے کو کٹیں گے؟ کدال تم سے کیسے چلیگی؟ تم تو بابو ہو بابو! تم نے اس لالچ میں پڑھا کہ سرکار تمہیں نوکری دے دیگی، جاؤ نا اب اسکے پاس! تمہیں ان حالوں پھرتے دیکھتے اُسے لجّا نہیں آتی؟" مجھے اپنی بیکسی پر رونا سا آگیا کہ یہ پڑھائی تو بجائے فائدہ پہونچانے کے اُلٹی جڑ ہی کاٹ رہی ہے۔

رتن بولا "اور تم سے نوکری ہوگی کیسے؟ ذرا اپنا بدن تو دیکھو، ایک پھاوڑے میں تمہارا تو بازو اُتر جائے گا" لیکن میں نے پھر بھی گوری شنکر کے ساتھ اسکی خوشامد کی جسے سُن کر اس نے تکبر سے کہا "کیوں بے گوری! یہ تیرا باوا لگتا ہے کیا؟ کیوں سر ہوئے جاتا ہے؟...... اچھا، خیر! جاؤ کام کرو، مگر کام انیس[19] نہ ہو، ورنہ دو آنے بھی نہ ملیں گے۔"

چار پانچ گھنٹے تک بمشکل تمام میں کام کرتا رہا لیکن جسم شل ہوگیا اور بازو اور کمر شل ہوگئی۔ میں اپنی قسمت پر آپ ہی آپ آگ بگولا ہو رہا تھا، تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ رتن مزدوروں کو ڈانٹتا ڈپٹتا چلا آرہا ہے۔ کسی کو لات ماردی، کسی کو موٹی سی گالی سنائی، اور کسی کی پگڑی پر زور سے لپڑ دیا۔ میں اسے کیسے برداشت کرلیتا۔ چنانچہ میں نے سوچ لیا کہ اگر مجھ سے کچھ بولا تو اس کو پکڑ کے رکھ دونگا۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں اُلجھا اور چُپ چاپ میرے پاس سے گذر گیا۔

(۲)

میں جس کارخانے میں ملازم تھا وہاں نیچ قوم کی عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔ مجھے یہاں کام کرتے کوئی سال ڈیڑھ سال ہوا ہوگا، کہ ہم میں ایک نئی عورت شامل ہوئی جو ذات کی چماری تھی مگر دیکھنے میں ایسی نہ معلوم ہوتی تھی، اُجلا رنگ، درمیانہ قد، اچھا ناک نقشہ اور خدوخال پر شرافت کے آثار، شاید جوانی کے ستائے ہوئے کسی شریف صاحبزادے کی اسکی ماں پر مہربانی ہوگئی ہوگی جس کا نتیجہ سونا کے وجود میں ظاہر ہوا۔ گوری شنکر کہنے لگا "وہ جو بڑھیا شرتی تھی نا، وہ سوموار کو مرگئی، یہ اُسی کی لونڈیا ہے۔ بابو جی نے کرپا کرکے اسے اپنے یہاں ہی نوکر رکھ لیا...... بیچاری اکیلی ہے۔" بات آئی گئی ہوگئی۔

کچھ دن یونہی گذرے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ "ہم بھی ہیں تیرے پرستاروں میں"۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ اسکی سگائی ہوچکی تھی، اور اسکا میاں ایک آدھ دن میں آنے والا تھا۔

بھادوں کی ایک شام تھی اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سورج دیوتا لال پیلے رنگ بدلتے ہوئے پچھم کی طرف دوڑے جارہے تھے اور سونا کھنٹوں سے

اونچا لہنگا اُٹھائے پٹکے ہوئے آہو کی طرح ہولے ہولے چل رہی تھی میں بھی تھوڑے فاصلے پر اسکی گوری گوری پنڈلیوں کو آنکھوں میں بسائے چھپتا چھپاتا چلا جا رہا تھا۔ جھونپڑی تک پہونچتے پہونچتے اندھیرا پھیل گیا، اور اسکے بالوں جیسی کالی رات چاروں طرف بکھر گئی۔ میں جھونپڑی کے پیچھے ایک کونے میں کھڑا ہوکر ایک موکھے میں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اس نے اندر آکر پہلے دیا جلایا اور پھر ایک ہنڈیا کی طرف بڑھی کہ دفعتاً .... میں نے دیکھا کہ .... وہ مہا دیا لو، سیٹھ رتن لال جی شراب پئے ہوئے سونا کی طرف چلے آتے ہیں سونا یکا یکی "کون؟" کہکر پلٹی، اور رتن نے ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "سونا! ـــ تو ڈر گئی؟ .... اری پگلی میں تجھے ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں .... میں تجھ سے سادی کرونگا .... آ میرے سینے سے لگ جا" اور اس کو آغوش میں لینے کے لئے اس نے اپنے مضبوط ہاتھ اسکی طرف بڑھا دئیے۔ سونا سہم کر پیچھے ہٹی "کیا کہتے ہو مہاراج! میرا آدمی آجکل میں آجائیگا تو وہ ......"

"ارے چھوڑ اس آدمی کو" .... رتن اسکے سینے پر سے مسکی ہوئی چولی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بات کاٹ کر بولا "تیرا گونا تو نہیں ہوا پھر کس بات کا فکر کرتی ہے؟ مجھ سے سادی کر لیگی تو تجھے سیٹھانی بناؤنگا۔ اور .... یہاں تو آ ......"

"سچ کہتے ہو مہاراج! سونا سراسیگی کی حالت میں کہنے لگی "پر دھرم بھی تو نشٹ ہو جائیگا، آتما بھی تو پاپن ہو جائیگی ......"

"پگلی کہیں کی ...." رتن اسکو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا "بس چپکی ہو جا ......"

اس نے دیئے کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ تھوڑی دیر تک آوازیں آتی رہیں "کیا کرتے ہو بابو ... رہنے دو .... میں بیاہتا ہوں ...... میرا آدمی ...." اور پھر ایک دلدوز چیخ کے بعد مکمل تاریکی اور خاموشی چھا گئی۔

میرے پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے اور اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سنگدل سے کشتم کشتا کر سکتا لہٰذا جس طرح ہو سکا میں بھاگم بھاگ گوری شنکر کے گھر پہونچا، اور اُسے جھنجوڑ کر تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ غصے میں اس کا خون (ونٹنے لگا اور اس نے میرے ساتھ جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے کہا "ماں کسم سر پھوڑ دونگا سورے کا۔ کیا سمجھا اس نے؟ کسو کی اجت لینی کوئی مجاک ہو کیا؟"

جب تک ہم وہاں پہونچے، رتن وہاں سے جاچکا تھا اور جھونپڑی کے اندر سے آہ و بکا اور سسکیوں کی آوازیں اس طرح آرہی تھیں گویا رات سسکیاں لے لے کر رو رہی ہو۔

(۳)

صبح ہوتے ہوتے گوری شنکر نے بہت سے مزدوروں کو خبر کر دی۔ مگر جب رتن کو معلوم ہوا تو اس نے بھی تھوڑی دیر میں سارا بند و بست کر لیا۔ کسی کا دھمکی سے اور کسی کا پیسے سے منہ بند کیا اور جو ذرا جی دار تھے، پولس کو روپیہ کھلا کر الٹا انہیں کو پھنسا دیا۔ میں اسلئے کہ میری مزدوری چار آنے سے چھ آنے کر دی گئی اور گوری اسلئے کہ وہ رتن کے ہاتھ نہ لگا۔ اسی روز سونا کا شوہر جو ایک گبرو جوان تھا یہاں آ پہونچا لیکن رتن کے سکھائے ہوئے آدمیوں نے سونا کو بدنام کر کے اُسے اُس سے بدظن کر دیا۔

شام ہونے کو آئی، چرواہے بھیگی ہوئی بانسریوں کو بجاتے گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کو ہنکائے لئے جاتے تھے کہ گوری ایک درخت کی آڑ میں سے نکل آیا۔ اور میرے پاس بیٹھ کر ہولے سے کہنے لگا "کیا سوچت ہو؟"

میں نے اسکے باوقار چہرے پر سنجیدگی کی جھلک دیکھ کر رسان سے جواب دیا "جیون کو بوجھنے کی کوشش کر رہا ہوں"

وہ شاید کچھ سمجھ گیا کیونکہ اسکے ہونٹوں پر حقارت آمیز اور طنزیہ مسکراہٹ آگئی "ہوں!! .... اچھا ...... ہاں، سونا کا اب کیا ہوگا؟

...... اس کا آدمی رُوٹھ کر چلا گیا ہے !"

"رام جانے! میں نے مونگ پھلی کے دانے مُنہ میں ڈالتے ہوئے کہا "امیر غریبوں کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتے ہیں — اور سرکار بھی غریبوں کی حمایت نہیں لیتی "

"سرکار نہ لے تو نہ سہی" اُس نے فوراً ہی جواب دیا "اور ہم غریب ہیں تو کیا ہوا، موقع ملے تو میں اس بدمعاش کا خون چوس لونگا...... ان بزدلوں کو دیکھو اس چنڈال سے ڈر گئے ...... تم تو میری مدد کروگے نا؟"

گویا مجھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑا! "نہیں، نہیں" میں نے کہا "میں کچھ نہیں کر سکتا۔ امیر اپنے ہتھکنڈوں سے غریبوں کو تباہ و برباد کیا ہی کرتے ہیں.... اور پھر ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

وہ ایک دم کھڑا ہوگیا اور اسکی آواز میں تلخی آگئی "ہاں جی لالہ گردھاری مل! تم بھلا کیا کرسکتے ہو؟ تم تو امیروں کو خوش کرنیکے لئے انکے ہاتھوں اپنی اجت اور دھرم بھی بیچ دوگے!"

"عزت اور دھرم کو تو گھر چھوڑ دیا" میں نے کہا "وہاں سے تو بس پیٹ لیکر چلا ہوں ...... مجبوری ہے"

"ہاں مجبوری ہی تو ہے! تم شہریوں کے لئے" نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا "میں تو ایسی مجبوری پہ لات مار چکا ہوں"

"باؤلے ہوئے ہو، تم ٹھاکر! میں نے اسے گویا سمجھاتے ہوئے کہا "بیوی بچے جو ہیں تمہارے! اور یہ سات آٹھ سال کی نوکری!!"

"پیٹ تو تم لیکر چلے ہو چودھری! میں ایشور کے گھر سے دہرم اور اجت لایا ہوں" اس نے جواب میں کہا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

اب آپ ہی بتایئے کوری بے وقوف نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر میں بھی نوکری چھوڑ دیتا تو آج یہ ٹھرّے، چٹ پٹی دال اور بھنے ہوئے چنوں کے لئے دھیلی پائی روز کا خرچ کہاں سے چلتا؟

صادق الخیری

غزل!

ساقی مست ہی پیمانہ بکف شیشہ بدست | اور کیا چاہیئے توبہ کے لئے عذرِ شکست
آنکھ ملنا تھا کہ پہلو میں دلِ زار نہ تھا | ہائے وہ شوخیٔ بیتاب وہ رعنائی مست
نگہ شوق میں عالم ہے مرقع اُن کا | اب وہی وہ نظر آتے ہیں بہر جلوۂ مست
مان بھی جاؤ ہٹا دو رخِ زیبا سے نقاب | تشنۂ حسن ہے کب سے نگہِ حسن پرست
تو گرفتارِ محبت ہوں ذرا یاد رہے | ابتدا ہی میں نہ ہو جائیں کہیں حوصلے پست
دیکھتے جاؤ ذرا مڑ کے نگاہِ ناکام | سنتے جاؤ دلِ مایوس کی آوازِ شکست

وقت پر ساتھ کسی نے نہ دیا اے کوکب
گم ہوا قافلۂ شوق بہ یک جلوۂ مست

کوکب، (شاہجہاں پوری)

فصیح الملک

ناظمِ یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک، بلبلِ ہندوستان۔ جہاں اُستاد، نواب مرزا خاں بہادر داغؔ، دہلی کے "لعلِ شب چراغ" راقم الدولہ ظہیرؔ دہلوی ان کے اُستاد بھائی تھے، ظہیرؔ کا ناز تو دیکھو، کہتے ہیں ؎

ہم بھی جناب داغؔ کے ہم درس ہیں ظہیرؔ
بلبل ہیں وہ تو طوطیِ ہندوستاں ہیں ہم

شعرا کی یہ سُنت ہے کہ اپنے اپنے باکمال اُستاد کا ذکرِ خیر کہیں نہ کہیں کر جاتے ہیں، جس سے اکتسابِ فیض پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً بحرؔ کا یہ شعر۔

فیض پہونچا اک جہاں کو اُن کی تحقیقات سے
حضرت ناسخؔ کا کیا کہنا حکمت اُستاد ہیں

رندؔ لکھنوی

چلے اب حضرت آتشؔ سے کرو عرض اے رندؔ
معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

نسیمؔ لکھنوی

میں ہوں اے تسلیمؔ شاگردِ نسیمؔ دہلوی
مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

نسیمؔ بھرتپوری

دلکش نہ ہوں کیوں نسیمؔ کے شعر
شاگرد ہے داغؔ دہلوی کا

خود داغؔ کہتے ہیں ؎

بعد اُستاد ذوقؔ کے کیا کیا
شہرت افزا کلام داغؔ ہوا

اس موضوع پر سینکڑوں نہیں ہزاروں شعر پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن جناب داغؔ کو دیکھئے کہ ان کی ہمدرسی پر ان کے اُستاد بھائی فخر کرتے ہیں، اپنے آپ کو طوطیِ ہندوستان کہتے بھی ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں بلبلِ ہندوستان کی ہمدرسی کا شرف حاصل ہے ؏

داغؔ معجز بیاں ہے کیا کہنا

اب اور آگے بڑھیئے! امیرؔ کا تعلق لکھنؤ سے داغؔ کا تعلق دہلی سے، ان دونوں اسکولوں میں جو مغایرت تھی وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس مغایرت پر معاصرانہ چشمک، سونے پہ سہاگہ، باوجود اسکے صوفی باصفا[۱] امیرؔ، داغؔ کی غزل پر غزل کہتے ہیں، مقطع ملاحظہ ہو!

امیرؔ اچھی غزل ہے داغؔ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

امیرؔ صاحب، داغؔ صاحب سے "دامنِ گلچیں" کے لئے غزل طلب کر رہے ہیں:۔

"...... موجودہ گلدستوں سے فروغ کی صورت اگر ہے تو یہی کہ محاسنِ معنوی میں کوشش کی جائے، اس کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ معدودے چند نامور شعرائے خوش فکر و خوش مذاق کا کلام ہمیشہ اس میں چھپے، آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقۂ نامور کی افسر ہے اور غایت مشتاقی سے اب غزل کہہ دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لہذا خواستگار ہوں کہ اپنی طبعِ نازک پر جبر کر کے بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجئے، مگر یہ پہلے سے کہے رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم غریبوں کو بھی کہنے کی گنجائش رہے۔ یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دُنیا بھر کے قلم توڑ دئے جائیں۔"

اچھا اسی سلسلہ میں امیرؔ صاحب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ فرمایئے!۔

"میرے پُرانے یار پُرانے غمگسار حضرت داغؔ سلامت

خداوند تعالیٰ یوماً فیوماً آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے ملک کو آپ کی قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اس کو آپ کا دل بخوبی جانتا ہوگا۔ آپ حاسدانِ کوتہ اندیش کا کچھ خیال نہ کریں، اربابِ کمال خصوصاً وہ جن سے زمانہ کچھ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہیں، محسود ہونا سرمایۂ ناز و فخر ہے، حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے۔"

۱؎ منشی صاحب کی جامعیت سے میں بہت مرعوب ہوں لیکن "تغزل" کی حد تک کبھی آہ داغؔ اور کبھی واہ داغؔ کہنا پڑتا ہے ۱۲

تذکرہ "انتخاب یادگار" دیکھئے اسمیں حضرت امیر مینائی جناب داغ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں :۔

داغ ۔ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں مغفور، چالیس برس کی عمر، صاحب دیوان شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگردوں میں فرد کامل، خوش مذاق ہونے میں یکتائی حاصل[ہ] ۔

"امام الفن" حضرت جلیل، حضرت امیر مینائی کے خاص شاگرد اور جانشین ہیں، ان خصوصیات کے حامل ہو کر بھی فرماتے ہیں

داغِ فراقِ داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زباں پہ اہل زباں کی ہے ہائے داغ

حقیقت بھی یہی ہے

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

جلیل کے بڑے استاد بھائی مولانا ریاض خیر آبادی جلیل کے دیوان کی تاریخ کہہ رہے ہیں بھلا داغ کے ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ مگر نہیں موقع ہو یا نہ ہو۔ ع

داغ اپنی بہائے جاتا ہے

دیکھیئے! حضرت ریاض، داغ کو کس طرح یاد کرتے ہیں

داغوں کے تھے باغ کھلے بعد داغ کس سے کہوں دردِ نہانِ سخن
کس سے کہوں کون بنا بعد داغ چارہ گرِ دردِ نہانِ سخن
داغ مٹے مٹ گئے استاد امیر ہے سخن اب مرثیہ خوانِ سخن
رہ گئے "ہم" گردِ پسِ کارواں نقشِ کفِ راہروانِ سخن
نقشِ کفِ پا بھی نہیں نقشِ آب خاک سرِ آبِ روانِ سخن

غور کیجیئے! اس "ہم" میں کون کون ہیں اور انکی "ہستی" کیا ہے؟

دیکھا آپنے ریاض کا اعتقاد داغ کے ساتھ!

امیر مینائی کے ایک اور باکمال شاگرد ہیں مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب، انہوں نے مجموعہ مکاتیب شائع کرکے ہم شیفتگان اردو پر بڑا احسان کیا ہے، اس مجموعے کی ابتدا میں امیر و داغ کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

آخر عمر میں استاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھکر زبان کی صفائی اور تاثیر پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے تاہم صنم خانہ عشق کی جلوہ آرائی گلزارِ داغ کی شادابی کو نہیں پہونچی "۔

یہ سب کچھ بجا و درست ہے۔ لیکن اسی "موازنہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رجحان اپنے استاد حضرت امیر مینائی ہی کی جانب زیادہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

شکوہ الفاظ، متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں۔ قصاید باشوکت فرماتے ہیں اور سخنور با سرمایہ، صاحب علم و فضل، داغ ان اوصاف سے معرا ہیں"۔

علامہ شبلی نے ثاقب صاحب کے ان دلائل تفضیل کو اسی کتاب کے "ریویو" میں یوں رد کر دیا ہے :۔

داغ کی کمزوریاں اور غلطیاں دکھلائی ہیں اور اس میں اس بات سے مدلل ہے کہ داغ کا سرمایہ علمی کچھ نہ تھا۔ لیکن اہل عرب کا خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔ یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔ فارسی میں

[ہ] ہمارے بعض .... ہم وطن بزرگوں نے بعض حاسدوں کے بہکانے کی وجہ سے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ داغ کو "دال منڈی" کے ناٹک نے مشہور کیا ہے۔ داغ جب یہاں آئے ہیں تو ان کی عمر (۶۰) برس سے بھی متجاوز ہو چکی تھی، امیر کا تذکرہ نکلنے کے وقت وہ صرف (۴۴) برس کے تھے مگر دیکھئے امیر صاحب نے ان کی تعریف کن لفظوں میں کی ہے!! دکن آنے سے پیشتر خود حضرت داغ اپنی شہرت روز افزوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں

ہند سے تا بہ دکن داغ ہے شہرت تیری اب تو کچھ اور ترا بختِ رسا کہتا ہے

دیکھیئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے مقابلہ میں جاہل تھا۔ تاہم انوری کو اسکی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں ؎

کہ آراست زلف سخن چوں عروس

جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھکر ہیں۔ غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں۔"

علامہ شبلی ہی اپنی ایک نظم میں دکن سے خطاب کرتے ہیں۔ اور اسکی ما بہ الامتیاز خصوصیات میں اپنے آپ کو اور نواب مرزا خاں داغ کو اس طرح شامل کرتے ہیں ع

شبلی سحر فن و داغ غزلخواں باتست

واہ کمال بھی کیا چیز ہے، وہ علامہ جو آگے چلکر "مجددین اسلام" میں شریک ہونے والا ہے اپنے بازو پر اس شان سے ایک غزل گو کو جگہ دے!

میرے ایک دوست مجھ سے یہ فقرہ سن کر مجھ پر بہت برہم ہوئے تھے کہ:—

آپ نے یہ کیا لکھ دیا، شبلی اگر دربار فضلا میں سنہری کرسی پر جلوہ فرما ہیں تو داغ بھی مسند آرائے شعر و سخن میں۔ خیر مولانا شبلی کیساتھ مولانا حالی کی بھی رائے سن لیجئے:—

غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے، آجتک فارسی یا اردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا ...... ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور ادا کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے۔ لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روزمرہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور بانکپن ہے، جو اسی شخص کا حصہ ہے (اقتباس از مقدمہ شعر و شاعری)

اسی رائے کی تائید میں اسی "مقدمہ" کا اور ایک مقام ہدیۂ ناظرین ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے، اسی طرح دلی میں ذوق ظفر اور خاصکر داغ نے غزل کی زبان میں وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے ؎

واہ رے داغ واہ ؎

داغ فراق داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زبان اہل زباں کی ہے ہائے داغ

مولانا حالی نے ہی جامع مکتوبات امیر مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب سے فرمایا کہ جناب مفتی صدرالدین خاں صاحب آزردہ صاف شعر کو پسند کرتے تھے اور اس لئے اشعار داغ کے مداح تھے جناب مولانا حالی نے خود حضرت امیر مینائی کے استاد حضرت اسیر سے سنا ہے کہ:—

کبھی امشاعرہ کیا جائیں ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں پوچھتا، اور مشاعرہ ختم ہوئے پر داغ کی غزل سب کی زبان پر ہوتی ہے[2]

یہی مولانا، داغ کو ایک رقعہ لکھتے ہیں اور اسمیں یہ شعر خواجہ شیراز کا سرنامے پہ تحریر فرماتے ہیں ؎

آں سیہ چردہ کہ شیرینی عالم با اوست
چشم میگوں، لب خنداں، دل خرم با اوست[3]

صاحبان ذوق "شیرینی عالم" پر نظر رکھ کے داغ کی کوئی ایک غزل پڑھ لیں بخدا مزا آجائیگا مزا۔ یہ لطف سخن خداداد ہے۔

مولانا حالی نے ہی بطور پیشین گوئی ایک شعر کہا تھا ؎

---

[1] مقدمہ خطوط منشی امیر احمد [2] خمخانۂ جاوید [3] مقدمہ خطوط منشی امیر احمد +

داغ دمجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میں تو اس پیشین گوئی کا قائل ہوں اور آپ؟

بندہ پرور! منصفی کیجئے خدا کو دیکھ کر

زمانہ ہوا مولانا حالی کی ایک غزل "مخزن" کے ایک قدیم پرچہ میں ہم نے دیکھی تھی جس کا مقطع اب بھی ہمارے ضبطِ ذہن ہے ؎

نعم البدل ہے داغ کا حالی کلام داغ
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

مولانا حالی اور مولانا شبلی کے بعد کسی اور نقاد کی رائے پیش کرنے سے فائدہ؟ لیکن قند پارسی بھی تو آخر کوئی چیز ہے؟ اس سے میں حلاوت پا رہا ہوں تو آپ کیوں محروم رہیں:-

داغ - نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں بہادر برگزیدہ ترین تلامذہ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق وازمشیران خاص فرماں روائے رامپور من واورا غائبانہ اتحادے است، ہرچند ملاقات صوری صورت نہ بستہ دریں نزدیکی گفتار دل آویز خویش را فراہم آوردہ گلزار داغ نام دیوانے ترتیب دادہ است، بعد طبع یکے نزد نامہ گرد آورد فرستادہ شوخی کہ در کلام اوست بندہ ندانم کہ امروز دیگرے را دادہ باشند وزبانے کہ او را بخشیدہ اند فی زماننا کسے را میسر نیست، بیشتر ازیں ستایش گفتار وے چہ تواں گفت - خیر الکلام ماقل ودل"

معزز ناظرین! یہ رائے بھی کسی معمولی شخص کی نہیں، نواب صدیق حسن خاں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، یہ رائے دہندہ اسی فرد فرید کا فرزند رشید ہے۔ الولد سر لابیہ + داغ سے متعلق ہمارے پاس اگرچہ اور اتنا ہی ذخیرہ ہوگا جتنا کہ آپکے روبرو پیش کیا گیا ہے لیکن بخوف طوالت اسکو نظر انداز کرتے ہیں ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے یاد کن ایں شاعرِ دیرینہ را

علی منظور حیدرآبادی

حشرِ جذبات

نازنہ کر حیات پر عظمتِ کار سے گذر
جسمیں خزاں کا رنگ ہو ایسی بہار سے گذر

راہ طلب میں عشق کا، ذوقِ فتادگی ہے جرم
اپنی ہی سمت دیکھ تو ہیبتِ دار سے گذر

درس لے آفتاب سے، اپنے کرم کو عام کر
موجِ نسیم صبح بن، ہر خس و خار سے گذر

معرکۂ حیات میں ہے یہی شرط زندگی
ضبط سے آشنا نہ ہو، صبر و قرار سے گذر

محرمِ عشق ہے اگر، یاس کا ذکر ہے حرام
صبح بہار دیکھ تو، شامِ بہار سے گذر

حاصلِ صد بقا ہے جو پی وہ شرابِ معرفت
جسکا مآل موت ہو، ایسے خمار سے گذر

حسنِ چمن ہے عارضی اُسپہ نہ اعتبار کر
جوشِ حیات ہو اگر رنگِ بہار سے گذر

دامِ تعینات سے، اپنے کو رکھ بلند تو
کھا نہ فریب رنگ و بو، رنگ و بہار سے گذر

ثاقب محوِ بیخودی اپنے کو رکھ نہ پست تو
برق و شرار خود ہی بن، برق و شرار سے گذر

ثاقب، کانپوری

خلط ملط

منیر کے مکا مار کر مانی نے اپنے بدن میں شگفتگی سی محسوس کی۔ اُس نے سرسری طور پر زبیدہ کی طرف دیکھا جو گلی کے نکڑ پر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ "آؤ بیدی۔ آؤ ہم اندر چل کر کھیلیں" اسنے اپنا دایاں بازو گھماتے ہوئے کہا۔ زبیدہ نے منیر کی طرف دیکھا جو بسورتا ہوا اپنی جیب سے بلوری گولیاں نکال رہا تھا۔ اور سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ منیر نے اپنی جیب سے ایک نیلی بلوری گولی نکالی اور اُسے ہتھیلی پر رکھکر آنسو پیتے ہوئے دیوار سے مخاطب ہو کر کہا "ہم یہ گولی مانی کو دینگے ہی نہیں"۔

مانی نے کنکھیوں سے نیلی گولی کی طرف دیکھا۔

زبیدہ دوڑ کر منیر کے پاس آگئی۔ اور اس کا بازو پکڑ کر کہنے لگی "آؤ ہم گھر گھر کھیلیں"۔ مانی نے ایک بناوٹی فاتحانہ انداز سے اس ویران گلی کا جائزہ لیا اور اپنی گذشتہ فتح کی یاد کو تازہ کرنیکے لئے اپنا بازو گھمانے لگا —— اور بے نیازی سے گھر کی طرف چل پڑا "ہم گھر میں ربڑ کی گیند سے کھیلیں گے"۔

مانی کی بے نیازی اور اس کا متحرک بازو دیکھکر زبیدہ اُس نیلی بلوری گولی کو بھول گئی اور للچائی ہوئی اور خائف مگر شوق بھری نظروں سے مانی کو دیکھنے لگی۔ منیر ایک منٹ کے لئے ساکت رہ گیا۔ پھر کہنے لگا "میں بتاؤں بیدی۔ ہمارے پاس دو سُرخ گولیاں ہیں —— لال سُرخ —— دکھاؤں —— یہ دیکھو" اور وہ فاتحانہ انداز سے اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ زبیدہ کی نگاہیں لوٹ آئیں۔ اور وہ شوق سے لال سُرخ گولیوں کی منتظر تھی۔

مانی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے مُڑ کر ایک نظر منیر اور بیدی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں گلی میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ ایک ساعت کے لئے وہ رُکا، جیسے وہ واپس لوٹ جانا چاہتا ہو۔ پھر اسکی نگاہ اپنے دائیں بازو پر پڑی جو اپنی گذشتہ فتح پر ابھی تک پھولا ہوا تھا —— اسکی ایڑیاں اُٹھیں —— اس کا بازو اکڑ گیا۔ شاید اُس وقت وہ اپنے آپ کو منیر سے افضل تر مخلوق سمجھ رہا تھا۔

ڈیوڑھی میں داخل ہو کر وہ سوچنے لگا "اب میں کیا کروں —— سامنے مُنڈیر پر ایک کوا بیٹھا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر کوے کی سمت میں ہوا میں ایک گھونسہ مار دیا "شست" کوا اُڑ گیا۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش ہوا مگر یہ ہوائی گھونسہ بازی کا کھیل منیر اور بیدی کی عدم موجودگی میں چنداں دلچسپ نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اتفاقاً بیدی اور منیر وہاں آجائیں —— اسکی نگاہ بھائی جان کے کمرے کی طرف جا پڑی۔ اس نے غور سے دروازے کی طرف دیکھا، ایک پٹ بند تھا اور دوسرا تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ "بھائی جان نہیں ہیں" اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ معاً اسے یاد آیا کہ بھائی جان کی دراز میں تصویریں تھیں جنہیں وہ اکثر تنہائی میں دیکھا کرتے اور مانی کو دیکھنے سے منع کرتے تھے۔ ان تصویروں کو چوری چوری دیکھنے کی کوشش میں وہ دو دفعہ پٹ بھی چکا تھا۔ اسکے گال پر اس گذشتہ طمانچے کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔

اُس نے اپنا ہاتھ اپنے گال پر رکھ لیا اور وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ مگر اسکے دل میں ایک لذیذ سی دھڑکن ہونے لگی اور اسکی آنکھیں کسی نامعلوم نشے سے جھومنے لگیں ——

خدا جانے بھائی جان ان تصویروں کو چھپا چھپا کر کیوں دیکھا کرتے تھے —— لمبے لمبے مُنہ والی عورتیں —— موٹی موٹی پنڈلیوں والی۔ بھدّے سے جسم والے مرد جنکے بدن پر کالے کالے بال تھے —— اور چہروں پر وحشت سی —— گنواروں کی طرح، اس نے مُنڈیر کی طرف دیکھا۔ کوا پھر آ بیٹھا تھا۔ شاید ان تصویروں کو بھولنے کی کوشش میں یا اپنی کسی گذشتہ فتح کی یاد تازہ کرنے کے لئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سمیٹ کر اپنی آنکھ کے قریب رکھ لیا، اور پھر آنکھ کو بند کر کے

بائیں آنکھ سے شست باندھکر "ٹھش" کہکر اپنا بازو اکڑا دیا۔ کوا اڑ گیا ———— وہ اپنی بندوق پر نازاں محسوس کر رہا تھا۔ مگر اسکے دل میں کوئی کہہ رہا تھا "بھائی جان کی دراز میں"۔

پھر دو بڑے بڑے بلوری گولے اسکے سامنے آکھڑے ہوئے جو بھائی جان کی میز پر کاغذوں پر پڑے رہتے تھے ———— اسے منیر کی نیلی گولی یاد آگئی۔ اور اسکے ہونٹوں پر ایک حقارت بھری مسکراہٹ آگئی۔

وہ دروازے سے بھائی جان کے کمرے میں جھانک رہا تھا، بھائی جان کی کرسی خالی پڑی تھی۔ ان کی کتاب زمین پر گری ہوئی تھی، میز پر وہ دونوں بلوری گولے پڑے تھے اور تصویروں والی دراز تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ دراز اور دونوں گولے اسے اندر کھینچ رہے ہوں۔ اسکے دل میں کوئی کہہ رہا تھا "بس صرف ایکدفعہ اس پھول والے گولے کو ہتھیلی پر رکھکر دیکھونگا ———— اور دراز میں سب سے اوپر جو تصویر ہوگی اسے دیکھکر واپس لوٹ آؤنگا ———— وہ دبے پاؤں دراز کی طرف جا رہا تھا۔ اسکے پاؤں اس وقت اسے زبردستی لے جا رہے تھے۔

دفعتاً کمرے کے دائیں کونے سے اس نے کپڑوں کی سرسراہٹ سنی۔ ٹھہر گیا ———— مڑا ———— سامنے بھائی جان میز کی طرف پیٹھ کئے کھڑے تھے۔ انکے بازوؤں میں ایک رنگدار کپڑوں کا گٹھا سا تھا جو اوپر سے زمین تک پہونچتا تھا، اور جسکے ایک سرے سے ایک چوٹی لٹک رہی تھی۔ بھائی جان اسکے چوٹی والے سرے پر جھکے ہوئے تھے ———— بھائی جان کا سر جھکا ———— اور وہ کپڑوں کا ستون اور بھائی جان آپس میں خلط ملط ہوگئے ———— ماتی وہاں سے بھاگ جانا چاہتا۔ مگر اسکی ٹانگیں گویا تھیں ہی نہیں۔ وہ بھول گیا کہ وہ بھائی جان کے کمرے میں ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ بھائی جان گال پر طمانچہ ماریں تو دو گھنٹے تک گال میں سرسر ہوتی رہتی ہے۔ وہ حیران تھا کہ بھائی جان اس کپڑوں کے گٹھے سے [illegible] تھے، اور [illegible] کپڑوں کے گٹھے کی چوٹی

!!! ———— پھر اس نے بھائی جان کی آواز سنی ————

"ظالم" ———— بھائی جان اس کپڑوں کے ستون سے باتیں کر رہے تھے!!! ———— پریشانی میں اس کا ہاتھ میز سے جا ٹکرایا ———— دونوں شکلوں میں ایک فوری جنبش ہوئی ماتی نے ڈر کے مارے آنکھیں جھپکالیں ———— کچھ خاموش آوازیں سنائی دیں۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

"یہ رومال تو تم بھول ہی گئیں"۔ بھائی جان کی آواز آئی، اس نے ڈرتے ہوئے آنکھ اٹھائی، سامنے بھائی جان کھڑے تھے۔ بائیں طرف انکی ملازمہ بانو بیٹھی میلے کپڑے باندھ رہی تھی۔ "ہاں اور دھوبی کو تاکید کر دینا کہ یہ کالر مجھے شام تک تیار کر دے سمجھی"؟ بھائی جان کی آواز میں جھجھک سی تھی۔

بانو نے جھکی ہوئی نگاہوں سے کالر لے لیا۔ اور مدہم سی آواز میں کہنے لگی "بہت اچھا"۔

ماتی نے بھائی کو یوں مشغول دیکھا تو اسے نامعلوم سا احساس کہ اسے وہاں سے سرک جانا چاہیئے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسے وہاں کیوں ٹھہرنا نہیں چاہیئے۔ وہ حالات کیا تھے، اور وہ شکلوں کا گڈمڈ ہونا کیا تھا۔ البتہ وہ یہ جانتا تھا کہ جب بھی بانو بھائی جان کے کمرے میں آتی تو بھائی جان یک لخت ماتی میں دلچسپی لینا بند کر دیتے۔ کندھے سے اتار دیتے یا باتیں کرنا بند کر دیتے ———— اور بیگانگی سے کہتے "اچھا ماتی اب تم باہر جا کر کھیلو مجھے اب پڑھنا ہے"۔ اور بانو کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک سی لہرا جاتی۔ اس وقت بانو نیچی آنکھوں سے کپڑے سے میز یا برش سے دری جھاڑنا شروع کر دیتی۔ مگر ماتی کو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کنکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہی ہو۔ اسوقت اسکے گال سرخ سے نظر آتے اور وہ چلتے چلتے ٹھٹکنے لگتی اور "جی اچھا" کہتے ہوئے اسکی آواز میں لوچ سا آجاتا۔ حالانکہ اندر ماں سے باتیں کرتے ہوئے اسکی آواز بھدی سنائی دیتی، اسکی آنکھیں پھیکی اور اس کا منہ زرد سا رہتا جیسے وہ دنیا سے بیزار بیٹھی ہو ————

مانی نے بھائی کو یوں مصروف دیکھ کر موقع غنیمت سمجھا۔ اور سرک جانا چاہا۔ مگر بھائی جان فوراً بول اُٹھے "ٹھہرو مانی، مجھے تم سے کام ہے" مانی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کا دل از سر نو دھڑکنے لگا۔ اس نے کانپتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا مگر بھائی اپنی ٹکٹائی دیکھنے میں شدت سے مصروف تھے۔ مانی نے معصوم سا منہ بنا لیا اور ایک اُڑتے ہوئے پر کو پکڑنے میں مصروف ہو گیا۔ بظاہر وہ اس پر سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ مگر وہ کنکھیوں سے بھائی اور بانو کو تاڑ رہا تھا۔ بھائی جان بانو کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے "یہ ٹکٹائی بھی لے جاؤ بانو۔ یہ بھی اب کچھ میلی ہو گئی ہے"۔ بانو نے نگاہ اُٹھائی۔ اس کا منہ سُرخ کیوں ہو رہا تھا۔ اور اُسکی آنکھیں خدا جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ ان مسکراتی آنکھوں کے اوپر جھکی ہوئی بھویں دوڑ کر ایک دوسرے کے قریب ہو گئیں۔ اسکی پیشانی پر ایک شکن پڑ گیا۔ جیسے وہ گھور رہی ہو۔ مگر وہ پیشانی گھورتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً جس طرح اسکے ابا کی پیشانی گھورتی تھی ——— بانو لچک کر مُڑی، اسکے گالوں میں چھوٹے چھوٹے سے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ اچھل کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ایک ساعت کے لئے مانی یہ بھول گیا کہ اُسے اس پر میں محو نظر آنا چاہیئے۔ بھائی جان مُڑے۔ مانی نے اس مُسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کی جو خواہ مخواہ اس پر چھا رہی تھی۔ اور وہ مزید معصومیت سے اپنے کھیل میں مشغول ہو گیا۔

"مانی جاؤ۔ میرے لئے ایک پانی کا گلاس لاؤ" بھائی نے کہا۔

مانی نے یہ سُنا اور اُسکے دل سے ایک نامعلوم سا بوجھ اُتر گیا کہ خدا جانے بھائی کیا کیا کہیں گے۔

باہر صحن میں بانو کھڑی کپڑے گن رہی تھی۔ اس کا بدن ڈھیلا اور منہ زرد سا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا خدا جانے بانو کو بھائی جان کے سامنے جا کر کیا ہو جاتا ہے۔ بھائی جان کے کمرے میں وہی بانو بالکل نئی بانو ہو جاتی ہے۔ اس کا دل چوری چوری آرزو کر رہا تھا کہ بانو بھائی جان کے کمرے میں ہی رہے اور وہ چُھپ چُھپ کر دیکھتا رہے۔ مگر بھائی جان تو ایسے وقت اُسے گھور کر باہر نکال دیا کرتے تھے۔ اور کہتے "تم جاؤ۔ اب مجھے پڑھنا ہے"۔

پانی کا گلاس لے کر بھائی نے مانی کا کان پکڑ لیا اور کہنے لگے "تم بہت شریر ہو گئے ہو۔ یوں میرے کمرے میں چوروں کی طرح گھس آتے ہو بدمعاش۔ پھر میں نے یوں آتے دیکھا تو بُری طرح سے پٹیونگا سمجھے"۔

پہلے تو مانی سمجھتا رہا کہ بھائی جھوٹ موٹ کہہ رہے تھے۔ مگر جب بھائی نے گھور کر باہر نکال دیا تو مانی بے چارہ سخت حیران ہوا۔ "یہ عجیب بات ہے۔ بھائی اس آئی گئی بات پر اب خفا ہو رہے ہیں"۔ اسوقت تو انہوں نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ کیا باتیں ہیں ——— کیوں ——— وہ کیوں گڈمڈ ہو رہے تھے، بانو کی آنکھیں کیوں چمکتی تھیں۔ اس کا منہ سُرخ کیوں تھا ———

"یہ دیکھو مانی۔ ہمارے پاس چاقو ہے"۔ منیر نے آکر چاقو دکھاتے ہوئے کہا۔

مانی نے للچائی ہوئی نظروں سے چاقو کی طرف دیکھا۔

اسکی نگاہ منڈیر پر جا پڑی۔ کوا بیٹھا تھا دفعتاً اسے کچھ یاد آ گیا "چُپ!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھکر منیر سے رازدارانہ انداز میں کہا "آؤ"۔ اُس نے اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا، اُسنے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر دائیں آنکھ بند کر لی اور دایاں بازو سمیٹ کر بائیں آنکھ سے شست باندھی "ٹھس" کہکر اس نے اپنا دایاں بازو کوے کی طرف ہوا میں چلا دیا۔ کوا اُڑ گیا۔

"دیکھا" مانی نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ بندوق ہے کوئی کوا ہو کہیں بیٹھا ہو ایک منٹ میں مر کر اُڑ جائیگا"۔

منیر پہلے تو متاثر ہو کر دیکھتا رہا پھر وہ یکلخت اس بندوق سے بے نیاز ہو گیا۔

"یہ دیکھو" اس نے چاقو کی دھار کی طرف اشارہ کر کے کہا "کوئی چیز ہو ایک جھٹکے میں کاٹ کر دو کر دونگا۔ یہ دیکھو" اس نے ایک تنکے کو کاٹتے ہوئے کہا "یہ ایک یہ دو ——— دیکھا ———" اور مرغی کا پر کاٹ کر

دکھاؤں ؟" "آؤ باہر۔ وہاں بیدی کے پاس میں نے بہت سے پر رکھے ہیں، بہت سے" ——— اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔

منیر مرغی کا پر کاٹ رہا تھا۔ بیدی کا دل دھڑک رہا تھا، شوق سے یا ڈر سے اور وہ منیر کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ مانی نے بیدی کو یوں منیر پر جھکے ہوئے دیکھا تو یکلخت اُسے اس کاٹنے والے چاقو میں کچھ دلچسپی نہ رہی وہ لاپروائی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا (وہاں کوئی تو نظر نہ آیا) پھر فوراً اُسے سوجھی "ہمارے بھائی جان کے پاس ایک اتنی لمبی چھری ہے" اُس نے اپنا بازو اکڑا اکڑا کر کہا "اتنی لمبی"۔ مگر شاید اُس ننھے سے جیتے جاگتے چاقو میں، اُس اتنی لمبی چھری سے جو ابھی تک محض ایک قصہ تھی زیادہ کشش نہ تھی۔ اسکی یہ بات بیدی کو منیر سے توڑ نہ سکی۔ شاید اسلئے کہ مانی کی اتنی لمبی چھری کے وجود سے وہ منکر تھے۔ اس کا وہاں ٹھہرنا صریحاً اسکی بے عزتی تھی۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔

سامنے دروازے میں ان کا نوکر شریف بیٹھا تھا۔ اسنے اپنی قمیص اُتار کر پیٹھ پر ڈال رکھی تھی، اسکے سینے پر لمبے لمبے کالے کالے بال دیکھ کر مانی اپنی اتنی لمبی چھری بھول گیا۔ ایسے ہی بال بھائی جان کی تصویروں پر تھے، جنہیں وہ دراز میں چھپا کر رکھتے تھے ——— اُس کا ہاتھ چوری چوری اپنی قمیص کے اندر گھس گیا۔ وہاں ایک بال بھی نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اُسکے بدن پر بھی بال ہوتے۔ اور وہ اپنے آپ کو شریف کے مقابلے میں سخت حقیر سمجھ رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کا بدن بھی شریف کی طرح موٹا موٹا اور میلا میلا ہو، اور اس پر بہت سے کالے کالے بال ہوں ——— اُس نے سُنا شریف گا رہا تھا۔ دھیمے دھیمے۔

"ظالم لوکی شیریں ———"

"ظالم"! اُس نے دل میں دُہرایا۔ بھائی جان اُس کپڑوں کے سُتون سے بھی یہی کہہ رہے تھے۔ خدا جانے ظالم کون تھا۔ کیا تھا۔ معاً اُس نے دیکھا کہ شریف کی آنکھ میں بھی وہی بھائی جان والی چمک تھی ——— اسکی آنکھیں شریف کی نگاہوں کی سمت اُٹھیں

سامنے کنوئیں پر ایک عورت پانی بھر رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ بار بار سر سے سرک جاتا، اور وہ بار بار اُسے سنوارتی اور مُڑ مُڑ کر شریف کی طرف دیکھتی۔ اُسکی کالی کالی آنکھیں کونوں میں آ آ کر شریف پر مسکراتیں، اِدھر شریف مسکرا مسکرا کر اور جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔ مانی کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں، بغیر بولنے کے بول رہی تھیں ——— پھر اُس نے دیکھا کہ اس عورت نے پانی کا گھڑا اُٹھایا۔ اس نے شریف کی طرف دیکھا۔ اُس کی گردن نے خم سا کھایا۔ اور وہ چل پڑی ——— اور شریف بھی اُٹھ کر اُسی طرف چل دیا، جیسے وہ چلتے چلتے بُلا گئی ہو۔

مانی کے دل میں خیالات کا ایک چھتہ بھنبھنا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے کیوں کیسے کس لئے کیا اُسکے ذہن میں آوارہ تھے۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، باتیں کرتی ہوئی بھویں، پیار سے گھورتی ہوئی پیشانی۔ بال۔ ظالم۔ تمام اُس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

وہ پریشان سا پھر رہا تھا۔

آپا کے کمرے میں سامنے آئینہ رکھا دیکھ کر اسکے دل میں اپنی آنکھیں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، اُس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آپا بال بنایا کرتی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ جب بھائی حمید اماں کو سلام کرنے آتے تو آپا کسی نہ کسی بہانے ایک دفعہ میز کے قریب جا کر اپنا منہ آئینہ میں دیکھ آیا کرتیں۔

آئینہ میں موٹے سے مُنہ والا اور بکھرے ہوئے بالوں والا ایک لڑکا نظر آ رہا تھا جسکی آنکھوں میں زرد زرد سے میل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مُنہ پر یہاں وہاں کچھ دھبے سے پڑے تھے اس نے جھٹ منہ موڑ لیا۔ سامنے وہی اتنی لمبی چھری پڑی تھی، مگر اس وقت وہ چھری بھی اُسے تسکین نہ دے سکی، اور وہ بے بسی اور پریشانی سے باہر نکل آیا۔

باورچی خانے میں اماں بیٹھی کھانا تیار کر رہی تھیں، اور بانو بیٹھی آلو چھیل رہی تھی "کیسی چُپ چاپ سی بیٹھی ہے" اُس نے بانو کو دیکھ کر دل میں سوچا۔ اُسوقت اسکی آنکھیں بھی خالی خالی اور اندر کی

طرف دھنسی ہوئی تھیں "یہ آنکھیں بھی کیا اُدلنے بدلنے والی چیز ہیں"۔ اس نے سوچا کبھی کچھ کبھی کچھ، خدا جانے کیوں لوگوں کی آنکھوں میں کبھی چمک آجاتی تھی، اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ اس دُنیا میں کوئی چیز بھی یقینی نہیں" اسوقت بانو کا منہ بھی کچھ زرد زرد سا تھا" خدا جانے کیا بھید ہے؟" ایسے موہوم خیالات اُسکے دل کی تہ میں گھوم رہے تھے۔

اسکی نگاہ بھٹک کر سامنے صحن میں جا پڑی۔ وہاں اسکی مُرغی چُگ رہی تھی۔ اس مرغی کو وہ "چتری" کہا کرتا تھا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ پڑوسیوں کا مُرغا "چتری" کو دق کر رہا ہے ——— یک لخت مُرغا چتری سے لڑ پڑا اور اس نے دوڑ کر چتری کے سر میں چونچ مار دی ——— پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئے۔ خدا جانے مرغی کیا ہوئی۔ وہ حیران تھا کہ یہ چیزیں کس طرح ایک دوسرے میں اُلجھ جاتی ہیں۔ کس لئے؟

"اماں وہ دیکھو" اس نے صحن کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ مرغا خواہ مخواہ میری چتری سے لڑتا ہے۔ میں اسے مار دونگا۔ میرے پاس چاقو بھی ہے۔ منیر کے پاس"

ماں نے باہر دیکھا اور پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ روک کر بناوٹی غصے سے کہنے لگی۔

"چپ رہ۔ نالائق۔ ایسی گندی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، جا باہر جا کر کھیل" کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے دیکھا بانو کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"خدا جانے باہر لڑکوں سے کیسی گندی گندی باتیں سیکھ آتا ہے" ماں کہہ رہی تھی۔ گندی باتیں! اُس نے سوچا۔ گندی کیوں۔ کونسی گندی باتیں۔ اور وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر جا کر اُس نے اپنی دستی بندوق سے دو ایک کوّے اُڑائے۔ دو ایک اُڑتے ہوئے پر پکڑے، اور مرغے کے دو ایک پر نوچے۔ پھر وہ اُکتا سا گیا اور یونہی گھومتا ہوا آپا کے کمرے میں جا نکلا۔ آپا صندوق کے سامنے دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ "چلو آپا کو چل کر ڈرائیں" اُسے سوجھی اور وہ دبے پاؤں آپا کے پیچھے جا پہونچا۔

اس نے دیکھا آپا کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی ——— آپا اس تصویر کو سینے سے لگا کر بھینچ رہی تھی۔

"ہاؤ" اس نے ڈرانے کی غرض سے چلا کر کہا اور ہنس پڑا۔ آپا پہلے تو گھبرا گئی، مُڑ کر دیکھا اور پھر اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی "تم ہو مانی۔ شیطان" اور آپا نے جھٹ وہ تصویر بغل سے نکال کر صندوق میں رکھ کر قفل لگا دیا۔ آپا کو تصویر رکھتے ہوئے دیکھ کر مانی نے کہا "آپا بھائی جان کے پاس بھی بہت سی تصویریں ہیں۔ میز کی دراز میں پڑی ہیں۔ اور آپا" اس نے منہ بنا کر کہا "ان تصویروں کے بھدّے بھدّے سے جسم اور لمبے لمبے بال ہیں۔ میں تم کو دکھا دونگا"

"چُپ" آپا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایسی بات نہیں کیا کرتے"

"نہیں آپا۔ سچ۔ اتنے لمبے لمبے بال۔ اور آپا لمبے لمبے منہ والی عورتیں۔ موٹی موٹی ٹانگیں اور اتنی بڑی ———"

"چُپ گدھا کہیں کا" آپا نے کہا "ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اماں نے سن لیا تو پٹ جائیگا" اور آپا باہر چلی گئی۔

"کیسی باتیں؟" وہ سوچنے لگا "کیوں نہ کروں۔ بھائی صاحب کے پاس تصویریں تو تھیں۔ اس نے خود کئی دفعہ دیکھی تھیں، اور بھائی جان خود انہیں روز دیکھا کرتے تھے۔ آپا کیوں اُسے منع کرتی تھی۔ یہ کیا جھگڑا ہے۔ یہ لوگ کیسے ہیں" وہ سخت پریشان ہو رہا تھا

رات کو آوازیں سُن کر اسکی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ایک مدھم سا لیمپ روشن تھا، اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اُس نے سُنا ابا کہہ رہے تھے "امانت کی ماں تم ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتی ہو"

"چُپ، دیکھئے، مانی جاگ رہا ہے"

"مانی ابھی بچہ ہے۔ اس کا کیا ہے۔ تم بڑی ظالم ہو"

مانی نے کنکھیوں سے دیکھا ——— دو دھندلی سی شکلیں

خلط ملط ہوگئیں۔

ساقی سوچ رہا تھا۔ کیا دنیا کے ہر شخص کو ظالم کہا جاتا ہے اور بھائی جان بھی ظالم کہہ رہے تھے۔ شریف بھی ظالم گا رہا تھا، اور اب وہاں رات کے وقت بھی اسکے قریب ہی کوئی ظالم تھا۔ دیکھنے کے لئے اُس نے کروٹ بدلی۔ فوراً وہ آوازیں خاموش ہوگئیں ——

ایک ہاتھ اونچا ہوا لیمپ کی طرف بڑھا۔ کمرے میں بالکل اندھیرا ہوگیا۔ ساقی ڈر گیا۔

"اماں اماں" وہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا۔

"چپ کیسا شور مچایا ہے"۔

"امی جان اندھیرا ہے"۔ ساقی نے لبسورتے ہوئے کہا۔

"سو جا بیٹا لیمپ میں تیل ختم ہوگیا ہے۔ سارا دن دنگا فساد اور کھیل کود میں کٹ جاتا ہے۔ رات کو بھی تجھے آرام نہیں۔ رات کو تو سو جایا کر"۔

"سو جایا کر" اس نے سوچا۔ کیا وہ سچ کہہ رہے تھے۔ سونا تو اسے کہتے ہیں جب کہ کوئی بالکل سو جائے۔ ذرا بات نہ کرے۔ وہ حیران سا تھا —— ظالم —— خلط ملط —— اندھیرے میں ماں کا ہاتھ اسکی طرف آیا اور اُسے تھپکنے لگا۔

اگلے روز ساقی زبیدہ سے کہہ رہا تھا۔

"بیدی آؤ کوٹھے پر چل کر کھیلیں"۔ وہ کوٹھے پر چلے گئے۔

"یہ نیا کھیل ہے"

"چپ" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "میں ہوں ابا اور تم —— وہ سوچنے لگا —— نہیں۔ اس کھیل میں لیمپ بھی چاہیئے —— "اچھا" اس نے خوش ہو کر کہا "تم ہو بانو —— اور میں ہوں بھائی جان —— منیر کو بالکل نہ بتانا —— ہیں —— چپ" اس نے چاروں طرف مڑ کر دیکھا، سامنے دروازہ کھلا تھا —— "ٹھہرو۔ میں دروازہ بند کر آؤں" —— اُس نے دبی آواز سے کہا۔ دروازہ بند کر کے وہ اسی طرح منہ پر انگلی رکھے دبے پاؤں واپس آیا —— "بانو" اُس نے دبی آواز میں کہا "قمیص اُتار دو"۔

—— "اچھا" —— بیدی نے شوق اور حیرانی سے کہا۔

اور وہ انتہائے شوق اور تحیر سے بُت بنی کھڑی تھی۔

ممتاز مفتی

حوّا کی بیٹی!

شام کا دلکش سماں ہے ڈھل چکا ہے آفتاب
اک طوائف اپنے کوٹھے پر کھڑی ہے بے حجاب

اک بہارِ نشہ و بو، اک نگار شوخ و شنگ
عارضوں پر غازۂ گلگوں، لبوں پہ سرخ رنگ

محفلِ زہرہ کا اک آئینۂ جادوگری
آسماں کی حور، اِندر کے اکھاڑے کی پری

حسن اور تازہ جوانی جوش پر آئی ہوئی
راہ چلتوں کی نظر پڑتی ہے للچائی ہوئی

سینہ و بازو پہ زلفِ ناز لہرائے ہوئے
ریشمی ساری کا آنچل سر سے ڈھلکائے ہوئے

زمزمے ہیں عشرتوں کے نقرئی آواز میں
بے حجابی کے تقاضے ہیں نگاہِ ناز میں

اے کہ عشرت کی بہاریں ہیں ترے گلزار میں
بیچتی ہے حسن کی رنگینیاں بازار میں

کوڑیوں کے مول دی تو نے جوانی کی شراب
ظلمتوں میں غرق کر ڈالے ہزاروں ماہتاب

عارضوں کا رنگ ہونٹوں کی حلاوت بیچ دی
تو نے کانٹوں کے عوض گل کی نزاکت بیچ دی

اپنی رنگینی سے ہر آغوش تو نے بھر دیا
تو نے دُنیا کے لئے جنت کو سستا کر دیا

ایک دُنیا کے لئے اذنِ ہوس کاری ہے تو
آج اے حوّا کی بیٹی جنسِ بازاری ہے تو

رات بھر تیرے شبستاں کے در و دیوار پر
تھرتھراتا ہے گنہ آلود روحوں کا اثر

زندگی کے اک بھیانک خواب کا نقشا ہے تو
جامۂ انسانیت پر بدنما دھبّا ہے تو

تو نے مٹی میں ملا دی ملتوں کی آبرو
ہیں ترے ساغر کی رنگینی میں مذہب کا لہو

توڑ ڈالیں بادۂ اُلفت کی تو نے چھاگلیں
عشق کی محفل میں روشن کیں ہوس کی مشعلیں

تیرا فرشِ کامرانی ہے بساطِ کشت و خوں
تو گرا ڈالے گی تہذیب و تمدن کے ستوں

تیرے ہاتھوں سے مٹے گا بازوئے محنت کا بل.
دستِ دولت آفریں اک روز ہو جائیگا شل

سینکڑوں شعلے ہیں تیرے عشرتوں کی آگ میں
تو مٹا ڈالے گی اک دن دہر سے نیکی کا نام
تو جلا ڈالے گی دُنیا کو سُنہری آگ میں
لے رہی ہے آج تو دُنیا سے شاید انتقام

بھوک اور افلاس سے جب زندگی تھی تجھ پہ تنگ
عزّت و محنت کا دشمن خود غرض سرمایہ دار
جس نے چوُسا تیری رگ رگ سے جوانی کا لہُو
جس نے ڈالے اس گنہ کی راہ پر تیرے قدم
مُدتوں تک بھوک کی ماری رہی جو آتما
پیٹ کی خاطر اگر تو بیچتی ہے جسم آج
تیری عزت کو نگل بیٹھا یہ دولت کا نہنگ
کھیلتا ہے جو برابر نوعِ انساں کا شکار
چاک کر دی جس نے عزت کی قبائے آبرو
تیری عصمت پاشیوں پر وقف ہے جس کا کرم
کر دیا "دولت" نے اسکی آبرو کا خاتمہ
کون ہے نفرت سے تجھ کو دیکھنے والا سماج!

کون سی محفل ہے ایسی جس کی تو ساقی نہیں؟
سامنے دُنیا کے تُف کرتے ہیں تیرے نام پر
راستہ میں دن کو لے سکتے نہیں تیرا اسلام
تیرے کوچے سے جنہیں ہو کر گذرنا ہے گناہ
محفلوں میں تجھ سے کر سکتے نہیں جو گفتگو
اِن میں لیکن جراٴتِ اخلاق بھی باقی نہیں
خلوتوں میں جو ترے قدموں پہ رکھدیتے ہیں سر
رات کو جو تیرے ہاتھوں سے چڑھا جاتے ہیں جام
گرم انکی سانس سے رہتی ہے تیری خوابگاہ
تیرے آنچل میں بندھی ہے اُنکی جھوٹی آبرُو

اُٹھ! کہ ایسی زندگی بے کار ہے تیرے لئے
جس سے رہ جائے تیرے مُلک و وطن کی آبرو
جان تک اپنے خریداروں سے لے سکتی ہے تو
عیش گویا عیش کا آزار ہے تیرے لئے
اپنی قیمت ایک ایسی شرط کر سکتی ہے تو
اپنی قیمت عرش کے تاروں سے لے سکتی ہے تو

زندگی میں حشر ڈھا سکتا ہے یہ تیرا شباب
مُنتظر ہے تیری نظروں کا سماجی انقلاب

جاں نثار اختر علیگ

ڈاکٹر مساریک

۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء کے روزناموں میں برقی اخبار کے ضمن میں ایک خبر شائع ہوئی:-

"ڈاکٹر ٹی مساریک سابق صدر زیکوسلوویکیا نے ۱۴ ستمبر کو ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی"

بہت کم ہندوستانی ہونگے جنہوں نے اس خبر کو کسی توجہ سے پڑھا ہو یا یہ نام بھی اُن کو یاد رہا ہو۔ ایسے ایسے صدر، وزیر اعظم، مدبّر، پروفیسر دُنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں روز مرا کرتے ہیں۔ غیر ممالک کے لوگ ان پر کہاں تک توجہ صرف کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ مگر ڈاکٹر مساریک ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کی زندگی پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالکر یا نگاہ کئے بغیر گذر جانا جائز ہے۔ اس کی زندگی ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک شمع ہدایت ہے، خضر راہ ہے، سبق آموز ہے، محرک عمل ہے، اس لئے ہم مختصراً اس کے سوانح حیات مفکر دماغوں اور حوصلہ مند دلوں کے سامنے پیش کرتے ہیں:-

ٹامس گاریگ مساریک مارچ سنہ ۱۸۵۰ء میں زیکوسلوویکیا میں جو اُس وقت آسٹریا کا علاقہ تھا ایک کوچبان کے گھر پیدا ہوا۔ بچپن میں اس کی تعلیم میں غریب باپ نے کیا حصہ لیا معلوم نہیں مگر ماں ہمیشہ اُس کی ہمت افزائی کرتی رہی۔ ہوش سنبھالتے ہی تحصیل علم میں اس کا غیر معمولی انہماک دیکھا گیا۔ اپنے ضلع کے صدر مقام برون میں جہاں وہ تعلیم پا رہا تھا ایک پولیس افسر کے بیٹے کا خانگی معلم مقرر ہوا اور اُس کے خاندان کے ساتھ ویانا چلا گیا۔ وہاں اس پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ وہ لوہار کا کام کرتا تھا۔ ہاتھ میں بھاری ہتھوڑا تھا اور دل میں عظمت و عزیمت کی بلند منزل۔ اپنی تعلیم سے کبھی غافل نہ رہا۔ پھر معلمی اختیار کی اور خود پڑھتا رہا۔ صرف ماں اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ خانگی طور پر اتنی علمی ترقی حاصل کر لی کہ وہ کسی ضابطہ کے امتحان کے بغیر وائنا یونیورسٹی میں داخل کر لیا گیا۔ اپنی قلیل کمائی سے فیس بھی ادا کرتا رہا۔ وائنا میں فلسفہ میں امتیاز کے ساتھ سنہ ۱۸۷۶ء میں گریجویٹ ہوا، پھر لیپزگ جرمنی میں مزید تکمیل کی اور وائنا یونیورسٹی میں لکچرار ہو گیا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں پراگ (موجودہ زکوسلوویکیا کا پایۂ تخت) میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔

پیشۂ تعلیم کے ساتھ ادبیات، صحافت، سیاست اس کا مشغلہ تھا۔ اپنے ملک اور باہر کے جرائد میں وہ مضامین لکھتا رہتا تھا۔ پھر اپنا ایک مخصوص جریدہ "اتھینیم" بھی جاری کیا۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں وہ اپنی زیک زبان کی انسیکلوپیڈیا کا مدیر مقرر ہوا۔ اس نے سیاسی انجمنیں بھی بنائیں، توڑیں، دوسری جماعتوں میں مدغم کیں۔ ان کا مقصد مقامی سیاست کا الٹ پھیر تھا جو عام دلچسپی کا باعث نہیں اس لئے ہم اُسے نظر انداز کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں وہ وائنا کی پارلیمنٹ ریخرت میں اور سنہ ۱۸۹۲ء میں ڈایٹ (پارلیمنٹ) میں اپنی پارٹی کا نمائندہ منتخب ہوا مگر سنہ ۱۸۹۳ء میں ایک دوسری برسر اقتدار جوان زیک پارٹی سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہو گیا۔

پروفیسر اور مصنّف کی حیثیت سے وہ ہمدردیٔ نوع انسان، مساوات اور صداقت کا مبلّغ رہا۔ آسٹریا کی سیاسی پالیسی پر وہ ہمیشہ نکتہ چینی کرتا رہا۔ ایک طرف جرمنی کے آسٹریا کا علاقہ غصب کرنے کے خلاف آواز اُٹھائی تو دوسری طرف آسٹریا کے بلقان پر دست درازی اور بوسینا کے الحاق پر صدائے مخالفت بلند کی۔ آسٹریا کی بعض اندرونی سازشوں اور خیانتوں کا راز طشت از بام کیا۔

سنہ ۱۸۷۵ء میں مساریک بحیثیت پروفیسر، فلسفی، مدبّر، مصنف ایسی شہرت و عزّت کا مالک ہو چکا تھا کہ ایک دولتمند امریکی خاتون

چارلٹ گاریگ سے اُس کی شادی ہوگئی۔ اور بیوی کے نام گاریگ کو اُس نے اپنے نام کا جُزو بنالیا۔ اُس کی بیوی صحیح معنی میں اُس کی شریک زندگی تھی۔ صرف گھر میں نہیں بلکہ میاں کے تمام سیاسی جدوجہد، دکھ سُکھ، رنج و راحت میں جان سے اور مال سے۔ ابتدائً مساریک کے حوصلے کی پرواز معلمی و اُستادی سے اُونچی نہ تھی۔ مگر فلسفیانہ تدبّر نے اُسے سیاست کے کانٹوں میں اُلجھائے بغیر نہ چھوڑا۔ وہ اگر پروفیسری پر قناعت کرلیتا تو ایک مصنّف کی حیثیت سے بھی کوئی معمولی رتبہ نہ رکھتا تھا۔ مگر اس کے ضمیر کی تڑپ، صداقت کے جوش، ایمان کے تقاضہ نے اُسے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ذلّت و افلاس کی کشمکش سے نکلکر اُس نے عزت و آرام کے بستر پر دم بھر خوابِ شیریں کا لطف اُٹھانا جائز نہ رکھا۔ حُبِ وطن اور محبتِ بنی نوع انسان کی آگ میں تڑپتا اور کانٹوں میں اُلجھتا رہا اور اُس کی بیوی ۱۹۲۳ء تک یعنی مرتے دم تک گھر اور اولاد کی ذمہ داریوں کے باوجود اُسکی آگ اور کانٹوں میں اُسکی شریک اور مددگار رہی۔

مساریک کی زندگی کا ایک نیا پُرعظمت باب جنگ عظیم سے شروع ہوا۔ اُس کے سیاسی عقائد و اعمال کے جُرم میں آسٹریا کی فوجی حکومت نے اس کے خلاف غداری اور جاسوسی کا الزام عائد کیا۔ ۱۹۱۴ء میں اُسے اٹلی میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ اور وہاں سے سویزرلینڈ، فرانس اور انگلستان میں ہر جگہ وہ اپنی قوم کی سیاسی آزادی کا پرچار اور ان تھک جدوجہد کرتا رہا۔ اس عرصے میں وہ کنگس کالج لندن میں دو برس پروفیسر بھی رہا۔ وہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ماہر تھا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ روس اور وہاں سے امریکہ چلا گیا۔ جہاں آسٹریا کے زوال پر اس نے زیک نیشنل کونسل کی تصدیق و توثیق حاصل کرلی۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں جب وہ نیویارک کی ایک مجلس ضیافت میں احباب و اعیان کے ساتھ شریک طعام تھا اُسے اپنے وطن سے ایک تار ملا کہ وہ زیکوسلوویکیا کے نئے جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ اس نے کسی ہیجان کے اظہار کے بغیر اُسے خاموشی سے جیب میں رکھ لیا اور حاضرین میں سے کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جب اس جدید ریاست کی بنا پڑی، اس کا صدر امریکہ میں گورنمنٹ پیرس میں، فوج سائبیریا میں اور قوم وطن میں تھی دشمنوں میں گھری ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں سات برس کے لئے دوبارہ صدر منتخب ہوا۔ پھر ۱۹۲۷ء میں اس عہدے کی مزید توسیع کی گئی۔ یہ زیک نیشنل کونسل کے نظام آئینی کے خلاف تھا مگر اُس کی خاطر آئین کو ڈھیلا کیا گیا۔ زیک اور سلوویک دو مختلف اقوام کو ملا کر ایک آزاد متحدہ ریاست قائم کرنے اور اس کی کامل آزادی کو دولِ یورپ سے منوانے کے لئے اُسے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں وہ پھر یورپ کے دورے پر نکل گیا۔ اور انتہائی جدوجہد کے بعد دولِ ائتلاف ثلثہ سے معاہدۂ پٹسبرگ پر دستخط کرالئے۔ اس کی رُو سے زیک اور سلوویک اقوام کا اتحاد اور ائتلاف کی رُکنیت منوا کر زیکوسلوویکیا کو ایک آزاد ریاست تسلیم کرالیا۔ اور دوعملی ریاست کا خاتمہ ہوگیا۔

دسمبر ۱۹۳۵ء میں ضعف پیری کے عذر سے وہ صدارت سے مستعفی ہوگیا۔ اس کی ہشتاد سالہ سالگرہ کی تقریب میں پارلیمنٹ نے اُسکے لئے اسّی ہزار پونڈ کا عطیہ منظور کیا مگر اس نے یہ رقم سرطان کے مریضوں کے لئے ریڈیم کی خرید اور مُفت علاج کیلئے وقف کردی۔

مساریک کے چار بچے ہوئے۔ ایک بیٹا نقاش ہوا اور ۱۹۱۵ء میں فوت ہوا۔ دوسرا پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر ہوا۔ پارلیمنٹ کا ممبر تھا، زیک ریڈکراس (صلیب احمر) کا صدر۔ جنگ عظیم میں قومی غداری کے جُرم میں قیدخانہ میں رہا۔ تیسرا امریکہ میں ایک ممتاز افسر تھا اور آجکل لندن میں زیکوسلوویک سفیر ہے۔ چوتھی ایک بیٹی ہے جو جنگ عظیم میں باپ کی مددگار اور نگراں حال رہی۔

مگر ان تمام وارثوں میں سب سے زیادہ لائق فخر اُسکے وہ رُوحانی وارث ہیں۔ قومی آزادی اور علمی تصانیف جن کی تعداد تقریباً چالیس ضخیم جلدوں تک پہونچتی ہے اور قریب قریب سب کا موضوع فلسفۂ حُریّت ہے۔

محمد مسلم۔ ایم۔ اے

بمبئی کی مچھلی والیاں

بمبئی کی مچھلی والیاں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان کی تمام عورتوں سے مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ اُن کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اگر تندرستی اور تازگی کا نام حُسن ہے تو میں اُن پر سے لکھنؤ کی نزاکت، گجرات کا تناسب، اور پنجاب کا رنگ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پشاور کی عورتیں ڈیل ڈول میں ان سے سبقت لے جائیں گی لیکن اپنے پیروں میں وہ تیز رفتاری پیدا نہیں کرسکتیں جو اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں اس کو برق رفتاری کہتا ہوں کیونکہ وہ چلتی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سر پر مچھلیوں کی ٹوکریوں کا ایک بڑا بوجھ رکھکر، اور تعجب ہے کہ وہ اس دوڑ میں اپنے وزن کا توازن اور اپنی رفتار کا تناسب اس طرح قائم رکھتی ہیں کہ جیسے مچھلیاں ان کے سر کا ایک حصّہ ہیں اور بمبئی کی سڑک اِن کے قدموں کا۔ بس سمندر کی مچھلیوں نے انسان کا روپ لیکر اپنے مسکن کو تبدیل کرلیا ہے۔ ان کے راستہ میں ٹرام، موٹر، وکٹوریہ اور آدمیوں کی بھیڑ کسی طرح حائل نہیں ہوتی۔ ان کے درمیاں سے یہ اس طرح بچی بچائی ہوئی نکل جاتی ہیں جیسے چمگادڑیں رسّیوں اور تار کے جال میں سے۔

ان کا سفر اس خونچہ والے کا سا نہیں ہوتا جو دروازہ دروازہ ٹھہرتا ہوا چلتا ہے بلکہ مسلسل ہوتا ہے۔ قلابا سے چرچ گیٹ تک یا کوئینس روڈ کی لمبی سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یا چرچ گیٹ، فرین لائیں اور چرنی روڈ تک یا اسپلینڈ میدان، کارنک روڈ اور کرافورڈ مارکٹ تک یہ عورتیں مچھلیوں کو جھولا جھلاتی ہوئی چلتی ہیں۔ یہانتک کہ بمبئی کے ہجوم میں اس طرح کھو جاتی ہیں کہ ہم ان کا پتہ نہیں لگا سکتے، لیکن ان سب میں ایک ہی بات مشترک ہوتی ہے اور وہ ان کی بھاگ دوڑ ہے۔ وہ تو دم لینے کے لئے بھی نہیں ٹھہرتیں بس وقت کی طرح آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ اُن کی یہ کیفیت جب سے وہ ہوش سنبھالتی ہیں اور جب تک کہ ہوش سنبھالنے کے قابل نہ رہیں اسی طرح رہتی ہے۔ گویا اُن کی زندگی ایک مسلسل مصروفیت اور ایک مقدس فرض ہے۔

انہوں نے مچھلیوں سے تڑپ سیکھی ہے اور سمندر سے نمک مستعار لیا ہے۔ سانولے رنگ اور نرم جلد نے اُن کے چہروں کو جاذب نظر بنادیا ہے۔ جس وقت ان کے سروں پر ٹوکریاں نہیں ہوتیں تو اُس وقت سیاہ بالوں کا موٹا اور گول جوڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنے سروں پر سمندر کا بھنور اُٹھائے پھر رہی ہیں۔ وہ ایک ساڑھی باندھتی ہیں جو اکثر سفید اور بے داغ ہوتی ہے۔ گھٹنوں تک ان کے پیر بالکل برہنہ رہتے ہیں اور وہ ساڑھی ان کے جسم پر اس طرح کسی ہوئی رہتی ہے کہ ہندوستان کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ البتہ رامپور کا تنگ پائجامہ اس کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساڑھی خود اُنھوں نے نہیں باندھی ہے بلکہ قدرت نے پیدائش سے قبل باندھ دی ہے یہی وجہ ہے کہ جسم بڑھ گیا ہے اور کپڑا نہیں بڑھا۔ یہانتک کہ اب وہ اس قید و بند سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ شاید ان کی یہ تیز رفتاری اسی کشمکش کا نتیجہ تو نہیں۔ وہ ساری کے ایک پلّو کو کمر کے گرد لپیٹ کر شانہ پر ڈال لیتی ہیں۔ جسم کے بالائی حصّہ پر ایک چُست شلوکہ ہوتا ہے جسکی آستین کہنیوں تک ہوتی ہے۔ کانوں میں سونے کے مُندرے گلے میں سونے کی بدھی اور چہرے پر اطمینان اور رفاغ البالی ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان کی دوسری مظلوم عورتوں کی طرح یہ مردوں کے روایتی ظلم و ستم کا شکار نہیں ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ اقتصادی طور سے بالکل آزاد ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کیلئے تقریباً دس روپے روزانہ پیدا کرلینا کوئی بات ہی نہیں۔

ان کے پیشے نے ان کو جفاکش، نڈر اور دلیر بنا دیا ہے۔ ان کی قوم جسے اس طرف "کولی" کہتے ہیں مغربی ساحل پر اپنی جفاکشی کی آپ مثال ہے۔ ان کے آباو اجداد قرونِ وسطیٰ میں تجارتی جہازوں کے لئے ایک مستقل خطرہ تھے، گویا سمندر پر انہیں کی حکومت تھی۔ ان عورتوں کی دلیری سے میں بہت ڈرتا ہوں۔ کیونکہ ٹرام اور برقی گاڑیوں پر چڑھتے وقت یہ "پہلے آپ اور بعد کو میں" کے اصول پر عمل نہیں کرتیں۔ یہ اپنی کہنیوں سے دھکا دیتی ہوئی اپنی جگہ آپ پیدا کر لیتی ہیں۔ اکثر اوقات اس جھڑپ میں بہت سے مہذب آدمی گرتے گرتے بچ جاتے ہیں اور جو منچلے اُن کے منہ آتے ہیں تو اُن کی زبان درازی سے منہ کی کھاتے ہیں۔ یہ نشستوں کے لئے بھیک بھی نہیں مانگتیں بخصوصیت سے ٹرام کے اندر زرق برق پارسی خاتونوں کے لئے یہ ایک بلائے ناگہانی ہوتی ہیں۔ عورتوں کی مخصوص نشستوں پر بلا تکلف بیٹھ کر اپنی ہمنشین مہذب خاتون کی ایسی ضیافت کرتی ہیں کہ وہ بیچاری محسوس کرتی ہے کہ ایک جل پری نے اُس کو اپنے آغوش میں دبا لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود سے قبل ہی اپنی ناک کو مضبوطی سے پکڑ کر مچھلیوں کے اس بھنور میں سے نکل جاتی ہے اور پوری نشست "تو دانی حساب کم و بیش را" کہتی ہوئی ان کے سپرد کر دیتی ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مچھلی والیاں ساحل پر مچھلیاں پکڑنے والوں کی بیویاں یا بیٹیاں ہیں۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ صبح یا شام کو اگر آپ ٹہلتے ہوئے "سیسون ڈاک" پہونچ جائیں تو آپ کو سمندر کی طرف سے شکاری کشتیاں آتی ہوئی نظر آئیں گی۔ جب یہ کنارے پر لگ جاتی ہیں تو اُن میں سے کولی مرد جو کمر تک لنگوٹی کے سوائے بالکل برہنہ ہوتے ہیں مچھلیوں کے انبار لیکر نکلتے ہیں اور دوسری طرف سے ہماری مچھلی والیاں اپنی خالی ٹوکریاں لیکر ان کے استقبال کو بڑھتی ہیں۔ اسی وقت نیلام ہوتا ہے اور اس طرح مرد مچھلیاں فروخت کرتے ہیں اور عورتیں اُن کو خریدتی ہیں۔ یہ سودا کرنے اور دام چکانے میں بڑی مشّاق ہوتی ہیں۔ مچھلیاں ایک ہاتھ سے دیتی ہیں اور دام دوسرے ہاتھ سے۔ اسکے بعد وہ اپنی ٹوکریوں کو آباد کر کے اپنے روزانہ کے دورے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ دراصل اُس وقت یہ سوال نہیں ہوتا کہ کس کی مچھلیاں لذیذ ہیں بلکہ کس کا بدن زیادہ چست اور پھرتیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بگولوں کی طرح بمبئی کی بادیہ پیمائی کرتی ہیں۔

برسات کے زمانہ میں مچھلی پکڑنے والوں کا کام مندا پڑ جاتا ہے اور اُن کا تمام وقت جال کی مرمت کرنے، شراب پینے اور خاندانی جھگڑوں کو از سر نو تازہ کرنے میں گذر جاتا ہے۔ مچھلی والیاں بھی سڑک پر کم نظر آتی ہیں۔ اسی زمانے میں یہ اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر بیڑیاں پھونکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

آخر میں میں آپ سے عرض کر دوں کہ میں ہندوستان کی مہذب عورتوں کے زرد چہرے، مرتاض جسم، اور سست رفتاری سے عاجز آ گیا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ تمام ہندوستان سمٹ سمٹا کر ایک لمبا ساحل ہو جائے جہاں تمام آبادی مچھلی والیوں ہی کی ہو اور انہیں کے جھرمٹ میں ہم اور آپ نور کے تڑکے مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہوں۔

سید ابو طاہر

نئی روشنی کا اندھیر

مولوی حیدر علی ترمذی اپنے وقت کے بڑے جیّد عالم تھے اور عالم بھی باعمل۔ نہایت متشرع۔ عوام و خواص دونوں طبقوں میں احترام تھا۔ دُور دُور تک تقدّس کی دُھوم تھی۔ انگریزی حکومت نے ان کی شُہرت اور اثر سے ہرچند کام لینا چاہا۔ نوازشاتِ شاہی کا میووں سے لدا ہوا سبز باغ دکھایا۔ یہاں تک کہ گھر بیٹھے بن مانگے شمس العلماء کا خطاب بھی عنایت کر دیا۔ لیکن اُنہوں نے کبھی بھول کر بھی کسی حاکم یا انگریز سے مصافحہ کرنا گوارا نہ کیا۔ ہمیشہ اپنی کملی میں مگن رہے۔ جب احبابِ جاہ پسند نے زیادہ اصرار کیا اور گورنمنٹ میں رسوخ کے دینی فوائد دکھانے چاہے تو اُنہوں نے صاف کہدیا کہ "بھئی فقیر گوشہ نشین کو سرکار دربار سے مطلب؟ اپنے مولائے دوجہاں کی غلامی سے مجھے کہاں فرصت کہ دُنیا کے کتوں کا سلامی بنوں۔"

لیکن بایں ہمہ شانِ بزرگی اپنے گھر میں کوئی ان کا اثر قبول نہ کرتا تھا۔ وہاں نہ ان کے فتوے چلتے تھے نہ سخت گیریاں۔ دینداری کے نام سے نفرت تھی۔ خدا اور رسول کا ذکر آجاتا تو محض رسمی طور پر۔ روزہ نماز کا بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ حج کی تمنّا اور زکوٰۃ کا خیال تو دُور کی باتیں ہیں۔ یعنی زندگی کے چاروں اسلامی گوشے ٹٹول ڈالئے کہیں ایمان کی پوری جھلک نہ تھی۔ بلکہ دُنیا اور آج کل کی ارتداد سے لبریز دُنیا کا سماں نظر آتا تھا۔ بیگم صاحبہ رنگین مزاج۔ آزاد خیال۔ صاحبزادہ ولی کے گھر بھوت اور صاحبزادی کا تو پوچھنا ہی کیا نئی روشنی کا برقی لیمپ۔ تین دم اور تینوں مولوی صاحب کے مشرب کے خلاف مذہب کی توہین کرنے والے۔

خُدا کی شان ہے کہ حیدر علی جیسا متقی، شرع کا پابند اور خُدا پرست مولوی اور اس کے سایہ میں ایسے شیطانی اعمال پرورش پائیں۔ باہر قال اللہ اور قال الرسول ہو اور اندر ہارمونیم بجیں اور عشقیہ غزلیں اُڑیں۔ وہاں تزکیہ نفس کی تعلیم دی جائے اور یہاں نفس پرستی سے مُہلت نہ ہو۔ مردانہ میں حدیث و فقہ کی کتابیں کھلی ہوئی ہوں اور زنانخانے میں جدید تعلیم اور دورِ حاضرہ کی معاشرت کا چرچا ہو۔ بات یہ تھی کہ مولانا کی بیگم صاحبہ کے والد خواجہ نسیم نے جو کشمیری نژاد نہایت سحر بیان واعظ تھے، کسی اتفاق سے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور ایک بیوہ یورشین خاتون کو گھر میں ڈالنے کے بعد ان کی معاشرت تقریباً انگریزی ہوگئی تھی۔ اسی مذہبی تبدیلی کی بدولت ان کے حقیقی بھائی خواجہ صمیم آج ڈپٹی کلکٹری کے مُعزز عہدے پر پہونچکر مسٹر سالیم کہلاتے تھے۔ وہ جس قدر بھی اس جدید طرزِ زندگی کے دلدادہ ہوتے کم تھا۔ باپ کے جیتے جی بیگم صاحبہ کو سوتیلی ماں سے سبق ملے پھر بھائی کے ہاں جب جاتیں اُن کے لکچر سنتیں۔ لڑکی بھی عموماً ساتھ ہوتی۔ مولویت کی روکھی پھیکی زندگی کا رنگ کس طرح جمتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بیگم صاحبہ تو جاہل تھیں صرف خوش غلاف ہو کر رہ گئیں۔ بیٹے صاحب رنڈیوں سے بے فکر تھے بُری صحبتوں میں اُلجھ گئے۔ صاحبزادی ماموں زاد بہنوں کو دیکھکر اڑیں۔ کرسچین اسکول میں جانے کا شوق ہوا۔ مولوی صاحب نے سُنا تو بہت بگڑے۔ دلوں خفا رہے۔ گھر میں آنا چھوڑ دیا۔ لیکن لڑکی برابر اسکول جاتی رہی۔ اسکول کے بعد کالج کی نوبت آئی۔ اب ماشاء اللہ یہ جوان ہو چلی تھی۔ اچھی خوراک، اچھی پوشاک، صورت شکل میں پری، الڑھ پنے کے دن۔ جا بہ جا تذکرے ہونے لگے۔ ایک دن مولانا کے کسی شاگرد نے بھی بے نقاب دیکھ لیا۔ اور مذہبی سادگی سے مولانا کو بھی اطلاع دیدی۔ مولانا کے غصّہ کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ گھر میں جا کر جانماز بچھا، دو ہتڑ مارے، سمجھایا اور جب سختی نرمی کسی بات کا اثر نہ دیکھا تو زندگی بھر گھر میں نہ جانے کا عہد کر کے خاموش باہر

چلے آتے۔

مولوی صاحب گھر میں آئیں یا نہ آئیں نہ ماں کو پروا تھی نہ بیٹی کو۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں سے غرض تھی تو اس کو اپنے فیشن سے۔ اسلئے کہ آمدنی کے ذرائع بدستور موجود تھے۔ گھر کے خرچ کی رقم برابر مل رہی تھی۔ مولانا نے گھر میں آنے کا عہد کیا تھا نہ بگڑنے کے اسباب کو بند کرنے کا۔ کھانے پہننے میں فرق آتا عیش و راحت میں تنگی ہوتی تو شاید اپنے چال چلن کی برائیوں پر نگاہ جاتی۔ اب تو یہ مثل ہوگئی تم رہ دیکھے ہم چھوٹے۔ تھوڑا بہت خوف تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اور علی الاعلان مغرب پرستیاں ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں ادھر تو مولانا کی دختر بلند اختر ثریا بیگم نے بی۔ اے کے امتحان کی تیاری شروع کی اُدھر خوش قسمتی سے مولانا کو ہجرت کا موقع مل گیا اور وہ جس قدر جلد ہو سکا مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ بال بچوں کے رہنے کیلئے اپنا مکان تو پہلے ہی سے تھا۔ تین چار ہزار کا زیور بھی ہوگا۔ چلتے وقت دو ہزار روپے نقد بھی حوالے کئے اور کہلا بھیجا کہ "تم لوگوں نے خُدا اور رسول کے احکام سے انحراف کیا، میرے حقوق نہیں سمجھے تم جانو۔ اس کا خمیازہ دیر سویر بھگتنا پڑے گا لیکن مجھ پر جو تمہارے حق ہیں میں انہیں بھولکر اللہ و نبی کا گنہگار نہیں بننا چاہتا۔ اس لئے اطمینان رکھو کہ زندگی بھر تمہاری روٹی کپڑے سے غافل نہیں رہونگا۔"

مولوی صاحب کے اس شریفانہ اور ٹھیٹ اسلامی سلوک سے بھی ان ناعاقبت اندیشوں کو کوئی عبرت حاصل نہ ہوئی۔ باپ کی جدائی سے نہ بیٹی کا ایک آنسو نکلا نہ خاوند کی مفارقت سے بیوی کے دل کو ٹھیس لگی۔ بلکہ چہروں پر ایک قسم کی بشاشت اور اطمینان سا معلوم ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کے جاتے ہی سارا گھر آزاد ہو گیا۔ پردے کی جو تھوڑی بہت رسم تھی وہ بھی اُٹھ گئی۔ دن رات سیریں تھیں۔ تماشے تھے۔ آج یہاں جلسہ ہے تو کل وہاں پارٹی ہے۔ دونوں ماں بیٹیاں کبھی ساتھ اور کبھی الگ اپنی اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں میں مغربی سیلاب میں بہی بہی پھرتی تھیں۔ مولوی زادہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔ مصلوں کی جگہ جوئے کے پانسے پھینکتے تھے۔ گھر کی اس آوارگی سے تسکین نہ ہوئی تو پاؤں باہر نکالے اور آخر ایک دن کسی طوائف کے ساتھ ایسے گئے کہ عمر بھر پھر نہ پلٹے۔

رہیں بی مولون اور مولوی زادی تو انہوں نے یورپین لیڈیوں کی تقلید کے شوق میں اپنی وضع قطع، طور طریق سب بدل لیا تھا۔ ماں کو میم اور بیٹی کو مس بننے کی ایسی دُھن سوار تھی کہ آنکھ، ناک، کان کے سارے لحاظ اٹھا دئے تھے۔ قاعدے کی بات ہے کہ رسمیات کے مقلد اپنے اماموں کی پیروی کرنے میں عموماً بہک جایا کرتے ہیں چنانچہ یہ دونوں ماں بیٹیاں بھی بہک گئیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ اپنے کو بھول گئیں ساتھ ہی اپنی قومیت، اپنے ملکی رسم و رواج اور اپنی معاشرت کو بھلا دیا۔ ثریا بیگم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی چشم ما روشن دل ما شاد، بہت اچھا کیا۔ ہماری آئندہ نسلیں اگر زندہ رہ سکتی ہیں تو ان ماں بننے والیوں کو تعلیم دے کر۔ لباس کیلئے بھی اگر مولوی حیدر علی کی بیوی اور بیٹی ہونے سے قطع نظر کر لی جائے، ہم انہیں چنداں قابل ملامت نہیں سمجھتے۔ پُرانی قسم کا ہندوستانی بے اصول تو خیر نہیں ہاں بے ڈھنگا پردہ بھی اُٹھا دینا کافر نہیں بنا دیتا۔ لیکن جسم کے ساتھ ساتھ خیالات کی عریانیوں کو کیا کہئیے گا کھلے سر برہنہ شانے، چہرہ بے نقاب محض اپنی نمائش کیلئے بازاروں اور تفریح کے مقامات میں پھرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

ثریا نے بی۔ اے کی ڈگری کیا لی، مغرب کی تقلید کا ٹھیکہ لے لیا۔ بات چیت، چال ڈھال، رنگ ڈھنگ، ایک ایک ادا میں یورپ کی شاگردی کا حق ادا کرتی تھی۔ موجودہ تمدن اور تہذیب جو سانپ کے منہ چھچھوندر بن کر رہ گیا ہے اور آج وہ خود اس سے عاجز آچکے ہیں، بی ثریا کے لئے ایک نعمت تھا۔ وہ اپنے کیرکٹر میں ہر وہ بات پیدا کرنا چاہتی تھی جو اس دورِ تہذیب کی خصوصیت ہے۔ ثریا کے

اب جوانی کے دن تھے ـــــ مرادیں ایک تاروں بھری رات کی منتظر تھیں۔ کئی مہینے سے مختلف الخیال نوجوانوں کی درخواستیں بھی آنی شروع ہوگئی تھیں۔ بالمواجہ بھی پیام سلام ہونے لگے تھے۔ اودھ اور پھر ایک مقتدر علم پرور خاندان کی پہلی مسلم خاتون تھی جس نے اعزاز کے ساتھ بی۔اے پاس کیا تھا۔ اس لئے صرف چند اچھے گھرانے اُسے اپنے اندر جذب کرنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے ہاں نئی روشنی پیدا ہو۔ ورنہ عموماً نوجوان یا تو اس کی حسن و جوانی کے خواستگار تھے یا انہیں ثریا بیگم کی مغرب پرستی سے اپنا کوئی مفاد مدنظر تھا۔ ممکن ہے ان خواستگاروں میں ایک دو ایسے بھی ہوں جن کا مقصدِ حقیقی ازدواجی مسرت ہو۔

مرد تو خیر اس معاملے میں خاص طور پر بدنام ہیں۔ نئی تعلیم اور نئے طرزِ معاشرت نے ان کی ذہنیت گندی سے گندی سہی لیکن صنفِ نازک پر یہ بھوت کیوں سوار ہوگیا۔ یہ نقاب اُلٹتے ہی اس قدر آزاد خیال کس لئے ہوگئیں کہ اپنی صنفی خصوصیات سے بھی ہاتھ اُٹھا لیا۔ اگر عورت ہی وہ مبارک ہستی ہے جس کی گود میں قومیں پلتی، بڑھتی اور ترقی کرتی ہیں تو اس کو ماں بننا چاہیئے نہ کہ ڈائن۔ ثریا صنف کے لحاظ سے تو عورت تھی اور تعلیم یافتہ عورت لیکن اندھی آزادی اور پرستاروں کی کثرت نے اس کے تصوّرات کو وہاں پہنچا دیا تھا جہاں احساسات بالکل کُند ہو جاتے ہیں اور ایک عورت اپنے درجے سے بہت نیچے گر جاتی ہے۔ ثریا کی رائے تھی کہ ازدواجی تعلق وہاں پیدا کیا جائے جہاں عصمت کی قیمت زیادہ سے زیادہ لگے۔ وہ ایک شوہر میں مردانہ اوصاف سے زیادہ جیب کی اہمیت چاہتی تھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ شوہر وہی بن سکتا ہے جو بہتر سے بہتر معاشرتی سامان مہیا کر سکے خواہ اس میں خاندانی، قومی، علمی، مردانہ اخلاقی کوئی خوبی ہو یا نہ ہو۔ اسکے خیال میں یہ سارے امتیاز اضافی اور صرف ایک دولت ہی اصلی چیز تھی۔

جوئندہ یابندہ چند ہی ہفتے میں اتفاق سے ثریا کو ایک حسن پرست شوقین کسی ریاست کا ریٹائرڈ وزیر مل گیا۔ ریاستوں کے بڑے عہدے دار عموماً مرتے مرتے جوان بنے رہنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ پہلے تو یہ ؎

"دشمنِ زندگی است موئے سفید روئے دشمن سیاہ باید کرد"

کی موافقت میں چہرے کی سفید رنگی روئیدگی کو کالا کرتے رہتے تھے۔ مگر اب جب سے خضابِ آہنی کا رواج ہوا ہے بالوں کی کھال تک نکال ڈالتے ہیں۔ بالکل صفا چٹ میدان۔ یہی حال سر ایم سلمانی کا تھا۔ عمر تو پچپن برس سے کم نہ تھی۔ البتہ حرکتیں ساری جوانوں کی سی تھیں انگریزوں اور انگریزی معاشرت کے عاشق تھے۔ تموّل اُن کا مانا ہوا تھا ایک معقول پنشن ملتی تھی۔ کئی گاؤں اور تقریباً پانچ سات ہزار روپے ماہوار آمدنی کی سکنی جائداد کے مالک تھے۔ تین لاکھ روپیہ مختلف بنکوں میں جمع تھا۔ پچاس ہزار روپے میں اپنی جان بھی بیمہ کرا لی تھی۔ عالیشان کوٹھی میں رہتے تھے۔ متعدد موٹریں سواری کو تھیں۔ پھر فیشن کا کیا پوچھنا۔ ان کا پیام کیا آیا ثریا بیگم کی مُراد آئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ دو ہفتہ کے اندر نکاح کی قانونی رسمیں پوری ہوگئیں۔ نکاح کیا تھا ایک تماشا تھا۔ ایک سانولا سا انگریز موٹر میں سوار آیا۔ دولہا دُلہن آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ برائے نام قاضی صاحب منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ ثریا بیگم مسز سلیمانی ہوگئیں۔ اور موٹر میں ایک حور ہم پہلوئے لنگور یہ جا وہ جا۔

چند روز بڑی موجیں رہیں۔ ثریا بیگم کا دماغ لندن اور پیرس کی سیر کرنے لگا۔ تاج محل ہوٹل کو شرمانے والی کوٹھی رہنے کو۔ بہرے خانساماں کمر باندھے دست بستہ ہر وقت حاضر۔ رینکن اور وائٹ وے کی دُکانیں فیشن کی پیاس بجھانے کیلئے چاروں طرف کھلی ہوئیں حکومت میں حکومت ـــــ اور دولت میں دولت۔ لیکن حقیقت میں ایک عورت کی اصلی تسکین ان چیزوں سے نہیں ہوتی۔ موجودہ تہذیب کے یہ

صرف فریب ہیں۔ دو چار ہفتہ کے بعد ہی ثریا بیگم کچھ خاموش اور اُداس سی نظر آنے لگیں۔ ایک ڈھلی ہوئی عمر کے دولھا سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی نوخیز دُلہن کے جذبات کا احترام کرتا۔ اور اسکی نوجوانی اس مصنوعی اعضا والے پیر نابالغ سے سیراب ہوتی۔

اب ثریا بیگم کو محسوس ہوا کہ وہ اس حال میں خوش نہیں رہ سکتی۔ اُس کے حسن و شباب کا باغ مرجھایا جاتا تھا۔ وہ رات بھر انگڑائیاں لیتی اور سارے دن بیچین رہتی۔ پھولوں کی مسہری بھی ہوتی خواب گاہ میں خیالی عیاشی کی تصویریں بھی مگر وہ راحت جو جوانی سے جوانی کو گلے مل کر ملتی ہے کہاں نصیب تھی۔ سر سلیمانی عیاش مزاج آدمی نہ تھے۔ اُنہیں صرف نئی شادیاں کرنے کا شوق تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی کسی بیوی کو تکلیف نہیں دی۔ ان کو ہر قسم کی آزادی تھی۔ کوٹھی میں کھائیں کوٹھوں پر کھیلیں۔ پھر بھی اگر ان کا پیٹ نہ بھرے تو خوشی سے رخصت کر دینے میں بھی عذر نہ تھا۔

سر سلیمانی نے اپنی بیاہتا بیوی کے بعد جس کے بطن سے سات لڑکے لڑکیاں تھیں۔ کئی نکاح کئے اور سب تھوڑے تھوڑے دن کے بعد اپنی مرضی سے آزاد ہو گئیں۔ لیکن ثریا بیگم سے اُنہیں کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ اس کی علیحدگی کے خیال سے بھی وہ کانپ اُٹھتے تھے اور اس لئے وہ اپنا زیادہ وقت مشہور ڈاکٹروں، ویدوں اور مُلک کے نامور طبیبوں سے مشورہ لینے میں گزارتے تھے۔ تاکہ ثریا کی بیزاری میں کمی ہو اور یہ وظیفۂ زوجیت کے قابل ثابت ہوں۔ ادھر تو سر سلیمانی اپنی فکر میں تھے اور ادھر مسز سلیمانی اپنی اُدھیڑ بن میں تھیں۔ ایک طرف دولت اور وجاہت تھی تو دوسری جانب جذبات اور جنسی مسرتیں۔ نہ اس دولت اور اعلیٰ تمدن سے ہاتھ اُٹھائے بنتی تھی نہ اپنی جوانی کا گلا گھونٹنے کو جی چاہتا تھا۔

اسی کشمکش میں ثریا بیگم کے دو سال گذر گئے۔ جاہل ہوتی یا خیالات میں قدامت پسندی کا اندھیرا ہوتا تو قصہ کبھی کا تمام تھا۔ ذرا بیباکی سے کام لیتی تو طلاق ہو جاتی۔ شوہر سختی سے کام لیتا تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی یا کچھ کھا کر سو رہتی۔ لیکن تعلیم یافتہ اور خصوصاً یورپی تہذیب کے مقلد ایسی حماقت نہیں کر سکتے۔ ثریا جیسی انگریزی تعلیم کی باعمل خاتون ان روایتی چیزوں سے بالاتر تھی۔ اس کا مطمح نظر کچھ اور تھا۔ اس نے اپنے جذبات کی تسکین کے لئے اسباب بہم پہونچا لئے۔ سر سلیمانی کی کمزوریوں اور ثروت کے ذریعے ہر اُس بے عنوانی میں مبتلا ہو گئی جو پست سے پست کیریکٹر کی عورتوں میں پائی جاتی ہیں مگر سونے کا جھول چڑھے ہوئے اس طلسمی تمدن کو نہ چھوڑا۔ بظاہر سکون تھا۔ دل گناہ یا انفعال سے مضطرب ہوں۔ نگاہوں میں بیباکی یا ندامت سہی۔ زبانیں بالکل خاموش تھیں۔ انگریزی رواج کے مطابق ملتے رہتے تھے۔ کھاتے تھے پیتے تھے۔ نہ شوہر کو بیوی کے کسی رویہ پر اعتراض کا حق تھا نہ بیوی شوہر سے اپنی زندگی وابستہ سمجھتی تھی۔ میزبان اور مہمان کا سا تعلق تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ مہمان خانے میں ہر قسم کے عیش و آرام ہیں۔

پناہ کے لئے انسان ہوں یا حیوان محبت اور شفقت نہایت ضروری ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات کا تو انحصار ہی محبت اور شفقت پر ہے۔ لیکن جہاں بجائے مناکحت کے تجارت کی گئی ہو اور محبت کے عوض دولت کو اس تعلق کی بُنیاد تصور کیا جائے وہاں ایثار اور ہمدردی تو کیا معنی معمولی نوعی شرافت بھی جاتی رہتی ہے۔ ثریا بیگم نے سر سلیمانی سے شادی کی تھی نہ اُن سے اس کو محبت تھی۔ ان کی دولت سے بیاہ کیا تھا اس لئے محبت بھی دولت ہی سے ہونی چاہیئے۔ سر سلیمانی تو ایک دلال کی حیثیت رکھتے تھے۔ محبت میں مشارکت کبھی کسی کو پسند ہوئی ہے جو ثریا بیگم پسند کرتیں۔ ان کے زیر غور اب یہ مسئلہ تھا کہ سر سلیمانی پکے پان ہیں اور میں لاولد۔ اگر یہ مر گئے تو کیا ہوگا۔ ایسی کوئی ترکیب نکالنی چاہیئے کہ بلا شرکت غیر اس دولت پر قابض ہو جاؤں۔ اللہ میاں کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ باوجود ہزار ضبط تولید مسز سلیمانی کو حمل رہ گیا۔

کچھ خوشی تھی کچھ رنج۔ سر سلیمانی سے کیا کہتیں۔ دونوں اپنی اپنی کمزوریوں سے واقف۔ مگر یہ چھپنے والی چیز بھی نہ تھی۔ تین چار مہینے بعد خود بخود کھلی اور ثریا بیگم کو بے حیا بنکر شوہر کے کانوں تک یہ خوشخبری پہونچانی پڑی۔

سر سلیمانی پُرانے ریاستی خرانٹ تھے سُنکر مُسکرائے اور خوشی کا اظہار کرکے ایامِ حمل کی احتیاطوں کا دیر تک ذکر کرتے رہے۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے ناخوشگواری معلوم ہوتی بلکہ اپنے دفتر کے کمرے میں جاکر کہلا بھیجا کہ "اگر اس غیر مترقبہ خوشی کے سلسلہ میں تم اپنی دوستوں کو کوئی پارٹی دینا چاہو تو تاریخ دن مقرر کر دو۔ بہتر سے بہتر انتظام ہوسکتا ہے" لیکن دل میں انتہائی غصّہ اور ملال تھا۔ ثریا کی نسبت جتنی افواہیں تھیں سچ ہوگئیں۔ اُنہیں یہ ہرگز بھی اُمید نہ تھی کہ ایک مولوی کی بیٹی، تعلیم یافتہ اتنی بے غیرت ہوجائے گی۔ دُنیا تو کیا کہتی۔ جس کے گھر میں ہو اُسی کی اولاد۔ اُنہیں ذہنی تکلیف یہ پہونچ رہی تھی کہ حرام کی کمائی میرے ہاں پلے گی۔ میرے نام سے پلے گی۔ میں بیٹھا ہوا دیکھونگا۔ اور مجھے اپنے کئے کی لاج میں کہنا پڑے گا کہ ہاں میری اولاد ہے۔ پھر وہ ترکہ میں میری اصلی اولاد کے برابر حقدار سمجھا جائیگا۔

ان خیالات نے سر سلیمانی کے مزاج میں ایک انتشار سا پیدا کر دیا اور جب تک وہ اس نتیجے پر نہیں پہونچ لئے کہ وضع حمل سے پہلے ثریا کا ٹھکانے لگا دینا ہی آئندہ کے تمام توہمات کو دُور کرسکتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے رازدار ڈاکٹر سے صلاح لی اور ایک سخت تریں زہر کافی سے زیادہ مقدار میں لاکر اپنے سیف میں محفوظ کر دیا تاکہ جس وقت چاہیں کام میں لاسکیں۔ یہ زہر بے بو۔ بے رنگ اور بے ذائقہ بالکل شفاف پانی کی طرح ایک بلّوری سفید شیشی میں بھرا ہوا تھا۔ یہ دولت بھی کیا عذاب ہے اور اس عذاب کو دورِ حاضرہ کے معیار معاشرت نے تو لعنت ہی بنا دیا۔ سر سلیمانی جیسا جنٹلمین مجبور ہے کہ ایک ناقابلِ معافی گناہ اپنے سر پر لے اور صرف اس لئے کہ اس کی دولت میں چوری نہ ہو۔ ساتھ ہی لیڈی سلیمانی اپنے داؤں سے غافل نہ تھیں۔ اور جس دن سے اُن پر یہ رازِ سربستہ کھُل گیا تھا کہ سر سلیمانی آج سے بہت پہلے اپنی تمام املاک اپنی اولاد کے نام ہبہ کرچکے ہیں اُن کی صنفی چالاکی ناجائز سے ناجائز تدبیر کیلئے تیار تھی۔

ثریا بیگم بظاہر یہ سمجھتی تھیں کہ سر سلیمانی کا سوائے دو چار معمولی بیویوں کے کوئی نہیں ہے اور وہ بھی سب بے اولاد ہیں۔ یہ نتیجہ کچھ تو ان کی جلدبازی کا تھا اور زیادہ اس مغالطہ میں اُنہیں سر سلیمانی کی انگریزی معاشرت نے ڈالا تھا۔ دو لڑکے یورپ میں تھے۔ تین کی تعلیم دہرہ دون میں ہورہی تھی۔ لڑکیاں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھیں۔ جنہوں نے کلکتہ میں ایک گرلز سکول کھول رکھا تھا۔ برس میں ایک مرتبہ یہ خود جاتے تھے اور بچّوں سے مل آتے تھے۔ اتفاق کی بات بینک کے ایک خط سے ثریا بیگم کو یہ حالات معلوم ہوگئے اور اس معلومات نے اس کو چراغ پا کر دیا۔ دانتوں سے اپنی بوٹیاں کاٹنے لگی۔ مگر کیا کرتی۔ ساری چالاکی ہوشیاری اور روشن خیالی دھری کی دھری رہ گئی۔ سر سلیمانی کی پنشن تھی یا بیمہ کا پچاس ہزار روپیہ۔ جس میں سے پنشن تو اُن کی زندگی تک ان کا مال تھا اور بیمہ کی رقم مرنے کے بعد کی چیز تھی وہ بھی ورثا میں تقسیم ہوتی۔ ثریا بیگم کو کیا ملتا۔ وہی روپے میں چھدام۔ ہاں اگر ثریا بیگم لاولد نہ رہے اور اولاد بھی نرینہ ہو تو جھگڑے کے بعد کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔ اولاد کا انتظام تو قدرت کی طرف سے ہوسکتا تھا۔ رہا یہ سوال کہ سر سلیمانی کے مرنے کا انتظار کوہ کندن وکاہ برآوردن۔ اس لئے مغربی تقلید کی دلدادہ ثریا کے واسطے ایک یہی راستہ تھا کہ سر سلیمانی کی زندگی جلد سے جلد ختم کردی جائے تاکہ بیمہ کی رقم ہاتھ میں لیکر اپنے بچّہ کے نام سے جو پیٹ میں ہے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

بہرحال سر سلیمانی اور مسز سر سلیمانی میں ایک قسم کی خونی کبڈی شروع ہوگئی تھی جس کا پالا دولت کی ڈھیری تھا۔ سر سلیمانی اپنی گھات میں تھے اور ثریا بیگم اپنی تاک میں۔ بدبختی سے سر سلیمانی کو زکام ہوا اور زکام سے بخار۔ ڈاکٹروں نے کمرہ میں قید کر دیا۔ سیف

کھولنے کی ضرورت پڑی۔ سر سلیمانی کو یاد بھی نہ تھا کہ سیف میں ثریا کے قتل کا سامان بھی ہے۔ ثریا کو کنجیاں دیدیں۔ اُس نے جو سیف کھولا تو شیشی نظر پڑی جس پر "زہر قاتل" کا سُرخ لیبل لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر برنارڈ کی چٹھی بھی دیکھی۔ یک دھک رہ گئی۔ جوں توں کر کے شیشی پر قبضہ کر سیف بند کیا اور آ گئی۔ خُدا کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں۔ پل بھر میں مارنے والے کی جان مرنے والے کے ہاتھ میں آ گئی۔ ملک الموت کا رُخ ایک اشارے میں اِدھر سے اُدھر مُڑ گیا۔

دوسرے دن صبح کو سر سلیمانی اپنے بستر پر مرے ہوئے ملے اور آج تک پتہ نہ چلا کہ موت کا سبب کیا تھا۔ ثریا نے بیمہ کی رقم کیلئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ بچہ اور بچہ بھی لڑکا پیدا کر کے دکھایا لیکن دوسری املاک میں تو کیا حصّہ ملتا بیمہ کی رقم سے بھی ایک حبّہ نہ ملا۔ اولاد تو اولاد نکاح ہی سرے سے ناجائز ثابت ہوا۔ البتہ ذات بدنامی اور ہزاروں اتہام ضرور ورثہ میں ملے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ تہذیب اور ہماری شاندار معاشرت نے عورتوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ وہ شوہروں کو صرف روپے کیلئے تلاش کرتی ہیں۔ ان کی شادیاں شادیاں نہیں بلکہ ایک تجارت ہے۔ انہیں مردوں کو شوہر بنانے کی ضرورت نہیں۔ ازدواجی رشتہ سے ان کا مقصد سوسائٹی میں بلند جگہ حاصل کرنا اور عشرت پسندانہ زندگی گزارنا ہے۔ اور عشرت پسندانہ زندگی بھی وہ جو سرتاپا بناوٹ ہے جس میں حقیقی مسرت کا نام نہیں۔ اگر ہماری خواتین بھی یورپ زدہ ہو کر، سامانِ آرائش کے لئے۔ موٹروں کے لئے، اعلیٰ لباس کیلئے اور تفریحات کے شوق میں اپنی صنعتی لطافتوں، اخلاقی نزاکتوں اور جنسی شرافتوں کو اسی طرح بیچتی رہیں اور ان میں عورت کا صحیح کیریکٹر نمایاں نہ ہو سکا تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری آئندہ نسلیں ملک کیلئے کیا مفید ہو سکیں گی۔ اور ایک شریف عورت اور بازاری میں کیا فرق رہے گا۔

اشرف صبوحی دہلوی

سرت چندر چٹرجی

پر

"وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے"

سرت چٹرجی! کتنے اُردو داں اس نام سے واقف ہیں؟ خود بنگال میں بہت سے لوگ اس کی پرائیویٹ زندگی کا حال سوائے اس حقیقت کے اور کچھ نہیں جانتے کہ وہ منکسر المزاج اور بادی النظر میں ایک کم رُو سا انسان ہے جس پر کبھی ایک مشہور اور ممتاز مصنف کا دھوکا نہیں ہوتا مگر "پردۂ راز" میں رہنے کے باوجود بھی یہ شخص بنگال کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز ناول نگار ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اسکے سوانح حیات سے قطع نظر کرکے صرف اس کے آرٹ پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکی زندگی کے واقعات کا تذکرہ کرنے سے دیدہ و دانستہ احتراز کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی پر ایک پُراسرار تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے جس میں سے ہماری متجسس نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ سرت کی حیا چونکہ اُسے منصۂ شہود پر آنے سے باز رکھتی ہے اس لئے یہاں بھی صرف اُس کے فن سے بحث کی جاتی ہے۔

اس کی سب سے پہلی تصنیف "چرترا ہین" "جمنا" نامی ایک ماہوار رسالہ میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے شائع ہوتے ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ناول نگاری کے میدان میں ایک نیا شہسوار اُترا ہے ــــــ ایک ایسا ناول نویس جو سوسائٹی کے اُن تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جن کا تذکرہ پہلے صریحاً ممنوع اور معیوب خیال کیا جاتا تھا!

اسوقت سے اس کے ناول اور مختصر افسانے برابر شائع ہو رہے ہیں۔

اس کے "سماجی ناولوں" کی "پہنائی" اور بنگالی ناولوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وسعتِ نظر لامحدود ہے، اس کی فضائے تخیل بے پایاں۔ وہ پہلا شخص ہے جو اپنے ناولوں میں ان "افتادگانِ قسمت" کا تذکرہ کرتا ہے جن کو ہماری بے رحم سوسائٹی "ارذل ترین خلائق" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ لوگ اس کے قصوں میں صرف "زیبِ داستاں" کے لئے داخل نہیں کئے جاتے۔ دراصل وہ ہی سرت کے ناولوں کی جان ہیں۔ وہ نہایت شفقت اور ہمدردی سے ان کی تصویریں کھینچتا ہے، ان کے خد و خال کو نمایاں کرتا ہے، اور اپنے سحر کار قلم کی مدد سے ان کو حیاتِ جاودانی بخشتا ہے۔ سوسائٹی کے بلند ترین طبقہ سے لیکر اسفل ترین طبقہ تک کے لوگ اس کے "پردۂ تصویر" پر نظر آتے ہیں۔ اس کے کردار حد سے زیادہ متنوع اور اصل کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ناول ایک قد آدم آئینہ ہیں جس میں سوسائٹی کا عکس ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔

بنگالی ناول میں "ریل ازم"[1] (اصلیت سے مطابقت) کا خیال سب سے پہلے سرت ہی نے داخل کیا۔ اس سے پہلے بنگالی ناول زیادہ تر تاریخی ہوتے تھے، سماجی نہیں۔ ان میں تخیل کی کارفرمائی زیادہ ہوتی تھی اور واقعیت یا اصلیت کا لحاظ بالکل نہیں کیا جاتا تھا۔ سرت نے سوسائٹی

---

[1] Realism

کی ہُوبہُو تصویر کھینچنے میں وہ ملکہ حاصل کیا ہے کہ اس کے کمال کو "ادبی فوٹوگرافی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، پھر اس کے بلیغ اشارات تو گویا سونے پر سُہاگہ ہیں۔

مگر اُس کی "اصلیت نگاری" (realism) اُس قسم کی مکروہ "اصلیت نگاری" نہیں جس کو دورِ حاضرہ کے یورپین مصنفین نے اپنا شعار بنا رکھا ہے اور جن کے خیال کے مطابق خللِ دماغ بھی ایک فن ہے۔ نہ وہ مسٹر جیمز جائس[1] کی طرح کا فن کار ہے جو "اصلیت نگاری" کا عذر پیش کرکے بیہودہ گوئی کیا کرتا ہے۔ وہ تو زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور جس حالت کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی تصویر الفاظ میں پیش کر دیتا ہے۔ کہیں کہیں تو اس کا آرٹ میکسم گورکی[2] کی یاد تازہ کر دیتا ہے، فرق صرف اتنا باقی رہ جاتا ہے کہ سرت کے کردار کیفیتِ شعری سے زیادہ مملو اور بہ حیثیت انسان ہونے کے زیادہ کامل ہوتے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا مایۂ کمال اس کی "خصائص نگاری" (Characterisation) ہے اور اس فن میں کوئی دوسرا بنگالی (نہ بنگالی کیوں کہیے؛ ہندوستانی) ناول نگار اس سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے کردار حد درجہ متنوع ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل نگاری ہی اس تنوّع کا راز ہے ـــ قدرت نے دو انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا۔ اس کے کردار پُرانے قصّوں اور کہانیوں کے اُن کٹھ پتلیوں جیسے افراد سے بالکل مختلف ہیں؛ جن کا وجود صرف قصّہ گو یا قصّہ نویس کے ذہن ہی میں ہوتا ہے! اور جن کا خارجی دُنیا میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ قصّہ گو یا قصّہ نویس کی تخلیقی قوت اُن کو اپنے خیال کے مطابق صرف دو صفات ـــ نیکی یا بدی ـــ سے متصف کر دیتی ہے۔ قصّہ میں جو شخص ایک بار نیک بنا کر پیش کر دیا گیا وہ ہمیشہ نیک ہی رہتا ہے اور بد کبھی اپنی فطرتِ زشت بدل نہیں سکتا۔

سرت نے زندگی، اس کے تلوّن اور اس کے اِمکانات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس دُنیا میں مثالی انسان ملنا ناممکن ہے۔ یہاں کا قانون ہی "تغیّر اور تبدّل" ہے۔ یہاں کوئی چیز بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک ہے اور ہر لحظہ نئے نئے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ نیک و بد جانچنے کا معیار بھی انفرادی ہے جو ہر شخص اور ہر زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

سرت کے کردار جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں ـــ گوشت و پوست سے بنے ہوئے انسان ـــ جن کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا ہوتا ہے اور جن کے پہلوؤں میں تڑپتے ہوئے دل ہوتے ہیں۔ وہ ان پُرانے قصّوں اور ناولوں کی "خیالی مخلوق" سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہ ہم کو اجنبی اور انوکھے نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں اُن سے اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ سرت چپکے سے ہم کو اُن کا نظّارہ قریب سے کراتا ہے۔ وہ صرف ان کے خدوخال ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اُن کے خیالات اور احساسات، ان کی حسرتیں اور ارمان، اُنکی اُمیدیں اور خطرات، ان کی خوبیاں اور خامیاں ـــ سب ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ نیک و بد کی تقسیم اسے نہیں آتی۔ وہ جانتا ہے کہ نیکی اور بدی کی طاقتیں زندگی کا جزو لاینفک ہیں اور علیحدہ علیحدہ اُنکا وجود ناممکن ہے۔ ہر شخص کے اندر یزداں اور اہرمن دونوں موجود ہوتے

---

[1] ـــ Mr. James Joyce نوٹ:- ("Ulysses" جیمز جائس کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ بڑے بڑے اہلِ دماغ اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو وہ ایک نہایت غیر دلچسپ کتاب ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اوریجنل ہے۔ مگر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ "اوریجنل زیادہ ہے اور آرٹسٹک کم"؛ سوائے اوریجنلٹی اور "کوفت" کے اس میں اور کچھ نہیں۔)

[2] Maxim Gorki

ہیں، گو ہر شخص میں ان کی طاقت اور عظمت کا مظاہرہ یکساں طور پر نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب ہے کہ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

اس کے ناول مزاحِ لطیف اور خوش طبعی کے بہترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ اس کی شروع شروع کی تصانیف میں یہ خوش طبعی بذلہ سنجی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ ہمیں بے اختیار اناطول فرانس[۱] یاد آجاتا ہے۔ وہی آب و تاب موجود ہے، مگر اس تلخی سے معرا جو "پنگوئن آئی لینڈس"[۱] میں پائی جاتی ہے۔ چٹرجی انسانوں کی حماقتوں اور لغزشوں کا مشاہدہ کرتا ہے، سوسائٹی کی تباہ کن رسمیں اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہیں۔ بے رحم قسمت کی نت نئی جور و جفا، انسان کے اندر والی متضاد اور باہم برسرِ پیکار طاقتوں کی ستم ظریفیاں اس کی حساس طبیعت پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ مگر وہ ان سب کا تذکرہ ایک ہمدردانہ تبسّم کے ساتھ کرتا ہے ــــــــــ شاید اس لئے کہ وہ خود بھی اپنے کسی حد تک بے عنوان دورِ شباب میں، ان سب کا شکار رہ چکا ہے اور ہم کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ہماری کمزوریوں اور لغزشوں پر خفگی کے بجائے اس کے پاس یا تو ایک معنی خیز مگر طفلانہ تبسّم ہوتا ہے یا ایک دبی ہوئی آہ جو باوجود کوشش ضبط کے اس کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ مگر اس کا یہ عجیب و غریب تبسّم جو بیک وقت ہمدردی اور تاسف کا مجموعہ ہوتا ہے اس گھنٹی کی آواز سے مشابہ ہے جو طوفان سے پہلے بجائی جاتی ہے۔

اس کے ان ناولوں میں جو بعد کو لکھے گئے ہیں ہمیں وہ بے باک اور بے ساختہ ہنسی مفقود نظر آتی ہے۔ گو اس پرانی خوش مزاجی کا اثر کچھ کچھ باقی رہتا ہے مگر اب اس کا خندۂ زیرِ لب "زہر خند" ہو جاتا ہے۔ اس کی ہنسی "زبردستی کی ہنسی" بن جاتی ہے۔ اس کے بھولے پن کی جگہ اب کسی اور چیز نے لی ہے جو زیادہ کرخت اور تلخ ہے۔ اب اس کی تصویریں اور مرقعے اندوہگیں ہونے لگے ہیں۔ اس کے کردار دلی جوش سے گفتگو کرتے ہیں مگر فضا میں سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ ہر چیز پر اب اندھیرا سا چھانے لگا ہے۔ زندگی بسر ہوتی ہے۔ دن کٹ جاتے ہیں۔ . . . . مگر کس امید پر؟ "کسی امید پر نہیں"! وہ خود ہی اپنے ناول "دیوداس"[۲] میں اس کا جواب دیتا ہے، جو اس کی عظیم ترین ٹریجڈی (المیہ) ہے۔ "چوبی" میں کچھ امید کی جھلک نظر آتی ہے، "ازکشنیا" کا انجام ہنسی خوشی ہوتا ہے، "گرہ داہا"[۳] "دخانۂ آتشیں" کا انجام موہوم رہتا ہے ــــ یعنی ہم اس کو اپنی مرضی اور خیال کے مطابق جیسا چاہیں سمجھ سکتے ہیں ــــ مگر "دیوداس"؟ "دیوداس" امید سے سراسر خالی ہے۔ اس میں صرف دل کی خلش ہے اور آنسوؤں کی تلخی!۔

دیوداس جب اپنی "پارو" (پاربتی) کے گھر کے سامنے دم توڑتا ہوتا ہے تو اس کے پاس ایک متنفس بھی نہیں ہوتا۔ جب صبح کو پارو کو اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتی ہے . . . . یہ ہے زندگی اور اس کا انداز بے پروا!۔

ہمیں زندگی کو پھولوں کی سیج نہ سمجھنا چاہیئے۔ گلہائے رنگ رنگ سے یہ خالی ہے۔ اس میں قدم قدم پر خار زار ہیں۔ "پھول" ــــ ــــ اگر زندگی میں پھول ہو سکتے ہیں! ــــــــــ ان نباتاتی پھولوں سے بھی زیادہ عارضی ہوتے ہیں جو ہماری دنیا میں پائے

---

[۱] Anatole France کے Penguine Island اناطول فرانس کی ایک تصنیف کا نام۔

[۲] اردو داں طبقے پر "نیو تھیٹرز لمیٹڈ" (کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی) نے "دیوداس" اور "گرہ داہا" جیسے بے مثل ناولوں کو فلمی ڈراموں کی شکل میں پیش کر کے واقعی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اصغر حسین شور نے نہایت پاکیزہ اور عام فہم زبان میں مکالمے لکھے ہیں۔ اور جمنا اور سہگل نے دیوداس میں اداکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ سرت کے اور ناول بھی اسی طرح ملک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ [۳] "گرہ داہا" کا نام "نیو تھیٹرز لمیٹڈ" نے بدل دیا ہے۔ اس

(بقیہ صفحہ آئندہ)

جاتے ہیں۔ ہاں، کانٹے البتہ ہیں جو ہمارے دلوں میں ناسور ڈالتے رہتے ہیں۔ قسمت رحم ناآشنا ہے اور ہم کمزور اور مجبور ہم غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور حد سے زیادہ توقع رکھنے کے عادی ہیں۔ ....

مگر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ سرت چٹرجی میں کوئی ٹھوس فلسفہ ملنا دشوار ہے اور اس کے ناولوں میں کسی ایک فلسفہ کی تلاش بھی حماقت کے مرادف ہے۔ وہ تو شیکسپیئر کی طرح "عام اور عالمگیر" ہے۔ وہ کوئی عقاید نہیں رکھتا۔ اس کے کردار محض کٹ پتلیاں نہیں جن کے ذریعے کسی فلسفہ کا اظہار کیا جاسکے۔ اس کے خیالات اور احساسات جگہ جگہ منتشر ہیں مگر ان کے مجموعے سے کوئی ایک فلسفہ تیار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ہر کردار کا نقطۂ نظر نرالا ہے اور خود اسی کردار کیلئے مخصوص ہے۔ سرت کے ناولوں میں "ہم خود اسکو کہیں نہیں پاسکتے" کہیں کہیں ہمیں دھوکا ہوجاتا ہے اور ہم کہہ اٹھتے ہیں۔ "یہاں، یہاں ہم نے تمہیں پکڑ لیا ہے!" مگر نہیں، وہ ہنستا ہے اور ہوا کی طرح ہماری گرفت سے آزاد ہوجاتا ہے۔ وہ اس روشنی کی طرح جگہ جگہ بھاگا بھاگا پھرتا ہے جو رات کو کسی قبرستان یا دلدل میں نظر آیا کرتی ہے اور جتنا زیادہ اس کا تعاقب کیا جائے اتنی ہی دور ہوتی جاتی ہے۔ ہم بھی سرت کا جگہ جگہ پیچھا کرتے ہیں مگر باوجود اس امر کے کہ وہ ہمیشہ ہمارے سامنے ہی رہتا ہے ہم اس سیماب وش ہستی کا کچھ حال نہیں جانتے۔

ہاں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آخری ناولوں میں وہ پہلا فن کار اپنے شباب کی شوخی اور ترنگ کھو بیٹھا ہے۔ خوش طبعی اب بھی کہیں کہیں — طویل وقفوں کے بعد — جھلک اٹھتی ہے مگر اب اس کی روشنی دیرپا نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے بھی وہ شیکسپیئر کا حریف ہے، جسکے اوپر بھی فن کار کی حیثیت سے یہی مختلف دور گذرے تھے۔

اور شیکسپیئر ہی کی طرح اس کے تخلیق کئے ہوئے کردار بھی اپنے تنوع اور رنگارنگی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہیں۔ اعلیٰ اور اسفل سب ہی تو موجود ہیں — کہیں وہ بے فکری سے گپ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، کہیں محبت کا دلچسپ مگر خطرناک کھیل کھیلتے ہوئے، یا اپنے کسی نصب العین کا تعاقب کرتے ہوئے — سب اپنا اپنا غم غلط کرتے ہیں، اپنی اپنی فکروں میں سرگرداں رہتے ہیں، اور اپنے اپنے مخصوص جذبوں کی پرورش کرتے ہیں — غرض سرت کی دنیا اتنی ہی دلچسپ اور آباد ہے جتنی خود زندگی! ہارڈی کی طرح اسنے بھی اپنے نسائی کردار زیادہ توجہ اور خوبصورتی سے پیش کئے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے یہاں عورتیں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم الشان ہیں — اچلا، ساوتری، کرن موئی، پاربتی، چندرا مکھی — یہ سب کی سب آپ اپنی نظیر ہیں۔ ہندوستانی ادب ابھی تک ان سے روشناس نہ تھا اور اب کہ پہلی بار یہ سب ہماری نگاہ کے سامنے بے نقاب ہوکر آئی ہیں تو ان کے کمالات اور روحانی اور جسمانی صفات کے اعتراف میں ہم سوائے "حیرت" کے اور کوئی خراج پیش نہیں کرسکتے! افسوس کا مقام ہے کہ اس کی جس تصنیف کو گورنمنٹ نے ضبط کرلیا وہی اس کا شاہکار تھی!

بسلسلۂ صفحۂ گذشتہ فلم کے آخری گیت کے ایک بول کی مناسبت سے اس کا نام "منزل" قرار دیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ نہایت بلیغ اشارات (suggestions) کا حامل ہے۔ جمنا۔ پی۔ سی۔ بروا۔ اور پرتھوی راج ..... ان باکمال آرٹسٹوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے — ہندوستانی "گویا اور متحرک تصاویر" میں "منزل" ہر اعتبار سے درجۂ اول کی مستحق ہے۔ "عوام" شاید اس رائے سے اختلاف کریں، مگر عوام کی پسند کا کیا ٹھکانا!

Thomas Hardy. & Shakespeare

اس کے شروع شروع کے کچھ افسانوں اور ناولوں میں ہمیں ایک ایسی دُنیا نظر آتی ہے جو ہماری دُنیا سے مختلف ہے۔ وہاں ہر چیز پر "خواب" کا سا سماں چھایا رہتا ہے ـــــ مثلاً "چوبی" جس میں برما کے ایک مصوّر اور اُس کی معشوقہ کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ عام طور پر اس قسم کی چیز سرت سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک تو وہ "مصوّرِ حقیقت" ہے نہ کہ "مصوّرِ خواب" مگر اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرت دوسری اصنافِ ادب میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اُس پر اِس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ محض خیالی انشا پردازی بے سُود ہے۔ اُس کے حصّہ میں تو "زندگی کی عکاسی" ہی آئی ہے اور وہ اسی کیلئے موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اپنا طرزِ تحریر بدل دیا اور الفاظ کے پیکر میں جیتے جاگتے انسانوں کو پیش کرنے کیلئے اُس نے وہ اسلوبِ نگارش اختیار کر لیا جس میں ہر لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

سرت چندر کی زبان میں ایک سحر آمیز خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اس کے سوائے کسی بنگالی مصنف نے کبھی ایسی پیاری اور بلیغ نثر نہیں لکھی ـــــ کفایت شعاری ـــــ الفاظ کی کفایت شعاری ـــــ سدا سے اس کا شعار رہا ہے۔ اس کو پڑھکر سنج (Synge) کی نثر یاد آجاتی ہے، گو سنج کے معائب بھی موجود ہیں یعنی حد سے زیادہ پُر مغزی اور اختصار! ان کی نثر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بعض اوقات معانی سے اتنے زیادہ گرانبار ہو جاتے ہیں کہ اُن کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور اُس کی پیچدار عبارت "اسم کامل" کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی "آرائش" کو دیکھکر ایک "تخیّل پرست" "اندیشہ ہائے دُور دراز" میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ طرزِ انشا نامانوس سہی مگر حد درجہ نشاط انگیز اور حسین ہوتی ہے۔ بنکم اور ٹیگور کے بعد اگر کوئی اور بنگالی طرزِ بیان کا مالک ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ سرت ہی ہے۔

جوزف کونراڈ کے علاوہ کسی اور جگہ ایک طوفان کا بیان اتنا موثر نہیں ملتا جتنا "چرترا ہین" میں!

اس کی زبان میں ایک دقت اور بھی ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایجازِ بیان ایسا ہے کہ اگر ترجمہ کیا بھی جائے تو اصل کی خوبی باقی نہیں رہتی۔ وہ ایک لفظ میں ایک خیال ادا کر جاتا ہے۔ اس کا ایک جملہ ایک کردار کے بیان کیلئے کافی ہوتا ہے۔ ترجمہ میں سرت کی یہ امتیازی شان قائم نہیں رکھی جا سکتی ـــ اگر کوئی "دل والا" اسکے ناولوں کا ترجمہ کر دے تو بنگال کی اصلی رُوح دُنیا پر ظاہر ہو جائیگی، جو ابھی تک کوئی دوسرا بنگالی مصنف صحیح طریقے پر پیش نہیں کر سکا ہے۔

سرت کی دُور رس نگاہ انسانی کیریکٹر کی تہ تک پہونچتی ہے۔ اس کی قادر الکلامی باعث رشک ہے۔ وہ نہایت بے باکی سے ان گورکھ دھندوں اور معمّوں کو دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جن میں نوعِ انسانی ہمیشہ سے اُلجھی رہی ہے اور اُلجھی رہیگی۔ لاریب، سرت چٹرجی کا شمار دُنیا کے عظیم ترین اور سب سے زیادہ اوریجنل ناول نگاروں میں ہو سکتا ہے۔

"ماضی"۔ دہلی

اساسِ حیات

زندگی کی شورشوں پر حکمراں ہے خامشی
عالمِ ہنگامہ کی اک پاسباں ہے خامشی
ہے خرامِ ناز سے ناآشنا موجِ نسیم
مطمئن پردوں میں گُل کے نوعروسانِ شمیم
نرم جاں کلیاں سکوں کی گود میں سوئی ہوئی
نیند کی گہرائیوں میں تتلیاں کھوئی ہوئی
یاسمیں کے کنجِ تنہا کی گھنیری چھاؤں میں
مست بھنورے سو رہے ہیں "رنگ و بو کے گاؤں" میں
پیڑ پر آموں کے محوِ خواب ہے کوئل کی کوک
اور خوابیدہ پپیہے کے دلِ نازک میں ہوک

عندلیب آسودۂ راحت ہے "نوکِ خار" پر
چھا رہا ہے اک سکوتِ عنبریں گلزار پر
سوگ طاری ہے اُسی کی مرگِ بے ہنگام سے
بہہ رہا ہے خونِ دل پھولوں کے رنگیں جام سے
قُمریاں زیرِ صنوبر سرنگوں بیٹھی ہوئی
رنجِ مرگِ ہمنشیں میں بے سکوں بیٹھی ہوئی
رو رہی ہے شبنمِ غمخوار جانِ ہزار کو
دے رہی ہے غُسل جسمِ عندلیبِ زار کو
روئی نرگس، کھول دی سُنبل نے بھی زلفِ رسا
گل گرے، بلبل گئی، گلزار میں اب کیا رہا؟

دفعتاً اٹھی نگاہِ شاعرِ جادو بیاں
آنکھ میں آنسو جگر میں درد کی جاں کاہیاں
لب پر اک پُرسوز نغموں کا ہجومِ بیکراں
ہاتھ میں لرزش، قلم میں جُنبشِ شعلہ فشاں
سینچتا ہے خُونِ دل سے سرزمینِ شعر کو
خاتمِ رنگیں میں جڑتا ہے نگینِ شعر کو
نغمہ زن ہوتی ہے فطرت اک نئے انداز سے
رُوحِ خُفتہ جاگ اُٹھتی ہے صدائے ساز سے

شعر ہوتا ہے رواں اُس کے لبِ فریاد پر
زندگی تعمیر ہوتی ہے اِسی بُنیاد پر

شیبانی